بسم اللہ الرحمن الرحیم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ○ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد ششم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ انبیاء

سورۃ الحج

سورۂ کہف

آیاتہا ۱۱۰ — سُوْرَۃُ الْکَھْفِ مَکِّیَّۃٌ ۱۸ — رکوعاتہا ۱۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ يَجۡعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں [1] جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب [2] اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی [3]۔

[1] ابن جریر نے اسحاق کے طریق سے اہل مصر کے ایک شیخ سے اور انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودی علماء کی طرف مدینہ طیبہ بھیجا تا کہ وہ علماء یہود سے محمد ﷺ کے متعلق دریافت کریں کہ اس کی نبوت ورسالت کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کے سامنے محمد ﷺ کی صفات عالیہ، خصائل جمیلہ اور عادات جلیلہ کو بھی بیان کریں۔ قریش نے یہود سے اس لئے محمد ﷺ کے متعلق پوچھا کیونکہ وہ پہلے اہل کتاب ہیں اور ان کے پاس انبیاء کرام کا علم ہے جس سے قریش مکہ محروم ہیں۔ وہ دونوں اپنی قوم کے مشورہ کے مطابق مدینہ طیبہ پہنچے اور یہود سے محمد ﷺ کے حسن اخلاق اور دعوت توحید کے متعلق بیان کیا۔ یہودیوں نے کہا اس سے تم تین چیزوں کے متعلق سوال کرو۔ اگر وہ ان کے متعلق صحیح صحیح جواب دے تو وہ یقیناً نبی اور رسول ہے اور اگر وہ ان چیزوں کے متعلق نہ بتا سکے تو اس کا دعویٰ نبوت من گھڑت اور افتراء عظیم ہے۔ ایک تو اس سے ان جوانوں کے متعلق پوچھو جو پہلے زمانہ میں اپنی بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا کیونکہ عربوں کے نزدیک ان جوانوں کا قصہ بڑا عجیب وغریب تھا۔ دوسرا اس شخص کے متعلق پوچھو جس نے زمین کے مشرق ومغرب کا سفر کیا تھا، اس کا واقعہ کیا ہے۔ تیسرا اس سے روح کی حقیقت دریافت کرو۔

نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط قریش کے پاس آئے تو انہیں بتایا کہ ہم ایسے تین سوال لائے ہیں جو محمد ﷺ اور ہمارے درمیان تنازعہ اور جھگڑے کو ختم کر دیں گے۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یہ تین سوال پوچھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں ان کے جوابات کل بتاؤں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ وہ واپس چلے گئے۔ لیکن قدرت کی حکمت کا تقاضا تھا کہ پندرہ روز تک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، نہ کوئی پیام اور نہ پیامبر آیا۔ اہل مکہ کو زبان طعن دراز کرنے کا موقع مل گیا۔ وحی کے انقطاع سے آپ کو شدید پریشانی ہوئی اور اہل مکہ کی اذیت آمیز گفتگو سے آپ کا دل مضطرب مزید تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ پندرہ دن کے بعد جبریل امین سورۂ کہف کی یہ پہلی آیات لے کر تشریف لائے۔ ان آیات میں ان کی تکلیف دہ باتوں پر پریشانی کا اظہار کرنے پر عتاب بھی تھا اور جوانوں نے تین سوالات پوچھے تھے ان کے جوابات بھی تھے (1)۔

[2] اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق پر جو سب سے بڑا انعام فرمایا ہے اس پر وہ اپنی تعریف خود فرما رہا ہے، وہ انعام عظیم قرآن حکیم ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 380 (العلمیۃ)

جو اس نے ان میں سے ایک شخص کے قلب مطہر پر نازل فرمایا۔ اور قرآن نعمت عظمٰی اسلئے ہے کیونکہ اس میں انسانیت کے کمال اور عروج تک پہنچنے والے راستوں کی راہنمائی کی گئی ہے۔ اور اس میں ان قوانین وفرامین کو بھی بیان کیا گیا ہے جن میں معاشرۂ انسانی کی دنیا وآخرت کی خیر اور بھلائی ہے۔ نیز اس آیت کریمہ میں بندوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک بلکہ پوری کائنات کے خالق کی تعریف اور ثناء کیسے کریں۔

سے حفص نے عوجا کو وصل کی صورت میں الف پر آواز کو توڑے بغیر لطیف سا سکتہ کر کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء بغیر سکتہ کے وصل کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے، کہ یہ کتاب رشد و ہدایت ہے جو اس نے اپنے حبیب کے قلب اطہر پر نازل فرمائی ہے۔ اس کے نہ تو الفاظ وعبارات میں کمی ہے اور نہ اس کے معانی میں باہم اختلاف ومنافات ہے اور اللہ تعالیٰ کی جناب سے جو اس میں دعوت آئی ہے اس میں کسی قسم کا انحراف اور تغیر نہیں اور نہ ہی اس کے ارشادات حکمت وموعظت سے خالی ہیں۔ عِوج اگر عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معانی مخفی کجی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور عوَج اگر بفتح عین ہو تو ظاہری ٹیڑھے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فِیْ رَاْیِهٖ عِوَجٌ وَّفِیْ عَصَاهُ عِوَجٌ (یعنی اس کی فکر اور سوچ میں کجی ہے اور اس کی چھڑی ٹیڑھی ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عوجا کا معنی غیر مخلوق مروی ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے اس کا معنی غیر مخلوق کیا ہے (1)۔

قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲

"(اور معاش ومعاد کو) درست کرنے والی ہے لے تا کہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے ہے اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بیشک ان کے لئے بہت عمدہ جزاء ہے۔ سے"

لے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ قیما کا یہ معنی فرماتے ہیں کہ یہ بالکل کجی اور ٹیڑھے پن سے پاک ہے، اس میں کسی قسم کی افراط و تفریط نہیں ہے۔ فراء لکھتے ہیں یہ کتاب تمام الہامی کتابوں کی موئید اور گواہ ہے اور ان کے بعض احکام کو منسوخ کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تکمیل انسانی کی صفت سے متصف ہے، بندوں کے مصالح درست کرنے والی ہے، یعنی یہ نورانی صحیفہ جس طرح اپنی صفت کمال سے موصوف ہے اسی طرح دوسروں کی اصلاح اور ان کو کمال عروج تک پہنچانے کی صفت سے بھی مزین ہے۔ قیما پر نصب مضمر فعل کی وجہ سے ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا وَّلٰكِنْ جَعَلَهٗ قَیِّمًا یا یہ لہ کی ضمیر یا الکتاب سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس صورت میں واؤ حالیہ ہوگی عاطفہ نہ ہوگی۔ اگر واؤ کو عاطفہ بنایا جائے تو معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ آ جائے گا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے تقدیم وتاخیر کا قول کیا ہے۔ یعنی اگر واؤ عاطفہ ہو تو تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتَابَ قَیِّمًا وَّلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔

قرآن کی یہاں دو صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں کوئی خامی اور کجی نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کتاب دوسروں کی خامیوں کی بھی اصلاح کرنیوالی ہے۔ ان دونوں وصفوں کا فائدہ کلام میں تاکید ہے کیونکہ کئی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کی صفت

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 155 (التجاریۃ)

استقامت (اصلاح) بیان کی جاتی ہے لیکن باریکی اور لطیف انداز سے دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ کچھ خامی اور کجی بھی نظر آ جاتی ہے لیکن قرآن میں یہ دونوں اوصاف جمع فرما کر اس کی جامعیت کو واضح فرما دیا۔

۲؎ لینذر کا فاعل عبد ہے، یعنی اس کتاب حکمت و موعظت کے ساتھ میرا عبد کامل ان لوگوں کو ڈرائے جو شرک و کفر میں ملوث ہیں۔ قرینہ کی وجہ سے پہلے مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس غرض پر اکتفا کیا گیا ہے جس کے لئے کلام کو ذکر کرنا مقصود تھا۔ باساً کا معنی عذاب ہے، یعنی عبد کامل، کتاب کامل کے ذریعے کفار کو اس عذاب سے ڈرائے جو بے نیاز ذات کی طرف سے جہنم کی آگ کی صورت میں ان پر ڈالا جائے گا۔ ابوبکر نے من لدنہ کو دال کے سکون اور ہونٹوں کو ملانے کے ساتھ ضمہ کی طرف اشمام دیکر پڑھا ہے۔ نیز انہوں نے نون اور ھا کو کسرہ دیا ہے اور ھا کو یاء کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے دال کے ضمہ اور نون کے اسکان اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ابن کثیر نے ھا کو واو کے ساتھ ملایا ہے۔

۳؎ حمزہ، کسائی نے باب افعال سے یبشر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں یبشر کا مفعول اول ذکر فرمایا ہے تا کہ ایمان داروں کی عظمت کا اظہار ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ایمان اور اعمال صالحہ پر انہیں برانگیختہ کیا جائے۔ یعنی نیک اعمال کرنے والوں کو یہ کتاب لاریب جنت اور رضاء الٰہی کا مژدہ جانفزاء سناتی ہے۔

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾

''وہ ٹھہریں گے اس (جنت) میں تا ابد ۱؎''

۱؎ یہ جو انہیں نیک اعمال کا اجر ان کی شایان شان ملے گا اس میں وہ ہمیشہ مسرور و خورسند رہیں گے۔ اس اجر و انعام کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا یہ دائمی اور ابدی ہوگا۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۗ﴿۴﴾

''اور تا کہ ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ ۱؎''

۱؎ یہاں ان لوگوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا جو اللہ کی اولاد کے قائل تھے۔ اور ڈرانے کو بھی ان کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا شرک اور کفر بہت گھناؤنا اور قبیح تھا اور بڑا عجیب و غریب تھا۔ اور جس چیز سے ڈرانا تھا یہاں اس کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ پہلے اس (عذاب) کا ذکر ہو چکا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾

''نہ انہیں اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا ۱؎ کو کتنی بڑی ہے وہ بات ۲؎ جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے ۳؎ وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔ ۴؎''

۱؎ بہ کی ضمیر کا مرجع الولد، یا اتخاذ یا القول ہے، یعنی ان احمقوں کو بیٹے کے متعلق، یا بیٹا بنانے یا ایسا قول کرنے کے (جرم) کے متعلق علم نہیں ہے، یہ سب کچھ اپنی انتہائی جہالت، باطل توہمات اور اندھی تقلید کی بناء پر کہتے ہیں (کہ اللہ نے فلاں کو اپنا بیٹا بنایا

ہے) جو کچھ اپنے بے عقل آباؤ اجداد سے سنا، بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی اور تقلید کر رہے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس کا بھی انہیں علم نہیں ہے۔ وہ اَبٌ اور ابن کا اطلاق موثر اور اثر کے معنی میں کرتے تھے، جبکہ انہیں اس کا علم ہی نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ ان عقل کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم وادراک ہی نہیں ہے ورنہ یہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کی طرف نسبت نہ کرتے۔ یا کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے عدم انکشاف کی وجہ سے ہوتا ہے حالانکہ وہ چیز موجود ہوتی ہے اور کبھی لاعلمی اس چیز کے معدوم اور محال ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہاں یہی مفہوم مراد ہے۔ یہ موجودہ مشرک جس طرح بے علم تھے اس طرح ان کے پیشروان کے آباء واجداد بھی نادان اور نا سمجھ تھے کیونکہ وہ بھی خدا کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے تھے۔

۲۔ ان کا یہ کفر یہ کلمہ کتنا قبیح اور نامعقول ہے کیونکہ انہوں اس ذات صمدیت کو ایک مخلوق سے تشبیہ دی، پتھر سے تراشے بتوں کو اس کا شریک ٹھہرایا، انہوں نے ایسی بات کہی ہے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اس ذات کو بیٹے اور خلیفہ کی احتیاج ہے حالانکہ وہ ذات ہر قسم کے ایسے نقص اور عیب سے منزہ اور مبرا ہے، کلمۃً پر نصب تمیز ہونے کی بنا پر ہے۔ اس قسم کا اسلوب بیاں تعجب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ کبرت میں فاعل ھی ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر کلمۃً بیان کر رہا ہے یا ضمیر کا مرجع اتخذ اللہ ولدا کا قول ہے۔ کلمہ کا اطلاق مرکب کلام پر بھی ہوتا ہے کیونکہ عرب قصیدہ کو بھی کلمہ کہہ دیتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اصل میں من کلمتہ تھا اور فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے اور من زائدہ ہے پھر من کو حذف کیا گیا اور کلمتہ کو منصوب پڑھا گیا۔

۳۔ یہ کلمتہ کی صفت ہے جو ان کے اپنے مونہوں سے ایسی بات نکالنے کی نامعقولیت کو بیان کر رہی ہے۔ حالانکہ نکلنے والی تو وہ ہوا تھی جو ایسی بات کی حامل تھی۔ بعض علماء فرماتے یہ جملہ محذوف مخصوص بالذم کی صفت ہے کیونکہ کَبُرَ یہاں بئس کے معنی میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے قول یخرج۔

۴۔ وہ سفید جھوٹ بک رہے ہیں کذبا مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی ان کی یہ بات (فلاں اللہ کا بیٹا ہے) کسی اعتبار سے بھی صداقت پر مبنی نہیں ہے۔

ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عتبہ، شیبہ، ابوجهل بن هشام، نضر بن الحارث، عاص بن وائل، اسود بن مطلب او ر ابوالبختری قریش کی ایک مجلس میں جمع تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پوری دلسوزی اور خلوص کے ساتھ کفار کو دعوت تو حیدی تو انہوں نے اس پیکر خلوص کی دعوت حق کو قبول کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، اور صبح و شام تنقید وطعن ان کا مشغلہ بن گیا۔ اس غیر منصفانہ طرز عمل پر آپ ﷺ کے شفیق ورحیم دل کو بہت تکلیف ہوتی، خلوص آمیز تبلیغ کی تضحیک وانکار آپ کیلئے نہایت پریشانی اور قلق کا باعث بنتا تھا(1) تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ کو تسلی دینے کیلئے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝

''تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے ۱؎ اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے ۲؎''

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 382 (العلمیۃ)

۱؎ اے پیارے حبیب ان ناہنجاروں اور ازلی بدبختوں کی ایمان سے بے رخی کرنے پر آپ اپنے نفس کو ہلاک کر دیں گے۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا اور شتر بے مہار کی طرح منہ موڑ گئے، آپ کو ان کی اس بے توجہی پر شدید دکھ اور پریشانی ہوئی تو آپ کی اس کیفیت کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو اپنے دوست واحباب چھوڑ گئے ہوں اور وہ ہجر و فراق کی طویل رات میں گھائل ہو رہا ہو۔ گویا آپ ﷺ بھی درد فراق میں مبتلا شخص کی طرح ان کے ایمان نہ لانے پر غم و اندوہ میں مبتلا ہیں۔

۲؎ ھذا الحدیث سے قرآن حکیم مراد ہے۔ ان لم یؤمنوا شرط ہے اور سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اسفاً یا تو علت کی بناء پر منصوب ہے یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ان پر افسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو مار ڈالیں گے یا ان کے ایمان کی آرزو میں اپنے آپ کو قتل کر دیں گے۔ اسف کا معنی شدید غصہ اور انتہائی غم و اندوہ ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۞

''بیشک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں اس کے لئے باعث زینت و آرائش ۱؎ تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے ۲؎''

۱؎ یعنی ہم نے حیوانات، نباتات اور معادن کو زمین اور زمین کے باسیوں کیلئے زینت و زیبائش کا باعث بنایا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ سانپ، بچھو اور شیاطین میں کیا حسن و زیبائش ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں اس اعتبار سے زینت ہیں کہ یہ اپنے صانع کی قدرت کاملہ، اس کی یکتائی اور اس کی صفات کمالیہ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ماعلی الارض سے مراد صرف مرد ہیں اور یہی زمین کی زینت و جمال ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد علماء اور صالحین ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں درختوں اور نہروں کی زینت مراد ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ'' یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور خوب آراستہ ہو گئی''

بعض علماء فرماتے ہیں ماعلی الارض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین کے حسن و خوبی کا باعث ہو سکتی ہے مثلاً دنیا کی ظاہری نفیس اشیاء۔ میں کہتا ہوں دنیا کی تمام اشیاء بھی مراد ہو سکتی ہیں جیسا کہ الفاظ کے عموم سے ظاہر ہے کیونکہ مجموعی نظام کے حسن پر سب چیزیں دلالت کرتی ہیں یا ہر چیز زینت میں داخل ہے کیونکہ جمیل و حسین صورتوں کا حسن ہمیشہ قبیح چیزوں کے ذریعہ سے ہی محسوس و معروف ہوتا ہے۔

۲؎ ھم ضمیر کا مرجع الناس ہے جو وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ اور يُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا کے ارشادات کے ضمن میں موجود و مفہوم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں آزمائے کہ عمل کے لحاظ سے کون اچھا اور بہتر ہے، کون ان فانی اور عارضی رنگینیوں سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے خالق کی طرف متوجہ رہتا ہے اور کون اس دنیا کے ظاہری حسن و جمال کی دلفریبیوں میں کھو جاتا ہے۔ بہتر عمل والا وہ ہو گا جو کفایت کرنے والے مال پر قناعت کرے اور پھر اس مال کو مناسب اور نیک جگہ پر صرف کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا سرسبز و شاداب، بہت لذیذ اور میٹھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں پہلے لوگوں کا خلیفہ بنایا تاکہ وہ دیکھے کہ تم اس میں کیسے اعمال کرتے ہو۔

وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۞

''اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان غیر آباد ۱؎''

۱؎ یعنی جن چیزوں کو ہم نے اس زمین کی زیب و زینت کا باعث بنایا، ایک دن ہم ان سب کو خاکستر اور ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

حیوانات ونباتات اور دوسری یہ حسین وجمیل اشیاء سب مٹی میں مل جائیں گی۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝

''کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غاروالے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں[1]''

[1] اس آیت میں استفہام تقریری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کا وصف مبالغہ کیلئے مصدر سے بیان کیا گیا ہے یا عجباً مصدر فاعل کے معنی میں ہے یا ذا عجب کے معنی میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں استفہام انکاری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے نہیں ہیں کیونکہ یہ بلندوبالا آسمان، یہ سرسبز وشاداب زمین اور پھر زمین کے دامن میں ان گنت دوسری مخلوق، ان لوگوں سے بھی حیرت انگیز ہے کیونکہ یہ سب اشیاء مختلف طبائع اور مختلف ہیئت پر پیدا کی گئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سب کو اپنی اصل یعنی مٹی کی طرف لوٹا دے گا۔ یہ گوناں گوں کائنات کی اشیاء، اصحاب کہف اور رقیم سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز ہیں۔ کہف اصل میں کھلی غار کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے اندر ہو۔ الرقیم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس سے مراد وہ تختی ہے جس پر اصحاب کہف کے اسماء اور ان کا قصہ درج تھا (یہ قول تمام اقوال سے زیادہ ظاہر ہے) اس تختی کو لوگوں نے اس غار کے منہ پر رکھ دیا تھا اور وہ تختی تانبے کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ پتھر کی تھی۔ اس تاویل پر رقیم بمعنی مرقوم ہوگا یعنی لکھا ہوا اور رقم کا معنی لکھنا ہے۔ ابن عباس سے حکایت ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جس میں ان کی غار تھی۔ اس صورت میں رقیم رقمۃ الوادی سے مشتق ہوگا جس کا معنی وادی کا کنارہ ہے۔ کعب الاحبار فرماتے ہیں یہ اس دیہات کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھی۔ بعض علماء فرماتے اصحاب رقم کوئی دوسرے افراد تھے جو اصحاب کہف کے علاوہ تھے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ کو اصحاب رقیم کے متعلق بیان فرماتے ہوئے سنا کہ یہ تین افراد تھے جو غار میں داخل ہوئے تھے(1)۔ اسی حدیث کو احمد اور ابن منذر نے حضرت انس کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ یہ پہلے لوگوں میں سے تین افراد تھے جو اپنے گھر والوں کیلئے خوراک طلب کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ باہر تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ انہوں نے دوڑ کر ایک غار میں پناہ لی، اچانک ایک چٹان گری جس کے ساتھ غار کا منہ بند ہوگیا۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ اپنا اپنا نیک عمل یاد کرو (اور اس کے واسطہ سے دعا کرو) ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس نیک عمل کی برکت سے ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔ ان میں سے ایک نے کہا ایک دن میں نے مختلف مزدوروں کو کام پر لگایا تھا پھر ایک شخص دوپہر کو آیا اور بقیہ وقت اس نے ان کی طرح مزدوری کی، میں نے دوسرے مزدوروں کی طرح اس (نصف دن) کام کرنے والے کو بھی پورے دن کی مزدوری دے دی۔ ان مزدوروں میں سے ایک مزدور ناراض ہوگیا اور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی اجرت کو گھر میں علیحدہ رکھ دیا پھر میرے پاس سے ایک گروہ گزرا تو میں نے اس سے اس مزدور کی اجرت کے بدلے ایک اونٹنی خرید لی۔ وہ اونٹنی مشیت الٰہی کے مطابق بڑھتی رہی۔ پھر وہی مزدور پیرانہ سالی کے عالم میں میرے پاس واپس آیا، میں تو اسے پہچان بھی نہ سکا۔ اس نے کہا میرا تیرے پاس کچھ حق باقی ہے۔ اس نے یاد دلایا تو مجھے یاد آ گیا۔ میں نے اس کو اونٹنی اور اس کی اولاد سب پیش کر دیں، اس شخص نے دعا کی یا اللہ اگر میں نے یہ سب عمل تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس کے واسطہ سے ہمیں اس غار سے باہر نکال دے، چٹان تھوڑی سی اپنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 156 (التجاریۃ)

جگہ سے ہٹ گئی حتی کہ انہیں کچھ روشنی نظر آنے لگی۔ دوسرے نے کہا میں مالدار تھا، جبکہ لوگ قحط اور تنگی میں مبتلا تھے۔ میرے پاس ایک عورت آئی، اس نے مجھ سے نیکی کرنے کا سوال کیا تو میں نے اسے کہا تم اپنا آپ میرے حوالے کرو تو میں تجھ سے نیکی کروں گا۔ اس نے انکار کیا پھر وہ تین مرتبہ آئی (لیکن ایسا ہی مطالبہ ہوا لیکن اس نے انکار کیا) پھر اس نے اپنے خاوند سے اس بات کا تذکرہ کیا، خاوند نے کہا اس کی بات مان لے اور اپنے بچوں کے سلسلہ میں میری معاونت کر پھر وہ لوٹ کر آئی اور اس نے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا۔ جب میں نے اس کا ستر کھولا اور اس سے بدکاری کا ارادہ کیا تو اس پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میں نے کہا تجھے کیا ہوا۔ اس عورت نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے کپکپی لاحق ہوگئی ہے میں نے کہا تو اس بھوک اور شدت کے عالم میں اپنے پروردگار سے ڈر رہی ہے اور میں اس خوشحالی کے حالات میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور خواہش کے مطابق مال بھی دیا، یا اللہ اگر میں نے یہ بدکاری تیری وجہ سے چھوڑی تھی تو ہماری یہ مشکل دور فرما دے چٹان تھوڑی سی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئی حتی کہ کے وہ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے، تیسرے نے کہا، میرے بوڑھے والدین تھے اور میری بکریاں بھی تھیں میں پہلے اپنے والدین کو کھلاتا اور پلاتا تھا پھر اپنی بکریوں کے چارہ وغیرہ کا بندوبست کرتا تھا۔ ایک دن بکریوں کے سلسلہ میں میری اتنی مصروفیت ہوئی کہ میں شام کے وقت لوٹا، گھر پہنچا، دودھ دوہنے والا برتن لیا۔ پھر اس میں دودھ دوہا لیکن والدین کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو وہ سو چکے تھے، میں نے انہیں بیدار کرنا آداب کے خلاف سمجھا، میں وہاں ہاتھ میں برتن لے کر بیٹھ گیا حتی کہ صبح کے وقت وہ بیدار ہوئے تو میں نے انہیں دودھ پیش کیا۔ یا اللہ اگر میں نے یہ عمل فقط تیری رضا کیلئے کیا تھا تو ہم سے یہ تکلیف دور فرما۔ اللہ تعالیٰ نے اس چٹان کو ہٹا دیا اور وہ باہر نکل آئے۔

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾

”(یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں [1] پھر انہوں نے دعا مانگی اے ہمارے رب ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لیے اس کام میں ہدایت۔ [2]“

[1] اوی کا معنی پناہ لینا ہے، یعنی انہوں نے ایک جگہ کو اپنی منزل بنایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں بنجلوس پہاڑ میں غار تھی جس کا نام جیرم تھا(1)۔ اس میں یہ نوجوان داخل ہوئے تھے، اور دعا کی تھی کہ اے ہمارے پروردگار دین متین کی طرف ہمیں ہدایت عطا فرما، اور ہماری خطاؤں کو معاف فرما دے اور ہمیں رزق بھی عطا فرما اور دشمن کے ظلم سے ہمیں محفوظ فرما۔

[2] امام بیضاوی فرماتے ہیں تھیئۃ کا اصل معنی کسی چیز کو نئے سرے سے تیار کرنا ہے(2) مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں جو تو نے اپنی جناب سے ایمان واطاعت کا نور عطا فرمایا اور کفار سے علیحدگی اور نفرت کی توفیق بخشی ہے، اس میں ہمیں استقامت اور ثبات عطا فرما۔ یا یہ معنی کہ ہمارے سارے امور کو باعث ہدایت بنا دے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے راعت منک رشدا یعنی حق کے راستہ پر ہمیں پختگی اور استقامت عطا فرما۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ نیز قاموس میں ہے کہ رشد رشدا اور شادا باب نصر اور فرح میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہدایت پانا ہے۔ رشید جو اللہ تعالیٰ کا صفاتی اسم ہے اس کا معنی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور جس کی ہر تقدیر اور انداز میں حسن وکمال ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 387 (فراس)

علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ ان جوانوں کے غار میں جانے کے سبب میں اختلاف ہے۔ محمد بن اسحاق لکھتے ہیں کہ عیسائیوں سے اپنا دین خلط ملط ہو گیا۔ اور گناہوں میں ملوث ہو گئے اور ان میں بادشاہ سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا پاٹ کرتے اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتے۔ لیکن کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر مضبوطی سے قائم تھے۔ اور اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اس علاقہ کا بدکار و بت پرست روم کا بادشاہ دقیانوس بھی تھا۔ یہ بتوں کی عبادت کرتا اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتا اور اپنی اس غلط روش کا پرچار کرتا۔ جو اس کی مخالفت کرتا اسے قتل کر دیتا تھا۔ وہ روم کے جس شہر میں جاتا، وہ کسی عیسائی کو نہیں چھوڑتا تھا، وہ انہیں بتوں کی پرستش اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرنے کا حکم دیتا۔ وہ مان جاتا تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیتا۔ حتیٰ کہ بادشاہ روم اس شہر میں جا پہنچا جو اصحاب کہف کا شہر تھا۔ اس کا نام افسوس تھا جب دقیانوس کسی شہر میں آتا تو دین مسیح کے پیروکار بہت پریشان ہوتے، چھپ جاتے اور بھاگ جاتے۔ دقیانوس اہل ایمان کو تلاش کرنے کا حکم دیتا۔ لوگ اہل ایمان کو پکڑ کر لاتے تو وہ انہیں قتل یا بت پرستی کا اختیار دیتا۔ کچھ لوگ عارضی زندگی کو ترجیح دیتے اور کچھ غیر کی عبادت سے انکار کر دیتے۔ جو انکار کرتے وہ انہیں قتل کر دیتا۔ جب اس ظالم بادشاہ اور اس کے جوانوں نے اہل ایمان کی پختگی دیکھی تو وہ اہل ایمان کو تکلیف دینے اور قتل کرنے کے درپے ہو گئے، وہ انہیں قتل کرتے اور پھر ان کے اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ پھر ان کے کٹے ہوئے اعضاء کو دیواروں پر لٹکا دیتے۔ جب اس بادشاہ کا فتنہ روز بروز بڑھتا گیا تو یہ نوجوان بہت پریشان ہوئے اور اپنی نماز، روزہ، صدقہ، تسبیح اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ روم کے رئیسوں اور شرفاء کے بیٹے تھے۔ یہ آٹھ افراد تھے اس آزمائش کو دیکھ کر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائے۔

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا اِنْ عَبْدُنَا غَيْرَهٗ

ترجمہ: ۔ اے ہمارے پروردگار، آسمانوں اور زمین کے مالک ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور خدا کو پکاریں تو ہم حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے اگر ہم کسی غیر کی عبادت کریں، اپنے ایماندار بندوں سے یہ آزمائش دور فرما دے اور اس مصیبت کو دفعہ فرما دے تا کہ تیرے بندے اعلانیہ تیری عبادت کر سکیں۔ وہ اپنی عبادت گاہ میں یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ پولیس پہنچ گئی۔ انہوں نے انہیں مسجدوں کی حالت میں اللہ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے ہوئے پایا۔ سپاہیوں نے کہا تم نے بادشاہ کے حکم سے کیوں سرتابی کی ہے؟ بادشاہ کے پاس چلو؟ وہ انہیں دقیانوس کے پاس لے گئے اور کہا بادشاہ سلامت آپ لوگوں کو بت پرستی اور بتوں پر جانور ذبح کرنے کیلئے جمع کرتے ہیں، جبکہ یہ نوجوان جو تمہارے خاندان سے ہیں، تیرے حکم کا مذاق اڑاتے ہیں اور تیرے فرمان کی نافرمانی کرتے ہیں۔ جب بادشاہ نے یہ سنا تو انہیں بلایا۔ وہ نوجوان آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہروں پر گرد و غبار تھا۔ بادشاہ نے پوچھا تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کیوں نہیں کرتے؟ جن بتوں کی سطح زمین پر پوجا کی جاتی ہے، تمہیں تو دوسرے لوگوں کیلئے نمونہ بننا چاہیے تھا۔ میں تمہیں اختیار دیتا ہوں یا تو تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کر دیا میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ مکسلمینا جوان جوانوں سے بڑا تھا، اس نے کہا ہمارا ایک خدا ہے جس کی عظمت سے آسمان لبریز ہیں۔ ہم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ سب تعریفیں سب بڑائیاں اور سب عیوب ونقائص سے پاک ہونا اسی کو زیبا ہے۔ ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے نجات وکامیابی کا سوال کرتے ہیں اور تمہارے یہ تراشے ہوئے بت ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے۔ جو تیرے جی میں آئے کر (یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے) مکسلمینا کے دوسرے ساتھیوں نے بھی اس کی طرح بادشاہ کو منہ پر کھری کھری سنا دیں۔ جب انہوں نے اپنے عزم واستقلال کا مظاہرہ کیا تو

پہلے بادشاہ نے ان کے شاہی لباس اتروا دیے۔ پھر کہا میں دوسرے امور مملکت سے فارغ ہو کر تمہیں وہ سزا دونگا جس کا میں نے تمہارے متعلق فیصلہ کیا ہے، مجھے اس وقت سزا دینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے لیکن میں صرف تمہارا عنفوان شباب دیکھ کر تمہیں مہلت دے رہا ہوں۔ اس مہلت میں تم غور وفکر کرلو اور اپنی ناقص عقلوں کو ہماری باتوں کی طرف متوجہ کرلو۔ پھر اس نے ان کے زیورات اتارنے کا حکم دیا اور باہر لے جانے کا فرمان جاری کیا۔ دقیانوس انہیں چھوڑ کر کسی کام کیلئے دوسرے شہر چلا گیا۔ ان نو جوانوں کو جب اس کے چلے جانے اور جلدی واپس آنے کا پتہ چلا تو انہیں خدشہ لاحق ہوا کہ وہ آئے گا تو ہمیں پھر بلا لے گا۔ نو جوانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے باپ کے گھر سے کچھ خرچ لے آئے، جس میں سے کچھ صدقہ کرے اور کچھ سے سامان خورد ونوش خریدے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ شہر کے قریب ایک غار تھی اس میں چلے جائیں گے جو بنجلوس پہاڑ میں تھی، وہ اس میں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہیں گے نیز مشورہ یہ ہے کہ جب دقیانوس واپس آئے گا تو ہم سب اس کے پاس جائیں گے اور اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے، وہ جو چاہے کرے (ہم عقائد حقہ سے روگردانی نہیں کریں گے)

یہ مشورہ طے ہو گیا تو سب اپنے اپنے باپ کے گھر گئے، خرچ لیا۔ کچھ صدقہ کیا اور باقی ساتھ لے کر غار کی طرف چل پڑے۔ ان کا ایک کتا تھا وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا حتی کہ وہ غار میں پہنچ گئے اور اس میں ٹھہرنے لگے۔ کعب الاحبار کا بیان ہے وہ کتے کے قریب سے گذرے تو وہ ان کے پیچھے چل پڑا، انہوں نے اسے دھتکارا لیکن پھر وہ پیچھے مڑ آیا۔ کئی دفعہ انہوں نے اسے بھگایا لیکن وہ پھر واپس آ گیا (اللہ تعالیٰ نے کتے کو قوت گویائی عطا فرمائی) اس نے کہا، اے لوگو! تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، میرے متعلق تم کچھ اندیشہ نہ کرو میں اللہ کے محبوب بندوں سے پیار کرتا ہوں۔ تم سو جاؤ، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نو جوان رات کے اندھیرے میں دقیانوس سے بھاگ گئے تھے اور ان کی تعداد سات تھی۔ یہ ایک چرواہے کے پاس سے گذرے جس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا اس چرواہا نے ان نو جوانوں کا دین قبول کرلیا اور ان کے ساتھ چل پڑا اور اس کا کتا بھی ان کے پیچھے ہو گیا۔ وہ شہر سے نکل کر غار کی طرف چلے گئے جو شہر کے قریب تھی۔

ابن عباس فرماتے ہیں وہ اس غار میں نماز، روزہ، تسبیح، تکبیر، تحمید میں بھی مصروف رہے۔ انہوں نے اپنا خرچ تملیخا کے پاس جمع کرا لیا۔ وہ ان کے لئے شہر سے خفیہ طور پر کھانا لاتا تھا۔ یہ سب سے خوبصورت اور مضبوط جسم والا تھا۔ جب وہ شہر میں جاتا تو اپنے عمدہ کپڑے اتار کر مساکین کا لباس پہن لیتا، جن میں مساکین کھانا طلب کرتے تھے۔ وہ ایک سکہ لے کر شہر کو جاتا، کھانے، پینے کی چیزیں خریدتا اور لوگوں سے حالات معلوم کرتا کہ ان کا ذکر شہر میں کچھ ہوا ہے یا نہیں۔ پھر وہ اپنے اصحاب کی طرف لوٹ جاتا۔ وہ غار میں کچھ مدت ٹھہرے رہے۔ دقیانوس شہر کو واپس آیا تو اس نے شہر کے سرداروں کو بلایا تو تمام نے بتوں کیلئے جانور ذبح کیے اہل ایمان بادشاہ کی آمد سے گھبرائے، تملیخا جو شہر میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانے، پینے کا سامان لینے آیا تھا وہ اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ کر گیا تو رو رہا تھا اور ساتھ کھانا بھی قلیل مقدار میں لے گیا تھا تملیخا نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ ظالم بادشاہ شہر میں پہنچ چکا ہے اور وہ ہماری تلاش میں ہے۔ سب ساتھی غار میں ہی سربسجود ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے آہ وفغاں کرنے لگے اور فتنہ وآزمائش سے پناہ طلب کرنے لگے۔ پھر تملیخا نے کہا اے بھائیو! اپنے سر اٹھاؤ اور کھانا کھاؤ، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرو۔ انہوں نے سجدوں سے سر اٹھائے، جبکہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، انہوں نے کھانا کھایا تقریباً یہ غروب آفتاب کا وقت تھا پھر وہ گفتگو کرنے بیٹھ گئے اور

ایک دوسرے کو تعلیم دینے لگے اور نصیحت آمیز باتیں کرنے لگے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے غار میں ان کے کانوں کو بند کر دیا۔ اور ان کا کتا ہاتھ پھیلائے غار کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ کتے پر بھی ایسی ہی غنودگی طاری ہوگئی جیسے ان پر طاری ہوئی تھی، وہ سب ایمان وایقان کی حالت میں سو گئے اور ان کا خرچ ان کے سروں کے قریب پڑا تھا۔ جب دوسرا دن ہوا تو دقیانوس نے انہیں تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے۔ بادشاہ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا ان جوانوں کے معاملہ نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے، جو یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ مجھے ان پر بہت غصہ ہے، یہ ان کی میرے معاملات سے ناشناسی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ اگر وہ میرے خدا کی عبادت کرتے اور اپنے دین سے توبہ کرتے تو میں انہیں چھوڑ دیتا۔ شہر کے سرداروں نے کہا جناب یہ لوگ رحم کے قابل نہیں جنہوں نے آپ کے حکم سے سرتابی کی ہے اور فرامین شاہی کی نافرمانی کی ہے۔ جناب نے انہیں مہلت دی تھی اگر وہ چاہتے تو اس مہلت کو غنیمت سمجھ کر لوٹ آتے۔ لیکن انہوں نے اپنے دین کو نہیں چھوڑا۔ جب سرداروں نے بادشاہ سے یہ بات کی تو وہ پھر غصہ میں لال پیلا ہوگیا۔ اس نے ان نوجوانوں کے والدین کو بلایا اور ان سے ان جوانوں کے متعلق پوچھا، اور کہا مجھے ان نافرمان بیٹوں کے متعلق بتاؤ جنہوں نے میرے حکم کی سرتابی کی ہے۔ ان کے باپوں نے کہا ہم نے تو تیری نافرمانی نہیں کی ہمیں اس سرکش گروہ کی وجہ سے کیوں قتل کرتا ہے جو ہمارے مال بھی اٹھا کر لے گئے تھے اور بازاروں میں انہیں ہلاک کر دیا۔ اور پھر وہ بنجلوس پہاڑ کی طرف چلے گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ گفتگو کی تو بادشاہ دقیانوس نے ان کو آزاد کر دیا۔ اب اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ ان جوانوں کے ساتھ کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ غار کا منہ بند کر دے۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ ان نوجوانوں کو عزت و اکرام عطا فرمائے اور انہیں بعد میں آنے والے لوگوں کیلئے نشانی بنائے اور لوگوں پر ان کی زندگی اور موت سے یہ حقیقت کھل جائے کہ قیامت واقعی قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ قبروں سے مردوں کو اٹھائے گا۔ دقیانوس نے حکم دیا کہ غار کا منہ بند کر دیا جائے، اور کہا کہ اسی غار میں انہیں رہنے دو جو انہوں نے خود اپنے لئے پسند کی ہے، خود بخود اندر بھوکے اور پیاسے مر جائیں گے اور یہ غار جو انہوں نے پسند کی ہے ان کے لئے قبر بن جائے گی۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ وہ بیدار ہیں اور جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اس سے باخبر ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو اس طرح نکال لیا تھا جس طرح سونے والوں کی روحوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے، اور ان کا کتا غار کے دہانے بازو پھیلائے بیٹھا تھا، اور اس پر بھی وہ غنودگی طاری ہوگئی تھی جو ان پر طاری تھی۔ وہ دائیں بائیں کروٹیں بدلتے رہے۔ بادشاہ، دقیانوس کے گھر دو آدمی ایسے تھے۔ جنہوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا، ایک کا نام بیندروس اور دوسرے کا نام ایاش تھا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ ان نوجوانوں کے حالات، ان کے نسب، ان کے اسماء اور واقعات کو سکے کی تختیوں پر لکھ دیں اور پھر انہیں تانبے کے تابوت میں رکھ دیں اور تابوت کو پھر ایک عمارت میں نصب کر دیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں پر کسی مومن قوم کو قیامت سے پہلے مطلع فرمادے اور جب یہ کتبہ پڑھے گا تو ان کی غار کو کھودنے والا ان کے حالات سے باخبر ہو جائے گا۔ انہوں نے مشورہ کے مطابق تختیاں نصب کر دیں پھر دقیانوس اپنی عمر پوری کرنے کے بعد مر گئے۔ زمانہ گذرتا رہا، بادشاہ یکے بعد دیگرے آتے رہے، عبید بن عمیر فرماتے ہیں اصحاب کہف ایسے نوجوان تھے جن کے گلوں میں طوق تھے اور ہاتھوں میں کنگن، ان کے بال لمبے لمبے تھے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا وہ اپنے زرق برق لباس پہن کر ایک میلہ کی طرف گئے تھے، ان کے ساتھ ان کے وہ بت بھی تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کا نور پیدا فرادیا۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا وزیر تھا، یہ لوگ سب مومن بن

گئے تھے لیکن ہر ایک اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم اس قوم کے درمیان سے نکل جائیں تاکہ ان کافروں پر نازل ہونے والا عذاب ہم پر نہ آجائے۔ ان میں سے ایک جوان نے پہل کی، وہ نکل کر ایک درخت کے نیچے علیحدہ جا بیٹھا پھر دوسرا نکلا، اس نے پہلے کو علیحدہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو امید کی کہ شاید یہ بھی میری طرح ایمان قبول کر چکا ہو لیکن معاملہ کو ظاہر نہ کر رہا ہو پھر تیسرا نکلا، وہ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے، ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ تم کیوں جمع ہوئے ہو ہر ایک خوف کی وجہ سے اپنے ایمان کو دوسرے سے چھپائے ہوئے تھا پھر وہ دو دو ہو کر نکلے اور ہر ایک نے اپنے ایمان کو دوسرے پر ظاہر کر دیا، وہ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے، اور ایک غار جو پہاڑ میں تھی وہ ان کے قریب تھی ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ اس غار میں پناہ لو تمہارا پروردگار تمہارے اوپر اپنی رحمت کی چادر پھیلا دے گا۔ وہ غار میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا، وہ تین سو نو (309) سال سوئے رہے۔ وہ اپنی قوم سے ان کے اسماء، نسب اور تاریخ لکھی کہ فلاں بن فلاں اور فلاں ہمارے بادشاہوں کے بیٹے تھے اور ہم نے انہیں فلاں بن فلاں بادشاہ کے دور میں گم کیا تھا۔ پھر انہوں نے یہ تختی بادشاہ کے خزانہ میں رکھ دی تاکہ اس کی عظمت بڑھ جائے۔ وہ بادشاہ مر گیا، اور اس طرح زمانہ اپنی گردش میں رہا۔

وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر میں آیا، وہ اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے کہا گیا کہ اس شہر کے گیٹ پر ایک بت ہے، اسے سجدہ کر کے داخل ہونا ضروری ہے۔ حواری نے بت کو سجدہ کرنا ناپسند کیا۔ وہ شہر کے قریب ایک حمام میں آیا اور وہاں مزدوری کرنے لگا، اس نے حمام میں کام شروع کیا تو حمام کے مالک کو بہت برکت ہوئی۔ اور اس حواری کے کچھ اور شہری نوجوان دوست بن گئے، حواری انہیں زمین و آسمان کی خبریں سناتا حتیٰ کہ وہ بھی مومن بن گئے اور اس کی تصدیق کی، حواری نے حمام کے مالک سے یہ شرط لگائی تھی کہ رات کو میری اپنی مصروفیت ہوگی۔ رات کے وقت میرے اور میری نماز کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا۔ حالات اسی طرح گذرتے گئے، ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک عورت کو لے کر حمام میں آیا، حمامی نے اسے شرم دلائی اور کہا تو شہزادہ ہے اور اس عورت کے ساتھ حمام میں داخل ہو رہا ہے۔ شہزادہ کو شرم محسوس ہوئی تو وہ واپس لوٹ گیا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادہ ایک عورت لے کر آیا۔ حمامی نے پھر اسی طرح کہا تو شہزادے نے اسے گالیاں دیں اور اسے ڈانٹ دیا۔ اور حمامی کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ شہزادہ اور عورت حمام کے اندر ہی مر گئے۔ بادشاہ آیا تو اسے خبر ہوئی کہ حمام والے نے تیرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے۔ اس نے حمامی کو تلاش کیا لیکن وہ نہ مل سکا، وہ کہیں بھاگ کر چلا گیا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کے ساتھ کون رہتے تھے، اسے نوجوانوں کے نام بتائے گئے، ان نوجوانوں کو تلاش کیا گیا لیکن وہ شہر سے باہر نکل گئے تھے، راستہ میں ایک شخص کے پاس سے گذرے جو ان کی طرح ایمان لا چکا تھا وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑا، اس کے ساتھ ایک کتا تھا وہ بھی ساتھ چل نکلا رات کے وقت وہ سب غار میں داخل ہوئے۔ آپس میں کہنے لگے ہم رات یہاں گزاریں گے، صبح ہوگی تو پھر آئندہ کا پروگرام سوچیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر غنودگی طاری فرما دی۔ بادشاہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان کی تلاش میں نکلا، اسے پتہ چلا کہ وہ اس غار میں داخل ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے اہلکاروں میں سے ایک نے غار کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا تو اس پر ایسی دہشت اور رعب طاری ہوا کہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی دوسرا داخل نہ ہوا۔ بادشاہ کو ایک ساتھی نے کہا کہ آپ انہیں قتل ہی کرنا چاہتے ہیں؟ بادشاہ نے کہا ہاں۔ اس نے کہا پھر غار کے دروازے پر دیوار بنا دو اور انہیں یہیں چھوڑ دو، خود بخود بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ بادشاہ نے اس کی تجویز پر عمل کرتے

ہوئے غار کا منہ بند کروا دیا۔ وہب فرماتے ہیں غار کا منہ بند ہوئے زمانہ بیت گیا۔ ایک دفعہ ایک چرواہا کو غار کے قریب بارش آ گئی، اس نے سوچا اگر میں اس غار کا منہ کھول دوں اور اپنی بکریاں اس میں داخل کر دوں تو بارش سے بچ جائیں گی۔ اس نے کوشش سے غار کا منہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت دوسرے دن اصحاب کہف کی روحیں ان کے جسموں میں لوٹا دیں۔

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں پھر ان شہروں کا بادشاہ نیک نامی آدمی بنا جس کا نام بیدوسیس تھا، اس کی بادشاہی کو جب 68 سال گزر گئے تو لوگوں نے اس کے ملک میں تخریب کاری شروع کر دی۔ اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور قیامت کو حق جانتے تھے اور کچھ اس کا انکار کرتے تھے، نیک صالح بادشاہ کے دل پر یہ چیز بہت گراں گذری۔ وہ رونے لگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع و زاری کرنے لگا۔ اور بہت زیادہ پریشان ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ باطل کے پرستار زیادہ ہو رہے ہیں اور اہل حق پر دن بدن غالب آ رہے ہیں۔ منکرین حق کہتے ہیں کہ صرف یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد ارواح کو اٹھایا جائے گا۔ اجسام کو دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ بیدوسیس نے نیک اور حق کے علمبرداروں کو بلایا اور پوچھا تو وہ بھی قیامت کے منکر نکلے حتیٰ کہ وہ بھی لوگوں کو حق اور حواریوں کی ملت سے برگشتہ کرنے والے تھے۔ بادشاہ نے جب نیکوکاروں اور حق کے ٹھیکیداروں کی یہ کیفیت دیکھی تو وہ پریشان ہو کر اپنے گھر داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ فقیرانہ لباس پہن لیا اور راکھ بچھا کر بیٹھ گیا۔ اتنی آہ و فغاں تضرع و زاری میں زمانہ بیت گیا، وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا اے میرے پروردگار تو ان لوگوں کا اختلاف دیکھ رہا ہے، ان پر کوئی ایسی نشانی نازل فرما جو اس کے عقیدہ کے بطلان کو واضح کر دے۔ بیشک رحمٰن و رحیم اپنے بندوں کی ہلاکت کو پسند نہیں فرماتا۔ اس کی مراد یہ تھی کہ اصحاب کہف پر مطلع فرما دے اور لوگوں کے سامنے ان کی شان بیان کر دے اور ان پر حجت اور دلیل بنا دے کہ ان کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے اور اس میں ذرا برابر شک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے بیدوسیس کی دعا قبول فرمائی تا کہ اس پر اپنی نعمتوں کی تکمیل فرما دے اور بکھرے ہوئے اور تفرقہ میں مبتلا مؤمنین کو جمع فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کے اولیاس نامی شخص کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ اس غار کے منہ پر کھڑی دیوار کو گرا دے اور اس غار میں بکریوں کا باڑا بنا دے، اس نے دو غلام اجرت پر لیے جنہوں نے پتھر ہٹانے شروع کر دیے۔ انہوں نے غار کا منہ صاف کر دیا اور دروازہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس غار میں سوئے ہوئے لوگوں کو رعب اور دہشت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے چھپا دیا تھا جب دونوں مزدوروں نے دروازہ کھولا تو اللہ جو ساری قدرتوں اور قوتوں کا مالک ہے اس نے مردہ نوجوانوں کو زندہ کر دیا اور وہ غار میں خوش و خرم نورانی چہروں اور پاکیزہ نفوس کے ساتھ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے پر سلام کرنے لگے، یوں لگتا تھا گویا ابھی رات کی نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ انہوں نے اٹھ کر نماز ادا کی جس طرح وہ پہلے اٹھ کر نماز ادا کرتے تھے۔ ان کے چہروں اور رنگتوں میں کچھ فرق نہ آیا تھا بالکل اسی ہیئت پر تھے جس پر وہ سوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دقیانوس ہماری طلب اور تلاش میں ہوگا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو تملیخا سے کہا جو کھانے، پینے کا منتظم تھا کہ تم شہر جا کر خبر لے آؤ کہ لوگ بادشاہ کے پاس ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کا خیال یہ تھا کہ معمول کے مطابق سوئے ہیں۔ اور یہ ان کا خیال تھا کہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ سوئے ہیں حتیٰ کہ ایک دوسرے سے اپنے سونے کے وقت کے متعلق پوچھنے لگے۔ بعض نے کہا بھائی تم کتنا وقت سوئے؟ دوسروں نے کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ پھر کہنے لگے تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا وقت سوئے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سونے کا وقت کچھ زیادہ نہ تھا۔ تملیخا نے کہا کیا تم اس شہر میں نہیں ہو۔ اس کی مراد یہ تھی کہ آج تمہیں بلایا جائے گا، تمہیں بتوں کیلئے

جانور ذبح کرنے ہوں گے یا تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا۔ مکسلمینا نے کہا بھائیو! تمہارا مقصود و مدعا اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہے تو اللہ کے دشمن کے کہنے پر ایمان کی روشنی حاصل کرنے کے بعد کفر کا اندھیرا قبول نہ کرنا۔ پھر انہوں نے تملیخا کو کہا کہ شہر جاؤ اور جا کر سنو کہ لوگ ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں اور دقیانوس کے پاس ہمارے بارے کیسا تذکرہ ہو رہا ہے اور بڑی ہوشیاری سے جانا تا کہ کسی کو تمہاری خبر نہ ہو۔ اور ہمارے لیے کھانا بھی لے آنا لیکن پہلے کی نسبت زیادہ لانا کیونکہ ہم صبح سے بھوکے ہیں۔ تملیخا نے ویسا ہی کیا جیسا کہ پہلے کرتا تھا، یعنی اچھا لباس اتار دیا اور اجنبی کپڑے لیے۔ پھر اپنے خرچ کے پیسوں سے ایک سکہ لیا جس پر دقیانوس کی مہر لگی ہوئی تھی۔ تملیخا غار سے باہر آیا اور دروازے سے گذرا تو غار کے دروازہ سے پتھر ہٹے ہوئے تھے، اسے بڑا تعجب ہوا۔ پھر وہ آگے گذر گیا اور کوئی خاص توجہ نہ دی جب چھپتے چھپاتے شہر کے دروازہ پر پہنچا تا کہ کوئی اسے دیکھ کر پہچان نہ لے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ دقیانوس اور اس کی آل اولاد تین سو سال پہلے مر چکے ہیں۔ تملیخا گیٹ پر آیا تو دیکھا کہ اس پر ایسی علامات تھیں جو اہل ایمان کی ہوتی ہیں، جبکہ شہر میں اہل ایمان کا غلبہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہوا، وہ چھپ کر ادھر ادھر دیکھتا، کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھتا پھر اس نے یہ دروازہ چھوڑا اور دوسرے دروازے پر گیا وہاں بھی اسلامی علامات ونشانات پائے، وہ سوچتا شاید میں کسی دوسرے شہر میں آ گیا ہوں۔ اس نے کئی لوگوں کو دیکھا جو آپس میں محو گفتگو تھے لیکن یہ لوگ پہلے موجود نہ تھے۔ اب وہ حیران و ششدر چل رہا ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ پھر وہ اسی دروازہ کی طرف لوٹ گیا جس سے داخل ہوا تھا، وہ سوچتا یہ کیا ہوا ہے؟ لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کل شام تک مسلمان ان اسلامی شعائر کو پسند کرتے تھے لیکن انہیں ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن آج یہ سب کچھ ظاہر ہے، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا پھر کہتا خواب تو نہیں ہے۔ اس نے چادر لی اور اپنے سر پر ڈال دی۔ وہ سن رہا تھا کہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے نام کی قسمیں کھا رہے ہیں۔ اس کا خوف و ہراس بڑھ گیا، وہ حیران و پریشان شہر کی فصیل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، دل میں سوچا کہ کل تک تو عیسیٰ علیہ کا سوائے چند افراد کے نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ آج میں سن رہا ہوں کہ ہر شخص بغیر کسی خوف و ہچکچاہٹ کے عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے رہا ہے۔ کہنے لگا شاید کوئی دوسرا شہر ہے جس میں میں پہنچ چکا ہوں لیکن قسم بخدا مجھے تو اس شہر کے قریب کسی دوسرے شہر کا علم ہی نہیں، وہ حیران و پریشان کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک نوجوان سے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے جوان نے کہا اس کا نام افسوس ہے دل میں کہا شاید میرا دماغ اپنی جگہ پر نہیں ہے، مجھے اس شہر سے جلدی نکل جانا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ رسوائی ہو اور کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے پھر کچھ ہوش سنبھالا اور کہنے لگا اس سے قبل کہ لوگ مجھے پہچان لیں میں اگر نکل جاؤں تو زیادہ بہتر ہے، پھر وہ کھانا فروخت کرنے والوں کے قریب گیا، وہ سکہ نکالا جو اس کے پاس تھا۔ دوکاندار کو دیکر کھانا طلب کیا۔ دکاندار نے وہ سکہ اور اس کی مہر دیکھ کر تعجب کیا اور پھر اسے دوسرے ساتھی کی طرف پھینک دیا، اس نے بھی اسی طرح اسے غور سے دیکھا اور اگلے دوست کی طرف پھینک دیا، وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے اس شخص کے ہاتھ پرانے زمانہ کا کوئی خزانہ لگا ہے۔ جب تملیخا نے ان کی یہ باتیں سنی تو انتہائی خوفزدہ ہوا، جسم پر کپکپی طاری ہو گئی، تملیخا کا خیال تھا کہ یہ مجھے پہچان چکے ہیں اور مجھے بادشاہ دقیانوس کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے، وہ اسے پہچاننے کی کوشش کرتے لیکن پہچان نہ سکتے۔ تملیخا نے انتہائی پریشانی کی کیفیت میں کہا تم مجھ پر مہربانی کرو، تم نے میرے پیسے بھی لے لئے اور واپس نہیں کیے اور کھانا بھی تم رکھ لو مجھے ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا تو ہے کون اور تیرا کام اور معاملہ کیا ہے، قسم بخدا تجھے پہلے لوگوں کا کوئی خزانہ ملا ہے تو اسے ہم سے چھپانا چاہتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو اور ہمیں وہ خزانہ دکھاؤ اور ہمیں اس میں شریک

کرد۔ ہم تیرا راز کسی کو نہیں بتائیں گے اگر تو نے ہمیں اپنا وہ، خزانہ نہ دکھایا تو ہم تجھے بادشاہ کے پاس لے جائیں گے، ہم تجھے اس کے حوالہ کریں گے اور وہ تجھے قتل کرے گا۔ جب تملیخا نے ان کی یہ کرخت کلام سنی تو کہا جس بات کا مجھے خدشہ تھا وہ تو ہوگئی۔ لوگوں نے کہا اے جوان تو ہم سے اس خزانہ کو چھپا نہیں سکتا۔ تملیخا سوچ رہا تھا کہ اب انہیں کیا جواب دوں، خوف و ہراس طاری تھا اور کچھ بول نہیں رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بولتا نہیں ہے تو انہوں نے اس کی چادر اتار لی اور اسے اس کی گردن میں ڈال کر شہر کی گلیوں میں کھینچنے لگے، حتیٰ کہ سب لوگوں کو اس کی خبر ہوگئی۔ لوگوں نے پوچھا تو بتایا کہ اس شخص کے پاس خزانہ ہے۔ شہر کے بچے بوڑھے سب جمع ہوگئے، اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے اور کہتے یہ اس شہر کا باشندہ نہیں ہے ہم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا ہے، تملیخا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے، جب خوف زیادہ ہوا تو وہ ساکت و جامد کھڑا ہوگیا اسے یقین تھا کہ اس کا باپ اور اس کے بھائی اسی شہر میں ہیں اور اس کا تعلق شہر کے امراء سے ہے۔ جب وہ سنیں گے تو اسے چھڑا کر لے جائیں گے، وہ اسی انتظار میں تھا کہ ابھی میرے خاندان کا کوئی فرد آجائے گا اور ان ظالم ہاتھوں سے مجھے رہائی دلائے گا۔ پھر انہوں نے اسے اٹھایا اور شہر کے ارباب بست وکشاد کے پاس لے گئے۔ وہ شہر کے دونوں رئیس بہت نیک صلاح فطرت تھے۔ ایک کا نام اریوس اور دوسرے کا نام اشطیوس تھا۔ جب تملیخا کو ان سرداروں کے پاس لے جارہے تھے تو وہ سوچ رہا تھا کہ اب یہ مجھے دقیانوس کے پاس لے جارہے ہیں، وہ بیچارہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا اور لوگ اس سے اس طرح مذاق کرتے جیسے پاگل سے مذاق کیا جاتا ہے۔ تملیخا رونے لگا پھر اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر یہ دعا کی اے اللہ اے آسمان اور زمین کے معبود آج مجھے صبر کی دولت عطا فرما اور اپنی جناب سے روح کے ذریعے ظالم بادشاہ کے پاس میری مدد اور تائید فرما۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ میری اور میرے بھائیوں کے درمیان اب جدائی ہو جائے گی، کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر انہیں میری اس گرفتاری کا علم ہوتا تو ضرور میرے پاس پہنچتے اور ہم اکٹھے جابر بادشاہ کے سامنے جاتے اور ہم کبھی زندگی اور موت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے۔ تملیخا یہ ساری باتیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش واپسی پر اپنے ساتھیوں کو یہ سب باتیں بتا سکتا۔ لوگ اسے دو نیک آدمیوں اریوس اور اشطیوس کے پاس لے گئے۔ تملیخا نے جب یہ دیکھا کہ اسے دقیانوس کے پاس تو نہیں لے جایا گیا۔ اسے کچھ ہوش آیا، حواس درست ہوگئے اور رونا بھی بند ہوگیا۔

اریوس اور اشطیوس نے وہ سکہ لیا، اسے غور سے دیکھا اور تعجب کا اظہار کیا پھر ایک نے تملیخا سے پوچھا یہ خزانہ کہاں کا ہے؟ جو تجھے ملا ہے تملیخا نے کہا مجھے کوئی خزانہ نہیں ملا بلکہ یہ تو وہ سکہ ہے جو مجھے اپنے آباء سے ملا ہے اور اس پر مہر بھی اسی شہر کی ہے لیکن قسم بخدا مجھے اپنے بارے میں بھی سمجھ نہیں آرہی میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ایک نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا تملیخا میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ انہوں نے پوچھا تیرے باپ کا نام کیا ہے اور تجھے یہاں کوئی جانتا ہے۔ تملیخا نے اپنے باپ کا نام بتایا لیکن اس نام کا کوئی آدمی اس شہر میں نہ تھا۔ اور کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو اسے جانتا ہو۔ ایک سردار نے کہا تو جھوٹا ہے اور ہمیں سچی بات نہیں بتا رہا۔ تملیخا کچھ سمجھ نہیں رہا تھا کہ انہیں کیا کیوں اور کیسے تسلی دوں، اس نے خاموشی سے آنکھیں زمین کی طرف جھکا لیں۔ قریب بیٹھے ایک شخص نے کہا یہ تو پاگل ہے۔ بعض نے کہا مجنون نہیں ہے لیکن جان بوجھ کر پاگل بن رہا ہے تاکہ تم سے بھاگ جائے۔ ایک سردار نے کہا کیا تیرا یہ خیال ہے کہ ہم تجھے آزاد کر دیں گے اور تیری تصدیق کر دیں گے کہ یہ تجھے باپ کی میراث میں ملا ہے۔ اس پر تو مہر تین سو سال پہلے کی ہے، تو جوان لڑکا ہو کر ہمیں بھٹکانا چاہتا ہے اور ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔ ہمارے بال سفید ہیں اور تیرے ارد گرد شہر کے سردار اور نمبردار بیٹھے ہیں، اس شہر

کےخزانے ہمارے قبضہ میں ہیں، ہمارے پاس تو اس مہر کا کوئی درہم و دینار نہیں ہے، مجھے یہ خیال آ رہا ہے کہ تجھے قید کرنے کا حکم صادر کروں تا کہ تجھے سخت سزا دی جائے اور پھر تجھے اس وقت تک محبوس رکھوں جب تک کہ تو خزانے کا اعتراف نہ کرے۔ جب حکام نے یہ دھمکی دی تو تملیخا نے انہیں کہا تم پہلے مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ اگر وہ تم نے صحیح جواب دے دیا تو میں بھی تمہیں وہ بتا دوں گا جو میرے پاس ہے، انہوں نے کہا پوچھ کیا پوچھتا ہے ہم تجھ سے کچھ نہ چھپائیں گے۔ اس نے پوچھا دقیانوس بادشاہ کا کیا ہوا؟ اسرداروں نے کہا سطح زمین پر اس نام کا بادشاہ ہم نہیں جانتے۔ یہ بادشاہ تو بہت زمانہ پہلے ہلاک ہو چکا ہے، اس کے بعد کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ تملیخا نے کہا میں تبھی تو حیران ہوں کہ کوئی شخص بھی میری تصدیق نہیں کرے گا۔ ہم ایک جماعت تھے اور ایک دین کے پیروکار تھے اور وہ دین اسلام تھا۔ بادشاہ نے ہمیں بتوں کی عبادت اور ان کے لیے جانور ذبح کرنے پر مجبور کیا تو کل شام ہم اس سے بھاگ نکلے تھے۔ جب صبح ہم بیدار ہوئے تو میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانا لینے اور حالات کا جائزہ لینے کیلئے نکلا۔ بالکل ہم اسی طرح تھے جیسا تم دیکھ رہے ہو۔ تم میرے ساتھ بنجلوس پہاڑ کی غار کی طرف چلو میں تمہیں اپنے ساتھیوں سے ملاقات کراتا ہوں۔

اریوس نے جب تملیخا کی باتیں سنی تو کہا اے میری قوم شاید یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہو جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کے ہاتھوں ظاہر فرمائی ہو، تم بھی ہمارے ساتھ چلو تا کہ یہ شخص ہمیں اپنے ساتھیوں سے ملائے۔ تملیخا کے ساتھ اریوس، اشطیوس چل پڑے اور شہر کے بڑے چھوٹے سب نکل پڑے تا کہ اصحاب کہف کو دیکھیں۔ ادھر جب اصحاب کہف نے دیکھا کہ تملیخا نے کھانا لانے میں دیر لگا دی ہے تو کہنے لگے لگتا ہے وہ پکڑا گیا ہے اور اسے دقیانوس بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے اور خوف کر رہے تھے کہ انہیں آوازیں اور ان کی طرف آتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ان کا خیال تھا کہ ظالم دقیانوس نے ہمیں پکڑنے کیلئے اپنے سپاہیوں اور کارندوں کو بھیجا ہے۔ وہ نماز کیلئے کھڑے ہو گئے، ایک دوسرے پر سلام کہا اور وصیت فرمائی اور کہا ہم چلیں اور اپنے بھائی تملیخا کو لے آئیں۔ وہ اب ظالم دقیانوس کے سامنے منتظر ہو گا کہ ہم کب پہنچتے ہیں؟ یہ وہ ساری گفتگو غار کے اندر بیٹھ کر کر رہے تھے، انہوں نے اندر سے اریوس اور اس کے ساتھیوں کو غار کے دروازہ پر کھڑے ہوئے دیکھا، تملیخا اندر گیا تو رو رہا تھا۔ جب انہوں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رونے لگے پھر انہوں نے اس کی تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔ اس وقت وہ سب جان گئے کہ وہ اللہ کے حکم سے اتنا طویل زمانہ غار میں سوئے رہے اور پھر بیدار ہوئے تا کہ لوگوں کیلئے آیت (نشانی) الٰہی اور قیامت کی تصدیق کا باعث بن جائیں اور لوگوں کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے، اس کے وقوع میں ذرا شک نہیں ہے پھر تملیخا کے پیچھے اریوس غار میں داخل ہوا تو اس نے (نحاس) تانبے کا صندوق دیکھا جس پر چاندی کی مہر لگائی گئی تھی۔ وہ غار کے دروازہ پر رک گیا اور شہر کے ایک امیر کو بلایا، اس نے تابوت کھولا تو اس میں رصاص کی دو تختیاں تھیں جن پر لکھا ہوا تھا کہ مکسلمینا، مخشلمینا، تملیخا، مرطونس، بشرطونس، بیربوس، دینومس، بطنومونس نوجوان تھے جو دقیانوس بادشاہ سے بھاگ گئے تھے تا کہ وہ ظالم بادشاہ انہیں اپنے دین سے برگشتہ نہ کر دے اور وہ اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ جب ان کے ٹھکانے کا پتہ چلا تھا تو پتھروں سے غار کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ اور ہم نے یہ تحریر اس لیے لکھی ہے تا کہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کو ان کی تاریخ و سیرت معلوم ہو جو انہیں پالیں۔ اور جب وہ اس تحریر کو پڑھیں تو تعجب کریں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں۔

اس نعمت پر کہ اس نے اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دکھائی پھر ان نوجوانوں نے ان لوگوں کے بارے بتلایا جو

دقیانوس بادشاہ کی ظلم کی چکی میں پس گئے تھے۔ پھر اریوس اور اس کے ساتھیوں نے ایک خط بیدوسیس بادشاہ کی طرف لکھا کہ وہ جلدی جلدی پہنچ جائے تا کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دیکھ لے، جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے دربار شاہی میں ظاہر فرمایا ہے اور اس نشانی کو تمام جہانوں کیلئے نشانی بتایا ہے تا کہ ان کے لیے نور اور روشنی کا باعث بنے اور قیامت پر یقین کا سبب بنے، ان نو جوانوں کے پاس جلدی پہنچو جن کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کیا ہے حالانکہ یہ تین سوسال قبل مر چکے تھے۔ بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو اس کے حواس درست ہو گئے اور طبیعت سنبھل گئی اور کہا اے آسمانوں اور زمین کے مالک میں تیری تعریف کرتا ہوں اور تیری بندگی کرتا ہوں اور تجھے ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہوں، تو نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا اور رحم فرمایا۔ تو نے اس نور کو نہیں بجھایا جو تو نے میرے آباء واجداد کیلئے اور عبد صالح قسطیطینوس بادشاہ کیلئے روشن کیا تھا۔ جب ملک کے دوسرے باشندوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی سوار ہو کر بادشاہ کے ساتھ نکل پڑے حتی کہ افسوس شہر میں پہنچے اور پھر غار کی طرف چڑھے۔ جب نو جوانوں نے بیدوسیس کو دیکھا تو خوش ہوئے اور سجدے میں گر گئے۔ بیدوسیس ان کے سامنے کھڑا ہوا اور پھر دوزانو ہو کر انہیں گلے لگایا۔ وہ بھی حمد و ثنا کرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے پھر نو جوانوں نے بیدوسیس سے کہا ہم تجھے اللہ کے سپرد کرتے ہیں، تجھ پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ اللہ تعالیٰ تیری اور تیرے ملک کی حفاظت فرمائے، اور ہم تجھے جن وانس کے شر سے اللہ کی پناہ میں دیتے ہیں۔ بادشاہ ابھی وہیں کھڑا تھا کہ وہ اپنی خوابگاہوں کی طرف لوٹے اور سو گئے، اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمالیں۔ بادشاہ ان کی طرف گیا اور ان پر ان کے کپڑے ڈال دیے اور حکم دیا کہ ان میں سے ہر شخص کو سونے کے تابوت میں رکھا جائے، شام ہوئی تو بادشاہ سو گیا، خواب میں اسے اصحاب کہف کی زیارت ہوئی تو انہوں نے کہا ہم سونے اور چاندی سے پیدا نہیں کیے گئے ہم مٹی سے پیدا کیے گئے، ہیں اور مٹی کی طرف ہی جائیں گے۔ ہمیں غار کے اندر مٹی پر ہی چھوڑ دو، جس طرح ہم پہلے پڑے تھے حتی کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ یہاں سے اٹھائے۔ بادشاہ نے اس وقت شیشم کی لکڑی کے تابوت بنوانے کا حکم دیا۔ جب وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے رعب و دہشت کے ذریعے ان کو لوگوں سے محجوب کر دیا۔ رعب وخوف کی وجہ سے کوئی شخص اندر داخل ہونے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ بادشاہ نے غار کے منہ پر مسجد بنانے کا حکم دیا جس میں لوگ نماز ادا کریں اور ان کی یاد منانے کیلئے ایک اجتماع کیا اور پھر حکم دیا کہ ہر سال ان کی یاد میں ایک اجتماع کیا جائے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ تملیخا کو جب نیک بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے۔ تملیخا نے کہا میں اس شہر کا رہائشی ہوں اور اس نے بیان کیا کہ میں کل یا کچھ دنوں سے نکلا ہوں، اور بادشاہ نے پہلے سن رکھا تھا کہ ایک نو جوانوں کا گروہ پہلے زمانہ میں گم ہو گیا تھا اور ان کے اسماء خزانہ میں ایک تختی کے اوپر لکھی ہوئے ہیں، اس نے وہ تختی منگوائی اور ان اسماء کو دیکھا تو ان میں تملیخا کا نام بھی تھا پھر جب اس تختی سے دوسرے اسماء پڑھے تو تملیخا نے کہا یہ میرے ساتھی ہیں، بادشاہ نے جب یہ سنا تو وہ اور اس کے ساتھ قوم کے چند افراد سوار ہوئے اور غار کے دروازے پر پہنچ گئے، اس تملیخا نے کہا مجھے چھوڑو تا کہ میں اپنے ساتھیوں کو خوشخبری سناؤں۔ کیونکہ اگر وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے۔ تملیخا اندر داخل ہوا اور انہیں بشارت دی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمالیں اور ان کے نشانات کو بھی مٹا دیا۔ باقی لوگ ان کو نہ دیکھ سکے (1)۔ ارشاد الٰہی اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًاۙ ﴿۱۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60-156 (التجاریۃ)

''پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے۔ [1]''

[1] یعنی ہم نے ان کے کانوں پر ایسے پردے ڈال دیے جو آواز سننے سے مانع تھے یعنی ہم نے انہیں ایسی نیند سلا دیا کہ کوئی آواز انہیں بیدار نہیں کرسکتی تھی۔ یہاں مفعول کو حذف کیا گیا ہے جیسے بَنٰی عَلٰی اِمْرَاَتِہٖ کے جملہ میں مفعول حذف کیا گیا ہے۔ فی الکھف ضربنا کی ظرف ہے اور سنین کی صفت عدداً اس لئے لگائی تاکہ کثرت پر دلالت کرے کیونکہ تھوڑی مقدار کو شمار نہیں کیا جاتا۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

''پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کرسکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے۔ [1]''

[1] لنعلم کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہلے علم نہیں تھا اور اس واقعہ کے بعد علم ہوگا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارا علم اولاً جس کا تعلق اس واقعہ سے استقبالی تھا اب اس کا تعلق حالی بن جائے۔ اَمَدًا کا معنی غایت ہے۔ ای مبتدا ہے احصی فعل ماضی امدا مفعول اور لمالبثوا اس کا حال ہے اور ما مصدریہ ہے۔ ای میں استفہام کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے لنعلم میں تعلیق کی صورت ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ ان دو گرہوں میں سے کون زیادہ ان کے ٹھہرنے کے زمانہ کو صحیح ضبط میں لانے والا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لام زائدہ ہے اور ومالبثوا احصیٰ کا مفعول ہے۔ اور ما موصولہ ہے اور امدًا تمیز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں احصی الاحصاء سے زائدہ حروف کے حذف کے ساتھ اسم تفصیل ہے جیسے عرب کہتے ہیں احصیٰ للمال۔ وافلس من ابن المدلف اور امداً اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر یہ اسم خود دلالت کررہا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے۔ واضرب بالسیوف القوانسا

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًی ﴿۱۳﴾ۙ

''(اے حبیب) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک بیشک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ [1]''

[1] نباھم میں ھم ضمیر کا مرجع اصحاب کہف ہیں۔ فتیٰ کی جمع فتیۃ ہے جیسے صبی کی جمع صبیۃ ہے اس کا معنی نوجوان ہے، یعنی جب وہ اپنے رب پر ایمان لائے تو ہم نے حقیقی ایمان عطا فرمایا جو نفس کی فناء کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور اس ایمان کا مرتبہ اس ایمان مجازی سے کئی درجہ بلند ہوتا ہے جو اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے نفس سرکشی اور کفران نعمت کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔

وَّ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

''اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہوگئے [1] تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔ [2]''

لے یعنی ترک وطن، مال واولاد کی جدائی پر ہم نے انہیں صبر کی دولت سے نوازا اور اظہار حق کی جرات کا جذبہ عطا فرمایا اور ظالم حکمران دقیانوس کے غلط عقائد اور فاسد نظریات کو برسر محفل رد کرنے کی ہمت عطا فرمائی اور ساری جراتیں، یہ ساری ہمتیں فناء قلب کے بعد ہوتی ہیں۔ جس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی خشیت وہیبت کے سوا کسی کی محبت اور خوف نہیں ہوتا اور عاشق دلفگار کسی غیر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا اور لوگ اس محب صادق کی نظر میں بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

لے جب وہ دقیانوس کی کچہری میں کھڑے تھے اور ظالم وجابر دقیانوس بتوں کی عبادت نہ کرنے پر عتاب کر رہا تھا تو انہوں نے دوٹوک الفاظ میں فاتحانہ اور فاخرانہ لہجہ میں اعلان کیا (یہ بت جو تمہارے معماروں کے تراشے ہوئے ہیں ہماری تقدس مآب جبینوں کے سجدوں کے مستحق نہیں ہو سکتے) ہمارا پروردگار تو وہ ہے جو بلند و بالا آسمانوں اور گوناگوں نعمتوں سے مالا مال زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہیں مانتے۔ اگر ہم اس قدرتوں کے مالک کے علاوہ کسی غیر کو خدا مانیں تو ہم حق سے تجاوز کرنے والے اور حد وقدر سے دور بات کرنے والے ہونگے اور انتہائی ظالم ہونگے۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ﴿۱۵﴾

"یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا۔ کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو لے ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے ۲ے"

لے هولاء مبتداء ہے اور قومنا عطف بیان ہے هولاءکا۔ دو نہ کی ضمیر کا مرجع اللہ ہے الهةً سے مراد وہ بت اور مورتیاں ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اتخذوا کا جملہ هولاء مبتدا کی خبر ہے۔ اور جملہ خبر یہ انکار کے معنی میں ہے لولا بمعنی هلا ہے۔ علیهم سے مراد علی عبادتهم ہے مضاف حذف کیا گیا ہے۔ سلطان بین، ظاہر دلیل یعنی یہ ہماری احمق قوم جو بتوں کو خدا مانتی ہے کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے کیونکہ عقیدہ ہمیشہ دلیل اور برھان پر مبنی ہوتا ہے، عقائد میں ظن اور تقلید کی اتباع جائز نہیں ہے۔ اس جملہ میں کنایۃً منہ بند کرنا مقصود ہے کیونکہ بتوں کی عبادت پر دلیل قائم کرنا محال ہے۔

۲ے اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کا کسی مخلوق کو شریک ٹھہراتا ہے اور اس کا بیٹا ہونے کا قول کرتا ہے۔ بہتان لگانا کسی پر بھی ایک ظلم اور ناقابل معافی جرم ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر بہتان لگانے والا کتنا ظالم اور بڑا مجرم ہوگا۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَی الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

"اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا لے تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لیے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لیے تمہارے اس کام میں آسانیاں ۲ے"

لے هم ضمیر کا مرجع قوم ہے اور وَمَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ کا عطف هم ضمیر منصوب پر ہے، یعنی جب قوم اور ان کے معبودوں سے تنہائی کر لی ہے۔ تو غار کو اپنا مسکن اور رہائش گاہ بنالو تاکہ کفار تمہارے پڑوس میں بھی نہ ہوں۔ ان کی ساری قوم اللہ کی بھی عبادت کرتی تھی اور

بتوں کے سامنے بھی سربسجود ہوتی تھی جس طرح سارے مشرک کرتے ہیں۔ وما یعبدون میں ما مصدریہ بھی ہوسکتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جب تم نے قوم اور اللہ کی عبادت کے سوا ان کی عبادت سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا کہ ما نافیہ ہو اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان نوجوانوں کے توحید پر ثابت قدم رہنے کی خبر دے رہے ہوں اور معترض کلام ہو جو اذ اور اس کے جواب کے درمیان ان کے اعتزال اور جدائی کے تحقق پر دلالت کرنے کیلئے ذکر کی گئی ہو۔

۲۔ کفار سے الگ غار کو اپنا مسکن بناؤ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے لیے اپنے غیب کے خزانہ سے رزق کے دروازے کھول دے گا اور دنیا و آخرت میں تمہارے اس ایمان اور اظہار حق اور ترک وطن کے عمل کی بناء پر تم پر اپنی وسیع عنایات فرمائے گا اور تمہارے لیے ہر قدم پر آسانیاں پیدا فرمائے گا، مرفقا میم کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ اسم آلہ ہے، یعنی جس چیز سے نفع اور فائدہ اٹھایا جائے، اللہ کے فضل پر کامل یقین کی بناء پر انہوں نے یہ پختہ ارادہ کیا۔ ابوجعفر، نافع اور ابن عامر نے میم کے فتحہ اور فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ مصدر ہے اور شاذ اوزان میں سے ہے جیسے مرجع المحیض قیاس تو یہ تھا کہ بفتحہ عین ہوتا۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

"اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے اور وہ (سورہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں ۱۔ (سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے ۲۔ (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے ۳۔ اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائیگا اس کے لیے کوئی مددگار (اور) راہنما ۴۔"

۱۔ وَتَرَى میں خطاب رسول ﷺ کو ہے یا ہر شخص کو ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے تزور یعنی زاء کے سکون اور راء کے تشدید کے ساتھ تحمر کے وزن پر باب افعلال سے پڑھا ہے اور کوفیوں نے تاء کے فتحہ۔ زاء مخففہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے زاء مشددہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے، اصل میں تتزاور تھا۔ کوفیوں نے ایک تاء کو حذف کیا اور باقی قراء نے تاء کو زاء میں ادغام کردیا اور یہ سارے صیغے زور سے مشتق ہیں جس کا معنی مائل ہونا ہے۔ یعنی سورج ہٹ کر گزرتا ہے، ان پر اس کی شعاعیں نہیں پڑتیں۔ اور جب غروب ہوتا ہے تو بھی ان سے ہٹ کر گزرتا ہے اور ایک کھلی، وسیع غار کے وسط میں سوئے پڑے ہیں جہاں انہیں ہوا کی تازگی اور راحت تو پہنچتی ہے لیکن غار کی تکلیف یا سورج کی گرمی کا اثر وہاں نہیں پہنچتا۔

ابن قتیبہ فرماتے ہیں ان کی غار بنات النعش کے سامنے تھی (1) پس اس طرح ہے کہ غار کے سامنے قریب ترین مشرق ومغرب راس سرطان کا مشرق اور مغرب ہے، جب سورج کا مدار اور راس سرطان کا مدار ایک ہوتا ہے تو سورج راس سرطان کی دائیں جانب طلوع ہوتا ہے، یہ وہ جانب ہے جو مغرب سے متصل ہے اور بائیں جانب سرطان کے مقابل غروب ہوتا ہے۔ پس سورج کی شعاعیں غار کی دونوں طرفوں پر پڑتی تھیں جس کی وجہ سے عفونت اور بدبو کم ہوتی تھی، ہوا معتدل رہتی تھی اور ان پاکبازوں پر سورج کی شعاعیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریۃ)

نہ پڑتی تھیں تا کہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور ان کی نیند میں خلل نہ آئے اور ان کے کپڑے بھی بوسیدہ نہ ہوں۔

بعض علماء فرماتے ہیں ابن قتیبہ کا یہ قول غلط ہے کیونکہ غار اگر بنات النعش کی طرف بھی ہو اور اس وجہ سے ان پر دھوپ نہ بھی پڑتی ہو۔ تب بھی یہ درست نہیں ہے(1) کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعہ سے سورج کو ان سے پھیر دیا تھا اور سورج ان کے درمیان خود ہی یہ بندوبست فرمایا تھا کہ ان پر سورج کی کرنیں نہ پڑتی تھیں۔ آئندہ ارشاد بھی قدرت الٰہیہ ہونے کی دلیل ہے۔

۲؎ یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گری اور کرشمہ سازی ہے جس سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے، یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے، کہ ان توحید کے پرستاروں کی شان، ان کا غار کو پناہ گاہ بنانا اور آپ کا ان کے واقعہ کو بیان کرنا یہ سب اللہ تعالیٰ نشانیوں میں سے ہیں۔

۳؎ نافع اور ابو عمرو نے وصل کی صورت میں المهتدی یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء وصل و وقف دونوں صورتوں میں یاء کو حذف کرتے ہیں۔ مهتد سے مراد وہ ہے جسے دنیا و آخرت دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی مل جائے۔ اور اس جملہ سے مراد یا تو اصحاب کہف کی تعریف و ثناء ہے یا اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ اس قسم کی ان گنت آیات موجود ہیں لیکن ان سے فائدہ اور بصیرت اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ ان آیات میں غور و فکر کی توفیق مرحمت فرماتا ہے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کا ذوق بخشتا ہے۔

۵؎ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اور اس کی راہنمائی نہیں فرماتا اس کا کوئی مرشد و راہنما تجھے نہیں ملے گا۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

"(اور اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سورہے ہیں ۱؎ اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور (کبھی) بائیں جانب ۲؎ اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو وان کی دہلیز پر ۳؎ اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے ۴؎"

۱؎ ایقاظ جمع ہے یقظ کی چونکہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا کثرت سے کروٹیں بدلتے تھے اس لئے تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سورہے ہیں۔ رقود جمع ہے راقد کی جیسے قاعد کی جمع قعود آئی ہے۔

۲؎ ہم ان کے ارادہ کے بغیر ان کے سونے کی حالت میں ان کی کروٹیں بدلتے ہیں کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ سال میں ایک مرتبہ کروٹ بدلتے تھے تا کہ ان کے گوشت کو مٹی نہ کھا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دسویں محرم کا دن ان کی کروٹ بدلنے کا دن تھا۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں ہر سال ایک کروٹ بدلتے تھے(2)۔

۳؎ یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے، اسی وجہ سے اسم فاعل عامل بھی ہے لیکن کوفی علماء اسم فاعل کو مطلقاً عمل کراتے ہیں۔ مجاہد اور ضحاک فرماتے ہیں وصید کا معنی غار کا صحن ہے اور عطا فرماتے ہیں دہلیز ہے۔ سدی فرماتے ہیں دروازہ ہے۔ ابن عباس سے عکرمہ نے ایک روایت یہی نقل کی ہے۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں وہ کتوں کی جنس سے ایک کتا تھا(3) ابن جریج سے مروی ہے کہ وہ شیر تھا، شیر کو بھی کتا کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کے حق میں بددعا فرمائی تو یہ الفاظ فرمائے اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْهِ کَلْبًا مِنْ کِلَابِکَ تو عتبہ کو شیر نے پھاڑ ڈالا تھا۔ پہلا قول معروف ہے کہ وہ عام کتا ہی تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ چتکبرا کتا تھا۔ آپ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قلطی سے بڑا اور کردی (کتے) سے چھوٹا تھا۔ مقاتل کہتے ہیں وہ زرد رنگ کا تھا۔ قرطبی فرماتے ہیں وہ سرخی مائل شدید زرد رنگ کا تھا۔ کلبی کہتے ہیں اس کا رنگ خلیج کی طرح تھا بعض فرماتے ہیں۔پتھر کی طرح تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا نام قطمیر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کا نام زبان تھا۔ اوزاعی نے اس کا نام تقود، سعدی نے ثور، کعب نے صہبا ذکر کیا ہے، خالد بن معدان فرماتے ہیں جنت میں اصحاب کہف کے کتے اور بلغام کے گدھے کے علاوہ کوئی جانور نہ ہوگا، سدی فرماتے ہیں اصحاب کہف جب کروٹ بدلتے تو کتا بھی ان کے ساتھ کروٹ بدلتا، جب وہ دائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا اپنا دایاں کان موڑ کر اس پر سو جاتا اور جب وہ بائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا اپنا بایاں کان موڑ کر اس پر سو جاتا(1)۔

یہ اطلعت کا خطاب محمد ﷺ کو ہے فرارا لولیت کا مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ اس کے مصدر کی ایک نوع ہے یا مفعول لہ کے اعتبار سے منصوب ہے یا حال کی بنا پر منصوب ہے ملئت کو نافع اور ابن کثیر نے لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ رعب کا معنی خوف ہے۔ کلبی لکھتے ہیں دل خوف سے اس لئے بھر جائے گا کیونکہ ان کی آنکھیں اس بیدار شخص کی طرح کھلی ہوتی ہیں جو بات کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور بعض نے خوف کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کے بال لمبے اور ناخن بہت طویل تھے اور بغیر کسی حس اور شعور کے پہلو بدل رہے تھے۔ بعض علماء نے رعب اور ہیبت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سارے ماحول کو اتنا بھیانک بنا دیا تھا کہ کوئی شخص اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ صحیح اور مختار وجہ یہی ہے۔ اس توجیہ پر سعید بن جبیر کی روایت دلالت کرتی ہے جو انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں ہم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں روم کی طرف غزوہ مضیق پر گئے تو ہمارا گذر اس غار سے ہوا جس میں اصحاب کہف تھے۔ امیر معاویہ نے فرمایا اگر ہمارے لیے ان لوگوں سے پردہ ہٹایا جاتا تو ہم انہیں دیکھ لیتے۔ ابن عباس نے فرمایا جب اسے دیکھنے سے روکا گیا جو آپ سے بہتر تھے (آپ کس باغ کی مولی ہیں) انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا۔ (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو۔) حضرت امیر معاویہ نے ان کی بات نہ سنی اور کچھ افراد کو بھیجا کہ تم جاکر دیکھو۔ جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی ہوا چلائی جس نے انہیں جلا دیا(2)۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾

"اور اسی طرح ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ وہ ایک دوسرے سے آپس میں پوچھیں کہنے لگا ایک کہنے والا ان سے کہ تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے ہو؟ بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دوسروں نے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے جتنی مدت تم ٹھہرے ہو پس بھیجو کسی کو اپنے ساتھیوں سے اپنے ایک سکہ کے ساتھ شہر کی طرف پس وہ دیکھے کہ کس کے ہاں عمدہ یا کیزہ کھانا ملتا ہے پس وہ لے آئے تمہارے پاس کھانا وہاں سے اسے چاہیے کہ وہ خوش خلقی سے کام لے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 167

اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے ۱؎"

۱؎ ہم نے انہیں اتنا طویل زمانہ غار میں سلائے رکھا اور ان کے جسموں کو بوسیدہ ہونے سے بھی بچائے رکھا۔ یہ اتنی طویل نیند جو موت کے مشابہ تھی ہماری قدرت کی نشانیوں سے ایک نشانی تھی اور انہیں بیدار کرنے سے مقصود یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے نیند کی مدت کا سوال کریں، اپنے احوال اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا عرفان حاصل کریں پس اس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین بڑھ جائے گا اور وہ قیامت کے وقوع پر اسی منظر سے دلیل پکڑیں گے اور اللہ کے انعام پر شکر ادا کریں گے۔ اس صورت میں لام لام علت ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ لام عاقبت ہے کیونکہ سوال کرنے کی خاطر تو انہیں بیدار نہیں کیا گیا تھا(1)۔ مکسلمینا نے پوچھا تم کتنی مدت سوئے رہے، چونکہ وہ معمول سے کچھ زیادہ سو گئے تھے اس لئے پوچھ رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی نمازیں جو فوت ہوگئیں تھی ان کی تعداد شمار کرنے کیلئے پوچھ رہے تھے۔ ہم جب غار میں داخل ہوئے تھے تو صبح کا وقت تھا اور جب بیدار ہوئے تو شام کا وقت تھا یہ مدت پورا ایک دن بنتی ہے۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو سورج کا کچھ حصہ باقی تھا تو انہوں نے کہا دن کا کچھ حصہ ہم سوئے رہے۔ یہ جواب ظن غالب پر مبنی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ظن غالب کے مطابق بات کرنا جائز ہے اور پھر جب انہوں نے اپنے بالوں اور ناخنوں کو دیکھا تو سوچنے لگے کہ ہم تو طویل وقت سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے رئیس مکسلمینا نے جب یہ اختلاف سنا تو کہا اختلاف کو چھوڑو تملیخا کو بھیجو وہ یہ سکہ لے جائے اور شہر میں دیکھے کہ پاکیزہ کھانا کسی کے پاس ہے۔ المدینہ سے مراد بعض کے نزدیک طرطوس کا شہر ہے اور زمانہ جاہلیت میں اس کا نام افسوس تھا پھر اسلام آیا تو اس کا نام طرطوس رکھا گیا۔ ان کا سکے ساتھ لے جانا دلیل ہے کہ زاد راہ ساتھ لینا متوکلین کی رائے ہے ورقکم کو ابو عمر، حمزہ اور ابو بکر نے راء کے سکوں کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے، مراد چاندی کا سکہ ہے جس پر مہر ہو یا نہ ہو، پاکیزہ کھانے سے مراد پاک اور حلال کھانا ہے جو غصب یا حرام طریقہ سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں تملیخا کو انہوں نے کہا کہ یہ تلاش کرنا کہ اللہ کا نام لے کر جس نے ذبح کیا ہو اس سے گوشت خریدنا۔ کیونکہ شہر میں ایماندار لوگ موجود تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔ ضحاک نے ازکی کا معنی اطیب (پاکیزہ) مقاتل بن حبان نے اجود، عکرمہ نے اکثر (زیادہ) لکھا ہے، زکوٰۃ کا اصل معنی زیادتی ہے اور بعض علماء نے اس کا معنی سستا کھانا کیا ہے(2) فرمایا ولیتلطف کا معنی یہ ہے کہ وہ معاملہ میں خوش خلقی کا مظاہرہ کرے تاکہ اسے دھوکا نہ دیا جائے یا لطیف طریقہ اپنائے تاکہ پہچانا نہ جائے اور کوئی ایسا عمل نہ کرے جو ہماری پہچان کا باعث بنے۔ اشعار کے فعل سے تعبیر اس لئے فرمایا کیونکہ وہ فعل اشعار کا سبب بنے گا۔

إِنَّهُمْ إِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾

"وہ لوگ اگر آگاہ ہو گئے تم پر تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں (جبراً) لوٹا دیں گے اپنے (جھوٹے) مذہب میں اور (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پا سکو گے ۱؎"

۱؎ یہاں یعیدوا اجوعود سے مشتق ہے صیرورۃ کے معنی میں ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ اپنے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 167 (التجاریۃ)　　2۔ ایضاً

بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝

''اور اسی طرح بستی والوں کو ہم نے اچانک آگاہ کر دیا ان (اصحاب کہف) پر تا کہ وہ جان لیں بلا شبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور بلا شبہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔[1] جب وہ بستی والے جھگڑ رہے تھے آپس میں ان کے معاملہ میں تو بعض نے کہا کہ (بطور یادگار) تعمیر کرو ان کے غار پر کوئی عمارت ان کا رب ان کے احوال سے خوب واقف ہے کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر کہ بخدا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے۔[2]''

[1] یعنی جس طرح ہم نے ان کو اتنی طویل مدت سلایا بھی اور پھر بیدار کیا تا کہ بصیرت میں اضافہ ہو تو اسی طرح ہم نے لوگوں کو اصحاب کہف پر مطلع کر دیا۔ عثر علی الشیٔ کا معنی ہے کسی چیز کو اچانک پالینا۔ اس اطلاع کا مقصود یہ تھا کہ وہ لوگ جو ان کے حالات سے باخبر ہوں انہیں یقین ہو جائے کہ مرنے کے بعد اٹھنے کا وعدہ الٰہی حق ہے کیونکہ سونا اور جاگنا بالکل مرنے اور اٹھنے کی طرح ہے۔ اور وہ قیامت جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس کے امکان میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کیونکہ جس نے ان کی روحیں نکالیں اور تین سو سال تک انہیں روکے رکھا اور پھر جسموں کو پھٹنے اور بکھرنے سے محفوظ رکھا پھر تین سو سال بعد ان روحوں کو جسموں میں لوٹا دیا، ایسی ذات یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمام لوگوں کو مار ڈالے پھر ان کی روحوں کو جس وقت تک چاہے قبضہ میں رکھے اور پھر قیامت کے روز ان روحوں کو جسموں کی طرف لوٹا دے۔

[2] اذ یہ اعثرنا کی ظرف ہے، یعنی جب لوگ جھگڑ رہے تھے تو اس وقت ہم نے مطلع کیا۔ وہ اپنے دین کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں وہ دوبارہ اٹھنے کے بارے جھگڑ رہے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ اٹھنا صرف روحانی ہوگا، جسمانی نہ ہوگی۔ مسلمان کہتے روح اور بدن دونوں کو اٹھنا ہوگا پس اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو بیدار کر کے انہیں دکھا دیا کہ جسم اور روح دونوں کیلئے اٹھنا ہوگا(1)۔ یا وہ نوجوانوں کے متعلق جھگڑ رہے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ طبعی موت عطا فرمائی تھی۔ بعض نے کہا اب بالکل مر چکے، ہیں بعض نے کہا پہلے کی طرح سوئے ہوئے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ عمارت بنانے کے متعلق جھگڑ رہے تھے۔ مسلمان کہتے کہ ہم ان کے قریب مسجد بنائیں گے(2) کیونکہ وہ ہمارے دین کے پیروکار تھے اور مسلمان ہو کر فوت ہوئے ہیں۔ مشرکوں نے کہا ہم ان پر ایک عمارت بنائیں گے جس میں لوگ رہیں گے اور اس کو ایک دیہات کی صورت بنالیں گے یا انہوں نے کہا کہ ہم غار کے دروازے پر ایک عمارت بنائیں گے تا کہ لوگ اندر نہ جاسکیں، ان کی مٹی کی حفاظت کا حق ہمیں حاصل ہے کیونکہ وہ ہمارے نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جن کو دولت وثروت، حکومت وسیاست کی وجہ سے غلبہ تھا یعنی بیدوسیس اور اس کے ساتھیوں نے کہا ہم ان کے قریب مسجد تعمیر کریں گے جس میں مسلمان نماز پڑھیں گے اور ان بزرگوں کی برکت حاصل کریں گے رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ اللہ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے اور اس معاملہ میں زیادہ غور وخوض کرنے والوں کا رد فرمایا جا رہا ہے کیونکہ دونوں فریق (مشرک اور مسلمان) اصحاب کہف کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ کفر اور کفار سے بری تھے اور وہ عام مؤمنین میں سے بھی نہ تھے (بلکہ اولیاء کاملین میں سے تھے) اگرچہ ایمانداروں میں سے تھے کیونکہ صوفی متصل بھی ہوتا ہے اور جدا بھی۔ اس کی مولانا روم نے کتنی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

ہر کسے در ظن خود شد یار من　　　واز درون من نجست اسرار من

بعض علماء فرماتے ہیں ربهم اعلم بهم جھگڑنے والوں کا کلام ہے گویا انہوں نے ان کے معاملہ کا ذکر کیا، ان کے نسب پر کلام کی، ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریہ)　　2۔ ایضاً

کے احوال پر بحث کی اور ان کے ٹھہرنے کی موت پر گفتگو کی لیکن جب کوئی حقیقی اور حتمی رائے قائم نہ کر سکے تو کہنے لگے **ربهم اعلم بهم**۔ مسئلہ۔ یہ آیت کریمہ اولیاء کرام کے مزارات کے قریب ان سے تبرک حاصل کرنے کیلئے مسجد بنانے کے جواز پر دلیل ہے، جبکہ شیخ استاد محمد فاخر محدث رحمۃ اللہ علیہ مزارات کے قریب مسجد بنانے کو مکروہ جانتے تھے اور کراہیت کی پہلی دلیل امام مسلم کی روایت کو بناتے تھے جو ابی الہیاج الاسدی سے مروی ہے، فرماتے ہیں مجھے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کیا میں تجھے اس کام کیلئے نہ بھیجوں جس کیلئے مجھے رسول ﷺ نے بھیجا تھا کہ جو بھی بت دیکھو اسے مٹا دو اور جو قبر اٹھی ہوئی دیکھو اسے برابر کر دو۔ اسی طرح دوسری دلیل امام مسلم کی ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پکی قبر بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ شیخ کی تیسری دلیل شیخین کی روایت ہے جو حضرت عائشہ اور ابن عباس نے روایت کی ہے، فرماتے ہیں جب رسول ﷺ کو شدید مرض لاحق ہوئی تو آپ محمد ﷺ نے اپنے چہرے پر چادر ڈالی اور پھر جب گھٹن محسوس ہوئی تو چادر چہرے سے ہٹا دی اور اس حالت میں یہ فرما رہے تھے معاملہ اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہود و نصاریٰ پر لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنایا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ جیسا عمل کرنے سے ڈرایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ احادیث پکی قبر بنانے، قبر پر عمارت بنانے اور اونچی قبریں بنانے کی کراہت پر دلالت کرتی ہیں۔ مزارات کے قریب مسجد بنانے کی کراہیت پر دلالت نہیں کرتی ہیں اور **اتخذوا قبور انبیاء هم مساجد** کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قبروں کی طرف سجدے کرتے تھے۔ حضرت ابو مرثد الغنوی کی حدیث میں اس مفہوم کی صراحت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہ قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ ان کی طرف نماز پڑھو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۫ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

"کچھ لوگ کہیں گے کہ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا کچھ کہیں گے وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے [1] اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا [2] آپ فرمائیے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی [3] سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے [4]"

[1] نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ان اصحاب کہف کے متعلق جھگڑنے والے بعض کہتے کہ وہ تین تھے اور کتا ان کو چار بنانے والا تھا۔ ثلاثة مبتدا محذوف هم کی خبر ہے اور رابعهم كلبهم کا جملہ ثلاثة کی صفت ہے۔ بعد والی تراکیب بھی اسی طرح ہیں۔ **يقولون** سے پہلے سین ذکر نہیں فرمایا کیونکہ معطوف علیہ پر سین کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں نجران کے عیسائیوں میں سے سید اور عاقب اور ان کے ساتھی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ اصحاب کہف کا ذکر چل پڑا۔ السید جس کا تعلق یعقوبیہ فرقہ سے تھا اس نے کہا تین تھے اور چوتھا کتا تھا۔ العاقب جس کا تعلق نسطوریہ فرقہ سے تھا اس نے کہا پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا(1)۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریہ)

گروہوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا یہ محض قیاس آرائیاں اور تخمینے ہیں بن دیکھے۔ رجماً پر نصب فعل مقدر کے مصدر کی بناء پر ہے، یعنی یرجمون رجماً یعنی ان کے پاس علمی دلیل نہیں ہے۔ یہ فقط ظن وتخمین سے کام لے رہے ہیں، غیب کی خبر دے رہے ہیں یا رجماً علت کی بناء منصوب ہے اور یقولون کے متعلق ہے اور رجماً کا معنی ظناً ہے۔ ظن کی جگہ رجم اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ عرب اکثر ظن کی جگہ رجم استعمال کرتے تھے حتی کہ ان کے نزدیک رجم اور ظن میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ تفسیر مدارک میں اسی طرح ہے، یعنی دونوں فریقوں کے پاس کوئی مستند علم نہیں ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔

۲۔ اور مسلمان حضور ﷺ کے بتانے سے کہتے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ ثامنھم کا جملہ سبعۃ کی صفت ہے لیکن درمیان میں واؤ ذکر کی گئی ہے گویا اسے اس جملہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو معرفہ اسم سے حال واقع ہوتا ہے اور اس کی وجہ صفت سے موصوف کے تعلق کی تاکید اور موصوف کے صفت سے متصف ہونے پر دلالت کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آٹھویں چیز سے پہلے ذکر کی جانے والی واؤ ہے مثلاً عرب جب گنتی کرتے ہیں تو واحد اثنان ثلاثۃ اربعۃ خمسۃ ستۃ سبعہ وثمانیۃ کیونکہ ان کے نزدیک آٹھ ایک عقد ہے جس طرح آج کل ہمارے نزدیک (10) ایک عقد ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی آٹھویں صفت سے پہلے واؤ ذکر کی گئی ہے اَلتَّآىٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ ...... وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اسی طرح ازواج مطہرات کے بارے فرمایا طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا (آٹھویں صفت سے پہلے یہاں بھی واؤ ذکر فرمائی ہے)۔

۳۔ قل ربی میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اے محبوب تم کہو کہ میرا رب ان اصحاب کہف کی تعداد کو خوب جانتا ہے، ان کی صحیح تعداد لوگوں میں سے بہت کم جانتے ہیں وہ قلیل یا تو نصاری میں سے تھے یا ان لوگوں میں سے تھے جو وہ مسلمان تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں۔ قلیل لوگوں میں میں بھی شامل ہوں وہ اصحاب کہف سات تھے (1)۔ ابن جریر اور فریابی نے ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن مسعود کا قول ابن ابی حاتم نے اسی طرح روایت کیا ہے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مذکورہ تین اقوال کے حصر کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک طائفہ کیلئے علم کو ثابت فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر چوتھے قول کو ذکر نہ کرنا اس کے عدم (نہ ہونے) کی دلیل ہے کیونکہ اصل نفی ہے (2) اور پہلے دو قولوں کو رجما بالغیب فرما کر رد کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق اور سچ تیسرا قول ہے (کیونکہ اس کے ساتھ رجما بالغیب نہیں فرمایا) امام بغوی نے ابن عباس سے ان کے یہ نام روایت کیے ہیں مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، سنونس، ساری نونس، ذونواس۔ کعسططیونس یہ آخری چرواہا تھا (3)۔ یہ نام طبرانی نے المعجم الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیے ہیں۔ علامہ ابن حجر شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ان ناموں کے تلفظ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ وثوق اور اعتماد کسی تلفظ پر نہیں ہے۔

۴۔ پیارے حبیب نوجوانوں کی شان اور ان کی تعداد کے متعلق بحث نہ کرو مگر سرسری گفتگو کرو جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ ان کے متعلق اتنی گہرائی اور تعمق سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اہل کتاب سے بھی ان کے متعلق مت پوچھو جتنا ہم نے وحی کیا ہے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان اہل کتاب کے پاس اصحاب کہف کا علم ہے بھی نہیں۔ اس لیے ایک سوال کرنے والے کی طرح ان سے سوال نہ کرو۔ کیونکہ ان کے احوال کے متعلق علم کی زیادتی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور نہ تم ایک ہٹ دھرم کی طرح سوال کرو جس کا ارادہ مسئول عنہ کو رسوا کرنا اور اس کے پاس جو علم ہے اسے حقیر ظاہر کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس نیت سے کسی سے سوال کرنا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 393 (العلمیۃ)　　2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 390 (فراس)　　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریۃ)

مکارم اخلاق کے منافی ہے۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

''ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنیوالا ہوں کل مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے ۲ اور یاد کرا اپنے رب کو جب تو بھول جائے ۲ (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھا دے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ ۳''

۱۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کام کے کرنے کی قسم اٹھائی لیکن چالیس دن گزر گئے (اور کام نہ کر سکے) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس (کہف: 23-24) کا ارشاد نازل فرمایا (1)۔ ابن المنذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ یہود نے قریش سے کہا کہ محمد ﷺ سے روح، اصحاب کہف اور ذی القرنین کے متعلق پوچھو انہوں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں کل تمہیں بتاؤں گا لیکن آپ نے ان شاء اللہ ساتھ نہ کہا، وحی کا سلسلہ پندرہ دن تک منقطع ہو گیا۔ حتی کہ آپ پر یہ کیفیت بہت تکلیف دہ تھی۔ قریش کو بھی جھٹلانے کا موقع مل گیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، ابن جریر کے حوالہ سے سورت کے آغاز میں ایسی ہی روایت نقل ہو چکی ہے اسی طرح ہم نے سورۂ بنی اسرائیل میں یسئلونک عن الروح کی تفسیر کے تحت بھی ذکر کیا ہے۔ یہ استثناء نہی سے استثناء ہے، یعنی کسی حال میں بھی مشیت الٰہی سے کام کو معلق کیے بغیر کسی کام کا پختہ عزم نہ کر دیا کسی وقت میں کسی کام کے کرنے کے متعلق کچھ نہ کہو مگر ساتھ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کا اذن ہوا تو ایسا کروں گا۔

استثناء کا تعلق فاعل سے نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ہو تو معنی یہ ہوگا کہ میں ایسا کرنے والا ہوں مگر مشیت الٰہی میرے کام میں آڑے ہے۔ اس معنی کی نہی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے اس آیت کریمہ میں اللہ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کو یہ ادب سکھایا ہے (کہ جب تک کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق نہ کر لیں اس کام پر پختہ عزم نہ کریں)۔

۲۔ تسبیح اور استغفار کے ساتھ اپنے پروردگار کو یاد کر جب تو بھول جائے۔ اس جملہ میں ہر عزم میں ان شاء اللہ کہنے کے اہتمام پر تاکید اور برانگیختہ کرنا ہے یا یہ معنی کہ جب تجھ سے کوئی امر الٰہی رہ جائے تو اپنے رب کریم اور اس کے عقاب و عتاب کو یاد کرتا کہ تدارک پر یہ یاد تیری معاون ثابت ہو یا یہ معنی کہ جب تجھے کوئی چیز بھول جائے تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر، وہ تجھے بھولی ہوئی چیز یاد دلا دے گا۔ عکرمہ فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تو غصہ میں ہو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر۔ وہب فرماتے ہیں انجیل میں ہے کہ اے ابن آدم غصہ کے وقت تو مجھے یاد کیا کر۔ میں جب غصہ میں ہوں گا تو تجھے یاد کروں گا۔ الضحاک اور سدیؒ فرماتے ہیں ہر نماز کے متعلق ہے، یعنی نماز قضاء ہو جائے تو اسے ادا کرو (2) حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے نماز بھول جائے تو جب اسے یاد آئے، ادا کرے (3)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے۔ صحیحین، مسند امام احمد، ترمذی اور نسائی میں اس طرح ہے کہ جو نماز بھول جائے یا نماز کے وقت سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے نماز یاد آئے تو فوراً ادا کرے۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو وتر نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو جب اسے یاد آئے تو ادا کرے۔ اس حدیث کو احمد، حاکم نے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 394 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69-168 (التجاریہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 25 (وزارت تعلیم)

روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ ابن عباس، مجاہد اور الحسن فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تم ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جب یاد آئے کہہ دیا کرو ان شاء اللہ۔ اسی قول کی بناء پر بعض علماء استثناء کی تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اگرچہ سال بعد بھی ہو بشرطیکہ وہ قسم سے حانث نہ ہوا ہو (یعنی قسم توڑی نہ ہو) اس تاخیر کے جواز کے قول کو سعید بن منصور، ابن جریر، طبرانی اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس قول کی تائید ابن مردویہ کی روایت سے ہوئی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا ان شاء اللہ لیکن عام فقہاء ایسی تاخیر کے قائل نہیں ہیں کیونکہ کلام غیر مستقل جب دوسری کلام کے معنی کو تبدیل کرنے والی ہو تو وہ شرط، استثناء غایت اور بدل بعض کی طرح ہوتی ہے، اس لئے اس کا متصل ہونا ضروری ہے۔ اگر استثناء منفصل بھی جائز ہو تو اقرار، طلاق، اعتاق کا ثبوت کبھی بھی نہ ہوا اور نہ صدق و کذب معلوم ہو۔

حکایت۔ خلیفہ منصور کو یہ خبر پہنچی کہ امام ابوحنیفہ حضرت ابن عباس کی استثناء منفصل میں مخالفت کرتے ہیں۔ خلیفہ نے امام صاحب کو بلایا تاکہ ڈانٹ ڈپٹ کرے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا یہ چیز تیرے خلاف جاتی ہے۔ کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو لوگوں سے طاعت کی بیعت لے پھر جب وہ باہر نکلیں تو ان شاء اللہ کہہ دیں اور وہ تیری اطاعت سے نکل جائیں۔ اس نے امام صاحب کی کلام کو داد تحسین دی اور جس نے امام صاحب پر طعن کیا تھا، اسے محفل سے نکال دیا۔ اور جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے آیت کے نزول کے وقت ان شاء اللہ کہا تھا، یہ استثناء اس پہلی کلام سے متعلق ہے جس میں آپ نے کہا تھا کہ کل آنا، میں تمہیں ان سوالوں کے جواب دوں گا بلکہ یہ استثناء مقدر کلام کے متعلق ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے کہ آئندہ کبھی میں ان شاء اللہ کو ترک نہیں کروں گا جب بھی کبھی کسی فعل کے کرنے کے متعلق ارادہ کروں گا۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تو سب کچھ بھول جائے تو اس وقت اپنے پروردگار کو یاد کر۔ صوفیاء فرماتے ہیں دائمی ذکر اس وقت تک متصور ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو بھول نہ جائے کیونکہ انسان کے دل کو ہر کام دوسرے کام سے غافل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک سینہ میں دو دل بنائے نہیں ہیں (کہ ایک اللہ کا ذکر کرے اور دوسرا دنیوی معاملات میں الجھا رہے) پس دائمی ذکر جس میں کبھی سستی اور کمزوری نہیں آتی وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوسری چیزوں سے مستغنی نہ ہو جائے اور ان کا خیال دل سے بالکل مٹ نہ جائے۔ اسی کیفیت کو فناء القلب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ ذکر جس کے پیچھے غفلت ہو اس کو صوفیاء شمار ہی نہیں کرتے جو دل کبھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور کبھی غیر کا تصور کرے اسے صوفیاء موحد نہیں کہتے۔ صوفیاء کی یہ تاویل کتاب کے الفاظ کے زیادہ مناسب ہے، قواعد عربیہ کے بھی موافق ہے اور مجاز سے بھی بہت دور ہے کیونکہ اذا نسیت اذکر کی ظرف ہے اور ظرفیت حقیقیہ تب ہو سکتی ہے جب نسیان کے وقت ذکر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر کا وقت سابقہ تمام تاویلات کے مطابق نسیان کے وقت کے مغائر ہے، یعنی وہ علیحدہ وقت ہیں پس سابقہ تاویلات کی صورت میں ظرفیت حقیقیہ نہ ہوگی بلکہ مجازی ہوگی اور حقیقت پر محمول کرنا اولیٰ ہوتا ہے۔

۳۔ نافع اور ابوعمرو نے صرف وصل کی صورت میں یھدین کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں (وقف اور وصل) میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے ھذا کا مشار الیہ بھولا ہوا ذکر یا حکم ہے، اس کا عطف اذکر پر ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب تم استثناء (ان شاء اللہ) بھول جاؤ یا اس کام کا کرنا بھول جاؤ جس کا اللہ نے حکم دیا

ہے تو اللہ تعالیٰ کا تسبیح۔ استغفار کے ساتھ ذکر کرو اور اس سے مدد طلب کرو اور یہ کہو کہ مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس بھولی ہوئی چیز سے قریب تر ہدایت کی راہ دکھائے گا۔ یا اس طرح ذکر کرے کہ انسان کو احساس ندامت ہو۔ تو بہ واستغفار کرے اور فوت شدہ امر کی قضاء بھی کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قریش نے جب عناد کی بناء پر اصحاب کہف کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انہیں فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی حجتیں اور دلائل عطا فرمائے گا جو اصحاب کہف کے واقعہ کی نسبت میری نبوت پر زیادہ دلالت کرنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے واقعی آپ کی نبوت پر بڑی دلیل پیش فرمائی کہ آپ ﷺ کو رسولوں کا علم غیب اور ما کان وما یکون (ماضی اور مستقبل) کا علم عطا فرما دیا۔ یہ علم غیب کا ملنا اصحاب کہف کی خبر سے کہیں زیادہ نبوت کی صداقت کی واضح دلیل ہے اور ہدایت کے زیادہ قریب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ایک حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو دیا کہ ان شاء اللہ کے قول کے ساتھ وقل عسی ان یھدین الایۃکہا کریں۔ میں انشاء اللہ کو کبھی ترک نہیں کروں گا جب بھولنے کے بعد مجھے یاد آئے گا۔ یعنی جب کوئی انسان انشاء اللہ بھول کر چھوڑ دے اور پھر اسے یاد آئے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ کہے عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا۔ صوفیاء کی تاویل پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی چیز سے ملائے گا جو اس ذکر سے بھی زیادہ باعث ہدایت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

''اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں [1] تین سو سال اور زیادہ کیے انہوں نے (اس پر) نو (9) سال [2]''

[1] یعنی اصحاب کہف غار میں زندہ ٹھہرے رہے اور سوئے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پہلے مجمل کلام کا بیان ہے جس میں فرمایا فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا بعض علماء فرماتے ہیں یہ اہل کتاب کا قول ہے، وہ کہتے تھے کہ اصحاب کہف تین سو نو سال غار میں ٹھہرے رہے۔ اگر یہ مدت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی تو قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ حضرت قتادہ کا قول ہے اور حضرت قتادہ کے اس قول کی تائید حضرت ابن مسعود کی قرأت سے بھی ہوتی ہے، وَقَالُوْا لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ (اس میں صراحت ہے کہ یہ مدت اہل کتاب کی بیان کردہ ہے قرآن کی نہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا رد فرماتے ہوئے فرمایا قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کا مطلب یہ ہے کہ ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ پس اب اگر یہ آپس میں اس کے متعلق جھگڑیں تو آپ فرمائیں تم سے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت ٹھہرے اور اس نے تو تین سو نو سال مدت بیان نہیں فرمائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل کتاب نے کہا کہ ان کے غار میں داخل ہونے کے وقت سے نبی کریم ﷺ کے زمانہ تک یہی مدت بنتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا یعنی ان کی روحوں کے قبض ہونے کے بعد آج تک ایک زمانہ گزر چکا ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

[2] حمزہ اور کسائی نے مائۃ کو سنین کی طرف مضاف کر کے بغیر تنوین کے پڑھا ہے کیونکہ یہاں تمیز مفرد کی جگہ جمع ذکر کی گئی ہے جیسا کہ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا میں ہے۔ فراء کہتے ہیں بعض عرب سنة کی جگہ سنین استعمال کرتے ہیں۔ باقی قراء کے نزدیک بدل یا عطف بیان ہوگا۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اور ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ جب ولبثوا فی کھفھم ثلث

مائۃ نازل ہوا تو عرض کی گئی یا رسول اللہ یہ تین سو سال ہیں یا مہینے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے سنین نازل فرمایا(1)۔ کلبی لکھتے ہیں نجران کے نصاریٰ نے کہا تین سو تو ہم جانتے ہیں لیکن نو کا ہمیں علم نہیں ہے تو اسی وقت قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا نازل ہوا۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝۲۶

”آپ فرمایئے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے ۱؎ اسی کیلئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست ۲؎ اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو ۳؎“

۱؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب کی مجلس میں فرمایا کہ اصحاب کہف تین سو شمسی سال غار میں رہے اور اللہ تعالیٰ نے تین سو سال قمری کا ذکر فرمایا ہے اور شمسی اور قمری سالوں کے درمیان فرق ہر سو سال میں تین سال کا ہوتا ہے۔ پس قمری سال تین سو نو ہونگے اس لئے فرمایا وازداد و تسعاً(2)۔

۲؎ زمین و آسمان کا غائب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے پھر کمال بصارت اور کمال سماعت پر دلالت کرنے کیلئے فعل تعجب کے صیغے ذکر فرمائے تاکہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے کی کیفیت دوسرے سننے اور دیکھنے والوں کی کیفیت سے وراء ہے کیونکہ اس ذات ہمہ بیں اور ہمہ داں سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے لطیف و کثیف کا اس کے سامنے کوئی فرق نہیں ہے، چھوٹی بڑی، خفی اور جلی سب چیزیں اس کے ادراک کیلئے برابر ہیں۔

۳؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ ابن التیسیر میں ابن عامر کا خلاف ذکر نہیں کیا۔ اور جمہور علماء نے لا یشرک یعنی یاء کیساتھ پڑھا ہے(3) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فیصلہ یا اپنے امر و نہی میں کسی کو شریک نہیں کرتا، کسی کو اپنے فیصلہ میں دخل اندازی کا حق نہیں دیتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں حکم بمعنی علم غیب ہے یعنی اپنے علم غیب میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

قرآن چونکہ اصحاب کہف کے واقعہ پر مشتمل ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کیلئے ایک غیب کی خبر ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اپنے نبی کریم ﷺ کی جانب وحی ہے اور بطور معجزہ عطا کیا گیا۔ اور پھر حکم دیا کہ ہمیشہ اس قرآن معجز کی تلاوت کرتے رہو اور قرآن پڑھنے والوں کی سنگت میں رہو۔ فرمایا

وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝۲۷

”اور پڑھ سنایئے (انہیں) جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کے ارشادات کا ۱؎ اور نہیں پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ ۲؎“

۱؎ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے، یعنی قرآن کی تلاوت کرو اور اس کے احکام کی اتباع کرو اور ان کے لایعنی سوالوں ”اس قرآن کے علاوہ قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو“ کی طرف کبھی توجہ نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس میں تغیر و تبدل کرنے پر قادر نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل معصیت کو جن کلمات کے ساتھ اس نے وعید سنائی ہے انہیں کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 396 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 169 (التجاریۃ) 3۔ ایضاً، صفحہ 170

۳ اے پیارے محمد ﷺ اگر آپ قرآن کی اتباع نہ کریں گے تو آپ اس کے سوا کوئی قرار گاہ نہیں پائیں گے۔ ابن عباس نے ملتحدا کا معنی حوزاً (حفاظت گاہ) کیا ہے۔ حسن نے مدخلاً (داخل ہونے کی جگہ) کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں بھاگنے کی جگہ۔ التحد کا اصل معنی میلان ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور روکے رکھئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ۱ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام طلب گار ہیں اس کی رضا کے ۲ اور نہ ہٹیں آپ کی نگاہیں ان سے ۳ کیا آپ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت اور نہ پیروی کیجئے اس (بد نصیب) کی غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے ۴ اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا ۵ اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے ۶''

۱ اے پیارے محمد آپ اپنے نفس کو ان اپنے عاشقان دلفگار کے ساتھ روکے رکھیۓ جو صبح و شام اپنے پروردگار کی تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں، جن کی ساری ریاضتوں، سجدہ ریزیوں اور شب خیزیوں کا مقصود صرف اور صرف رضاء الٰہی ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ عیینہ بن حصین الفزاری کے متعلق نازل ہوئی جو اسلام لانے سے پہلے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی مجلس میں فقراء صحابہ کی جماعت بیٹھی تھی جن میں سلمان فارسی بھی تھے۔ حضرت سلیمان فارسی نے ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی، جس میں آپ کو پسینہ آ رہا تھا اور ان کے ہاتھ میں کھجور کے پتے تھے جن کو چیر کر آپ کچھ بُن رہے تھے۔ عیینہ کہنے لگا اے محمد ﷺ ان لوگوں کی بدبو آپ کو تکلیف نہیں دیتی، ہم مضر قبیلہ کے سردار ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ ہم ان بدبودار اور فقراء لوگوں کی وجہ سے آپ کی اتباع نہیں کرتے۔ آپ ان کو مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کی اتباع کریں گے یا آپ اس طرح کریں کہ ان کیلئے ایک الگ مجلس کا اہتمام کریں اور ہمارے لیے علیحدہ محفل کا انتظام کیا کریں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی واصبر نفسک الآیۃ۔

۲ ابن عاصم نے بالغداۃ کو غین کے ضمہ دال، کے سکون اور واو کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء غین اور دال کے فتحہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے۔ غدوۃ اور عشی سے مراد یا تو تمام اوقات ہیں یا دن کی دو اطراف ہیں۔ وجھہ میں وجہہ کا لفظ زائد ہے جیسا کہ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ میں وجہ مقحم ہے۔ مطلب یہ کہ یہ درویش صفت لوگ صرف اور صرف اللہ کیلئے عبادت کرتے ہیں، دنیا و آخرت کی کوئی چیز ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ اصحاب صفہ کے بارے نازل ہوئی، ان کی تعداد سات سو تھی جو نبی کریم ﷺ کی مسجد میں رہتے تھے، کھیتی، مال مویشی، تجارت وغیرہ سے بالکل مستغنی تھے۔ فقط یہی کام تھا کہ ایک نماز محبوب کریم ﷺ کی معیت میں ادا کر لیتے تو دوسری نماز کے انتظار میں ہو جاتے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ اَمَرَنِيْ رَبِّيْ اَنْ اَصْبِرَ مَعَهُمْ. سب تعریف اس ذات کیلئے جس نے میری امت میں ایسے پاکباز اور حسین سیرت لوگ پیدا فرمائے جن کی ہم نشینی کا میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ ہم نے سورۂ انعام میں

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ کی تفسیر کے تحت اس آیت کے سبب نزول کے متعلق بعض روایات نقل کی ہیں (وہاں سے ملاحظہ فرمائیں)

۳ے آپ کی آنکھیں انہیں چھوڑ کر اغنیاء و مالداروں کی مجلس کی طلبگار نہ ہوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ والوں کی مصاحبت و محفل کی متلاشی نہ ہوں۔ تريد زينة الدنيا الحياة الدنيا ک ضمیر سے حال ہے۔

۴ے آپ ان کی پیروی نہ کریں جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں جن کی اتباع سے روکا گیا ہے عیینہ بن حصین ہے۔ بعض فرماتے ہیں امیہ بن خلف مراد ہے۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ یہ امیہ بن خلف الجمحی کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اس نے نبی کریم ﷺ سے ایک ایسا مطالبہ کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ ان درویشوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں اور اہل مکہ کے سرداروں کو اپنا ہم نشین بنائیں۔ ابن ابی حاتم نے ربیع سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو امیہ بن خلف کی پیروی سے روکا گیا ہے کیونکہ امیہ ہی ہر اس بات سے غافل اور بھولنے والا تھا جو اسے کہی جاتی تھی۔ ابن بریدہ نے ذکر کیا ہے کہ عیینہ بن حصین نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا اور وہاں سلمان فارسی بھی تشریف فرما تھے، عیینہ نے کہا جب ہم تیرے پاس آئیں تو ان کو نکال دیا کرو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی و لا تطع من اغفلنا قلبه۔

۵ے اس نے فقراء کو مجلس سے نکالنے اور قریش کے سردار کو قریب بٹھانے کی استدعا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں کی تھی۔ اس جملہ میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ایسی غیر اخلاقی بات کرنے پر برانگیختہ کرنے والی چیز ذکر الٰہی سے محرومی ہے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک ہونا ہے حتی کہ دنیا کا غبار اس کے دل پر اس طرح چھا گیا ہے کہ نفس کی پاکیزگی، دل کی صفائی اور نور معرفت سے منور ہونے کا شرف اس کی مادیت آلود گیوں سے او جھل ہو گیا ہے۔ پس جو ایسے شخص کی پیروی کرے گا وہ غفلت اور غباوت میں اس جیسا ہو گا۔ معتزلہ چونکہ غافل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے، اس لئے وہ اس کا یہ معنی کرتے ہیں کہ ہم نے اسے غافل پایا یا ہم نے اس کو غفلت کی طرف منسوب کیا یا یہ اغفل ابلہ کے قبیل سے ہے، یعنی اس نے اس کو بغیر نشانی کے چھوڑ دیا اہل سنت و جماعت ان دونوں نسبتوں اغفلنا اور واتبع هواه کو دو امروں کی دلیل بناتے ہیں (1) انسان پر جبر نہیں ہے (2) اور انسان کلی طور پر مختار نہیں ہے۔

۶ے امام بغوی لکھتے ہیں حضرت قتادہ اور مجاہد نے فرطا کا معنی ضیاعا کہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے اپنے معاملہ کو ضائع کر دیا اور کام کے دنوں کو معطل کر دیا۔ بعض نے اس کا معنی شرمندگی کیا ہے۔ مقاتل بن حبان نے سرفا (حد سے تجاوز) کیا ہے۔ فراء نے متروکا چھوڑا ہوا (حد سے تجاوز کرنے والا) معنی بیان کیا ہے (1)، امام بیضاوی لکھتے ہیں جو حق کو پیٹھ کے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا ہو۔ عرب کہتے ہیں فرط فرس وہ گھوڑا جو بقیہ گھوڑوں سے آگے نکل جائے، اسی سے الفرط ہے جس کا معنی پیش رو ہے (2)۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۗ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۗ بِئْسَ الشَّرَابُ ۗ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

''اور فرمائیے حق تمہارے رب کی طرف سے ہے لے پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے ۲ے بیشک ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لیے آگ گھیر لیا ہے انہیں اس آگ کی دیوار نے ۳ے اور اگر فریاد کریں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 563 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 168 (العلمیہ)

گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کے ساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے (اور اتنا گرم کہ) بھون ڈالتا ہے چہروں کو۔ یہ مشروب بڑا ناگوار ہے اور یہ قرارگاہ بڑی تکلیف دہ ہے۔''

۱۔ الحق مبتدا اور من ربکم خبر ہے یعنی حق وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حق فرمائے، وہ حق نہیں جسے نفس کی خواہش اچھا کہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الحق مبتدا محذوف کی خبر ہو اور من ربکم حال ہو یعنی اسلام یا قرآن حق ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہے۔

۲۔ یہ تخییر کا صیغہ تہدید اور وعید کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ گویا یہ جواب ہے جب عیینہ نے نبی کریم ﷺ کو کہا تھا کہ تمہیں ان کی بدبو تنگ نہیں کرتی ہم تو قبیلہ مضر کے سردار اور معزز لوگ ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے اور ہمیں آپ کی اتباع اور پیروی سے صرف یہی لوگ مانع ہیں۔ ان کو مجلس سے اٹھا دو تو ہم آپ کی اتباع کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے اور اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ان مسکینوں وفقیروں کی مجلس وسنگت پر اپنے آپ کو روکے رکھو اور وہ تمہیں منع کرتا ہے کہ کبھی ان پاکیزہ نفوس کو اپنی مجلس سے اٹھا دو چاہیں تو یہ کافر ایمان کی روشنی قبول کرلیں اگر چاہیں تو کفر کے اندھیرے میں بھٹکتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مجھے ایمان لانے والے کے ایمان کی اور کفر کرنے والے کے کفر کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایمان قبول کرو گے تو اس کا نفع تمہاری طرف لوٹے گا اور اگر کفر کرو گے تو کفر کا وبال بھی تم پر ہی پڑے گا۔

۳۔ سرادق وہ حجرہ جس کو قناتوں کے ساتھ گھیرا گیا ہو۔ نہایہ میں ہے ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنے گھیرے میں لے لے خواہ وہ دیوار ہو یا، خیمہ۔ علماء فرماتے ہیں یہ لفظ مفرد ہے اور عربی نہیں، عربی میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ عرب کلام میں کوئی مفرد لفظ ایسا نہیں جس کا تیسرا لفظ الف ہوا اور الف کے بعد دو حرف ہوں۔ ہوسکتا ہے یہ سردق کی جمع ہو۔ امام احمد ترمذی اور حاکم نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا آگ کے سرادق چار ہیں۔ یعنی دوزخ کی چار دیواریں ہیں۔ ہر دیوار کی موٹائی اتنی ہے کہ اسے طے کرنے کے لیے چالیس سال درکار ہوں گے (1)۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباس نے فرمایا سرادق سے مراد آگ کی دیواریں ہیں۔ کلبی کہتے ہیں یہ آگ کی لپیٹ ہے جو کفار کو باڑا کی طرح گھیر لے گی۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد دھواں ہے جو کفار کو گھیر لے گا۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ اس طرح فرمایا اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ۔ چلو اس سایہ کیطرف جو تین شاخوں والا ہے (2)۔

۴۔ امام احمد ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن حبان، الحاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعید الخدری سے نقل کیا ہے کہ مھل سے مراد وہ تلچھٹ ہے جب وہ انسان کے قریب کیا جائے گا تو اس کے چہرے کی کھال (گل کر) اس میں گر جائے گی (3)۔ امام احمد، نسائی، حاکم۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے ابی امام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یسقی من ماء صدید یتجرعه کے متعلق فرمایا جب وہ پیپ والا پانی اس کو قریب کیا جائے گا تو وہ (کافر) اسے ناپسند کرے گا اور جب زیادہ قریب کیا جائے گا تو اس کا چہرہ جلا دے گا اور اس کے سر کی کھال اس میں (سڑ کر) گر جائے گی اور جب وہ اس کو پیئے گا تو وہ اس کی انتڑیوں کو کاٹ دے گا حتی کہ وہ اس کی دبر سے نیچے بہہ جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے ابی طلحہ کے واسطے سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ المھل سے مراد سیاہ تلچھٹ ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباس نے فرمایا مہل سے مراد وہ غلیظ پانی ہے جو تیل کے تلچھٹ کی مانند ہوگا۔ مجاہد فرماتے ہیں

1۔ مصابیح السنہ، جلد 2، صفحہ 379 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 65-564 (الفکر)

پیپ اور خون مراد ہے۔ ابن مسعود سے المھل کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے سونا اور چاندی منگوائے پھر ان کو آگ پر گرم کیا جب وہ پگھل گئے تو فرمایا مھل اس کے مشابہ چیز ہے۔ وہ پانی جو پیپ جیسا غلیظ ہوگا جونہی چہروں کے قریب ہوگا تو اس کی تپش سے چہرے جل جائیں گے۔ یہ جملہ ماء کی صفت ثانیہ ہے یا المھل سے حال ہے یا کاف وتشبیہ جو ضمیر ہے اس سے حال ہے(1)۔

۵۔ بئس کا مخصوص بالذم المھل ہے اور ساءت کا مخصوص بالذم النار ہے۔ ابن عباس سے مرتفقا کا معنی منزل، مجاہد نے مجمع، عطاء نے قرار گاہ اور قتیبی نے مجلس کیا ہے(2) ارتفاق کا اصل معنی رخسار کے نیچے اپنی کہنی رکھتا ہے، معنی آرام کرنا اور سہارا لینا ہے یہ حسنت مرتفقا کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے ورنہ دوزخیوں کیلئے کب کوئی آرام اور سکون ہوگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾

''بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے ۱؎''

۱؎ پہلے انّ کی خبر دوسرا انّ اور اس کے اسم خبر ہیں اور خبر میں ضمیر راجع محذوف ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا مِنْھُمْ یا مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا کے عموم کی وجہ سے راجع ضمیر کی ضرورت ہی نہیں ہے جیسا کہ نعم الرجل زید میں ضمیر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی یا ضمیر کی جگہ یہ اسم ظاہر ہے کیونکہ من احسن عملاً کا اطلاق ہوتا ہی الذین امنوا و عملو الصالحت پر ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾

''یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کے لیے ہمیشگی کے جنت ہیں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ۱؎ انہیں پہنائے جائیں گے ان جنتوں میں کنگن سونے کے ۲؎ اور پہنیں گے سبز رنگ کا لباس جو باریک ریشمی کپڑے اور موٹے ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ہوگا ۳؎ تکیہ لگائے بیٹھے ہونگے وہاں مرصع پلنگوں پر ۴؎ کتنا اچھا ہے یہ اجر اور کتنی عمدہ ہے یہ آرام گاہ ۵؎''

۱؎ عدن کا معنی ٹھہرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں عَدَنَ الْمَاءُ بِالْمَكَانِ (پانی ٹھہر گیا) عدن اسلئے فرمایا ہے کہ اس میں مؤمنین ہمیشہ ٹھہرے رہیں گے۔ اولئک کا جملہ اجر کے بیان کیلئے علیحدہ مستقل کلام کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ (اولئک الخ) پہلے انّ کی خبر ہو اور دوسرا انّ اپنے اسم خبر سے ملکر جملہ معترضہ ہو یا یہ جملہ دوسری خبر بھی ہوسکتا ہے۔

۲؎ اساور جمع ہے اسورۃ کی یا یہ اسوار کی جمع ہے جو سوار کی جمع ہے (یعنی یہ جمع الجمع ہے) من ابتدائیہ ہے۔ من ذھب اساور کی صفت ہے اور اس سے پہلے من بیانیہ ہے اساور اور ذھب پر تنکیر ان کنگنوں کے حسن وخوبصورتی کی بڑائی کیلئے ہے، طبرانی نے الاوسط میں اور امام بیہقی نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اگر اہل جنت کے ادنی زیور کا دنیا والوں کے تمام زیورات سے مقابلہ کیا جائے تو آخرت میں اللہ جو جنتیوں کو زیور عطا فرمائیں گے وہ اہل دنیا کے تمام زیورات سے افضل اور بہتر ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 565 (الفکر) 2۔ ایضاً

گا(1)، ابوالشیخ نے العظمہ میں کعب الاحبار سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ پیدا فرمایا ہے جو پیدائش سے لے کر قیامت تک جنتیوں کے زیور تیار کرتا رہے گا۔ اگر جنتیوں کے زیوروں میں سے ایک زیور بھی (دنیا) میں لایا جائے تو سورج کی روشنی ختم ہو جائے۔

۳؎ جنتیوں کے لباس سبز رنگ کے ہونگے۔ ابن السنی اور ابونعیم نے طب النبی ﷺ میں حضرت انس روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ رنگ سبز تھا(2)۔ سندس وہ کپڑا جو باریک ریشم سے بنا ہوا ہو اور استبرق وہ کپڑا جو موٹے ریشم سے بنا ہوا ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنتیوں کے کپڑوں میں موٹائی سے مراد اس کی پختگی ہے(3) عمر الحربی سے مروی ہے کہ سندس وہ ریشم کا کپڑا ہے جو سونے سے بُنا گیا ہو۔ نسائی، طیالسی، بزار اور بیہقی نے حسن سند سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول ہمیں جنتیوں کے لباس کے متعلق بتائیے کیا بنے بنائے پیدا ہونگے یا ان بنے ہوئے ہونگے جن کو بعد میں بنایا گیا ہوگا، ایک شخص یہ سوال سن کر ہنس پڑا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ناواقف آدمی عالم سے سوال کرتا ہے تو تم ہنستے کیوں ہو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا جنت کے پھل دو مرتبہ ان کپڑوں سے پھٹیں گے(4)۔ (یعنی جنتیوں کے لباس درختوں کے پھولوں سے پیدا ہوں گے) بزار، ابو یعلیٰ اور طبرانی نے ابوالخیر مرثد بن عبداللہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس سے ریشم پیدا ہوتا ہے جو اہل جنت کا لباس ہوگا(5)۔

۴؎ جنتی جنت میں ٹیک لگا کر بیٹھے ہونگے۔ ٹیک لگا کر بیٹھنے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ کیفیت خوشحال اور بادشاہوں کی ہوتی ہے جو صوفوں پر بیٹھتے ہیں۔ وہ نشست گاہ جو حجلہ عروسی میں ہوتی ہے، اسے اریکہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع ارائک ہے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اریکہ وہ تخت ہوتا ہے جو حجلہ عروسی میں سجایا گیا ہوتا ہے اور تخت بغیر حجلہ کے ہو تو اسے اریکہ نہیں کہتے۔ اسی طرح حجلہ کو بغیر تخت کے اریکہ نہیں کہتے۔ جب حجلہ اور تخت دونوں ہوں تو اس مجموعہ کو اریکہ کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا ارائک موتیوں اور یاقوت سے بنے ہونگے(6)۔

۵؎ جنت کتنی عمدہ جزاء ہے اور کتنی بہتر قرار گاہ اور عمدہ مجلس ہے یا یہ معنی کہ صوفے کتنے آرام دہ ہیں۔

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾

''اور بیان فرمائیے ان کیلئے مثال دو آدمیوں کی ہم نے دیے تھے ان دونوں میں سے ایک کو ۱؎ دو باغ انگوروں کے اور ہم نے باڑ بنادی ان دونوں کے اردگرد کھجور (کے درختوں) کی ۲؎ اور اگا دی ان دونوں کے درمیان کھیتی ۳؎''

۱؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے فرمایا یہ آیت دو بھائیوں کے بارے نازل ہوئی جو اہل مکہ میں سے بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسود بن عبدیالیل (یہ نبی کریم ﷺ کے نکاح سے پہلے ام سلمہ کے خاوند بنے تھے۔ بعد میں ام سلمہ حضور ﷺ کے عقد نکاح میں آ گئیں تھیں) ابوسلمہ مومن تھا اور دوسرا بھائی اسود بن عبدالاسود بن عبدیالیل کافر تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عیینہ اور اس کے ساتھیوں کا حضرت سلمان فارسی اور اپنے جیسے درویشوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا اس کی مثال ہے، ان

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 401 (العلمیہ) 2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 118 (التراث الاسلامی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 565 (الفکر) 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 401 (العلمیہ) 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً، صفحہ 402

دونوں کو بنی اسرائیل کے دو شخصوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جن میں سے ایک مومن تھا، جس کا نام یہودا تھا، یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے اور بقول مقاتل اس کا نام تملیخا تھا اور دوسرا کافر تھا جس کا نام قطروس تھا۔ وہب نے اس کا نام مقطفر لکھا ہے۔ ان دونوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں فرمایا ہے۔ ان کا قصہ عبداللہ بن المبارک نے معمر کے حوالہ سے عطاء الخراسانی سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں دو آدمی آپس میں شریک تھے، جن کے پاس آٹھ ہزار دینار تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ دونوں بھائی تھے، انہیں وراثت سے آٹھ ہزار دینار ملے تھے ان دونوں نے انہیں تقسیم کر لیا، ان میں ایک نے ہزار دینار سے زمین خریدی، دوسرے نے اللہ سے عرض کی فلاں نے ہزار دینار کے عوض زمین خریدی ہے میں تجھ سے جنت میں ہزار دینار کے بدلے زمین خریدتا ہوں، اس نے ہزار دینار صدقہ کر دیئے پھر اس کے ساتھی نے ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنایا۔ مومن نے کہا یا اللہ فلاں نے ہزار دینار سے گھر بنایا ہے میں تجھ سے ہزار دینار کے عوض جنت میں گھر خریدتا ہوں اور ہزار صدقہ کر دیے پھر اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ہزار دینار خرچ کر دیے۔ مومن نے کہا اے اللہ میں تجھ سے جنت کی عورتوں سے نکاح کرنے کا سوال کرتا ہوں۔ ہزار دینار کے بدلے میں اس نے ہزار دینار صدقہ کر دیے پھر کافر نے ہزار کے بدلے میں غلام اور سامان خریدا۔ مومن نے کہا یا اللہ میں تجھ سے ہزار کے عوض غلام اور سامان خریدتا ہوں پھر اس نے ہزار صدقہ کر دیا۔ پھر مومن کو کسی ضرورت سے واسطہ پڑا تو وہ اپنے کافر ساتھی کے پاس آیا کہ شاید وہ مجھ سے نیکی کر دے، وہ اس کے راستہ پر بیٹھ گیا حتی کہ کافر اس کے پاس خدام کی معیت میں پورے کروفر سے گزرا۔ کافر نے اسے پہچان لیا اور پوچھا تو فلاں ہے۔ مومن نے کہا ہاں فلاں ہوں۔ پوچھا کیا کام ہے؟ مومن نے اپنی تکلیف کا اظہار کیا اور کہا میں تیرے پاس آیا ہوں تا کہ تو میرے ساتھ نیکی کر دے۔ کافر نے پوچھا تیرا وہ مال کہاں گیا جو ہم نے آپس میں تقسیم کیا تھا اور تجھے نصف حصہ ملا تھا۔ مومن نے اپنا سارا واقعہ بیان کر دیا (کہ وہ میں نے صدقہ کر دیا ہے) کافر نے کہا تو مال کو فقیروں، درویشوں پر صدقہ کر دیتا ہے چل نکل جا میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا پس کافر نے مومن کو ترش لہجہ میں زجر و توبیخ کر کے نکال دیا پھر وہ دونوں مر گئے تو ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۝ یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ترجمہ:۔ پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو نگے (اور) سوال جواب کریں گے کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا (1)۔

روایت ہے کہ جب مؤمن اس کے پاس آیا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھومنے لگا اور اسے اپنا مال و متاع اسے دکھانے لگا۔ اس وقت ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں، یعنی کافروں اور مومنین کیلئے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو یعنی مقدر یا نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں یا سابقہ زمانہ کے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو رجلین مضاف کے حذف کے ساتھ مثل کا بدل ہے اور اس کے بعد مثل کی تفسیر ہے۔

۲؎ یعنی کافر کیلئے انگوروں کے باغ اگائے یہ جملہ تمثیل کا بیان یا رجلین کی صفت ہے۔ حفه القوم کا معنی ہے قوم نے اسے گھیر لیا اور نخل سے پہلے با زائدہ ہے جسے غشیتہ بہ میں با زائدہ ہے۔

۳؎ ان دونوں باغات کے درمیان کوئی جگہ بنجر یا خراب نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان بھی ہم نے کھیتی اگا دی ہے گویا وہ دونوں باغ ہر قسم کے اناج اور پھلوں کے جامع ہیں اور بہت خوبصورت ترتیب اور دلکش انداز میں وہ باغ لگائے گئے ہیں۔

كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَیْــٴًـا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝۳۳

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 566 (الفکر)

''یہ دونوں باغ اپنے پھل لائے اور نہ کم ہوئی ان سے کوئی چیز اور ہم نے جاری کر دیں ان کے درمیان نہریں ۱؎''

۱؎ باغ دو ہیں لیکن صیغہ اور ضمیر مفرد ذکر فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ کلتا مفرد ہے عام طور پر باغات کا پھل ایک سال اچھا ہوتا ہے دوسرے سال کم ہو جاتا ہے لیکن ان باغوں کے پھلوں میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی فجرنا کو یعقوب نے جیم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور ان باغوں کے درمیان نہریں جاری فرمائی ہیں تا کہ ان کو متواتر پانی ملتا رہے اور ان کی بہار باقی رہے اور ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

''اور (باغوں کے علاوہ) اور بھی اس کے اموال تھے ۱؎ تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث مباحثہ کے دوران کہا کہ میں دولت کے لحاظ سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں ۲؎''

۱؎ ثمر کو عاصم نے ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعمرو نے ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ احیط ثمرہ میں بھی اسی طرح مختلف قرأتیں ہیں۔ الازہری فرماتے ہیں الثمرہ کی جمع ثمر یعنی ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ آتی ہے اور ثَمَرٌ کی جمع ثمار اور ثمار کی جمع الثمر یعنی ثاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ آتی ہے۔ قاموس میں ہے الثمرة محركة حمل الشجر و انواع المال (1) یعنی الثمرة باغات اور باغات کے علاوہ مال کی اقسام کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، واحد ثمرة و ثمرہ ہے اور جمع ثمار ہے اور جمع الجمع ثمر اور جمع الجمع اثمار ہے اور اس سے مراد سونا، چاندی، نسل اور اولاد ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ باغوں کے علاوہ اس کے پاس مال و دولت کے کئی ذخائر بھی تھے اور یہ ثمر ماله سے مشتق ہے جس کا معنی مال کا زیادہ ہونا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہاں ثمر سے مراد سونا اور چاندی ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنہوں نے ثمر کو ثاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک درختوں کے پھل مراد ہیں جو کھائے جاتے ہیں اور جنہوں نے ثاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک اس سے مراد مال کثیر ہے (2)۔

۲؎ نفر سے مراد خدام، نوکر چاکر اور معاون ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی مذکر اولاد کیا ہے کیونکہ یہ اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ اس معنی پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے ان ترن انا اقل منک مالا وولداً۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾

''اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا درآنحالیکہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ (سرسبز و شاداب) باغ کبھی برباد ہو گا ۱؎''

۱؎ یہاں ایک باغ کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ علیحدہ علیحدہ ہر باغ میں داخل ہوتا تھا یا اس لئے کہ دونوں باغ ایک دوسرے کے ساتھ متصل تھے اس لئے ایک باغ فرما دیا یا باڑ اور چار دیواری کے ایک ہونے کی وجہ سے (جنت) ایک باغ فرمایا اور درمیان میں نہر کی وجہ سے جَنَّتَيْنِ (دو باغ) فرمایا یا وہ باغ مراد ہے جس نے اسے دائمی باغ سے محروم کر دیا تھا، جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے متقین سے فرمایا ہے چونکہ کافر کی امیدیں بڑی طویل تھیں اور غفلت میں سرکش ہو چکا تھا اور مہلت کی وجہ سے بڑے گھمنڈ میں تھا، اس وجہ سے اس نے کہا

میں تو اس باغ کی فناء کا تصور بھی نہیں کرتا شاید یہ بھی مراد ہو کہ اس نے یہ گمان کیا کہ اس کی یہ خوشحالی، مال، دولت اور باغات ہمیشہ رہیں گے، جب تک اس کی زندگی کے سانس باقی ہیں کیونکہ کوئی عقلمند خواہ مومن ہو یا کافر وہ یہ تو جانتا ہے کہ ایک دن اس دنیا سے کوچ کرنا ہے اور ہمیشہ زندہ رہنا تو ممکن ہی نہیں ہے یا یہ مراد ہے کہ اس نے زبان حال سے یہ کہا تھا کیونکہ جو یاد الٰہی سے غافل ہوتے ہیں اور دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں منہمک ہوتے ہیں وہ بڑی طویل امنگیں رکھتے ہیں اور ایسے ایسے اعمال کرتے ہیں گویا انہوں نے کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔ گویا وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ نہ ہمارے باغ تباہ ہوں گے اور نہ قیامت قائم ہوگی۔

وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

''اور میں یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی اور بفرض محال اگر مجھے لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میں پاؤں گا اس (نزہت گاہ) سے بہتر پلٹنے کی جگہ ۱؎ ''

۱؎ چونکہ وہ کافر تھا اور قیامت کے وقوع کا منکر تھا اس لئے اس نے کہا میں قیامت کا تصور کر بھی نہیں سکتا۔ پھر اس نے کہا بفرض محال اگر مرنے کے بعد تمہارا گمان کے مطابق مجھے رب کے حضور لوٹایا بھی گیا تو میں آخرت میں دنیا کی سعادتمندیوں سے زیادہ سعادت وآرام عطا فرمائے گا۔ اس نے یہ اس لئے کہا تھا کہ کیونکہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ دنیا میں جو مجھے اللہ تعالیٰ نے آرام وآسائش دی ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ میں اللہ کی بارگاہ میں معزز ومکرم ہوں اور میرا یہ اللہ کے ہاں حق ہے۔ بصریوں اور کوفیوں نے منھا کو مفرد ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے جس کا مرجع وہ باغ ہے جس میں وہ داخل ہوا تھا اور حجازیوں اور شامی قراء نے منھما تثنیہ ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں بھی تثنیہ ضمیر کے ساتھ ہے اور مرجع جنتین ہے۔ منقلبا کا معنی، مرجع اور انجام ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾

''اس کے ساتھی نے اس بحث مباحثہ کے درمیان کہا کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے پیدا فرمایا مٹی سے پھر نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا ۱؎ ''

۱؎ یہ مومن کی گفتگو جو وہ اپنے ساتھی کافر سے کر رہا ہے۔ کیا تو اس کریم ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا فرمایا، تیرے مادہ کی اصل مٹی ہے یا تیرے اصل آدم علیہ السلام کا مادہ مٹی ہے اور پھر غور کر تیرا قریبی مادہ بھی اتنی عمدہ چیز نہیں وہ نطفہ ہے پھر اس نے تجھے اپنی کمال قدرت سے کامل انسان بنا دیا۔ اس آیت میں قیامت کے انکار کو اللہ تعالیٰ کے انکار سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ قیامت کا انکار اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر شک کی بنیاد پر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی مٹی کی تخلیق پر ان کار قیامت کو مرتب فرمایا ہے کیونکہ جو ابتداءً مٹی سے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ اس کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔

لٰكِنَّاۡ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

''لیکن میں ۱؎ (تو) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو ۲؎ ''

۱؎ لکنا کو جمہور قراء نے وقف کی صورت میں خط کی اتباع کرتے ہوئے الف کے ساتھ پڑھا ہے اور وصل کی صورت میں بغیر الف کے پڑھا ہے کیونکہ اس کی اصل لکن انا ہے۔ تخفیف کیلئے ہمزہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کی حرکت لکن کے نون کو دی گئی ہے پس

دونوں جمع ہو گئے تو آپس میں مدغم ہو گئے اور الف خط میں باقی رہا، وقف کی صورت میں الف پڑھا جاتا ہے جیسے انا میں وقت کی صورت میں پڑھا جاتا ہے اور وصلاً الف نہیں پڑھا جاتا جیسے انا میں وصلاً الف نہیں پڑھا جاتا۔ ابن عامر، یعقوب نے وصل کی صورت میں بھی الف کیساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ہمزہ کے عوض میں ہے یا وصل کو وقف کے قائم مقام کرتے ہوئے ایسا پڑھا ہے۔

۲۔ھو ضمیر شان ہے اور جملہ اس کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھو اللہ کی ضمیر ہو اور اللہ اسم جلالت اس کا بدل ہو اور ربی اس کی خبر ھو اور ھو اللہ ربی کا جملہ فعل محذوف کا مفعول ہو، تقدیر عبارت اس طرح ہو اقول ھو اللہ ربی اور اقول کا جملہ انا کی خبر ہو اور ضمیر عائد اقول کی انا ضمیر ہو اور اس تقدیر کی دلیل ولا اشرک ربی، کا عطف ہے۔ ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ولا اشرک ربی اکفوت سے استدراک ہے گویا اس طرح کہا ہے تو اللہ کا منکر ہے لیکن میں مومن اور موحد ہوں جیسا کہ یہ جملہ ہے زید غائب لکن عمرو حاضر امام بغوی فرماتے ہیں کسائی نے فرمایا اس آیت میں تقدیم وتاخیر ہے اصل میں لکن اللہ ھو ربی ھے (1) اس صورت میں لکنا میں خلاف قیاس رسم الخط میں الف زائدہ ہے۔

وَ لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾

”اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تو تو کہتا ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ (وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں)۱؎ اگر تو نے مجھے دیکھا کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں ۲؎“

۱؎ ماشاء اللہ سے پہلے ما موصولہ بھی ہوسکتا ہے اور ماشرطیہ بھی، شرطیہ کی صورت میں جواب محذوف ہوگا۔ یہ اقرار ہے کہ یہ باغ اور جو کچھ اس میں ہے اللہ کی مشیت اور چاہت سے ہے۔ اگر چاہے تو وہ اس کو باقی رکھے چاہے تو اس کو تلف کردے۔ یعنی تو نے باغ میں داخل ہوتے وقت اپنے عجز اور ناتوانی اور اللہ کی قدرت کا اعتراف کیوں نہ کیا کہ میں تو اس باغ کی حفاظت پر قدرت نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور معونت سے۔ اس کی آبادی اور اس کی تدبیر کی جو توفیق ملی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی معونت اور تائید سے ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو کسی چیز کو دیکھے اور وہ اس کو اچھی لگی تو کہے ماشا اللہ لا قوۃ الا باللہ ایسا کہنے سے اس کو نظر بد نہ لگے گی (2) ابن السنی نے بھی اس طرح روایت کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہشام بن عروہ عن ابیہ سے مروی ہے کہ جب بھی حضرت عروہ اپنے مال میں سے کوئی اچھی چیز دیکھتے یا باغ میں داخل ہوتے تو یہ کہتے ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ (3)۔

۲؎ ترن میں قالون اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ انا ضمیر فصل ہے یا مفعول اول کی تاکید ہے۔ اقل کو انا کی خبر کے اعتبار سے مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور پھر جملہ ترن کا مفعول ثانی ہے۔

فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۙ﴿۴۰﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 569 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 405 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 569 (الفکر)

''پس عجب نہیں کہ میرا رب مجھے عطا فرما دے کوئی بہتر چیز تیرے (اس) باغ سے اور اتارے اس باغ پر کوئی آسمانی عذاب تو ہو جائے یہ (سرسبز) باغ ایک چٹیل میدان[1]''

[1] ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان یؤتین میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ یہ جملہ ان ترن کا جواب ہے۔ قتادہ نے حسبانا کا معنی عذابا کیا ہے۔ ابن عباس نے آگ فرمایا ہے۔ قتیبی نے اس کا معنی پتھر یا طوفان فرمایا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ حسبانۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی الصواعق (کڑک) ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ حساب کے معنی میں مصدر ہے اور اس سے مراد باغ کی تباہی کا اندازہ لگانا یا برے اعمال کا عذاب ان کے حساب سے دینا ہے (1) صعیداً زلقاً یعنی وہ باغ اس طرح صاف ہو جائے کہ اس پر پاؤں پھسلنے لگیں کیونکہ اس کے درختوں اور پودوں کا نام ونشان ہی نہ ہوگا۔ حضرت مجاہد نے اس کا معنی خوفناک ریگستان کیا ہے۔

أَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَن تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا ﴿٤١﴾

''یا یوں جذب ہو جائے اس کا پانی زمین کی گہرائی میں کہ پھر تو اس کو تلاش کے باوجود نہ پا سکے[1]''

[1] غوراً زمین کے اندر چلا جانا یہ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے جیسے زلقا مصدر کو بطور استعمال کیا گیا ہے۔

وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَآ أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَٰلَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّيٓ أَحَدًا ﴿٤٢﴾

''اور اس کے (باغ) کا پھل برباد ہو گیا پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا اور (اب) وہ گرا پڑا تھا اپنے چھپروں پر اور (بصد حسرت) کہنے لگا کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا[1]''

[1] اس کا مال اس طرح ہلاک ہوا جیسی اس کو توقع نہ تھی یہ احاطته العدو سے مشتق ہے کیونکہ جب وہ گھیرے میں لے لیتا ہے تو وہ مخالف پر غالب آ جاتا ہے اور اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ تقلیب الکف شرمندگی اور ندامت سے کنایہ ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کافر جب دنیا میں اپنے باغ کو گرا پڑا دیکھتا ہے تو کف افسوس ملتا ہے اور قیامت کے دن یا قبر میں جنت میں اپنے مقام کو دیکھے گا جس کو دوزخ سے بدل دیا گیا ہوگا تو کہے گا کاش میں نے کسی کو دنیا میں اپنے رب کا شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔ ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَمْ تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ﴿٤٣﴾

''اور نہ رہی تھی اس کے پاس کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اور نہ وہ بدلہ لینے کے قابل تھا[1]''

[1] حمزہ اور کسائی نے لم یکن یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے اللہ کے سوا قیامت کے روز اس کے عذاب کو دور کرنے یا ہلاک شدہ باغ کو لوٹانے یا اس کی مثل لانے پر کوئی قادر نہیں ہے۔ صرف وہ ذات خود ہی کسی کی اعانت کرے تو کر سکتی ہے لیکن اس کے دستور میں کفار کی مدد کرنا نہیں ہے اور کافر اس سزا پر انتقام بھی نہیں لے سکتا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 179 (العلمیۃ)

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

''یہاں سے ثابت ہو گیا کہ سارا اختیار اللہ سچے کیلئے ہے[1] وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اس کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے[2]''

[1] یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو واضح ہو جائے گا کہ اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔ حمزہ اور کسائی نے الولایہ کو واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی غلبہ ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی دوستی اور مدد کرنا ہے، جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے اللہ ولی الذین آمنوا کہ اللہ ایمانداروں کا دوست اور مددگار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ربوبیت ہے اور اگر واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی امارت ہے۔ ابوعمرو اور کسائی نے الحق کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ولایت کی صفت ہے۔ حضرت ابی کی قرات اس کی تائید کرتی ہے هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ الْحَقُّ لِلّٰهِ۔ مبتدا محذوف ہو کی خبر ہے۔ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اسم جلالت کی صفت ہے جیسے اس ارشاد میں ہے ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یلیتنی لم اشرک بربی احداً کا جملہ کافر سے دنیا میں شرمندگی اور شرک سے توبہ کے طور پر صادر ہوا ہو۔ یا جب اسے اپنی بھائی کی نصیحت یاد آئی ہو اور اس نے اضطراری اور اضطرابی حالت میں یہ کہا ہو اور اس نے گمان کیا ہو کہ یہ سارا نقصان مجھے شرک کی وجہ سے پہنچا ہے خواہ وہ ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو۔ یہ اس کا قول دوسرے کفار کے قول کی طرح ہوگا جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور وہ بھنور میں پھنس جاتی ہے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے دین کو یعنی حالت اضطراب میں وہ کہے گا ولایت تو اللہ سچے کیلئے ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے اطاعت شعار بندوں کو بہتر جزاء عطا فرماتی ہے۔ انہیں دنیا میں اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق جزاء عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی ان کو بہتر ثواب اور دائمی اجر عطا فرمائے گا، جبکہ دوسرے منکر لوگوں کو وہ اپنی منشاء کے مطابق حقیر اور فانی چیزیں عطا فرماتا ہے اور بس آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ عقبا کو عاصم اور حمزہ نے قاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عقبیٰ کا معنی جزاء ہے جزاء کو عقبیٰ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ طاعت کے پیچھے ہوتی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

''بیان فرمائیے ان سے دنیوی زندگی کی (ایک اور) مثال یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے اتارا ہے آسمان سے پس گنجان ہو کر اگتی ہیں اس پانی سے زمین کی انگوریاں پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے اڑائے پھرتی ہیں اسے ہوائیں[1] اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے[2]''

[1] اے پیارے اپنی قوم کے سامنے اس دنیا کی ظاہری چمک دمک، بہت جلدی فنا اس کی عجیب وغریب حالت کو بیان کر دو یہ تو اس پانی کی طرح ہے جسے ہم اپنی قدرت سے اتارتے ہیں۔ کماء ہو کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اضرب کا مفعول ثانی ہو اور ضرب بمعنی صیّر ہو۔ اختلط کا معنی مل جل جانا ہے، یعنی اس پانی کے سبب زمین کی فصل گنجان ہو جاتی ہے یا یہ معنی کہ پانی نے اس کھیتی میں اثر دکھایا اور وہ کھیتی

سرسبز وشاداب ہوگئی۔ابوعبیدہ فرماتے ہیں تذر وہ کا معنی بکھیرنا ہے۔بلکہ مجموعی کیفیت مشبہ بہ ہے اور وہ یہ ہے پانی کے ذریعے پودوں کا پیدا ہونا ان کا گنجان ہونا پھران کا ریزہ ریزہ ہوجانا پھران کو ہلواؤں کا بکھیرنا اور آخر میں اس طرح ہوجانا کہ گویا یہاں کھیتی تھی ہی نہیں۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے پیدا کرنے اور فناء کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ۝۴۶

''مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب وزینت ہیں ۱؎ اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے ۲؎ ''

۱؎ یہ مال واولاد جس کی کثرت پر عیینہ اور اس جیسے مادیت پرست اتراتے ہیں، دنیا میں انسان ان سے زیب وزینت حاصل کرتا ہے لیکن یہ تو جلدی فناء ہونے والی ہیں۔ یہ دنیا کا مال واسباب آخرت کا زادراہ نہیں ہے۔

۲؎ اور ایک نیک اعمال جن کا اثر دائمی ہے وہ ازروئے ثواب کے مال وفرزند سے اللہ کی بارگاہ میں ہزار درجہ بہتر ہیں۔اور ہر اس چیز سے بہتر ہیں جن سے انسان امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مال اور بیٹے دنیا کی کھیتی ہیں اور نیک اعمال آخرت کی کھیتی ہیں۔کبھی اللہ تعالیٰ یہ دونوں چیزیں بعض افراد کو عطا فرما دیتا ہے(1)۔ابن عباس، عکرمہ اور مجاہد فرماتے ہیں الباقیات الصالحت سے مراد سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ہے۔حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر اور لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ ہیں(2) اس حدیث کو امام احمد، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ کی کثرت کیا کرو کیونکہ یہ تکلیف کے ننانوے (99) دروازے بند کرتا ہے اور کم از کم تکلیف جو اس سے دور ہوتی ہے وہ حزن وملال ہے اس حدیث کو العقیلی نے روایت کیا ہے۔

نعمان بن بشیر سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ سبحان اللّٰہ الحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر یہ الباقیات الصالحات ہیں(3) طبرانی نے اسی کی مثل سعد بن عبادہ کی حدیث نقل کی ہے۔ابن جریر نے حضرت ابوہریرہ سے مرفوع حدیث اسی طرح نقل کی ہے، ایک صحابی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل کلام یہ ہے۔سبحان اللّٰہ الحمد للّٰہ لا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سبحان اللّٰہ الحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر میرے نزدیک ہر اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے(4)۔اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔حضرت سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم فرماتے ہیں الباقیات الصالحت، پانچ نمازیں ہیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قول مروی ہے۔ابن عباس سے اس کا مفہوم اعمال صالحہ بھی

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 571 (الفکر) 2۔الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 408 (العلمیہ) 3۔ایضاً
4۔صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 16، حدیث:32 (العلمیہ)

مروی ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔(1)

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿٤٧﴾

"اور (غور کرو) جس روز ہم ہٹا دیں گے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) ۱؎ اور تم دیکھو گے زمین کو کہ کھلا میدان ہے اور ہم جمع کریں گے انہیں پس نہیں پیچھے رہنے دیں گے ان میں سے کسی کو ۲؎"

۱؎ کوفیوں اور نافع نے جمع متکلم کا صیغہ نسیّر پڑھا ہے اور جبال کو منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد مونث غائب کا صیغہ اور مجہول پڑھا ہے اور الجبال کو نائب الفاعل بنایا ہے، یعنی ہم پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اکھیڑ دیں گے اور ریزہ ریزہ کریں گے۔ یوم اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہے یا عند ربک پر اس کا عطف ہے اس لئے منصوب ہے تقدیر یوں ہوگی اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

۲؎ آپ کو زمین کھلا میدان نظر آئے گی، درخت، پہاڑ اور کوئی منزل دکھائی نہ دے گی۔ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے بارزۃ کا یہی مفہوم نقل کیا ہے۔ عطا فرماتے ہیں زمین میں جو مردے وغیرہ دفن ہیں وہ ظاہر ہو جائیں گے اور زمین کا باطن بھی ظاہر دکھائی دے گا پھر فرمایا ہم لوگوں کو قبروں سے اٹھائیں گے۔ نسیر مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا اور یہاں حشر نا ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کا وقوع متحقق اور یقینی ہے یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے کہ حشر پہاڑ کے ہٹانے سے پہلے ہوگا، اس صورت میں واؤ حالیہ ہوگی اور قد مقدر ہوگا۔ غدرہ کا معنی کسی کو چھوڑ دینا ہے، وفا نہ کرنے کو غدر کہتے ہیں۔ فلم نغادر کا معنی ہوگا کہ ہم نہیں چھوڑیں گے، یعنی زندہ کیے بغیر ہم کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔

وَعُرِضُوا عَلَى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَجْعَلَ لَكُمْ مَوْعِدًا ﴿٤٨﴾

"اور وہ پیش کیے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں صفیں باندھے ہوئے ۱؎ (پھر ہم انہیں کہیں گے کہ) آج تم آ گئے ہو ہمارے پاس جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی بار ۲؎ ہاں تم تو یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ ہم نہیں مقرر کریں گے تمہارے لیے وعدہ کا وقت ۳؎"

۱؎ لوگوں کے بارگاہ الٰہی میں پیش ہونے کی حالت کو لشکر کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو بادشاہ کے سامنے تعارف کیلئے نہیں بلکہ اس لئے آتا ہے کہ وہ انہیں حکم دے اور سارے بندے صفوں میں ہونگے، کوئی مخفی اور پوشیدہ نہیں ہوگا۔ لقد جئتمونا حال ہے عرضوا کی ضمیر سے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لقد جئتمونا یوم کا عامل ہو۔

۲؎ یعنی ہم کہیں گے کہ تم آ گئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ کہ تمہارے سر پر کپڑا تھا، نہ پاؤں میں جوتا تھا اور تمہارا ختنہ بھی نہ کیا گیا تھا۔ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو ہم نے تمہیں بعد میں دنیا کے اندر عطا کیا تھا۔

بخاری، مسلم اور ترمذی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں پیدل چلتے ہوئے، ننگے بدن، غیر مختون جمع ہو گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 572 (الفکر)

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ (1) سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کولباس پہنایا جائے گا۔

بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے روز ننگے پاؤں ننگے بدن اور بغیر ختنہ کے اٹھایا جائے گا۔ حضرت عائشہ نے عرض کی مرد، عورتیں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہونگے۔ فرمایا اے عائشہ اس دن معاملہ بہت سخت ہوگا (2)۔ طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ ام سلمہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ نے عرض کی یہ تو بڑی بری حالت ہوگی۔ ایک دوسرے کی شرمگاہوں کو دیکھ رہے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ مشغول ہوں گے۔ حضرت عائشہ نے عرض کی حضور! لوگوں کی کیا مشغولیت ہوگی؟ فرمایا صحائف کا کھلنا جن میں چیونٹی اور رائی کے دانہ کے برابر نیکیاں اور گناہ لکھے ہوئے ہوں گے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے کہ آپ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے کہا لوگ ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھ رہے ہونگے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اے فلانہ ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی، وہ ہر چیز سے غافل ہوگا۔ طبرانی نے سہل بن سعد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے بھی مرفوع حدیث اسی طرح مروی ہے، اس میں ہے کہ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول ﷺ ایک دوسرے کو کیسے دیکھیں گے آپ ﷺ نے فرمایا آنکھیں پھٹی ہوں گی اور حضور نے اپنی نظر اوپر اٹھائی، طبرانی اور بیہقی نے سودہ بنت زمعہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون ہوں گے۔ کسی کے منہ تک پسینہ ہوگا، کسی کے کانوں کی لووں تک ہوگا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ تو بڑی بری حالت ہوگی، لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے ۔فرمایا لوگ اس سے غافل ہوں گے لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (3) علامہ قرطبی فرماتے ہیں ان احادیث میں عراۃً (ننگے بدن) کا قول اس حدیث کے مخالف نہیں ہے جس میں ہے کہ مرد اپنی قبروں میں اپنے کفنوں کے ساتھ ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث برزخ کے متعلق ہے۔ جب قبور سے نکلیں گے تو برہنہ بدن ہوں گے۔ لیکن یہ احادیث ان احادیث کے معارض ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔ ابوداؤد، حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کی ہے۔ حاکم نے اسے صحیح بھی لکھا ہے۔ جب حضرت ابوسعید الخدری پر موت کا وقت قریب آیا تو نئے کپڑے منگوائے اور پہن لیے پھر فرمایا میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میت ان کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں وہ مرے گا (4)۔ ابن ابی الدنیا نے حسن سند کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ماں کو دفن کیا تو انہیں نئے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ اور پھر حضرت معاذ نے فرمایا اپنے مردوں کو اچھے لباس میں کفن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز انہی کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اپنے مردوں کو اچھے لباس میں کفن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز ان کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں بعض علماء نے ان احادیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اکثر علماء نے ان احادیث کو شہید پر محمول کیا ہے جسے ان کپڑوں میں ہی دفن کرنے کا حکم ہے جن میں وہ قتل ہوتا ہے اور اسی خون کے ساتھ دفن کرنے کا حکم ہے۔

حضرت ابوسعید نے یہ حدیث شہید کے متعلق سنی تھی لیکن انہوں نے اس کو عموم پر محمول کر دیا ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں ان احادیث

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 160، حدیث: 58 (العلمیہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 159، حدیث 56
3۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 363 (التراث الاسلامی)
4۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 578 (التراث الاسلامی)

میں اس طرح تطبیق ہوگی کہ بعض لوگ برہنہ اٹھیں گے اور بعض کپڑوں کے ساتھ اٹھیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ تطبیق وتوفیق بہتر ہے اور یہ آیت کریمہ کفار کے متعلق ہے کیونکہ آگے بھی کفار کے متعلق ارشاد ہے۔

؎ تمہارا یہ خیال تھا کہ ہم نے دوبارہ اٹھنے کا وقت مقرر نہیں کیا اور انبیاء کرام نے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ بل کا کلمہ یہاں ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف خروج کیلئے ہے اور یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ برہنہ حسم نیکوکاروں کے علاوہ کا ہوگا اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آنکھیں پھٹی ہونگی اور قرآن کا ارشاد لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔ یہ کفار کے حق میں ہے اور آنکھوں کا پھٹا ہونا کفار کی صفت ہے۔ ہولنا کی کی وجہ سے ان کی آنکھیں پھٹی ہونگی۔ نیکوکاروں کی یہ کیفیت نہ ہوگی لیکن حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا، اس سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ ابتداء میں انبیاء برہنہ ہونگے۔ ہاں اس حدیث کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ صلحاء اور نیکوکاروں کو قبروں کے اندر نکلنے سے پہلے کرامت کے لباس عطا کیے جائیں گے اور حضرت ابراہیم کو قبر کے اندر سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا۔ بعض علماء اس حدیث کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ کپڑوں سے مراد عمل صالح ہے جیسا کہ عمل صالح کو قرآن میں لباس سے تعبیر کیا گیا ہے فرمایا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾

''اور رکھ دیا جائیگا (ان کے سامنے) نامہ عمل ؎ پس تو دیکھے گا مجرموں کو کہ وہ ڈر رہے ہونگے اس سے جو اس میں ہے اور کہیں گے صد حیف! اس نوشتہ کو کیا ہو گیا ہے کہ نہیں چھوڑا اس نے کسی چھوٹے گناہ کو اور نہ کسی بڑے گناہ کو مگر اس نے اس کا شمار کر لیا ہے اور (اس دن) وہ پالیں گے جو عمل انہوں نے کیے تھے اپنے سامنے۔ اور آپ کا رب تو (اے حبیب!) کسی پر زیادتی نہیں کرتا ؎''

؎ الکتاب پر الف لام جنس کا ہے۔ اس سے مراد بندوں کے اعمال کی کتابیں ہیں کیونکہ یہی نامۂ اعمال بندوں کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں رکھا جائے گا یا میزان میں رکھا جائے گا یا رحمٰن کے سامنے رکھا جائے گا۔ جن کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا، اپنے گناہوں کو لکھا ہوا دیکھ کر ڈر رہے ہوں گے۔ اور اس وقت وہ اپنی ہلاکت کو پکار دیں گے۔ یہاں نداء کا معنی جزع فزع کا اظہار کرنا ہے اور مخاطبین کو آگاہ کرنا ہے جن پر یہ کلام نازل ہوا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں صغیرہ سے مراد بغیر وجہ کے مسکرانا ہے اور کبیرہ سے مراد قہقہہ لگانا ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں صغیرہ سے مراد چھونا، بوسہ لینا ہے اور کبیرہ سے مراد زنا ہے (1) اور فرماتے ہیں یہ بطور تمثیل فرمایا ہے۔ ہم نے سورۂ نساء میں اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ الآیۃ کی تفسیر میں گناہ کبیرہ کا ذکر کر دیا ہے۔ الا احصاها محل نصب میں ہے کیونکہ یہ لا یغادر کا مفعول ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا گناہ اس کتاب میں موجود اور شمار ہوگا۔

سہل بن سعد سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھوٹے گناہوں سے بچو۔ چھوٹے گناہوں کی مثال اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 574 (الفکر)

قوم کی طرح ہے جو کسی وادی کے بطن میں اترے، ایک ایک لکڑی اٹھا کر لائیں اور ان پر روٹیاں پکالیں (تو جس طرح چھوٹی ایک ایک لکڑی مل کر روٹیاں پکانے کے قابل ہوگئیں) اس طرح چھوٹے گناہ بھی ہلاک کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے(1) طبرانی نے حضرت سعد بن جنادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ حنین سے فارغ ہوئے تو ہم ایک چٹیل میدان میں اترے جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ کسی کے پاس ہو وہ لے آئے۔ بڑا یا چھوٹا سب کچھ جمع کرو۔ راوی فرماتے ہیں چند منٹوں میں ہم نے مال کا ڈھیر لگا دیا۔ رسول ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ ڈھیر دیکھ رہے ہو؟ اسی طرح گناہ تم میں سے ایک شخص کے جمع ہوں گے جیسے تم نے یہ ڈھیر جمع کیا ہے بس ہر شخص کو اللہ سے ڈرنا چاہیئے نہ چھوٹا گناہ کرے، نہ بڑا کیونکہ یہ سب شمار کیے جاتے ہیں(2)۔ نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ چھوٹے گناہوں سے بچو کیونکہ اللہ کی طرف ان کا بھی مطالبہ کیا جائے گا(3)۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں، جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں انہیں ہلاک کرنے والا شمار کرتے تھے(4)۔ امام احمد نے اسی کی مثل صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید سے روایت کی ہے۔

لے وہ اپنے صحیفوں میں ہر عمل کو موجود پائیں گے یا جو انہوں نے اعمال کیے، ان کی جزاء کو موجود پائیں گے اور اللہ تعالیٰ کسی پر زیادتی نہیں فرماتا، وہ کسی بندے کے نامہ عمل میں کوئی ایسا گناہ نہیں لکھتا جو اس نے کیا نہ ہو اور نہ سزا سے زیادہ دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز بندوں کو تین پیشیاں ہوں گی۔ دو پیشیاں تو جھگڑنے اور عدد پیش کرنے کیلئے ہوں گی اور تیسری پیشی یہ ہوگی کہ صحیفے (نامہ اعمال) اڑ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی دائیں ہاتھ میں لے گا اور کوئی بائیں ہاتھ میں لے گا(5) اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابوموسیٰ الاشعری سے اور امام ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے ابن مسعود سے موقوف روایت کی ہے۔ حکیم ترمذی فرماتے ہیں جھگڑا دشمنوں کیلئے ہوگا وہ جھگڑیں گے کیونکہ وہ اپنے رب کو نہیں پہچانتے ہوں گے اور ان کا خیال ہوگا کہ ہم جھگڑیں گے تو بچ جائیں گے اور ان کی صحت قائم ہوگی۔ دوسری پیشی میں حضرت آدم تمام انبیاء کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کی موجودگی میں دشمنوں پر حجت قائم فرمائے گا پھر انہیں دوزخ کی طرف بھیج دے گا اور تیسری پیشی مومنین کیلئے ہوگی اور یہ پیشی مغفرت کیلئے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو خلوت میں عتاب فرمائے گا حتیٰ کہ وہ حیاء اور خجالت محسوس کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے گا اور ان سے راضی ہو جائے گا۔ حضرت انس نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا سارے نامہ اعمال عرش کے نیچے ہوں گے۔ جب اللہ کی بارگاہ میں حاضری کا وقت ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا چلائے گا جو دائیں اور بائیں ہاتھوں میں نامہ اعمال پہنچا دے گی اور ان کی ابتداء میں لکھا ہوگا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتے تھے جو شخص دنیا میں ان پڑھ ہوگا، قیامت کے روز وہ بھی پڑھ لے گا

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 574 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 411 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 411 (العلمیہ) 4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 145 (الفکر) 5۔ ایضاً، صفحہ 205

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۞۵۰

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ ۱؎ وہ قوم جنّ سے تھا سو اس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی (اے اولاد آدم) کیا تم بناتے ہوا سے اور اس کی ذریت کو اپنا دوست مجھے چھوڑ کر حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں ظالموں کیلئے بہت برا بدلہ ہے ۲؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے آدم کو فرشتوں کے سجدہ کرنے اور ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کو کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ ان امور کی تمہید اور مقدمہ ہے، جبکہ بیان مقصود تھا۔ یہاں جب پہلے اللہ تعالیٰ نے ظاہر مال و دولت پر فخر کرنے والوں کی مذمت فرمائی اور ان کی اس سوچ اور عمل کو قبیح فرمایا تو ابلیس کا ذکر فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ حکم الٰہی سے انحراف ابلیس کا طریقہ ہے یا جب اللہ تعالیٰ نے دنیا پر فخر کرنے اور دنیا سے شغف رکھنے والوں کا حال بیان فرمایا اور اس کا سبب دنیا کی محبت اور شیطان کی مکاری تھی۔ پہلے انہیں دنیا کی ظاہری چمک دمک سے عدم دلچسپی کی ترغیب دی کیونکہ یہ ساری چیزیں زوال پذیر ہیں اور پھر بتایا کہ نیک اعمال ہی باقی رہنے والے اور بہتر ہیں۔ پھر انہیں شیطان کی انسان سے پرانی دشمنی یاد دلا کر شیطان سے نفرت دلائی جارہی ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کو بار بار ذکر کرنے کی یہی حکمت ہے۔

۲؎ وہ جنوں میں سے تھا۔ یہ جملہ حال ہے اور اس سے پہلے قد مضمر ہے یا تعلیل کیلئے مستقل کلام ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے کہ پوچھا گیا اس نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو بتایا گیا کہ اس کی وجہ اس کا جنوں میں سے ہونا ہے۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ یہ دلیل ہے کہ ابلیس کو بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کا حکم تھا۔ فاء سببیہ ہے، اس میں دلیل ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، ابلیس نے نافرمانی کی تھی کیونکہ وہ اصل میں جن تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا ملائکہ کا ایک گروہ ہے جنہیں جن کہا جاتا ہے اور ان کی تخلیق نار السموم سے ہوتی ہے، اس معنی و مفہوم کے اعتبار سے مستثنیٰ متصل ہوگا (1) حضرت حسن فرماتے ہیں وہ جنوں میں سے تھا، ملائکہ میں سے نہیں تھا اور یہ جنوں کی اصل ہے جس طرح آدم انسانوں کی اصل ہیں، اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ حضرت حسن کا یہ کہنا کہ ابلیس جنوں کی اصل ہے جس طرح آدم انسانوں کی اصل ہیں بہت بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ یہ آیت کریمہ سورۂ رحمٰن اور سورۂ جن کی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں سے کچھ مومن نیکوکار ہیں اور کچھ اور ہیں جو جہنم کا ایندھن ہیں۔ ابلیس اور اس کی اولاد سب اللہ اور اللہ کے دوستوں کے دشمن ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے افتتخذونه الایه یہ ان کی دشمنی کے ظاہر ہونے کے باوجود ان کو دوست بنانے پر استفہام انکاری ہے، یعنی وہ تمہارا دشمن ہے پھر بھی تم میری اطاعت کے بجائے تم اس (پلید) کی اطاعت و پیروی کرتے ہو۔ یہ ظالموں کیلئے برا بدلہ ہے کہ انہوں نے ابلیس اور اس کی ذریت کو اللہ کا بدل بنایا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں مجاہد نے امام شعبی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک دن میں بیٹھا تھا کہ ایک مزدور آدمی آیا اور اس نے پوچھا، کیا ابلیس کی بیوی ہے؟ میں نے پہلے کچھ اور سوچا پھر غور کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا افتتخذ ونه وذریته اولیاء۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اولاد بغیر بیوی کے نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا ہاں اس کی بیوی ہے۔ امام شعبی کا یہ قول کہ بیوی کے بغیر اولاد نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 575 (الفکر)

ہو سکتی، یہ اس ارشاد سے مستفاد ہے اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (اس کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے) قتادہ فرماتے ہیں شیطانوں کی بھی اسی طرح اولاد ہوتی ہے جس طرح انسانوں کی اولاد ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیطان اپنی دبر میں اپنی دم داخل کرتا ہے پھر وہ انڈا دیتا ہے پھر وہ انڈا پھٹتا ہے تو شیطانوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں شیطان کی اولاد سے لاقیس اور ولھان ہے۔ (ولہان نماز اور وضو میں وسوسہ اندازی کرتا ہے)۔ الھفاف، مرۃ (مرۃ کی وجہ سے شیطان کی کنیت ابو مرہ ہے) زلنبور (یہ بازاروں میں گھومتا ہے لغو باتوں کو مزین کرتا ہے جھوٹی قسمیں اٹھواتا ہے اور سامان کی تعریف کرواتا ہے) الاعور۔ یہ انسان کو زنا پر برانگیختہ کرتا ہے، مرد کے ذکر اور عورت کی شرمگاہ میں پھونک مارتا ہے۔ مطوس (یہ لوگوں کے مونہوں میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ یعنی جھوٹی افواہیں پھیلاتا ہے) بتر (یہ مصیبت کے وقت چہرہ نوچنے، سینہ پیٹنے اور گریبان چاک کرنے کا عمل کراتا ہے) داسم یہ اس شخص کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے جو سلام نہیں کرتا اور اللہ کا ذکر نہیں کرتا، یہ شیطان اسے دکھاتا ہے کہ سامان نہیں اٹھایا گیا یا سامان کو حسن ترتیب سے نہیں رکھا گیا پھر جب وہ آدمی کھانا کھاتا ہے اور اس پر اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو وہ شیطان اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اعمش فرماتے ہیں ایک دفعہ میں گھر میں داخل ہوا اور میں نے اللہ کا ذکر نہ کیا اور نہ میں نے گھر والوں پر سلام کیا تو مجھے لوٹا دکھائی دیا میں نے گھر والوں سے کہا اسے اٹھاؤ اور میں ان سے جھگڑنے لگا۔ پھر مجھے یاد آیا تو میں نے کہا داسم داسم۔ (یعنی داسم نے مجھے دھوکا میں ڈال دیا) ابی بن کعب حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا وضو کیلئے ایک شیطان ہے جسے ولہان کہا جاتا ہے، پس پانی کے وسوسہ سے بچو (1) اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے، اہل حدیث کے نزدیک اس کی سند قوی نہیں ہے کیونکہ اس کا راوی خارجہ بن مصعب ہے۔

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عثمان بن العاص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ شیطان میرے اور میرے نماز اور میرے قرآن کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مجھ پر نماز کو خلط ملط کر دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شیطان ہے جس کا نام حزب ہے، جب تم اس کے وسوسہ کو محسوس کرو تو اللہ سے اس کی پناہ مانگا کرو اور تین مرتبہ بائیں طرف تھوک دیا کرو، عثمان بن ابی العاص فرماتے ہیں میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابلیس اپنا عرش پانی پر لگاتا ہے۔ پھر اپنے لشکر زمین میں بھیجتا ہے اور اس کا سب سے قریبی وہ ہوتا ہے جو بڑا فتنہ برپا کرتا ہے۔ ایک شیطان چیلہ آتا ہے، کہتا ہے میں نے فلاں کام کیا ہے، شیطان کہتا ہے تو نے کوئی اعلیٰ کام نہیں کیا پھر دوسرا چیلہ آتا ہے اور کہتا ہے میں نے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ شیطان اسے اس کے کام کی وجہ سے اپنا قریبی بنالیتا ہے اور کہتا ہے ہاں تو نے عظیم کام کیا ہے۔ اعمش کہتے ہیں میرا خیال ہے راوی نے فرمایا اور وہ اس کو اپنے ہاتھ چمٹا لیتا ہے۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

"میں نے ان سے مدد نہیں لی تھی جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور نہ (اس وقت ان سے مدد لی) جب خود انہیں پیدا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 575 (الفکر)

کیا اور میں نہیں بنایا کرتا گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو لے۔''

لے ابو جعفر نے جمع متکلم کا صیغہ نون اور الف کے ساتھ مَآاَشْهَدْنَا هُمْ پڑھا ہے اور جمع کا صیغہ تعظیم کیلئے ہوتا ہے، یعنی ہم نے ان اشیاء کی تخلیق میں ان شیطانوں سے کچھ مدد نہیں لی تا کہ یہ عبادت و طاعت کے مستحق قرار پائیں۔ کیونکہ عبادت کا استحقاق خالقیت (پیدا کرنے) کے توابع اور لوازم میں سے ہے۔ جو پیدا کرنے میں شریک ہوگا وہ عبادت میں بھی شریک ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اشارۃً ان سے مدد لینے کی نفی فرمائی تو اب صراحۃً نفی فرما دی اور فرمایا میں گمراہ لوگوں کو کائنات کی تخلیق میں مددگار و انصار بنانے والا نہیں ہوں۔ ضمیر کی جگہ صراحۃً المضلین کا اسم ذکر فرمایا یا اس کی وجہ ان کی مذمت کرنا اور ان سے امداد لینے کو بہت بعید سمجھنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مااشھدتھم میں ھم ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان مشرکوں کو اشیاء کی تخلیق کے وقت نہیں بلایا تھا اور نہ میں نے ان کو ایسے علوم کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن کو کوئی دوسرا نہیں جانتا حتیٰ کہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اگر ہم ایمان لائے تو سب لوگ ایمان لائیں گے۔ اے حبیب آپ نصرت دین کیلئے ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ فرمائیں۔ میری یہ شان کے لائق ہی نہیں ہے کہ میں اپنے دین کیلئے گمراہوں سے مدد حاصل کروں اس توجیہ کی تائید ماکنت کی قرأت کرتی ہے۔ کہ یہ خطاب کا صیغہ ہے اور خطاب حضور ﷺ کیلئے ہے۔ کلبی کہتے ہیں اشھدتھم میں ھم ضمیر کا مرجع ملائکہ ہیں۔ یعنی کائنات ارضی و سماوی کی تخلیق کے وقت فرشتوں کو میں نے نہیں حاضر کیا تھا تا کہ وہ عبادت کے مستحق ہوں اور انہیں اللہ کی بیٹیاں کہا جائے۔ اس توجیہ پر یہ وما کنت متخذ المضلین مستقل کلام ہوگی۔ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھنے والی صورت نہ ہوگی۔ یعنی میں نے نہ تو فرشتوں سے مدد لی ہے، نہ شیطانوں سے کہ یہ عبادت کے مستحق نہیں۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿٥٢﴾

''اور اس روز اللہ تعالیٰ (کفار کو) فرمائے گا بلاؤ میرے شریکوں کو جنہیں تم (میرا شریک) خیال کیا کرتے تھے لے تو وہ انہیں پکاریں گے پس وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور ہم حائل کر دیں گے ان کے درمیان ایک آڑ ۲ے۔''

لے یقول کو حمزہ نے نون کے ساتھ متکلم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کافروں سے فرمائے گا کہ بلاؤ میرے شریکوں کو جن کو تم میرا شریک یا اپنے شفیع خیال کرتے تھے تا کہ وہ تمہیں میرے عذاب سے بچائیں۔ شرکاء کی یاء متکلم کی طرف اضافت ان کے عقیدہ اور گمان کے مطابق ہے اور انہیں زجر و توبیخ کرنے کیلئے ہے بعض علماء فرماتے ہیں شرکاءی سے مراد ابلیس اور اس کی ذریت ہے۔

۲ے وہ بتوں کے پجاری اپنے بتوں کو فریاد کریں گے لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہ دیں گے اور اس دن ہم کفار اور ان کے بتوں کے درمیان آڑ بنا دیں گے موبقا اسم ظرف ہے جس کا معنی ہلاکت کی جگہ ہے اوبق کا معنی ہلاک کرنا ہے، عطاء اور ضحاک نے اس کا معنی ہلاکت کی جگہ کیا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ جہیم کی وادی ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں یہ آگ کی ایک نہر ہے جس میں آگ بہتی ہے اور اس کے کناروں پر کالے گدھوں کی طرح بڑے بڑے سانپ ہیں۔ ابن الاعرابی

فرماتے ہیں ہر دو چیزوں کے درمیان جو آڑ اور رکاوٹ ہوتی ہے اسے موبق کہتے ہیں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے۔ الفراء کہتا ہے البین کا معنی تعلق ہے معنی یہ ہے کہ ہم قیامت کے روز دنیا کے تعلقات کو ہلاک کر دیں گے، اس کی مثل قرآن میں ہے لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ (ان کے تعلقات کٹ جائیں گے) اس قرأت پر جنہوں نے بین کو مرفوع پڑھا ہے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

''اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہ پائیں گے اس سے نجات پانے کی کوئی جگہ 1۔''

1۔ مجرمون سے مراد مشرکین ہیں، یعنی مشرکین دوزخ کی آگ کو دیکھیں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ ابھی اس میں گرنے والے ہیں۔ امام احمد نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وظنوا انهم مواقعوها کے ارشاد کے متعلق فرمایا کہ کافر کو پچاس ہزار سال کھڑا کیا جائے گا جیسا کہ اس نے دنیا میں کوئی عمل نہیں کیا۔ کافر جہنم کو دیکھے گا تو چالیس سال کی مسافت سے بھی یوں محسوس کرے گا کہ وہ اس میں ابھی گرا (2)۔ مصرفاً یا تو مصدر ہے یا اسم ظرف ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

''اور بیشک ہم نے طرح طرح سے بار بار بیان کی ہیں اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہر قسم کی مثالیں 1۔ اور انسان ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے 2۔''

1۔ یعنی ہم نے اس قرآن میں بار بار اور نئے نئے اسلوب میں ایسی عبادتیں پیش کی ہیں جن میں ہر عبادت غرابت میں ضرب المثل کی مانند ہے اور انداز اس لیے اختیار فرمایا تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں بعض علماء فرماتے ہیں من کل مثل محذوف کی صفت ہے جو صرفنا کا مفعول ہے، یعنی مثالاً من جنس کل مثل یعنی ہم نے ہر قسم کی مثالیں بیان کیں تا کہ نصیحت حاصل کریں۔

2۔ ابن عباس فرماتے ہیں انسان سے مراد نضر بن الحارث ہے اور اس کا جھگڑا قرآن کے متعلق تھا۔ کلبی کہتے ہیں انسان سے مراد ابی بن خلف الجهمي ہے۔ بعض کہتے مطلق کفار مراد ہیں جیسا کہ ارشاد ہے وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ اور جھگڑتے ہیں کافر بے سروپا دلیلوں کے بعض علماء فرماتے ہیں یہ عموم پر ہے، اس میں مسلمان اور کافر کوئی تخصیص نہیں ہے۔ امام بخاری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو میرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کیا تم نماز تہجد نہیں پڑھتے ہو۔ حضرت علی فرماتے ہیں میں نے عرض کی ہماری روحیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اگر وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو ہم اٹھ پڑتے ہیں۔ جب میں نے یہ جواب دیا تو آپ ﷺ کوئی جواب دیے بغیر واپس تشریف لے گئے پھر میں نے سنا کہ آپ واپس پلٹتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مار کر یہ کہہ رہے تھے وکان الانسان اکثر شی جدلا (3)۔

جدلاً نسبت سے تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، معنی یہ ہے کہ انسان کا جھگڑا سب چیزوں سے زیادہ ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 577 (الفکر)　2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 415 (العلمیۃ)　3۔ ایضاً

"اور کس چیز نے روکا ہے لوگوں کو اس بات سے کہ وہ ایمان لے آئیں جب آ گئی ان کے پاس ہدایت (کی روشنی) اور مغفرت طلب کریں اپنے رب سے مگر یہ (کہ وہ منتظر ہیں) کہ آئے ان کے پاس اگلوں کا دستور یا آئے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب"

۱۔ الھدیٰ سے مراد، قرآن، اسلام اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح احکام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھدی سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس واطہر ہے، یعنی حق کے واضح ہونے کے بعد ایمان لانے اور اپنے رب کی بارگاہ میں کفر اور گناہوں کی معافی مانگنے سے کونسی چیز انہیں روکے ہوئے ہے۔ کیا یہ یہی چاہتے ہیں کہ پہلے لوگوں پر جس طرح ہمارا عذاب آیا اور ان کا نام ونشان مٹا دیا۔ ان پر بھی ایسا عذاب آئے اور انہیں تہس نہس کر دے، ان تاتیھم سے پہلے مضاف محذوف ہے، مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے اِلَّا تَقْدِیرَ اَنْ تَاْتِیَھُمْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ۔ بعض علماء نے یہ تقدیر ذکر کی ہے اِلَّا طَلَبَ اَنْ تَاْتِیَھُمْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ مِنْ مُعَایَنَۃِ الْعَذَابِ وَانْتِظَارِھِمْ ذَالِکَ۔ یعنی وہ پہلے لوگوں کے طریقہ پر عذاب کو دیکھنا چاہتے ہیں ان کی طرح عذاب کے منتظر ہیں کیونکہ انہوں نے بھی دعا مانگی تھی اللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ۔

۲۔ ابن عباس نے قبلاً کا معنی عیاناً کیا ہے، یعنی آمنے سامنے، روبرو، مجاہد نے اس کا معنی اچانک کیا ہے(1) اہل کوفہ، ابوجعفر نے قبلاً کو قاف اور باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبلاً جمع قبیلہ کی اور اس کا معنی مختلف قسم کا عذاب ہے اور اس پر نصب ضمیر سے یا العذاب سے حال ہونے کے اعتبار سے ہے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۚ وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْۤا اٰیٰتِیْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

"اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے اور جھگڑتے ہیں کافر بے سروپا دلیلوں کی آڑ لے کر تاکہ وہ مٹا دیں اس سے حق کو اور بنا لیا ہے انہوں نے میری آیتوں کو اور جن سے وہ ڈرائے گئے ایک مذاق"

۱۔ ہمارے رسولوں کی آمد کا مدعا مؤمنین کو ثواب اور جنت کی بشارت دینا اور کافروں کو عذاب اور جہنم سے ڈرانا ہے، یعنی ہم نے انہیں یہ قدرت دے کر نہیں بھیجا کہ یہ کفار کی تجویز کردہ آیات لے آئیں یا ساری مخلوق کو شاہراہ ہدایت پر گامزن کریں اور ان کو ہدایت دینے پر غالب ہوں۔

۲۔ کافر بے سروپا، لایعنی باتوں کے ساتھ جھگڑتے ہیں، کہتے ہیں کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ کبھی کہتے ہیں مَاۤ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (تم ہماری طرح بشر ہو) کبھی کہتے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو نازل فرماتا کبھی کہتے ہیں) لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (کیوں نہ قرآن کو ان دو شہروں میں سے کسی عظیم آدمی پر اتارا گیا۔) کبھی کہتے ہیں کیا تم جو ذبح کرو وہ حلال ہے، جسے اللہ تعالیٰ مار دے وہ حرام ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 578 (الفکر)

[1] دحض کا اصل معنی پھسلنا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان غیر معقول باتوں سے ان کا مقصود یہ ہے کہ حق کو اپنی جگہ سے پھسلا دیں۔

[2] انہوں نے قرآن اور جس عذاب سے انہیں ڈرایا گیا ہے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ ما انذروا سے پہلے ما مصدریہ یا ما موصولہ ہے۔ وہ مشرک کہتے ہیں لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس قرآن کی مثل کہہ لیں۔ يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (یہ قرآن انہیں کوئی بشر سکھاتا ہے) اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (یہ قرآن تو پہلے لوگوں کے قصے ہیں) عذاب کا مذاق اس طرح اڑاتے ہیں کہ کہتے ہیں لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (ہم جو کہتے ہیں اس کی وجہ سے اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

"اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پس اس نے روگردانی کر لی ان سے اور فراموش کر دیا اس نے ان (اعمال بد کو) جو آگے بھیجے تھے اس کے دونوں ہاتھوں نے [1]۔ ہم نے ڈال دیے ان کے دلوں پر پردے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو جب بھی وہ ہدایت قبول نہیں کریں گے [2]۔"

[1] یعنی اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اس قرآن سے نصیحت کی گئی جس کے الفاظ اور معانی سراپا اعجاز ہیں، اس نے نصیحت قبول کرنے کے بجائے اس میں غور و فکر کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور اپنے اعمال خبیثہ، کفر، عقائد باطلہ کو فراموش کر دیا اور ان کے انجام کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ اس اعراض اور فراموشی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کے دل پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے دل کفر کی تیرگیوں اور تاریکیوں سے ڈھک دیئے گئے ہیں تاکہ انجام کار قرآن حکیم کو سمجھنے کی نعمت حاصل نہ کریں۔ ان یفقھوہ سے پہلے لام مقدر ہے جو عاقبت کیلئے ہے۔ ان یفقھوہ میں ہ ضمیر مذکر اور مفرد ذکر کی ہے حالانکہ اس کا مرجع آیات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر کو معنی کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے اور آیات سے مراد قرآن ہی ہے۔ اور ہم نے ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے، ہم نے انہیں آیات قرآنیہ کو سننے کی صلاحیت ہی عطا نہیں فرمائی۔ علی آذانھم کا عطف علی قلوبھم پر ہے، یعنی جَعَلْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔

[2] اے میرے حبیب اگر آپ ان کو کتنی پر خلوص دعوت توحید دیں پھر بھی یہ ہدایت نہ پائیں گے کیونکہ ان کے دلوں پر پردے پڑے ہیں اور کانوں میں گرانی ہے۔ ان میں ہدایت کی استعداد ہی نہیں ہے ان کے پاس ہدایت حاصل کرنے والے سب ذرائع مفقود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے ساتھ معاملہ کیا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں تھا کہ وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾

"اور آپ کا پروردگار تو بہت بخشنے والا بڑا ہی رحمت والا ہے۔ اگر وہ پکڑ لیتا انہیں ان کے کیے پر تو جلد ان پر عذاب بھیجتا

(وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کو سزا دینے کا ایک وقت مقرر ہے۔ نہیں پائیں گے اس وقت اس کے بغیر کوئی پناہ کی جگہ۔ ؎ ''

؎ اے پیارے! اے روح کائنات' تیری رب کی بخشش و مغفرت بہت وسیع ہے، وہ صفت رحمت سے موصوف ہے۔ اور اس کی مغفرت و رحمت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے قریش مکہ کو فوراً عذاب کی چکی میں پیس نہیں دیا حالانکہ انہوں نے اس کے نبی مکرم ﷺ سے دشمنی اور عداوت کی حد کردی ہے' اس نے ان کے لئے بھی عذاب دینے کا وقت مقرر فرمایا ہے۔ موعد سے مراد قیامت کا دن ہے یا جنگ بدر کا دن ہے۔ جب وہ وقت مقرر آ جائے گا تو یہ میرے نبی ﷺ کے گستاخ کوئی پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔ آل کا معنی نجات پانا ہے اور آل الیہ کا معنی کسی کے پاس نجات حاصل کرنا ہے۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

'' اور یہ بستیاں ہیں ہم نے تباہ کر دیا ان کے باشندوں کو جب وہ ستم شعار بن گئے ؎ اور ہم نے مقرر کر دی تھی ان کی ہلاکت کیلئے ایک میعاد ؎ ''

؎ ان بستیوں سے مراد قوم نوح' عاد اور ثمود کی بستیاں ہیں اور ان لوگوں کی بستیاں ہیں جو ان کی صفت سے موصوف تھے۔ تلک القری مبتدا ہے اور اهلكنا هم خبر ہے۔ یا تلک القری فعل مضمر کا مفعول ہے جس کی تعبیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ موصوف یا صفت سے پہلے مضاف کا مقدر ماننا ضروری ہے۔ تاکہ ضمیر کا مرجع صحیح ہو جائے۔ یعنی اصحاب تلک القری ہوگا یا تلک اصحاب القری ہے۔ یعنی ہم نے ان بستیوں کے باشندوں کو ہلاک کر دیا جنہوں نے قریش مکہ کی طرح کفر اور گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔

؎ ابوبکر نے یہاں اور سورۂ نمل میں میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ مهلكهم پڑھا ہے اور حفص نے میم کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ شاذ مصادر کے وزن پر پڑھا ہے۔ جیسے مرجع' المحیض' اور باقی قراء نے میم کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ اهلكه سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ موعداً سے مراد وقت معلوم ہے۔ یعنی جس طرح پہلی ظالم قوموں کی ہلاکت کا وقت مقرر تھا اور وہ اس وقت سے لمحہ بھر مقدم و مؤخر نہ ہوئے تو یہ کفار مکہ بھی اپنے مقررہ وقت سے ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہ ہوں گے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

'' اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ پہنچوں جہاں دو دریا ملتے ہیں ؎ یا (چلتے چلتے) گزار دوں گا مدت دراز۔ ؎ ''

؎ آیت میں جس موسیٰ کا ذکر ہو رہا ہے وہ موسیٰ بن عمران ہیں جیسا کہ صحیح حدیث دلالت کرتی ہے اور نوجوان سے مراد یوشع بن نون بن افراثیم بن یوسف علیہ السلام ہیں۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید نون جو یوشع کے باپ ذکر کئے گئے ہیں وہ آل افراثیم سے ہوں کیونکہ یوشع اور نون کے درمیان بہت زیادہ زمانہ ہوا ہے، یعنی باپ نہیں ہیں، آل افراثیم کی نسل سے ہیں۔ لا ابرح کا معنی ہے کہ میں متواتر چلتا رہوں گا۔ خبر کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ ہر حالت خبر پر دلالت کر رہی ہے اور وہ سفر ہے اور حتی ابلغ کا قول بھی خبر پر دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ حتى ابلغ مجمع البحرين یہ غایت ہے جو کسی چیز کی غایت ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ پس وہی لا ابرح کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل لا يبرح مسيرى حتى ابلغ هو۔ اس صورت میں اسم محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے (یعنی مسیر کو حذف کر کے یاء ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے) پھر ضمیر اور فعل بدل گئے ہیں، یعنی یاء ضمیر مرفوع مستتر ضمیر میں

بدل گئی (جبکہ پہلے مجروراور بارزتھی) اور فعل غائب کے صیغہ **لا ابرح** سے متکلم کے صیغہ **لا ابرج** میں بدل گیا ہو۔ اور **حتی ابلغ** خبر ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے **لا ابرح** تامہ ہو یعنی ہمیشہ اس حالت پر چلتا رہوں گا اور تلاش کرتا رہوں گا اور کبھی جدا نہ ہوں گا۔ جب تامہ ہوگا تو اسے خبر کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ **مجمع البحرین**: مشرق کی جانب سے فارس اور روم کے سمندروں کے ملنے کی جگہ مراد ہے قتادہ نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں اس سے مراد طنجہ کا شہر ہے' اور ابی بن کعب کے نزدیک افریقہ مراد ہے۔

۲؎ قاموس میں **الحقبۃ بالضمتین ثمانون سنۃ او اکثر والدھر و السنۃ و السنون**۔ یعنی حقبہ حا اور قاف کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد اسی سال یا اس سے زیادہ مدت ہوتی ہے' اور زمانہ' سال' کئی سال کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ **الحقب' الدھر'** یعنی حقب سے مراد زمانہ ہے۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا الحقب سے مراد اسی (80) سال ہیں بعض نے فرمایا ستر (70) سال ہیں۔ ابن ابی شیبہ' ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اس قول کو نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں چلتا رہوں گا حتی کہ دونوں امروں میں سے ایک امر واقع ہوجائے یا تو میں **مجمع البحرین** تک پہنچ جاؤں گا یا چلتے چلتے زمانہ گزار دوں گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ او بمعنی الا ہو' اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں چلتا رہوں گا حتی کہ میں **مجمع البحرین** کو پالوں گا یا میں اتنا زمانہ گزار دوں گا کہ مجھے یقین ہوجائے گا کہ وہ مجمع مجھے نہیں مل سکتا۔

امام بخاری اور مسلم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے' فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے کہا کہ نوف البکالی کہتا ہے کہ خضر علیہ السلام کے ساتھی موسیٰ سے مراد موسیٰ بنی اسرائیل نہیں ہے' ابن عباس نے فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ بکا ہے' ہمیں ابی بن کعب نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ تمام لوگوں سے زیادہ علم والا کون ہے؟ آپ نے جواب دیا میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف علم کو منسوب نہیں کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی بھیجی کہ **مجمع البحرین** میں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یارب میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے ساتھ ایک مچھلی ٹوکری میں رکھ لو' جہاں وہ مچھلی تم سے گم ہوجائے وہی میرے بندے کی قیام گاہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام حکم الٰہی کے مطابق مچھلی ٹوکری میں لیکر چل پڑے اور آپ کے ساتھ نوجوان یوشع بن نون بھی چل پڑا۔ چلتے چلتے دونوں ایک چٹان تک پہنچے' اس پر دونوں سر رکھ کر سو گئے۔ مچھلی نے ٹوکری میں حرکت کی اور اس سے باہر نکلی پھر سمندر میں گر گئی اور درمیان میں سرنگ کی طرح راستہ بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کا چلنا روک لیا اور وہ اس پر محراب کی طرح ہوگیا۔ جب دونوں بیدار ہوئے تو یوشع جو سب کچھ مچھلی کا نکلنا اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے تھے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دینا بھول گئے۔ دن کا بقیہ حصہ بھی وہ چلتے رہے اور رات کو بھی سفر جاری رکھا حتی کہ جب دوسرا دن آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صبح کا کھانا لاؤ' ہمیں اس سفر میں بہت بڑی مشقت برداشت کرنی پڑی ہے۔ فرمایا موسیٰ علیہ السلام کو تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی حتی کہ وہ اس جگہ سے آگے گذر گئے جہاں پہنچنے کا اللہ نے حکم دیا تھا۔ یوشع نے کہا اے موسیٰ کلیم آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم ستانے کیلئے اس کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔ اس نے سمندر میں اپنا راستہ بنا لیا تھا' بڑی تعجب کی بات ہے۔ فرمایا مچھلی نوجوان کیلئے سرنگ کی صورت میں تھی اور موسیٰ کیلئے تعجب کی بات تھی' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہی تو جگہ تھی جس کی ہم تلاش میں تھے' وہ ہماری منزل

مراد تھی۔ وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر واپس لوٹے۔ حتیٰ کہ اسی چٹان تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک شخص کپڑا لپیٹے سویا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے رشد و ہدایت کے علم سے کچھ سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا اے موسیٰ کلیم تم میرے ساتھ صبر کی طاقت نہیں رکھ سکو گے۔ مجھے اللہ نے ایسا علم عطا فرمایا ہے جو تم نہیں جانتے اور آپ کو ایسا علم عطا فرمایا ہے جس کو میں نہیں جانتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ مجھے ان شاء اللہ صابر پائیں گے اور میں تمہارے کسی امر کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ حضرت خضر نے فرمایا اگر تم نے میرے ساتھ چلنا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہیں کرنا یہاں تک کہ میں خود تجھے اس کے متعلق بتاؤں۔ وہ دونوں ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ایک کشتی پاس سے گذری تو خضر علیہ السلام نے انہیں سوار کرنے کو کہا۔ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا۔ جب وہ دونوں سوار ہو گئے تو تھوڑی دیر بعد حضرت خضر ہتھوڑے کے ساتھ کشتی کا ایک پھٹہ اکھیڑنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا جناب انہوں نے ہمیں بغیر کرائے کے کشتی پر سوار کیا ہے اور آپ ان کی کشتی کا تختہ نکال رہے ہیں تاکہ سب غرق ہو جائیں، یہ آپ نے بڑا برا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ موسیٰ کلیم نے عرض کی حضور میری بھول پر میرا مواخذہ نہ فرمائیں اور میرے اس معاملہ میں مجھ سے سختی نہ کرو(1)۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام سے پہلا سوال بھول کر ہوا تھا۔ دوسرا شرط کی بناء پر اور تیسرا جان بوجھ کر کیا تھا' فرمایا ایک چڑیا آئی اور کشتی کی ایک طرف بیٹھ گئی پھر اس نے دریا سے پانی کی چونچ بھری۔ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا میرا اور تیرا علم اللہ کے علم کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر سے چڑیا نے پانی لیا ہے۔ پھر وہ ساحل پر چل پڑے۔ راستہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے بچوں میں کھیلتے ہوئے ایک بچہ دیکھا تو خضر علیہ السلام نے اسکو پکڑا اور ہاتھ سے ہی اس کا سر تن سے جدا کر کے قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام (تڑپ گئے) اور فرمایا بغیر کسی حق کے ایک معصوم نفس کو آپ نے قتل کر دیا، آپ نے بڑا نازیبا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ فرمایا یہ پہلے سے زیادہ سخت کام کیا ہے۔ پھر کہا اگر میں آپ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو مجھے آپ ساتھ نہ رکھیں اور آپ میری طرف سے معذور ہو گئے۔ پھر وہ چل پڑے حتیٰ کہ جب انکا گذر ایک گاؤں سے ہوا' گاؤں والوں سے انہوں نے کھانا مانگا تو انہوں نے ان کی میزبانی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی گاؤں میں دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اسے درست کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے بھائی یہ ایسی قوم تھی جنہوں نے ہمیں کھانا کھلانے اور میزبانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر آپ چاہتے تو کم از کم ان سے مزدوری ہی لے لیتے۔ حضرت خضر نے فرمایا بس سنگت ختم، اب میرے اور تیرے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے۔...... ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا تک حضرت خضر علیہ السلام نے کلام فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہماری خواہش ہے کہ موسیٰ کلیم صبر کرتے تاکہ ہم پر ان کے مزید واقعات بیان کئے جاتے(2)۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تیرے بندوں میں سے محبوب ترین بندہ کونسا ہے۔ فرمایا جو مجھے یاد کرتا ہے اور کسی حالت میں مجھے نہیں بھولتا۔ پھر پوچھا کون سا بندہ عمدہ فیصلے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 417 (العلمیۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 418

کرنے والا ہے؟ فرمایا جو حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور خواہش نفس کی پیروی نہیں کرتا۔ پھر پوچھا زیادہ عالم کون ہے؟ فرمایا جو اپنے علم کے باوجود لوگوں سے علم حاصل کرتا ہے اس خواہش سے کہ ہوسکتا ہے کوئی کلمہ ایسا مل جائے جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور ہلاکت سے لوٹا دے (1)۔ پھر موسیٰ کلیم علیہ السلام نے عرض کی اگر تیرے بندوں میں سے زیادہ علم والا کوئی موجود ہے تو میری اس کی طرف رہنمائی فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ سے زیادہ علم والا خضر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اسے کہاں تلاش کروں؟ فرمایا چٹان کے قریب ساحل سمندر پر۔ عرض کی میں اس تک کیسے پہنچوں گا؟ فرمایا ایک مچھلی ٹوکری میں لے لو جہاں وہ گم ہو جائے وہی میرے خضر کا مقام ہے۔ موسیٰ کلیم نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا جب مچھلی گم ہو جائے تو مجھے بتانا۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

"پھر جب وہ دونوں پہنچے جہاں آپس میں دو دریا ملتے ہیں دونوں بھول گئے اپنی مچھلی کو تو ۱؎ بنالیا اس نے اپنا راستہ دریا میں سرنگ کی طرح ۔۲؎"

۱؎ بَيْنِهِمَا ظرف ہے مجمع کی اس کی طرف اضافت یا توسعت کی بناء پر ہے یا بین بمعنی وصل ہے اس لئے اس کی طرف مجمع کو مضاف کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ دونوں اس چٹان کے پاس پہنچے جو دو دریاؤں کے سنگھم کے پاس تھی، وہ بھونی ہوئی مچھلی پھڑکی اور زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی۔ قدرت کی یہ کرشمہ سازی اسلئے ہوئی تا کہ موسیٰ علیہ السلام یا خضر علیہ السلام کیلئے معجزہ بن جائے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت سفیان نے فرمایا لوگ یہ خیال کرتے ہیں اس چٹان کے پاس آب حیات ہے، اس کا پانی جس چیز کو لگتا ہے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اور سمندر میں جا گرتی ہے۔ کلبی کہتے ہیں یوشع بن نون نے آب حیات سے وضو کیا تھا اور اس کا پانی اس نمکین مچھلی پر ٹوکری میں چھڑکا تھا۔ اس پانی کی وجہ سے وہ مچھلی زندہ ہو کر دریا میں کود پڑی تھی اور پانی میں دم مارتی ہوئی چلی گئی۔ جس پانی کے ساتھ اس کا جسم مس کرتا وہ خشک ہو جاتا اور وہ آگے چلی جاتی۔ موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو اس مچھلی کا حال پوچھنا بھول گئے اور یوشع بتانا بھول گئے کہ مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مچھلی یوشع کے پاس تھی اور وہی بھولے تھے لیکن بھولنے کی نسبت دونوں کی طرف اس لئے فرمائی کیونکہ وہ دونوں کا زاد سفر تھی جیسے عرب کہتے ہیں قوم فلاں جگہ گئی اور زاد راہ بھی ساتھ لے گئی حالانکہ زاد راہ ایک شخص کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن اٹھانے اور ساتھ لے جانے کی نسبت تمام کی طرف کرتے ہیں (2)۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کیلئے سرنگ کی طرح راستہ بنا دیا تھا سرب کا معنی راستہ ہے، اس سے سارب بالنہار ہے (دن کے وقت راستہ پر چلنے والا) بعض علماء فرماتے ہیں سرب کا معنی طویل دراڑ ہے۔ صحیح حدیث کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کے چلنے کو روک لیا تھا اور وہ پانی اس پر محراب کی شکل میں ہو گیا تھا۔ سربا پر نصب مفعول ثانی ہونے کی بناء پر ہے اور فی البحر یا تو سربا سے یا سبیلہ سے حال ہے اور اتخذ کے متعلق کرنا بھی جائز ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

"پس جب وہاں سے آگے بڑھ گئے آپ نے اپنے جوان ساتھی سے کہا لے آؤ ہمارا صبح کا کھانا بیشک ہمیں برداشت کرنی پڑی ہے اپنے اس سفر میں بڑی مشقت ۔۱؎"

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 423 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 582 (الفکر)

1۔ موسیٰ علیہ السلام اور یوشع چلتے چلتے مجمع سے گذر گئے حتی کہ دوسرے دن صبح کے ناشتہ کا وقت ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا صبح کا کھانا لے آؤ۔ غداء اس کھانے کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو اور العشاء جو شام کے کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو۔ نصب کا معنی تھکاوٹ اور شدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چٹان سے گذرنے کے بعد بھوک اور تھکاوٹ طاری کی تا کہ مچھلی کی یاد آئے اور اپنی منزل مقصود کی طرف واپس لوٹیں۔ صحیح حدیث میں گذر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو چٹان سے گذرنے سے پہلے کوئی تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

''اس ساتھی نے کہا (اے کلیم) آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم (ستانے کیلئے) اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے بنا لیا تھا اپنا راستہ دریا میں بڑے تعجب کی بات ہے۔ لے''

لے امام بغوی نے لکھا ہے کہ ہقل بن زیاد نے فرمایا یہ وہ چٹان ہے جو نہر الزیت کے قریب ہے(1)۔ امام بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یوشع نے جب یہ مچھلی کا زندہ ہونا وغیرہ دیکھا تھا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو سارا واقعہ سنانے کیلئے کھڑے ہوئے تھے لیکن پھر بتانا بھول گئے تھے۔ حتی کہ دوسرے دن ظہر کی نماز پڑھ کر بتایا(2) اور پھر اپنا عذر پیش کیا۔ اَنْسٰنِيْهُ کو حفص نے وصل کی صورت میں ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ فتح میں علیہ اللہ میں ھا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں ھا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی شیطان نے مجھے آپ کے سامنے مچھلی کا امر بیان کرنا فراموش کرا دیا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید وہ اس نے مچھلی کے زندہ ہونے اور دریا میں گرنے کی وجہ سے قدرت کی نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا، ان کی وجہ سے وہ کلیتہً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا ہو اور عبرت میں مستغرق ہو گیا ہو۔ اس وجہ سے مچھلی کا ذکر بھول گیا ہو، لیکن شیطان کی طرف بھلانے کی نسبت اپنے نفس کو روندنے کیلئے کی ہو۔ یا اس لئے کہ دونوں اطراف کے برداشت کی طاقت نہ ہونا اور ایک طرف سے غافل ہو کر دوسری طرف کلیتہً متوجہ ہو جانا یقیناً ایسا کرنے والے کیلئے نقصان شمار ہوتا ہے(3)۔ واللہ اعلم۔ عجباً مفعول ثانی سبیلاً محذوف کی صفت ہے۔ موصوف کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے اور ظرف ظرف لغو ہے۔ یا یہ اتخذ کے مصدر اتخاذاً کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے اور مفعول ثانی فی البحر ظرف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اور اس کا فعل مضمر ہے۔ گویا نوجوان نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرتے ہوئے آخر میں فرمایا عجبت عجباً۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے ہے کہ جب یوشع نے انہیں بتایا کہ مچھلی نے سمندر میں راستہ بنا لیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا عجبت عجباً۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اتخذ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کے سمندر میں راستہ بنانے کو عجیب جانا۔ اس صورت میں عجباً حال ہوگا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾

''آپ نے فرمایا یہی تو وہ ہے جس کی ہم جستجو کر رہے تھے پس وہ دونوں لوٹے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے۔ لے''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 583 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 204 (العلمیة)

لے نبغ کی یاءکو ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں قائم رکھا ہے جبکہ نافع ،ابوعمرو اور کسائی نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے ، باقی قراء نے دونوں حالتوں (وقت وصل) میں حذف کیا ہے ۔ قصصا یا تو فعل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا او قد کا مصدر ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا مصدر یعنی اسم فاعل ہے اور حال کی حیثیت سے منصوب ہے ۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

''تو پایا انہوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے لے جسے ہم نے عطا فرمائی تھی رحمت اپنی جناب سے اور ہم نے سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے (خاص) علم ۔ ۲؎''

لے عبداً سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک خضر علیہ السلام ہیں حالانکہ صحیح حدیث میں وارد ہے آپ کا نام بلیا بن ملکان تھا ۔ بعض نے یسع اور بعض نے الیاس نام لکھا ہے اور خضر آپ کا لقب تھا ۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ہمام بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپ کو خضر اس لئے کہا جاتا کہ آپ خشک زمین اور خشک گھاس پر تشریف فرما ہوتے تو وہ (آپ کی برکت سے) سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی (1) ۔ مجاہد نے آپ کے خضر لقب کی یہ وجہ لکھی ہے کہ آپ جہاں نماز پڑھتے ، اردگرد کا علاقہ سرسبز و شاداب ہو جاتا ۔ امام بغوی فرماتے ہیں ، بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کی نسل سے تھے ۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ بادشاہوں کے بیٹوں میں سے تھے جنہوں نے دنیا سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا (2) ۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ آپ بنی اسرائیل سے نہ تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کئے گئے تھے ۔ اگر حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق بنی اسرائیل سے ہوتا تو آپ موسیٰ علیہ السلام کے متبعین سے ہوتے ۔ جبکہ ظاہر اس کے خلاف ہے ۔ حدیث صحیح میں گذر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کو کپڑا لپیٹے ہوئے دیکھا تو ان پر سلام کیا' خضر علیہ السلام نے کہا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں ۔ فرمایا میں موسیٰ ہوں ۔ خضر علیہ السلام نے کہا موسیٰ بنی سرائیل ، فرمایا ہاں ۔ میں جناب کے پاس آیا ہوں تا کہ آپ مجھے رشد و ہدایت کا وہ علم سکھائیں (جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے) آپ کو سکھایا گیا ہے ۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ گدی کے بل چت لیٹے ہوئے تھے اور کپڑا لپیٹے ہوئے تھے ، کچھ کپڑا آپ کے سر کے نیچے تھا اور کچھ پاؤں کے نیچے تھا ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت ملاقات ہوئی جب خضر علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے ۔ یہ بھی روایت ہے کہ سبز چادر پر ملاقات ہوئی تھی سمندر کے کنارے پر ۔

۲؎ رحمۃ سے مراد وحی اور نبوت ہے' من لدنا علما سے مراد مخصوص علم ہے جس کا حصول ذات الٰہی کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں اور وہ علم ذات و صفات ہے' امام بغوی فرماتے ہیں اکثر اہل علم کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام نبی نہیں تھے ۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک یہ قول محل نظر ہے کیونکہ اولیاء کرام کو جو الہام وغیرہ سے علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے ، اس میں خطاء کا احتمال ہوتا ہے ، اسی وجہ سے اولیاء کرام کے علوم میں تعارض پایا جاتا ہے ۔ اگر خضر علیہ السلام نبی نہ ہوتے تو اس الہام کی بناء پر کہ یہ بچہ بڑا ہو کر والدین کو کفر پر مجبور کرے گا ، معصوم بچے کو قتل کرنا آپ کیلئے کبھی جائز نہ ہوتا ۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾

''کہا اس بندے کو موسیٰ نے کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو

1 ۔ تفسیر بغوی ، جلد 3 ، صفحہ 584 (الفکر) ۔۔۔ 2 ۔ ایضاً

آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ؎ ‘‘

؎ کلام کا حق تو یہ تھا کہ آپ اس طرح کہتے کہ میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کی اتباع کروں اور آپ کی سنگت اختیار کروں۔ لیکن آپ نے اتباع اور سنگت کا اذن طلب کرنے کیلئے اسلوب بیان بدل دیا۔ تعلمن میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ نافع اور ابوعمرو نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے، یعنی کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے سکھائیں علی ان تعلمن حال ہے اتبعک کی ضمیر مرفوع سے یا ضمیر منصوب سے۔ رشداً کو ابوعمرو نے راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے بُخل اور بَخَل۔ رشد کا معنی بھلائی اور خیر کا پہنچانا ہے یہ تعلمنی کا مفعول ہے اور علمت کا مفعول ہوتا ہے، یعنی عرف کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رشدً ابتعک کی علت ہو۔ یا فعل مضمر کا مصدر ہو یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ کبھی کبھی مفضول کو اپنے سے افضل پر کوئی جزوی فضیلت ہوتی ہے اور فاضل کو چاہئے کہ فضیلت کا وہ حصہ مفضول سے حاصل کرے اور اس کو عار نہ سمجھے جیسا کہ مذکورہ آیات کی تفسیر میں گذرا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے پوچھا کہ تیرا کونسا بندہ زیادہ عالم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو اپنے علم کے ہوتے ہوئے لوگوں سے علم سیکھتا ہے، شاید کہ کوئی کلمہ ایسا مل جائے جو اس کی ہدایت کے راستہ کی طرف راہنمائی کرے اور اسے ہلاکت کے گڑھے سے بچالے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حکمت کا کلمہ مومن کی گمشدہ چیز ہے جہاں سے ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے اور ابن عسا کر نے حضرت علی رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے منقول درود بھی اسی باب سے متعلق ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ(1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے تعلیم کا سوال کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تورات علم کے لئے کافی ہے اور عمل کے لئے بنی اسرائیل کی راہنمائی کافی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے(2)۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کلام میں انتہائی ادب اور تواضع کا اظہار کیا اور اتباع کی اجازت طلب کی اور پھر اللہ تعالیٰ کے خصوصی علم سے کچھ سکھانے کی استدعا کی۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾

’’اس بندے نے کہا (اے موسیٰ) آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ؎ ‘‘

؎ حفص نے مَعِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رہ کر صبر کرنے کی طاقت کی نفی بڑی تاکیدی کلام کے ساتھ کی ہے۔ ایسی ہونی نہیں چاہئے تھی، اس لئے پھر خود ہی علت بیان فرمائی اور خود ہی ساتھ نہ رہ سکنے کا ان کی طرف سے عذر پیش کردیا۔

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

1۔ شرح سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 489 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585 (الفکر)

''اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جس کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔ [1]''

[1] خبراً کا معنی علم ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے یا تمیز ہے یا مفعول مطلق ہے کیونکہ لم تحط بہ کا معنی لم تخبرہ ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رہ کر صبر کرنے کی نفی اس لئے فرمائی کیونکہ خضر علیہ السلام کو معلوم تھا کہ ان سے ایسے امور صادر ہوں گے جو ظاہراً غیر شرعی ہوں گے اور انبیاء کرام غیر شرعی امور پر خاموش نہیں رہ سکتے جب تک کہ انکی وجہ جواز ظاہر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ انبیاء کرام کی شریعتیں ایسے قواعد کلیہ پر مبنی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کی نسبت سے عموماً اصلاح کا موجب ہوتے ہیں۔ پس ان کی اصلاح وجوہ بھی عام لوگوں کے لئے ظاہر ہونی چاہئیں۔ اور وہ احکام جو اُن انبیاء کرام کی طرف وحی کئے جاتے ہیں وہ امتوں کی طرف مبعوث نہیں کئے جاتے بلکہ وہ انبیاء کرام کے اپنے نفوس کی اصلاح کے لئے وحی کیے جاتے ہیں یا ان امور کی اطاعت کے لئے ہوتے ہیں جو انبیاء کرام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتے ہیں۔ پس ایسے احکامات ایسی حکمتوں پر مبنی ہوتے ہیں جن کی وجہ غیر عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام کے فعل پر انکار کی وجہ بھی یہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا شرب مختلف تھا۔ (جبکہ استفادہ (علم حاصل کرنا) کی شرائط میں سے ہے کہ عالم و متعلم کا شرب ایک ہو۔ متعلم استاد کی پیروی کرے اور اعتراض کی زبان نہ کھولے) حضرت خضر علیہ السلام نے صبر پر استطاعت نہ رکھنے کو عدم افادہ کی علت بنایا۔ علت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گویا یوں فرمایا کہ میری معیت وصحبت تجھے فائدہ نہ دے گی کیونکہ تو میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔

اسی وجہ سے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مرید پر واجب ہے کہ وہ شیخ کی کسی بات پر اعتراض نہ کرے اگر چہ اس کے ہاتھ سے کوئی غیر شرعی فعل بھی ظاہر ہو بشرطیکہ مرید پر ثابت ہو چکا ہو کہ مرشد کریم اہل کمال اور اہل تکمیل افراد سے ہے اگر مرید مشرب کے اختلاف کی وجہ سے صبر کی طاقت نہ رکھتا ہوں تو اس پر واجب ہے کہ مرشد کی مصاحبت ترک کر دے لیکن اس کے کمال کا منکر نہ ہو۔

اگر کوئی یہ کہے کہ شریعت محمدیہ عام اور دائمی ہے۔ اب اس میں نسخ اور تبدیلی کا احتمال ممکن ہی نہیں ہے تو کوئی عارف اگر غیر شرعی کام کرے تو اس پر کیسے خاموش رہا جائے۔ تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ دین میں کسی حرام چیز کو کوئی بھی مباح تصور نہیں کرتا۔ پس جو مدعی ولایت ہے اس سے بھی یہ متصور نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بچہ کو قتل کر دے اور یہ کہے کہ اللہ نے مجھے الہام کیا ہے کہ یہ بڑا ہو کر والدین کو کفر اور سرکشی پر مجبور کرے گا۔ لیکن کبھی ایک چیز کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہوتے ہیں اور ہر ایک قول کی بنیاد دلیل شرعی پر قائم ہوتی ہے جیسا کہ سماع، ذکر بالجہر وغیرہ میں اولیاء کرام میں سے کوئی اگر ان افعال کو کرتا ہے اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ جو کسی عالم کی تقلید کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سلامتی کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ کبھی ایک چیز ظاہراً غیر شرعی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہوتی جیسے جو بوتل میں پانی ڈال کر پیئے اور لوگوں کو دکھائے کہ یہ شراب ہے، اس سے اس کی غرض یہ ہو کہ مخلوق کا ہجوم کم ہو جائے اور اس کے معمولات میں خلل نہ آئے۔ اور کبھی اللہ والے سے گناہ صغیرہ سرزد ہوتا ہے اور اس کے گناہ ہونے کا وہ اعتراف بھی کرتا ہے۔ (یعنی گناہ اولیاء سے سرزد ہو سکتا ہے) جبکہ علماء کا اجماع ہے کہ گناہ سے عصمت انبیاء کرام کا خاصہ ہے۔ معصیت کا صدور ولایت کے منافی نہیں ہے۔ پس مرید کے لئے شیخ پر اعتراض جائز نہیں بلکہ اس فعل کو اچھا نہ سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے اور اس شیخ کے کمال کا انکار بھی نہ کرے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے بارے میں نیک گمان۔ بعض اولیاء کرام کے مقالات کشف اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس ان پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے بلکہ جہاں تک ممکن ہو ان کی صحیح محمل پر تاویل کرنی چاہئے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے۔ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا [1] اور اگر

ان کے اقوال کا کوئی صحیح محل بیان نہ ہو سکے تو اسے سکر پر محمول کرنا چاہئے۔ کیونکہ فقہاء کا فتویٰ ہے کہ جب مباح چیز سے نشہ چڑھ جائے تو وہ بندہ معذور ہوگا اور اس کی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ سے محبت کے غلبہ کی وجہ سے کوئی مدہوش ہو جائے تو وہ کیسے اپنے کلام میں معذور نہ ہوگا۔ یا ان کی باتوں کو اس پر محمول کیا جائے کہ قائل کی مراد کو سامع سمجھنے سے قاصر ہے۔ یا اس پر محمول کیا جائے کہ کہنے والے کا وہ کلام اور معنی مراد ہے جو ظاہری معنی کے خلاف ہے کیونکہ عبارات محسوس معانی یا معقولہ معانی پر منحصر ہوتی ہیں جو امور محسوسہ سے مستنبط معانی ہوتے ہیں۔ لیکن جس کی کوئی مثال اور نظیر نہ ہو جیسے ذات وصفات کے حقائق جب قلب سلیم پر متجلی ہوتے ہیں اور وہ ان کو بیان کرنا چاہتا ہے، جبکہ ان کے بیان کے لئے کوئی الفاظ بھی لغت میں نہیں ہیں۔ تو قائل استعارات' مجازات اور غیر تامہ تشبیہات کی طرف مجبور ہوتا ہے۔ پس سننے والے کیلئے جائز نہیں ہے کہ ان کے مقالات کو ظاہر معانی پر محمول کرے جو عقائد اہل سنت کے مخالف ہوں اور کہنے والے پر اعتراض کرے بلکہ ان اقوال کے ساتھ متشابہات کا معاملہ کرے جو کلام الٰہی اور کلام رسول ﷺ میں موجود ہیں۔ جو اس مسلک پر نہیں چلتا (اور اولیاء کرام کی گستاخیاں کرتا ہے) وہ خسارے اور گھاٹے میں ہوتا ہے جیسا کہ قرآن ظالموں کے لئے خسارے کا اضافہ کرتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ سننے اور ان کے آیات قرآنیہ ہونے کا انکار کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اگر اللہ کے جسم کا معتقد ہو تو کفر کے قریب ہو جائے گا۔ اسی طرح اولیاء کرام کا کلام جب ظاہر شریعت کے خلاف ہو تو اس پر انکار نہیں کرنا چاہئے اور اس کے ظاہر پر اعتقاد بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

جب موسیٰ علیہ السلام کو اپنے صبر پر یقین نہ تھا تو قطعی طور پر یہ نہیں کہا کہ میں صبر کروں گا بلکہ ان شاء اللہ کہہ کر مشیت الٰہی کے ساتھ اپنے صابر ہونے کو معلق کر دیا۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾

"آپ نے کہا آپ مجھے پائیں گے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا صبر کرنے والا اور میں نافرمانی نہیں کروں گا آپ کے کسی حکم کی۔[1]"

[1] ستجدنی کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ولا اعصی لک امراً کا جملہ صابراً پر معطوف ہے اور محل نصب میں ہے۔ یعنی آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والا اور نافرمانی نہ کرنے والا پائیں گے۔ یا اس جملہ کا عطف ستجدنی پر ہے، اس وقت اعراب میں اس کا کوئی محل نہ ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صبر کرنے پر معاہدہ کیا کیونکہ صحبت کے افادہ کے لئے صبر کرنا شرط ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مصاحبت کا حکم فرمایا تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو صبر کرنے میں شک تھا کیونکہ اعتراض اور مخالفت' مشرب کے مختلف ہونے کے لوازم میں سے ہے اور بغیر اختیار کے ان سے اس چیز کا صادر ہونا تھا اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کرنا حتیٰ کہ میں خود بیان کروں۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾

"اس بندے نے کہا اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھیے نہیں یہاں تک کہ میں آپ سے اس کا خود ذکر کروں۔[1]"

[1] قال کا فاعل خضر علیہ السلام ہیں۔ اتبعتنی میں ابن ذکوان نے یاء کو دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے، جبکہ اخفش سے اس کے خلاف مروی ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ نافع' ابن عامر اور ابوجعفر نے فلا تسئلنی کو لام کے فتحہ اور

نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے لام کے سکون اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کلام کو شرط و جزاء کی صورت میں ذکر کیا ہے کیونکہ صبر کرنے میں آپ کو شک تھا اور اسکے وقوع کو آپ نے بعید سمجھا تھا۔ (یعنی خضر علیہ السلام کو موسیٰ کلیم کے خاموش رہنے اور سوال نہ کرنے پر شک تھا اور آپ کو معلوم تھا کہ اختلاف مشرب کی بناء پر یہ خاموش نہیں رہ سکیں گے اس لئے یہ اسلوب اپنایا۔ سیدھا یہ نہیں فرمایا کہ تم مجھ سے اس کام کے متعلق نہ پوچھنا جو میں کروں، جبکہ وہ تجھے پسند نہ ہو۔ کیونکہ سوال اعتراض کی مانند ہوتا ہے اور اعتراض استفادہ سے مانع ہے۔ پس میں خود اس معاملہ کو بیان کروں تو فبہا ورنہ تم استفسار نہ کرنا۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

''پس وہ دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ سوار ہوئے کشتی میں تو اس بندے نے اس میں شگاف کر دیا موسیٰ بول اٹھے کیا تم نے اس لئے شگاف کیا ہے کہ اس کی سواریوں کو ڈبو دو۔ ۱؎ یقیناً تم نے بہت برا کام کیا ہے۔ ۲؎''

۱؎ باہم معاہدہ کر کے دونوں ساحل سمندر پر چل پڑے۔ انہیں ایک کشتی کی تلاش تھی تا کہ اس پر سوار ہو جائیں۔ انہیں ایک کشتی مل گئی اور اس پر سوار ہو گئے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ سواریوں نے کہا یہ چور ہیں۔ ان کو نکل جانے کا حکم دو۔ لیکن کشتی کے مالک نے کہا یہ چور نہیں ہیں، مجھے تو یہ انبیاء کے چہرے دکھائی دیتے ہیں(1)۔ بخاری، مسلم کی حدیث میں ابی بن کعب کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ انکے پاس سے کشتی گذری تو انہوں نے سوار کرنے کے متعلق کہا تو وہ خضر علیہ السلام کو پہچان گئے اور انہوں نے بغیر کسی کرایہ کے انہیں سوار کر لیا(2)۔ جب سوار ہو گئے تو خضر علیہ السلام نے اسے توڑنا شروع کر دیا، جب کہ صحیحین کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ نکال لیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے یارائے ضبط نہ ہو سکا اور کہا تم بھی کمال کے بندے ہو۔ انہوں نے ہم پر احسان کیا کہ ہمیں بغیر کرایہ کے سوار کر لیا اور آپ شگاف کر کے سواریوں کو ڈبونا چاہتے ہو۔ آپ اس میں شگاف کریں گے تو پانی اندر داخل ہو جائے گا اور نتیجہ سب لوگوں کا غرق ہونا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے لیغرق کو یاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اھلھا کو مرفوع پڑھا ہے۔ جبکہ شَیْـًٔا پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھا ہے۔

۲؎ امراً یہ امر الامر سے مشتق ہے۔ جس کا معنی عظیم ہونا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کلام عرب میں الامر کا معنی داھیہ (مصیبت) ہے اور ہر چیز کی اصل شدید اور بڑی ہے(3)۔ قتیبی نے اس کا ترجمہ عجبا کیا ہے(4)۔ امام بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ خضر علیہ السلام نے ایک کانچ کا پیالہ لیا اور کشتی کے سوراخ پر رکھ دیا(5)۔ جلال الدین المحلی فرماتے ہیں پانی اندر داخل نہ ہوا تھا، یعنی یہ خضر علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾

''اس بندے نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میں یہ طاقت نہیں کہ میری سنگت پر صبر کر سکیں۔ ۱؎''

۱؎ قال کا فاعل خضر علیہ السلام ہیں۔ حفص نے معی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ خضر علیہ السلام نے پہلی بات یاد کرانے کے لئے دوبارہ کہی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 482 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

جب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ تختہ نکالنے کے باوجود پانی کشتی میں داخل نہیں ہوا اور سواریوں کو کچھ نقصان نہیں ہوا اور اپنا معاہدہ بھی یاد آیا تو معذرت کرتے ہوئے کہا۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ﴿٧٣﴾

''آپ نے (عذرخواہی کرتے ہوئے) کہا کہ نہ گرفت کرو مجھ پر میری بھول کی وجہ سے۔ ۱؎ اور نہ تنگی کرو مجھ پر میرے اس معاملہ میں بہت زیادہ۔ ۲؎''

۱؎ بما نسیت میں ما موصولہ بھی ہوسکتا ہے اور شئی کے معنی میں موصوف بھی ہوسکتا ہے، یعنی اعتراض نہ کرنے کے معاہدہ یا میرے اس کو بھولنے کی وجہ سے مؤاخذہ نہ فرمائیں۔ موسیٰ کلیم نے اپنی بھول پر معذرت طلب کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں نسیان بمعنی الترک ہے۔ یعنی آپ کی پہلی وصیت کو میں نے جو چھوڑا ہے اس پر مواخذہ نہ فرمائیں۔ حدیث صحیح میں ابی بن کعب سے روایت ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلا سوال بھول کی وجہ سے، دوسرا شرط کی بناء پر، تیسرا سوال عمداً کیا تھا(1)۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا آپ بھولے نہیں تھے۔ بلکہ یہاں کلام میں تعریض ہے (تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراحتہً ایک چیز ذکر کی جاتی ہے لیکن مراد کچھ اور ہوتا ہے جس کا ذکر نہیں ہوتا جیسے کوئی کسی سے مخاطب ہوکر کہتا ہے بخل کتنا برا ہے۔ اس کلام میں تعرض ہے کہ مخاطب بخیل ہے۔) گویا آپ کوئی دوسری چیز بھول گئے تھے وصیت کو نہیں بھولے تھے(2)۔

۲؎ لا ترھقنی کا معنی لا تکلفنی ہے۔ یعنی مجھ پر تنگی اور گرفت کر کے مشقت نہ ڈالیئے۔ عسراً کا معنی مشقة ہے یعنی مجھ پر اس تنگی اور مؤاخذہ کی وجہ سے آپ کی متابعت مشکل ہو جائے گی۔ عسراً رھق کا مفعول ثانی ہے۔ یرھق کا معنی کسی چیز کو ڈھانپ لینا ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ مجھ پر تختی نہ کرو، اور آسانی کا معاملہ کرو تنگی کا معاملہ نہ کرو۔

فَانْطَلَقَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ ۙ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۖ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ﴿٧٤﴾

''پھر دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ ملے ایک لڑکے کو تو اس نے اسے قتل کر ڈالا موسیٰ (غضب ناک ہوکر) کہنے لگے۔ ۱؎ کیا مار ڈالا آپ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلہ کے بغیر بیشک آپ نے ایسا کام کیا ہے جو بہت ہی نازیبا ہے۔ ۲؎''

۱؎ کشتی سے اتر کر کلیم و خضر چل پڑے۔ راستہ میں بچوں کے درمیان کھیلتے ہوئے ایک بچہ سے ملے جسے خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ بچہ شیریں کلام اور خوش شکل تھا۔ سدی نے لکھا ہے کہ وہ بچہ تمام بچوں سے زیادہ حسین تھا، اس کا چہرہ حسن کی وجہ سے چمکتا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ خضر علیہ السلام نے اسے لٹا کر چھری سے ذبح کیا تھا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے اسے سر سے پکڑا اور ہاتھ سے اس کی گردن اکھیڑ دی۔ عبدالرزاق نے یہی خبر روایت کی ہے کہ آپ نے انگوٹھے، سبابہ اور وسطی تین انگلیوں کے ساتھ اشارہ فرمایا اور اس کا سرتن سے جدا کر دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے پتھر سے اس کا سر کچل دیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ دیوار پر اس کا سر مار کر قتل کیا تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ بچہ ابھی بالغ نہیں تھا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے(3) اور نص قرآن سے بھی یہی مستفاد ہے کیونکہ غلام کے لفظ کا اطلاق بلوغ کے بعد میں نہیں تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں موسیٰ کلیم کا نفساً زکیة کہنا ہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 586 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

دلیل ہے کہ وہ بچہ تھا، بالغ نہیں تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں وہ پورا مرد تھا۔ کلبی کہتے ہیں وہ ڈاکہ زنی کرتا تھا اور سامان لوٹ کر والدین کے پاس پناہ لیتا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں وہ بچہ تھا اور برے افعال کرتا تھا، جس سے اس کے والدین کو تکلیف ہوتی تھی۔ مسلم نے ابی بن کعب کی حدیث میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس بچے کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ طبعاً کافر تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو والدین کو کفر اور نافرمانی پر مجبور کرتا (1)۔ فقتلہ میں فآء تعقیب کے لئے ہے اور یہ دلالت کرتی ہے کہ خضر علیہ السلام نے پہلی ملاقات میں بغیر تفتیش اور مہلت کے فوراً قتل کر دیا تھا۔

۲۔ کوفیوں اور ابن عامر نے الف کے بغیر یآء کی تشدید کے ساتھ زکیۃً پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے الف کے ساتھ یآء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ کسائی اور فراء فرماتے ہیں کہ دونوں کا معنی ایک ہے جیسے قاسیہ اور قسیہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں الزاکیۃ وہ ہوتا ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو اور الزکیۃ وہ نفس ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر توبہ کر لی ہو (2)۔ بغیر نفس یعنی قتل تو حد اور قصاص کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ جبکہ اس پر نہ حد تھی نہ قصاص۔ آپ نے اسکو کیوں قتل کر دیا۔ کشتی کے مسئلہ میں خرقھا کو جزاء بنایا اور موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو مستقل کلام ذکر فرمایا اور دوسرے فعل (قتلہ) میں موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو ماقبل شرط کی جزاء بنایا۔ اس تغیر عبارت کی وجہ یہ ہے کہ قتل ایک قبیح ترین فعل تھا، اس پر اعتراض کو زیادہ دخل تھا۔ یہ فعل اس قابل تھا کہ اسے کلام کی بنیاد بنایا جائے۔ اسی وجہ سے آگے علیحدہ کلام ذکر فرمائی لقد جئت شیئاً نکراً۔ نکراً اس فعل کو کہتے ہیں جو غیر شرعی ہو۔ نافع، یعقوب، ابوبکر اور ابن ذکوان نے یہاں اور سورۃ الطلاق میں نکراً یعنی کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ النکر امر سے زیادہ قبیح فعل پر دلالت کرتا ہے کیونکہ بچہ کے قتل میں حقیقۃً ہلاکت پائی گئی تھی اس لئے نکراً فرمایا اور کشتی کے پھاڑنے میں ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہاں امراً استعمال فرمایا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں امر نکر سے زیادہ برے فعل پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ کشتی میں بہت سے لوگوں کا ہلاک ہونا تھا اس لئے وہاں امر استعمال کیا، یہاں ایک شخص کی ہلاکت تھی اس لئے نکراً استعمال فرمایا (3)۔ واللہ اعلم۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾

"اس نے کہا (پہلے ہی) میں نے کہہ نہ دیا تھا آپ کو کہ آپ میری معیت میں صبر نہیں کر سکیں گے۔ ۱؎"

۱؎ معی کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ دومرتبہ عہد کو توڑنے پر یہاں عتاب کو زوردار لہجہ میں ذکر فرمایا۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَیْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

"آپ نے کہا اگر میں پوچھوں آپ سے کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ ۱؎ آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔ ۲؎"

۱؎ قال کا فاعل موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی آپ نے کہا اگر اس مرتبہ کے بعد مجھ سے آپ پر کوئی سوال ہو تو آپ مجھے بیشک جدا کر دینا۔ یعقوب نے فلا تصحبنی یعنی بغیر الف کے الصحبۃ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 587 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

۲۔ نافع اور ابوجعفر نے لدنی کو دال کے ضمہ اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوبکر نے دال کے سکون اور ضمہ کے اشمام اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن دوسرے قراء نے دال کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ لدنی کا معنی عندی ہے۔ یعنی آپ میری طرف سے معذور ہوں گے کیونکہ تین مرتبہ میں آپ سے عہد توڑ چکا ہوں گا۔ مسلم نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رَحۡمَةُ اللّٰهِ عَلَيۡنَا وَعَلٰى مُوۡسٰى لَوۡلَا اَنَّهٗ عَجَّلَ لَرَاَى الۡعَجَبَ وَلٰكِنَّهٗ اَخَذَهٗ مِنۡ صَاحِبِهٖ ذِمَامَةٌ فَقَالَ اِنۡ سَاَلۡتُكَ بَعۡدَهَا الخ۔ یعنی اللہ ہم پر اور موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے۔ (آپ ﷺ کا معمول مبارک) تھا کہ جب بھی کسی نبی کا اس طرح ذکر فرماتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے) اگر وہ جلدی نہ فرماتے تو بڑی بڑی عجیب چیزیں دیکھتے۔ لیکن انہوں نے خضر علیہ السلام سے حیاء فرمایا اور بلامت و مذمت سے ڈر گئے اور یہ کہہ دیا اگر میں اس کے بعد آپ سے پوچھوں تو آپ میری طرف سے معذور ہوں گے (1)۔ ابن مردویہ نے ان الفاظ میں یہی حدیث نقل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے حیاء فرمایا اور یہ کہہ دیا۔ اگر وہ اپنے ساتھی (خضر علیہ السلام) کے ساتھ ٹھہرے رہتے تو بڑی بڑی تعجب خیز چیزیں دیکھتے۔

فَانۡطَلَقَا ۟ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهۡلَ قَرۡيَةِ ۨاسۡتَطۡعَمَاۤ اَهۡلَهَا فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا فَوَجَدَا فِيۡهَا جِدَارًا يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّنۡقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوۡ شِئۡتَ لَـتَّخَذۡتَ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ۝

”پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ جب ان کا گزر ہوا گاؤں والوں کے پاس تو انہوں نے ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے (صاف) انکار کر دیا انکی میزبانی کرنے سے پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو اس بندے نے اسے درست کر دیا۔ ۱؎ موسیٰ کہنے لگے اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ۲؎“

۱؎ ابن عباس فرماتے ہیں قریہ سے مراد انطاکیہ ہے۔ ابن سیرین نے فرمایا وہ ایکہ ہے یہ آسمان سے بعید ترین جگہ ہے۔ بعض نے برقہ لکھا ہے (2) علامہ بغوی نے حضرت ابوہریرہ سے اندلس روایت کیا ہے (3)۔ کلیم و خضر نے اس بستی والوں سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے مہمان نوازی سے صاف انکار کر دیا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دونوں لئام کی بستی میں آئے، مجالس کا چکر لگایا اور لوگوں سے کھانا طلب کیا لیکن انہوں نے کھانا نہ دیا۔ مہمان نوازی کا حق طلب کیا لیکن انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا سب سے برا شہر وہ ہے جس میں مہمان کی مہمان نوازی نہ کی جائے (4)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ مردوں سے انہوں نے کھانا طلب کیا، انہوں نے نہ دیا لیکن اہل بربر کی ایک عورت نے ان کو کھانا پیش کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام نے ان کی عورتوں کے لئے دعا کی اور ان کے مردوں پر لعنت کی (5)۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک دیوار ہے جو بالکل گرنے کے قریب ہے۔ اس کلام میں مجاز ہے کیونکہ دیوار کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ گرنے کے قریب تھی۔ اسی طرح کہتے ہیں داری تنظر دار فلان۔ (میرا گھر فلاں کے گھر کو دیکھتا ہے) یہ اس وقت کہتے ہیں جب گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے گرتی ہوئی دیوار کھڑی کر دی۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے حضور ﷺ سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ دیوار ہاتھ کے اشارہ سے کھڑی کر دی تھی۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت خضر نے دیوار کو ہاتھ سے چھوا تو وہ سیدھی ہو گئی۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ پہلے آپ نے اس دیوار کو مکمل گرایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 587 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 588 3۔ ایضاً

پھر اس کی بنیاد کھڑی کی۔ السدی فرماتے ہیں مٹی بنائی اور پھر دیوار بنائی (1)۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ بھی عجیب آدمی ہیں مفت و مفت دیوار بنا دی ان لوگوں کی جنہوں نے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں دیا۔ اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ابن کثیر، یعقوب اور ابو عمر نے لتخذت یعنی تاء کی تخفیف اور خاء کے کسرہ کے ساتھ مجرد فعل سے تبعت کے وزن پر پڑھا ہے۔ تخذیتخذ بروزن سمع یسمع استعمال ہوتا ہے۔ باقی قراء نے تاء کی تشدید اور خاء کے فتحہ کے ساتھ باب افتعال سے اتبعت کے وزن پر پڑھا ہے۔ فاء کلمہ کی تا کو تاء افتعال میں مدغم کیا گیا ہے۔ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ جیسے تبع اور اتبع کا معنی ایک ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک اخذ سے مشتق نہیں ہے امام بیضاوی نے بھی بصریوں کی تائید کی ہے کیونکہ اس صورت میں فاکلمہ ہمزہ ہوگا اور ہمزہ تاء میں مدغم نہیں ہوتا۔ جوہری فرماتے ہیں اتخاذ باب افتعال کا مصدر ہے۔ الاخذ سے مشتق ہے لیکن ہمزہ کی تلیین اور یاء کو تاء سے بدلنے کے بعد ادغام کیا گیا ہے، یعنی پہلے ہمزہ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یاء سے بدلا گیا پھر یاء کو تاء سے بدلا گیا کیونکہ وہ باب افتعال فاء کے کلمہ میں واقع ہے۔ جس طرح اسر 'ایسر سے ہے اسی طرح الاتخاذ الاخذ سے ہے۔ پھر جب باب افتعال میں کثرت سے استعمال ہونے لگا تو علماء کو یہ شبہ ہوا کہ تاء اصلیہ ہے پس انہوں نے اسی سے فعل یفعل بنالیا۔ اور تخذ یتخذ کہنے لگے۔ اہل عرب کا قول علامہ جوہری کے قول کے خلاف ہے، اسی طرح الجزری نے نہایہ میں لکھا ہے۔

علیہ میں ہ ضمیر کا مرجع "بنانا" ہے۔ یعنی آپ اس دیوار بنانے پر اجرت ہی طلب کر لیتے۔ اس جملہ میں عوض لینے پر برانگیختہ کرنا ہے تاکہ وہ دونوں اس عوض سے خوراک لے کر قوت حاصل کرتے اور گزراوقات کرتے۔ دوسرا اس جملہ میں اشارہ ہے کہ آپ نے بے مقصد کام کیا ہے۔ اس جملہ میں دلیل ہے کہ آپ نے دیوار محنت اور مشقت سے بنائی تھی اس لئے اجرت لینا جائز تھا۔ اگر معجزہ سے کھڑی کی ہوتی تو اجرت لینا جائز نہ ہوتا۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

"اس نے کہا (بس سنگت ختم) اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ گیا۔ ۱۔ میں آگاہ کرتا ہوں آپ کو ان باتوں کی حقیقت پر جن کے متعلق آپ صبر نہ کر سکے۔ ۲۔"

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا یہ تیسرا اعتراض ہماری جدائی کا سبب ہے کیونکہ اس اعتراض میں ہوائے نفس کا دخل ہے، جبکہ پہلے دو اعتراض کی کیفیت اس سے مختلف تھی کیونکہ ان کی بنیاد خالصۃً دین اور دیانت پر تھی۔ (۱) یا یہ معنی کہ یہ وقت ہماری جدائی کا وقت ہے کیونکہ آپ نے ایسا اعتراض کیا ہے جس میں خواہش نفس کا دخل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھذا کا اشارہ اس فراق کی طرف ہو فلا تصاحبنی کے قول سے جس کا ذکر کیا گیا تھا۔ فراق کی بین کی طرف اضافت 'مظروف کی ظرف کی طرف اضافت کی طرح ہے مجازاً ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مفسر فرماتے ہیں میں کہتا ہوں یہ اضافت لغوی ہے۔

۲۔ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ کلیم علیہ السلام سے فرمایا اب سنو جن باتوں کے ظاہر کو غیر مناسب سمجھ کر آپ خاموش نہیں رہ سکے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 589 (الفکر)

(۱) بعض غالی صوفیاء نے یہ کہا ہے اور مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی اتباع میں یہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ایسی بات درست نہیں کیونکہ نبی جو بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے سب سے افضل ہیں، صاحب کتاب ہیں اور انتہائی جلیل القدر ہیں ان کی شان میں یہ گستاخی ہے۔ بعض مفسرین سے ایسی غلطی ہوئی ہے جسے صاحب کشاف معتزلی نے بھی رد کیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے بھی اسے بے بنیاد قرار دیا ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان باتوں کا انجام خیر اور نیکی تھا۔
امام بغوی فرماتے ہیں بعض تفاسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کا دامن پکڑا اور کہا قبلہ! جدا کرنے سے پہلے مجھے اپنے کاموں کی حقیقت تو بتا دو۔ تو خضر علیہ السلام نے فرمایا(1)۔

اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

''وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں سو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔ لے اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا جو پکڑ لیا کرتا تھا ہر کشتی کو زبردستی سے۔ ۲ے''

لے حضرت کعب فرماتے ہیں کہ وہ کشتی دس بھائیوں کی تھی جن میں سے پانچ اپاہج تھے اور پانچ سمندر میں کام کرتے تھے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مسکین کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کے پاس مال ہو لیکن نصاب کو نہ پہنچتا ہو(2)۔ اور اس کی کفایت بھی نہ کرتا ہوں یا اس کی حاجات اصلیہ سے فارغ نہ ہو۔ وہ بھائی مل کر اس کشتی کو اجرت پر چلاتے تھے اور اپنی معیشت کا بندوبست کرتے تھے۔
۲ے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا میں نے اسے عیب دار اس لئے کیا تھا کیونکہ آگے ایک بادشاہ تھا جو صحیح سلامت کشتی زبردستی لے لیتا تھا۔ وراء ھم کا معنی امامھم (سامنے آگے) ہے جیسے ارشاد ہے مِنْ وَّرَآىٕهٖ جَهَنَّمُ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی خلفھم (پیچھے) ہے چونکہ لوٹنا اس کے راستہ پر تھا اس لئے فرمایا وراء ھم (ان کے پیچھے) پہلا قول صحیح ہے کیونکہ ابن عباس کی قرأت مکان امامھم اس پر دلالت کرتی ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس اسی طرح پڑھتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو اس لئے عیب دار کیا تھا تا کہ ظالم بادشاہ وہ چھین نہ لے۔ اس بادشاہ کا نام جلیدی بن کرکر تھا۔ محمد بن اسحٰق نے اس کا نام سولہ بن جلید الازدی لکھا ہے۔ شعیب الجبائی نے ہدد بن بدد ذکر کیا ہے(3)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کلام کے نظم کا حق تو یہ تھا کہ و کان وراء ھم ملک پہلے ہوتا اور فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا متأخر ہوتا۔ کیونکہ ہمیشہ مسبب۔ سبب پر مرتب ہوتا ہے اور مسبب' سبب سے مؤخر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تعییب کا ارادہ جو مسبب ہے وہ غصب کے خوف سبب سے مقدم ہے۔ اس اسلوب بیان کی دو وجہیں ہیں۔ 1۔ اہتمام کی وجہ سے۔ (چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے انکار کی بنیاد کشتی کے پھاڑنے پر تھی اس لئے خضر علیہ السلام نے پہلے انکار کی وجہ کو دور کیا کہ میں نے عیب دار کرنے کے لئے اس میں شگاف کیا تھا۔ غرق کرنے کے لئے شگاف نہیں کیا تھا۔ تو اس اہمیت کے پیش نظر خضر علیہ السلام نے انداز بیان کو بدل دیا۔
۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سبب صرف صحیح کشتی کے غصب ہونے کا خوف نہیں تھا بلکہ کشتی کا مساکین کے لئے ہونا بھی عیب دار کرنے کے سبب کا جزء تھا۔ خضر علیہ السلام نے پہلے دونوں جزوں میں سے اقوی جزء پر حکم کو مرتب فرمایا اور اقوی کی رعایت فرمائی اور پھر بطور تقید و تعمیم دوسرے جزء کو ذکر فرمایا۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے قوم کے سامنے عیب دار کرنے کا عذر پیش کیا اور ظالم بادشاہ کے متعلق بتایا، جبکہ پہلے انہیں اس بادشاہ کے متعلق معلوم نہ تھا۔ فرمایا میں نے اس کو عیب دار کرنے کا اس لئے ارادہ کیا تھا تا کہ جب یہ اس ظالم بادشاہ کے پاس سے گزرے تو وہ اس کے عیب کی وجہ سے اسے چھوڑ دے اور جب وہ بادشاہ سے آگے گزر گئے تو انہوں نے کشتی کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 590 (الفکر) | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً

درست کرلیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک شیشی سے اس کا سوراخ بند کر دیا۔ بعض فرماتے ہیں تارکول سے بند کیا تھا(1)۔
میں کہتا ہوں امام بغوی کی نقل کردہ روایت کی قرآن کا اسلوب بیان موافقت نہیں کرتا کیونکہ آیت قرآنیہ میں صراحت کے ساتھ ہے کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت کشتی سے اترنے' بچے کو قتل کرنے اور دیوار کو درست کرنے کے بعد علیحدگی کے وقت بتائی تھی۔ اگر خضر علیہ السلام نے کشتی والوں کے سامنے پہلے ہی یہ عذر پیش کر دیا ہوتا اور حکمت بتا دی ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت مخفی نہ ہوتی کیونکہ آپ بھی تو کشتی میں ساتھ تھے اور دوبارہ اس حکمت کو موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۟

''اور وہ جو لڑکا تھا تو (اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اس کے والدین مومن تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (اگر زندہ رہا تو) مجبور کر دے گا انہیں سرکشی اور کفر پر۔ ۱؎ ''

۱؎ یعنی بچے کے والدین ایماندار تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بچہ اپنی نافرمانی اور بدکرداری سے ان پر سرکشی اور کفر کی بدنما چادر نہ بچھا دے۔ اور ان کو شر اور مصیبت میں گرفتار نہ کر دے۔ یا یہ معنی کہ ان کے ایمان کے ساتھ اپنی سرکشی اور کفر کو ملا نہ دے اور ایک ہی گھر میں دو مومن اور ایک کافر و سرکش جمع نہ ہو جائیں۔ یا یہ معنی کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ غالب آ کر انہیں تکلیف دے گا اور اس کی گمراہی کی وجہ سے وہ مرتد ہو جائیں گے یا غلبہ محبت کی وجہ سے اس کی سرکشی اور کفر پر اس کی مدد کر کے مرتد ہو جائیں گے۔

سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہمیں خوف ہوا کہ اس کی محبت والدین کو اس کافر کے دین کی پیروی پر برانگیختہ کرے گی(2)۔ حضرت خضر علیہ السلام کو یہ اندیشہ وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے زید بن ہرمز عن ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے کہ نجدہ الحروری نے حضرت ابن عباس کو خط لکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو کیسے قتل کیا تھا؟ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس نے جواباً لکھا کہ اگر بچوں کا حال تمہیں بھی موسیٰ علیہ السلام کے عالم ساتھی کی طرح معلوم ہو جائے تو تیرے لئے قتل کرنا جائز ہوگا، یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی نہی عام مسلمانوں کے لئے ہے جن کی طرف وحی نہیں کی جاتی۔ تا کہ ان کو بچوں کی حالت کا علم حاصل ہو۔ اور وحی کا سلسلہ اب نبی کریم ﷺ کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی نہی خضر علیہ السلام اور ان جیسے دوسرے افراد کے لئے نہیں ہے جنہیں وحی کے ذریعے چیزوں کا علم عطا کیا جاتا ہے۔ بلکہ آپ کی نہی عام مؤمنین کے لئے ہے جن پر وحی نہیں آتی۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ جانتا تھا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو کافر اور سرکش ہوگا اور مفروض محقق غلام نہ زندہ رہا، نہ اس نے کفر کیا اور نہ سرکشی کی کیونکہ خضر علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اور علم ہمیشہ معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج میں علم کے مصداق کو معلوم پایا جائے۔ پس اس مسئلہ میں اس علم کی صحت کیسے متصور ہوگی۔ جبکہ معلوم پایا ہی نہیں گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے پہلے ہی قتل کر دیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اشیاء کا وجود علم الٰہی کے تابع ہے، جبکہ بندوں کا علم اشیاء کے تابع ہوتا ہے۔ کیونکہ علم وہاں بھی معلوم کے تابع ہے اور اس سے مستفاد ہے۔ یہ جواب اس لئے نفع بخش نہیں کیونکہ علم خواہ معلوم کے تابع ہو یا معلوم کا متبوع ہو' علم و معلوم کی مطابقت ضروری ہوتی ہے اور ایک کا دوسرے سے تخلف نہ ہونا بھی ضروری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 590 (الفکر)　　2۔ ایضاً

ہے۔ پس جب غلام ہی زندہ نہ رہا اور اس نے کفر کا ارتکاب ہی نہ کیا تو واقع میں قضیہ کے تحقق کا نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔ پس علم الٰہی کا تعلق قضیہ کے ساتھ جائز نہیں ہے تا کہ واقع کے ساتھ علم کی مطابقت کا نہ ہونا لازم نہ آئے (یعنی ایسا معلوم جس کا خارج میں وجود ہی نہیں ہے اس کے ساتھ علم الٰہی کا صحیح تعلق کیسے ممکن ومتصور ہو گا) اس کا صحیح جواب وہ ہے جو شبہ کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے کہ قضیہ شرطیہ کا صدق اور اس کے ساتھ علم کا تعلق واقع میں مقدم کے لئے تالی کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے (یعنی مقدم اور تالی میں علاقہ لزوم پایا جائے) قضیہ شرطیہ کا وجود دونوں طرفوں (مقدم وتالی) کے پائے جانے کا مقتضی نہیں ہوتا (یعنی مقدم اور تالی کا پایا جانا ضروری نہیں۔ علاقہ لزوم ضروری ہے اگر وہ پایا جائے گا تو قضیہ شرطیہ صحیح ہو گا) مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَوْكَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ یہ قضیہ شرطیہ ہے اور سچا ہے مقدم (بہت سے خدا) کے نہ پائے جانے کے باوجود اس سے علم متحقق ہے۔ پس اس علم کا مقتضیٰ بچہ کے باقی رہنے کی صورت میں بچہ کے کفر کا لزوم ہے۔ اس سے اس کے تخلف کا احتمال نہیں۔ (یعنی بچہ کا نہ پایا جانا اس کا کفر نہ کرنا قضیہ شرطیہ کی سچائی کے لئے مانع نہیں۔ کیونکہ مقدم اور تالی کے درمیان علاقہ لزوم پایا جاتا ہے۔) ایک دوسری مثال سے سمجھئے ہم کہتے ہیں اگر سورج طلوع ہو گا تو دن موجود ہو گا۔ پس یہ قضیہ شرطیہ سورج کے طلوع ہونے کی صورت میں دن کے وجود کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے' سورج کے طلوع ہونے یا دن کے وجود کا تقاضا نہیں کرتا۔ (اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ بچہ زندہ رہے گا تو کفر کرے گا قضیہ شرطیہ صحیح ہے اور اس سے علم متحقق ہوتا ہے) واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے لئے لزوم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں چیزوں میں سے ایک چیز دوسری کے لئے علت تامہ ہو۔ یا وہ دونوں چیزیں معلول ہوں اور ایک تیسری چیز دونوں کے لئے علت تامہ ہو۔ پس بچہ کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے کفر کے لزوم کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس لزوم کی وجہ وہ ہے جو صوفیاء کرام نے بیان فرمائی ہے کہ خارج میں تمام اشیاء کے وجود ان اعیان ثابتہ کے عکس اور ظل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ جب اعیان ثابتہ علم کے مرتبہ میں ہیں۔ تو اسی لئے صوفیاء فرماتے ہیں۔ معلوم علم کے تابع ہے۔ پھر صفات الٰہیہ اللہ تعالیٰ کے ہادی اور مضل ہونے کی طرف راجع اور تقسیم ہوتی ہیں۔ پس وہ اشیاء جن کا مبداء تعین ہدایت ہے ان کے وجود کے لئے ہدایت کا ظہور لازم ہے۔ ان کا خاتمہ یقیناً سعادت پر ہو گا (یعنی جس شخص پر صفت الٰہیہ ہادی کا عکس پڑے گا تو یقیناً اسے ہدایت نصیب ہو گی اور اس کا خاتمہ بالخیر ہو گا) اور وہ چیزیں جن کا مبدء تعین صفت ضلالۃ ہو تو ان کے وجود کے لئے شقاوت کا ظہور لازمی ہو گا۔ اور ان کا خاتمہ شقاوت پر ہو گا۔ ان چیزوں سے ہدایت متصور ہی نہیں ہو سکتی۔ (یعنی جس شخص پر اس کی صفت ضلالت کا سایہ و عکس پڑے گا وہ یقیناً بدبخت ہو گا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ۔ (ہر ایک کے لئے وہ آسان کر دیا جاتا ہے جو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے) کا یہی مطلب ہے۔ پس جو اہل سعادت سے ہو گا اس کے لئے سعادت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے اور جو اہل شقاوت سے ہو گا اس کے لئے اہل شقاوت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث متفق علیہ ہے۔ اور حضرت علی سے مروی ہے۔ پس اس بچہ کی کفر پر پیدائش کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مبدء تعین صفت ضلال تھی (اس لئے اس نے بڑا ہو کر بھی گمراہ ہی رہنا تھا) پس اس میں گمراہی کے اثر کے ظہور سے پہلے بچپن میں اس کا وفات پا جانا اس کے لئے اور اس کے والدین کے لئے بہتر تھا۔ اور یہ اس کے والدین پر اللہ کی طرف سے مہربانی اور بندہ نوازی تھی۔ اس طرح نہیں جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ جو کام بندے کی اصلاح کا باعث ہے اس کا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے' کیونکہ اگر اس طرح

معاملہ ہوتا تو کوئی کافر بھی نہ پایا جاتا کیونکہ اس کا بچپن میں اللہ تعالیٰ پر مارنا واجب ہوتا۔ واللہ اعلم۔

فَاَرَدْنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

''پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب (ایسا بیٹا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو۔ ۱؎''

۱؎ فاردنا کا معنی شاید یہ ہو کہ ہم نے خواہش کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ کیونکہ بندے کے ارادہ کا تعلق اللہ کے فعل سے ممکن نہیں ہے' حضرت خضر علیہ السلام نے یہاں ارادہ کی نسبت اپنی طرف بھی کی ہے اور جمع کا صیغہ ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی ہے' کیونکہ تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے اس کا بدل عطا کرنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہلاک کرنا خضر علیہ السلام کے کسب سے پایا گیا اور ایجاد خالصۃً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ پس دونوں نسبتیں صحیح ہیں۔ ابوجعفرؒ نافع اور ابوعمرو نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ یبدل پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے۔ بعض علماء نے تبدیل اور ابدال کے معنی میں فرق کیا ہے۔ فرماتے ہیں تبدیل یہ ہے کہ کسی چیز کا عین قائم ہو اور اسکی حالت کو بدل دیا جائے اور ابدال یہ ہے کہ ایک چیز کو اٹھا دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام رکھنا(1)۔ میں کہتا ہوں اس فرق کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو دونوں قرأتوں کا جمع کرنا متصور نہ ہوتا، جبکہ دونوں قرأتیں متواتر بھی ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بیٹے کا بدل ایک بیٹا عطا فرمائے گا جو گناہوں کی غلاظت سے پاک ہو اور برے اخلاق سے منزہ ہو۔ اور والدین پر زیادہ مہربان ہو۔ ابن عامرؒ ابوجعفرؒ اور یعقوب نے رحماً کو حاء کے ضمہ کے ساتھ، جبکہ دوسرے قراء نے حاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحماً' رحم اور قرابۃ سے ہے۔ قتادہ نے یہ معنی کیا ہے صلہ رحمی کرنے والا ہو اور والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والا ہو۔ زکوۃً اور رحماً پر نصب تمیز ہونے کی بناء پر ہے اور ان کا عامل اسم تفضیل خیر اور اقرب ہیں۔ امام بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کے بدلہ میں انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی جس سے ایک نبی نے شادی کی تھی پھر اس سے ایک نبی پیدا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک امت کو اس کے ذریعے ہدایت عطا فرمائی تھی(2)۔

حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے، فرمایا اللہ نے انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی تھی۔ جس سے ستر نبی پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریج نے لکھا ہے کہ ایک مسلمان بچہ عطا فرمایا تھا(3)۔

ابن ابی شیبہ' ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے عطیہ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ ان کو بیٹی عطا کی گئی تھی جس نے نبی کو جنا تھا(4)۔

ابن المنذر نے ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن المنذر نے بسطام بن جمیل عن یوسف بن عمر کے طریق سے اس طرح روایت کیا ہے کہ اللہ نے بیٹے کی جگہ بیٹی عطا فرمائی تھی جس نے کئی انبیاء کو جنم دیا تھا(4)۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں' ترمذی' حاکم نے حضرت ابودرداء کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مطرف فرماتے ہیں اس بچہ کی پیدائش پر والدین خوش ہوئے تھے اور اسکے قتل پر غمگین ہوئے تھے۔ اگر وہ بچہ زندہ رہتا تو اس کے ہاتھوں دونوں ماں باپ کی ہلاکت ہوتی۔ پس انسان کو راضی بقضاء الٰہی ہونا چاہئے کیونکہ ناپسندیدہ امر میں مومن کے لئے قضاء الٰہی بہتر ہوتی ہے بنسبت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر)	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً	4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 431 (العلمیہ)

پسندیدہ امر کے (1)۔ میں کہتا ہوں پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر امر میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی آزمائش سے ڈرنا چاہئے اور اس سے پناہ طلب کرے، اس کی رحمت کی امید رکھے۔ ہر صورت میں قضاء الٰہی سے خوش اور راضی رہے، اعتراض کی زبان نہ کھولے۔

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

"باقی رہی دیوار (تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (دفن) تھا۔ [1] اور ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا۔ [2] پس آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں بچے اپنی جوانی کو پہنچیں اور نکال لیں اپنا دفینہ۔ [3] یہ (ان پر) ان کے رب کی خاص رحمت تھی۔ [4] اور (جو کچھ میں نے کیا) میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا یہ حقیقت ہے ان امور کی جن پر آپ سے صبر نہ ہوسکا۔ [5]"

[1] امام بغوی نے ان یتیم بچوں کے نام اصرم اور صریم لکھے ہیں (3) اور وہ خزانہ بقول عکرمہ کوئی مال تھا۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ترمذی' حاکم نے ابی الدرداء کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ وہ مال سونا اور چاندی تھا (4)۔ طبرانی نے ابوالدرداء سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے کہ پہلے لوگوں کے لئے سونا چاندی حلال تھے اور مال غنیمت حرام تھا اور ہمارے لئے غنائم حلال ہیں اور سونا چاندی (مردوں کے لئے) حرام ہے۔ میں کہتا ہوں سونے چاندی کے ہم پر حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سونے چاندی کو خزانہ کریں اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ہم پر حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی۔

حضرت ابن عباس اور ابن عمر نے فرمایا ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہو وہ کنز کے زمرہ میں نہیں آتا اگرچہ وہ مدفون بھی ہو۔ اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو وہ کنز ہے اگرچہ مدفون نہ بھی ہو۔ شاید اس وقت اس شہر والوں پر زکوٰۃ واجب نہ ہو اسی وجہ سے فرمایا گیا اُحِلَّتْ لَهُمُ الْكُنُوْزُ کہ ان کے لئے کنز حلال تھے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرماتے ہیں کنز سے مراد ایک صحیفہ ہے جس میں علم (کا خزانہ) تھا (5)۔ حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس اثر کو صحیح بھی کہا ہے کہ وہ خزانہ نہ سونا تھا، نہ چاندی تھا بلکہ علم کے صحائف (کتابیں) تھے۔ ابن ابی حاتم نے ربیع بن انس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر لکھا تھا کہ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر یقین بھی رکھتا ہے اور پھر وہ خوش رہتا ہے' حیرت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر پر یقین بھی رکھتا ہے تو تھکاوٹ کیسے برداشت کرتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو رزق کے ملنے کا یقین رکھتا ہے تو اپنے آپ کو مشقت میں کیسے ڈالتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو حساب کا یقین رکھتا ہے تو غافل کیسے ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس پر جو دنیا کی زوال پذیری کا یقین رکھتا ہے' تو دنیا پر مطمئن کیسے ہوتا ہے۔ لا اللہ

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 431 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 430 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 591 (الفکر) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 144 (وزارت تعلیم)

الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه۔ اور دوسری جانب یہ لکھا تھا اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا وَحْدِیْ لَا شَرِیْکَ لِیْ خَلَقْتُ الْخَیْرَ وَالشَّرَّ فَطُوْبٰی لِمَنْ خَلَقْتُهٗ لِلْخَیْرِ وَاَجْرَیْتُهٗ عَلٰی یَدَیْهِ وَوَیْلٌ لِّمَنْ خَلَقْتُهٗ لِلشَّرِّ وَاَجْرَیْتُهٗ عَلٰی یَدَیْهِ(1)

''میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی الٰہ نہیں میں وحدہ لاشریک ہوں میں نے ہی خیر وشر کو پیدا فرمایا' مبارک ہوا سے جسے میں نے خیر کے لئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں خیر کو جاری فرمایا اور ہلاکت ہے اس کے لئے جسے میں نے برائی کیلئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں برائی کو جاری کیا۔''

بزار نے بھی اسی طرح ضعیف سند کے ساتھ ابوذر سے مرفوعاً نقل کی ہے لیکن مختصر ہے۔ الخرایطی نے قمع الحرص میں ابن عباس سے موقوف نقل کی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت علی سے مرفوع نقل کی ہے۔ بزار نے ابی ذر سے مرفوع روایت کی ہے۔ زجاج کہتے ہیں کنز کا لفظ جب مطلق بولا جائے تو مال کا خزانہ مراد ہوتا ہے اور تقیید کی صورت میں یہ کہنا جائز ہے کہ اس کے پاس علم کا خزانہ ہے۔ وہ تختی ان دونوں چیزوں (مال اور علم) کی جامع تھی کیونکہ وہ خود سونے کی تھی اور اس پر علم کے شاہپارے بھی تھے(2)۔

2۔ اور ان یتیموں بچوں کا باپ ایک نیک آدمی تھا جس کا نام کاشح تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا اپنے باپ کے تقویٰ اور صلاح کی وجہ سے ان یتیموں کے مال کی حفاظت کی گئی تھی(3) یعنی اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو دیوار کی اصلاح کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ بچوں کا خزانہ محفوظ رہے اور یہ بندہ نوازی اور شفقت ورحمت صرف ان کے باپ کے نیک اور صالح ہونے کی وجہ سے تھی۔ محمد بن المنکدر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کی صلاح اور تقویٰ کی وجہ سے اس کی اولاد در اولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی حفاظت فرماتا ہے اور جب تک وہ نیک صالح بندہ کسی مقام پر سکونت پذیر رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پڑوسیوں کی بھی حفاظت فرماتا ہے۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں میں نماز پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے بچے یاد آجاتے ہیں اور میں اپنی نماز میں اضافہ کرتا ہوں(4)۔

بعض علماء فرماتے ہیں ان یتیم بچوں اور ان کے نیک باپ کے درمیان سات پشتوں کا واسطہ تھا۔ ابن ابی حاتم نے بقیہ عن سلیمان بن سلیم ابی سلمہ کے طریق سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں تورات میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اپنے نیک بندے کی وجہ سے سات صدیوں (یعنی سات پشتوں) تک حفاظت فرماتا ہے اور کسی ایک کی ستم شعاری اور کارستانی کی وجہ سے سات نسلوں کو ہلاک کرتا ہے(5)۔

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ مومنین پر حق ہے کہ وہ نیک لوگوں کی اولاد کی دیکھ بھال کریں جب تک کہ ان سے سرکشی اور کفر کا صدور نہ ہو' اگر ان سے دین سے انحراف اور کفر کا صدور ہو تو سزا کے بھی زیادہ مستحق ہیں جیسا کہ سابقہ آیت اس قول کی دلیل ہے اما الغلام فکان ابواہ مومنین الایہ۔ یعنی نیک والدین کا بیٹا مجرم اور طاغی تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے بحکم الٰہی اسے قتل کی سزا دی۔

۳۔ یعنی رب کریم نے ان کے بلوغت اور جوانی کی عمر کو پہنچنے کا ارادہ فرمایا۔ رشد کی عمر سے مراد بقول بعض علماء اٹھارہ سال ہے اور میرے نزدیک چالیس سال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۔ ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح اور ظاہر مذہب پچیس سال ہے کیونکہ جب بیوقوف' کم عقل شخص پچیس سال کا ہو جائے تو امام صاحب کے نزدیک اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ ارشاد ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔ پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال۔

۴۔ رحمۃً پر نصب یبلغا کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر ہے یا مصدر ہونے یا مفعول لہ ہونے کی بناء پر ہے کیونکہ خیر کا ارادہ رحمت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 592 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحمۃ کا تعلق فعل محذوف سے ہے جس کی تقدیر یہ ہے فَعَلْتُ مَا فَعَلْتُ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اولاً ارادہ کی نسبت حضرت خضر علیہ السلام نے اپنی طرف کی اور فرمایا فاردت ان اعیبھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیب کرنے کا عمل براہ راست آپ کے ساتھ تھا۔ اور دوسری صورت میں ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی اور اپنی طرف بھی کی فرمایا فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمیں تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے بدل پیدا کرنے کے ساتھ تھی۔ تیسری صورت میں ارادہ کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ فاراد ربک ان یبلغا۔ اسکی وجہ یہ ہے بچوں کو حد بلوغت تک پہنچانے میں خضر علیہ السلام کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یا ان تینوں توجیہات میں اسلوب بیان کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا فعل چونکہ فی نفسہ شر اور مذموم تھا (کشتی توڑنا) اس لئے اس کی نسبت اپنی طرف کی، اور تیسرا فعل (دیوار بنانا) سراپا خیر تھا اسلئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی، جبکہ دوسرا فعل غلام کو قتل کرنا اس کے دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے خیر تھا (والدین کو نیک اولاد ملنی تھی) اور ایک اعتبار سے شر تھا (معصوم بچے کو قتل کرنا) اس لئے جمع کا صیغہ ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ اور اپنی طرف نسبت کر دی۔ (تا کہ خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور شر کی نسبت اپنی طرف ہو) اہل ادب وعرفان ہمیشہ خیر وشر کے ذکر کے موقع پر ایسا ہی انداز ادب اپناتے ہیں) یا نسبتوں کے اختلاف کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ واسطوں کی طرف توجہ کرنے میں عارف کا حال مختلف ہوتا ہے(1) (یعنی کبھی عارف کی توجہ سبب اور واسطہ کی طرف ہوتی ہے، کبھی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جو اسباب وسائط کو پیدا کرنے والا ہے اور کبھی واسطہ اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف ہوتی ہے) واللہ اعلم۔

5 جو کچھ تو نے مجھ سے افعال سرزد ہوتے دیکھے ہیں کشتی کا توڑنا، بچہ کو قتل کرنا اور دیوار بنانا یہ سب میں نے اپنی فکر اور رائے کی بناء پر نہیں کئے بلکہ یہ سب کچھ میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے۔ لم تسطع اصل میں تستطع تھا تخفیفاً تاء استفعال کو حذف کیا گیا ہے۔ اس کا معنی طاقت نہ رکھنا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت میں آیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے علیحدہ ہونے لگے تو خضر علیہ السلام سے کہا جناب مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا علم صرف لوگوں کے سامنے بیان کرنے کے لئے حاصل نہ کرو بلکہ اس پر عمل کرنے کیلئے حاصل کرو(2)۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں خضر وکلیم علیہما السلام کے واقعہ سے چند فوائد ملتے ہیں۔

1۔ انسان کو اپنے علم پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔ 2۔ اگر کوئی غیر پسندیدہ کام نظر آئے تو جھٹ سے اعتراض نہیں جڑ دینا چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسی حقیقت پوشیدہ ہو جس کی اسے خبر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں خصوصاً جب کسی عالم دین، عارف کامل، متقی و پرہیزگار سے کوئی غیر پسندیدہ امر نظر آئے تو اس کا فوراً انکار کرنا اور زیادہ غیر مناسب اور سوءادب ہے جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے 3۔ ہمیشہ علم وعرفان کے موتی تلاش کرتے رہنا چاہئے(3)۔

4۔ استاد اور مرشد کے سامنے نہایت عجز وانکسار سے رہنا چاہئے۔ ان سے گفتگو اور بات کرتے وقت ادب کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹنا چاہئے۔ 5۔ مجرم کو اپنے جرم پر تنبیہ کرنی چاہئے اور پھر عفو ودرگزر کر دینا چاہئے۔ لیکن جب مجرم سے بار بار اس فعل کا ارتکاب ہو تو

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 518 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 592 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 581 (الفکر)

اس سے علیحدگی اختیار کرنی چاہئے۔

امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ خضر علیہ السلام بقید حیات ہیں یا موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام زندہ ہیں اور ہر سال حج کے موقع پر ملاقات کرتے ہیں اور خضر علیہ السلام کی زندگی کا سبب یہ ہے کہ آپ نے آب حیات پی لیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ذوالقرنین بادشاہ آب حیات کی تلاش میں تاریکی کے اندر داخل ہوا تھا اور خضر علیہ السلام ان کے آگے آگے تھے۔ خضر علیہ السلام آب حیات کے چشمہ پر پہنچ گئے تھے، آپ نے اس سے غسل بھی کیا تھا۔ اسے نوش بھی فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے لئے نوافل بھی پڑھے تھے۔ لیکن ذوالقرنین پیچھے سے راستہ بھول گیا تھا اور واپس لوٹ آیا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کا وصال ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔

ایک دفعہ عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے تمہاری یہ رات (لیلۃ القدر) دکھائی گئی ہے، آج جو لوگ سطح زمین پر زندہ ہیں سو سال بعد کوئی ایک بھی زندہ نہ رہے گا (1)۔ میں کہتا ہوں صاحب الحصین نے التغر یہ میں ذکر کیا ہے، مستدرک للحاکم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو ایک شخص آیا جس کی داڑھی سفید تھی۔ جسم صبیح (ملیح) تھا۔ وہ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آیا اور رونے لگا پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یوں خطاب فرمایا اللہ تعالیٰ ہر مصیبت پر تسلی دیتا ہے۔ ہر فوت شدہ کا نعم البدل عطا فرماتا ہے۔ اور ہر ہلاک ہونے والے کا جانشین بناتا ہے پس تم لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس کی طرف رغبت کرو، وہ تمہیں اس مصیبت میں گرفتار دیکھ رہا ہے۔ دیکھو دکھ اس شخص پر ہے جس کی کمی کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خطاب کرنے کے بعد وہ شخص واپس چلا گیا۔ حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ خضر علیہ السلام تھے۔

اولیاء کرام کی خضر علیہ السلام سے ملاقاتیں اور ان سے فیض یاب ہونے کی روایتیں مشہور ہیں۔ آپ کی زندگی پر یہ سب باتیں دلیل ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر خضر علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زندہ ہوتے تو وہ آپ کی صحبت سے جدا نہ رہتے کیونکہ آپ ﷺ تمام لوگوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو میری اتباع کے سوا انہیں کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ اس حدیث کو امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ فرمایا عیسیٰ بن مریم آسمان سے اتریں گے اور مسلمانوں کے ایک شخص (مہدی علیہ السلام) کی اقتداء کریں گے اسی طرح مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور جابر سے روایت کی ہے۔

اس مسئلہ کا حل حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں تو وہ حقیقت حال کے انکشاف کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے۔ حضرت مجدد نے دیکھا کہ خضر علیہ السلام ان کے سامنے کھڑے ہیں، آپ نے ان سے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو آپ نے فرمایا میں اور الیاس زندوں میں سے نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو ایسی قوت بخشی ہے جس سے ہم مجسم ہو جاتے ہیں اور زندہ لوگوں جیسے کام کرتے ہیں مثلاً جب اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم گمراہوں کی راہنمائی کرتے ہیں، مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ علم لدنی کی تعلیم دیتے ہیں اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو ارادہ ہو اسے روحانی نسبت بھی عطا کرتے ہیں۔ اولیاء اللہ میں سے جو قطب مدار ہوتا ہے ہمیں اس کا معاون بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے مدار عالم بنایا ہے اس کی برکت سے عالم کی بقاء ہے۔ اس زمانہ میں یمن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 592 (الفکر)

کے ایک بزرگ قطب مدار ہیں جو مذہباً شافعی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ شافعی مذہب کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کشف صحیح سے مختلف اقوال کا اختلاف اٹھ جاتا ہے اور اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو بلند و بالا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾

''اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ذی القرنین کے متعلق۔ [1] فرمائیے میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس کا حال۔ [2]''

[1] یہود یا مشرکین مکہ آپ سے آزمائش کی خاطر ذی القرنین کے متعلق پوچھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسکے نام کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا اس کا نام مرزبان بن مرزبہ الیونانی ہے جو یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا(1)۔ بعض نے اس کا نام اسکندر بن فیلیس بن فیلقوس الرومی ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا قول اصح ہے کیونکہ ابن اسحٰق، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور الشیرازی نے الالقاب میں اور ابوالشیخ نے وہب بن منبہ الیمانی سے روایت کیا ہے اور وہب تاریخی باتوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ انہوں نے فرمایا ذوالقرنین روم کا ایک شخص تھا جو ایک بوڑھی عورت کا بیٹا تھا۔ جس کی ذوالقرنین کے علاوہ اور کوئی اولاد نہ تھی۔ اور اس کا نام اسکندر تھا۔ ابن المنذر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا سکندر ہی ذوالقرنین ہے(2)۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس کی نبوت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نبی تھا۔ ابوالطفیل فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا ذوالقرنین نبی تھا یا بادشاہ۔ آپ نے فرمایا وہ نہ نبی تھا نہ بادشاہ لیکن وہ ایسا بندہ تھا جو اللہ سے محبت کرتا تھا اور اللہ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ اللہ کے لئے پرخلوص تھا اور اللہ اس کے خلوص کی قدردانی فرماتا تھا(3)۔ میں کہتا ہوں اسی طرح ابن مردویہ نے سالم بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا وہ نبی تھے تو آپ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ تھا جو پیکر اخلاص تھا اور اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص کی قدر فرماتا تھا(4)۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ دوسرے کو ذوالقرنین کے لقب سے پکار رہا تھا۔ آپ نے فرمایا پہلے تم نے انبیاء کرام کے اسماء کے ساتھ اپنے نام رکھے، اس پر بھی اکتفاء نہ کیا حتیٰ کہ تم نے فرشتوں کے اسماء کے ساتھ نام رکھنے شروع کر دیئے ہیں(5)۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ نیک عادل بادشاہ تھا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ذوالقرنین نام رکھنے کے سبب میں بھی اختلاف ہے۔ زہری فرماتے ہیں وہ سورج کے دونوں کناروں مشرق و مغرب تک پہنچا تھا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ روم اور فارس کا بادشاہ تھا اس لئے اس نام سے ملقب تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ نور اور تاریکی میں داخل ہوا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس نے خواب میں سورج کے دونوں کناروں کو پکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس کے سر پر خوبصورت مینڈھیاں تھیں۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس کے سر پر دو سینگ تھے جن کو وہ پگڑی کے ذریعے چھپائے رکھتا تھا(6)۔ میں کہتا ہوں، ابن عبدالحکیم نے یونس بن عبیدہ اور شیرازی نے القاب میں قتادہ سے اس طرح روایت کیا ہے۔ ابوالطفیل نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کو ذوالقرنین اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو تقویٰ کا حکم دیا۔ قوم نے اس کے سر کے دائیں طرف چوٹ لگائی تو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 438 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 435 (العلمیۃ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر)

مر گیا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا پھر اس نے قوم کو تقویٰ کا حکم دیا تو قوم نے اس کے سر پر بائیں طرف ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھر زندہ کر دیا۔

امام احمد نے الزہد میں، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے العظمۃ میں ابوالورقاء سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا ذوالقرنین کے سینگ کس کے تھے۔ فرمایا شاید تمہارا خیال ہے کہ اس کے سینگ سونے اور چاندی کے تھے۔ وہ نبی تھے، اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ انہوں نے قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی تو ایک شخص اٹھا اور اس نے انکے سر کی بائیں جانب ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گئے۔ اللہ نے پھر انہیں زندہ فرما دیا پھر اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث کیا (انہوں نے دعوت توحید دی) ایک شخص اٹھا اور دائیں جانب چوٹ لگائی اور وہ فوت ہو گئے۔ پس اللہ نے ان کا نام ذوالقرنین رکھ دیا(1)۔

۲۔ علیکم کا خطاب سائلین یعنی سوال کرنے والوں کو ہے۔ عنہ ذی القرنین سے حال ہے یا اللہ تعالیٰ سے حال ہے۔ اور ذکر کا معنی خبر ہے۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾

"ہم نے اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں ۱؎ اور ہم نے دیا تھا اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا سازو سامان ۲؎"

۱؎ یعنی ہم نے اسے زمین میں تصرف کا اختیار بخشا۔ جیسے چاہے اس میں تصرف کرے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا اللہ نے بادل کو اس کے لئے مسخر کر دیا تھا اور اس پر وہ سوار ہوتے تھے اور اس کو سارے اسباب عطا فرمائے تھے۔ اس کے لئے نور کو پھیلا دیا تھا اس لئے دن اور رات اس کے لئے برابر روشن ہوتے تھے۔ تمکن فی الارض کا یہی مطلب ہے اور زمین میں چلنا اس کے لئے آسان کر دیا تھا اور راستے اس کے لئے ہموار کر دیئے تھے(2)۔

۲؎ سب چیزیں ہم نے اسے عطا کی تھیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ مخلوق جس جس چیز کی محتاج ہوتی ہے ہم نے وہ سب اسے عطا کر دی تھیں۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ بادشاہوں کو شہروں کے فتح کرنے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جس جس ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم نے اسے عطا کر دی تھی۔ سبباً سے مراد علم، قدرت اور آلات ہیں جن کے ذریعے وہ ہر چیز تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت الحسن نے اس کا معنی بلاغاً الی حیث اراد کیا ہے، یعنی جہاں وہ پہنچنے کا ارادہ کرتا تھا ہم اسے پہنچنے کے سارے اسباب مہیا کر دیتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ مطلب ہے کہ ہم نے زمین کے کناروں کو اس کے قریب کر دیا تھا(3)۔

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾

"پس وہ روانہ ہوا ایک راہ پر۔ ۱؎"

۱؎ اہل حجاز اور بصریوں نے فاتبع پڑھا ہے، یعنی تینوں مقامات پر ہمزہ وصلی اور تشدید کے ساتھ باب افتعال سے پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے ہمزہ قطعی اور تاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 436 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 94-593 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

امام بغوی فرماتے ہیں ان دونوں کا معنی ایک ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے معانی کے درمیان فرق ہے۔ ہمزہ قطعی کی صورت میں اس کا معنی پالینا اور لاحق ہونا ہے اور باب افتعال سے تشدید کی صورت میں اس کا معنی سار یعنی چلنا ہے۔ عرب کہتے ہیں ما زلت اتبعتہ حتی اتبعتہ یعنی میں اس کے پیچھے چلتا رہا حتی کہ میں نے اسے پالیا(1)۔ اصمعی سے اسی طرح مروی ہے۔ سببا کا معنی راستہ ہے۔ ابن عباس نے اس کا معنی منزل کیا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ؕ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾

'' یہاں تک کہ جب وہ غروب آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ڈوب رہا ہے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں 1 اور اس نے وہاں ایک قوم پائی 2 ہم نے کہا اے ذوالقرنین! (تمہیں اختیار ہے) خواہ تم انہیں سزا دو خواہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو 3 ''

1 مغرب الشمس سے مراد قابل رہائش زمین کی انتہا ہے جو مغرب کی جانب تھی۔ ابوجعفر، ابن عامر، حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے حمیة یعنی رامیہ کے وزن پر ہمزہ کے بغیر الف کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی گرم ہے، باقی قراء نے بغیر الف کے ملئة کے وزن پر مہموز پڑھا ہے۔ اور یہ حمئت البئر سے مشتق ہے جب کنویں کی مٹی سیاہ ہو جائے۔ تو حمئة کا معنی سیاہ کیچڑ ہے۔ دونوں قراتوں کے درمیان معنوی طور پر کوئی مخالفت نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ چشمہ دونوں وصفوں کا حامل ہو (گرم بھی ہو اور سیاہ بھی ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ حامئة کی یاء ہمزہ سے بدل کر آئی ہو کیونکہ اس کا ماقبل کسرہ ہے۔ اس صورت میں دونوں قراتیں متحد ہو جائیں گی یعنی سیاہ کیچڑ والا چشمہ مراد ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعب سے پوچھا تورات میں کیا ہے کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہم تورات میں پڑھتے ہیں کہ وہ پانی اور مٹی میں غروب ہوتا ہے(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید ذوالقرنین بحر محیط کے ساحل پر پہنچا ہو اور اسے اسی طرح نظر آیا ہو کیونکہ حد نظر تک پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا ہوگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وجدھا تغرب اس نے سورج کو غروب ہوتے پایا یہ نہیں فرمایا کہ واقعی سورج غروب ہو رہا تھا۔ تفتیمی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔(3)

2 ذوالقرنین نے اس چشمہ کے پاس ایک قوم کو پایا۔ امام بیضاوی نے بعض علماء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس قوم کا لباس وحشی جانوروں کی کھالیں تھیں اور سمندر جو کچھ باہر پھینکتا تھا وہ ان کی خوراک تھی اور وہ عقیدہ کے اعتبار سے کافر تھے(4)۔

3 ہم نے ذوالقرنین کو حکم کیا کہ اس قوم کو اسلام کی دعوت دو۔ اگر یہ کفر پر اصرار کریں تو پھر تم انہیں قتل کر دو اور اگر یہ توبہ کر لیں اور اسلام قبول کر لیں تو پھر انہیں اکرام و ارشاد اور شریعت کی تعلیم دو۔ اما کا کلمہ یہاں تقسیم کیلئے ہے جیسا کہ اواس ارشاد میں تقسیم کے لئے ہے، اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْۤا اَوْ یُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ ترجمہ: بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 520 (الفکر)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 520 (الفکر)

زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے انہیں چن چن کر قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے یا جلا وطن کر دیئے جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اما کا کلمہ یہاں تخییر کے لئے ہے، یعنی ان کے کفر کی وجہ سے انہیں قتل کر دو یا انہیں اسلام کی دعوت دو تمہیں اختیار ہے اور ان یتخذ فیھم حسنا سے مراد یہی دعوت اسلام ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسے قتل کرنے اور قیدی بنانے کا اختیار دیا اور قیدی بنانے کو احسان اس لئے شمار کیا کیونکہ یہ قتل کے مقابلہ میں احسان ہی ہے۔ پہلے دو قولوں کی تائید ذیل کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾

''ذوالقرنین نے کہا جس نے ظلم (کفر و فسق) کیا تو ہم ضرور اسے سزا دیں گے پھر اسے لوٹا دیا جائے گا اس کے رب کی طرف تو وہ اسے عذاب دے گا بڑا ہی سخت عذاب [1]''

[1] ذوالقرنین کے حکم الٰہی کی اتباع میں یا تخییر کے بعد اسلام کی طرف انہیں دعوت دینے کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔ میری دعوت اسلام کے بعد جو کفر پر اصرار کرے گا اور اپنے شرکیہ عقائد پر قائم رہے گا تو میں اور میرے ساتھی دنیا میں اسے قتل کے عذاب میں مبتلا کریں گے پھر آخرت میں رب ذوالجلال جہنم کا سخت عذاب دیں گے جس کی مثل پہلے عذاب نہ جھیلا ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾

''اور جو شخص ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو اس کے لئے اچھا معاوضہ ہے [1] اور ہم اسے حکم دیں گے ایسے احکام بجا لانے کا جو آسان ہوں گے [2]''

[1] یعنی جو ایمان لائے گا اور ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل کرے گا تو اس کے لئے اچھا بدلہ ہے۔ حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے جزاء کو منونا اور حال کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ یعنی جزاء کے طور پر اس کے لئے جنت ہے۔ یا اس کے لئے بطور جزاء اچھا ثواب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل مقدر کا مصدر ہے اور پھر جملہ حال یا تمیز کی بناء پر منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے بغیر تنوین کے مضاف کر کے مرفوع پڑھا ہے۔ اس قرأت پر الحسنی سے مراد اعمال حسنہ ہیں، یعنی اس کے لئے اچھے اعمال کی جزاء ہے یا کہا جاتا ہے کہ الحسنی سے مراد جنت ہے یا اچھا بدلہ ہے اور جزاء کی الحسنی کی طرف اضافت موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی طرح ہے جیسے مسجد الجامع و جانب الغربی۔

[2] یسر، ذا یسر کی تقدیر میں ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یسر کا معنی معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذوالقرنین کو خطاب دلیل ہے کہ وہ نبی تھے، ان کی طرف وحی کی جاتی تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں اصح یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ اور اس خطاب سے مراد الہام ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ذریعہ سے ملا ہو جو ان کی صحیح سمت راہنمائی کرتا رہتا ہو جیسے بنی اسرائیل میں بادشاہوں کے ساتھ انبیاء کرام ہوتے تھے جو ان کی راہنمائی کرتے تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾

''پھر وہ روانہ ہوا دوسرے راستہ پر [1]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

لے یعنی مشرق کی طرف پہنچانے والے راستہ پر چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۙ﴿۹۰﴾

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچا طلوع آفتاب کے مقام پر تو اس نے پایا سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا ہے ایسی قوم پر کہ نہیں بنائی ہم نے ان کے لئے سورج (کی گرمی) سے بچنے کی آڑ لے۔''

لے یعنی ذوالقرنین سورج کے طلوع کی جگہ پہنچا تو وہاں اس نے ایسی قوم کو پایا جن کا لباس نہ تھا یا کوئی مکان نہ تھا کیونکہ ان کی زمین گھر' مکان کو اٹھانے کی متحمل ہی نہ تھی یا انہوں نے مکانوں کی جگہ غاریں بنا رکھی تھیں جن میں وہ رہتے تھے۔

كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

''بات یونہی ہے لے اور ہم نے احاطہ کر رکھا ہے ہر اس چیز کا جو اس کے پاس تھی اپنے علم سے لے''

لے یعنی ذوالقرنین بالکل اسی طرح تھا جس طرح ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کا مرتبہ بلند تھا اور اس کی بادشاہی وسیع وعریض تھی یا یہ معنی کہ اس کا معاملہ اہل مشرق کے ساتھ بھی اہل مغرب کی طرح اختیار وتخییر کا تھا۔ كذالک یا یہ وجدها کے مصدر محذوف کی صفت ہے' یعنی اس نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا جیسا اس نے اسے غروب ہوتے دیکھا یا یہ لم نجعل کے مصدر کی صفت ہے' یعنی اہل مشرق کے لئے کوئی آڑ نہیں بنائی جس طرح اہل مغرب کے لئے نہیں بنائی تھی یا یہ قوم کی صفت ہے یعنی اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جو کفر اور حکم میں اس قوم کی مثل تھی جن پر سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔

لے اس کے پاس جو لشکر' آلات حرب' تعداد اور اسباب ہیں ہم سب کو جانتے ہیں' یعنی ہم اس کے ظواہر و باطن کو جانتے ہیں خبرا کا معنی علم ہے اور مصدریۃ کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ احطنا میں خبر کا معنی موجود ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس کے پاس ہر چیز کی اتنی کثرت تھی جس کا احاطہ صرف لطیف وخبیر ذات کو ہی تھا۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾

''پھر وہ روانہ ہوا ایک اور راہ پر۔''

لے یعنی پھر اس نے تیسرا راستہ اختیار کیا جو مشرق ومغرب کے درمیان تھا' یعنی جنوب سے شمال کی طرف چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان لے تو پایا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم کو جو نہیں سمجھ سکتے تھے (ان کی) کوئی بات لے''

لے سدین کو ابن کثیر' ابو عمرو اور حفص سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں جس رکاوٹ کو انسان نے بنایا ہو وہ سد (بفتحہ سین) ہے اور جو قدرت کی کرشمہ سازی سے ہو وہ سد (بضم سین) ہے۔ ابو عمرو کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں السد بالفتح مصدر ہے اور بالضم اسم ہے۔ اور یہاں السدین سے مراد دو پہاڑ ہیں جن کے درمیان ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے سامنے دیوار بنادی تھی۔ یہ ارمینیہ اور

لے تفسیر ... جلد 3 صفحہ 504 (الفکر)

آذربائیجان کے پہاڑ ہیں۔ ابن المنذر نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شمال کے آخر میں جہاں ترکوں کی زمین کی حد ختم ہوتی ہے وہاں دو پہاڑ ہیں، ان کے پیچھے یاجوج ماجوج رہتے ہیں۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفاسیر میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ یہاں بین مفعول بہ ہے جو ظروف متصرفہ میں سے ہے۔

۲۔ دونھما میں ھما ضمیر سے مراد دو پہاڑ ہیں، یعنی ان پہاڑوں کے سامنے۔ حمزہ اور کسائی نے یفقھون کو باب افعال سے یفقھون یا کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ دوسروں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے تھے۔ دوسرے قراء نے یفقھون مجرد فعل سے پڑھا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسروں کی کلام نہیں سمجھتے تھے۔ ابن عباس فرماتے وہ کسی کی کلام نہیں سمجھتے تھے اور نہ لوگ انکی کلام سمجھتے تھے۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

''انہوں نے کہا۱ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے اس علاقہ میں ۲ تو کیا ہم مقرر کر دیں آپ کے لئے کچھ خراج ۳ تا کہ آپ بنا دیں ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک بلند دیوار ۴''

۱۔ یعنی اس قوم نے کسی مترجم کے واسطہ سے ذوالقرنین سے درخواست کی کہ یاجوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے۔ قالوا کی جگہ ابن مسعود کی قرأت میں قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ہے۔ عاصم نے یہاں اور سورۂ انبیاء میں یاجوج اور ماجوج دونوں کو مہموز پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یہ دونوں عجمی اسم ہیں اور دلیل ان کا غیر منصرف ہونا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عربی ہیں اور اج الظلم سے مشتق ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ اجیج النار سے مشتق ہے (آگ کی ضو اور اس کا شرارہ) ان کی کثرت کی وجہ سے آگ کے شعلوں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے اور ان کا غیر منصرف ہونا معرفہ اور تانیث کی وجہ سے ہے (1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ الضحاک فرماتے ہیں یہ ترکوں کی نسل ہے۔ سدی کہتے ہیں ترک یاجوج کا ایک لشکر تھا جو نکلا ہوا تھا۔ اور ذوالقرنین نے دیوار بنائی تو یہ باہر ہی رہ گیا۔ سب ترک ان کی اولاد ہیں۔ قتادہ سے مروی ہے کہ وہ بائیس قبیلے تھے۔ ذوالقرنین نے اکیس قبیلوں کے آگے دیوار بنائی تھی اور ایک قبیلہ باقی رہ گیا تھا۔ ترک وہی ہیں۔ ان کو ترک اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ باہر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اہل تاریخ کہتے ہیں نوح علیہ السلام کے تین فرزند تھے۔ سام، حام اور یافث۔ عرب، عجم اور رومی سام کی اولاد ہیں اور حبشہ، زنج اور نوبہ حام کی اولاد ہیں۔ اور ترک، خزر، صقالبہ اور یاجوج ماجوج یافث کی نسل ہیں، ابن عباس نے عطا کی روایت میں فرمایا کہ یاجوج و ماجوج دس حصے ہیں اور سارے انسان ان کے مقابلہ میں ایک حصہ ہیں۔ حضرت حذیفہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ یاجوج ایک امت ہے اور ماجوج بھی ایک امت ہے اور ان میں سے ہر ایک امت کی تعداد چار لاکھ ہے، ان میں سے کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اپنی نسل سے ہزار آدمی ایسے نہ دیکھ لے جو ہتھیار اٹھالیں (یعنی جوان ہو جائیں) یہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، بے آباد دنیا تک پھیلتے جائیں گے (2)۔

میں کہتا ہوں شاید حدیث کا مطلب یہ ہو کہ جب ذوالقرنین نے دیوار بنائی تھی اس وقت ان میں سے ہر امت کی تعداد چار لاکھ تھی لیکن اس کے بعد، جب ان میں سے ہر شخص اپنے ہزار مسلح افراد دیکھ کر مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور يَسِيْرُوْنَ اِلَى

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 596 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 97-596 (الفکر)

خَرَابُ الدُّنْيَا کا معنی یہ ہو کہ جب قیامت کے قریب اس دیوار سے نکلیں گے تو بے آباد دنیا تک چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں یاجوج ماجوج کی تین قسمیں تھیں کچھ ارزر (شام کا ایک درخت ہے) کی مانند ہیں، ان کی لمبائی اوپر کی جانب ایک سو بیس ہاتھ ہے اور ایک قسم وہ ہے جن کا عرض اور طول برابر ایک سو بیس ہاتھ ہے۔ ان کے سامنے نہ پہاڑ ٹھہر سکتا ہے نہ لوہا۔ ایک قسم وہ ہے جو ایک کان کو بچھونا بناتے ہیں اور دوسرے کو لحاف' گھوڑے' وحشی' خنزیر جس کے قریب سے گزرتے ہیں اسے کھا جاتے ہیں۔ ان میں سے جو مرتا اسے بھی وہ کھا جاتے ہیں، ان کا آگے والا دستہ شام میں اور پیچھے والا دستہ خراسان میں ہے۔ مشرق اور بحیرہ طبر کی نہریں پی جاتے ہیں (1) میں کہتا ہوں یہ قرب قیامت میں اس دیوار سے نکل کر پئیں گے اور ہر چیز کو کھائیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان کا طول ایک بالشت اور عرض ایک ہاتھ ہے اور کچھ ان میں بہت لمبے ہیں (2)۔

کعب فرماتے ہیں یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے عجیب لوگ ہیں۔ یہ اس طرح پیدا ہوئے کہ آدم علیہ السلام کو ایک دن احتلام ہوا اور ان کا نطفہ مٹی سے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پانی سے یاجوج و ماجوج کو پیدا فرما دیا۔ وہ باپ کی طرف سے ہمارے علاتی بھائی ہیں لیکن ماں کی طرف سے کچھ نہیں لگتے (3)۔

امام بغوی فرماتے ہیں وہب بن منبہ نے ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین رومی تھا اور ایک بوڑھی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ بالغ ہوا تو ایک نیک آدمی بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا میں تجھے مختلف زبانوں والی قوموں کی طرف بھیجنے والا ہوں۔ ان میں سے دو امتیں ایسی ہیں جن کے درمیان زمین کے طول کی دوری ہے۔ ایک سورج کے غروب ہونے کی جگہ ہے اسے ناسک کہا جاتا ہے۔ دوسری سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے، اسے منسک کہا جاتا ہے۔ دو امتیں ہیں جن کے درمیان زمین کے عرض کی مسافت ہے۔ ایک دائیں قطر میں ہے، اسے ھاویل کہا جاتا ہے۔ دوسری زمین کے بائیں قطر میں ہے، اسے قاویل کہا جاتا ہے۔ ایک امت زمین کے وسط میں ہے جن میں جن اور انسان، یاجوج و ماجوج ہیں۔ ذوالقرنین نے عرض کی میں کس قوم کے ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا اور کس لشکر کے ساتھ ان پر چڑھائی کروں گا اور کونسی زبان سے ان کے ساتھ بات کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تجھے سطوت عطا کروں گا' تیری زبان کو پھیلا دوں گا، تیرے بازوؤں کو مضبوط کروں گا۔ تجھے کوئی چیز خوفزدہ نہیں کرے گی' میں تجھے ہیبت کا لباس پہناؤں گا۔ تجھے کوئی چیز نہیں روکے گی' تیرے لئے نور و ظلمت کو مسخر کر دوں گا، نور و ظلمت تیرے لشکر بنا دوں گا۔ نور تیری آگے سے راہنمائی کرے گا ظلمت تجھے پیچھے سے گھیرے میں لئے رکھے گی۔ ذوالقرنین پہلے سورج کے غروب ہونے کی طرف چلا۔ وہاں اس نے کافی لوگ پائے جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس نے ان پر ظلمت سے چڑھائی کی حتیٰ کہ انہیں ایک مکان میں جمع کر دیا پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف بلایا۔ ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ منکر ہو گئے۔ پھر اس نے منحرفین کی طرف توجہ کی۔ ان پر ظلمت کو داخل کیا پس وہ تاریکی ان کے پیٹوں اور گھروں میں داخل ہو گئی۔ پس وہ بھی اس کی دعوت میں داخل ہو گئے۔ پھر اس نے اہل مغرب سے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ ان کو لے کر چلا حتیٰ کہ ہاویل قوم کے پاس پہنچا ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو ناسک قوم کے ساتھ کیا تھا۔ پھر وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ منسک قوم کے پاس پہنچا، ان سے بھی وہ معاملہ کیا جو پہلی امتوں کے ساتھ کیا تھا پھر وہ قاویل قوم کے پاس آیا۔ ان سے بھی پہلی امتوں جیسا سلوک کیا پھر وہ ان امتوں کی طرف متوجہ ہوا جو زمین کے وسط میں تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچا جہاں مشرقی سمت ترکوں کا علاقہ ختم ہوتا ہے تو انسانوں میں سے ایک نیک گروہ اس کے پاس آیا اور کہا اے ذوالقرنین ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک مخلوق ہے جو چوپایوں کی

2_ البدایہ صفحہ 597　　3_ ایضاً

مثل ہے، جانوروں اور چوپایوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ ان کے درندوں کی طرح لمبے لمبے دانت اور داڑھیں ہیں، وہ سانپ اور بچھو کھاتے ہیں اور ہر ذی روح جسے اللہ نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے کھا جاتے ہیں۔ کوئی مخلوق ان کے بڑھنے کی طرح نہیں بڑھتی۔ اسمیں کوئی شک نہیں وہ زمین کے مالک بن جاتے ہیں، اس پر غلبہ پالیتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں۔ کیا ہم تیرے لئے چندہ اکٹھا کریں اس شرط پر کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنادے۔ ذوالقرنین نے کہا میرے رب نے مجھے جو قوت عطا کی ہے وہ تمہاری ان کوڑیوں سے کہیں بہتر ہے۔ فرمایا تم پتھر' لوہا' اور تانبا اکٹھا کرو میں ان کی خبر لے کر آتا ہوں۔ ذوالقرنین چلا گیا حتیٰ کہ ان کے شہروں کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اس قوم کو ایک ہی مقدار میں پایا ہم میں سے ٹھگنا (پست قد) کے نصف قد کے برابر ان کا قد تھا۔ ہمارے ہاتھوں کے ناخنوں کی طرح ان کے پنجے تھے اور دانت' کچلیاں درندوں کی طرح تھیں، ان کے جسموں پر سخت بال تھے جو انہیں سردی گرمی سے بچاتے تھے' ان کے کان بڑے لمبے تھے۔ ایک کو بچھونا اور ایک کو اوڑھنا بناتے تھے' ایک میں موسم گرما گزارتے دوسرے میں موسم سرما۔ جہاں جمع ہوتے جانوروں کی طرح جماع کرتے۔ جب ذوالقرنین نے ان کی عادات واطوار کا جائزہ لے لیا تو دونوں پہاڑوں کی طرف واپس آیا۔ ان کے درمیان کی پیائش کی پھر پانی تک بنیاد کھدوائی، اس کے اندر پتھر ڈلوائے، تانبے سے مصالحہ تیار کیا اور اسکو ان پتھروں کے اوپر ڈال دیا پس وہ اس طرح ہو گیا گویا زمین کے نیچے سے پہاڑ نکل آیا ہے (1)۔

۲۔ یعنی یاجوج و ماجوج ہماری زمین میں قتل' تخریب کاری' کھیتوں کی تباہی کر کے فساد پھیلاتے ہیں۔ کلبی کہتے ہیں وہ موسم ربیع میں زمینوں کی طرف نکلتے اور ہر سبز و تر چیز کو کھا جاتے ہیں اور ہر خشک چیز کو اٹھا کر ساتھ لے جاتے۔ اس سے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ لوگوں کو بھی کھا جاتے تھے (2)۔

۳۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۃ المومنون میں خراجاً الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی ہم اپنے اموال سے ایک حصہ نکالیں گے۔ ابوعمرو کہتے ہیں الخرج کا معنی جس کے ذریعے سے رغبت دی جائے اور خراج جس کا ادا کرنا لازمی ہو اور الخرج افراد پر ہوتا ہے اور خراج زمینوں پر ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں اپنے سر کا خرج ادا کرو اور اپنے شہر کا خراج ادا کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں الخراج زمین پر ٹیکس ہوتا ہے اور الخرج مصدر ہے۔

۴۔ نافع' ابن عامر اور ابوبکر نے سین کے ضمہ کے سدا اور باقی قراء نے سدا سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ان کے سامنے کوئی بند باندھ دیجئے۔

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾

"وہ بولا وہ دولت جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر ہے پس تم میری مدد کرو جسمانی مشقت سے میں بنا دوں گا تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ ۱۔"

۱۔ قال کا فاعل ذوالقرنین ہے۔ مکنی کو ابن کثیر نے بغیر ادغام کے اصل پر دونوں کیساتھ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلے نون کو مفتوح اور دوسرے کو مکسور پڑھا ہے۔ جبکہ دوسرے قراء نے نون مشدد مکسور کے ساتھ مدغم پڑھا ہے یعنی جو میرے رب نے مجھے مال اور ملک میں سے عطا فرمایا ہے وہ تمہارے خراج سے کہیں بہتر ہے' تم کام کر کے یا جن آلات کی مجھے ضرورت ہے ان کے ذریعے میری مدد کرو۔ میں ایک مضبوط دیوار بنا دیتا ہوں، وہ دیوار دو پہاڑوں سے بلند تھی۔ عرب کہتے ہیں ثُوبٌ مُرَدَّمٌ جب اس پر تہہ در تہہ ٹکڑے لگے ہوئے ہوں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 597 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 598

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾

''تم لے آؤ میرے پاس لوہے کی چادریں ۱؎ (چنانچہ کام شروع ہوگیا) یہاں تک کہ جب ہموار کر دیا گیا وہ خلا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا ۲؎ تو اس نے حکم دیا دھونکو یہاں تک کہ جب وہ لوہا آگ بنا دیا ۳؎ تو اس نے کہا لے آؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا ۴؎ کہ میں اسے اس پگھلے ہوئے لوہے پر انڈیلوں ۵؎ ''

۱؎ اتونی کو جمہور قراء نے ہمزہ قطعی کے ساتھ ابتاء سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی دینا اور عطا کرنا ہے۔ اس مطالبہ اور خراج کے واپس کرنے اور بدنی مشقت پر اکتفاء کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ آلات مہیا کرنا اعانت ہے۔ عمل پر خراج نہیں۔ ورش نے اپنی اصل پر ہمزہ کی حرکت ماقبل تنوین کو دے کر پڑھا ہے ابو بکر نے ردما ن اتونی یعنی تنوین کے کسرہ اور اس کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی جیئونی ہے۔ ابتداءً ہمزہ پر کسرہ تھا پھر اجتماع ہمزتین کی وجہ سے ہمزہ یاء سے بدل گیا جن میں پہلا مکسور تھا اور دوسرا ساکن تھا۔ زبرۃ بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ابو بکر کی قراءت پر اس کی اصل بزبر الحدید تھی کیونکہ اتیان مصدر لازم ہے۔ پھر باء کو حذف کیا گیا جیسے امرتک الخیر میں باء کو حذف کیا گیا ہے۔ وہ لوگ ذوالقرنین کے حکم کے مطابق لوہے کی چادریں، لکڑی اور کوئلہ لے آئے۔ اس نے انہیں ایک دوسرے پر جوڑ دیا۔ وہ متواتر لوہے کی چادریں لکڑی اور کوئلے پر ڈالتا رہا اور اسی طرح لکڑی اور کوئلے پر لوہے کی چادریں ڈالتا رہا۔

۲؎ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے الصدفین کو صاد اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو بکر نے صاد کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے صاد اور دال دونوں پر فتحہ پڑھا ہے۔ یہ تمام لغتیں موجود ہیں اور یہ الصدف سے ہے جس کا معنی المیل ہے کیونکہ ہر ایک پہاڑ دوسرے کی طرف مائل تھا۔ اسی سے التصادف بمعنی التقابل ہے۔

۳؎ ذوالقرنین نے مزدوروں کو کہا اس سارے ملبہ میں آگ لگاؤ اور پھر اس کو دھونکو۔ یہ سلسلہ شروع رہا حتی کہ وہ ملبہ بالکل آگ کی طرح بنا دیا گیا۔ بنانے کی نسبت ذوالقرنین کی طرف کی ہے حالانکہ بنانے والے تو مزدور تھے اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کام ذوالقرنین کے حکم سے ہوا تھا۔

۴؎ اتونی کو حمزہ اور کسائی نے قال کی لام کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ جیئی کے معنی میں پڑھا ہے اور جب ابتداءً پڑھتے ہیں تو ہمزہ وصلی کو کسرہ اور ہمزہ ساکنہ کو ماسے بدل کر پڑھتے ہیں۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں اعطاء کے معنی میں ہمزہ قطعی اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

۵؎ افراغ کا معنی انڈیلنا ہے اور قطراً پگھلا ہوا تانبا ہے، یعنی تم تانبا لے آؤ، میں اس پگھلے ہوئے تانبے کو لوہے پر ڈالوں گا پس آگ لکڑی اور کوئلے کو کھا گئی۔ اور پگھلا ہوا تانبا لکڑی کی جگہ ہو گیا حتی کہ لوہا اور تانبا آپس میں چمٹ گئے لوہا اینٹ بن گیا اور تانبا مٹی کے قائم مقام ہو گیا پس وہ مضبوط پہاڑ بن گیا۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس دیوار کا عرض پچاس ہاتھ، اونچائی دو سو ہاتھ اور لمبائی ایک فرسخ تھی (1)۔

قطراً اسم ہے جس میں اتونی اور افرغ دونوں عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ بصری علماء دوسرے فعل کو عمل کراتے ہیں اور فرماتے ہیں پہلے فعل کا مفعول حذف ہوتا ہے جس پر دوسرے فعل کا مفعول دلالت کر رہا ہوتا ہے اور بصری علماء اپنے مذہب کے مختار ہونے کی دلیل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 599 (الفکر)

یہ دیتے ہیں کہ دوسرا فعل مفعول کے قریب ہوتا ہے اس لئے اس کو عمل کرانا اولیٰ ہے اور اگر پہلے فعل (اتونی) کا قطراً کو مفعول بنایا جائے دوسرے فعل (افرغ) کے مفعول کے لئے ضمیر نکالنی لازم ہوگی۔ اس التباس سے بچنے کے لئے دوسرے فعل کو عمل کرانا ہی بہتر ہے۔ کوئی علماء فرماتے ہیں پہلا فعل مقدم ہوتا ہے اس کا تقدم عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے یہاں بھی قطراً اتونی کا مفعول ہوگا اور افرغ کا مفعول محذوف ہوگا۔ دونوں صورتوں میں کوئی التباس نہیں ہے۔

فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

''سو یاجوج و ماجوج بڑی کوشش کے باوجود اسے سر نہ کر سکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے [1]''

[1] اسطاعوا اصل میں استطاعوا ہے جمہور نے دو قریب المخرج حروف کے اتصال سے بچنے کے لئے تاء کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ حمزہ نے تاء کو طاء میں ادغام کر کے مشدد اور اجتماع الساکنین علی غیر حدہ کر کے پڑھا ہے۔ یعنی وہ اس دیوار کی بلندی اور ملائمت کی وجہ سے نہ اس کے اوپر چڑھ سکے اور اس کی شدت وصلابت کی وجہ سے نہ نیچے سے سوراخ کر سکے۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ﴿ؕ۹۸﴾

''ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے مجھے یہ توفیق بخشی) اور جب آ جائے گا میرے رب کا وعدہ تو وہ اسے ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ (ہمیشہ) سچا ہوا کرتا ہے [1]''

[1] یعنی ذوالقرنین نے کہا۔ یہ دیوار یا یہ خلا پر کرنے کی قدرت رب کی اپنے بندوں پر خاص رحمت ہے۔ لیکن جب یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا وقت میرے پروردگار کی طرف سے آ جائے گا یا یہ معنی کہ قیامت جب قریب آ جائے گی تو یہ دیوار زمین میں بوس ہو جائے گی۔ کوفیوں نے دکاء کو مد اور ہمزہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر ہمزہ اور مد کے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی وہ اسے کوٹی ہوئی، ریزہ ریزہ اور زمین کے برابر کر دے گا۔

ذوالقرنین کا قصہ یہاں ختم ہوا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ذوالقرنین ظلمت میں داخل ہوا پھر جب واپس آیا تو شہرزور میں اس کا وصال ہو گیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کی عمر تیس سال سے کچھ زائد تھی (1)۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ نے عن ابی رافع عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج ہر روز اس دیوار کو کھودتے ہیں حتیٰ کہ جب سورج کی شعاع نظر آتی ہے تو ان کا سردار کہتا ہے اب واپس چلے جاؤ بقیہ کل کھود یں گے لیکن اللہ تعالیٰ اسے پھر مکمل فرما دیتا ہے۔ لیکن جب فیصلہ الٰہی کا وقت آ جائے گا اور وہ اسی طرح کھود یں گے کہ سورج کی شعاعوں کا ظہور ہونے لگے گا تو ان کا سردار کہے گا اب واپس جاؤ بقیہ کل ان شاء اللہ کھود یں گے۔ ان شاء اللہ کہنے کے بعد دوسرے دن واپس آئیں گے تو ویسے ہی پائیں گے جیسے چھوڑ کر گئے تھے، پس وہ اس بقیہ حصہ کو کھود یں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے۔ پہلے وہ پانیوں کا رخ کریں گے، لوگ ان کے خوف سے قلعوں میں چھپ جائیں گے۔ وہ یاجوج و ماجوج اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، وہ خون آلود ہو کر واپس آئیں گے۔ وہ کہیں گے ہم اہل زمین پر غالب آ گئے اور اہل السماء پر بھی غالب آ گئے۔ اللہ تعالیٰ انکی گدیوں میں ایک کیڑا پیدا فرما دے گا جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ زمین کے کیڑے موٹے ہو جائیں گے اور ان کے گوشت کھانے کی وجہ سے وہ

1۔ تفسیر بغوی جلد 3، صفحہ 602

اللہ تعالیٰ کا خوب شکرادا کریں گے(1)۔

مسلم نے نواس بن سمعان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا، دوران گفتگو آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی۔اور کبھی بلند ہو جاتی ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وعظ سے یوں محسوس ہونے لگا کہ دجال کھجوروں کے جھنڈ میں ہے۔پھر جب ہم آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ہمارے چہروں سے دجال کا خوف پہچان لیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے چہروں پر یہ خوف وہراس کے آثار کیوں ہیں۔ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے دجال کا تذکرہ فرمایا۔آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی تھی اور کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ہم نے گمان کیا کہ وہ کھجوروں کے اس جھنڈ میں ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر دجال سے زیادہ کسی اور چیز کا خوف ہے جو(قرب قیامت میں) ظاہر ہوگی۔اگر دجال نکلے گا اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں گا تو میں اس سے جھگڑوں گا۔اور اگر میری عدم موجودگی میں نکلے گا تو ہر شخص خود اس سے مقابلہ کرے گا۔ اللہ کریم میری طرف سے اس سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے گا۔وہ چھوٹے چھوٹے بالوں والا جوان ہوگا،اس کی آنکھ کا ڈھیلا باہر نکلا ہوا ہوگا اور میں اسے عبدالعزیٰ بن قطن کی طرح دیکھتا ہوں۔جو تم میں سے دجال کو پائے وہ سورۂ کہف کی پہلی آیات کی تلاوت کرے،وہ شام اور عراق کے درمیان سے پھوٹے گا۔وہ دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! وہ زمین میں کتنا عرصہ ٹھہرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس دن۔(اس وقت) ایک دن سال کی طرح ہوگا۔ایک دن ایک مہینہ کی طرح ہوگا،ایک دن جمعہ کی طرح ہوگا،اس کے تمام دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے۔ہم نے عرض کی حضور ﷺ! ایک دن جو سال کا ہوگا کیا اسمیں ہمارے لئے ایک دن نمازیں کافی ہوں گی۔فرمایا نہیں بلکہ تم اندازہ سے نماز ادا کرنا۔ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ وہ زمین میں کتنا جلدی چلے گا؟ فرمایا وہ اس بادل کی طرح تیز چلے گا جس کو پیچھے سے ہوا دھکیل رہی ہوتی ہے۔وہ دجال ایک قوم کے پاس آئے گا وہ انہیں اپنی طرف بلائے گا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اور اسکی بات کو قبول کرلیں گے۔وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ بارش برسادے گا' زمین کو حکم دے گا تو وہ اناج وسبزہ اگادے گی۔ان کے اونٹ شام کو واپس آئیں گے تو ان کی کوہانیں پہلے کی بنسبت لمبی ہوں گی۔ان کی اونٹنیوں کی کھیری مکمل بھری ہوئی ہوں گی اور ان کے پہلو لمبے ہو چکے ہوں گے۔پھر وہ ایک قوم کے پاس آئے گا،انہیں اپنی الوہیت کی دعوت دے گا وہ اس کی بات کو رد کردیں گے۔فرمایا وہ ان سے مڑے گا تو وہ سب قحط میں مبتلا ہو جائیں گے،ان کے مال میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا۔پھر وہ ایک بنجر زمین پر آئے گا،اسے کہے گا اپنے خزانے اگل دے پس اس کے خزانے نکل کر شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں گے۔پھر وہ ایک جوان آدمی کو بلائے گا اور اسے تلوار کے ساتھ مارے گا تو اسے دو ٹکڑے کر دے گا پھر وہ اس کو بلائے گا تو وہ مقتول شخص ہنستا' مسکراتا اس کے پاس آجائے گا۔

اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمائیں گے، وہ دمشق کی مشرقی جانب سفید منارہ کے پاس فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔جب آپ سر جھکائیں گے تو بارش کی طرح قطرے گریں گے اور جب سر بلند کریں گے تو آپ سے موتیوں کی طرح قطرے ٹپکیں گے۔اور آپ کی سانس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہوگی۔اس لئے جس کافر کو لگے گی وہ مر جائے گا اور آپ کی سانس کا اثر حد نظر تک ہوگا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے حتیٰ کہ لد کے دروازے پر اسے پائیں گے اور اسے قتل کردیں گے۔پھر عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے پاس آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس دجال کے شر سے محفوظ رکھا ہوگا۔ان کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 600 (الفکر)

چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں ان کے درجات انہیں بتائیں گے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائیں گے کہ میں نے کچھ ایسے بندے (یاجوج و ماجوج) نکالے ہیں جن سے کسی کو جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، تم میرے بندوں کو طور کی طرف لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالے گا وہ ہر ٹیلے سے نکل پڑیں گے، انکا پہلا گروہ بحیرہ طبریہ پر پہنچ جائے گا، وہ اس کا سارا پانی پی جائے گا۔ پھر آخری گروہ آئے گا وہ کہیں گے کبھی یہاں پانی تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی (طور پر) محصور ہو جائیں گے، ہر چیز کا اتنا کال پڑے گا کہ ایک بیل کا سر کسی کے لئے اتنا عظیم ہو گا جیسے آج تمہارے لئے سو دینار ہیں۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی سب اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے رہیں گے حتی کہ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا فرمائے گا اس کی وجہ سے وہ ایک شخص کی موت کی طرح سب مر جائیں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور انکے ساتھی زمین پر اتریں گے۔ زمین پر کوئی ایک بالشت کے برابر جگہ بھی ان کی بدبو اور تعفن سے خالی نہیں پائیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اللہ کریم کی بارگاہ میں اس مصیبت سے نجات کی التجا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی فریاد کو قبول فرمائیں گے اور بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح پرندے بھیجیں گے، وہ پرندے یاجوج و ماجوج کے جسموں کو اٹھا کر وہاں پھینک آئیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ کریم بارش برسائیں گے جس سے مٹی کا گھر، اون سے بنا ہوا خیمہ کوئی بھی محروم نہیں رہے گا۔ زمین دھل جائے گی اور صاف وشفاف ہو جائے گی پھر زمین کو حکم ہو گا اپنی برکت اگا دے۔ اس وقت پھر اتنی برکت ہو جائے گی کہ ایک انار کو پوری ایک جماعت کھائے گی، اس کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے۔ دودھ میں بڑی برکت ہو گی حتی کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی لوگوں کے کئی گروہوں کے لئے کافی ہو گی اور ایک گائے ایک قبیلہ کے لئے کافی ہو گی، ایک بکری ایک خاندان کے لئے کافی ہو گی۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا چلائیں گے۔ وہ ہوا ہر مومن و مسلمان کی بغل کے نیچے لگے گی تو اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ صرف برے لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح لڑتے ہوں گے۔ ان پر ہی قیامت قائم ہو گی(1)۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے دوسرا یاجوج و ماجوج کا گروہ آئے گا تو وہ کہے گا یہاں کبھی پانی تھا پھر وہ چل کر جبل خمر تک پہنچیں گے۔ یہ بیت المقدس کا پہاڑ ہے اور کہیں گے ہم نے زمین والوں کو قتل کر دیا۔ آؤ اب ہم آسمان والوں کو قتل کریں، وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں خون آلود واپس لوٹائے گا۔

ترمذی کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح بڑے بڑے پرندے بھیجے گا جو انہیں (یاجوج و ماجوج) اٹھا کر لے جائیں گے اور گڑھے میں پھینک دیں گے اور مسلمان ان کے تیروں، کمانوں اور ترکشوں کو سات سال تک جلاتے رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا۔ الخ۔ امام بغوی نے یہ حدیث ذکر کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ حضرت وہب فرماتے ہیں پھر یاجوج و ماجوج سمندر پر آئیں گے اور اسکا سارا پانی پی جائیں گے اور اسکے جانور کھا جائیں گے پھر وہ لکڑیاں، درخت اور لوگوں میں سے جو انہیں مل جائے گا اسے کھا جائیں گے لیکن وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ اور بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گے(2)۔

امام بخاری نے ابو سعید الخدری کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا یاجوج و ماجوج کے نکلنے کے بعد بھی حج اور عمرہ کیا جائے گا(3)۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 602 (الفکر) 3۔ ایضاً

''اور ہم واگزار کر دیں گے بعض کو اس دن کہ وہ (تند موجوں کی طرح) دوسروں میں گھس جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو اکٹھا کر دیں گے ۔1''

1۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دیوار کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد یاجوج و ماجوج پانی کی موجوں کی طرح ایک دوسرے میں داخل ہوں گے اور کثرت اور دوڑنے میں سبقت لیجانے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے میں خلط ملط ہوں گے اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ قیامت کا منظر بیان ہو رہا ہے کہ جن وانس ایک دوسرے میں اس وقت حیران و پریشان داخل ہوں گے ۔اس آخری قول کی تائید نفخ فی الصور کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ہم صور پھونکیں گے اور ساری مخلوق کو حساب و کتاب کی خاطر ایک مٹی میں جمع کر دیں گے ۔

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۙ﴿۱۰۰﴾

''اور ہم ظاہر کریں گے جہنم کو اس دن کفار کے لئے بالکل عیاں ۔1''

1۔ یعنی کافر اپنی آنکھوں سے جہنم کا مشاہدہ کریں گے ۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

''وہ کافر جن کی آنکھوں پر پردے پڑے تھے میری یاد سے اور جو (کلمہ حق) سن بھی نہیں سکتے تھے ۔1''

1۔ غطاء سے مراد ہر وہ چیز ہے جو کسی دوسری چیز کو ڈھانپ دے ۔ذکر سے مراد وجود باری تعالیٰ اور صفات باری تعالیٰ کے دلائل و آیات ہیں ۔یعنی حق کا مشاہدہ کرنے اور حق بات سننے سے محروم اس لئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شقاوت لکھ دی ہے اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے بغض و عناد رکھتے ہیں اور جو اُس کے نائبین ہیں ان سے بھی عداوت رکھتے ہیں اور ان پر صفت اضلال کا عکس پڑا ہے اور ان کا مبدء تعین اسم مضل ہے ۔اس لئے یہ حق کی نہ روشنی دیکھ سکتے ہیں اور نہ حق کی آواز سن سکتے ہیں ۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

''کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو1 میرے بغیر حمایتی 2 (یہ ناممکن ہے) بیشک ہم نے تیار کر رکھا ہے جہنم کو کفار کی رہائش کے لئے 3''

1۔ عبادی سے مراد ملائکہ مسیح اور عزیر علیہم السلام ہیں ۔ابن عباس فرماتے ہیں عبادی سے مراد شیاطین ہیں جن کی اتباع کافر کرتے تھے مقاتل فرماتے ہیں بت مراد ہیں اور یہاں بتوں کو عباد اسی طرح کہا گیا ہے جیسا کہ ذیل کی آیت میں ہے ۔اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ۔ترجمہ: بیشک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا بندے ہیں تمہاری طرح (1)۔

2۔ دونی کو نافع، ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے من دونی حال ہے اولیاء سے مراد رب یا شفیع ہیں ۔عبادی اور اولیاء لیتخذوا کے مفعول ہیں اور پھر ان موصول اپنے صلہ سے مل کر حسب کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور یہاں استفہام انکاری ہے، یعنی معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ میرے بندے ان کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریہ)

دوست نہیں دشمن ہیں، وہ ان کی نازیبا اور لایعنی حرکتوں سے ہمیشہ براءت کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ نیک بندے طبعاً کافروں شیطانوں اور بتوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان سے دشمنی رکھتے ہیں۔ جب قیامت کا ہولناک ہنگامہ برپا ہوگا، یہ کافر بت اور شیاطین ایک دوسرے کا انکار کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور اپنے عبادت گزاروں سے براءت کا اظہار کریں گے یا حسب کا دوسرا مفعول محذوف ہے اور قرینہ کی بناء پر خبر کی طرح اس کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ یعنی کیا یہ کافر یہ خیال کرتے ہیں کہ میرے بندوں کو میرے بغیر حمایتی بنانا ان کے لئے نفع مند ہوگا (نہیں ہرگز نہیں) ابن عباس فرماتے ہیں اس کا یہ مفہوم ہے کہ کیا کافروں کا یہ گمان ہے کہ میرے بغیر حمایتی بنانے سے مجھے غصہ وغضب نہیں آئے گا اور میں ان کو سزا نہیں دوں گا (1) (یہ ان کی سوچ کتنی احمقانہ اور غلط ہے) اس تاویل پر حسب کے دونوں مفعول محذوف ہوں گے، جوابی لا اغضب ہے اور یہ جملہ دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور ان یتخذوا حرف جر مقدر کے ساتھ کفروا کے متعلق ہے۔ یعنی جنہوں نے میرے بغیر ان کو حمایتی بنایا اس سبب سے انہوں نے کفر کیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام ابن عباس کے قول پر ہو کہ میرے بغیر میرے بندوں کو ان کا حمایتی بنانا مجھے ناراض نہیں کرے گا۔ ہرگز نہیں میں ان کو اس پر سخت سزا دوں گا۔ اس تقدیر پر دوسرا مفعول محذوف ہوگا۔

۳ نزلاً سے مراد منزل ہے یا وہ جگہ جو مہمان کی آمد سے پہلے تیار کی جاتی ہے۔ اس ارشاد میں ان سے استہزاء اور انہیں تنبیہ ہے کہ جس عذاب کو وہ حقیر سمجھتے ہیں وہ ان کے لئے بالکل تیار ہے (ان کے وقت مقررہ کے آنے کی دیر ہے پہنچتے ہیں جہنم کے بھڑکتے شعلوں سے ان کی تواضع کی جائے گی)

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾

"فرمایئے (اے لوگو) کیا ہم مطلع کریں تمہیں ان لوگوں پر جو اعمال کے لحاظ سے گھاٹے میں ہیں۔ ا"

ا اعمالاً پر نصب تمیز کی بناء پر ہے اور جمع اس لئے کہ اسم جنس اگر ذکر کیا جاتا تو وہ فاعل کے اختلاف یا اپنے مدلول کے متنوع ہونے پر دلالت نہ کرتا اگرچہ وہ اپنے مدلول کی ہر اکائی پر دلالت کرتا، اس لئے عمل کو جمع (اعمال) ذکر فرمایا تاکہ مذکورہ دونوں امروں میں سے ایک پر دلالت کرے۔

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جنکی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آرائش میں کھو کر رہ گئی ہے اور وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ کوئی بڑا عمدہ کام کر رہے ہیں۔ ا"

ا ضل کا معنی ضائع ہونا ہے۔ سعی کا معنی کوشش اور کاوش ہے فی الحیاۃ الدنیا، سعیهم کے متعلق ہے۔ صنعاً کا معنی عمل اور کام ہے۔ الذین اسم موصول محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف ھم کی خبر ہے، یہ سوال کا جواب ہے یا من الاخسرین سے بدل کی بناء پر مجرور ہے یا مذمت کی بناء پر منصوب ہے۔

ابن عباس، سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں جن کی ساری کوششیں رائیگاں ہیں وہ یہود و نصاریٰ ہیں، وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دین منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد وہ راہب ہیں جو اپنے گرجا گھروں میں رہتے ہیں (2) اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے آخرت کی نعمتوں کی امید پر دنیا کی ساری لذتوں کو چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری جدوجہد رائیگاں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

ہے کیونکہ وہ عقیدہ کفر یہ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب فرماتے ہیں اس سے مراد خارجی ہیں(1) کیونکہ یہ پہلا فرقہ ہے جنہوں نے اہل سنت و جماعت، یعنی صحابہ کرام اور ان کے ساتھیوں سے بغاوت کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ بدعتی ہیں جو نفس کے پجاری ہیں اور انہوں نے اہل سنت و جماعت کی مخالفت کی ہے۔ پس اس میں سب فرقے رافضی معتزلہ اور دوسرے تمام گمراہ فرقے شامل ہیں۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد کافر ہیں جو قیامت اور دوبارہ اٹھنے پر ایمان و یقین نہیں رکھتے اور صرف وہی اعمال کرتے رہے جو ان کے لئے دنیا میں نفع بخش ہوتے ہیں، انہیں آخرت کی کوئی فکر ہی نہیں اور نہ وہ دنیا کے بعد کسی چیز کا عقیدہ و تصور رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو دنیا میں آخرت کے اعمال میں سے کوئی ایسا عمل کرتا ہے جو دنیا میں اسکے گھاٹے اور خسارے کا باعث ہے (جیسے صدقہ و خیرات وغیرہ) تو وہ پاگل ہے۔ میری اس توجیہ کی تائید آئندہ آیت بھی کرتی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾

''یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا[1] اور اس کی ملاقات کا تو ضائع ہو گئے ان کے اعمال[2] تو ہم ان (کے اعمال تولنے) کے لئے روز قیامت کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے[3]''

[1] اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کو سخت قسم کی تنبیہ کی گئی ہے جو قیامت کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور پھر دنیا کے اعمال کو آخرت کے اعمال پر ترجیح دیتے ہیں اور صبح و شام دنیا کے لئے سرگرداں رہتے ہیں لیکن آخرت کو سنوارنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ مغفرت الٰہی اور اس کے فضل و رحمت کے حصول کے لئے کبھی کوشش نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دانشمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنا مطیع بنایا اور مرنے کے بعد کی زندگی کو سنوارنے کے لئے نیک عمل کئے اور عاجز (کم عقل) وہ ہے جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور اللہ پر (جھوٹی) امید لگائے رہا(2)۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ اگر آیت میں مراد یہود و نصاریٰ ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ وہ قیامت کا صحیح عقیدہ نہیں رکھتے اور اسکے عذاب کے ملنے کا نظریہ نہیں رکھتے۔

[2] ایسے بدعقیدہ اور کمزور عقیدہ لوگوں کے اعمال جو انہوں نے دنیا کی خاطر کئے یا ثواب کی امید سے کئے سب رائیگاں ہو جائیں گے۔ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں ان کا کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا کیونکہ نیکیوں کی قبولیت کے لئے ایمان کی نعمت کا ہونا شرط ہے۔

[3] ایسے بدمذہبوں کیلئے اللہ کی بارگاہ میں کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی بارگاہ میں (قیامت کے روز) ایک موٹا بھاری بھرکم آدمی آئے گا لیکن اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا اور فرمایا یہ آیت پڑھو۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا(3)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے نقل کی ہے۔ ابونعیم اور الآجری نے اس آیت کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ اس طرح ہے کہ ایک طاقتور بہت زیادہ کھانے والا شخص میزان میں رکھا جائے گا تو اسکا وزن ایک جو کے برابر بھی نہ ہوگا اور فرشتہ ایسے ستر آدمیوں کو ایک دھکا دے کر پھینک دے گا یا یہ معنی کہ ہم ایسے لوگوں کے لئے میزان قائم ہی نہیں کریں گے کہ ان کے اعمال کا وزن کیا جائے۔ کیونکہ ان کے سارے اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے بلکہ بغیر وزن اور تول کے انہیں دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ جن اعمال کو وہ نیکیاں خیال کرتے ہیں ان کا میزان میں کوئی وزن نہ ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 550 (العلمیۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 691 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوسعید خدری نے فرمایا لوگ قیامت کے روز اپنے اعمال لے کر آئیں گے ان کے پاس اعمال تہامہ پہاڑ کی طرح بڑے بڑے ہوں گے، جب ان کا وزن کیا جائیگا تو انکا کچھ وزن نہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ فلا نقیم لهم یوم القیامة وزناً کا یہ مراد ہے(1)۔

امام سیوطی فرماتے ہیں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا مؤمنین کے لئے میزان خاص ہے یا کفار کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا۔ پہلے قول کے مؤید آیت کریمہ فلا نقیم لهم یوم القیامة وزناً کو دلیل بناتے ہیں اور دوسرے قول کے حمایتی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ارشاد ان کے اعمال کی کوئی حیثیت نہ ہونے سے مجاز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ الایۃ الی قولہ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ ترجمہ: اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہ ہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ ہر شخص کے اعمال کا میزان ہونا ضروری نہیں، وہ لوگ جو بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہوں گے ان کے لئے میزان نصب نہ ہوگا۔ اسی طرح جنہیں جلدی جلدی بغیر حساب وکتاب دوزخ میں ڈالا جائے گا ان کے لئے بھی میزان نہ ہوگا۔ اور ایسے لوگوں کا ذکر اس ارشاد میں ہے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ۔ علامہ قرطبی کا یہ قول دونوں قولوں اور آیتوں کو جمع کر دیتا ہے اور وہ فریق جنہیں جلدی بھیجا جائے گا ان کے لئے میزان نہ ہوگا اور بقیہ کفار کیلئے میزان ہوگا۔ امام سیوطی نے اسی طرح لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں آیت میں مذکورہ کفار کو منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ خاص کرنے کا بھی احتمال ہے کیونکہ منافقین ابتداءً مسلمانوں میں رہیں گے اور ہر قوم کے اپنے معبود کے پیچھے جانے کے بعد اہل کتاب میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾

"یہ ہے ان کی جزا جہنم اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور رسولوں کو مذاق بنالیا۔ 1"

1۔ ذالک کا مشار الیہ۔ ان کے اعمال کا سقوط اور ان کا بے قدر ہونا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے (یعنی ذالک مبتدا محذوف کی خبر ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاءھم مبتدا ثانی ہو اور جہنم خبر ہو پھر جملہ اسمیہ ذالک کی خبر ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاء ھم اس کا بدل ہو اور جھنم کی خبر ہو۔ یا جزاء ھم ذالک کی خبر ہو اور جھنم خبر کا عطف بیاں ہو۔ ھزوا کا معنی مذاق کرنا ہے اور یہاں مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾

"یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے۔ 1"

1۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ بہتر جنت ہے، اور اعلیٰ جنت ہے، اس کے اوپر رحمٰن کا عرش (عظیم) ہے، اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں (متفق علیہ)(2) ترمذی اور حاکم نے عبادہ بن الصامت سے اور بیہقی نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت کے سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان زمین اور آسمان جیسا فاصلہ ہے۔ فردوس جنت کا اعلیٰ درجہ ہے اور اس کے اوپر عرش ہے اور اس سے جنت کی چار نہریں نکلتی ہیں جب تم اللہ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔

بزار نے عرباض بن ساریہ سے، طبرانی نے ابی امامہ سے اسی طرح روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 391 (وزارت تعلیم)

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ مقام ہے(1)۔ حضرت ابی امامہ کی حدیث میں یہ زائد ہے کہ اہل فردوس عرش کی چر چراہٹ کو سنتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا جنتوں میں سے فردوس سے کوئی اعلیٰ جنت نہیں ہے، اسمیں نیکی کا حکم کرنیوالے اور برائی سے روکنے والے داخل ہونگے۔ مقاتل فرماتے ہیں فردوس جنت کا بلند، بہتر، افضل اور نعمتوں سے لبریز مقام ہے(2)۔

احمد طیالسی اور بیہقی نے ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت الفردوس چار ہیں، دو سونے کی ہیں جن کے زیور، مکان اور ہر چیز سونے کی ہے اور دو جنتیں چاندی کی ہیں۔ الحدیث۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ ہر جنت کو فردوس کہا جاتا ہے۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے، اس حدیث میں راوی سے سہو ہوا ہے یا یہاں فردوس کا لغوی معنی مراد ہے۔ کعب فرماتے ہیں فردوس ایک باغ ہے جس میں انگور ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں فردوس رومی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی باغ ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں یہ حبشی زبان میں باغ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ زجاج فرماتے ہیں یہ رومی لفظ ہے عربی کی طرف منتقل ہو کر آیا ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں فردوس سے مراد ایسا باغ ہے جس کے درخت بہت گھنے ہوں۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد خوبصورت باغ ہے۔ بعض فرماتے ہیں فردوس سے مراد وہ باغ ہے جس میں قسم قسم کے پودے ہوں اور اس کی جمع فرادیس ہے(3)۔ تو ابوموسیٰ کی روایت میں فردوس کا لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے مستعمل ہوا ہے لیکن معنی علمی کے اعتبار سے جنت کا اعلیٰ مقام ہے اگر آیت میں لغوی معنی مراد ہو تو اسم موصول اپنے عموم پر ہوگا، یعنی عام مومنین مراد ہوں گے اور اگر معنی علمی مراد ہو تو الذین امنوا سے مراد وہ لوگ ہوں گے جن کے پاس ایمان کامل موجود ہے۔

بیہقی نے حضرت انس کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فردوس کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے اور مشرک اور دائمی شراب خور پر اس میں داخلہ ممنوع قرار دیا ہے۔ ابن ابی الدنیا نے صفۃ الجنہ میں عبداللہ بن الحارث بن نوفل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا، فردوس کو اپنے ہاتھ سے لگایا۔ فرمایا اپنی عزت و جلال کی قسم فردوس میں ہمیشہ شراب پینے والا اور دیوث داخل نہ ہوں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! دیوث کون ہے؟ فرمایا جو اپنی بیوی میں زنا کی برائی کو دیکھتا ہے اور پھر اس میں سستی کا مظاہرہ کرتا ہے(4)۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

”وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں (اور) نہیں چاہیں گے کہ وہ اس جگہ کو بدل لیں۔ 1۔“

1۔ خالدین فیها حال مقدرہ ہے، وہ اس جگہ کو نہیں بدلیں گے کیونکہ جنت الفردوس سے زیادہ عمدہ جگہ ہے ہی نہیں کہ وہ اس کا اشتیاق کریں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس جملہ سے مراد ان کے جنت میں ہمیشہ رہنے کی تاکید ہو۔ حاکم وغیرہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کہ تم ہمیں کوئی سوال بتاؤ جو ہم اس شخص (محمد ﷺ) سے پوچھیں۔ تو یہود نے کہا تم اس سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرو۔ انہوں نے سوال کیا تو یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ کا ارشاد نازل ہوا۔ یہود نے کہا ہمیں علم کثیر عطا کیا گیا ہے، ہمیں تورات ملی ہے اور جسے تورات کا علم دیا گیا ہو اسے خیر کثیر عطا کیا گیا ہوتا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 457 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ)
3۔ ایضاً 4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 31-130 (التراث الاسلامی)

اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

"(اے حبیب) آپ فرمایئے کہ اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات (لکھنے) کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے پیشتر کے ختم ہوں میرے رب کے کلمات اور اگر ہم لے آئیں اتنی اور روشنائی اس کی مدد کو (تب بھی ختم نہ ہوں گے)۔[1]"

[1] مداد کا معنی ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے دوسری شی کی امداد کی جائے جیسے دوات کے لئے سیاہی اور چراغ کے لئے تیل۔ مداد کا اصل معنی زیادتی اور کسی چیز کا یکے بعد دیگرے آنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر سارے سمندر قلم کے لئے سیاہی بن جائیں اور قلم اللہ تعالیٰ کے علوم وحکمت کے کلمات کو لکھنا شروع کر دے (1) تو سارے سمندروں کا پانی ختم ہو جائے گا لیکن اس کے کلمات علم وحکمت کی انتہا نہ ہوگی کیونکہ ہر چیز کی انتہا اور حد ہے لیکن اس کے کلمات علم وحکمت لامحدود اور لامتناہی ہیں، وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ تنفد کو حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے۔ فرمایا اگرچہ ہم اس سمندر کی مثل بطور روشنائی ایک اور سمندر بھی لے آئیں تو پھر بھی اس کی شان کو مکمل کرنے سے پہلے وہ ختم ہو جائیں کیونکہ متناہی (ختم ہونے والا) کا مجموعہ بھی متناہی ہوتا ہے۔ اجسام میں سے جو چیز وجود میں داخل ہوتی ہے وہ متناہی ہوتی ہے اور متناہی لامحالہ غیر متناہی سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ہم سمندر یا سات سمندر اور اس کی مثل زائد سمندر فرض کریں اور اس کے ذریعہ سے علم الٰہی کے کلمات کو لکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کلمات میں سے ہر جزء جو قلم کے ساتھ قائم ہوگا اس جزء پر گزشتہ زمانہ میں طاری ہونے والے احوال لکھنا قلم کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اگرچہ وہ احوال متناہی ہی ہوں۔ پس اللہ کی دوسری ممکنات کے متعلق معلومات کا احاطہ کیسے ممکن ہوگا۔ متناہی کے لئے غیر متناہی کا احاطہ کرنا بہت بعید ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ یہود نے کہا تم خود کہتے ہو کہ ہمیں حکمت عطا کی گئی ہے اور تمہاری کتاب قرآن حکیم میں ہے کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا۔ پھر آپ کہتے ہیں تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی (2) کہ وہ علم جو اس کتاب میں فی نفسہ خیر کثیر ہے کیونکہ اسمیں تمہاری معیشت و آخرت کی صلاح کے تمام احکام موجود ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کے سمندروں کا ایک قطرہ ہے۔

بمثله میں با تعدیہ کے لئے ہے اور مثله جئنا کا مفعول ہے اور مدادا تمیز ہے جیسا کہ على التمرة مثلها زبدًا ہے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

"(اے پیکر رعنائی وزیبائی!) آپ فرمایئے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا خدا صرف اللہ وحدہ ہے[1] پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی[2] تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو[3]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریۃ)

1۔ ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو اس آیت کریمہ میں اظہار تواضع کا درس دیا ہے تا کہ اس کی مخلوق پر اپنی بڑائی نہ کرتے رہیں۔ حکم دیا کہ خود ہی اقرار کرو کہ میں تمہاری مثل بشر ہوں لیکن مجھے وحی کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے اور مجھے وحی کی عزت عطا کی گئی ہے۔ میری طرف وحی کی گئی کہ تمہارا خدا ایک ہے جس کا ذات وصفات میں کوئی شریک نہیں ہے(1)۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں اس فتنہ کا سد باب کیا گیا ہے جس میں نصرانی مبتلا ہوئے تھے، جبکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے تھے کہ اندھوں کو بینا کر دیتے ہیں۔ برص شدہ مریضوں کو درست کر دیتے ہیں۔ مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ (تو انہوں نے آپ کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا) حضور نبی رحمت ﷺ کو عیسیٰ علیہ السلام سے کئی گنا زیادہ معجزات عطا کئے گئے تھے۔ آپ کے معجزات کو دیکھ کر اس بدعقیدگی میں لوگوں کے مبتلا ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ تم اپنی ان ساری عظمتوں اور ان گنت کمالات کے ہوتے ہوئے اعلان کرو کہ میں اللہ کا عبد ہوں۔ وہ میرا معبود ہے۔ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک وہمسر نہیں ہے۔

2۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں رجاء کا لفظ خوف وامید کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے استعمال کیا ہے۔

فلا کل ما ترجو من الخیر کائن　و کل ما ترجو من الشر واقع

یعنی جس خیر کی تم امید کرتے ہو ضروری نہیں کہ تمہاری خواہش وامید پوری ہو جائے اور برائی جس کا تمہیں خوف ہے اس کا واقع ہونا بھی یقینی نہیں ہے(2)۔

3۔ جو حسن ثواب اور رویت باری تعالیٰ کا متمنی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ صرف اس کی رضا کے لئے اعمال صالحہ کرے، عمل میں ریاءکاری، نمود ونمائش کا زہر بالکل نہ ہو اور اپنے عمل پر کسی غیر سے جزاء وثناء کا خواہش مند نہ ہو۔

ابن ابی حاتم نے کتاب الاخلاص میں طاؤس سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں موقف حج میں کھڑا ہوتا ہوں اور مقصود اللہ کی رضا ہوتی ہے اور میری یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ میرا یہاں کھڑا ہونا دیکھا جائے (یعنی لوگ مجھے دیکھ لیں) آپ ﷺ نے اس شخص کی بات سن کر کوئی جواب نہ دیا حتی کہ یہ آیت فمن کان یرجو الایہ نازل ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ حاکم نے مستدرک میں متصل عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے نقل کی ہے اور شیخین کی شرط پر اسے ضعیف کہا ہے۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مسلمانوں میں سے ایک شخص جہاد کرتا تھا اور وہ یہ بھی پسند کرتا تھا کہ اس کے جہاد کو دیکھا جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی من کان یرجو لقاء ربہ الایۃ۔

ابونعیم اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ جندب بن زہیر جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے اور لوگوں میں اپنے عمل کا تذکرہ سنتے تو خوش ہوتے تھے اور اس خوشی میں نیکی میں اور اضافہ کرتے اس پر یہ آیت فمن کان یرجوا الخ نازل ہوئی(3)۔ اگر یہ کہا جائے کہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں اپنے گھر میں نماز پڑھ رہا تھا، میرے پاس ایک شخص آیا مجھے یہ بات بڑی اچھی لگی کہ اس نے مجھے نماز کی حالت میں دیکھا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوھریرہ رضی اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (التجاریہ)　　3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 69-458 (العلمیہ)

تعالیٰ عنہ اللہ تجھ پر رحم فرمائے تیرے لئے دو اجر ہیں ایک خفیہ عبادت کرنے کا اجر دوسرا اعلانیہ عبادت کا اجر۔

مسلم میں ابوذر سے روایت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا حضور بتائیں کہ جو شخص نیک عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی اس عمل پر تعریف کرتے ہیں (اس کو اجر ملے گا) فرمایا یہ مومن کو جلدی ملنے والی بشارت ہے(1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں احادیث آیت کے شان نزول میں ذکر کی گئی، احادیث کے منافی ہیں ان میں تطبیق کس طرح ہوگی۔

ہم کہتے ہیں ان دونوں قسم کے ارشادات میں کوئی تضاد اور تخالف نہیں ہے کیونکہ آیت کے شان نزول میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک عمل کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے عمل کو دیکھیں اور اس کے عمل کی تعریف کریں یا وہ عمل میں زیادتی کرتا ہے جب اس کو لوگ دیکھیں تو یہ سب ریاکاری اور شرک خفی ہے۔ اور جو شخص نیک عمل کرتا ہے، لوگ اس کو دیکھ کر اس کی تعریف کرتے ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتا ہے، جبکہ اس کا مقصود اس عمل سے لوگوں کی ثناء اور ان سے اجر لینا نہیں ہے اور ان کی خاطر وہ عمل میں زیادتی نہیں کرتا۔ تو یہ اس کو جلدی ملنے والی بشارت ہے اور اس کو خفی اور اعلانیہ عبادت کا دوہرا اجر بھی ملے گا۔ واللہ اعلم۔

جندب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کو سنانے کے لئے عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سنانے کی جزا دیتا ہے اور جو ریاکاری کا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ریاکاری کی سزا دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم)(2)

محمد بن لبید سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ شرک اصغر (چھوٹا) کیا ہے۔ فرمایا ریاکاری۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے بیہقی نے شعب الایمان میں یہ مفہوم زائد لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نیک اعمال کی جزاء عطا فرما رہا ہوگا تو ریاکاروں سے فرمائے گا تم اپنے اعمال کا اجر طلب کرنے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو تم دکھانے کے لئے دنیا میں عمل کرتے تھے اور دیکھو کیا تم انکے پاس جزاء اور خیر پاتے ہو(3)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں شرک اصغر سے بچو پوچھا گیا شرک اصغر کیا ہے فرمایا ریاکاری۔ اس اثر کو ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں، اصبہانی نے ترتیب وترغیب میں روایت کیا ہے۔

ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شریکوں کے شرک سے مستغنی ہوں۔ جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ غیر کو شریک کیا تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں، وہ اس کے لئے ہے جس کے لئے اس نے عمل کیا(4) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسعید بن ابی فضالہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو جمع فرمائے گا جس دن کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا جس نے کسی نیک عمل میں کسی غیر اللہ کو شریک کیا آج اسے چاہئے کہ غیر اللہ سے اپنا ثواب طلب کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں شرکاء اور شرک سے بے نیاز ہوں(5)۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص نیک عمل لوگوں کو سنانے کے

1۔ مشکوۃ المصابیح صفحہ 454 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 333 (العلمیہ)
4۔ ایضاً صفحہ 229 5۔ ایضاً صفحہ 330

لئے کرے گا اللہ تعالیٰ اسے سنانے کی سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے حقیر فرمائے گا اور اسکو رسوا کرے گا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

حضرت شداد بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس نے ریاء کاری سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے ریا کاری سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ جس نے ریا کاری سے صدقہ دیا اس نے شرک کیا(2)۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز سربمہر صحیفے لائے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان صحیفوں کو پھینک دو اور ان کو قبول کر لو فرشتے عرض کریں گے تیری عزت کی قسم ہم نے ان اعمال ناموں میں وہ کچھ لکھا ہے جو انہوں نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ اعمال میری رضا کے لئے نہیں تھے اور نہ میں آج انہیں قبول کرتا ہوں اور نہ ان اعمال میں میری خوشنودی مطلوب تھی(3)۔ اس حدیث کو بزار، طبرانی نے الاوسط میں دار قطنی، اصبہانی نے الترغیب میں روایت کیا ہے۔

شہر بن عطیہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص کو قیامت کے روز حساب کے لئے پیش کیا جائے گا، اس کے نامہ اعمال میں پہاڑوں کی مثل نیکیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے فلاں دن اس لئے نماز پڑھی تھی کہ تجھے نمازی کہا جائے۔ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، خالص دین میرے لئے ہے اور تو نے فلاں دن روزہ رکھا تھا کہ تجھے روزہ دار کہا جائے، میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور خالص دین میرے لئے ہے پھر یکے بعد دیگرے اس کے سارے ریاء کاری والے عمل مٹا دیئے جائیں گے۔ فرشتے اسے کہیں گے تو نے غیر اللہ کے لئے عمل کئے تھے۔

شداد بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے تمام لوگوں کو حد نظر تک ایک جگہ جمع فرمائے گا۔ ایک پکارنے والا لوگوں کو یہ بات سنائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں شریک سے بہتر ہوں ہر وہ عمل جو دنیا میں میرے لئے کیا گیا اور اس میں غیر کو بھی شریک کیا گیا، تو آج میں اپنے شریک کو ترک کرتا ہوں اور آج میں کوئی عمل قبول نہیں کرتا مگر وہ جو خالصاً میری رضا کے لئے کیا گیا تھا(4)۔ اس حدیث کو اصبہانی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے دوسروں کو دکھانے کے لئے کوئی عمل کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کام کو اسی کے سپرد کرے گا جس کے لئے اس نے عمل کیا تھا اور فرمائے گا دیکھ شریک تجھے کچھ نفع پہنچا سکتا ہے۔ صوفیاء کرام اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ جو دنا فتدلیٰ فکان قاب قوسین اوادنیٰ پر بلا کیف قرب الٰہی چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ فناء نفس اور رذائل نفس کے ازالہ کے بعد عمل صالح کرے کیونکہ نفس کے رذائل عمل کو فاسد کر دیتے ہیں اور عمل کی اصلاح صرف فناء نفس کے بعد ہوتی ہے۔ ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا غیر اللہ کے ساتھ نہ قلبی تعلق ہو نہ علمی علاقہ ہو اور نہ محبت کا تعلق ہو کیونکہ دل کے علمی تعلق سے مراد ذکر ہے اور ذکر عبادت ہے۔ محبت عبادت کا تقاضا کرتی ہے اور محبوب وہ ہے جو معبود ہے کیونکہ عبادت انتہا درجہ کی تواضع اور ذلت کو کہتے ہیں۔ انسان اپنے نفس کی تذلیل کرتا اور اپنے محبوب کی بارگاہ میں انتہا درجہ کی تواضع کرتا ہے۔ اور یہ خیر فناء

1۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 331 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 460 (ایضاً)
2۔ مجمع ... اوسط ... جلد 3، صفحہ 287 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 459 (العلمیہ)

قلب کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ غیر اللہ کے ساتھ علمی تعلق تو اولیاء کرام بلکہ انبیاء کو بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ علم جو فناء قلب کے بعد ہوتا ہے اس کا محل قلب نہیں ہوتا بلکہ اس کا دل تو اس مقام پر رحمٰن کی تجلیات کا مرکز ہوتا ہے۔ لیکن علم کا تعلق اس محل کے علاوہ کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ حکمت کے تقاضا کے مطابق تکلیف احکام کا مادہ اب بھی باقی ہوتا ہے۔

فصل

حضرت ابوالدرداء نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں جسے یاد ہوں گی وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا(1)۔ اس حدیث کو مسلم، احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے ابودرداء سے اس طرح روایت کی ہے کہ جو سورۂ کہف کی پہلی تین آیات پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے بچ جائے گا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت سہل بن معاذ حضرت انس سے اور وہ حضور سے روایت کرتے ہیں کہ جو سورۂ کہف کا اول و آخر پڑھے گا وہ اس کیلئے پاؤں سے سر تک نور اور جو ساری سورت تلاوت کرے گا وہ اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہوگی۔ امام احمد، مسلم اور نسائی نے اس طرح روایت کی ہے جس نے سورۂ کہف کی آخری دس آیات پڑھیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے جس نے اپنے بستر پر سورۂ کہف پڑھی تو اس کی سونے کی حالت میں ایک نور ہوگا جو اس کے لئے اس کے بستر سے مکہ تک جگمگائے گا اور اس نور کے اندر فرشتے ہوں گے جو اس کے اٹھنے کے وقت تک اس کے لئے دعا مغفرت کرتے رہیں گے۔ اگر اس کا سونے کا مقام مکہ میں ہوگا تو اس کے لئے نور ہوگا جو اس کے بستر سے بیت المعمور تک چمکے گا، اس میں فرشتے ہوں گے جو اس کے بیدار ہونے تک اس کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سورۂ کہف جمعہ کے دن تلاوت کرے گا تو اس جمعہ اور آئندہ جمعہ کے درمیان اس کے لئے وہ نور روشنی کرے گا(2)۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہے۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اس طرح روایت کی ہے کہ جو جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرنے گا اس کے پاس سے کعبہ تک اس کے لئے نور چمکتا رہے گا۔ براء بن عازب سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص سورۂ کہف کی تلاوت کر رہا تھا اور اسکے قریب ایک گھوڑا دو رسیوں سے باندھا ہوا تھا۔ پس ایک بادل اس پر چھانے لگا اور چکر لگانے لگا اور قریب آنے لگا۔ اور اس کے گھوڑے نے اس بادل کے قریب ہونے کی وجہ سے بدکنا شروع کر دیا۔ صبح وہ شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اس نے رات کا ماجرا عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ (بادل) وہ سکینت تھی جو تلاوت قرآن کے وقت نازل ہوتی ہے(2)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو فمن کان یرجوا لقاء ربہ الایہ تلاوت کرے گا، اس کے لئے عدن سے مکہ تک نور ہوگا جس میں فرشتے بھرے ہوں گے (ازالۃ الخفاء)

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے سورۂ کہف کا ترجمہ بروز اتوار دس بج کر بیس منٹ پر صبح ختم ہوا۔

الحمد للہ رب العالمین الصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 271 (قدیمی) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 399 (العلمیۃ)

اللھم انی اعوذبک من الھم والحزن واعوذبک من العجز والکسل واعوذ
اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں حزن وملال سے' تجھ سے پناہ مانگتا ہوں عجز اور سستی سے اور
بک من الجبن والبخل واعوذبک من غلبۃ الدین وقھر الرجال
تجھ سے پناہ مانگتا ہوں بزدلی اور بخل سے اور تجھ سے پناہ مانگتا ہوں قرض کے غلبہ اور انسان کے قہر سے۔
اللّٰھم انی اعوذبک من ان اشرک بک وانا اعلم واستغفر لما لا اعلم
اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ دانستہ شرک کروں اور میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اس شرک سے جو نادانستہ مجھ سے سرزد ہو۔
اللّٰھم امین بجاہ سیدالانبیاء والمرسلین صلی اللّٰہ علیہ وآلہ واصحابہ وازواجہ وعلماء امتہ و اولیاء ملتہ اجمعین۔

سورۂ مریم

سورۂ مریم مکی ہے،اس میں 6 رکوع اور 98 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝

''کاف۔ہا۔یا۔عین۔ص۔[1]''

[1] ابوبکر اور کسائی نے ھا اور یاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن کثیر اور حفص نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ،ابن عامر اور حمزہ نے ھا کے فتحہ اور یاء کے امالہ کے ساتھ،نافع نے ھا کو امالہ کے ساتھ اور یاء کو بین بین پڑھا ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝

''یہ ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی۔[1]''

[1] حضرت نافع اور عاصم ذکر سے پہلے صاد کو ظاہر کرتے ہیں اور باقی قراء صاد کو ذال میں ادغام کرتے ہیں۔
اگر حروف مقطعات سے مراد سورت یا قرآن ہو تو ذکر رحمت ربک الخ خبر ہوگا یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ھذا المتلو ذکر رحمت ربک (یہ تلاوت کیا گیا ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا) یا ذکر رحمت ربک (یعنی جو تجھ پر پڑھا گیا ہے اس میں تیرے رب کی رحمت کا ذکر ہے) عبدہ' رحمت یا ذکر کا مفعول ہے،اس تقدیر پر کہ رحمت' ذکر کا فاعل ہو جیسا کہ اس جملہ میں ہے ذکرنی جود زید اور زکریا' عبدہ سے بدل ہے یا عطف بیان ہے ذکر کو حمزہ' کسائی اور حفص نے قصر کے ساتھ اور دوسرے قراء نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝

''جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے۔[1]''

[1] اذ ظرف ہے جو رحمت یا ذکر کے متعلق ہے۔یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی عبادت گاہ میں آدھی رات کے وقت آہستہ آہستہ اپنے کریم رب کے حضور التجاء کی۔آہستہ اور خفیہ لہجہ میں اس لئے دعا کی کیونکہ سری اور خفی دعا میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے۔اخفاء دعا کی سنت ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝

''عرض کی اے میرے رب[1] میری حالت یہ ہے کہ کمزور و بوسیدہ ہوگئی ہیں میری ہڈیاں اور بالکل سفید ہوگیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے[2] اور اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہو اے میرے رب! اور میں نامراد رہا

ہوں۔ ۳؎ ‘‘

۱؎ یہاں سے حضرت زکریا علیہ السلام کی دردمندانہ التجاء کا ذکر ہو رہا ہے۔ رب اصل میں یاربی تھا۔ حرف ندا اور مضاف الیہ کو اختصار کی خاطر حذف کیا گیا ہے۔ وھن کا معنی کمزور اور نرم ہونا ہے۔ وھن کی نسبت العظم (ہڈی) کی طرف کی گئی ہے کیونکہ ہڈیاں جسم کا سہارا اور بدن کی اصل ہیں یا اس لئے کہ بدن کے اعضاء میں سے ہڈیاں مضبوط ترین عضو ہیں؛ جب ہڈیاں ناتواں اور کمزور ہوگئی ہیں تو بقیہ اعضاء زیادہ کمزور ہوں گے۔ اور العظم (ہڈی) کو مفرد ذکر فرمایا ہے لیکن مراد جنس ہے۔

۲؎ بڑھاپے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ بھی سفید ہوتا ہے اور آگ کے اشتعال کی طرح بالوں میں پھیل جاتا ہے۔ مبالغہ کے لئے اشتعال کی نسبت سر کی طرف فرمائی اور شیبا کو بطور تمیز ذکر فرمایا اور اس جملہ میں اشارہ فرما دیا کہ بڑھاپا پورے سر کو گھیر چکا ہے سب بال اولوں کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ الراس پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ الف لام پر اکتفاء فرمایا اور مضاف الیہ کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ مراد کا ظہور تقیید سے مستغنی کر دیتا ہے (مخاطب کا علم قید لگانے سے مستغنی کر دیتا ہے کیونکہ آپ اپنے سر کی حالت بیان فرما رہے تھے کسی غیر کے سر کی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے میرے پروردگار میں بوڑھا ہو چکا ہوں (اس جملہ میں جو لطائف ہیں ان کی وجہ سے بلاغت کے اعتبار سے انتہائی بلند درجے پر ہے)

علماء کا اختلاف ہے کہ جب آپ نے یہ التجاء کی تھی اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی عمر مبارک ساٹھ سال تھی۔ ابن ابی حاتم نے ابن المبارک سے یہی قول روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ستر سال تھی۔ یہ قول عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے ثوری سے نقل کیا ہے۔ محلی فرماتے ہیں آپ کی عمر مبارک ایک سو بیس سال تھی اور آپ کی اہلیہ محترمہ اٹھانوے سال کو پہنچ چکی تھیں۔

۳؎ اے میرے کریم رب ماضی میں جب بھی میں نے تیری بارگاہ بے نیاز میں دست طلب دراز کیا تو تو نے ہمیشہ میری التجاؤں کو شرف قبولیت بخشا تو نے کبھی مجھے نامراد و مایوس نہیں لوٹایا۔ میری آرزوؤں کی شاخ کو ثمر بار کرنا ہمیشہ سے تیری سنت رہی ہے۔ آج بھی میں تجھ سے قبولیت کی امید لے کر آیا ہوں۔ کریم اپنے در کرم کے امیدواروں کو کبھی نامراد نہیں لوٹاتا۔ دعا مصدر ہے جو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے تقدیر اس طرح ہے بدعائی ایاک۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فاعل کی طرف مضاف ہو۔ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ جب تو نے مجھے ایمان کے لئے دعوت دی تو میں تجھ پر ایمان لے آیا۔ ایمان کی روشنی کو ترک کر کے میں بدبخت و نامراد نہ ہوا۔ پس اس ایمان اور میرا تیری دعوت ایمان کو قبول کرنا ان کی برکت سے میری دعا کو شرف قبولیت عطا فرما۔ الم اکن کا جملہ پہلی کلام پر معطوف ہے یا ضمیر متکلم سے حال ہے کیونکہ معنی میں ضمیر متکلم فاعل ہے کیونکہ سابقہ جملوں کا معنی شبت ہے (یعنی میں بوڑھا ہو چکا ہوں)

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙ

’’اور میں ڈرتا ہوں (اپنے بے دین) رشتہ داروں سے (کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کر دیں) ۱؎ اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخشدے مجھے اپنے پاس سے ایک وارث۔ ۲؎ ‘‘

۱؎ موالی سے مراد چچا کے بیٹے ہیں۔ من ورائی یعنی میرے مرنے کے بعد، یہ محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی مجھے اپنے رشتہ داروں یا جو میرے بعد میرے جانشین بننے والے ہیں ان سے اندیشہ ہے کہ میرے وصال کے بعد وہ میری جانشینی کا حق ادا نہیں کریں گے اور میری امت پر دین کو اپنی خواہشات کے مطابق بدل دیں گے۔ یہ جملہ یا تو پہلی کلام پر معطوف ہے یا لم اکن کے فاعل سے حال ہے۔

ع اور میری بیوی بانجھ ہے۔ یعنی میں اور میری بیوی عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جس میں عادۃً اولاد نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں تیرے فضل اور تیرے کمال قدرت سے امید کی جاسکتی ہے۔ اس لئے تیری بارگاہ سے عرض ہے کہ تو مجھے ایسا بیٹا عطا فرما جو میرے وصال کے بعد اس منصب کی نازک ذمہ داریوں کو حسن وخوبی سرانجام دے سکے۔

يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝

''جو وارث بنے میرا اور وارث بنے یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان کا لہ اور بنا دے اسے اے رب! پسندیدہ (سیرت والا) ۲''

لہ ابوعمرو اور کسائی نے یرثنی اور یرث کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ دعا کا جواب ہیں، جبکہ قراء نے ولیاً کی صفت کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے۔ یہاں میراث سے علم اور نبوت کی میراث ہے۔ مال کی میراث مراد نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام مال کا وارث نہیں بناتے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں اور انبیاء کرام کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے۔ وہ تو صرف علم کا وارث بناتے ہیں۔ جس نے ان کے علم سے کچھ حاصل کیا تو اس نے نبوت کی میراث کا بڑا حصہ لیا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے کثیر بن قیس سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور انہوں نے راوی کا نام قیس بن کثیر ذکر کیا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث کی وجہ سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے باپ محمد رسول اللہ ﷺ کی میراث سے حصہ نہیں عطا فرمایا تھا۔ جبکہ انہوں نے مالی میراث کا مطالبہ کیا تھا۔ اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدنا ابوبکر کے پاس آئے اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔ سیدنا ابوبکر نے ان دونوں کو بتایا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہم (انبیاء کرام) کسی کو وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے لا نورث ما ترکناہ صدقۃ(2)۔

اس طرح امام بخاری نے اپنی الصحیح میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت ازواج مطہرات نے اپنی میراث کے مطالبہ کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کیا حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے(3)۔ (پھر تم کیوں میراث کے مطالبہ کا مشورہ کر رہی ہو)۔ امام بخاری نے مالک بن اوس بن الحدثان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا تو ان کا پہرہ دار یرفا آیا اور پوچھا حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت زبیر اور حضرت سعد آپ سے ملنا چاہتے ہیں، انہیں اندر آنے کی اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں۔ ان سب حضرات کو یرفا نے اندر آنے کی اجازت دی (تو وہ اندر تشریف لے آئے) پھر یرفا نے پوچھا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے ہیں، انہیں اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں اجازت ہے۔ حضرت عباس نے عرض کی اے امیر المومنین میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا لوگو! میں تمہیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 34 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 995 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً، صفحہ 996

یہ آسمان اور زمین قائم ہیں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ (ہم سے مراد حضور ﷺ کی اپنی ذات تھی) پوری مجلس نے کہا بیشک حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس تصدیق کے بعد حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تمہیں بھی علم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا فرمایا تھا(1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے ورثاء میرے وصال کے بعد دینار (مال) تقسیم نہ کریں۔ جو کچھ میری ازواج مطہرات کے خرچ اور میرے خادموں کے خرچ سے بچے وہ صدقہ ہے(2)۔

ایسی ہی احادیث حضرت حذیفہ بن الیمان، زبیر بن العوام اور ابو درداء سے مروی ہیں۔

شیعہ (رافضی) ان احادیث کا انکار کرتے ہیں اور سیدنا صدیق اکبر پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے مقتدا محمد بن یعقوب الکلینی نے اپنی جامع (الکافی) میں ابو عبداللہ جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِرْھَماً وَلَا دِیْنَارًا وَّاِنَّمَا اُوْرِثُوْا اَحَادِیْث مِنْ اَحَادِیْثِھِمْ۔ (ترجمہ) انبیاء کرام درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے ارشادات کا وارث بناتے ہیں۔

آیت کریمہ کا سیاق بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ یہاں مال کی میراث کی بات نہیں کیونکہ آپ نے دعا فرمائی کہ وہ وارث بنے میرا اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا۔ حالانکہ حضرت زکریا کے بیٹے کیلئے تمام آل یعقوب کی طرف سے انکے مال کا وارث بننا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ نیز یہ مقام نبوت سے بہت بعید ہے کہ ذکریا علیہ السلام ہر وقت اسی فکر و اندیشہ میں رہتے ہوں کہ میرے مال کا وارث میرے رشتہ دار اور چچا کے بیٹے بن جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

۲؎ اے میرے پروردگار پھر میرے اس فرزند ارجمند کو قول و عمل میں پسندیدہ بنادے یا یہ معنی کہ اس کو خوشی اور غم، خیر اور مصیبت ہر حال میں اپنی رضا پر راضی رہنے والا بنادے۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝

''اے زکریا ہم مژدہ دیتے ہیں تجھے ایک بچے (کی ولادت) کا اس کا نام یحییٰ ہوگا ہم نے نہیں بنایا اس کا کوئی ہم نام اس سے پہلے۔ ۱؎''

۱؎ اس کلام میں اختصار ہے تقدیر اس طرح ہے کہ فاستجاب اللّٰہ دعاء ہ فقال ذکریا یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو اس قادر مطلق نے شرف قبولیت عطا فرمایا اور پھر یہ خوشخبری سنائی۔ سورۃ ال عمران میں زکریا کو مد اور قصر کی صورت میں پڑھنے کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ فرمایا ہم تجھے ایک من موہنے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو تیرا صحیح جانشین ہوگا، تیری مسند کا صحیح اہل ہوگا، اس کا نام بھی ہم خود رکھتے ہیں، اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ نام خود رکھ کر اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو شرف و عزت کے مقام بلند پر فائز فرمادیا۔ اسمہ یحییٰ غلام کی پہلی صفت ہے۔ اور لم نجعل الخ یا تو حال ہے یا غلام کی دوسری صفت ہے۔ قتادہ اور کلبی فرماتے ہیں اس سے پہلے یحییٰ کسی کا نام نہ تھا(3)۔ اس میں دلیل ہے کہ غیر معروف اسماء کے ساتھ کسی کا نام رکھنا مسمی (اس ذات) کی تعظیم کے لئے ہوتا

ہے۔ سعید بن جبیر اور عطاء نے یہ معنی کیا ہے کہ ہم نے اس کی کوئی شبیہ اور مثل پیدا نہیں کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ھَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے (1)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی کوئی مثل نہیں بنائی جس نے نہ اللہ کی نافرمانی کی ہو اور نہ معصیت کا ارادہ کیا ہو (2)۔ میں کہتا ہوں اس سے یہ مراد ہے کہ آپ میں اکثر فضائل جمع تھے۔ اگرچہ بعض جزء کی فضیلت کا موجب تھے جیسے آپ کا عورتوں کی خواہش نہ کرنا وغیرہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ پہلے انبیاء کرام سے افضل تھے کیونکہ حضرت خلیل علیہ السلام اور کلیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء پہلے گزرے ہیں اور وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے فضائل و کمالات میں افضل تھے۔

علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مثل کسی بانجھ عورت نے بچہ نہیں جنا (3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ظاہر قول یہ ہے کہ یہ عجمی اسم ہے۔ اگر عربی ہے تو پھر فعل سے منقول ہے جیسے یعیش اور یعمر اسم فعال سے منقول ہیں۔ بعض علماء نے آپ کے اس اسم کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کی وجہ سے آپکی والدہ کا رحم (جو بڑھاپے کی وجہ سے بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا) زندہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا نام یحییٰ رکھا گیا۔ یا اس وجہ سے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ کی وجہ سے اللہ کا دین زندہ ہوا تھا (4)۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا ۝

"زکریا نے عرض کی میرے رب! کیسے ہو سکتا ہے میرے ہاں لڑکا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے [1] اور میں خود پہنچ گیا ہوں بڑھاپے کی انتہا کو [2]"

[1] رب اصل میں یا ربی تھا۔ انی بمعنی کیف ہے۔ و کانت امراتی عاقراً یا حال ہے یا سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ یہ زکریا علیہ السلام کا کلام ایک سوال ہے اور حقیقت حال طلب کرنے کیلئے ہے۔ یعنی ہمارے ہاں کیسے بچہ ہوگا؟ ہم دوبارہ جوان ہو جائیں گے یا اس پیرانہ سالی میں ہمارا بچہ پیدا ہوگا۔ اس کلام میں اسباب کو دیکھتے ہوئے اولاد پر تعجب کا اظہار ہے ورنہ آپ کو قدرت خداوندی پر کچھ تعجب نہ تھا۔

[2] عتیا اصل میں عتو تھا جیسے قعود ہے۔ عربوں نے دو متواتر ضموں اور دو واؤ کو ثقیل سمجھا اسلئے تاء کو کسرہ دیا پھر پہلی واؤ کسرہ کے بعد یاء سے بدل گئی پھر دوسری واؤ یاء سے بدل کر ادغام ہو گئی۔ جمہور قراء نے عتیا یعنی عین کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص اور کسائی نے مابعد کی اتباع کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ العتو کا معنی اطاعت سے انکار کرنا ہے لیکن یہاں مراد انتہائی بوڑھا ہونا ہے کیونکہ ضعیف اپنے نفس کی اطاعت نہیں کرتا اور اپنی مراد حاصل کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔ قتادہ فرماتے ہیں یہاں مراد ہڈیوں کا خشک اور کمزور ہونا ہے۔ عرب کہتے ہیں عتا الشیخ یعتو عتیا و عسیا۔ جب کوئی شخص اپنی عمر کی انتہا کو پہنچ جائے اور بوڑھا ہو جائے۔ عات اور عاس اسے کہتے ہیں جس کا جسم اور ہڈیاں خشک ہو جائیں (5)۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَیْـًٔا ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 530 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ)

''فرمایا یونہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ اس کبرسنی میں بچہ دینا میرے لئے آسان بات ہے ۱؎ اور (دیکھو!) میں نے تمہیں بھی تو پیدا کیا تھا اس سے پیشتر حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ ۲؎ ''

۱؎ قال کا فاعل اللہ تعالیٰ یا وہ فرشتہ ہے جو بشارت دینے آیا تھا۔ حضرت زکریا کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا بات بالکل اسی طرح ہے جیسی آپ نے کی ہے، اسباب کے اعتبار سے بچے کا پیدا ہونا بہت عجیب اور حیران کن ہے لیکن تمہارا رب فرماتا ہے کہ مجھ پر یہ معاملہ آسان ہے، ایسا ہی ہوگا جیسا میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ مجھے کسی سبب اور واسطہ کی ضرورت نہیں (میں قادر مطلق ہوں) یہ بھی ہوسکتا ہے حضرت زکریا نے فرمایا ہو کہ بات اسی طرح ہے۔ (اس صورت میں کہ جو مثل کے معنی میں ہے، سابق کلام کی تاکید کے لئے زائد ہے اور سابق کلام سے مراد حضرت زکریا کا قول رب انی یکون الخ ہے) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کذالک منصوب ہو اس قال کی وجہ سے جو قال ربک میں ہے اور دونوں فعل معمول بنانے میں جھگڑ رہے ہیں۔ دوسرے کو عمل کرایا گیا اور پہلے فعل میں مضمر مانا گیا اور اس کا برعکس بھی جائز ہے، یعنی قال ربک کذالک۔ یہ سابق کلام کی طرف اشارہ ہے یعنی یبشرک بغلام الخ یعنی مجھ پر آسان ہے کہ میں تیری قوت جماع لوٹا دوں اور تیری بیوی کے رحم کو علوق کے لئے کھول دوں یا یہ مبہم کی طرف اشارہ ہے جس کی تفسیر ھو علی ھین کا قول کررہا ہے۔

۲؎ حمزہ اور کسائی نے خلقناک یعنی تعظیم کے طور پر نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ علی میں جو ضمیر مجرور ہے اس سے حال ہے اور ھین کے متعلق ہے۔ ولم تک شیئا۔ خلقتک کی ک ضمیر سے حال ہے یعنی میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا تھا حالانکہ تو بالکل معدوم تھا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ معدوم شی نہیں ہے (جیسا کہ اہلسنت اور بعض معتزلہ کا مسلک ہے، جبکہ بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ معدوم شی ہے۔ یعنی اہلسنت کے نزدیک معدوم پر شی کا اطلاق نہیں ہوتا، جبکہ بعض معتزلہ کے نزدیک معدوم پر شی کا اطلاق ہوتا ہے)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝

''زکریا نے عرض کی اے میرے رب ٹھہراؤ میرے لئے کوئی علامت جواب ملا تیری علامت یہ ہے کہ تو بات نہیں کر سکے گا لوگوں سے تین رات تک حالانکہ تو بالکل تندرست ہوگا۔ ۱؎ ''

۱؎ رب اصل میں یا ربی تھا۔ لی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی میرے ایسی علامت ٹھہراؤ جو میری عورت کے حمل پر دلالت کرے۔ ثلاث لیال سے مراد تین دن ہیں جیسا کہ سورۂ ال عمران کی آیت دلالت کرتی ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ ان تین دنوں اور تین راتوں میں لوگوں سے آپ کلام نہ کر سکے۔ جب اللہ کا ذکر کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی زبان کو قوت گویائی عطا فرما دیتے۔ آپ ذکر وشکر کے لئے لوگوں سے تنہا ہوگئے تھے۔ سویا تکلم کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی آپ صحیح وسلامت ہونے کے باوجود بات نہیں کرسکیں گے۔ نہ آپ گونگے اور بہرے ہوں گے بلکہ صرف بطور علامت آپ سے قوت گویائی سلب کی جائیگی۔ مجاہد فرماتے ہیں کلام سے مانع کوئی مرض نہ ہوگی۔ بعض علماء نے سویا کا معنی متتابعات۔ یعنی متواتر کیا ہے لیکن پہلا معنی صحیح ہے (1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریۃ)

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ﴿۱۱﴾

''پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ تم پاکی بیان کرو (اپنے رب کی) صبح وشام۔ [1]''

[1] فاء عاطفہ ہے اور یہ مقدم کلام ظہرت پر معطوف ہے۔ یعنی وہ نشانی ظاہر ہوگئی اور آپ کلام نہ کر سکے تو باہر تشریف لائے۔ محراب سے مراد مسجد ہے۔ اس کو محراب اس لئے فرمایا کیونکہ یہ شیطان سے حرب (جنگ) کرنے کی جگہ ہے۔ قاموس میں محراب کے مختلف معانی ذکر ہیں۔ 1۔ کمرہ۔ 2۔ کمرے کا اگلا حصہ۔ 3۔ محترم جگہ۔ 4۔ مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ۔ 5۔ وہ جگہ جہاں بادشاہ علیحدہ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں لوگ محراب کے باہر منتظر تھے کہ آپ دروازہ کھولیں اور اندر داخل ہو کر نماز پڑھیں لیکن اچانک زکریا علیہ السلام باہر تشریف لائے تو رنگ اڑا ہوا تھا لوگوں نے وجہ پوچھی (1) تو آپ نے ان کو اشارہ سے صبح وشام ذکر الٰہی میں مشغول رہنے کا ارشاد فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں آپ نے یہ حکم زمین پر لکھا (2)۔ سبحوا سے پہلے ان مفسرہ کیونکہ اوحی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے یا ان مصدریہ ہے۔

یٰیَحْیٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾

''اے یحیٰی پکڑ لو اس کتاب کو مضبوطی سے اور ہم نے عطا فرمادی انکو دانائی جبکہ وہ بچے تھے۔ [1]''

[1] یہاں بھی کلام میں اختصار ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ یحیٰی کی والدہ حاملہ ہوئیں پھر انہوں نے یحیٰی کو جنم دیا پھر جب وہ خطاب الٰہی سننے کے اہل ہو گئے تو ہم نے انہیں حکم دیا۔ الحلی فرماتے ہیں حضرت یحیٰی دو سال کے تھے کہ یہ حکم ملا۔ الکتاب سے مراد تورات ہے اور بقوۃ سے مراد مضبوط اور کوشش اور توفیق طلب کرنے کے ساتھ۔ اور الحکم سے مراد حکمت اور کتاب کی سمجھ ہے۔ اتیناہ الحکم صبیا کا عطف یاقلنا یایحییٰ پر ہے۔ صبیاً۔ تین سال کا بچہ۔ حضرت یحیٰی علیہ السلام نے بچپن میں تورات پڑھی تھی۔ جو بلوغت سے پہلے قرآن پڑھ لے اس کے متعلق کہتے ہیں فقد اوتی الحکم صبیا۔ اس شخص کو بچپن میں حکمت عطا کی گئی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو بچپن میں بچوں نے کھیل کی دعوت دی تو آپ نے فرمایا ہمیں کھیل کود کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں الحکم سے مراد نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن میں یحیٰی علیہ السلام کو تاج نبوت عطا فرمایا تھا۔

وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾

''نیز عطا فرمائی دل کی نرمی اپنی جناب سے اور نفس کی پاکیزگی [1] اور وہ بڑے پرہیزگار تھے [2]''

[1] حنانا کا عطف الحکم پر ہے یعنی اپنی جناب سے ہم نے ان پر رحمت فرمائی یا یہ معنی کہ ہم نے ان کے والدین اور دوسرے لوگوں کے لئے حضرت یحیٰی کے دل میں نرمی پیدا فرمادی۔ یاحنانا کا معنی ہیبت اور وقار ہے۔ یا رزق یا برکت ہے۔ قاموس میں حنان کا معنی رحمت، رزق، ہیبت، وقار، دل کی نرمی ذکر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا اسم الحنان ہے جس کا معنی رحیم ہے۔ زکوۃ سے مراد گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک طاعت واخلاص ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں زکوٰۃ سے مراد عمل صالح ہے۔ ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ کلبی کہتے ہیں زکوٰۃ سے مراد وہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کی صورت میں عطا فرمایا تھا (3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 195 3۔ ایضاً

۲؎ آپ ایک مخلص اور اطاعت شعار مسلمان تھے آپ نے کبھی نہ کوئی گناہ کیا تھا اور نہ گناہ کا ارادہ کیا تھا۔ اس جملہ کا عطف اتیناہ پر ہے۔

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾

''اور وہ خدمت گزار تھے اپنے والدین کے اور وہ جابر (اور) سرکش نہ تھے۔ ۱؎''

۱؎ یعنی اپنے والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والے اور ان کے ساتھ احسان کرنے والے تھے اور متکبر نہ تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبار وہ ہوتا ہے جو غصہ میں مارتا ہے اور قتل کرتا ہے عصیا کا معنی گنہگار ہے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

''اور سلامتی ہو ان پر جس روز پیدا ہوئے اور جس روز وہ انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے۔ ۱؎''

۱؎ یہ جملہ معترضہ ہے۔ یعنی ہر اس چیز سے انہیں اللہ کی طرف سے سلامتی ہو جو تکلیف دیتی ہے۔ پیدائش کے دن یحییٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چھونے سے محفوظ رکھا۔ حالانکہ ہر پیدا ہونے والے بچہ کو شیطان چوک دیکر رلا دیتا ہے۔ وصال کے بعد عذاب قبر سے سلامت ہوں اور یوم حشر دوزخ کے عذاب اور قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ ہوں۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں انسان ان تین حالتوں میں رہتا ہے۔ جس دن پیدا ہوتا ہے تو ایک عالم کو چھوڑ کر دوسرے عالم میں آتا ہے پھر مرتا ہے تو ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جنہیں اس نے پہلے نہیں دیکھا ہوتا ہے۔ پھر جس دن قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو اپنے آپ کو ایسے حالات میں پائے گا جس کی مثل پہلے اس نے نہ دیکھے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو ان تینوں حالات میں حفاظت وسلامتی کا مژدہ سنا دیا(۱)۔

یوم ولد اپنے معطوفات سے مل کر ظرف مستقر کے متعلق ہے۔ جو سلام علیہ میں علیہ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ظرف مستقر فعل استقر یا حصل کے متعلق ہے جیسا کہ بصریوں کا مذہب ہے یا حاصل ومستقر (اسم فاعل) کے متعلق ہے۔ کہا جائے جیسا کہ کوفیوں کا مذہب ہے تو دونوں تقدیروں کی صورت میں ایک زمانہ پر دلالت کرے گی۔ یا زمانہ ماضی پر (جبکہ فعل حصل کے متعلق کہا جائے) یا زمانہ حال پر (جب اسم فاعل کے متعلق کیا جائے) پس یوم ولد کی ظرفیت دوسری تقدیر پر اور یوم یموت اور یوم یبعث پہلی تقدیر پر کیسے درست ہوگی (کیونکہ اگر حال کا زمانہ مراد لیا جائے تو یوم ولد ماضی ہے اس کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی اور اگر ماضی کا زمانہ مراد لیا جائے یوم یبعث اور یوم یموت کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی۔ ماضی کی صورت میں یوم ولد کے ساتھ معنی درست ہوگا کہ سلامتی قرار پذیر ہو جس دن پیدا ہوئے لیکن دوسرے صیغوں یوم یموت اور یوم یبعث کے ساتھ معنی درست نہ ہوگا۔ پھر معنی ہوگا کہ سلامتی زمانہ ماضی میں قرار پذیر ہو جس دن آپ کا وصال ہوگا اور جس دن آپ کو اٹھایا جائے گا)

محققین اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ظرف کا عامل معنوی ہوتا ہے اور وہ مصدر حصول اور استقرار ہے اور مصدر میں کسی زمانہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زید فی الدار قائماً میں حال کا عامل معنوی کہتے ہیں۔ اس کو جو حصل یا حاصل سے تعبیر کرتے ہیں تو یہ مجازاً ہے جیسا کہ ھذا زید قائما میں کہا جاتا ہے اشیر زیداً قائماً۔ اس میں زمانہ پر کوئی دلالت نہیں ہوتی۔ ظروف زمانیہ کا تعلق تینوں زمانوں سے کرنا جائز ہوتا ہے کیونکہ ان میں فعل کے معنی کی بو ہوتی ہے۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ یہ حصل یا حاصل کے متعلق ہے تو پھر ظرف اس کے قائم ہو جائے گی تو ضمیر محذوف (فعل یا شبہ فعل) سے منتقل ہو کر ظرف کی طرف منتقل ہو جائے گی پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (التجاریہ)

ظرف زمانہ کے معنی سے خالی ہو جائے گی پس تینوں زمانوں کے ساتھ تعلق جائز ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝

"اور (اے حبیب!) بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہوگئی اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا۔ ۱"

۱۔ واذکر کا عطف کلام سابق کے مضمون پر ہے' کیونکہ مذکور کو اس لئے ذکر کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب اس کو جان لے اور اسکی حفاظت کرے گویا یہ اعلم کے قول کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے یعنی اس قصہ کو جان لے اور اسکو محفوظ کر لے۔ تقدیر اس طرح ہے اعلم ذکر رحمة ربک زکریا واذکر فی الکتاب مریم الخ۔

الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے۔ اذانتبذت یا تو مریم سے بدل اشتمال ہے کیونکہ جس کیفیت میں آپ تھیں اس پر وقت مشتمل تھا۔ یا بدل ہے کیونکہ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے اور ظرف سے مراد وہ واقعہ ہے جو اس وقت میں رونما ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک چیز ہیں یا مضاف مقدر کی ظرف ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں اذ بمعنی ان مصدریہ ہے جیسا کہ اس جملہ میں ہے اکرمتک اذ لم تکرمنی اس صورت میں لامحالہ بدل ہی ہوگا۔ النبذ کا معنی کسی چیز کو پھینک دینا ہے۔ جو بعد اور دوری کو لازم ہے۔ اسلئے اسکا معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ الگ ہوگئیں۔ دور ہوگئیں اپنے گھر والوں سے ایک ایسے مکان میں جو اسی گھر میں مشرقی جانب تھا۔ سخت سردی کا موسم تھا، آپ دھوپ میں بیٹھ کر اپنے سر سے جوئیں نکال رہی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں آپ اس وقت حیض سے پاک ہوئی تھیں اور غسل کرنے کے لئے گئی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں عبادت کی خاطر علیحدہ مشرقی کمرے میں تشریف لے گئی تھیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اسی وجہ سے نصرانیوں نے مشرق کو اپنا قبلہ بنالیا۔ مکانا ظرف ہے یا مفعول بہ ہے کیونکہ انتبذت بمعنی اتت ہے۔ اسلئے مکاناً مفعول بہ ہوسکتا ہے۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝

"پس بنالیا اس نے لوگوں کی طرف سے ایک پردہ پھر ہم نے بھیجا اس کی طرف اپنے جبرئیل کو ۱ پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں ۲"

۱۔ ابن عباس نے حجاباً کا معنی ستراً یعنی پردا بیان فرمایا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ دیوار کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ مقاتل فرماتے ہیں پہاڑ کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ عکرمہ فرماتے ہیں آپ مسجد میں تھیں تو آپ کو حیض شروع ہوگیا۔ آپ اپنی خالہ کے گھر واپس آگئیں حتیٰ کہ جب خون ختم ہوا اور پاک ہوگئیں تو مسجد کی طرف پھر لوٹ آئیں۔ جب آپ حیض سے طہارت کے لئے غسل کر رہی تھیں اور آپ نے کپڑے اتارے ہوئے تھے تو ایک خوبصورت معتدل جسم اور گھنگھریالے بالوں والے نوجوان کی شکل میں جبرئیل ظاہر ہوئے۔ جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس کی طرف اپنے جبرئیل کو بھیجا (1)۔ جبرئیل کی اپنی طرف نسبت جبرئیل کو شرف عطا کرتے کے لئے کی۔ آپ کو روح اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ دین آپ کی وجہ سے اور آپ کی وحی کے ذریعے زندہ ہوتا ہے۔

۲۔ جبرئیل آپ کے سامنے تندرست امرد جوان کی شکل میں نمودار ہوئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (التجاریۃ)

بشری صورت میں آپ کے پاس آئے تھے اور آپ اسکے ساتھ حاملہ ہوگئی تھیں۔ پہلا قول صحیح ہے۔

قَالَتْ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ﴿۱۸﴾

''مریم بولیں میں پناہ مانگتی ہوں رحمٰن کی تجھ سے اگر تو پرہیز گار ہے۔ ۱؎''

۱؎ حضرت مریم علیہا السلام نے جبرئیل امین کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو دور سے یہ فرمایا۔ یہ ارشاد آپ کی انتہائی پاکدامنی اور عفت کی دلیل ہے۔

نافع، ابن کثیر و اور ابوعمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کنت تقیا۔ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ یعنی اگر تو متقی ہے تو مجھے نہ چھیڑنا۔ یا مجھ سے دور ہو جا، اسکی وجہ سے جس کی میں نے پناہ مانگی ہے۔ یہ اسی طرح کا قول ہے جیسے عرب کہتے ہیں ان کنت مومنا فلا تظلمنی۔ یعنی مناسب یہ ہے کہ تیرا ایمان تجھے ظلم کرنے سے منع کرے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا چاہئے یہ کہ تو اللہ سے ڈرے اور تیرا تقویٰ تجھے برائی سے روکے۔ بعض فرماتے ہیں یہ کلام مبالغہ پر مبنی ہے تقدیر اس طرح ہے اگر تو متقی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ جب تو متقی نہ ہوگا تو میں کتنی زیادہ تجھ سے مانگتی! یہ بھی جائز ہے کہ ان نافیہ ہو۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖۗ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ﴿۱۹﴾

''جبرئیل نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ میں عطا کروں تجھے ایک پاکیزہ فرزند۔ ۱؎''

۱؎ جبرئیل نے کہا میں انسان نہیں کہ تم مجھ سے گھبرا رہی ہو اور پناہ مانگ رہی ہو۔ میں فرشتوں میں سے تیرے رب کا فرستادہ ہوں۔ مجھے تیری طرف بھیجا گیا ہے تا کہ میں تجھے گناہوں سے پاک، یا خیر پر پرورش پانے والا، نیکی اور صلاح کے زینے پر چڑھنے والا فرزند عطا کروں۔

حضرت جبرئیل نے بچہ عطا کرنے کی نسبت اپنی طرف کی حالانکہ حقیقۃً بچہ عطا کرنے والا اللہ ہے۔ تو یہ آپ کی نسبت مجازی ہے کیونکہ آپ ظاہری سبب تھے، آپ نے پھونک ماری تھی (اس لئے ظاہری سبب کی طرف نسبت سے انسان مشرک نہیں ہوتا، جبکہ عقیدہ یہ ہو کہ ہر نعمت عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے) یہ بھی جائز ہے کہ (لا ھب لک) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت ہو۔ تقدیر اس طرح ہو کہ تیرے رب نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے۔ (اور) وہ فرماتا ہے میں نے تیری طرف اپنا رسول بھیجا تا کہ میں تجھے اس رسول کے پھونک مارنے کے ذریعے بچہ عطا کروں۔ ورش، ابوعمرو نے لیھب لک پڑھا ہے۔ اسی طرح حلوانی نے قالون سے لیھب لک نقل کیا ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہیں عطا کرے۔ اسی نسبت مجازی کے اعتبار سے صوفیاء کرام کہتے ہیں جسکے دو دن برابر ہوئے وہ خسارے میں ہے۔

قَالَتْ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾

''(حیرت سے) بولیں (اے بندۂ خدا) کیونکر ہوسکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی بشر نے ۱؎ اور نہ میں بد چلن ہوں''

۱؎ حضرت مریم نے تعجب کرتے ہوئے فرمایا میرے ہاں بچہ کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ کسی بشر نے مجھ سے نکاح بھی نہیں کیا۔ یہ اشارات

نکاح کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ بدکاری کے لئے خبث اور فجر جیسے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

۲؎ میں بدچلن بھی نہیں ہوں۔اس کا عطف سابق کلام پر ہے۔بغیا مبرد کے نزدیک اصل میں بغوی بروزن فعول تھا۔واؤ کو یاء سے بدلا گیا اور پھری کو یاء میں ادغام کیا گیا ہے۔پھر یاء کی مناسبت سے غین کو کسرہ دیا گیا۔اس کے آخر میں تاء لاحق نہیں ہوتی کیونکہ فعول بمعنی فاعل ہو تو تذکیر و تانیث کا فرق نہیں کیا جاتا۔ مذکر اور مونث دونوں کے لئے فعول ہی استعمال ہوتا ہے۔مبرد کے علاوہ علماء کے نزدیک بغیا کا اصل وزن فعیل ہے اور تاء اس کے آخر میں مبالغہ اور نسب کی وجہ سے لاحق نہیں ہوئی۔(قاعدہ یہ ہے کہ اسم فاعل کو فعیل پر محمول کیا جائے تو اس کے آخر میں تاء لاحق ہوتی ہے۔اور یہ حمل اس وقت ہوتا ہے، جبکہ اسم فاعل، فعیل کے لفظاً اور معنیً موافق ہو۔یعنی اسم فاعل حال اور استقبال کے معنی میں ہو۔اور وہ اسم فاعل جو مبالغہ اور نسبت کے لئے ہوتا ہے وہ دوام اور ثبوت کے لئے ہوتا ہے، حال اور استقبال کے لئے نہیں ہوتا۔پس جب لفظاً اسم فاعل مبالغہ اور نصب کی صورت میں فعیل پر لفظاً اور معنی جاری نہیں ہوتا تو اس کے آخر میں تاء بھی لاحق نہیں ہوتی۔اسی طرح نسبت کا صیغہ جب فاعل کے وزن پر ہو جیسے تامرٗ لابنٗ حائض وغیرہ تو ان کے آخر میں تا لاحق نہیں ہوتی کیونکہ اس سے مراد ذات تمر، ذات لبن اور ذات حیض ہوتا ہے)

حضرت مریم نے فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو نکاح ہوا ہو یا برائی کی گئی ہو لیکن مجھ میں جب یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں تو بچہ کیسے پیدا ہوگا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

''جبرئیل نے کہا یہ درست ہے (لیکن) تیرے رب نے فرمایا یوں بچہ دینا میرے لئے معمولی بات ہے اور (مقصد یہ ہے کہ) ہم بنائیں اسے اپنی (قدرت کی) نشانی لوگوں کے لئے اور سراپا رحمت اپنی طرف سے اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ۱؎''

۱؎ جبرئیل نے کہا معاملہ اسی طرح ہے، یعنی اللہ تجھے بیٹا بغیر باپ کے عطا کرے گا اگرچہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا اور تو بدچلن بھی نہیں ہے۔تیرا رب فرماتا ہے کہ بغیر باپ کے بیٹا پیدا کرنا میرے لئے کونسا مشکل ہے؟ میرے لئے تو یہ آسان سا معاملہ ہے۔قال ربک۔ یا تو محذوف جملہ کی علت ہے جس پر کذالک دلالت کر رہا ہے یا بتقدیر قد اس سے حال ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کذالک۔قال ربک کا مقولہ ہو تقدیر عبارت اس طرح ہے۔قال ربک کذالک۔اور ھو علی ھین علت کے معنی میں ہو۔ولنجعله یا تو علی ھین پر معطوف ہے کیونکہ وہ علت کے معنی میں ہے۔یعنی ہم ایسا کریں گے کیونکہ یہ آسان ہے ہمارے لئے اور ہم اسے قدرت کی نشانی بنائیں گے۔یا لنجعله کا عطف علت مقدر پر ہے جو جملہ محذوفہ ہے۔تقدیر عبارت اس طرح ہے۔اھب لک غلاما لنجتبیه بوحینا ولنجعله ایة للناس۔بعض علماء فرماتے ہیں غائب سے متکلم کی طرف التفات کے طریقہ پر اسکا عطف لیھب پر ہے۔رحمة منا یھلنجعله کے محل پر معطوف ہے یعنی تاکہ اسے اپنی طرف سے بندوں پر اپنی قدرت کی نشانی بنائیں جو اس سے ہدایت حاصل کریں یا اس کا عطف ایة پر ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم اسے اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔اے مریم اس امر کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے یا یہ معنی کہ لوح محفوظ پر مقدر ہو چکا ہے اور لکھا جا چکا ہے۔یا امراً مقضیاً کا معنی اموراً حقیقاً

ہے یعنی یقیناوہ ایسا کرے گا کیونکہ اس نے اس کو آیت اور رحمت بنانا ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

''پس وہ حاملہ ہوگئیں۔اس (بچہ) سے پھر وہ چلی گئیں اسے (شکم میں) لئے کسی دور جگہ۔ لے''

لے فحملته محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے فاطمانت بقول الملک فنفخ الملک فی جیب درعها فحملت حین لبست۔ یعنی حضرت مریم فرشتے کی بات سن کر مطمئن ہوگئیں۔ پھر فرشتے نے آپ کی قمیص کے گریبان پر پھونک ماری جب آپ نے وہ قمیص پہنی تو آپ حاملہ ہوگئیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبرئیل نے آپ کی قمیص کے گریبان کو اپنی انگلیوں سے کھینچا اور گریبان میں پھونک ماری۔ بعض فرماتے ہیں آپ کی قمیص کی آستین میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں آپ کے منہ میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں دور سے جبرئیل نے پھونک ماری تھی اور ہوا آپ تک پہنچی تھی اور آپ اسی وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہوگئی تھیں۔ آپ حمل کے ساتھ گھر سے دور چلی گئیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں آپ بیت المقدس کی ایک وادی میں چلی گئیں تاکہ لوگ بغیر نکاح کے حمل کی وجہ سے طعن و تشنیع نہ کریں۔ امام بغوی فرماتے ہیں آپ کی مدت حمل اور وضع حمل میں اختلاف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حمل اور ولادت دونوں ایک ہی گھڑی میں ہوئے تھے۔ بعض فرماتے ہیں دوسری عورتوں کی طرح نو ماہ حمل ٹھہرا تھا۔ بعض نے آٹھ ماہ (1) اور بعض نے چھ ماہ لکھے ہیں۔ مقاتل بن سلیمان فرماتے ہیں۔ ایک ساعت میں آپ حاملہ ہوئیں اور دوسری ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت تیار ہوگئی۔ جب اسی دن سورج زائل ہوا تو وضع حمل ہوگیا اور حضرت مریم علیہا السلام کی عمر ابھی دس سال تھی اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہونے سے پہلے دو حیض گزارے تھے۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

''پس لے آیا انہیں درد زہ ایک کھجور کے تنے کے پاس۔ لے (بصد حسرت و یاس) کہنے لگیں کاش! میں مرگئی ہوتی اس سے پہلے اور بالکل فراموش کر دی گئی ہوتی۔ ع''

لے اَجَاءَ کو ہمزہ افعال کے ذریعے متعدی کیا گیا ہے۔ یہ جاء سے مشتق ہے جس طرح اتیٰ بمعنی اعطی استعمال ہوتا ہے اس طرح اَجَاءَ مجبوراً آنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مخاض مصدر ہے جب عورت کے پیٹ میں بچہ باہر آنے کے لئے حرکت کرتا ہے تو اس وقت جو عورت کو تکلیف ہوتی ہے اسے مخاض کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں مخضت المراء ۃ جب عورت کو درد زہ شروع ہو جائے۔ مخاض کے کھجور کے تنے کی طرف لانے کی نسبت مجازی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ درد زہ کے وقت اللہ تعالیٰ اسے لے آیا یا یہ معنی کہ مخاض کے سبب وہ آئیں۔ پس مخاض آنے کا سبب تھا گویا وہ اسے لے کر آیا ہے۔ کھجور کے تنے کے پاس تاکہ اسکے ساتھ چھپ جائیں اور تکلیف کے وقت اس کو پکڑ لیں۔ جذع جڑ اور ٹہنی کو کہتے ہیں اور اس کھجور کو بھی کہتے ہیں جو سخت سردی کی وجہ سے صحراء میں خشک ہوگئی ہوا اور اس پر کوئی سبزہ نہ ہو۔

ابن ابی حاتم نے ابی روق سے روایت کیا ہے حضرت مریم علیہا السلام اس کھجور کے تنا کے پاس پہنچیں جس پر کوئی ایک پتہ بھی نہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 196 (التجاریہ)

تھا، اسے جھنجھوڑا تو اس پر پتے، خوشے اور تر کھجوریں لگ گئیں۔ النخلة پر الف لام جنس کا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے دل میں یہ الہام کیا تھا تا کہ وہ انہیں اس درخت کے پاس ایسی نشانیاں دکھائیں جس سے ان کا خوف و ہراس اور پریشانی جاتی رہے اور انہیں کھجوریں کھلائے کیونکہ یہ عورتوں کی مرغوب غذا ہیں (1)۔

2۔ آپ کو بغیر خاوند کے بچہ ہونے پر جو الزامات کا خدشہ تھا اور لوگوں کے طعن و تشنیع کا اندیشہ تھا اور معاشرہ کے سامنے شرم و حیاء کا سامنا تھا تو آپ کہنے لگیں کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی۔ یالیتنی میں منادیٰ محذوف ہے تقدیر اس طرح ہے یاایھا المخاطب لیتنی۔ شاید یہاں ان کا مخاطب نفس ہے یا جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یا تنبیہ کے لئے اور جملہ ندائیہ متمنیٰ کے استبعاد کے لئے ہے۔ مت کو ابن کثیر، ابوعمرو، ابن عامر اور ابوبکر نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ان کے نزدیک یہ مات یمات سے مشتق ہے، یعنی ماضی کا عین کلمہ مکسور اور مضارع کا عین کلمہ مفتوح ہے جیسے خاف یخاف ہے۔ باقی قراء کے نزدیک یہ مات یموت سے ہے یعنی ماضی کا عین کلمہ مفتوح اور مضارع کا عین کلمہ مضموم ہے جیسے قال، یقول ہے۔ ھذا کا مشار الیہ الامر ہے۔ نسیا کو حفص اور حمزہ نے نون کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نسیان، حفظ کی ضد ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کو یاد ہوا سے بھول جائے۔ دل کے ضعف کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے یا ارادۃً بھلا دیتا ہے تا کہ دل سے اس کا ذکر مٹ جائے۔ جس نسیان کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے وہ، وہ ہے جس میں ذاتی ارادہ شامل ہو۔ ارشاد ہے فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا۔ (بس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو۔ اسی طرح انسان جس میں معذور ہو اس میں اس کا ارادہ نہ ہو وہ قابل مذمت نہیں ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسیان۔ میری امت سے خطا اور بھول کو اٹھا لیا گیا ہے، یعنی بھولنے کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں کیا جاتا۔ کبھی کبھی نسیان کا اطلاق کسی چیز کو بطور اہانت ترک کرنے پر ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسیان کی نسبت ہو تو یہی معنی مراد ہوتا ہے جیسے ارشاد ہے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ النِّسِي (بالکسر) اس کا معنی وہ چیز جو فراموش کی گئی ہو۔ جس طرح النقض (بالکسر) کا معنی وہ چیز جو توڑی گئی ہو پھر یہ عرف عام میں اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جس کا کوئی اعتبار و شمار نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں احفظوا انساکم۔ یعنی تم اپنی ایسی چیزوں کی حفاظت کرو جنہیں عام طور پر بھلایا جاتا ہے۔ النسی بالفتح بھی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ بھی اس میں لغت ہے جیسے وِتر وَتر اَلْحِبْسُ اَلْحَبْسُ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اس کے ساتھ کسی چیز کا نام رکھا جاتا ہے یا یہ مفعول کے معنی میں ہے اور النسی سے مراد وہ چیز ہے جو بھلائی گئی ہو۔ جیسا کہ اس کا اصل معنی ہے، اسی وجہ سے اس کے بعد منسیا ذکر فرمایا تا کہ یہ وہم دور ہو جائے کہ وہ معنی مراد ہے جس کا اعتبار اور شمار کم ہو اگرچہ بالکل بھلائی نہ گئی ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں انسی جو چیز پھینکی گئی ہو، فراموش کی گئی ہو اور حقارت کی وجہ سے ذکر نہ کی گئی ہو۔ اور منسیا کا معنی وہ چیز جو چھوڑی گئی ہو (2)۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ چیز ہے جو غیر مذکور اور غیر معروف ہو۔ عکرمہ، ضحاک اور مجاہد فرماتے ہیں وہ مراد جو پھینک دیا گیا ہو، بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ کاش میں پیدا ہی نہ کی گئی ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی تکلیف اور پریشانی کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے۔ تو مریم علیہا السلام نے موت کی تمنا کیوں کی؟

جواب یہ ہے کہ شاید ان کی شریعت میں اس نہی کے وارد ہونے سے پہلے حضرت مریم نے یہ تمنا کی ہو یا بغیر ارادہ کے غلبہ حال کی وجہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 539 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریہ)

سے ایسا کہا ہو۔ یا دین میں فتنہ کے خوف سے ایسا کہا ہو کیونکہ انسان رسوائی کے وقت کبھی جھوٹ بولتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے تو آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں لوگوں کی رسوائی کی وجہ سے مجھ سے جھوٹ نہ نکل جائے اور خودکشی نہ کرلوں تو ان دونوں صورتوں میں دین کی خرابی کا خدشہ تھا۔ اس لئے موت کی تمنا کی اور دین میں فتنہ کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ تفصیل سے سورۂ بقرہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝۲۴

''پس پکارا اسے ایک فرشتہ نے اس کے نیچے سے [1] (اے مریم) غمزدہ نہ ہو [2] جاری کر دی ہے تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی [3]''

[1] ابوجعفر، نافع، حمزہ، کسائی اور حفص نے من کو میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ حروف جارہ سے ہے اور مابعد اس کا مجرور ہے اس صورت میں نادیٰ کا فاعل محذوف ہے، یعنی ایک ندا کرنے والے نے ندا دی اور وہ ندا کرنے والے جبرئیل امین تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، السدی، قتادہ، ضحاک اور ایک پوری علماء کی جماعت کا کہنا ہے کہ مریم علیہا السلام ایک ٹیلہ پر تھیں اور جبرئیل امین ٹیلہ کے پیچھے سے نیچے تھے، انہوں نے حضرت مریم کو آواز دی، جب انہوں نے سنا کہ مریم علیہا السلام بہت گھبرا گئی ہیں۔ مجاہد اور حسن کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام شکم مادر سے باہر آئے تو انہوں نے یہ آواز دی(1)۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں تو یہ جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فوضعت حملها فناداها۔ باقی قراء نے من کو میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ اسم موصول ہے یہ اپنے صلہ سے مل کر نادیٰ کا فاعل ہے، معنی یہ ہوگا کہ اس نے آپ کو ندا دی جو آپ کے نیچے تھا وہ جبرئیل تھے یا عیسیٰ علیہا السلام تھے۔ تحتها کی ضمیر کا مرجع مریم علیہا السلام ہیں۔ بعض فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع نخله ہے۔

[2] ان مفسرہ ہے جو نادیٰ کی تفسیر بیان کر رہا ہے، یعنی اس نے یہ آواز دی کہ تنہائی، کھانے اور پینے کی اشیاء کے نہ ہونے اور لوگوں کی باتوں سے غمزدہ نہ ہو۔

[3] سری سے مراد چھوٹی نہر ہے۔ طبرانی نے معجم صغیر میں حضرات براء کی مرفوع حدیث میں یہی معنی بیان کیا ہے لیکن ابواسحٰق سے مرفوع بیان نہیں کی لیکن ابوسنان سے مرفوع بیان کی ہے۔ ابن عدی نے الکامل میں ابوسفیان سے معلل روایت کی ہے۔ ابن معین، نسائی، ابن المدینی سے اس کا ضعف مروی ہے۔ بخاری نے براء سے تعلیقاً ذکر کی ہے۔ عبدالرزاق، ابن جریر اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں حضرت براء سے موقوف روایت کی ہے۔ اسی طرح حاکم نے المستدرک میں روایت کی ہے حاکم فرماتے ہیں یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ طبرانی، اور ابونعیم نے الحلیہ میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ چھوٹی نہر اللہ تعالیٰ نے نکالی تھی تا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اس سے پانی پیئے۔ اس حدیث کی سند میں ایوب بن نہیک ہیں جس کو ابوزرعہ اور ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں تحتک کا معنی تحت امرک ہے (تیرے حکم کے تحت ہے) اگر تو حکم دے گی تو یہ نہر جاری ہو جائے گی، اگر تو رکنے کا اشارہ کرے گی تو وہ رک جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جبرئیل نے پاؤں مارا۔ بعض فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے پاؤں مارا تو میٹھا چشمہ جاری ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں وہاں ایک خشک نہر تھی، اللہ تعالیٰ نے اس میں پانی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریۃ)

جاری فرما دیا تھا۔ خشک کھجور پر پتے نکل آئے تھے اور اس پر پھل لگ کر پک گیا تھا (1)۔ بعض فرماتے ہیں السری کا معنی سردار ہے اور یہ سرو سے مشتق ہے اور مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ الحسن فرماتے ہیں قسم بخدا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بلند عظمت اور بلند مقام بندے تھے (2)۔

وَهُزِّيٓ إِلَيۡكِ بِجِذۡعِ ٱلنَّخۡلَةِ تُسَٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبٗا جَنِيّٗا ﴿٢٥﴾

"اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں۔ ۱؎"

۱؎ جذع سے پہلے باء تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں عرب کہتے ہیں ہزہ وہزبہ (3)۔ تساقط کو جمہور قراء نے تاء اور قاف کے فتحہ اور سین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے سین کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ باب تفاعل سے مضارع کا صیغہ ہے، اصل میں تیساقط تھا۔ حمزہ تاء کو حذف کر دیتے ہیں اور دوسرے قراء تاء کو سین میں ادغام کر دیتے ہیں۔ حفص نے تاء کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ باب مفاعلہ سے پڑھا ہے اس کا معنی گرانا ہے اور مونث کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ضمیر نخلہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعقوب نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر جذع کی طرف لوٹ رہی ہے۔ رطبا تمیز ہے تساقط کی ضمیر سے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق اور حفص اور یعقوب کی قرأت کے مطابق مفعول بہ ہے۔ جنیاً جو اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہو اور اسکے چننے کا وقت آ گیا ہو۔ ربیع بن خیثم فرماتے ہیں نفاس والی عورت کے لئے میرے نزدیک تر کھجور سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں اور مریض کے لئے شہد سے بہتر کوئی چیز نہیں (4)۔

فَكُلِي وَٱشۡرَبِي وَقَرِّي عَيۡنٗاۖ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ ٱلۡبَشَرِ أَحَدٗا فَقُولِيٓ إِنِّي نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمَٰنِ صَوۡمٗا فَلَنۡ أُكَلِّمَ ٱلۡيَوۡمَ إِنسِيّٗا ﴿٢٦﴾

"(میٹھے میٹھے خرمے) کھاؤ اور (ٹھنڈا پانی) پیو ۱؎ اور (اپنے فرزند دلبند کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم دیکھو کسی آدمی کو تو (اشارہ سے اسے) کہو کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے رحمٰن کے لئے (خاموشی کے) روزہ کی پس میں آج کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی۔ ۲؎"

۱؎ عیناً۔ قری کی نسبت سے تمیز ہے۔ قری، قرار سے مشتق ہے کیونکہ آنکھ جب خوش کن منظر دیکھتی ہے تو وہ اس منظر کو ہی دیکھتی رہ جاتی ہے، کسی دوسری چیز کی طرف منتقل نہیں ہوتی بلکہ اسی منظر پر قرار پذیر رہتی ہے۔ عرب کہتے ہیں قر اللہ عینک یعنی اللہ تعالیٰ تجھے خوش کن اور دل پسند چیز دکھائے اور تیری نظر کو اس منظر پر ٹھہرا دے تاکہ تیری نظر ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ اقر اللہ عیناک۔ اللہ تجھے سلا دے۔ اقر یقر استعمال ہوتا ہے جب کوئی سکون پذیر ہو جائے۔ یا یہ القر سے مشتق ہے جسکا معنی ٹھنڈک ہے کیونکہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے محبوب کو قرۃ العین اور ناپسند چیز کو سخنۃ العین کہتے ہیں۔

۲؎ اما اصل میں ان ما ہے، ما زائدہ ہے جو ان شرطیہ میں مدغم کیا گیا ہے۔ ترین کے آخر میں نون تاکید ہے، یعنی اے مریم اگر کوئی شخص تجھے نظر آئے اور تجھ سے اس ننھے بچے کے متعلق پوچھے تو تم صرف اتنا کہنا کہ میں نے اپنے رب رحمٰن کی خاطر خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ ابن مسعود نے یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ السدی فرماتے ہیں بنی اسرائیل میں جو مجاہدہ کرتا وہ جس طرح کھانے، پینے کا روزہ رکھتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اسی طرح شام تک بات کرنے کا بھی روزہ رکھتا(1)۔بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بات اشارہ سے کہنے کو کہا تھا کیونکہ بات جھگڑے کا باعث بنتی اور عیسیٰ علیہ السلام کی کلام پر اکتفا کا حکم فرمایا تھا کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن میں کلام کرنا سب طعن وتشنیع کی زبانوں کو بند کرتا تھا۔بعض فرماتے ہیں اتنی مقدار آپ کو بات کرنے کی اجازت تھی۔اس کے بعد کلام سے رک جانے کا حکم تھا۔کہا جاتا ہے کہ آپ ملائکہ سے کلام فرماتی تھیں،انسانوں سے کلام نہیں کرتی تھیں۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ﴿۲۷﴾

''اس کے بعد وہ لے آئیں بچہ کو اپنی قوم کے پاس (گود میں) اٹھائے ہوئے انہوں نے کہا اے مریم تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔ [1]''

[1] بہ میں ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کے ہاں جب بچہ کی ولادت ہوئی تو آپ فوراً اسے اٹھا کر قوم کے پاس لے آئیں۔کلبی نے لکھا ہے کہ حضرت مریم اور آپ کے بچہ کو یوسف النجار ایک غار میں اٹھا کر لے آئے۔آپ وہاں چالیس دن رہیں حتیٰ کہ نفاس سے پاک ہوگئیں۔پھر حضرت مریم اپنا معصوم بچہ اٹھائے اپنی قوم کے پاس آئیں،راستہ میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ سے کلام کی تھی۔کہا اے امی جان مبارک ہو میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا مسیح ہوں۔جب آپ گھر آئیں اور ساتھ بچہ بھی تھا چونکہ گھر والے سب نیکوکار لوگ تھے(2) آپ کو ایسی حالت میں دیکھ کر رونے لگے اور پریشان ہوگئے اور کہا اے مریم تو نے بہت برا کام کیا ہے' لقد جئت الخ محذوف قسم کا جواب ہے۔فریاً۔ناپسندیدہ کام،یہ فری الجلد سے مشتق ہے اور اس کا معنی الشق ہے' اس معنی میں حضرت حسان کا قول ہے لا فرینهم فری الادیم۔میں ہجو کر کے انہیں چمڑے کے کاٹنے کی طرح کاٹ دوں گا۔قرآن کریم میں اکثر جھوٹ' شرک اور ظلم کے لئے استعمال ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا۔اسی طرح ارشاد ہے۔وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا (اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے گناہ عظیم کا) چونکہ شرک اور معاصی انسان کی عصمت اور صلاح کی چادر کو تار تار کر دیتے ہیں،اس لئے شرک اور معصیت کو افتریٰ کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

بعض علماء نے اس کا معنی برا اور عجیب کیا ہے،یعنی ایسا کام جس نے عادت کو کاٹ دیا ہے اور اس میں شگاف کر دیا ہے۔ابو عبیدہ فرماتے ہیں ہر برے امر کے لئے خواہ وہ قول ہو یا عمل اس کے لئے فری استعمال ہوتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا میں نے حضرت عمر جیسا عبقری اور تعجب انگیز کام کرنے والا شخص نہیں دیکھا(3)۔

یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ﴿۲۸﴾ۚ

''اے ہارون کی بہن [1] نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدچلن تھی [2]''

[1] ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ ہارون سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون نبی ہیں کیونکہ آپ ان کی نسل سے تھیں جس طرح تمیمی شخص کو اخو تمیم کہا جاتا ہے(4)۔بعض فرماتے ہیں آپ ان لوگوں کی نسل سے تھیں جو ہارون نبی کے ساتھ بھائیوں کا رشتہ رکھتے تھے۔ابن ابی حاتم نے علی بن طلحہ سے یہی قول روایت کیا ہے۔کلبی فرماتے ہارون حضرت مریم کے علاتی بھائی تھے۔بنی اسرائیل کے

1۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 198 (التجاریۃ) 2۔ایضاً 3۔ایضاً 4۔ایضاً

ایک نیک صالح مرد تھے(1)۔بغوی نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ جب میں نجران گیا تو وہاں کے عیسائیوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم قرآن میں پڑھتے ہو یاخت ھارون۔حالانکہ وہ آپ سے صدیاں پہلے گزر چکے ہیں۔فرماتے ہیں (میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا) لیکن جب میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لوٹ کر آیا تو میں نے یہی سوال آپ ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کا معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام اور پہلے بزرگوں کے ناموں پر رکھتے تھے(2)۔اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔امام بغوی لکھتے ہیں کہ قتادہ وغیرہ نے فرمایا ہارون بنی اسرائیل میں ایک نیک عابد شب بیدار تھا۔روایت ہے کہ جب یہ ہارون فوت ہوئے تو ان کے جنازہ میں دوسرے لوگوں کے علاوہ چالیس ہزار ایسے افراد تھے جن کے نام ہارون تھے۔ لوگوں نے حضرت مریم کو ان سے تشبیہ دی کہ تو تو ہارون کی طرح نیک سیرت اور بلند کردار تھی۔نسبی بھائی مراد نہیں ہیں جیسا کہ قرآن نے فضول خرچی کرنے والوں کو شیطانوں کا بھائی کہا ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں)(3) اسی طرح عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ ممکن ہے انہوں نے استہزاءً اور مزاقاً حضرت مریم کو حضرت ہارون سے تشبیہ دی ہو یا اس لئے تشبیہ دی ہو کہ پہلے انہوں نے حضرت مریم کی نیکی اور پاک سیرت کو دیکھا تھا بعض علماء فرماتے ہیں ہارون بنی اسرائیل کا فاسق و فاجر شخص تھا۔انہوں نے فسق کی وجہ سے اس کے ساتھ تشبیہ دی۔ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

۲۔ حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا اور والدہ کا نام حنہ تھا۔بغیا کا معنی زانیہ اور بدکارہ ہے۔اس جملہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ ان سے یہ کام انتہائی قبیح ہے کیونکہ نیک لوگوں کی اولاد سے برا کام زیادہ برا اور عجیب سمجھا جاتا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ﴿۲۹﴾

''اس پر مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا لوگ کہنے لگے ہم کیسے بات کریں لے اس سے جو گہوارہ میں (کم سن) بچہ ہے۔ ۲ ''

لے حضرت مریم نے اشارہ فرمایا کہ اس بچہ سے بات کرو۔حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں جب حضرت مریم کے پاس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا تو آپ نے اشارہ کیا تاکہ اس کا کلام آپ کی پاکدامنی کی حجت بن جائے۔آپ کے واقعہ میں ہے جب آپ نے بچہ کی طرف اشارہ کیا تو قوم کو غصہ آ گیا اور کہنے لگے تو نے بہت برا کیا ہے تو ہم سے مزاح کرتی ہے(4)۔

۲ کان زائدہ ہے جیسا کہ اس ارشاد میں زائدہ ہے هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا اور من کا صلہ فی المهد صبیا ہے۔فی المهد ظرف مستقر ہے اور صبیا ظرف کی ضمیر سے حال ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کان تامہ ہو یا دوام کے لئے ہو جیسا کہ کان اللہ علیما حکیما میں ہے یا بمعنی صار ہو۔یہاں مہد سے مراد ماں کی گود ہے۔بعض فرماتے ہیں مہد سے مراد واقعی مہد (پنگھوڑا) ہے۔ان کا مقصود یہ تھا کہ ہم نے تو کوئی عقلمند شخص ایسا نہیں دیکھا جو ناسمجھ اور کلام سے عاجز بچہ سے گفتگو کرے۔سدی کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی کلام سنی تو آپ نے دودھ پینا چھوڑ دیا اور لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب حضرت مریم نے اشارہ فرمایا تو آپ نے پستان چھوڑ دیا، بائیں طرف پر سہارا لیا اور ان کی طرف متوجہ ہوئے اور دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا(5)۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (التجاریہ) 2۔ایضاً 3۔ایضاً 4۔تفسیر خازن، ایضاً 5۔تفسیر بغوی، ایضاً

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾

''(اچانک) وہ بچہ بول پڑا لہ کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ ۲؎ ''

لہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کی اسم جلالت (اللہ) کی طرف اضافت کر کے اشارہ فرمایا کہ میں اللہ کا عبد مکرم ہوں۔ چونکہ قوم منکر تھی اس لئے تاکید کے ساتھ آپ نے کلام کو ذکر فرمایا۔ وہب فرماتے ہیں جب بنی اسرائیل حضرت مریم سے مجادلہ اور مناظرہ کر رہے تھے تو زکریا علیہ السلام تشریف لے آئے۔ آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا اگر تجھے حکم دیا گیا ہے تو اپنی دلیل پیش کرو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت یہ ارشاد سنایا۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس دن تھی(1)۔ مقاتل فرماتے ہیں پیدائش کے دن ہی آپ نے انی عبداللہ فرمایا تھا۔ آپ نے اپنی عبودیت کا اقرار کیا تھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور آپ نے سب سے پہلے یہی کلام فرمائی تا کہ لوگ مجھے الہ (خدا) نہ بنالیں(2)۔

۲؎ اتانی کو حمزہ نے یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الکتاب سے مراد تورات ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ اللہ نے تورات آپ کو الہام فرمائی تھی(3)۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ کتاب سے انجیل مراد ہے اور آپ کو صغرسنی میں انجیل دی گئی تھی لیکن آپ اس وقت زیرک لوگوں جیسی عقل رکھتے تھے۔ بعض نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کتاب (انجیل) عطا فرمائے گا اور مجھے نبی بنائے گا۔ اور ماضی کے الفاظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ ان امور کا وقوع یقینی تھا اور تحقق تھا اور جس کا وقوع یقینی ہو وہ واقع کی طرح ہوتا ہے (یعنی گویا وہ ہو چکا ہے) بعض فرماتے ہیں یہ آپ نے وہ بات بتائی جو آپ کے بارے لوح محفوظ میں لکھی تھی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا متی کنت نبیاً۔ آپ کب سے نبی ہیں، فرمایا میں اس وقت سے نبی ہوں جبکہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔ اس حدیث کو ابن سعد، ابونعیم نے الحلیہ میں میسرہ الفجر بن سعد عن ابی الجدعاء کے سلسلہ سے روایت کیا ہے اور طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾

''اور اسی نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں لہ اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا ۲؎ جب تک میں زندہ رہوں ۳؎ ''

لہ برکۃ کا معنی نیکی اور خیر کو ثابت کرنا ہے اور یہ بورک البعیر سے مشتق ہے جس کا معنی اونٹ کا بیٹھنا ہے یا برکۃ بمعنی عطاء میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَللّٰھُمَّ بَارِکْ فِیْ عَطَاءِ کَ۔ اے اللہ اپنی عطا اور بخشش میں اضافہ فرما۔ یا بمعنی عظمت اور کرم ہے۔ کہا جاتا ہے یہ فلاں کی برکت کی وجہ سے ہے۔ بعض نے مبارکا کا معنی یہاں نفاعاً (بہت زیادہ نفع دینے والا) کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی معلم خیر ہے، یعنی بھلائی کی تعلیم دینے والا۔ عطاء فرماتے ہیں اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دینے والا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے پیروکاروں کے لئے باعث برکت بنایا ہے(4)۔ جہاں بھی میں ہوں خواہ زمین میں خواہ آسمان میں۔ خواہ کسی طرف بھی متوجہ ہوں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آپ

1۔ تفسیر ... صفحہ 198 (التجارية) 2۔ ایضاً صفحہ 199 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

آسمان والوں کے لئے بھی نفع رساں ہیں کیونکہ فرشتے بھی آپ سے مستفید ہوتے ہیں۔
۲۔ اس نے مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کر کے مال کو اور نفس کو ہر قسم کے رذائل سے پاک کرنے کا حکم دیا ہے۔
امام بغوی فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تو مال تھا ہی نہیں انہیں کیسے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے مجھے اس نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے اگر میرے پاس مال ہو۔ بعض فرماتے ہیں خیر کی کثرت طلب کرنے کے لئے یہ حکم دیا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ میں تجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دوں گا (1)۔
۳۔ مادمت حیا۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی ظرف ہے یعنی اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی زندگی میں نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾

''اور مجھے خدمت گذار بنایا ہے اپنی والدہ کا اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بدبخت ۱۔''

۱۔ براً کا عطف مبارکاً پر ہے۔ یا اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر اوصانی کا فعل دلالت کر رہا ہے یعنی کلفنی براً۔ اس صورت میں براً مصدر ہوگا۔ جباراً کا معنی متکبر اور سرکش ہے۔ شقیاً اپنے رب کا نافرمان۔ بعض فرماتے ہیں شقی وہ ہوتا ہے جو گناہ کرے لیکن توبہ نہ کرے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

''اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے اٹھایا جائے گا زندہ کر کے ۱۔''

۱۔ والسلام علی حقیقت میں جملہ فعلیہ ہے، اسی وجہ سے اس کا عطف جملہ فعلیہ پر کیا گیا ہے اور صورۃً جملہ اسمیہ اس لئے بنایا تاکہ استمرار اور ثبوت پر دلالت کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تینوں مختلف حالات میں سلامتی کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ پیدائش کے وقت شیطان کے کچوکے سے، موت کے وقت عذاب قبر سے اور حشر کے روز قیامت کی ہولنا کیوں اور دوزخ کے عذاب سے۔ السلام پر الف لام عہدی ہے، جنس کا ہے۔ اس کلام میں آپ کے دشمنوں پر لعنت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب سلامتی جنس کو اپنے لئے اور اپنے متبعین کے لئے بنایا تو اشارہ ہے کہ جو آپ کے مخالف ہے اس کا حکم بھی مخالف ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (سلامتی ہو ان پر جو ہدایت کے پیروکار ہیں) یہ کلام اشارہ ہے کہ جو ہدایت کو جھٹلاتا ہے اور پیٹھ پھیرتا ہے اس پر عذاب ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے مؤثر اور بلیغ کلام فرمائی تو انہیں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی اور عصمت کا یقین ہو گیا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام خاموش ہو گئے اور اس عمر تک پہنچنے سے پہلے کلام نہ فرمائی جس میں عام طور پر بچے بولنا شروع کرتے ہیں۔ (2)

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾

''یہ ہے عیسیٰ بن مریم ۱ (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں ۲۔''

۱۔ ذالک کا مشار الیہ سابقہ کلام ہے جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی عبودیت وغیرہ کا اظہار فرمایا۔ ذالک مبتدا اور عیسیٰ خبر ہے، ابن مریم نعت یا دوسری خبر ہے، یعنی اس طرح حقیقت نہیں ہے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ آپ خدا ہیں، یہ ان کا من گھڑت خیال ہے۔ اس جملہ میں نصرانیوں کے عقیدہ کی بڑے بلیغ اور موثر انداز میں تردید و تکذیب کی جا رہی ہے اور طریق برہانی سے ان کا رد کیا گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 199 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

ہے۔اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی صفت سے موصوف فرمایا جو ان کے عقیدہ کی ضد ہے پھر حکم کا عکس بیان فرمایا (یعنی انہوں نے حکم لگایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ ہے یا اللہ کا بیٹا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ (یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے) یہ ارشاد اللہ کے بیٹے ہونے کی صراحۃً نفی ہے۔یعنی یہ صحیح ہی نہیں بلکہ محال ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے)

۲ ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے قول الحق کو مصدر مؤکد کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے تقدیر اس طرح ہے اقول قول الحق یا مدح کی بناء پر منصوب ہے، باقی قراء نے مبتداء محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہوگی۔ الکلام السابق قول الحق لا ریب فیه۔سابق کلام سچی کلام ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔قول کی حق کی طرف اضافت بیانیہ ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں قول الحق یا تو عیسیٰ کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے یا اس کی خبر ثانی ہے۔اس کا معنی کلمۃ الحق ہے۔ یمترون کا معنی شک کرنا اور جھگڑا کرنا ہے۔یہودی کہتے آپ جادوگر اور کذاب ہیں جبکہ نصاریٰ کہتے کہ آپ (نعوذ باللہ) اللہ کے بیٹے ہیں یا خود اللہ ہیں۔آئندہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بیٹا ہونے کی نفی فرما دی۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ﴿۳۵﴾

''یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔وہ پاک ہے جب وہ فیصلہ فرما دیتا ہے کسی کام کا تو بس صرف اتنا حکم دیتا ہے اس کے لئے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ ۱ ''

۱ ولد سے پہلے مِن نفی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔سبحانہ مصدر ہے جو فعل کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔اصل میں یہ اسبحہ سبحانا تھا۔یہ جملہ معترضہ ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی کو بیٹا بنانے سے پاک ہونے پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ وہ قادر مطلق ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کن فرماتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی اس کے حکم اور اس کے پیدا کرنے کے ارادہ سے ہے۔جو ذات ایسی عظیم قدرتوں کی مالک ہو وہ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہوتی ہے۔ عورتوں کے حمل کے ذریعے بچہ پیدا کرنے کی اسے حاجت نہیں ہوتی اور وہ علوق کے ذریعے اجزاء بنانے کی بھی محتاج نہیں ہوتی۔جملہ شرطیہ۔کسی کو بیٹا بنانے کی نفی کے لئے بطور تعلیل ہے۔ابن عامر نے فیکون کو امر کے جواب کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۶﴾

''اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی سو اسی کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ ۱ ''

۱ کوفیوں ابن عامر اور یعقوب نے ان کو الف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اس بناء پر کہ یہ مستقل جملہ ہے اور اس کا عطف انی عبداللہ پر ہے۔اہل حجاز اور ابو عمرو نے الصلوٰۃ والزکوٰۃ پر عطف کی بناء پر الف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔یعنی اوصانی بان اللہ ربی یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ثابت ان اللہ ربی و ربکم۔اور جملہ انی عبداللہ پر معطوف ہو کر قول کا مقولہ ہے۔اس آیت میں توحید کے اعتقاد کے ساتھ قوت نظریہ کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے اور فاعبدوہ میں مامورات کے ادا کرنے اور منہیات سے رکنے کے ساتھ قوت عملیہ کی تکمیل مطلوب ہے۔فاء سببیہ ہے اور ھذا صراط مستقیم۔ فاعبدوہ کی تعلیل ہے اور ما سبق کی تاکید ہے۔ صراط مستقیم سے مراد وہ راستہ ہے جس کے خیر ہونے کا ارشاد ۔۔۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۳۷﴾

''پھر کئی گروہ آپس میں اختلاف کرنے لگے ۱؎ پس ہلاکت ہے کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے جو بہت بڑا ہے۔ ۲؎''

۱؎ احزاب سے مراد یہود ونصاریٰ یا نصرانیوں کے مختلف گروہ ہیں۔ نصرانیوں کے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تین گروہ تھے۔ نسطوریہ کہتے آپ اللہ کے بیٹے ہیں، یعقوبیہ کہتے خدا عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں زمین پر اترا تھا پھر آسمان پر واپس لوٹ گیا۔ عیسائیوں کا ایک گروہ ملکائیہ تھا جو کہتے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول تھے۔ فاختلف کا عطف قال عیسی پر ہے۔ من بینهم میں مِن زائدہ ہے اور ظرف اختلف کے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کے اصحاب کے درمیان یا آپ کی قوم کے درمیان یا لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔

۲؎ فویل میں فاء سببیہ ہے۔ ویل اصل میں مصدر منصوب ہے جس کا معنی هلكوا هلاكاً ہے پھر جملہ فعلیہ سے اسے جملہ اسمیہ کی طرف منتقل کیا گیا اور ابتداء کی بناء پر اسے رفع دیا گیا تا کہ استمرار پر دلالت کرے۔ جیسے سلام علیکم ہے۔ الذین کفروا اصل میں مصدر کے متعلق تھا۔ پھر اسے مبتدا کی خبر کے طور پر ظرف مستقر بنایا گیا۔ من مشهد یوم عظیم 'ویل کے متعلق ہے یعنی کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے ہلاکت ہے جس کی ہولناکی جس میں حساب و جزاء کا سلسلہ بڑا عظیم ہوگا۔ مراد قیامت کا دن ہے یا مشہد کا معنی وقت الشہود ہے یا مکان الشہود ہے، یعنی حاضری کے وقت یا حاضری کی جگہ کی وجہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے یا یہ معنی کہ اس دن کی ان کے خلاف گواہی کی وجہ سے ان کے لئے ہلاکت ہے۔ فرشتے' انبیاء کرام اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم۔ ان کی زبانیں' ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے کفر وفسق کی گواہی دیں گے۔ یا من وقت الشهادة علیهم او من مکانها مراد ہے یعنی ان کے خلاف شھادت کے وقت یا شہادت کی جگہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی کہ جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گواہی دی اس کی وجہ سے انکے لئے ہلاکت ہے۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾

''(اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس ۱؎ لیکن یہ ظالم آج تو کھلی گمراہی میں ہیں۔ ۲؎''

۱؎ اس آیت میں یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اسمع و ابصر تعجب کے صیغے ہیں، اللہ تعالیٰ تعجب کرنے سے پاک ہے۔ اس لئے جمہور فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے روز انکے کان اور ان کی آنکھیں' حق کو غور سے سننے اور دیکھنے کی وجہ سے قابل تعجب ہوں گی لیکن دنیا میں گونگا اور بہرہ بنے رہنے کے بعد آج ان کا سننا اور دیکھنا کچھ نفع بخش نہیں' دنیا میں حق کو سنتے اور حق کا مشاہدہ کرتے تو تب نفع بخش تھا۔ یا یہ دھمکی اور تہدید ہے کہ یہ لوگ قیامت کے روز ان ہماری دھمکیوں اور تہدید کو کانوں سے سنیں گے اور آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے، جبکہ دنیا میں انہوں نے ہمارے ڈرانے اور خوف دلانے کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ بهم۔ جار مجرور صیغہ تعجب کے فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسمع و ابصر امر کے صیغے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم فرمایا ہے کہ ان عقل کے اندھوں کو اس عظیم دن کی ہولناکیوں کے بارے میں سناؤ اور دکھاؤ۔ اس تاویل پر جار مجرور محل نصب میں ہوں گے۔

۳؎ الیوم سے مراد دنیا ہے اور یہ ظرف' اس فعل یا شبہ فعل کے متعلق ہے جس کے متعلق فی ضلل مبین ہے۔ ضمیر کی جگہ یہاں الظالمون استعمال فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پتہ چل جائے کہ وہ ظالم تھے کیونکہ انہوں نے اس وقت اپنے کانوں اور آنکھوں کو استعمال ہی نہ کیا، جبکہ ان کے لئے سننا اور دیکھنا مفید تھا' اس وقت ان کی عقل پر پردے پڑے رہے۔ اسی گمراہی کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کی غفلت والا پرواہی پر مہر لگادی۔

وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ اِذۡ قُضِىَ الۡاَمۡرُ‌ۘ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ وَّهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۳۹

''اور اے نبی کریم آپ ڈرایئے انہیں حسرت وندامت کے دن سے جب ہر بات کا فیصلہ کردیا جائے گا ۱؎ اور آج یہ لوگ غفلت میں ہیں اور یہ ایمان نہیں لاتے۔ ۲؎''

۱؎ یوم الحسرۃ۔ انذر کا مفعول ثانی ہے۔ انذرھم کا جملہ یا تو معترضہ ہے یا فاختلف پر معطوف ہے قلنا کی تقدیر کے ساتھ۔ اذ قضی الامر' یا تو الیوم سے بدل ہے یا حسرۃ کی ظرف ہے۔ یعنی جب حساب سے فراغت ہو جائے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل کردیئے جائیں گے اور موت کو ذبح کردیا جائے گا۔

حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت کو چتکبرے مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا اور ایک منادی کرنے والا ندا دے گا اے جنتیو! پس وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور دیکھیں گے وہ پوچھے گا کیا تم اسے جانتے ہو وہ کہیں گے یہ موت ہے۔ وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے پھر اسے ذبح کیا جائے گا پھر منادی کرنے والا کہے گا اے اہل جنت اب تم نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اب کوئی موت نہیں آئے گی۔ اے دوزخیو! تم نے دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے، تمہیں بھی موت نہیں آئے گی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی وانذرھم یوم الحسرۃ اذ قضی الامر الآیہ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے (1)۔ شیخین نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور شیخین نے موت کا ذبح کرنا ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ لیکن اس حدیث میں آیت کا پڑھنا نہیں ہے۔ اسی طرح ابویعلیٰ' بزار' اور طبرانی نے الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کی ہے۔ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے لیکن اس میں بھی قراءت آیت کا ذکر نہیں ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں قیامت کے دن کو یوم الحسرت اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ مجرم اپنے جرم پر اور نیکوکار اپنی نیکیوں کی قلت پر حسرت کریں گے (2)۔

طبرانی اور ابویعلی نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کو کوئی حسرت وندامت نہ ہو گی لیکن اس وقت پر وہ حسرت کریں گے جو اللہ کے ذکر کے بغیر گزرا ہو گا۔

امام بغوی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی مرتا ہے وہ حسرت کرتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا ندامت کس پر ہوگی، فرمایا اگر نیکوکار ہو گا تو یہ حسرت کرے گا کہ زیادہ نیکیاں نہ کرسکا۔ اگر مجرم ہوگا تو یہ حسرت کرے گا کہ وہ برائی سے کیوں نہ بچا (3)۔

۲؎ ابھی وہ اپنی گمراہی سے غافل ہیں اور اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ آخرت میں ان سے کیسا سلوک ہوگا، اب تو وہ مخبر صادق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 200 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 552 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، ایضاً

ﷺ کی بات پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ دونوں جملے فی ضلال مبین جس فعل یا شبہ فعل کے متعلق ہیں اس کی ضمیر سے حال ہیں اور درمیان میں کلام معترض ہے یا یہ دونوں جملے انذرھم کی ضمیر منصوب سے حال ہیں، یعنی ان کو ڈرایئے درآں حالیکہ یہ غافل ہیں اور تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ پس یہ حال ہے جو تعلیل کو متضمن ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾

''یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے [۱] اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔ [۲]''

[۱] یعنی یہ زمین اور اس پر رہنے والی مخلوق سب فناء ہو جائیں گے اور صرف رب تعالیٰ کی ذات تنہا باقی رہے گی۔ جس طرح مورث کی موت کے بعد وارث باقی رہتا ہے۔ مَن کا کلمہ عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے استعمال فرمایا۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ زمین پر اور زمین والوں پر سلطنت کرنے والوں کو ہلاک کر کے ہر شخص کی مالکیت کو ختم کردے گا اور بادشاہی صرف اللہ وحدہ کے لئے ہوگی۔

[۲] قیامت کے دن اٹھنے کے بعد انہوں نے ہماری طرف لوٹنا ہے اور ہم انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دیں گے۔ یہ جملہ محلاً مرفوع ہے کیونکہ یہ نرث پر معطوف ہو کر انا کی خبر ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾

''اور ذکر کیجئے آپ کتاب میں [۱] ابراہیم علیہ السلام کا وہ بڑا راست باز نبی تھا [۲]''

[۱] صدیقاً کا معنی بعض علماء نے کثیر الصدق کیا ہے، یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ بعض نے فرمایا جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ بعض فرماتے ہیں صدیقاً سے مراد وہ شخص ہے جو صدق کا عادی ہونے کی وجہ سے کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو قول اور اعتقاد میں سچا اور اپنے فعل سے اس نے اپنے صدق کو ثابت کیا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی غیب چیزوں میں تصدیق کرنے والا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت' اس کی صفات' اس کے انبیاء اور رسل' قیام قیامت وغیرہ اور جو ان امور کو بحسن وخوبی سرانجام دیتا ہو جن کا اس کو حکم دیا گیا ہے اور ان چیزوں کو قبیح جانتا ہو جن سے منع کیا گیا ہے اور اپنی تصدیق کو اپنے فعل سے ثابت بھی کرنیوالا ہو۔ پس وہ اوامر کو بجالانے اور مناہی سے اجتناب کرنے پر کمربستہ ہو۔ میں کہتا ہوں کثرت تصدیق سے متعلقات کے اعتبار سے کثرت تصدیق مراد نہیں جیسے بغوی کی ظاہر عبارت دلالت کرتی ہے کیونکہ جو کچھ نبی کریم ﷺ لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق تو ہر مومن کے دل میں پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جو کسی ایک چیز کی بھی تصدیق نہیں کرتا وہ کافر ہے اور تمام امور شرعیہ پر عمل کرنا اور منہیات سے اجتناب کرنا صالحین اور نیکوکاروں کا حصہ ہے اور ہر نیک صالح شخص بھی صدیق نہیں ہوتا بلکہ کثرت تصدیق سے مراد تصدیق کی قوت اور شدت ہے۔ یہ چیز نبی کے ذریعے اصالۃً یا وراثۃً ملتی ہے، یعنی انبیاء کرام کی ظاہراً اور باطناً مکمل اتباع کرنے اور کمالات نبوت اس استغراق اور ان خالص تجلیات ذاتیہ کی وجہ سے میسر آتی ہے جو بلاحجاب اس امتی پر اتباع وپیروی کیوجہ سے اس پر منعکس ہوتی ہیں۔ (واللہ اعلم) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے چار اقسام کا ذکر فرمایا جن پر اس کا انعام ہے' اور وہ انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں اور دوسرے مومنین کو ان لوگوں کی معیت کی بشارت دی ہے۔ پس صدیقین' شہداء اور صالحین کے درجہ سے بلند ہیں۔ ہم نے سورۃ نساء کی آیت کریمہ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ کے تحت تفصیل سے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے۔ صدیقین

وہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ اس کی تفسیر سورۂ واقعہ میں ذکر کی ہے۔ انبیاء کرام کے بعد سب سے بڑے صدیق رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں۔ خصوصاً جوان میں سے جلیل القدر اور رفیع منصب ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں صدیق اکبر ہوں جو میرے بعد صدیق اکبر ہونے کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہوگا، میرے بعد سے مراد بعد رتبی ہے بعد زمانی نہیں ہے۔ سب صحابہ سے بڑے صدیق ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں صدیق فرمایا اور اسی پر علماء امت کا اجماع ہے۔

۲۔ نبیؐ نبوة سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی بلند جگہ ہے۔ نبی رتبہ میں بلند ہوتا ہے کیونکہ اللہ نے اسے مخلوق کی راہنمائی کیلئے بھیجا ہوتا ہے یا یہ النباء سے مشتق ہے جس کا معنی خبر ہے یعنی اللہ کی طرف سے خبر دینے والا یا اللہ کی طرف سے خبر دیا گیا۔ (مہموز اور ناقص اصل میں اختلاف کی بناء پر دونوں معانی ہو سکتے ہیں)

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْــًٔا ۝۴۲

"جب انہوں نے کہا اپنے باپ سے کہ ا۔ اے میرے باپ تو کیوں عبادت کرتا ہے اس کی جو نہ کچھ سنتا ہے اور نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ تجھے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔۲۔"

ا۔ ابیہ سے مراد آذر ہے۔ سورۂ انعام میں اسکی تحقیق گزر چکی ہے۔ مہربانی اور شفقت طلب کرنے کیلئے یابت فرمایا ہے اے میرے باپ (حالانکہ وہ چچا تھا باپ نہیں تھا۔ یسمع اور یبصر دونوں کے مفعول بالکل معدوم و منسی ہیں، یعنی ان کے پاس سننے کے لئے نہ کان ہیں نہ دیکھنے کیلئے آنکھیں ہیں (یہ تو تراشے ہوئے پتھر کے بت ہیں) یہ معنی بھی ہو سکتا ہے نہ یہ کچھ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں تو پھر یہ مورتیاں کیسے تمہارے حال سے باخبر ہیں، کیسے تمہارے ذکر کو سنتے ہیں اور تمہاری اس عجز و نیاز کو کیسے دیکھتے ہیں۔

۲۔ تمہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہاری مصیبت کو دور کر سکتے ہیں۔ شیئاً مصدریت کی بناء پر منصوب ہے یا یہ معنی کہ تکلیف میں سے کچھ دور نہیں کر سکتے اس صورت میں مفعولیت کی بناء پر منصوب ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے سامنے اس کی گمراہی کا تذکرہ کر رہے ہیں لیکن بڑے ادب و احترام سے۔ وہ انہیں ہدایت کی طرف بلا رہے ہیں اور ادب و احترام کا دامن تھامے ہوئے ان کی گمراہی پر ایک بڑی واضح اور کھلی دلیل پیش کر رہے ہیں۔ اسکی گمراہی کا کھلے اور صریح الفاظ میں تذکرہ نہیں کرتے بلکہ صرف پوچھتے ہیں کہ جناب کونسی ایسی چیز ہے جو تمہیں ان بتوں کی عبادت پر مجبور کرتی ہے، یہ تراشے ہوئے ڈھانچے تو اس قابل بھی نہیں کہ کوئی دانشور اور عقلمند ان کے سامنے اپنی مقدس پیشانی رگڑے۔ عقلمند تو ہمیشہ کسی عام فعل کو بھی کسی صحیح غرض کے لئے ادا کرتا ہے۔ جبکہ عبادت جسکا مفہوم حد درجہ کی تعظیم ہے اس کا مستحق صرف اور صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو ہر چیز سے مستغنی اور بے نیاز ہو، جو نیکی پر انعام اور جرم پر سزا دینے پر قادر ہو، کسی کو نفع پہنچانے یا کسی کی تکلیف دور کرنے پر قدرت تامہ رکھتی ہو تا کہ اس سے اپنا دفاع طلب کیا جا سکے۔ عبادت کے لائق وہ ذات ہو سکتی ہے جو پیدا کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے، مارنے، سزا دینے اور ثواب دینے جیسی صفات سے متصف ہو لیکن جو اپنے وجود میں دوسروں کا محتاج ہو، دوسری مخلوق کی طرح ممکن ہو اگر چہ سننے اور دیکھنے، انعام دینے، تکلیف پہنچانے پر قادر بھی ہو بلکہ تمام مخلوق سے افضل بھی ہوں جیسا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ ہیں، عقل سلیم تو انکی عبادت کو بھی عار سمجھتی ہے اور غیر کی عبادت کرنا تو ایسے ہے جیسے جو پہلے ہی دست طلب خود پھیلائے ہوئے ہو، اس سے کوئی دوسرا سوال کرے جو خود فقیر اور محتاج ہے اس

سے وہ اپنی حاجت طلب کرتا ہے۔ جب ذی روح اور اشرف المخلوق کی عبادت کی یہ کیفیت ہے تو پھر پتھر کی تراشی ہوئی مورتیاں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ کوئی نفع دے سکتی ہیں انکی عبادت کرنا اوران کے سامنے جبین نیاز جھکانا کتنا قبیح اور کتنا بڑا جرم ہوگا۔ اور ان کی عبادت کیسے زیبا اور مناسب ہوگی۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾

”اے میرے باپ بیشک آیا ہے میرے پاس وہ علم جو تیرے پاس نہیں آیا اس لئے تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ۔ [1]“

[1] حضرت ابراہیم نے کہا اے میرے باپ اللہ نے جو مجھے اپنی ذات کا عرفان اور اپنے احکام کا علم یقینی عطا فرمایا ہے اس سے تمہارا دامن یکسر خالی ہے، تم میرے دین کی اتباع کرو، میں تمہاری بالکل سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کروں گا جو دنیا وآخرت کی کامیابی تک تمہیں پہنچا دے گا۔ حضرت ابراہیم کے خلق عظیم اور طبع کریم کا کمال ہے کہ باپ کو صراحۃً جاہل اور بے علم نہیں کہا اور نہ اپنے علم کی شیخی دکھائی بلکہ اپنے آپ کو ایک رفیق سفر کی طرح پیش کیا جو راستہ کے پیچ وخم سے زیادہ واقف ہے۔ پھر آپ نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ جس عقیدہ پر تم مطمئن بیٹھے ہو اس میں ذرا برابر نفع نہیں۔ فرمایا دنیا وآخرت کی تباہی اور نقصان کا راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ اس میں حقیقۃً شیطان کی عبادت ہے کیونکہ وہی اس بہت بڑے جرم (بتوں کی عبادت) کا حکم دینے والا تھا۔

يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾

”اے باپ شیطان کی پوجا نہ کیا کر بیشک شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ [1]“

[1] فرمایا شیطان کے مزین کردہ افعال کفر ومعاصی، بتوں کی پوجا کو مت اپناؤ کیونکہ وہ تو خود رب کریم کا نافرمان ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی نافرمانی کا حکم دیتا ہے حالانکہ رب کریم کی وہ ذات ہے جو نعمتوں کے بیشمار دسترخوان بچھائے ہوئے ہے (جس سے اپنے بیگانے سب لطف اندوز ہورہے ہیں) اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مجرم ونافرمان کی پیروی کرنے والا بھی مجرم وگنہگار ہوتا ہے اور ہر مجرم وگنہگار اسی لائق ہے کہ اس سے نعمتوں کے خزانے واپس لے لئے جائیں اور نافرمانی کے جرم پر اس سے انتقام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ دین اور شیطان کی مکاریوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے بعد برے انجام اور سزا وانتقام سے ڈرایا۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا ﴿۴۵﴾

”اے باپ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھے پہنچے عذاب (خدانخواستہ) رحمٰن کی طرف سے تو تو بن جائے شیطان کا ساتھی۔ [1]“

[1] انی کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقی قراء نے یہیے کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا اے باپ اگر آپ کفر اور شیطان کی اطاعت کی روش پر چلتے رہے تو مجھے تمہارے عذاب میں کچلے جانے کا اندیشہ ہے، عذاب کے ذکر میں رحمٰن کی صفت کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نافرمانی ایسا قبیح جرم ہے کہ اس ذات سے عذاب ملنے کا باعث بنتا ہے جو سراپا رحمت ہے، کیونکہ اطاعت شعاروں پر کمال رحمت، مجرموں اور سرکشوں پر کمال غضب کے منافی نہیں ہے۔ تم دنیا میں شیطان کے دوست بن جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں لعنت کے مستحق ٹھہرو گے اور آخرت میں دردناک عذاب میں تم اس کے ساتھ رہو گے۔ وہ تمہارے ساتھ رہے گا اور دونوں اسی لعنت وعذاب میں گرفتار ہو گے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں (شیطان کی عبادت سے دو وجوہ سے روکا جاتا ہے۔ایک اس کا آدم کو سجدہ نہ کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور دوسرا انسان سے دشمنی کرنا) لیکن یہاں اس کی جنایات میں سے صرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے آدم سے اسکی دشمنی کی طرف توجہ نہ فرمائی بلکہ اسے عارف باللہ ہونے کے باوجود رب کی نافرمانی کرنے کو ذکر فرمایا کیونکہ یہ چیز بہت بری ہے یا دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا تمام برائیوں کی اصل ہے دوسری تمام برائیاں اور جرائم اس پر متفرع ہوتے ہیں یا تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آدم اور اس کی اولاد کی دشمنی کا نتیجہ تھی(1)۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾

"باپ نے کہا کیا روگردانی کرنے والا ہے تو میرے خداؤں سے اے ابراہیم؟ ۱؎ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور دور ہو جاؤ میرے سامنے سے کچھ عرصہ ۲؎ "

۱؎ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے محبت بھرے اور خلوص آمیز انداز تکلم کے مقابلہ میں درشتی اور سختی سے کلام کیا گیا ہے۔اے بیٹے نہیں کہا بلکہ نام لے کر بات کی، نام بھی ابتداء کلام میں نہیں بلکہ آخر میں ذکر کیا اور خبر کو مبتدا پر مقدم کیا ہے پھر کلام کو ہمزہ استفہامیہ سے شروع کیا تا کہ رغبت نفس کے انکار پر تعجب کا اظہار ہو جائے۔گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بتوں کی عبادت سے انکار کوئی عقلمند تو کرتا نہیں۔اس کے بعد دلیل سے بات کرنے کے بجائے دھمکی دینی شروع کر دی کہ اگر تم ہمارے بتوں کے متعلق بات کرنے سے باز نہ آئے یا ان کی عبادت سے انحراف سے باز نہ آئے تو میں تجھ پر پتھروں کی بارش کر دوں گا۔کلبیؒ مقاتل اور ضحاک سے لارجمنک کا معنی یہ کیا ہے کہ میں تجھے گالیاں دوں گا اور تجھے برا بھلا کہہ کر اپنے آپ سے دور کر دوں گا۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی فرمایا کہ میں تجھے ماروں گا۔حسن نے لا قتلنک بالحجارۃ معنی ذکر کیا ہے۔یعنی میں تجھے پتھروں سے قتل کر دوں گا(2)۔

۲؎ یہ لارجمنک کے مفہوم پر معطوف ہے۔کلبی نے ملیاً کا معنی طویلاً (لمبازمانہ) مجاہد اور عکرمہ نے حیناً (کچھ وقت) سعید بن جبیر نے دھراً (زمانہ) لکھا ہے الملی کا اصل معنی ٹھہرنا ہے۔عرب کہتے ہیں تملیت حیناً۔میں کچھ وقت ٹھہرا رہا۔دن اور رات کو الملوان کہتے ہیں۔قتادہ اور عطاء نے ملیاً کا معنی سالماً کیا ہے۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی بھی فرمایا ہے کہ تو مجھ سے سلامتی کے ساتھ دور ہو جا ورنہ میری طرف سے تجھے ایسی تکلیف پہنچے گی جو تیری برداشت سے وراء ہوگی۔عرب کہتے ہیں ملی بامر کذا جب کوئی کسی امر پر قادر ہو(3)۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾

"ابراہیم نے (جواب میں) کہا سلام ہو ۱؎ تم پر میں مغفرت طلب کروں گا۔تیرے لئے اپنے رب سے ۲؎ بیشک وہ مجھ پر بےحد مہربان ہے۔ ۳؎ "

۱؎ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الوداعی اور متارکت کا سلام کہا اور بداخلاقی کا مقابلہ حسن اخلاق سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں اچھا تم سلامت رہو۔ہمیشہ حلیم الطبع اور بلند اخلاق لوگوں کا نادانوں سے یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ترش کلام اور بداخلاقی کے آگے بجھ تے نہیں بلکہ حوصلہ اور بردباری کا اظہار کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔اللہ کے مقرب بندوں سے

1۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 555 (العلمیۃ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 201 (التجاریۃ) 3۔ایضا

جب جاہل مخاطب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہو۔ یعنی میری طرف سے تمہیں سلامتی ہے میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔

۲۔ ربی کی یاء کو نافع اور عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اکثر مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے عرض کروں گا کہ وہ تجھے توحید اور اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمائے اور کفر و شرک سے توبہ کی توفیق مرحمت فرمائے کیونکہ کافر کیلئے مغفرت کا سوال کرنا جائز ہی نہیں ہے صرف اسکے لئے اس چیز کی توفیق طلب کی جا سکتی ہے جو مغفرت کا موجب ہو۔ میرے نزدیک مفسرین کی یہ توجیہہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ۔ الی قولہ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے مشرک کے لئے جو استغفار کیا تھا اس میں حضرت ابراہیم کی اقتداء جائز نہیں ہے حالانکہ مشرک کے لئے توفیق کی دعا جائز ہے (اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول ساستغفر لک ربی کا یہ مفہوم ہوتا جو مفسرین نے بیان فرمایا ہے تو صراحۃً قرآن میں منع نہ کیا جاتا۔) مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آپ کا یہ کہنا مشرک کے لئے استغفار کی نہی سے پہلے کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابو طالب کو کہا تھا قسم بخدا میں آپ کے لئے استغفار کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے منع نہیں کیا جاتا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الآیۃ(1)۔ اس کی تفسیر سورۂ توبہ میں گزر چکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے ان کے ایمان کی درخواست کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور انہیں ایمان کی روشنی عطا فرما دیتا کیونکہ ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے لیکن آزر کا ایمان مقدر ہی نہ تھا اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے انکے کے لئے دعا ہی نہیں کی تھی۔

۳۔ میرا رب کریم مجھ پر بڑا مہربان اور بڑی نوازشات فرمانے والا ہے۔ انتہائی لطف اور بندہ نوازی فرمانے والا ہے، کلبی نے یہ معنی لکھا ہے کہ وہ جانتا ہے جب بھی میں دعا کیلئے دست طلب پھیلاتا ہوں میری آرزوؤں اور دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ ہمیشہ میری دعاؤں کو قبول فرماتا ہے(2)۔

وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝۴۸

"اور میں الگ ہو جاؤں گا تم سے اور (ان سے بھی) جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے نامراد نہیں رہوں گا۔ ۱ "

۱۔ اعتزلکم کا عطف سا ستغفر پر ہے، اور وما تدعون کا عطف اعتزلکم کی ضمیر منصوب (کم) پر ہے، مقاتل فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے جب دیکھا (کہ پند و نصائح کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا) تو آپ کوثی میں ان سے جدا ہو کر ارض مقدس کی طرف ہجرت کر گئے تھے(3) اور قوم سے فرمایا میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے کبھی نامراد و خائب نہیں ہوں گا۔ جس طرح تم بتوں کی عبادت کر کے بدبختی اور نامرادی کو اپنی قسمت بنا رہے ہو۔ آپ نے عسیٰ کا کلمہ ذکر فرمایا جو امید اور توقع پر دلالت کرتا ہے۔ اسکی وجہ آپ کی کسر نفسی اور تواضع ہے۔ اور یہ تنبیہ کرنا تھا کہ دعاؤں کو شرف قبولیت عطا کرنا، نیک اعمال پر ثواب دینا یہ میرے رب کریم کا فضل اور احسان ہے اس پر واجب نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی عبادات و ریاضات کی قبولیت اور عدم قبولیت کا دارومدار خاتمہ پر ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو پوشیدہ ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 675 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (التجاریۃ) 3۔ ایضاً، صفحہ 202-201

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

''پس جب وہ جدا ہو گیا ان سے اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تو عطا فرمایا ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب اور سب کو ہم نے نبی بنایا۔ ۱''

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وطن اور خاندان چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر گئے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے انہیں شرک و کفر سے آلودہ قوم کے عوض اسحق و یعقوب جیسی برگزیدہ اولاد عطا فرمائی۔ لما ظرف ہے وھبنا کے متعلق ہے۔ وھبنا کا جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اسطرح ہوگی قال سلام علیک الی آخرہ۔ فاعتزلھم فوھبنا لہ اسحق و یعقوب۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

''اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں اپنی رحمت سے (طرح طرح کی نعمتیں) ۱۔ اور ہم نے ان کے لئے سچی اور دائمی تعریف کی آواز بلند کر دی۔ ۲''

۱۔ من رحمتنا سے پہلے من بعضیہ ہے۔ کلبی کہتے ہیں رحمت سے مراد مال، اولاد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کتاب اور نبوت ہے (1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت اسحق اور حضرت یعقوب کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں انبیاء کی اصل ہیں۔ یا اسماعیل علیہ السلام کا علیحدہ ان کے فضائل و کمالات کے ساتھ ذکر کرنا تھا۔ اس لئے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا گیا (2)۔

۲۔ لسان سے مراد وہ الفاظ اور کلام ہے جو زبان سے نکلتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے لسان العرب۔ یعنی عربوں کی لغت۔ لسان صدق سے مراد تعریفی کلمات ہیں۔ تمام قومیں (اختلاف مذاہب) کے باوجود حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ان کی دعا کی قبولیت پر فخر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم آپ کی تعریف و ثناء کرتی ہے۔ لسان کی صدق کی طرف اضافت اور پھر علو کے ساتھ اس کی صفت لگانا یہ دلیل ہے کہ وہ لوگ ان تعریفی کلمات کے مستحق ہیں۔ جو کچھ لوگ ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں وہ ان کے واقعی حقدار ہیں اور ان کے محامد مرور زمانہ اور قوموں کی تبدیلی کے باوجود کسی شخص پر مخفی نہیں ہیں۔ لھم ظرف مستقر ہے اور جعلنا کا مفعول ثانی ہے اور علیا ظرف میں پوشیدہ ضمیر مرفوع سے حال ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

''اور ذکر فرمائیے کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ (اللہ کے چنے ہوئے) تھے ۱۔ اور رسول و نبی تھے ۲''

۱۔ کوفیوں نے مخلصا کو لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا ہے اور غیر کی طرف توجہ کی آلائش سے بھی انہیں پاک فرمایا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور اپنا سر خم کر دیا تھا اور اپنے نفس کی ہر ہر حرکت ہر ہر سانس اپنے رب کے لئے کر دیا تھا اور اپنے رب کریم کی عبادت کو شرک جلی اور شرک خفی سے بالکل پاک کیا تھا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو آپ بلند مقام پر فائز بھی ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خبر دیتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 556 (العلمیہ)

والے بھی تھے۔ چونکہ انباء (نبی بنانا) وجود میں ارسال (رسول بنانا) پر متفرع ہوتا ہے اسلئے رسول کو مقدم فرمایا حالانکہ رسالت نبوت سے اخص اور اعلیٰ ہے (کیونکہ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا اور رسول وہ ہوتا ہے جس پر وحی اور کتاب کا نزول ہوتا ہے)

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾

''اور ہم نے انہیں پکارا طور کی دائیں جانب سے [1] اور ہم نے انہیں قریب کیا راز کی باتیں کرنے کے لئے [2]''

[1] طور مصر اور مدین کے درمیان ایک پہاڑ ہے اس کو الزبیر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ندا اس وقت کی گئی جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے آ رہے تھے راستہ میں آپ نے آگ دیکھی تو ندا دی گئی اے موسیٰ اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ میں اللہ رب العالمین ہوں۔ الایمن سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب ہے کیونکہ پہاڑ کا کوئی دایاں (بایاں) نہیں ہوتا۔ اسکی طور کی طرف اضافت قربتی نسبت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر جا رہے تھے جب طور کے قریب پہنچے تو طور موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا اور مراد بابرکت جانب ہے کیونکہ یہ جہت بطور برکت استعمال ہوتی ہے۔

[2] موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے ایسا قرب عطا فرمایا جو الفاظ اور تحریر کے احاطہ میں نہیں آ سکتا۔ جسکو وہ نصیب نہیں ہوا وہ اسکی لذت کو کسی اور طریقہ سے محسوس نہیں کر سکتا۔ نجیاً۔ قربناہ کی ضمیر فاعل اور مفعول دونوں سے حال ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

''اور ہم نے بخشا انہیں اپنی خاص رحمت سے ان کا بھائی ہارون جو نبی تھا۔ [1]''

[1] لہ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی (اور مقرر فرما میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے) تو ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبوت عطا فرما کر ان کا معاون بنایا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کی دعا کی وجہ سے ہم نے ہارون پیدا فرمایا کیونکہ حضرت ہارون عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ من رحمتنا سے پہلے من اجلیہ ہے۔ یا من بعضیہ ہے اخاہ وھبنا کا مفعول ہوگا اگر من سببیت کے لئے ہو اور اگر من بعضیت کے لئے ہو تو پھر بدل ہوگا۔ ھارون 'اخاہ سے عطف بیان ہے۔ اور نبیا وھبنا کے مفعول سے حال ہے۔

وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾

''اور ذکر کیجئے کتاب میں اسمٰعیل کو بیشک وہ وعدہ کے سچے تھے [1] اور رسول (اور) نبی تھے [2]''

[1] اسماعیل سے مراد اسماعیل بن ابراہیم ہیں جو نبی کریم محمد ﷺ کے جد امجد تھے۔ آپ کی صفت وعدہ کی سچائی کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں آپ نے جو بھی وعدہ فرمایا اسے وفا کیا۔ مقاتل فرماتے ہیں آپ نے ایک شخص سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس کی واپسی تک یہاں ٹھہرے رہیں گے۔ وہ شخص تین دن کے بعد واپس لوٹا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کلبی فرماتے ہیں آپ اس شخص کا ایک سال تک انتظار کرتے رہے (1)۔ آپ کے وعدہ سچائی کے لئے وہ صبر کا وعدہ کافی ہے جو کہ آپ نے اپنے باپ کے ساتھ ذبح پر صبر کرنے کا کیا تھا تو آپ نے اسے دل و جان سے وفا کیا۔

[2] حضرت اسماعیل علیہ السلام جرہم قبیلہ کی طرف رسول اور نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریۃ)

کریمہ دلیل ہے کہ رسول کے لئے صاحب شریعت ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تمام انبیاء کرام آپ کی شریعت کے پیرو تھے (1)۔

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾

"اور وہ حکم دیا کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا ۱؎ اور اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے ۲؎"

۱؎ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ آپ اپنے اہل وعیال کو اہمیت کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ آپ احکام الٰہیہ کی تبلیغ کا آغاز اپنے نفس اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے فرماتے تھے کیونکہ ان کی تکمیل دوسری امت کی بنسبت آپ کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ (ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کہ پہلے انسان اپنے اوپر احکام شریعت کا نفاذ کرے پھر اپنے اہل وعیال پر ان کو جاری فرمائے' تا کہ یہ سب لوگ دوسروں کے لئے نمونہ اور اسوہ بن جائیں)

حضور نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع فرمانے کا حکم دیا تھا ارشاد فرمایا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ اے محبوب پہلے اپنے رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرایئے۔ دوسری جگہ فرمایا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ اے مسلمانو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو آتش جہنم سے بچاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل سے مراد آپ کی امت ہے کیونکہ انبیاء کرام اپنی امتوں کے باپ ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ سے مراد مکمل شریعت ہے جو اللہ نے ان پر فرض کی تھی اور ان کی شریعت بھی وہی تھی جو اللہ نے ہم پر فرض کی ہے (2) اور ان دو عبادتوں کا مخصوص ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ نماز بدنی عبادات میں سے افضل ترین عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادات میں سے افضل ترین عبادت ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت ورسالت پسند تھی اور اللہ تعالیٰ آپ کی اعمال وافعال میں استقامت اور طاعت الٰہی پر دوام کی وجہ سے راضی تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾

"اور ذکر فرمایئے کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بیشک وہ بڑے راستباز (اور) نبی تھے ۱؎ اور ہم نے بلند کیا تھا انہیں بڑے اونچے مقام تک ۲؎"

۱؎ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت شیث علیہ السلام کی نسل سے تھے اور آپ نوح علیہ السلام کے پردادا تھے۔ آپ کا نام اخنوخ تھا' بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو ادریس اس لئے کہا جاتا تھا کہ آپ اکثر کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا غیر منصرف ہونا اس کے الدرس سے مشتق ہونے کی تردید کرتا ہے۔ ہاں یہ کوئی بعید نہیں کہ اس کا معنی ان کی لغت میں اس کے قریب قریب ہو اور آپ کے کثرت درس کی وجہ سے اس نام سے آپ کو ملقب کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر تیس صحیفے نازل فرمائے تھے (3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ادریس پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا' اور سب سے پہلے آپ نے کپڑوں کی سلائی

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 558 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 559 (العلمیۃ)

فرمائی اور سلا ہوا کپڑا پہنا۔ آپ سے پہلے لوگ جانوروں کی کھالیں لباس کے طور پر استعمال فرماتے تھے۔ اور ہتھیاروں کے پہلے موجد بھی آپ ہیں اور کفار سے لڑائی بھی سب سے پہلے آپ نے کی۔ علم نجوم اور علم حساب کا آغاز بھی آپ نے ہی فرمایا(1)۔

بلند مقام سے مراد بعض علماء کے نزدیک نبوت کے شرف کے ساتھ بلند درجہ عطا فرمانا اور اللہ کی بارگاہ میں قرب ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد جنت ہے۔ بعض نے فرمایا چھٹا یا چوتھا آسمان ہے۔ انس بن مالک حضرت مالک بن صعصعہ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت محمد کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے معراج کی رات حضرت ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا(2)۔ یہ حدیث پاک تفصیل سے سورہ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم میں مذکور ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا بلند کیے جانے کا سبب

حضرت کعب وغیرہ کا بیان ہے کہ ایک دن آپ کسی کام کے لئے جا رہے تھے کہ آپ کو سخت گرمی محسوس ہوئی۔ آپ نے عرض کی اے میرے رب کریم میں آج دھوپ میں چلا ہوں اور مجھے سخت گرمی محسوس ہوئی ہے وہ فرشتہ اس کی گرمی کیسے برداشت کرتا ہوگا جو ایک دن میں پانچ سو سال کی مسافت اسے (سورج) اٹھائے رکھتا ہے۔ یا اللہ اس فرشتے سے اس (سورج) کے بوجھ اور گرمی کو ہلکا اور کم فرما دے جب صبح ہوئی تو فرشتے نے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم پایا۔ فرشتے نے عرض کی یا رب یہ کیسے تو نے کمی کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے مقرب بندے ادریس علیہ السلام نے تجھ سے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم کرنے کی سفارش کی ہے اور میں نے اس کی سفارش قبول فرمائی ہے۔ فرشتے نے عرض کی یا رب میرے اور اس بندے کے درمیان دوستی پیدا فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو دوستی کی اجازت مرحمت فرمادی۔ وہ فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس پہنچا حضرت ادریس علیہ السلام نے اسے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو بڑا معزز فرشتہ اور ملک الموت کے پاس تیری بڑی قدر و منزلت ہے۔ آپ میری ان سے سفارش کر دیں کہ میری موت میں تھوڑی تاخیر کر دے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نعمتوں پر شکر اور زیادہ کرلوں۔ فرشتے نے کہا قبلہ! اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کی موت کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے اس میں وہ تاخیر نہیں فرماتا۔ ہاں میں آپ کے کہنے کے مطابق بات کرتا ہوں۔ فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے قریب چھوڑ کر خود آسمان کی طرف چڑھ گیا، وہ فرشتہ ملک الموت کے پاس پہنچا اور کہا کہ جناب میرا انسانوں میں ایک دوست ہے۔ اس نے سفارش طلب کی ہے کہ آپ ان کی موت میں تاخیر کر دیں۔ ملک الموت نے کہا یہ کام تو میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا کر سکتا ہوں کہ انہیں اپنی موت کا وقت بتا دیتا ہوں تاکہ وہ پہلے سے تیاری کرلیں۔ فرمایا ٹھیک ہے یہ تو کر دو۔ حضرت ملک الموت نے اپنا رجسٹر دیکھا اور فرمایا تم نے جس انسان کے متعلق مجھ سے بات کی ہے (وہ مر چکا ہے) اور آئندہ کبھی نہیں مرے گا۔ فرشتہ نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں ابھی انہیں سورج کی طلوع ہونے کی جگہ کے پاس چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ ملک الموت نے کہا تم جاؤ دیکھو وہ وہاں مر چکا ہے اور ادریس علیہ السلام کی زندگی کا کوئی لمحہ اب باقی نہیں ہے۔ وہ سورج کا فرشتہ لوٹ کر آیا تو ادریس علیہ السلام کو مردہ پایا۔

وہب بن منبہ فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام آسمان میں زندہ ہیں یا مر چکے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آپ زندہ ہیں اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ چار انبیاء کرام زندہ ہیں حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام زمین پر حضرت ادریس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ) 2۔ ایضاً صفحہ 203

اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام آسمان پر زندہ ہیں۔

وہب فرماتے ہیں حضرت ادریس علیہ السلام کی ہر روز اتنی عبادت بلند ہوتی تھی جتنی کہ تمام دوسرے لوگوں کی پہنچتی تھی۔ فرشتوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا اور انہیں ان کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ ملک الموت نے اپنے رب سے حضرت ادریس علیہ السلام کی ملاقات کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملی تو آپ انسانی شکل میں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس تشریف لائے۔ حضرت ادریس علیہ السلام ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ جب افطار کا وقت ہوا تو آپ نے ملک الموت کو کھانے کی دعوت دی۔ انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل تین راتیں ایسا ہی ہوتا رہا حضرت ادریس کھانے کی دعوت دیتے لیکن ملک الموت جو انسانی شکل میں آئے ہوئے تھے کھانا کھانے سے انکار کر دیتے۔ تیسری رات حضرت ادریس علیہ السلام نے پوچھا جناب آپ ہیں کون؟۔ ملک الموت نے کہا میں ملک الموت ہوں، میں اپنے رب سے اجازت لے کر تمہاری ملاقات اور تجھ سے دوستی کرنے کیلئے آیا ہوں۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا۔ مجھے تجھ سے ایک کام ہے' پوچھا کیا؟ فرمایا تم میری روح قبض کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ ان کی روح قبض کرلو' اس نے روح قبض کر لی پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ دیر کے بعد ان کی روح لوٹا دی۔ ملک الموت نے کہا آپ نے موت کا سوال کیوں کیا۔ فرمایا اس لئے تاکہ موت کی تکلیف اور اسکی گہرائی کا ذائقہ چکھ لوں تاکہ میں اس کے لئے زیادہ تیار ہو جاؤں پھر حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا مجھے تجھ سے ایک اور کام بھی ہے ملک الموت نے پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم مجھے آسمان پر لے جاؤ تاکہ میں آسمان' جنت اور دوزخ دیکھ لوں۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو انہیں آسمانوں پر لے جانے کی اجازت فرما دی۔ جب آپ دوزخ کی آگ کے قریب پہنچے تو فرمایا ملک الموت! مجھے ایک اور حاجت ہے۔ فرمایا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم دوزخ کے داروغے مالک سے کہو کہ میرے لئے دوزخ کے دروازے کھول دے تاکہ میں اس میں داخل ہو کر سب کچھ دیکھ لوں' آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی گئی۔ پھر فرمایا جیسے تم نے مجھے دوزخ دکھائی ہے اب جنت بھی دکھا دو۔ آپ جنت کی طرف تشریف لے گئے۔ اس کے دروازے کھولنے کا مطالبہ کیا تو وہ کھول دیئے گئے اور آپ جنت میں داخل ہو گئے پھر سیر جنت کے بعد ملک الموت نے کہا جناب آپ یہاں سے چلیے اور زمین میں اپنی جگہ تشریف لے جائیے۔ حضرت ادریس علیہ السلام جنت کے ایک درخت سے چمٹ گئے اور فرمایا میں تو یہاں سے کبھی نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتے نے پوچھا جناب آپ جنت سے باہر کیوں نہیں جاتے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔ میں اسکا ذائقہ چکھ چکا ہوں اور فرمایا تم میں سے ہر شخص دوزخ میں وارد ہوگا، میں اس منزل سے بھی گزر چکا ہوں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جنتی جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اسلئے اب میں باہر نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی طرف پیغام بھیجا کہ ادریس علیہ السلام میرے حکم سے جنت میں داخل ہوئے تھے اور میرے حکم سے ہی نکلیں گے (تم ان سے مکالمہ بند کرو) اسی وجہ سے حضرت ادریس جنت میں زندہ ہیں اور ورفعناہ مکاناً علیاً کا یہی مطلب ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

''یہ وہ (مقدس ہستیاں) ہیں جن پر انعام فرمایا اللہ تعالیٰ نے انبیاء (کرام کے زمرہ) سے یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اور بعض ان کی اولاد جنکو ہم نے سوار کیا تھا (کشتی میں) نوح کے ساتھ اور بعض ابراہیم اور یعقوب کی اولاد سے تھے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا۔ جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں تو وہ گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور (زاروقطار) روتے ہوئے۔''

لہ اولٰئک کا مشارالیہ انبیاء کرام ہیں جن کا ذکر حضرت زکریا علیہ السلام سے شروع ہوا اور ادریس علیہ السلام پر ختم ہوا۔ انعام سے مراد دنیوی اور دینی انعامات ہیں۔ من النبیین 'علیہم کی ضمیر سے حال ہے اور اسم موصول کا بیان ہے۔ من ذریۃ ادم سے مراد ادریس علیہ السلام اور بقیہ تمام انبیاء کرام ہیں۔ یہ من النبیین سے بدل ہے یا صفت ہے یا حال ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ من ذریۃ آدم میں من بعضیہ ہو کیونکہ منعم علیہم انبیاء کرام سے اعم ہیں اور ذریۃ سے اخص ہیں اور ذریۃ ابراھیم سے مراد حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام وغیرہما ہیں۔ اسرائیل' ابراہیم پر معطوف ہے' اسرائیل سے مراد اسرائیل کی اولاد ہے' اور ان میں سے موسیٰ' ہارون' زکریا' یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ بچیوں کی اولاد بھی ذریت کے تحت داخل ہے۔ مِمَّنْ هَدَيْنَا یا تو یہ پہلے عن بیانیہ پر معطوف ہے یا دوسرے من پر معطوف ہے اس تقدیر پر کہ وہ من بعضیہ ہے اگر یہ من پہلے من پر معطوف ہوگا تو یہ حضرت مریم اور اسماعیل (علیہما السلام) کی اولاد کو شامل ہوگا جن کا ذکر کان یامر اھلہ بالصلوٰۃ میں ہوا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کو ہم نے شرف نبوت کے لئے چن لیا۔ انہیں کرامت وہدایت کی عظمت سے نوازا۔

لہ سجداً جمع ہے ساجدین کی۔ بکیا کو حمزہ اور کسائی نے باء کے کسرہ کے ساتھ اور جمہور اور حفص نے باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ ابتک کی جمع ہے۔ اذا ظرفیہ خروا کے متعلق ہے اور پھر خسروا کا جملہ اولٰئک کی خبر ہوگا اگر اسم موصول کو اس کی صفت بنایا جائے۔ اور خرُّوْا کا جملہ مستقل علیحدہ کلام ہوگا اگر اسم موصول کو اولٰئک کی خبر بنایا جائے اور اس مستقل کلام کا مقصود ان کی خشیت الٰہی کو بیان کرنا ہے کہ وہ برگزیدہ لوگ' کمال نفس' شرف نسب اور اتنی بلند اور رفیع شان کے باوجود ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ابن ماجہ' اسحٰق بن راہویہ اور بزار نے اپنی اپنی مسند میں حضرت ابن ابی وقاص کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کی تلاوت کرو تو رونے کی کوشش کرو اور اگر رونا نہ آئے تو رونے والی شکل بناؤ (1)۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾

''پس جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جنہوں نے ضائع کیا نمازوں کو لہ اور پیروی کی خواہشات (نفسانی) کی ۲ سو وہ دوچار ہوں گے اپنی نافرمانی (کی سزا سے) ۳''

لہ خلف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اچھے جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو برے جانشین مراد ہوتے ہیں' یعنی ان انبیاء کرام کے پیچھے ایسے لوگ آئے جنہوں نے نمازوں کو ترک کر دیا۔ ابن مسعود اور ابراہیم فرماتے ہیں انہوں نے نماز کو اپنے اوقات سے مؤخر کیا تھا۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں نماز کے ضیاع کا مطلب یہ ہے کہ انسان ظہر کی نماز کو عصر کی نماز کے وقت تک مؤخر کردے اور عصر کی نماز کو غروب شمس تک مؤخر کردے (2)۔ میں کہتا ہوں نماز کے ضیاع سے مراد غلط اور مکروہ انداز میں نماز ادا کرنا ہے یا نماز کی سنتوں اور

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 319 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 20 (التجاریہ)

مستحبات کو ترک کرنا ہے۔

۲۔ برے جانشینوں میں دوسری برائی یہ تھی کہ وہ اطاعت الٰہی کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کے در پے ہو گئے تھے اور نافرمانی' گناہ اور بدکاریوں کو انہوں نے اختیار کر لیا تھا۔

۳۔ ایسے بدکاروں کو دوزخ کی وادی غیّ میں پھینک دیا جائے گا۔ امام بغوی نے وہب کے قول کے مطابق لکھا ہے کہ غیّ جہنم کی ایک نہر ہے جو انتہائی گہری اور اسکی طبع بہت خبیث ہے۔ لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ جہنم کی ایک وادی ہے اور جہنم کی دوسری وادیاں اس سے پناہ مانگتی ہیں اور یہ زنا پر اصرار کرنے والوں' عادی شرابی' ہمیشہ سود کھانے والوں، والدین کے نافرمانوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے(1)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس کی حدیث بالکل اسی طرح مرفوع ذکر کی ہے۔

امام بغوی لکھتے ہیں عطاء نے فرمایا غیّ جہنم کی ایک وادی ہے جس میں پیپ اور خون بہتا ہے۔ فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا یہ جہنم کی بہت گہری اور بہت گرم وادی ہے، اس میں ایک کنواں ہے جسے ہیم کہا جاتا ہے۔ جب جہنم بجھنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کنویں کو کھول دیتے ہیں' جس کی وجہ سے جہنم پھر بھڑک اٹھتی ہے(2)۔

امام بغوی نے زکریا بن ابی مریم الخزاعی سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابی امامہ الباہلی کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جہنم کے کنارہ سے جہنم کی گہرائی تک ایک پتھر کو گرنے میں ستر سال کی مدت لگتی ہے یا فرمایا اس پتھر کو جو دس موٹی اونٹنیوں جیسا ہو اس کو اتنی مدت لگتی ہے۔ عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید نے پوچھا پھر اس کے نیچے بھی کچھ ہے اے ابی امامہ! فرمایا اس کے نیچے غیّ ہے اور آثام کی وادیاں ہیں(3)۔

ابن جریر' ابن ابی حاتم' سعید بن منصور' ہناد' الفریابی' حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے مختلف طرق سے اسی آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا الغیّ جہنم کی ایک وادی ہے' ایک روایت میں ہے کہ جہنم میں ایک گہری نہر ہے جس کا ذائقہ بہت برا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ دوزخ میں کھولتے ہوئے پانی کی ایک نہر ہے جس میں ان لوگوں کو پھینکا جائے گا جو خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں(4)۔

بیہقی نے حضرت براء بن عازب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں غیّ جہنم کی ایک وادی ہے جو بڑی گہری ہے اور بدبودار ہے۔

طبرانی اور بیہقی نے براء بن عازب سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ایک پتھر کا وزن دس اوقیہ ہو، اسے جہنم کے کنارے سے پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک اس کی گہرائی میں نہیں پہنچے گا۔ اس کے بعد وہ غیّ اور آثام تک پہنچے گا۔ براء بن عازب فرماتے ہیں میں نے عرض کی حضور! غیّ اور آثام کیا ہیں؟ فرمایا یہ جہنم کے نیچے دو نہریں ہیں جن میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے۔ ان دو وادیوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے۔ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا(5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہاں غیّ سے مراد گمراہی ہے جو ہدایت کی ضد ہے۔ وہ گمراہی کو پائیں گے اور جنت کے راستہ سے بھٹک جائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عربوں کے نزدیک ہر برائی غیّ ہے اور ہر نیکی رشاد ہے۔ اسی وجہ سے ضحاک یہ معنی فرماتے ہیں کہ وہ گھاٹا پائیں گے۔ بعض نے غیّ کا معنی ہلاکت، بعض نے عذاب کیا ہے(6)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مضاف کو حذف کر کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (التجاریہ) | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً، صفحہ 205

4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 500 (العلمیہ) | 5۔ ایضاً | 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (التجاریہ)

مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ یہ اصل میں جزاء غی تھا، یعنی دنیا میں اختیار کئے گئے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی سزا پائیں گے۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۙ

''مگر جو تائب ہوئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے ۱؎ تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲؎''

۱؎ یعنی جنھوں نے نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور نمازوں کو ترک کیا اگر وہ سچے دل سے توبہ کرلیں اور جو کافر تھے مسلمان ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر مکمل ایمان لے آئیں اور پھر ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ یہ کفار کے متعلق ہے(1)۔ یعنی مذکورہ وعید کفار کے ساتھ مختص ہے۔ میں کہتا ہوں من آمن و عمل صالحا مستثنیٰ ہے پس جو ایمان لایا لیکن نیک اعمال نہ کئے تو وہ فاسق بھی مذکورہ وعید میں داخل ہے جس طرح کہ سابقہ آیت کی تفسیر میں ابن عباس کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ نہ سرابی زانی وغیرہ جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں وہ غی میں پھینکے جائیں گے۔

۲؎ فاولئک کا مشارالیہ من تاب و آمن و عمل صالحا ہے۔ ابن کثیر، ابن عمرو، یعقوب اور ابوبکر نے یدخلون کو باب افعال سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فعل مجرد دخل سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ شیئاً مفعول ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے۔ یعنی ان کے اعمال کی جزاء میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی یا شیئا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے، یعنی ان پر کچھ ظلم وزیادتی نہ ہوگی۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ سابقہ کفر توبہ کرنے والے کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام سابقہ تمام گناہوں اور جرموں کو ختم کر دیتا ہے' اس حدیث کو عمرو بن عاص کے حوالہ سے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ یہ اولئک کا جملہ استثناء کے مضمون پر تعلیل کے مقام پر ہے۔

جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا ۝۶۱

''سدا بہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمٰن نے اپنے بندوں سے ۱؎ غیب میں کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے ۲؎''

۱؎ یہ جنت عدن سابقہ الجنۃ سے بدل اشتمال ہے۔ یا بطور مدح منصوب ہے یا فعل محذوف اعنیٰ کی وجہ سے منصوب ہے عدن گر اقامۃ کے معنی میں ہو تو جو جنت اس کی طرف مضاف ہے وہ نکرہ ہوگا' بعض فرماتے ہیں یہ یک معین جنت کا علم ہے۔ اور یہ اسم کی طرف اضافت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جنت کی زمین کا علم ہے۔ دونوں تقدیروں پر جنت عدن معرفہ ہوگا اور التی کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ موصول کو نکرہ کی تاویل میں کیا جائے تو یہ التی جنت کی صفت ہوگا یا جنت عدن سے بدل ہوگا۔ اور صلہ میں ضمیر عائد محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی التی وعدالرحمٰن بھا عبادہ۔

۲؎ بالغیب' حال ہے عبادہ سے، یعنی اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا در آں حالیکہ وہ جنت سے غائب تھے۔ یا یہ جنت سے حال ہے' یعنی جنت ان سے غائب ہے یا یہ مضاف کے حذف کے ساتھ وعد کے متعلق ہے' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے ایمان اور غیب کی تصدیق

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 562 (العلمیہ)　　2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 76 (وزارت تعلیم)

کے باعث یہ وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں سے وعدہ فرمایا وہ یقیناً پورا ہوگا اور جنتی ضرور اس میں تشریف لائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ماتیا اسم مفعول اتیا اسم فاعل کے معنی میں ہے کیونکہ جو چیز تیرے پاس آتی ہے تو تو بھی اس کے پاس آیا ہے۔ عرب اَتٰی عَلَیَّ خَمْسُوْنَ سَنَۃً۔ (مجھ پر پچاس سال گزر گئے) اور اَتَیْتُ عَلٰی خَمْسِیْنَ سَنَۃً (میں پچاس سال سے گزرا) میں کچھ فرق نہیں کرتے کیونکہ دونوں کا معنی اور مفہوم ایک ہی ہے۔ اسی طرح وَصَلَ اِلَیَّ الْخَبَرُ (مجھ تک خبر پہنچی) اور وَصَلْتُ اِلَی الْخَبَرِ (میں خبر تک پہنچ گیا) میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾

''نہیں سنیں گے جنت میں کوئی لغو بات بجز 'سلامت رہو' کی دعائیہ صدا ۱ ؎ اور انہیں ان کا رزق ملے گا وہاں ہر صبح و شام ۲ ؎''

۱ ؎ لغواً۔ ایسی کلام جو فضول ہو۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال مقدرہ ہے عبادہ سے یا الجنۃ سے یا صلہ کی ضمیر محذوف سے۔ سلاماً۔ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے یا ایک دوسرے کی طرف سے سلامت رہو کی صدائے دلنواز سنیں گے، کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔ یا یہ معنی کہ وہ ایسی کلام سنیں گے جس میں عیب اور نقص سے سلامت ہوں گے۔

۲ ؎ ان کو جنت میں صبح و شام رزق ملے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد خوش و خرم زندگی اور رزق کی فراوانی ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں عرب صبح و شام ملنے والے رزق کے علاوہ کوئی زندگی تصور نہیں کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنت کا ایسا وصف بیان فرمایا (1)۔

سعید بن منصور، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت فرمایا کہ جنتیوں کو آخرت میں اسی کی مقدار ملے گا جتنا انہیں دنیا میں ملتا تھا (2)۔ ابن المبارک نے ضحاک سے اس آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ دن، رات کی مقادیر پر انہیں رزق ملے گا۔

ابن المنذر نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں۔ میں نے زہیر بن محمد سے وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا جنت میں کوئی رات نہیں ہے وہ ہمیشہ نور میں رہیں گے۔ حجابات کے اٹھانے کے ساتھ دن کی مقدار اور حجابات کے ڈالنے کے ساتھ رات کی مقدار کو پہچانا جائے گا۔ الحکیم ترمذی نے النوادر میں، حسن اور ابی قلابہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا جنت میں رات ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا لهم رزقهم فيها بكرة و عشيا۔ کہ صبح و شام ان کو رزق ملے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہاں کوئی رات نہیں ہے۔ صرف نور کی روشنی ہوگی صبح اور شام کا ایک دوسرے پر ورود ہوگا اور جن اوقات میں وہ نمازیں پڑھتے تھے ان میں اللہ کی طرف سے ان کے پاس تحفے آئیں گے اور فرشتے ان پر سلام بھیجیں گے (3)۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

''یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں سے (صرف) اسکو جو متقی ہوگا ۱ ؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریۃ)۔ 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 501 (العلمیۃ) 3۔ ایضاً

ل یعنی ہم ان پران کے تقویٰ اور پرہیزگاری کو باقی رکھیں گے جس طرح وارث پر مورث کا مال باقی رہتا ہے۔ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وراثت کا لفظ استعمال فرمایا ہے کیونکہ تملیک اور استحقاق میں یہ قوی ترین سبب ہے کیونکہ اس کے بعد نہ فسخ ہے، نہ لوٹانا ہے اور نہ یہ رد اور اسقاط سے باطل ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ متقین جنت میں ان محلات کے وارث بنیں گے جو دوزخیوں کو ملنے تھے اگر وہ اطاعت گزار ہوتے اور یہ مومنین کی عزت میں اضافہ کرنے کیلئے دیئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ، بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہرایک کے لئے دو منزلیں ہیں، ایک منزل جنت میں اور ایک دوزخ میں جب کوئی مرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوتا ہے تو اہل جنت اس کی منزل کے وارث ہوجاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ یہی مطلب ہے (1)۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی وارث کو میراث دینے سے بھاگے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم فرمادے گا(2)۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل سے فرمایا اے جبرئیل تم جتنا میرے پاس آیا کرتے ہو، اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے تو اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی(3)۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ۚ

"اور (جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے ل مگر آپ کے رب کے حکم سے ۲ اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ۳ اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا ۴۔"

ل تنزل کا مطلب ہے آہستہ آہستہ اترنا کیونکہ یہ نزل باب تفعیل کا مطاوع ہے اور کبھی یہ مطلقاً نزول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے نزل بمعنی انزل استعمال ہوتا ہے۔

۲ الا بامر ربک۔ ظرفیت کی بناء پر یا مصدریۃ کی بناء پر منصوب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وما نتنزل الا وقتا متلبسا بامر ربک علی ما یقتضیہ حکمتہ او تنزلا الا تنزلا متلبساً بامرہ۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جبرائیل نے چالیس دن نزول میں تاخیر کردی آگے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی طرح روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا حضور! کون سی جگہ اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور کونسی جگہ زیادہ مبغوض اور ناپسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں نہیں جانتا، پوچھ کر بتاؤں گا۔ جبرئیل تشریف لائے، جبکہ بڑی دیر سے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل! دیر سے آئے ہو مجھے تو یہ خیال آنے لگا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔ تو جبرئیل نے کہا وما نتنزل الا بامر ربک۔

ابونعیم نے الدلائل میں اور ابن اسحٰق نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش نے جب اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ کو ان کا جواب معلوم نہ تھا لیکن آپ کو امید تھی کہ وحی آجائے گی۔ پندرہ دن گزر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 332 2۔ ایضاً، صفحہ 198 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریہ)

وحی نازل نہ فرمائی جب جبرئیل بعد میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل! تو نے دیر لگا دی۔
امام بغوی نے، ضحاک، عکرمہ، مقاتل اور کلبی کا قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے آپ کی قوم نے اصحاب کہف ذی القرنین اور روح کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے سوالوں کے کل جواب دوں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو نہ بھیجا حتیٰ کہ یہ تاخیر رسول اللہ ﷺ پر بڑی شاق گزری پھر پندرہ دن کے بعد جبرائیل تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرائیل تو نے دیر لگا دی۔ اب میرا تو گمان بدل رہا تھا اور میں تو تیری آمد کے اشتیاق میں بے چین ہو رہا تھا۔ جبرائیل نے کہا مجھے بھی آپ سے ملاقات کا انتہائی شوق تھا لیکن میں عبد مامور ہوں حکم کا بندہ ہوں۔ جب مجھے حکم الٰہی ہوتا ہے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ جب روک دیا جاتا ہے تو رک جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت اور وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۞ نازل فرمائی(1)۔

ۓ له ما بين ايدينا کا جملہ نزول میں تاخیر کی علت کی بناء پر محل نصب میں ہے یا حال کی بناء پر منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کے بعد قیامت تک بلکہ اس کے بعد کے وقت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، دنیا اور آخرت کے امور کا بھی وہی مالک ہے اور ثواب و عقاب کا معاملہ بھی اسی کے پاس ہے۔ اور جو کچھ اشیاء و احوال گزر چکے ہیں وہ ان کا بھی مالک ہے اور جو موجود وقت ہے اور جو کچھ اس میں موجود ہے سب اسی کا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما بين ايدينا سے مراد زمین ہے جب ہم اس پر نزول کا ارادہ کریں اور وما خلفنا سے مراد آسمان ہے جب ہم اس سے اترنے کا ارادہ کریں۔ اور وما بين ذالک سے مراد ہواء ہے۔ یعنی ہم کسی زمانہ میں اذن الٰہی کے بغیر نہیں اترتے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہوتے مگر اللہ کے حکم سے۔

ۓ اے جان عالم آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے۔ میرا حاضر نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی آپ سے ناراضگی اور چھوڑنے کی وجہ سے نہیں جیسا کہ یہ گندے ذہن والے کافر سوچتے ہیں بلکہ وحی کے نزول کی تاخیر میں اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص حکمت کارفرما تھی جسے وہ خود ہی جانتا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۞

"وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ۱ سو اس کی عبادت کرو اور ثابت قدم رہو اس کی عبادت ۲ پر کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے ۳"

۱ رب السموات والارض وما بينهما مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے یا ربک سے بدل ہے۔ اور یہ اس کے نسیان کے امتناع کا بیان ہے۔

۲ عبادت کے حکم کا خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہو رہا ہے اور یہ سابقہ کلام پر مرتب ہے، یعنی جب آپ کو معلوم ہے کہ تیرے رب کریم کا تجھ پر فضل و احسان اور رحمت بے انتہا ہے اور اس کی یہ شان ہی نہیں کہ تجھے چھوڑ دے تو آپ اس نعمت و احسان پر بطور تشکر ہر دم اس کی عبادت میں مصروف رہیے اور اس عبادت پر دوام اختیار فرمائیے، آپ وحی کی تاخیر اور کفار کے استہزاء سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریۃ)

رنجیدہ خاطر نہ ہوا کریں۔ یہاں اصطبار کو لام کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ کلام کا تقاضا یہ تھا کہ علی کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا جاتا لیکن یہ انداز و اسلوب میں تبدیلی اس بات کا شعور دینے کے لئے ہے کہ عبادت میں لذت بھی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ(1) نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یا یہ معنی کہ تکالیف و مصائب اور کفار کی ایذا رسانیوں پر اپنے رب کی عبادت کی خاطر صبر کیجئے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر راسخ ہو جائیں اور خالصاً اللہ کے عبادت گزار ہو جائیں

سے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں سمیا کا معنی مثلاً کیا گیا ہے۔ یعنی آپ کوئی اس کی مثل جانتے ہیں جو عبادت کا مستحق ہو اور الٰہ کہلوانے کا حقدار ہو۔ کلبی فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ کیا آپ جانتے ہیں کوئی ایسا دوسرا جسے اللہ کہا جاتا ہو(2)' کیونکہ مشرکین بتوں کو الٰہ کہتے تھے لیکن کسی کو وہ اللہ نہیں کہتے تھے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ احدیت میں ظاہر ہے اور اس کی ذات مماثلت سے بلند و بالا ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے التباس اور مماثلت کو قبول نہیں کرتا۔ یہ ارشاد عبادت کے حکم کا ثبوت اور تقریر ہے کیونکہ جب اس کی کوئی مثل ہی نہیں ہے اور کوئی دوسرا عبادت کا مستحق بھی نہیں ہے تو ضروری ہے کہ اس کے حکم کو ہی تسلیم کیا جائے اور اس کی عبادت میں صبح و شام مشغول رہا جائے اور اس کی عبادت کی مشقتوں کو برداشت کیا جائے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَامِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾

''اور انسان (از راہ انکار) کہتا ہے ا کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا ۲''

ا انسان سے مراد کوئی فرد واحد نہیں بلکہ جنس انسان مراد ہے کیونکہ بعض کا قول جنس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا مخصوص انسان مراد ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں انسان سے مراد ابی بن خلف اُجمحی ہے وہ قیامت کا منکر تھا(3)۔ روایت ہے کہ اسے ایک بوسیدہ پرانی ہڈی ملی تو اس نے اسے پکڑ کر مشرکین سے کہا دیکھو محمد (ﷺ) کہتا ہے کہ اسے از سر نو زندہ کیا جائے گا اور ہمیں مرنے کے بعد پھر اٹھایا جائے گا اللہ تعالیٰ نے اس کی بات کو یہاں حکایت فرمایا۔

۲ کیا میرے مرنے کے بعد زمین سے یا موت کی حالت سے زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ یہاں ظرف کو مقدم کرنا اور اس پر حرف انکار کا داخل کرنا اس لئے ہے کہ منکر مطلقاً دوبارہ زندگی کا منکر نہیں تھا بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور حیات ملنے کا منکر تھا۔ ظرف اس فعل کے متعلق ہے جس پر اخرج دلالت کر رہا ہے۔ موجود اخرج فعل کے متعلق نہیں ہے کیونکہ لام کا مابعد ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اور سوف پر لام صرف تاکید کے لئے ہے' حال کے معنی سے خالی ہے۔ ابن ذکوان نے ایک ہمزہ مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ استفہام کو حذف کیا ہے اور مراد انکار کا معنی ہے، جبکہ باقی قراء نے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿۶۷﴾

''کیا یاد نہ رہا انسان کو کہ ہم نے ہی پیدا کیا اسے اس سے پہلے حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ا''

1۔ نافع' عاصم اور ابن عامر نے یذکر کو ذال کے سکون اور کاف کے ضمہ کے ساتھ تخفیف کے ساتھ ینصر کے وزن پر پڑھا ہے اور باقی قراء نے کاف کے فتحہ اور ذال متشدد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کی اصل یتذکر ہو گی' تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا

1۔ کنز العمال: 18912 (التراث الاسلامی)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، 206 (التجا...)   3۔ ...

تو یذکر ہو گیا۔ اس کا معنی سوچنا اور فکر کرنا ہے' اس کا عطف یقول پر ہے۔ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان ہمزہ استفہام کو ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ منکر بالذات معطوف ہے اور معطوف علیہ کا انکار اس سے پیدا ہوا ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہمزہ استفہام کو معطوف علیہ پر داخل کیا جاتا یعنی اگر یہ حضرت انسان اپنی عقل کو استعمال کرتا اور سوچ لیتا تو یہ ایسا نہ کہتا کیونکہ ہم نے اس کی اس وقت تخلیق کی تھی، جبکہ اس کا مادہ اور اصل بھی نہ تھا۔ حالانکہ محض عدم مادہ اور اصل کے نہ ہونے کی صورت میں بنانا زیادہ متعجب اور حیران کن ہے بنسبت بکھرے ہوئے اجزاء اور اعراض کو اکٹھا کرنے کے (جو ذات بغیر مادہ اور اصل کے ایک نئی چیز تخلیق کر سکتی ہے تو مادہ اور اصل' جوہر اور اعراض کے موجود ہونے کے وقت اسے مجتمع کیوں نہیں کر سکتی۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾

''سو (اے محبوب) تیرے رب کی قسم! ہم جمع کریں گے انہیں بھی اور شیطانوں کو بھی [1] پھر حاضر کریں گے ان سب کو جہنم کے ارد گرد کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے [2]''

[1] نبی کریم ﷺ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو آپ ﷺ کی طرف مضاف کر کے قسم اٹھائی، فرمایا تیرے رب کی قسم (حالانکہ وہ سب کا رب ہے' اس نسبت اور اضافت میں جو لطف اور مزہ ہے وہ صرف اہل ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں) فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ ان کا قیامت کا انکار کرنا جہنم کی طرف شیطانوں کے ساتھ حشر ہونے کا سبب تھا۔ الشیاطین مفعول معہ ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے واؤ معیت نہ ہو بلکہ واؤ عاطفہ ہو۔ تو اس صورت میں الشیاطین معطوف ہو کر مفعول بہ ہو گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہو گا (1)۔

[2] جثیا' ھم ضمیر منصوب سے حال ہے' ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جماعات فرمایا ہے اور یہ جثوۃ کی جمع ہے۔ الحسن اور الضحاک فرماتے ہیں یہ جاث کی جمع ہے۔ یعنی وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ سدی فرماتے ہیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے (2)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ سعادت مندوں اور بدبختوں تمام کو جہنم کے ارد گرد جمع فرمائے گا۔ سعادت مند جب دوزخ کو دیکھیں گے جس سے اللہ نے انہیں نجات عطا فرمائی تو زیادہ خوش ہوں گے اور بدبخت لوگ سعادت مندوں کو جنت کی طرف جاتا دیکھ کر زیادہ غمگین ہوں گے اور حسرت کا اظہار کریں گے۔ اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ سب کو جہنم کے پاس جمع فرمائے گا۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں' بیہقی نے عبداللہ بن ثابت سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں گویا جہنم سے دور الکرم میں گھٹنوں کے بل دیکھ رہا ہوں (3) پھر حدیث کے راوی سفیان نے یہ آیت پڑھی وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً۔ ابن حجر فرماتے ہیں الکرم سے مراد وہ بلند مقام ہے جہاں امت محمد ﷺ موجود ہو گی۔ ثم کا کلمہ دلیل ہے کہ حشر کے بعد جہنم کے گرد جمع ہونے میں اچھا خاصا وقفہ ہو گا کیونکہ فیصلہ ہونے سے پہلے لوگ ایک طویل زمانہ موقف میں محبوس ہوں گے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾

''پھر ہم (چن چن کر) الگ کر دیں گے ہر گروہ سے ان لوگوں کو [1] جو (خداوند) رحمٰن کے سخت نافرمان تھے [2]''

[1] من کل شیعۃ سے مراد ہر امت اور اہل دین ہیں۔ شیعۃ شاع یشیع شیعا و شیوعا و مشاعا شیعوعۃ و شیعانا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 504 (العلمیہ)

سے مشتق ہے اس کا معنی پھیلنا ہے۔ شیعۃ الرجل کسی انسان کے متبعین اور معاونین کو کہتے ہیں اور شیعہ علیحدہ فرقہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق واحد، تثنیہ جمع، مذکر اور مونث پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ قاموس میں بھی اسی طرح لکھا ہے میں کہتا ہوں شیعہ کا اطلاق انسان کے پیروکاروں اور مددگاروں پر اس لئے ہوتا ہے کہ شیوع اور انتشار (یعنی پھیلاؤ) تقویت کو مستلزم ہے۔ پیروکار اور مددگار پھیل جاتے ہیں اور متبوع (قائد) کی تحریک ان کی وجہ سے تقویت پکڑتی ہے۔ جوہری کہتے ہیں الشیاع کا معنی پھیلاؤ اور تقویت ہے کہا جاتا ہے شاع الحدیث یعنی بات زیادہ ہوگئی اور طاقتور ہوگئی۔ شاع القوم قوم زیادہ ہوگئی اور پھیل گئی۔ شَیَّعَتِ النَّارُ بِالْحَطَبِ آگ لکڑیوں کی وجہ بھڑک اٹھی۔ شیعہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن سے انسان تقویت حاصل کرتا ہے اور وہ پھیل جاتے ہیں۔ جب ہر امت کا علیحدہ دین ہے اور اپنے دین کے ساتھ وہ پھیل گئے اور ان کا معاملہ ان کی وجہ سے مضبوط ہوگیا تو اس لئے ان پر اس لفظ کا اطلاق کیا گیا۔

۲۔ ایھم اشد اصل میں ھو اشد تھا۔ عتیا۔ کا معنی تکبر کرنا اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جاتا ہے(1)۔ قاموس میں اسی طرح ہے یا اس کا معنی طاعت سے ہٹ جانا ہے امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جرأت کیا ہے اور مجاہد نے اس کا معنی فجور کیا ہے(2)۔ عتیا کا کلمہ اشد کی نسبت سے تمیز ہے اور ای کا کلمہ سیبویہ کے نزدیک لننزعن کے مفعول کے حیثیت سے منصوب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ای کا حق تو یہ تھا کہ دوسرے اسماء موصولہ کی طرح مبنی ہوتا کیونکہ اسماء موصولہ احتیاج میں حرف کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن یہاں ای معرب ہے۔ لزوم اضافت کی وجہ سے کل اور بعض پر محمول ہے اور جب اس کے صلہ کا صدر حذف ہوگیا تو اس میں نقص اور زیادہ ہوگیا پس یہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا یعنی معرب ہوگیا۔ اور خلیل نحوی کے نزدیک یہ مرفوع ہے یا تو اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اشد ہے اور یہ جملہ اس قول کو بیان کر رہا ہے (جو محذوف اسم موصول کا صلہ ہے جو اسم موصول لننزعن کا مفعول ہے اور ای یہاں اسم موصول نہیں بلکہ استفہامیہ ہے) اور تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لننزعن من کل شیعة الذین یقال فیھم ایھم اشد یا ایھم لننزعن سے معلق ہے۔ (لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ تعلیق افعال قلوب کے ساتھ خاص ہے جبکہ لننزعن افعال قلوب سے نہیں ہے) اس کے جواب میں بیضاوی فرماتے ہیں لننزعن میں تمیز کا معنی پایا جاتا ہے۔ (کیونکہ کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے نکالنا اس کے جدا کرنے اور ممتاز کرنے کا تقاضا کرتا ہے) اور یہ تمیز اور افراز علم کا سبب ہے (اس لئے تعلیق ہوسکتی ہے) یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور من بعضیہ ہے یا من زائدہ ہے اور لننزعن کا فعل من کے زائدہ ہونے کی صورت میں کل شیعة پر واقع ہے یا یہ معنی ہے لننزعن بعض کل شیعة۔

یا ایھم یشیع فعل کے فاعل کی حیثیت سے مرفوع ہے کیونکہ شیعة یشیع کے معنی میں ہے اور علی بیان کے لئے ہے(3) (یعنی جار مجرور فعل محذوف یا مصدر مبین کے متعلق ہے) یا اشد کے متعلق ہے۔ آئندہ آیت میں الباء کی بھی یہی ترکیب ہے۔ (گویا یوں سوال کیا گیا کہ انہوں نے کسی ذات پر سرکشی کی تو کہا گیا۔ عتوا علی الرحمن۔ کہ انہوں نے رحمٰن کی سرکشی کی) واللہ اعلم۔

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِیًّا ۝

”پھر ہم ہی خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ مستحق ہیں اس آگ میں تپائے جانے کے۔ ۱ “

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1716 (التراث العربی)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریۃ)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 74-573 (العلمیۃ)

لے آیت کا یا یہ معنی ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو آگ میں تپانے کے زیادہ مستحق ہیں یا یہ معنی کہ جن کا آگ میں تپایا جانا زیادہ بہتر ہے۔ ثم کا کلمہ یہاں تاخیر زمانی کے لئے نہیں بلکہ تراخی رتبہ کے لئے ہے۔ جس طرح ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں ثم تراخی رتبہ کے لئے ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام کنایہ ہے ثم لنعذبنھم سے یعنی پھر ہم انہیں ضرور عذاب دیں گے۔ اس تاویل میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ عذاب دینا دوزخ پر پیشی سے متاخر ہی ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں اعلم بمعنی العلیم ہے کیونکہ یہ علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ کراماً کاتبین اور دوسرے ملائکہ بھی جانتے ہیں کہ فاجر اور متقی کون ہیں سعادت مند اور بد بخت کون ہیں اور اللہ اس کو زیادہ جانتا ہے۔

حمزہ کسائی اور حفص نے جثیا' عتیا اور صلیا کو فاء کلمہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے اور جمہور علماء نے فاء کلمہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ان کے نزدیک اس کا اصل وزن فعول ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

کل شیعۃ اگر کفار اور نافرمان مسلمانوں تمام کو شامل ہو تو اشد کے ذکر میں اس بات پر تنبیہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نافرمانوں میں سے اکثر کو معاف فرما دے گا اور اگر کل شیعۃ صرف کفار سے ساتھ خاص ہو جیسا کہ سیاق کلام کا تقاضا ہے اور امام بغوی اور دوسرے اکثر مفسرین کی رائے ہے' تو اشد سے مراد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوں گے پہلے ان کو جدا کر کے دوزخ میں ڈالے گا پھر جو ان سے کم ہوں گے' یعنی ترتیب وار چن چن کر کافر سرکشوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ ہر طبقہ کے سرکشوں کو اس آگ میں ڈالا جائے گا جو ان کے لئے تیار کی گئی ہوگی۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ جب پہلے اور پچھلے سب جمع ہو جائیں گے حتیٰ کہ تعداد پوری ہو جائے گی۔ پہلے بڑے مجرموں کو چنا جائے گا اور پھر انہیں آگ میں ڈالا جائیگا پھر جو ان سے کم درجہء کفر پر ہوں گے انہیں ڈالا جائے گا (اسی ترتیب سے سلسلہ جاری رہے گا) پھر حضرت عبداللہ بن مسعود نے فوربک لنحشرنھم الایۃ تلاوت فرمائی۔ ہناد نے ابی الاحوص سے اسی طرح کا قول نقل فرمایا ہے یبدء ا لا کابر فالا کابر جرماً(1)۔

وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۟

''اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا لے یہ آپ کے رب پر لازم ہے (اور اس کا) فیصلہ ہو چکا ہے ۲ے''

لے ان نافیہ ہے اور منکم واحد محذوف کی صفت ہے۔ وار دھا میں ھا ضمیر کا مرجع جہنم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قسم مضمر ہے اصل میں واللہ ما منکم الا واردھا ہے اور اس تاویل کی دلیل الا تحلۃ القسم کے الفاظ ہیں جو احادیث میں وارد ہیں۔ (حدیث شریف اس طرح ہے لَا يَمُوْتُ لِاَحَدِكُمْ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ اِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ)

۲ے الحتم مصدر ہے حتم الامر کا جس کا معنی واجب ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اس کو واجب کر لیا ہے اور اس کا فیصلہ فرما دیا ہے اور اس نے ایسا وعدہ فرمایا ہے جس کا خلف ممکن نہیں ہے۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۟

''پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 504 (العلمیہ)

گے۔ ل‘‘

ل ننجی ،کا عطف سابق کلام کے مضمون پر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی نورد کم جمیعاً فی جھنم ثم ننجی۔ یعنی ہم تم تمام کو جہنم میں داخل کریں گے پھر متقین کو نکال لیں گے۔ کسائی نے ننجی کو باب افعال سے تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی جو لوگ شرک سے بچتے رہے انہیں جنت کی طرف لے جایا جائے گا بغیر کسی عذاب کے یا نافرمانیوں کا عذاب جھیلنے کے بعد۔ لیکن کافروں کو دوزخ میں گھٹنوں پر رہنے دیا جائے گا۔ جثیا کا معنی بعض علماء نے جمیعاً اور بعض نے گھٹنوں کے بل کیا ہے اور ورود سے مراد دخول ہے اگر چہ وہ دخول پل صراط کے اوپر سے گزرنے کے ساتھ ہو۔ پل صراط جہنم کے اوپر ہے' کچھ بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ ورود سے مراد دخول نہیں ہے کیونکہ جو ایک مرتبہ دوزخ میں داخل ہوگا وہ کبھی باہر نہیں نکلے گا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن جہنم میں کبھی داخل نہ ہوگا کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤىۙ اُولٰٓىٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَۙ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَاۚ ۔ (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے۔) بلکہ یہاں ورود سے مراد حاضر ہونا اور دیکھنا ہے کیونکہ سب لوگ حساب کی جگہ جمع ہوں گے اور وہ جگہ جہنم کے قریب ہوگی۔ اور اسی حساب کی جگہ سے متقین کو جنت کی طرف جانے کا حکم ہوگا اور ظالموں کو دوزخ کی طرف جانے کا آرڈر ہوگا اور ورود کا معنی قریب ہونا۔ قرآن میں اور جگہ بھی استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ۔ موسیٰ علیہ السلام پانی کے قریب تھے، اندر داخل نہیں ہوئے تھے لیکن پھر بھی ان کے لئے ورود کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ورود بمعنی حضور اور رؤیت کی تائید وہ حدیث طیبہ بھی کرتی ہے جو احمد' ابویعلی اور طبرانی نے ایک ایسی سند سے روایت کی ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے' حضرت معاذ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص خوشی سے' کسی حاکم کے حکم سے نہیں' مجاہدین کی نگہبانی کرتا ہے، وہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا مگر قسم پوری کرنے کے لئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا)

ہم اہلسنت و جماعت کہتے ہیں کہ ورود کا حضور' قریب اور رؤیت کے معنی میں استعمال جائز ہے لیکن ضرورت کے وقت، جبکہ یہاں اصل معنی دخول کو چھوڑ کر ان معانی میں استعمال کرنے کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ بدعتیوں کی تاویل کا قرآنی ارشاد ثم ننجی الذین اتقوا الخ بھی تردید کرتا ہے کیونکہ مومنین کا نکالنا اور ظالموں کو اس میں رہنے دینا دخول کے بعد ہو سکتا ہے اور حدیث میں عدم دخول پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ حدیث قسم پوری کرنے کی مقدار رؤیت کو ثابت کرتی ہے۔ دخول کی نفی نہیں کرتی' باقی رہا اُولٰٓىٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ داخل ہونے کے بعد وہ دوزخ سے دور کئے جائیں گے اور دور ہونے کی وجہ سے اس کی آواز کو نہ سنیں گے اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ وہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت بھی اس کی آہٹ کو نہیں سنیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والی بنادے گا۔

ہناد' طبرانی اور بیہقی نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو عرض کریں گے اے ہمارے رب کیا تو نے ہم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم آگ پر وارد ہوں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کیوں نہیں لیکن تم اس میں سے گزرے، ہو جبکہ وہ بجھ چکی تھی۔

ابن عدی اور طبرانی نے یعلی بن امیہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز آگ مومن سے کہے گی اے مومن (جلدی سے) گزر جا تیرے نور نے تو میرے شعلوں کو بھسم کر دیا ہے۔ ورود بمعنی دخول (اگر چہ علی سبیل المرور بھی ہو) کی ہماری ایک دلیل امام احمد، حاکم، بیہقی کی حدیث ہے جو انہوں نے ابی سمیہ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں ہم ورود کے معنی میں جھگڑ رہے تھے، بعض کہتے کہ مومن دوزخ میں داخل نہ ہوگا، بعض کہتے کہ سب لوگ داخل ہوں گے پھر متقین کو نکال لیا جائے گا۔ میں جابر بن عبد اللہ سے ملا، یہ اختلاف ان کے سامنے بیان کیا تو آپ نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میرے یہ کان بہرے ہو جائیں گے اگر میں نے حضور ﷺ سے یہ بات نہ سنی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا سب نیک بد دوزخ میں داخل ہوں گے لیکن آگ مومن پر ٹھنڈی اور بے ضرر ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی حتیٰ کہ آگ مومنین کی ٹھنڈک کی وجہ سے شور مچائے گی الٰہی ان لوگوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے میری تمازت ختم ہو رہی ہے پھر اللہ تعالیٰ متقین کو وہاں سے نکال لے گا اور کافر وہاں گھٹنوں کے بل پڑے رہیں گے (1)۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ نافع بن الازرق نے ابن عباس سے ورود کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ابن عباس نے ورود کا معنی دخول کیا اور نافع نے کہا ورود کا معنی دخول نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت میں سب کے دخول کا ذکر نہیں ہے پھر فرمایا اے نافع، ہم سب اس آگ پر وارد ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس آگ سے نکال لے گا اور میرا خیال ہے کہ تجھے نہیں نکالے گا کیونکہ تو اس کو جھٹلاتا ہے (2)۔ سعید بن منصور، عبد الرزاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ۔ پھر فرمایا کیا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ میں اور تم سب داخل ہوں گے پھر میں دیکھوں گا کہ تو نکلتا ہے یا نہیں۔

العوفی کے طریق سے ابن عباس سے مروی ہے کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے مراد یہ ہے کہ فاسق و فاجر سب داخل ہوں گے۔ کیا تم نے یہ ارشاد الٰہی سماعت نہیں فرمایا۔ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ اسی طرح ارشاد ہے۔ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا (اور اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح)(3)۔ حاکم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ آپ سے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وان منکم الا داخلها۔ یعنی ورود کا معنی دخول ہے۔ بیہقی نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا لا یبقیٰ احد الا دخلها۔ یعنی ہر شخص آگ میں داخل ہوگا۔ سابقہ آیات اور صحابہ اور مفسر تابعین کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ ورود بمعنی دخول ہے۔ امام احمد، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے اس ارشاد وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے متعلق روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے پھر وہ اپنے اعمال کے مطابق اس سے گزریں گے۔ پہلا طبقہ بجلی کی چمک کی طرح تیزی سے گزر جائیگا، دوسرا ہوا کی طرح، تیسرا گھوڑے کی تیز رفتاری سے، چوتھا اونٹ کی رفتار سے اور اس کے بعد والا تیز پیدل چلنے والے شخص کی تیزی سے گزر جائیگا۔(4)

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العلمیۃ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریۃ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العلمیۃ)

4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 494 (قدیمی)

ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے اور ان کا ورود آگ کے اردگرد قیام ہے پھر وہ پل صراط سے اپنے اعمال کے مطابق تیزی سے گزریں گے، بعض بجلی کی مانند، بعض ہوا کی مانند، بعض پرندے کی مانند، بعض تیز گھوڑے کی مانند، بعض تیز اونٹ کی مانند، بعض تیز چلنے والے شخص کی مانند گزریں گے۔ حتیٰ کہ آخری شخص جو گزرے گا اسکا نور اسکی قدموں کے انگوٹھوں کی جگہ تک ہوگا اور وہ پل صراط سے ڈگمگا کر گزرے گا۔ امام بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں وہ قسم پوری کرنے کی مقدار دوزخ میں داخل ہوگا (1) پھر راوی حدیث حضرت سفیان نے بطور دلیل قرآن کا یہ ارشاد پڑھا وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔

طبرانی نے عبد بن بشیر الانصاری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں جو ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے تو وہ شخص راہ گیر کی طرح دوزخ پر وارد ہوگا، یعنی پل صراط سے مسافر آدمی کی طرح گزر جائیگا ٹھہرے گا نہیں۔

ابن جریر نے غنیم بن قیس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں لوگوں نے آگ پر وارد ہونے کا ذکر کیا تو حضرت کعب نے فرمایا آگ تمام لوگوں کو روک لے گی حتیٰ کہ سب فاسق و فاجر کے قدم اس پر برابر ٹک جائیں گے پھر ایک ندا کرنے والا ندا دے گا (اے آگ) اپنے ساتھیوں کو روکے رکھ اور میرے ساتھیوں کو چھوڑ دے، ہر دوزخ کا دوست اس میں دھنس جائے گا اور دوزخ اپنے ساتھیوں کو اس طرح پہچانتی ہوگی جیسے مرد اپنے بچے کو پہچانتا ہے۔ مومنین اپنے تر کپڑوں کے ساتھ نکل آئیں گے۔ (یعنی مومنین کو آگ کی اتنی تپش بھی نہیں لگے گی کہ ان کے کپڑے خشک ہو جائیں)

امام سیوطی فرماتے ہیں بعض علماء اہلسنت نے ورود کی تفسیر دخول سے کی ہے اور اس آیت کے متعلق مروی اقوال میں سے ایک یہ قول بھی ہے۔ اسی کو علامہ قرطبی نے ترجیح دی ہے اور حضرت جابر کی حدیث مذکور سے استشہاد کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد پل صراط سے گزرنا لیا ہے۔ امام نووی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور انہوں نے ابن مسعود کی روایت کو ترجیح دی ہے جس میں صراط پر گزرنے کا ذکر ہے۔ اسی طرح حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کیا ہے۔

میں کہتا ہوں جب پل صراط جہنم کے اوپر ہے تو اس سے گزرنا دخول کو لازم ہے، دخول آگ میں یقینی وقوع کا تقاضا نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں ورود سے مراد دخول ہے اگر چہ بطریق مرور (گزرنا) ہو کیونکہ اس مفہوم کے اعتبار سے تمام احادیث کا معنی جمع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت حسن کا قول ہے کہ ورود کا معنی داخل ہوئے بغیر اس کے اوپر سے گزرنا ہے جیسا کہ بیہقی نے ان سے نقل کیا ہے تو میں اس کے جواب میں، میں کہوں گا کہ حضرت حسن کے قول میں دخول بمعنی وقوع اور دوزخ میں ٹھہرنا ہے۔ مطلق دخول مراد نہیں ہے۔

حضرت ہناد نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ جو افراد جنگ بدر اور یا حدیبیہ میں شریک ہوئے ان میں سے کوئی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا الخ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے یہ ارشاد نہیں سنا ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا (2)۔ اس

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 330 (قدیمی)
2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2242 (ابن حزم)

میں عدم دخول سے مراد عدم وقوع اور عدم استقرار ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم نے یہ نہیں سنا ثم ننجی الذین الخ۔ یہ جواب صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ عدم دخول سے مراد عدم استقرار ہے جو نجات کا مفاد ہے، امام سیوطی فرماتے ہیں۔ اکثر سلف صالحین ورود کی تحقیق اور صدور کے احتمال سے ڈرتے تھے (یعنی دوزخ میں ورود (دخول) تو یقینی ہے لیکن نکلنا محتمل ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔)

ہناد اور احمد نے الزہد میں، سعید بن منصور، حاکم اور بیہقی نے حضرت حازم بن ابی حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے۔ بیوی نے پوچھا میرے سرتاج کیوں رو رہے ہو۔ فرمایا مجھے یہ تو خبر دی گئی ہے کہ میں نے آگ پر وارد ہونا ہے لیکن مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ میں نے وہاں سے نکلنا بھی ہے؟

ہناد اور بیہقی نے ابو اسحٰق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ابو میسرہ عمرو بن شرحبیل اپنے بستر کی طرف اٹھے اور فرمایا کاش میری ماں نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا۔ ان کی بیوی نے کہا کیوں؟ فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آگ پر وارد ہونے کی خبر دی ہے لیکن یہ خبر نہیں دی کہ ہم اس سے نکلنے والے بھی ہیں(1)۔

احمد نے الزہد میں حضرت الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنے بھائی سے کہا کیا تیرے پاس یہ خبر پہنچی ہے کہ تو آگ پر وارد ہوگا۔ بھائی نے کہا ہاں۔ پھر پہلے بھائی نے پوچھا کیا تیرے پاس یہ خبر بھی آئی ہے کہ تو اس سے نکل بھی آئیگا۔ دوسرے بھائی نے کہا نہیں۔ پہلے بھائی نے کہا پھر تو ہنستا کس لئے ہے، اس کے بعد اس شخص کو مرتے وقت تک ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا(2)۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا۝

"اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں وضاحت سے ۱؎ تو کافر کہتے ہیں ایمان والوں سے ۲؎ کہ (یہ تو بتاؤ) ہم دونوں گروہوں میں سے کس کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کس کی نشست گاہ خوبصورت ہے۔ ۳؎"

۱؎ علیہم کا مرجع کفار ہیں یہ جملہ فخلف من بعدھم پر یا یقول الانسان پر معطوف ہے۔ آیات بینات کا مفہوم یہ ہے کہ یہ آیات خود بخود واضح ہیں یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بیان اور تفسیر کی وجہ سے اپنے معانی پر واضح دلالت کرتی ہیں یا یہ معنی کہ اپنے اعجاز کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر واضح دلالت کرتی ہیں۔

۲؎ الذین کفروا سے مراد نضر بن حارث اور اس جیسے ہٹ دھرم دوسرے قریش ہیں، یعنی کفار کو آیت قرآنی کے ذریعے جب دعوت حق دی جاتی تو وہ غریب و نادار مسلمانوں سے کہتے، ذرا دیکھو تو سہی مومنین اور کافروں میں سے کن کی بود و باش اچھی ہے اور محفل کن کی پر رونق ہیں، غریب مسلمان سخت زندگی بسر کرتے تھے۔ کپڑے بھی پھٹے پرانے پہنتے تھے، جبکہ مشرکین اپنے بالوں کو کنگھی کرتے، سر پر تیل لگاتے اور بہتر کپڑے پہنتے تھے تو وہ اس عیش و طرب کی زندگی پر فخر کرتے ہوئے مومنین سے یہ سوال کرتے تھے۔

۳؎ ابن کثیر نے مقاما کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ ظرف ہے یا باب افعال سے مصدر ہے اور باقی قراء نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ قیام سے ظرف ہے۔ ندیا کا معنی محفل اور مجمع ہے۔ جب کفار نے واضح آیات سنیں اور پھر ان کا

1 تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2240 (ص۔ع۔م) 2 ایضاً، صفحہ 240-41

جواب دینے اور چیلنج قبول کرنے سے عاجز آگئے تو انہوں نے دنیا کی عیش وعشرت کو باعث افتخار قرار دیا اور کہتے کہ ہمارے پاس جو آرام وآرائش اور دولت وثروت ہے یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی ہماری فضیلت ہے اور ہمارے لئے اس کی بارگاہ میں عمدہ ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی ان ڈینگوں کا رد کرتے ہوئے ذیل کا یہ ارشاد نازل فرمایا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿٧٤﴾

''اور (ان احمقوں نے یہ نہ سوچا) کہ کتنی قومیں ان سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا وہ ساز وسامان اور ظاہری سج دھج میں (ان سے) بہتر تھیں۔[1]''

[1] کم خبر یہ ہے اور اھلکنا کا مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے من قرن' کم کی تمیز ہے۔ ہر زمانہ کے لوگوں کو قرن کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمانہ میں باہم ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ علامہ بغوی نے اثاثا کا معنی ساز وسامان اور اموال کیا ہے۔ مقاتل نے کپڑے اور لباس کیا ہے(1)۔ قاموس میں اثاث کا معنی متاع البیت گھر کا سامان لکھا ہے اور فرمایا اس صورت میں یہ بغیر واحد کے ہوگا اور اس کا معنی مال ہو تو پھر یہ جمع ہوگا اور اس کا واحد اثاثہ ہوگا(2)۔ اثاثا اور رئیا دونوں احسن کی نسبت سے تمیز ہیں اور ضمیر کا مرجع قرن ہے یعنی ان لوگوں کا مال ومتاع ظاہری سج دھج بہتر تھی۔ رئیا کو قالون اور ابن ذکوان نے یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ ہمزہ یاء سے بدلا گیا پھر یاء کو یاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ یا یہ ری سے مشتق ہے۔ جو عطش (پیاس) کی ضد ہے اور اس کا معنی نعمت سے سیر ہونا ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس صورت میں اس کا معنی خوش منظر ہے۔ حمزہ نے ھمزہ کے ابدال کے ساتھ وقف کیا ہے اور قالون کی موافقت کی ہے۔ ھم احسن کا جملہ قرن کی صفت ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰى إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ۖ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾

''آپ فرمائیے جو گمراہی میں (مگن) ہو تو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اسے رحمٰن لمبی ڈھیل[1]۔ یہاں تک کہ جب دیکھیں گے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے یعنی عذاب یا قیامت تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کون مکان کے لحاظ سے برا اور لشکر کے اعتبار سے کمزور ہے۔[2]''

[1] فلیمدد امر کا صیغہ ہے لیکن بمعنی خبر ہے۔ نیز امر کا صیغہ وارد کرنے میں اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ مہلت ایسی چیز ہے جو رحمٰن کو عطا کرنی چاہئے تاکہ کافروں کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ۔ (کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا)

اما العذاب اور اسکا معطوف' ما یوعدون سے بدل ہیں اور اجمال کی تفصیل ہیں عذاب سے مراد دنیا میں قیدی ہونا اور قتل ہونا ہے اور الساعة سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ یہ فلیمدد کی غایت ہے یاقال الذین کفرو اللذین امنوا ای الفریقین الخ کی غایت ہے۔

[2] قیامت کے روز جب عذاب الٰہی کو دیکھیں گے یا دنیا میں قتل اور قید کو دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ کون مکان کے لحاظ برا ہے اور کون لشکر کے لحاظ سے کمزور ہے۔ شیاطین کافروں کے لشکر ہیں اور مومنین کے معاون ولشکر فرشتے ہیں۔ فسیعلمون کا جملہ جواب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (التجاریۃ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 263 (التراث العربی)

شرط ہے اور یہ کلام مشرکین کے قول کا رد ہے جو انہوں نے کہا تھا۔ اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَ اَحْسَنُ نَدِیًّا۔ اللہ تعالیٰ نے خیر مقاما کے مقابلہ میں شر مکاناً اور احسن ندیا کے مقابلہ میں اضعف جندا فرما کر ان کا رد فرما دیا۔ مجلس کا حسن اور رونق لوگوں کے اجتماع سے ہوتی ہے اور ان کی شان و شوکت کے اظہار سے ہوتی ہے لیکن جب معاونین کم ہوں گے تو رونق و محبت بھی کم ہوگی۔

وَ یَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

''اور زیادہ کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں (کے نور) ہدایت کو[1] اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے اور انہیں کا انجام اچھا ہے۔[2]''

[1] یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے ایمان میں تقویت اور اضافہ فرماتا ہے اور انہیں ان کے مقاصد عالیہ تک پہنچا دیتا ہے اور ان نفوس قدسیہ کا مطمح نظر (مال و جاہ کا حصول نہیں) بلکہ قرب الٰہی ہوتا ہے۔ اس جملہ کا عطف قل کے بعد والے جملہ شرطیہ من کان فی الضلالۃ الخ کے مضمون پر ہے۔ یعنی کافروں کو ڈھیل دینا اور دنیا کے سامان عیش و طرب سے انہیں لطف اندوز کرنا اللہ کی بارگاہ میں ان کی فضیلت کی وجہ سے نہیں ہے اور مومنین کے پاس دنیا کا مال و متاع کم ہونا اللہ کی بارگاہ میں ان کے مرتبہ کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کا مال کم عطاء فرمایا تا کہ ان کے ثواب میں اضافہ کرے ان کے درجات کو بلند فرمائے اور انہیں اپنے قرب کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز فرمائے۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس جملہ کا عطف فلیمدد پر ہے کیونکہ وہ خبر کے معنی میں ہے۔ تقدیر عبارت گویا اس طرح ہوگی جو گمراہ ہوتا ہے اللہ اس کی گمراہی میں اضافہ فرماتا ہے اور جن سے وہ گمراہ دشمنی رکھتا ہے (یعنی مومنین) ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے۔

[2] الباقیات الصالحات سے مراد اذکار اور اعمال صالحہ ہیں جن کا فائدہ ہمیشہ نیکوکار کو ملتا رہتا ہے۔ فرمایا یہ فائدہ بہتر ہے اس دنیوی مال و متاع سے جس سے کافر متمتع ہوتے ہیں اور فخر سے پھولے نہیں سماتے اور انجام کے اعتبار سے بھی نیک اعمال بہتر ہیں۔ یہاں خیر کا لفظ صرف زیادتی کے معنی میں ہے یہ عربوں کے اس قول کے مطابق ہے۔ الصیف احر من الشتاء یعنی گرمیوں میں گرمی سردیوں میں سردی کی نسبت زیادہ ہے۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت خباب بن الارت سے روایت فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں میں لوہاروں کا کام کیا کرتا تھا۔ عاص بن وائل کے ذمہ میری کچھ رقم تھی میں اس سے مانگنے کے لئے گیا تو اس نے کہا بخدا میں یہ رقم اس وقت ادا کروں گا جب تو محمد (ﷺ) کی نبوت کا انکار کرے گا۔ میں نے کہا بخدا میں ان کی نبوت کا انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو مر جائے پھر تجھے قیامت کے روز اٹھایا جائے۔ اس نے کہا مرنے کے بعد میں قبر سے اٹھایا جاؤں گا۔ میں نے کہا ہاں (تجھے اٹھایا جائے گا) وہ گستاخ کہنے لگا اس وقت میرے پاس مال اور اولاد کی فراوانی ہوگی، میں وہاں تیرا قرض ادا کروں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی(1)۔

اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾

''کیا آپ نے دیکھا اس کو جس نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور کہنے لگا کہ مجھے ضرور ضرور دیا جائے گا مال اور اولاد۔[1]''

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 36 (دار المعرفت بیروت)

۱؎ چونکہ رویت (دیکھنا) کسی خبر کے لئے قوی ترین ذریعہ ہے اس لئے ارایت کو اخبرنی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے یا مخاطب غیر معین ہے۔ رایت کا کلمہ فاء کے ساتھ ذکر فرمایا ہے یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اوقع نظرک فرایت۔ الذی کفر سے مراد العاص بن وائل ہے۔ قال کا عطف کفر پر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ولداً کو واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے عرب عرب، عجم عجم۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو جمع ہے اور دونوں فتحہ کے ساتھ ہوں تو مفرد ہے۔ جیسے اسد اور اسد۔

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾

''(اس لاف زنی کی وجہ کیا ہے) کیا وہ آگاہ ہو گیا ہے غیب پر ۱؎ یا لے لیا ہے اس نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ ۲؎''

۱؎ یہ جملہ بتاویل مفرد ہو کر ارایت کا مفعول ثانی ہے اطلعه یہاں اطلع الجبل کے قبیل سے ہے جس کا معنی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جانا ہے یعنی کیا یہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ غیب پر مطلع ہو گیا ہے۔ ہمزہ استفہام ذکر کیا گیا ہے اور باب افتعال کے ہمزہ وصلی کو حذف کیا گیا ہے (یعنی اطلع سے پہلے ہمزہ مفتوحہ ہمزہ استفہام ہے) ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے لوح محفوظ کو دیکھ لیا ہے، مجاہد فرماتے ہیں کیا اس نے علم غیب جان لیا ہے(1) کہ وہ آخرت میں مال اور اولاد ملنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

۲؎ یا اس نے خداوند رحمٰن سے کوئی عہد لیا ہے۔ یعنی کیا اس نے لا اله الا الله کہا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں کوئی اس نے نیک عمل کیا ہے۔ کلبی کہتے ہیں کیا اللہ سے اس نے عہد لیا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا(2)۔

كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾

''ہرگز ایسا نہیں۔ ہم لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہا ہے ۱؎ اور لمبا کر دیں گے اس کے عذاب کو خوب لمبا کرنا ۲؎''

۱؎ سنکتب کا معنی ہم محفوظ کر لیں گے یا ہم اس کی بات کو ظاہر کریں گے کہ ہم نے اس کی بات کو لکھا ہوا ہے یا یہ معنی کہ ہم نے جو اس کا قول لکھا ہے اس سے اس کا انتقام لیں گے۔ یہ تاویلات کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نفس کتابت، قول (بات) سے متاخر نہیں ہوتا (بلکہ جونہی وہ منہ سے بات کرتا ہے لکھ لی جاتی ہے) کیونکہ ارشاد ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۔ (سین جو مستقبل میں کسی کام کے کرنے پر دلالت کرتا ہے اس کو نکتب پر داخل کرنے کی پہلی وجہ بیان فرمائی کہ سین صرف کتابت کے ظہور اور اس کی وضاحت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا معنی کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ یہاں مجازی معنی کا استعمال ہوا ہے۔ سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے۔)
انسان کے اعمال کراماً کاتبین لکھتے ہیں یہاں لکھنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے حکم سے لکھتے ہیں۔

۲؎ کفر کی وجہ سے جس عذاب کا مستحق تھا اب اس بکواس کی وجہ سے ہم اس کے عذاب میں مزید اضافہ کر دیں گے۔

وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

''اور ہم ہی وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے (یعنی اس کے مال و اولاد کے) اور وہ ہمارے پاس تنہا آئے گا ۱؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (التجاریۃ)   2۔ ایضاً

لے یعنی ہم اس گستاخ کو ہلاک کر دیں گے اور اس کی جھوٹی ملکیت کو باطل کر دیں گے اور قیامت کے دن جب زنجیروں میں جکڑا ہوا ہمارے پاس آئے گا تو اس کے پاس نہ مال ہوگا، نہ اس کے ساتھ اولاد ہوگی' تن تنہا ہوگا' چہ جائیکہ اسے وہاں مزید ملے گا سنکتب اپنے معطوف سے مل کر علت ہے اس زجر و توبیخ کی جو کلا سے مستفاد ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾

''اور انہوں نے بنا لئے ہیں اللہ کے سوا اور خدا کہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں۔ لے''

1۔ یعنی کفار قریش نے بتوں کو خدا بنا رکھا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے مددگار بنیں وہ ان کو وسیلہ اور شفیع سمجھتے تھے۔

كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

''ہرگز نہیں وہ جھوٹے خدا انکار کر دیں گے ان کی عبادت کا لے اور وہ (الٹے) ان کے دشمن ہو جائیں گے ۲ے''

1۔ کلا ان کی بات کو رد کرنے کے لئے آیا ہے کہ وہ قیامت کے روز ان کی کچھ معاونت نہ کریں گے، وہ بت اس مشکل گھڑی میں ان مشرکوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان سے براءت کریں گے اور کہیں گے تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۡ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ۔ (ہم (ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے) یا یہ مطلب کہ کفار بتوں کی عبادت سے بالکل مکر جائیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے نہ تھے ہم شرک کرنے والے)

۲ے وہ بت کفار کی ذلت اور رسوائی کا باعث بنیں گے کیونکہ ذلت و رسوائی' عزت کی ضد ہے، اس لئے یہاں عزاً کے مقابلہ میں ضدا آیا ہے اس لئے یہاں اس کا معنی ذلت و رسوائی ہوگا۔ یہ تاویل پہلی تاویل کی تائید کرتی ہے یا یہ معنی کہ وہ بت ان کے مخالف ہو جائیں، یعنی وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی تکذیب کریں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے یا کفار کو عذاب دلانے میں مددگار بنیں گے اس طرح کہ پتھر کے بنے ہوئے بتوں کو آگ میں ڈال کر بھڑکایا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یکونون میں ضمیر کفار کے لئے ہو اور علیھم کی ضمیر بتوں کے لئے ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ کفار اپنے بتوں کے منکر ہو جائیں گے اور دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہنے کے بعد قیامت کے روز ان کی عبادت سے انکاری ہو جائیں گے۔

ضد کے لفظ کا واحد ہونا معنی کی وحدت کی وجہ سے ہے، یعنی وہ مخالفت میں ایک چیز ہوں گے۔ جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا وَهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ۔ وہ مخالف کے سامنے ایک ہاتھ ہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ قاموس میں ہے کہ ضد جمع بھی استعمال ہوتا ہے(1)۔ جیسے اس ارشاد میں ہے ویکونون علیھم ضداً۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم نے مسلط کر دیا ہے' شیطانوں کو کفار پر لے وہ انہیں (اسلام کے خلاف) ہر وقت اکساتے رہتے ہیں ۲ے''

لے استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کافروں پر شیطانوں کو مسلط کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 430 (التراث العربی)

ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔ (اور جو شخص (دانستہ) اندھا بنتا ہے رحمٰن کے ذکر سے تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لئے ایک شیطان پس وہ ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے) امام بغوی فرماتے ہیں اس ارشاد سے اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ (اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے یا یہ معنی کہ ہم نے کافروں اور شیطانوں کو آزاد کر دیا ہے کہ وہ آپس میں یارانہ گانٹھیں۔ اس صورت میں یہ ارسلت البعیر سے مشتق ہوگا جس کا معنی ہے میں نے اونٹ کو آزاد کر دیا۔

۲ وہ شیطان انہیں گناہوں پر اور جھوٹی امیدیں دلا کر بدکاریوں پر اکساتے رہتے ہیں اور نفسانی خواہشات کی پیروی پر برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ الاز اور الھز کا معنی حرکت دینا ہے۔ توء زھم ازاً پورا جملہ الشیاطین سے حال ہے۔ اس کلام میں حضور نبی کریم ﷺ کو تعجب دلانا ہے کہ دیکھو آیات بینات کے ذریعے حق کے واضح ہونے کے بعد بھی یہ بدبخت کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور گمراہی کی عمیق وادی میں سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں اور کیسی گستاخانہ باتیں کرتے ہیں۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾

''پس عجلت نہ کیجئے ان پر (نزول عذاب کے لئے) ہم گن رہے ہیں ان کے ایام زندگی کو اچھی طرح ۱؎ ''

۱؎ ان پر آپ نزول عذاب کی بددعا کرنے میں جلدی نہ فرمائیں۔ ہم نے جو ان کی عمر متعین کی ہے اس کو ہم شمار کر رہے ہیں ایک ایک دن شمار ہو رہا ہے۔ ان کی زندگی کے ایام محدود ہیں (جونہی وقت مقرر آ جائے گا تو اپنے انجام بد کو پہنچ جائیں گے) فلا تعجل پر فاء سببیہ ہے اور انما نعدلھم کا جملہ معللہ ہے یا جملہ مستانفہ ہے اور جملہ الم تر انا ارسلنا الخ واتخذوا من دونہ الھۃ کی تائید اور تقریر ہے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾

''وہ دن جب ہم اکٹھا کریں گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کے حضور میں (معزز و مکرم مہمان بنا کر) ۱؎ ''

۱؎ یوم نحشر المتقین اپنے معطوفات سے مل کر فعل محذوف نفعل بالفریقین ما نفعل کی ظرف ہے یا اذکر کی وجہ سے منصوب ہے یا لا یملکون کے متعلق ہے۔ الی الرحمن سے مراد اللہ تعالیٰ کے عزت و کرامت عطاء کرنے اور اس کی تجلیات کا عکس پڑنے کی جگہ ہے۔ وفداً متقین سے حال ہے اور یہ وافد کی جمع ہے، یعنی جس طرح وفد بادشاہوں کے پاس پوری سج دھج کے ساتھ جاتے ہیں اور بادشاہوں سے عزت و کرامت کے منتظر ہوتے ہیں۔

حاکم، بیہقی اور عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور پھر فرمایا قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر نہیں جائیں گے اور نہ انہیں ہانک کر لے جایا جائے گا بلکہ جنت سے ایسی اونٹنیوں کے ذریعے ان کو لایا جائے گا جن کی مثل مخلوق نے پہلے نہ دیکھی ہوں گی۔ ان اونٹنیوں پر کجاوے سونے کے ہوں گے اور ان کی مہاریں زبرجد کی ہونگی، وہ تقویٰ کے پیکر ان پر سوار ہو کر آئیں گے اور جنت کے دروازے کھٹکھٹائیں گے (1)۔ امام بغوی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر چل کر نہیں آئیں گے بلکہ ایسی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 508 (العلمیۃ)

اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں گے جن کے کجاوے سونے کے ہوں گے اور ان کی سواریوں کی زینیں یواقیت کی ہوں گی۔ متقین انہیں چلانے کا ارادہ کریں گے تو وہ چل پڑیں گی، وہ ٹھہرانے کا ارادہ کریں گے تو ٹھہر جائیں گی(1)۔ امام بیہقی نے طلحہ بن ابی طلحہ عن ابن عباس کے طریق سے اس آیت یوم نحشر الخ کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم متقین کو رحمٰن کے حضور میں سوار کر کے اکٹھا کریں گے(2) اور (ونسوق المجرمین الخ) کا یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ ہم مجرموں کو پیاسا ہانک کر لے جائیں گے۔

ابن جریر نے ابی طلحہ عن ابی ھریرہ کے طریق سے وفداً کا یہ معنی نقل کیا ہے کہ ہم انہیں اونٹنیوں پر سوار کر کے لائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے عمر بن قیس الملائی سے روایت کیا ہے کہ مومن جب قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل ایک خوبصورت شکل اور انتہائی خوشبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ مومن سے پوچھے گا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ مومن کہے گا نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تیری خوشبو بڑی پاکیزہ ہے اور تیری شکل بڑی دلکش ہے۔ وہ کہے گا میں تیرا عمل صالح ہوں۔ دنیا میں میں تجھ پر سوار رہا، آج تو مجھ پر سوار ہو جا۔ پھر یہ آیت یوم نحشر المتقین الی الرحمن وفداً تلاوت فرمائی۔ اور جب کافر قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل انتہائی قبیح شکل میں اور انتہائی بری بدبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ کافر سے پوچھے گا تو مجھے جانتا ہے۔ وہ کہے گا نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ تیری صورت بڑی بھدی اور بدشکل ہے اور بدبو بڑی گندی ہے، وہ کہے گا اسی طرح بات ہے، میں تیرا برا عمل ہوں دنیا میں تو مجھ پر سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہونگا۔ اور پھر یہ آیت وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ تلاوت فرمائی۔

وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾

''اور اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح [1]''

[1] علامہ بغوی نے وِرداً کا معنی پیدل چلنا کیا ہے۔ بعض نے پیاسا کیا ہے، یعنی مجرموں کو ہانک کر جہنم کی طرف لایا جائے گا جبکہ پیاس کی وجہ سے ان کی گردنیں ٹوٹ رہی ہوں گی۔ الورد اس جماعت کو کہتے ہیں جو پانی پر وارد ہوتی ہے اور پانی پر کوئی شخص اس وقت وارد ہوتا ہے جب پیاسا ہوتا ہے(3)۔ ابن عباس نے بھی اس کا معنی عطاشا (یعنی پیاسے) کیا ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ تبارک و تعالیٰ نے دونوں فریقوں کا حال بیان فرمایا ہے، ایک فریق کاملین متقین اور انبیاء کرام کا ہے اور دوسرا فریق کفار کا ہے لیکن عام نیکوکاروں اور گنہگار مومنین کا ذکر نہیں فرمایا۔ ان کا ذکر حدیث میں ہے۔ لوگوں میں سے کچھ پیدل جائیں گے وہ عام مومنین ہیں۔ ہم نے تفصیل سے حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حدیث معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورۂ بنی اسرائیل میں وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا کے تحت ذکر کی ہے(4)۔

ابوذر کی احادیث میں ہے کہ لوگ تین کیفیتوں میں جمع کیے جائیں گے سوار، پیدل اور مونہوں کے بل۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لوگ تین طریقوں پر جمع ہوں گے۔ راغبین (رغبت کرنے والے) راہبین (خوفزدہ) اور ایک اونٹ پر دو اور ایک اونٹ پر تین ایک اونٹ پر دس اور باقی لوگوں کو آگ ہانک کر لے جائیگی۔ جہاں وہ دوپہر کو ٹھہریں گے، آگ بھی ان کے ساتھ ٹھہرے گی اور جہاں وہ رات گزاریں گے، وہ آگ بھی ان کے ساتھ رات گزارے گی(5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 8-507

ابن حجر فرماتے ہیں راغبین اور راھبین سے عام مومنین مراد ہیں۔ اور جو ایک اونٹ پر دو دو' تین تین کا ذکر فرمایا ہے لیکن ایک اونٹ پر ایک شخص کا ذکر نہیں فرمایا یہ اشارہ ہے کہ ایک اونٹ پر ایک سوار وہ ہوں گے جو ابرار ہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں راغبین اشارہ ہے ابرار کی طرف اور راھبین اشارہ ہے ایسے لوگوں کی طرف جو خوف ورجاء کے درمیان ہیں اور جن کو آگ ہانک کر لے جائے گی وہ کفار ہیں۔ الحلیمی نے بھی اسی کی مثل تشریح کی ہے لیکن یہ زائد لکھا ہے کہ ابرار سے مراد متقین ہیں جنہیں جنت کی اونٹنیوں پر لایا جائے گا اور وہ اونٹ جن پر خوف ورجاء والے سوار ہوں گے' ہوسکتا ہے وہ اونٹ ہوں جن کو قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا۔ امام سیوطی فرماتے ہیں چونکہ یہ لوگ خوف ورجاء کے بین بین ہوں گے اس لئے انہیں جنت کی اونٹنیوں پر لوٹانا مناسب نہیں ہے اور فرماتے ہیں یہ وہ لوگ ہوں گے حساب کے وقت جن کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور عذاب میں مبتلا نہ ہوں گے۔ لیکن وہ لوگ جن کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا، وہ پیدل چلیں گے۔ احتمال ہے کہ وہ پیدل چلیں اور سوار نہ ہوں یا پہلے وہ سوار ہوں اور پھر جب محشر کے قریب پہنچیں تو پیدل چلیں۔ فرماتے ہیں کفار اپنے مونہوں کے بل چلیں گے۔

طبرانی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز انبیاء کرام کو جانوروں پر لایا جائے گا تاکہ وہ اسی حالت میں محشر میں پہنچیں۔ نیک آدمی کو اونٹنی پر لایا جائے گا، مجھے براق پر لایا جائے گا، میرے شہزادوں حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جنت کی دو اونٹنیوں پر لایا جائے گا۔ اور بلال کو بھی جنت کی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی پر لایا جائے گا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہادت کی اذان دیں گے حتیٰ کہ جب **اشھد ان محمد رسول اللہ** ﷺ کہیں گے تو اولین وآخرین میں سے سب مومنین شہادت دیں گے۔ پس جس کی شہادت قبول کی جائے گی اس کی شہادت قبول کی جائے گی جس کی رد ہوگی اس کی رد کی جائے گی۔

نوٹ: حلیمی اور غزالی نے لکھا ہے کہ وہ لوگ جو سوار کر کے لائے جائیں گے وہ اپنی قبور سے سوار ہو کر آئیں گے۔ اسماعیلی کا میلان اس طرف ہے کہ وہ موقف کی طرف پیدل چل کر آئیں گے اور پھر وہاں سواریوں پر سوار ہوں گے۔ وہ یہ تاویل اس لیے کرتے ہیں تاکہ دونوں قسم کی احادیث جمع ہو جائیں۔ صحیحین اور ترمذی کی حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں' برہنہ بدن' غیر مختون اور پیادہ پا حاضر ہو گے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ۔ اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔

اسی طرح امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے' طبرانی نے سودہ بنت زمعہ اور ام سلمہ' سہل بن سعد' حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اور البزار نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ ان احادیث میں آیت کی قرأت اور ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنائے جانے کا ذکر نہیں ہے اور ان احادیث میں یہ زائد ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے عرض کی حضور! کتنی بری بات ہوگی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ اس چیز سے غافل ہوں گے لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۔ (ہر شخص کو ان میں سے اس اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے (سب سے) بے پرواہ کر دے گی۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

''انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے۔ لے''

لا یملکون کی ضمیر عباد کے لئے ہے جن پر دونوں قسموں کا ذکر دلالت کر رہا ہے اور لا یملکون کا جملہ المتقین اور المجرمین سے حال ہے یا جملہ متانفہ ہے، یعنی کوئی شفاعت کرنے کا مالک نہیں ہے مگر ایمان، عمل صالح اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اس عظمت کے لئے تیار فرمایا ہے اور جن کو گنہگاروں کی سفارش کا شرف بخشا ہے وہ سفارش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا) ایک اور مقام پر فرمایا وَ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ (اور وہی قبول کرتا ہے دعائیں ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (ان کے حق سے بھی) انہیں زیادہ (اجر) دیتا ہے اپنی مہربانی سے)

ابن صالح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمانداروں اور عمل صالح کرنے والوں کی ان کے بھائیوں کے حق میں شفاعت قبول فرمائے گا اور یزیدھم من فضلہ کا مطلب یہ ہے کہ ان پر مزید کرم نوازی ہوگی کہ بھائیوں کی بھی شفاعت قبول فرمائے گا۔ یا یہ معنی کہ وہ سفارش اور شفاعت فرمائیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے) عَهِدَ الْاَمِیْرُ اِلٰی فُلَانٍ بِكَذَا اس وقت کہا جاتا ہے جب امیر کسی کو کسی کام کا حکم دے۔ اور من موصول لا یملکون کی ضمیر سے بدل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ یا استثناء کی بناء پر منصوب ہے اور جائز ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور یملکون میں واؤ علامت جمع ہو ضمیر نہ ہو جیسے اَكَلُوْنِیَ الْبَرَاغِیْثُ میں ہے تقدیر یوں ہوگی لا یملک الشفاعۃ احد الا من اتخذ۔ بعض علماء فرماتے ہیں من اتخذ عند الرحمن عھداً سے مراد وہ شخص ہے جس نے لا الہ الا اللہ کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے فرمایا فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔ اور فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اللہ پر بندوں کا حق ہے کہ انہیں عذاب نہ دے جو شرک نہیں کرتے[1]۔

یہ حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت معاذ سے روایت کی ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اسم موصول محل نصب میں ہوگا اور اس سے پہلے شفاعۃ مضاف مقدر ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لا یملکون الشفاعۃ الا شفاعۃ من اتخذ عند الرحمن عھداً۔ یعنی شفاعت مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی بعض علماء فرماتے ہیں الضمیر مجرمین کے لئے ہے اور الشفاعۃ فعل مجہول کا مصدر ہے۔ اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ مجرموں کے حق میں شفاعت قبول نہ ہوگی اور مومنین کے حق میں شفاعت قبول ہوگی۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾

''اور کفار کہتے ہیں بنالیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔''

یہود و نصاریٰ اور بعض عرب کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں قالوا کی ضمیر کا مرجع مذکور نہیں ہے لیکن (یہود و نصاریٰ) کی طرف بغیر مرجع کے ضمیر لوٹانا جائز ہے کیونکہ ان سے یہ قول مشہور تھا گویا وہ معلوم اور معہود ہیں۔

حمزہ اور کسائی نے اس صورت میں ہر مقام پر اور سورۂ زخرف اور سورۂ نوح میں ولد کو واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 205، حدیث: 49 (العلمیۃ)

ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب نے سورۂ نوح میں ان کی موافقت کی ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾

''(اے کافرو!) یقیناً تم نے ایسی بات کی ہے جو سخت معیوب ہے۔ لے''

لے جئتم کے مخاطبین یہ جھوٹ بکنے والے ہیں جو اللہ کی اولاد بناتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے قول کی برائی بیان کرنے کے لئے غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ ابن عباس نے اداً کا معنی منکر اور مجاہد نے عظیماً فی الانکار کیا ہے یعنی سخت معیوب اور قبیح چیز۔ عرب کہتے ہیں وادنی الامر و آدنی۔ یعنی اس کام نے مجھ پر بوجھ ڈال دیا اور وہ کام مجھ پر بہت بھاری ہو گیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ادا کلام عرب میں بہت بڑی مصیبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے(1)۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾

''قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے۔ لے''

لے نافع اور کسائی نے یہاں اور سورۂ حم عسق میں تکاد کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مؤنث ہے۔ یتفطرن کو نافع، ابن کثیر، حفص، کسائی اور ابوجعفر نے یاء اور تاء اور طاء مشددہ کے ساتھ باب تفعل سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب انفعال سے تاء کی جگہ نون اور طاء مکسورہ مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انفطر کا معنی بھی پھٹنا ہے لیکن باب تفعل سے پڑھنا زیادہ بلیغ ہے کیونکہ یہ تفعیل کا مطاوع ہے (جس میں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے) بخلاف باب انفعال کے کہ وہ فعل مجرد کا مطاوع ہے اور دوسری وجہ بات تفعل کے بلیغ ہونے کی یہ ہے کہ اس میں تکلیف کا خاصہ ہے۔ قاموس میں ھد کا معنی الھدم الشدید و الکسر لکھا ہے، یعنی سختی سے گرنا اور ٹوٹ جانا(2)۔ بعض علماء نے یتفطرن السموات کا معنی یسقطن علیھم (یعنی ان پر وہ گرتے ہیں) لکھا ہے اور تنشق الارض کا معنی تخسف بھم (یعنی زمین ان کے ساتھ دھنستی ہے) لکھا ہے۔ و تخر الجبال کا معنی تنطبق علیھم (یعنی وہ پہاڑ ان پر مل جائیں) کیا ہے۔

أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾

''کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔ لے''

لے ولداً میں قرأت کا وہی اختلاف ہے جو پیچھے دو مرتبہ گزر چکا ہے۔ ان موصول حرفی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مضاف کے حذف کے ساتھ مفعول لہ کی حیثیت سے محل نصب میں ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ کراھۃ ان دعوا یا ظرفیت کی بناء پر محل نصب میں ہوگا اور یتفطرن، تنشق اور تخر کے متعلق علی سبیل التنازع ہوگا۔ (یعنی ہر ایک فعل تقاضا کرتا ہے کہ یہ میرے متعلق ہو) یا لام کے اضمار کے ساتھ یا منه کی ضمیر سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہوگا۔ یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الموجب لذالک ان دعوا۔ یا ھدا کا فاعل ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے یعنی ھدھا دعاء الولد۔ اور یہ اس سے مشتق ہوگا جس کا معنی سمی (نام رکھنا) ہے اور سمی کے دو مفعول ہوتے ہیں لیکن یہاں ایک مفعول پر اکتفاء کیا گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 472 (التراث العربی)

تا کہ جن کو بھی اللہ کا بیٹا کہا جاتا ہے سب کو شامل ہو جائے (جیسے عزیر علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام وغیرہما) یا یہ اس دعا سے مشتق ہے جس کا معنی نسب ہے جو دعا کا مطاوع ہے جو کوئی کسی کی طرف منسوب ہو تو ادعیٰ الی فلان کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور کعب فرماتے ہیں جب یہود و نصاریٰ نے کہا کہ اللہ کا بیٹا ہے تو آسمان، زمین اور پہاڑ بلکہ ساری مخلوق لرز گئی سوائے جن و انس کے۔ قریب تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ جاتی اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جاتا ان کے اس قول پر ملائکہ کو انتہائی غصہ آیا اور جہنم بھڑک اٹھی (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کلمہ اتنا ہولناک اور قبیح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات صفت حلم سے متصف نہ ہوتی تو سارے عالم کو نیست و نابود کر دیتی اور جنہوں نے یہ قبیح کلام کی ان پر غصہ کی وجہ سے سارا جہاں گرا دیتا۔

وَمَا يَنۢبَغِى لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۟ؕ﴿۹۲﴾

''اور نہیں جائز رحمٰن کے لئے کہ وہ بنائے کسی کو (اپنا) فرزند۔[1]''

[1] انبغیٰ ینبغی مطاوع ہے بغی کا جس کا معنی طلب کرنا ہے (اور مطاوع کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی نے کسی چیز کو طلب کیا اور وہ پائی گئی) مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اگر چہ وہ بفرض محال طلب بھی کرے، یعنی یہ اس کی قدرت کے تحت داخل ہی نہیں ہے کیونکہ یہ محال اور غیر ممکن ہے۔ یا یہ معنی کہ اس کی شان اتنی بلند و بالا ہے کہ یہ بیٹا بنانا اس کے لائق ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ تمام نقائص سے پاک ہے اور ہر اس صفت سے بھی منزہ ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید رحمانیت کی صفت پر حکم کو مرتب کرنا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز یا نعمت ہے یا منعم علیہ ہے۔ تو جو نعمت ہے یا منعم علیہ وہ نعمتیں عطا کرنے والے اور چھوٹی بڑی نعمتیں بخشنے والے کی ہم جنس نہیں ہو سکتی، پس اس کے لئے بیٹا بنانا ممکن ہی نہیں ہے (2)۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۟ؕ﴿۹۳﴾

''کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمٰن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔[1]''

[1] مَن نکرہ ہے جس کی صفت ظرف ہے۔ کل مبتدا ہے اور مستثنیٰ مفرغ اس کی خبر ہے، یعنی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے مگر وہ اس کی مملوک اور مخلوق ہے، اس کی عبادت اور انقیاد کے ساتھ اس کی بارگاہ میں پناہ لیتی ہے اور قیامت کے روز عاجزی کرتے ہوئے آئیگی عبودیت مجازی بھی بیٹا ہونے کے منافی ہے، اسی وجہ سے جو اپنے بیٹے کا مالک ہوتا ہے تو وہ بیٹا آزاد ہو جاتا ہے تو پھر عبودیت حقیقیہ جو مخلوق کے مساوی ہے وہ بیٹے کے منافی کیسے نہ ہوگی۔ (یعنی بیٹا ہونا اور عبد ہونا دونوں ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ ساری مخلوق اس کی عبد ہے تو ثابت ہو گیا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے) کل کے معنی کی مناسبت سے آتی اور عبد جمع ہونے چاہئے تھے لیکن لفظ کل کا اعتبار کرتے ہوئے انہیں مفرد ذکر کیا گیا ہے۔

لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۟ؕ﴿۹۴﴾

''اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح۔[1]''

[1] یعنی وہ سب اس کے شمار میں ہیں، اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے، اس کی قدرت کاملہ اور علم کامل سے کوئی بھی خارج نہیں ہے۔ اس نے ان کی ذوات، نفوس، اعمال، احوال اور رزق کو شمار کر رکھا ہے کیونکہ ہر چیز کا اس کے پاس اندازہ ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 591 (العلمیۃ)

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

"اور وہ سب پیش ہوں گے اس کے سامنے قیامت کے دن تنہا۔ 1"

1۔ یعنی قیامت کے روز ان کے ساتھ دنیا کی کوئی چیز بھی نہ ہوگی، دنیا کے اعوان وانصار سے جدا اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ ابن جریر نے عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ جب عبدالرحمٰن بن عوف نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو مکہ کے دوستوں شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف کی یاد محسوس کرنے لگے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل ارشاد نازل فرمایا(1)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

"بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے پیدا فرمادے گا خدائے مہربان ان کے لئے (دلوں میں) محبت۔ 1"

1۔ یعنی مومنین کے دلوں میں محبت پیدا فرمائے گا یا ان کے لئے ایسے محب پیدا فرمائے گا جو ان سے محبت کریں گے۔ قاموس میں ہے کہ ود کی واؤ پر تینوں حرکتیں پڑھنی جائز ہیں اور ودا کا معنی محب بھی ہے۔ بہت زیادہ محبت کرنے والا(2)۔ اس آیت کریمہ میں عبدالرحمٰن بن عوف کے لئے تسلی اور اطمینان ہے اور ان کے ساتھ وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کافروں کے بدلے میں مومنین محبت کرنے والے پیدا فرمائے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی محبت کافروں کے علاوہ مومنین کے دلوں میں(3) اور ساری کائنات میں پیدا فرمادے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ(4)۔ میں جس کا مولا ہوں، علی اس کا مولیٰ (دوست، مددگار) ہے۔ اس حدیث کو امام احمد، ابن ماجہ نے براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، امام احمد نے بریدہ سے، ترمذی اور نسائی نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے، علی کا ذکر عبادت ہے (ذكر علي عبادة) اس ارشاد کو صاحب سند الفردوس نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں حب علي عبادة آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِيْلَ قَدْ اَحْبَبْتُ فُلَانًا فَاَحِبَّهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ اَهْلِ السَّمَاءِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ وُضِعَ لَهُ الْقُبُوْلُ فِي الْاَرْضِ(5)۔ ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبرئیل کو فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر تو جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمان والوں میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے۔ تم بھی اس سے محبت کرو پس تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زمین میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے (یعنی زمین کی مخلوق بھی اس سے محبت کرتی ہے)

اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ کی یہ تاویل

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 12-511 (العلمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 468 (التراث الاسلامی)
3۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 512 (العلمیہ) 4۔ مجمع الزوائد: 14613 (الفکر) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 331 (قدیمی)

بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی ذات کا محبّ بنا دیتا ہے کیونکہ حدیث قدسی ہے لَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَىَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ۔ بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

''صرف اس لئے ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں اتار کر تا کہ آپ مژدہ سنائیں اس سے پرہیزگاروں کو اور ڈرائیں اس کے ذریعہ اس قوم کو جو بڑی جھگڑالو ہے۔[1]''

[1] بلسانک میں باء بمعنی علی ہے یا باء اپنے ہی اصلی معنی میں ہے اور یسرناہ کو باء کے صلہ کے ساتھ متعدی فرمایا کیونکہ اس کے ضمن میں انزلناہ کا معنی ہے۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت پر اتارا۔ اس معنی کے اعتبار سے بلسانک حال ہوگا۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی ممکن ہے۔ یسرناہ علی امتک متلبساً بلغتک۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت میں اتار کر آپ کی امت پر آسان کر دیا۔ یسرناہ کی ضمیر منصوب اور تنذر بہ میں مجرور ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ قوماً لدا۔ سخت جھگڑالو قوم جو حق کے واضح ہونے کے باوجود تعصب، عناد اور خصومت کی بناء پر آگ کو اختیار کرتے ہیں۔ حضرت حسن نے لدا کا معنی حق سے بہرہ کیا ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی یہ فرمایا ہے۔ الظالم الذی لا یستقیم، یعنی ایسا ظالم جو کبھی سیدھا نہ ہوتا ہو اور راہ راست پر نہ آتا ہو۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں جو حق کو قبول نہ کرتا ہو اور باطل کا مدعی ہو(1)۔ اور یہاں حصر اضافی ہے۔ یعنی ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ ان کے ایمان لانے کی وجہ سے قلق و اضطراب میں مبتلا رہیں اور اپنے نفس کو مشقت میں ڈالتے رہیں ہم نے تو اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ شرک سے بچنے والوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی بشارت دیں اور مجرموں اور منکروں کو خوفناک انجام سے ڈرائیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

''اور کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے کیا محسوس کرتے ہو ان میں سے کسی کو یا سنتے ہو ان کی کوئی آہٹ۔[1]''

[1] اس ارشاد میں کفار قریش کو ڈرانا اور نبی کریم ﷺ کو ان کو ڈرانے پر جرأت دلانا ہے۔ فرمایا ان گزشتہ قوموں میں سے کسی فرد کا حواس خمسہ میں سے کسی حاسہ کے ذریعے کچھ پتہ محسوس کرتے ہو۔ بعض نے تحس کا معنی تریٰ (دیکھنا) بعض نے تجد (پایا) اور بعض نے تشعر (محسوس کرنا) کیا ہے۔ الرکز خفی آواز کو کہتے ہیں۔ رکز کی ترکیب خفاء کے معنی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً رکز الرمح بولتے ہیں جب نیزہ کی ایک طرف زمین میں چھپ جائے۔ رکاز دفن شدہ مال کو کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس سورۂ پاک کی تفسیر بروز سوموار 5 صفر 1203ھ میں مکمل ہوئی۔ الحمد للّٰه رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید الانبیاء و المرسلین سورۂ مریم کا ترجمہ بروز سوموار 21 ربیع الثانی 1421ھ بمطابق 24 جولائی 2000ء بوقت پانچ بجے شام مکمل ہوا۔ اے مالک الملک میری اس سعی ناتمام کو قبول فرما اور آخرت میں بغیر حساب اور مناقشہ کے سرخروئی کا باعث بنا اور تا دم آخر اپنے کلام مقدس اور سنت نبوی (ﷺ) کی خدمت میں مشغول فرما۔ آمین ثم آمین بجاہ سیدالمرسلین امام المتقین، خاتم النبیین محمد المصطفیٰ ﷺ۔ الحمد للّٰه رب العالمین۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 212 (التجاریہ)

سورۂ طٰہٰ

ایاتہا ۱۳۵ — سُوْرَۃُ طٰہٰ مَکِّیَّۃٌ ۲۰ — رکوعاتہا ۸

سورہ طہٰ مکیہ ہے اس میں 8 رکوع اور 135 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

آغاز ترجمہ سورۂ طٰہٰ 22 ربیع الثانی 1421 بمطابق 25 جولائی 2000 بروز منگل۔

طٰهٰ ﴿۱﴾

ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے طاء اور هاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ، ورش اور ابوعمر نے صرف ھا کے امالہ کے ساتھ اور باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں (طٰا ' ھا) حروف کے اسماء ہیں۔ ان پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ کی ابتداء میں گذر چکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اور یہ گذر چکی ہے بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اور یہ قسم ہے جیسے حضور کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ حم لا ینصرون(1)۔

ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خندق کی رات فرمایا حم لا ینصرون (قسم بخدا کافر کبھی کامیاب نہ ہوں گے) مقاتل بن حیان فرماتے ہیں طٰہٰ کا معنی یہ ہے کہ اپنے دونوں قدموں کو زمین پر رکھو۔ آپ ﷺ نماز تہجد ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ادا فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف میں مبتلا نہ ہونے کا ارشاد فرمایا(2)۔ بزار اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ پر یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا کا ارشاد نازل ہوا تو آپ ساری رات قیام فرماتے حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے، آپ تھکاوٹ کی وجہ سے ایک پاؤں اٹھا لیتے اور ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے۔ جبرئیل نازل ہوئے اور کہا طه علی الارض بقدمیک یا محمد اے پیارے محمد ﷺ اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھیے(3)۔ اس طرح بھی پڑھا گیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کی اصل طَاء ہوگئی اور یہ وَطَاء یطأُ سے مشتق ہوگا۔ ہمزہ ھاء سے بدل گیا ہے اور یطا میں ہمزہ الف سے بدل گیا ہے پھر امر کا صیغہ بنایا گیا تو اس کے ساتھ ھاء السکت ملائی گئی۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ الف ہمزہ کا بدل ہو اور ھا ضمیر ہو جس کا مرجع الارض ہو لیکن حرف کی صورت میں اس کا لکھا ہوا ہونا اس کی تائید نہیں کرتا۔ مجاہد، عطاء اور ضحاک نے اس کا معنی یا رجل (اے شخص) کیا ہے اور قتادہ فرماتے ہیں یہ سریانی زبان میں یا رجل کے معنی میں ہے، کلبی کہتے ہیں قبیلہ عک کی لغت میں اس کا معنی یا انسان ہے(4)۔ اس معنی کے اعتبار سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ طٰہٰ کو نبی کریم ﷺ کے اسماء میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ یہ آپ کی ذات کی طرف

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 343 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 516 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)

اشارہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کلبی نے لکھا ہے کہ جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ آپ عبادت میں انتہائی کوشش فرمائیں تو آپ ﷺ قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے کبھی ایک قدم پر کھڑے ہوتے اور کبھی دوسرے پر اور آپ ساری رات قیام میں گذار دیتے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور تھوڑی مشقت کرنے کا حکم فرمایا(1)۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۙ﴿۲﴾

''نہیں اتارا ہم نے آپ پر یہ قرآن کہ آپ مشقت میں پڑیں۔ لے''

لے قاموس میں الشقاء کا معنی شدت اور تنگی لکھا ہے(2)۔ جوہری کہتے ہیں شقاوۃ (بدبختی) سعادت کی ضد ہے' جس طرح شقاوۃ کی دو صورتیں ہیں دینوی اور اخروی اسی طرح سعادت کی بھی دو صورتیں ہیں پھر سعادت دینوی کی تین صورتیں ہیں۔ نفسیہ' بدنیہ اور خارجیہ۔ اسی طرح شقاوت کی بھی یہ تمام صورتیں بنتی ہیں۔ اس آیت کریمہ میں شقاوت دنیویہ بدنیہ مراد ہے، یعنی تھکاوٹ۔ بعض علماء فرماتے ہیں الشقاء کالفظ التعب (تھکاوٹ) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اَشۡقٰى مِنۡ رَائِضِ الۡمُهۡرِ (یعنی گھوڑے کے بچے کو سواری کے لئے تیار کرنے والے شخص سے بھی وہ زیادہ تھکا ہوا ہے) اسی طرح عرب کہتے ہیں۔ سَيِّدُ الۡقَوۡمِ اَشۡقَاهُمۡ قوم کا سردار قوم سے زیادہ مشقت کرنے والا ہوتا ہے۔ کلام کو اس اسلوب میں بدل کر بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مراد کے خلاف مفہوم نہ سمجھا جائے اگر اتعب استعمال ہوتا تو مراد کے خلاف کا وہم ہوتا اور مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ سعادت دارین حاصل کریں(3)۔ (اس لئے نہیں کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں) ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا تو آپ ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو قدموں کے اگلے حصہ پر سہارا لے کر کھڑے ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی یہ مشقت دیکھ کر ارشاد فرمایا۔ طٰهٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى (4) عبد بن حمید نے ربیع بن انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرا پاؤں اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد طٰهٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا الخ نازل فرمایا(5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کفار کی (بدزبانی) کا رد ہے۔ انہوں نے جب آپ ﷺ کی عبادت میں اجتہاد اور کوشش دیکھی تو کہنے لگے کہ یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل ہوا ہے تا کہ آپ تکلیف میں مبتلا ہوں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کفار نے ساری کائنات سے زیادہ سعادت مند اور ارجمند کی طرف شقاوت کی نسبت کی ہو، اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے آباءواجداد کا دین چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا رد فرمادیا اور اس برگزیدہ ذات کی سعادت کو بیان فرمایا کہ اس پر تو قرآن نازل ہوا ہے اور وہ تو صفات کمالیہ سے متصف ہے واللہ علم۔ اسی مفہوم پر ابن مردویہ نے جوعوفی کے طریق سے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے وہ بھی دلالت کرتی ہے۔ کفار نے کہا کہ یہ شخص (خاک بدہن اشقیاء) بدبخت ہو گیا ہے تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے ہم نے قرآن اس لئے تو نازل نہیں کیا کہ اگر آپ کی قوم واضح اور روشن آیات کو سن کر ایمان نہ لائیں تو آپ ان کے غم میں بیقرار و بے چین رہیں، یہ قرآن تو نصیحت ہے۔ اور آپ پر صرف اس کی تبلیغ لازم ہے اور بس اگر طٰہٰ کو سورت یا قرآن کی تاویل میں کر کے مبتدا بنایا جائے تو ما انزلنا کا جملہ خبر ہوگا اور اسی جملہ میں لفظ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1705 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 595 (العلمیہ) 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 516 (العلمیہ) 5۔ ایضاً

القرآن ضمیر عائد کے قائم مقام ہوگا اور اگر طہٰ کو قسم بنایا جائے تو یہ جواب قسم ہوگا۔ اور اگر طہٰ کو منادیٰ (یعنی یا رجل یا رجل) بنایا جائے تو یہ جملہ اس منادیٰ لہ ہوگا۔ اگر اسے جملہ فعلیہ یا مبتدا کے اضمار کے ساتھ جملہ اسمیہ بنایا جائے تو جملہ مستانفہ ہوگا۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ﴿۳﴾

''بلکہ یہ نصیحت ہے ۱؎ اس کے واسطے جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے۔ ۲؎''

۱؎ یہ مستثنیٰ منقطع ہے اور لتشقیٰ کے محل سے اسے بدل بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ (شقاوت اور نصیحت) کی جنسیں مختلف ہیں (ایک جنس نہ دوسری کا عین ہے نہ بعض ہے اور نہ ایک دوسری پر مشتمل ہے اس لئے بدل بننے کی کوئی صورت بھی نہیں) اور نہ یہ انزلنا کا مفعول لہ ہے کیونکہ ایک فعل دو علتوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور یہ ہوسکتا ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور فعل محذوف کی علت کی بناء پر منصوب ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو ما انزلناہ الا تذکرۃً بعض علماء فرماتے ہیں تذکرہ مصدر ہے اور ک ضمیر سے یا القرآن سے حال ہے۔ یا یہ انزلنا کا **مفعول** لہ ہے اس بنا پر کہ لتشقیٰ اس محذوف کے متعلق ہے جو القرآن کی صفت ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ما انزلنا علیک القرآن المنزل لتتعب بتبلیغہ لغرض اِلّا تذکرۃً۔

۲؎ لمن یخشیٰ سے مراد وہ شخص ہے جس کے دل میں خشیت الٰہی اور نرمی ہے ڈرانے کے ساتھ نرم ہو جاتا ہے یا وہ شخص مراد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ڈرانے کے ساتھ ڈر جائے گا۔ کیونکہ خوف رکھنے والا ہی اس قرآن سے نفع حاصل کرتا ہے۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ؕ﴿۴﴾

''یہ اتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا فرمایا زمین کو اور بلند آسمانوں کو ۱؎''

۱؎ تنزیلاً اپنے فعل کے اضمار کے ساتھ یخشیٰ کی وجہ سے یا بطور مدح یا تذکرۃ سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے بشرطیکہ تذکرہ کو حال بنایا جائے لفظاً یا معنی مفعول لہ نہ بنایا جائے کیونکہ ایک چیز اپنی ہی ذات یا اپنی نوع کے لئے علت نہیں بن سکتی۔ ممن خلق الخ تنزیلاً کے متعلق ہے یا اس کی صفت ہے اس میں تفنن کلام کے لئے متکلم سے غیبۃ کی طرف التفات کیا ہے اور دو وجہ سے منزل کی عظمت شان بیان کی گئی ہے۔ اس کے انزال کی نسبت اس ذات کی طرف ہے جس کی شان بلند و بالا ہے اور اس کی نسبت اس ذات کی طرف کی گئی جو صفات کمالیہ اور افعال عظیمہ کے لئے مختص ہے۔ پھر بالترتیب اس ذات بے ہمتا کے افعال اور صفات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے اور ترتیب وہ اختیار فرمائی ہے جو عقل کے زیادہ قریب ہے، پہلے زمین و آسمان کی تخلیق کا تذکرہ کیا جو عالم کی اصل ہیں۔ زمین کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ یہ جس کے زیادہ قریب ہے اور بلند و بالا آسمانوں سے زیادہ اس میں قدرت کی نشانیاں عیاں ہیں۔ الْعُلیٰ جمع ہے عُلیا کی جو اعلیٰ کی مونث ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿۵﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿۶﴾

''وہ بے حد مہربان (کائنات کی فرمانروائی کے) تخت پر متمکن ہوا ۱؎ اسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے ۲؎''

۱؎ اس کی تفسیر سورۂ یونس میں گذر چکی ہے۔

۲؎ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے مراد ملائکہ ستارے وغیرہ ہیں اور و ما في الارض سے مراد پہاڑ انہار معادن اشجار حیوانات جن وانس شیطان اور ملائکہ وغیرہ ہیں۔ اور ما بینهما سے مراد ہوا بادل گرج چمک وغیرہ ہیں اور الثریٰ سے مراد گیلی مٹی ہے حدیث شریف میں ہے کہ کتا پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی کھاتا ہے عرب ثری التراب بولتے ہیں جب مٹی پر پانی چھڑکا جائے امام بغوی نے لکھا ہے کہ ضحاک فرماتے ہیں وما تحت الثریٰ سے مراد وہ ہے جو گیلی مٹی کے نیچے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں زمینیں مچھلی کی پیٹھ پر ہیں اور مچھلی سمندر پر ہے اور مچھلی کا سرا اور دم عرش کے نیچے ملے ہوئے ہیں اور سمندر ایک سبز چٹان پر ہے اور آسمان کی سبزی اس کی چٹان کی وجہ سے ہے۔ اور یہ وہ چٹان ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے لقمان کے قصہ میں بیان فرمایا ہے۔ (فتکن في صخرة) اور وہ چٹان بیل کے سینگ پر ہے اور بیل گیلی مٹی پر ہے اور اس کے نیچے جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ بیل اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ سب سمندروں کو ایک سمندر بنا دے گا تو وہ بہہ کر اس بیل کے پیٹ میں چلے جائیں گے اور وہاں خشک ہو جائیں گے (1)۔ الرحمٰن مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے یا مدح کی بناء پر موقوع ہے اور مابعد مبتدا محذوف کی خبر ہے یا الرحمٰن مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے اور علی العرش استوىٰ کا جملہ اور له ما في السموٰت الخ کا جملہ دونوں بغیر حرف عطف کے یکے بعد دیگرے خبریں ہیں۔ جیسے زیدٌ عالم عاقلٌ میں عالم اور عاقلٌ خبریں ہیں اور الرحمن اپنی اخبار سے مل کر جو جملہ بنا ہے یا تو یہ جملہ مستانفہ ہے اور جو مسائل کا جواب ہے جو کہتا ہے کہ ہمارے سامنے اس قرآن نازل کرنے والے کی صفت بیان کرو۔ یا یہ خلق کے جملہ کے مضمون کی تاکید ہے۔

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ۞

''اور اگر تو بلند آواز سے بات کرے (تو تیری مرضی) وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور دل کے بھیدوں کو بھی ۱؎''

۱؎ امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو اور اسے جہری لہجہ میں پکارو (تمہاری اپنی مرضی) جان لو وہ تمہارے جہر سے مستغنی ہے کیونکہ وہ تو پوشیدہ اور پردے میں کہی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے اور جو ابھی دل میں تصور اور خیال ہے اسے بھی جانتا ہے (2)۔ میرے نزدیک اس کا یہ مفہوم ہے کہ تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو یا آہستہ کرو اللہ تعالیٰ اسے جان لے گا اور اس کا اجر وثواب دے گا۔ کیونکہ وہ تو اسرار کی باتوں اور دل کے تصورات کو بھی جانتا ہے چہ جائیکہ جہری آواز میں ذکر ہو۔ سیاق کلام کی وجہ سے اور تخافت حذف کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں البرد محذوف ہے۔ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ۔ امام بغوی فرماتے ہیں حسن فرماتے ہیں السر وہ راز کی بات جو کسی غیر کے سامنے بیان کی گئی ہو اور اخفي جو ابھی نہاں خانہ دل میں انگڑائیاں لے رہی ہو، ابھی اس کا اظہار زبان سے نہ ہوا ہو ابن عباس اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ سر وہ بات ہے جو ابھی دل میں ہی ہے اور اخفیٰ وہ بات جو بعد میں اللہ تعالیٰ تیرے دل میں ڈالے گا اور تو ابھی تک خود اسے نہیں جانتا کہ ایسا بھی ہوگا۔ کیونکہ تو تو فقط آج کی بات اور خیال کو جانتا ہے، کل جو تیرے دل میں آئے گا اس کی آج تجھے خبر نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات جو تو آج دل میں آرزوئیں اور امنگیں لیئے بیٹھا ہے وہ انہیں بھی جانتا ہے اور جو تو کل سوچے گا اور خیال کرے گا وہ اسے بھی جانتا ہے۔ حضرت علی بن طلحہ، ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں السر وہ بات جو ابھی ابن آدم کے دل میں ہوتی ہے اور اخفیٰ وہ عمل جو ابھی تک کیا نہیں، بعد میں کرے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں السر وہ عمل ہے جو تم لوگوں سے پوشیدہ کرتے ہو اور اخفیٰ دل کا وسوسہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں السر سے مراد عزیمت ہے، یعنی کسی کام کا پختہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 599 (العلمیہ)

ارادہ کرنا۔ اور اخفیٰ وہ بات جو دل میں کھٹک تو رہی ہے لیکن اس پر عزم نہیں ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں وہ ذات جو ہمہ بین اور ہمہ دان ہے اپنے بندوں کے سر و اخفیٰ کو جانتی ہے دوسرا کوئی نہیں جانتا (1)۔ صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں سر اور اخفیٰ مجردات خمسہ میں سے ہیں جو عرش کے اوپر کشف کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انسان کے بدن میں ان کے جلوے منعکس ہوتے ہیں اور وہ مجردات خمسہ (ایسی پانچ چیزیں جو مادہ سے خالی ہیں) یہ ہیں قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ قلب ولایت انسانیہ کی تجلیات کا مہبط ہے اور روح ولایت نوحیہ ابراہیمیہ کے انوار کی جلوہ گاہ ہے، اور سر ولایت موسویہ کی تجلیات کا مہبط ہے اور اخفیٰ ولایت عیسویہ کے انوار کا مہبط ہے اور اخفیٰ ولایت محمدیہ کے انوار کی منزل ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸

"اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے اسکے لئے بڑے خوبصورت نام ہیں [1]"

[1] اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مبتدا خبر ہیں اور له الاسماء الحسنی خبر ثانی ہے اور جملہ کبریٰ له ما فی السموٰت جملہ کے مضمون کے لئے ہے۔ کیونکہ جو آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اس کے لئے الوھیت میں یکتا ہونا اور ان تمام صفات کمالیہ کے ساتھ متصف ہونا ضروری ہے جن پر اس کے وہ خوبصورت اسماء دلالت کرتے ہیں جن کے ساتھ کسی غیر کو موسوم کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ الحسنیٰ مونث ہے الاحسن کی۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کو باقی تمام اسماء پر حسن و خوبصورتی میں اس لئے فضیلت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں جو تمام معانی سے بلند اور افضل ہیں۔ ہم نے سورۂ اعراف میں اسماء حسنیٰ کی بحث تفصیل سے وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا کے تحت ذکر کر دی ہے۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹

"اور (اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو اطلاع موسیٰ کے قصہ کی؟ [1]"

[1] یہ استفہام تقریری ہے۔ یعنی تیرے پاس موسیٰ کی خبر یقیناً پہنچ چکی ہے۔ اور اس جملہ کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے۔ یعنی اِلَّا تذکرۃً کے مضمون پر عطف ہے کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے "لیکن ہم نے اسے بطور نصیحت اتارا ہے"۔ یا یہ کہ اس کا عطف تنزیلاً کے مضمون پر ہے۔ یعنی تیرے پاس قرآن آیا، آپ کو عبادت کی تھکاوٹ پہنچی، آپ نے سعادت کی سب منزلیں طے کیں اور آپ کے پاس موسیٰ کلیم کی خبر بھی پہنچی ہے، جس میں ان کی مشقتوں اور منازل عالیہ کا تذکرہ بھی ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت کی تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر فرمایا تا کہ نبوت کے بارگراں کو اٹھانے، پیغام رسانی کی مشکلات اور تکالیف پر صبر کرنے میں موسیٰ علیہ السلام کی اقتداء کریں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جو آغاز نبوت میں نازل ہوئی تھیں۔

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝۱۰

"جب (مدین سے واپسی پر تاریک رات میں) آپ نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں کو کہا تم (ذرا یہاں) ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں لے آؤں تمہارے لئے اس سے کوئی چنگاری [1] یا مجھے مل جائے آگ کے پاس کوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریۃ)

راہ دکھانے والا ملے''

لے اذ ظرف ہے حدیث موسیٰ کی، یعنی کیا تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام کی خبر پہنچی جب انہوں نے آگ کو دیکھا تھا۔ یا اذ فعل مضمر راى کی ظرف ہے۔ یا اذ کر مقدر کا مفعول فیہ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کی زیارت کے لئے مصر واپس آنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے اجازت دے دی۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل اور مال کو لے کر چل پڑے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ آپ نے ظالم بادشاہوں کے خوف سے راستہ بھی غیر معروف اختیار فرمایا۔ آپ کی بیوی امید سے تھیں، معلوم نہیں دن میں بچہ کی پیدائش ہو جائے یا رات کو۔ آپ کسی راہنما کے بغیر صحرا میں چل پڑے۔ آپ کو مجبوراً تاریک ٹھنڈی اور برفانی رات میں طور کی مغربی جانب چلنا پڑا۔ راستہ میں بیوی کو دردزہ شروع ہو گیا آپ نے چقماق کو رگڑا لیکن وہ نہ جلی۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بڑے غیرت مند شخص تھے۔ رات کے وقت اپنے رفقاء سفر کے ساتھ چلتے تھے اور دن کے وقت دوستوں سے علیحدہ ہو جاتے تھے تا کہ ان کی بیوی پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ پس آپ چلتے ہوئے راستہ بھول گئے، رات بڑی اندھیری اور سرد تھی۔ انہوں نے چقماق جلایا لیکن وہ نہ جلا، آپ کو اس وقت طور کی بائیں جانب دور آگ دکھائی دی(1)۔ آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو۔ آپ کا یہ خطاب بیوی اور دوسرے ہمراہیوں سے ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ خطاب آپ کا اپنی بیوی کو تھا لیکن چونکہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں اس لئے تعظیم کے لئے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ حمزہ نے یہاں اور سورۂ قصص میں لاهله کی ضمیر کو وصل کی صورت میں ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انّی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ الانس بمعنیٰ ابصر ہے، یعنی اچھی طرح دیکھنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ایناس کا معنی مانوس چیز کو دیکھنا ہے۔ لعلّی کو کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قبس آگ کا شعلہ چنگاری جسے بڑی آگ سے حاصل کیا جاتا ہے(2)۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔

ع ھدی سے مراد ہادی ہے، یعنی میں کوئی راہنما پالوں جو صحیح راستہ پر میری راہنمائی کرے یا یہ معنی کہ دین کے ابواب کی طرف میری راہنمائی کرے۔ کیونکہ ابرار و نیکو کار لوگ جس حالت میں بھی ہوں ان کا میلان دین کے ابواب کی طرف ہوتا ہے۔ جب آگ کا لانا اور راہنما کا ملنا متوقع تھا تو ان کو رجاء اور طمع کے صیغہ (لعلی) کے ساتھ ذکر کیا۔ لیکن آگ کا دیکھنا یقینی تھا اس لئے اسلوب بیان یقین والا ذکر فرمایا۔ اور علی النار میں استعلاء (غلبہ) کا معنی ہے کیونکہ آگ جلانے والے آگ کے اوپر ہوتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ آگ قریبی مکان کے اوپر تھے (ان معانی کی خاطر علی استعمال فرمایا جو غلبہ اور استعلاء کے لئے آتا ہے) جیسا کہ مررت بزید میں باء اس مکان کے قریب سے گذرنے کے معنی میں ہے جو زید کے قریب ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾

''پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی اے موسیٰ لے''

لے لما اتا ها نودی کی ظرف ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو ایک سرسبز درخت دیکھا جس کے اوپر نیچے آگ ہی آگ ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ آگ اپنی جگہ میں روشن اور سبزی اپنی جگہ میں گہری اور شدید تھی۔ درخت کی سبزی آگ کی چمک میں مخل نہ تھی اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 14-213 (التجاریہ)　2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 773 (التراث العربی)

نہ آگ کی چمک درخت کی سبزی میں کوئی تبدیلی کا باعث تھی۔ قتادہ، مقاتل اور کلبی کہتے ہیں وہ درخت عوسج کا تھا۔ وہب فرماتے ہیں علیق کا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں عناب کا تھا۔ یہ آخری قول ابن عباس سے مروی ہے۔ اہل تفسیر فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دیکھا تھا وہ آگ نہیں نور تھا۔ اور نار (آگ) کے لفظ سے اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو نار (آگ) گمان کیا تھا۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ رب تعالیٰ کا نور تھا۔ یہ ابن عباس، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ آگ ہی تھی اور آگ ہی اللہ کا حجاب ہے۔ اور اس کی دلیل ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا حجاب نار (آگ) ہے اگر وہ اس حجاب کو اٹھا دے تو اس کے چہرے کی تجلیات حد نظر تک تمام مخلوق کو جلا دے(1)۔ امام بغوی نے یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے کہ صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں نار کی جگہ نور ہے۔ میں کہتا ہوں نور وہ ہوتا ہے۔ جو آگ کا لطیف حصہ ہوتا ہے جو جلاتا نہیں ہے۔ نور اور آگ دونوں کا مال ایک ہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ آپ نے خشک گھاس لی اور درخت کے قریب گئے جب وہ قریب ہوتے آگ دور ہو جاتی۔ آپ حیران وششدر ہو گئے، آپ نے وہاں ملائکہ کی تسبیح سنی اور آپ پر سکینت طاری ہوگئی اور اس وقت آپ کو یہ ندا کی گئی۔

إِنِّيٓ أَنَا۠ رَبُّكَ فَٱخۡلَعۡ نَعۡلَيۡكَ إِنَّكَ بِٱلۡوَادِ ٱلۡمُقَدَّسِ طُوٗى ﴿١٢﴾

"بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں[1] پس تو اتار دے اپنے جوتے[2] بے شک تو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے[3]"

[1] اِنّی کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر ابوعمرو اور ابو جعفر نے انی کے ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے قول کے اضمار یا ندا کو قول کے قائم مقام کرنے کی وجہ سے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور متکلم کی ضمیر (یٔ انا) کا تکرار تاکید اور تحقیق کے لئے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت وہب نے فرمایا درخت سے آواز آئی اے موسیٰ تو موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا لیکن آپ کو معلوم نہ تھا کہ کون مجھے بلا رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا مجھے بلانے والے میں تیری آواز سن رہا ہوں لیکن مجھے تیرے مکان کا علم نہیں ہے کہ کہاں ہے؟ ارشاد ہوا میں تیرے اوپر، تیرے ساتھ، تیرے آگے، تیرے پیچھے اور تجھ سے زیادہ تیرے قریب ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ ایسی ذات اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے تو آپ کو یقین ہو گیا(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بعض علماء فرماتے ہیں جب ندا آئی تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کلام کرنے والا کون ہے۔ فرمایا میں اللہ ہوں۔ شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ شاید تم شیطان کی کلام سن رہے ہو۔ یہاں پھر آپ نے فرمایا میں پہچان گیا ہوں کہ یہ اللہ کی کلام ہے کیونکہ میں اسے تمام جہات، اور تمام اعضاء سے سن رہا ہوں۔ یہ اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے کلام روحانی طور پر لیا پھر وہ کلام بدن کے لئے تمثیل بنا اور حس مشترک کی طرف منتقل ہوا پھر بغیر کسی عضو اور جہت کے اختصاص کے حس مشترک میں منقش ہو گیا(3)۔

[2] آپ جب وادی مقدس پہنچے تو حکم ہوا کہ جوتے اتار دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع اور ادب واحترام کے تقاضے پورے کرنے کے لئے حکم دیا گیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں جوتے اتارنے کے حکم کا سبب وہ ہے جو ابن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے۔ کہ آپ کے جوتے مردار گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ غیر مدبوغ چمڑے کے تھے۔ عکرمہ اور مجاہد نے یہ وجہ بیان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (التجاریۃ)   2۔ ایضاً   3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 2-601 (العلمیۃ)

کی ہے کہ یہ وادی مقدس ہے، جوتے اتار دو تا کہ اس بابرکت وادی کی خاک تمہارے قدموں سے لگے اور تم اس سے برکت حاصل کرو۔ اس وادی کو دو مرتبہ پاک کیا گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم سنتے ہی جوتے اتار دیئے اور وادی کے باہر پھینک دیئے (1)۔

سے طوی کو کوفی اور شامی علماء نے یہاں بھی اور سورۃ النازعات میں بھی مکان کی تاویل میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ الطی سے ثنی کی طرح نودی یاالمقدس کا مصدر ہے یعنی دوندائیں دی گئیں یا دومرتبہ سے پاک کیا گیا۔ میں کہتا ہوں الطی کا اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ تثنیہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، باقی قراء نے علمیت اور عدل کی وجہ سے بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ یعنی غیر منصرف بنایا ہے۔ اور یعنی اس میں غیر منصرف کے دو سبب علمیت اور عدل پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ وادی کا علم ہے اور یہ طاؤ سے معدول ہے۔ یا علمیت کے ساتھ دوسرا سبب تانیث پایا جاتا ہے۔ جب کہ اسے بقعہ کی تاویل میں کیا جائے، طوی الوادی کا عطف بیان ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں وادی طویٰ گول اور گہری تھی۔ گولائی میں طور کی مثل تھی (2) بعض علماء فرماتے ہیں طویٰ تنوین کے ساتھ اپنے فعل کے قائم مقام مصدر ہے اور ظرف میں پوشیدہ ضمیر مرفوع سے حال ہے جو ضمیر موسیٰ کی طرف راجع ہے۔ یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جو آپ کو بطریق اجتباء (بانتخاب الٰہی) حاصل ہوئی گویا آپ نے اللہ تعالیٰ کی دستگیری سے وہ وادی طے کی۔ یہ وادی آپ نے تھوڑے سے وقت میں طے فرمائی حالانکہ اگر اپنی کوشش سے اس مسافت کو (جو اللہ اور بندے کے درمیان ہے) طے فرماتے تو بڑی مشکل سے طے ہوتی۔

صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں قلب کا اصلی مقام عرش پر ہے۔ اگر انسان عبادت واجتہاد سے اس تک پہنچنا چاہے تو اسے پچاس ہزار برس کی مدت درکار ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت چاہئے کیونکہ زمین اور عرش کے درمیان پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ اسی کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ لیکن اس عروج اور بلندی کو ایک سالک شیخ کامل کے جذب کے ذریعے بطور اجتباء (چناؤ، انتخاب) فوراً حاصل کر لیتا ہے۔ (یعنی مرشد کامل کی توجہ سے اللہ تعالیٰ خود اس کا انتخاب فرما کر اسے اس منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے)

سیر زاہد ہر شبے یک روزہ راہ سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

کہ زاہد تو ایک رات میں ایک دن کی مسافت ہی طے کرتا ہے لیکن عارف کی سیر ہر لحظہ بادشاہ حقیقی کے تخت (عرش) تک ہوتی ہے۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ﴿۱۳﴾

''اور میں نے پسند کر لیا ہے تجھے (رسالت کے لئے) سو خوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے لے''

لے یعنی میں نے تجھے نبوت اور رسالت کے لئے منتخب فرما لیا ہے۔ حمزہ نے انا کو انّا یعنی نون کی تشدید کے ساتھ اور اخترت کو اخترنا (بطور تعظیم) جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ لما یوحیٰ کا لام علی سبیل التنازع استمع اور اخترت دونوں فعلوں کے متعلق ہے۔

اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾

''یقیناً میں ہی اللہ ہوں نہیں ہے کوئی معبود میرے سوا۔ پس تو میری عبادت کیا کر اور ادا کیا کر نماز مجھے یاد کرنے کے لئے ع''

لے اِنّیْ کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ ما یوحیٰ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

بدل ہے نیز اس میں توحید کا ذکر ہے جو علم کا کمال ہے۔ دوسرا اس میں عبادت کا حکم ہے جو عمل کا کمال ہے (یعنی علم و عمل کی معراج کا اس جملہ میں ذکر ہے)

۳۔ نماز چونکہ تمام عبادات سے افضل ترین عبادت ہے اس لئے اس کی اہمیت اور علوشان کے اظہار کے لئے دوبارہ علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ فاعبدنی کے امر میں اس کا ذکر بھی ضمناً آ چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز دین کا ستون ہے(1)۔ اس حدیث کو ابونعیم اور بیہقی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور صاحب مسند الفردوس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ نماز ایمان کا ستون ہے(2) ابن عساکر نے حضرت انس سے یہ روایت کیا ہے کہ نماز ایمان کا نور ہے(3) صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا حضور ﷺ کون سا عمل اللہ کی بارگاہ میں محبوب ترین ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نماز(4)۔ مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے اور کفر کے درمیان (فاصل) نماز کا ترک ہے(5)۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت بریدہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد، دارمی اور بیہقی نے عبداللہ ابن عمر بن العاص سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا جو نماز کی حفاظت کرے گا نماز قیامت کے روز اس کے لئے نور، دلیل اور نجات ہوگی اور جو اس کی محافظت نہیں کرے گا اس کے لئے نہ نور ہوگا اور نہ نجات اور وہ شخص قیامت کے روز قارون فرعون اور ھامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا(6)۔

ترمذی نے عبداللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے کہ فرمایا صحابہ کرام اعمال میں سے کسی عمل کو چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے لیکن نماز کے ترک کو کفر سمجھتے تھے(7)۔ ان احادیث کے ظاہری مفہوم کی بناء پر امام احمد بن حنبل نے فرمایا مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ جس نے جان بوجھ کر نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔ نماز کے تمام عبادات سے افضل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی ذات میں حسن ہے، جب کہ دوسری عبادات میں حسن کسی واسطہ سے ہے۔ مثلاً روزہ میں حسن ہے کیونکہ یہ نفس امارہ بالسوء کی نحوست کو ختم کرتا ہے۔ زکوٰۃ میں حسن ہے کہ یہ فقیر کی حاجت کو پورا کرتی ہے۔ حج میں حسن ہے کہ اس میں بیت اللہ شریف کی تعظیم ہے۔ اس نماز کے ذاتی حسن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اقامت کے حکم کے لئے علت (لذکری) ذکر فرمائی لذکری کو نافع اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز قائم کرو تا کہ مجھے اس میں یاد کرو۔ کیونکہ نماز اپنے تمام ارکان کے ساتھ ذکر الٰہی ہے۔ اس میں دل زبان اور جوارح کی عبادت ہے۔ بعض علماء لذکری کا معنی یہ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور ان میں میں نے نماز کا حکم دیا ہے۔ بعض نے یہ معنی فرمایا کہ تم نماز قائم کرو میں تمہارا رحمت اور ثناء کے ساتھ ذکر کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہوں اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر دل میں کرتا ہے تو میں بھی تنہا اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس کی محفل سے بہتر محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے(8)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ (لذکری) تقیید ہے۔ نماز کے قیام کے حکم کی تعلیل نہیں

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 284 (التراث الاسلامی) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 278 3۔ ایضاً، صفحہ 228
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 58 (قدیمی) 5۔ ایضاً
6۔ ایضاً، صفحہ 59 7۔ ایضاً 8۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی)

ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ خالصۃ میری یاد کے لئے نماز ادا کرو، اس میں کوئی ریاء کاری کا شائبہ نہ ہو اور میرے ذکر کے ساتھ کسی غیر کی آمیزش نہ ہو۔ یہ آیت انہیں معنی کے اعتبار سے مجمل ہے اور اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ہے۔ فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اسی طرح جبرئیل کی امامت والی مشہور حدیث میں اس کی تفصیل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے میری نماز کے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔ حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز ادا کرنا بھول جائے یا نماز کے وقت سو گیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جس وقت اسے یاد آئے اسی وقت نماز ادا کرے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ نماز کا اس کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(1)

حضرت ابو قتادہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونے میں کوتاہی نہیں بلکہ کوتاہی صرف بیداری میں ہے، جب تم میں سے کوئی نماز بھول جائے یا نماز کے وقت سو گیا ہو تو اسے جب یاد آئے اس نماز کو ادا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾

"بے شک وہ گھڑی (قیامت) آنے والی ہے[1] میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں[2] تا کہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو اس کام کا جس کے لئے وہ کوشاں ہے[3]"

[1] یہ جملہ عبادت کے امر کی تعلیل کے مقام پر ہے یا عبادت کے امر کے فائدہ کے بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہے۔ یا ڈرانے کے لئے جملہ معترضہ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اِنَّ سے پہلے واؤ حرف عطف مقدر ہے۔

[2] اخفش نے اکاد کا معنی ارید کیا ہے، یعنی میں قیامت کے وقت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں کاد کا لفظ زائد ہے۔ معنی اخفی وقتها ہے۔ یعنی میں اس کے وقت کو پوشیدہ رکھتا ہوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ میں اس کو چھپائے رکھتا اور میں یہ بھی نہ کہتا کہ یہ آنے والی ہے۔ اگر بندوں پر شفقت اور ان کے عذروں کو ختم کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں اس کے آنے کی بھی خبر نہ دیتا۔ اس کی مثال قرآنی یہ ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ (یعنی اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو اللہ کا بیٹا بنانے والوں پر آسمان پھٹ پڑے)۔ میں کہتا ہوں شاید یہ اشارہ ہے کہ ایمان باللہ اور اللہ کی عبادت ایسے شرف حسن اور فضیلت والے اعمال ہیں کہ یہ لوگوں سے بذات مقصود ہونے چاہئیں کسی غرض وعنایت اور جنت کی امید اور دوزخ کے خوف کی وجہ سے نہیں ہونے چاہئیں اگرچہ ایمان لانے اور عبادت کرنے کا ثمرہ جنت اور ایمان نہ لانے اور عبادت نہ کرنے کا نتیجہ دوزخ ہی ہے۔ لیکن ایمان ایسا عزت اور شرف والا عمل ہے کہ اس کا کرنا لازمی ہے۔ اور کفر فی نفسہ ذلت اور خسارہ ہے اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے آنے کی خبر نہ دیتے تو تب بھی ایمان لانے والوں کا ایمان جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف کی وجہ سے نہ ہوتا بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صہیب اچھا آدمی ہے اگر اسے اللہ کے عذاب کا خوف نہ بھی ہوتا تو یہ اس کی نافرمانی نہ کرتا۔ حضرت رابعہ بصریہ نے فرمایا میں چاہتی ہوں کہ جنت کو جلا دوں اور دوزخ کو بجھا دوں تا کہ لوگ بغیر کسی لالچ اور خوف کے خالصاً اللہ کی رضا کے لئے عبادت کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بندوں پر مہربانی کرتے ہوئے اور کفار کے عذروں کو ختم کرتے ہوئے

1۔ مشکوۃ المصابیح صفحہ 196 (قدیمی) صفحہ 61   2۔ ایضاً

قیامت کی آمد کی خبر دے دی۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں قیامت کے وقت کو اپنے آپ سے پوشیدہ رکھتا ہوں تو پھر کوئی دوسرا کیسے پہچانے گا۔ اس تاویل کی تائید بعض قراءتوں سے ہوتی ہے جن میں فَکَیْفَ اُظْهِرُهَا لَکُمْ کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ کلام عربوں کے محاورہ کی طرح ہے کہ جب وہ کسی چیز کے پوشیدہ کرنے میں مبالغہ کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں میں نے تیرے راز کو اپنے سے چھپائے رکھا۔ یعنی میں نے اسے انتہائی پوشیدہ رکھا اور قیامت کے وقت کو بیان نہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جب لوگوں کو اس کے آنے کے وقت کا علم نہیں ہوگا تو وہ ہر وقت خوفزدہ رہیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں افعال کا ہمزہ سلب کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ میں اس سے پردہ ہٹا دوں گا۔ اسے ظاہر کر دوں گا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اظہار والے معنی کی تائید اخفی کے ہمزہ کے فتحہ والی قرأت بھی کرتی ہے(1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں اخفی کو ھمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس کا معنی ہوگا، میں ظاہر کروں گا عرب کہتے ہیں خفیت الشئی جب کوئی کسی چیز کو ظاہر کردے اور اخفیت الشّئی جب کوئی کسی چیز کو چھپا دے(2)۔ نهایه للجزری میں یہی تحقیق لکھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب خفا (مجرد) کا معنی ظاہر کرنا ہے اور متواترہ خفی (مزید فیہ) کا معنی چھپانا ہے تو پھر قرأت متواترہ کا معنی ظاہر کرنا کیسے ہو سکتا ہے اور حضرت حسن بصری کی قرأت اس کی تائید کیسے کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں خفا مجرد کبھی ظاہر کرنے اور کبھی چھپانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے خفی' یخفی' خفیًا۔ بروزن رفی یرفی اظهره واستخرجه(3) (خفی کا معنی ظاہر کرنا ہے) خفي يخفىٰ بروزن رضی یرضی۔ خفاءً فھو خاف وخفی اس کا معنی چھپنا اور ظاہر نہ ہونا ہے۔ پس جب ماضی مجرد باب ضرب پر ھمزہ افعال زائدہ کیا جائے گا تو اس کا معنی چھپانا اور ظاہر نہ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ مشہور معنی ہے اور جب باب سمع پر ھمزہ افعال زائدہ کیا جائے گا تو معنی ظاہر کرنا اور نہ چھپانا ہوگا۔

ﷺ یہ آتیةٌ یا اخفیھا کے متعلق ہے بشرطیکہ اخفیھا کا معنی ظاہر کرنا ہو۔ اگر یہ معنی ہو کہ میں اس کی آمد کے وقت کو چھپائے رکھتا اور یہ بھی نہ کہتا کہ یہ آنے والی ہے۔ تب بھی بما تسعیٰ اتیةٌ یا اخفیھا کے متعلق ہوگا۔ یعنی میں اس کے آنے کی خبر نہ دوں گا حتیٰ کہ ہر نفس کو بدلہ دیا جائے گا جو اس نے اللہ کی رضا کے لئے کیا، اس عمل میں نہ اسے جنت کا لالچ تھا اور نہ دوزخ کا خوف تھا اور پھر ایسے عمل کی جزاء اللہ کی ملاقات اور زیارت اور اس کے قرب کے مراتب ہیں۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾

''پس ہرگز نہ روکے تجھے اس (کو ماننے) سے ۱ وہ شخص جو نہیں ایمان رکھتا اس پر اور پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی ۲ ورنہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے ۳''

۱ عنها کی ضمیر کا مرجع لقاء اللہ یا قیامت کے آنے پر ایمان یا اقامة الصلوٰة ہے۔ ظاہراً یہاں کافر کو منع فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس سے نہ روکے لیکن مراد موسیٰ علیہ السلام کو منع کرنا ہے کہ کافر کے کہنے اور روکنے پر آپ اس پر ایمان لانے سے نہ رکیں۔ اس اسلوب سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ فطرت سلیمہ قیامت سے اعراض کرنے کا انکار کرتی ہے اور وہ دین میں رسوخ اور پختگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور کافر کا اس بات سے روکنا دین میں کجی پیدا کرنے کے لئے ہے۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 650 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریۃ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1680 (التراث الاسلامی)

ے یعنی وہ نہ رو کے جو اس پر خود ایمان نہیں رکھتا اور خواہش نفس کا بندہ ہے۔ مالی لذتوں کی طرف مائل ہے اور اس نے اس بات سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ اس قیامت کے انکار میں کتنی برائی ہے اور اس پر کتنا عذاب ہے۔ واتبع یا تو لایومن پر معطوف ہے۔ یا قد کی تقدیر کے ساتھ لایومن کے فاعل سے حال ہے۔

ے قیامت پر ایمان لانے سے رکنے کی وجہ سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ فاء کے بعد ان مقدر ہے، اس کے سبب فعل منصوب ہے۔

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ⑰

''اور (ندا آئی) یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ لے''

لے یہ استفہام اور سوال لاعلمی اور بے خبری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے، کہ یہ ڈنڈا ہے اس سے بڑے بڑے عجائب اور معجزات کا اظہار ہوگا۔ ما کا کلمہ مبتدا ہے۔ اور تلک خبر ہے بیمینک محذوف منصوب کے متعلق ہو کر حال ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قارۃً او ماخوذۃً بیمینک۔ یا تلک (بقول علماء کوفہ) اسم موصول ہے اور بیمینک اس کا صلہ ہے۔ یا موسیٰ کا تکرار مانوس کرنے اور تنبیہ کرنے کے لئے ہے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ أُخْرٰى ⑱

''عرض کی (میرے رب) یہ میرا عصا ہے میں ٹیک لگاتا ہوں اس پر اور میں پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لئے اور میرے لئے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں۔ لے''

لے امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عصا کی دو شاخیں تھیں اور نیچے نوک بنی ہوئی تھی اور اس پر شانبہ چڑھی ہوئی تھی۔ مقاتل فرماتے ہیں اس ڈنڈے کا نام نبعہ تھا(1)۔ جب درخت سے پتے جھاڑنے کے لئے زور سے ڈنڈا مارا جاتا ہے تو اس کے لئے ھش الورق۔ استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اس کی یہی تشریح لکھی ہے(2)۔ وَلِیَ ورش اور حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مآرب کا معنی مقاصد اور اُخرٰی مارب کی صفت ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اُخَرُ ہوتا لیکن آیت کے سرے ملانے کے لئے اُخرٰی ذکر فرمادیا۔ موسیٰ علیہ السلام دوسرے جو مقاصد اس ڈنڈے سے حاصل کرتے تھے وہ یہ تھے آپ جب چلتے تو اسے کندھے پر رکھ لیتے اور اس کے ساتھ اپنا لوٹا اور سامان لٹکا لیتے، اس کی شاخوں پر آگ جلانے والی لکڑیاں رکھتے جن کی وجہ سے آگ نکل پڑتی، اس کے اوپر کپڑا ڈال کر سایہ حاصل کرتے، کنویں سے پانی نکالنے والی رسی چھوٹی ہوتی تو ڈنڈا اس کے ساتھ باندھ کر اسے لمبا کر لیتے اور جب درندے آپ کی بکریوں پر حملہ کرتے تو آپ اس کے ساتھ ان کا دفاع کرتے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام سوال کا مقصود سمجھ گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت اور اس کے منافع کا بیان چاہتے ہیں۔ پھر جب آپ نے اس حقیقت کے خلاف اس میں کچھ معجزات دیکھے اور اس کے دوسرے خصائص مشاہدہ فرمائے تو آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ معجزہ ہے(3) اسی وجہ سے اس کی حقیقت اور اس کے منافع کو مفصل اور مجمل بیان فرمایا تاکہ جواب اس غرض کے مطابق ہو جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریۃ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 830 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 607 (العلمیۃ)

جو موسیٰ علیہ السلام نے سمجھی تھی۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ یہ ڈنڈا دوسرے ڈنڈوں کی جنس سے ہے، اس سے وہ منافع حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے ڈنڈوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

بعض اہل محبت وعشق فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بقدر ضرورت جواب سے زائد کلام اس لئے فرمائی تا کہ محبوب سے کلام کی لذت حاصل کریں پھر زیادہ تفصیل سے بھی جواب نہیں دیا تا کہ کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے بے ادبی نہ ہو جائے، یعنی ادب واحترام کے تقاضا کی بناء پر کلام کو زیادہ طویل بھی نہیں کیا۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾

"حکم ہوا ڈال دے اسے زمین پر موسیٰ ۱ؔ"

۱ؔ یعنی اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو اور اس کے دوسرے مقاصد کی حقیقت جان لو گے وھب فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسے پھینکنے کا حکم فرما رہے ہیں(1)۔

فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾

"تو آپ نے اسے زمین پر ڈال دیا پس اچانک وہ سانپ بن کر (ادھر ادھر) دوڑنے لگا۔ ۱ؔ"

۱ؔ جونہی موسیٰ علیہ السلام نے اس ڈنڈے کو پھینکا تو وہ سانپ بن کر تیزی سے پیٹ کے بل دوڑنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر (حیۃ) کی جگہ جان فرمایا ہے۔ كَاَنَّهَا جَآنٌّ۔ جان چھوٹے باریک جسم والے سانپ کو کہتے ہیں۔ اور ایک مقام پر ثعبان فرمایا فاذا ھی ثعبان' ثعبان تمام سانپوں سے بڑا ہوتا ہے حیۃ کا لفظ چھوٹے' بڑے' مذکر اور مونث تمام قسم کے سانپوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ثعبان اور جان ایک سانپ کے لئے استعمال نہیں ہوسکتے تو اس کا جواب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سانپ کے لئے کبھی ثعبان کبھی جان اور کبھی حیہ کا لفظ استعمال فرمایا۔ بعض علماء نے ان آیات میں تطبیق اس طرح کی ہے کہ اس کی ابتدائی حالت کے اعتبار سے اسے جان فرمایا۔ کیونکہ پہلے وہ ڈنڈے کی مقدار میں تھا۔ پھر وہ پھول گیا حتیٰ کہ ثعبان بن گیا۔ یعنی اس کی انتہائی اور آخری حالت کے اعتبار سے ثعبان فرمایا۔ بعض نے اس طرح مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ سانپ بڑائی میں ثعبان تھا، تیزی میں جان تھا اسی وجہ سے کانھا جان فرمایا (گویا وہ جان تھا) فاذا ھی جان نہیں فرمایا جس طرح کہ فرمایا فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (تو فوراً وہ صاف اژدھا بن گیا) محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ڈنڈا ایک بڑا سانپ بن گیا ہے اور اس کی شاخیں اس کے لئے باچھیں بن گئی ہیں اور نوک (برچھی) گردن اور کلغی ہوگئی ہے اور وہ حرکت کررہی ہے اور اس کی آنکھیں آگ کی طرح چمک رہی ہیں۔ وہ جب بڑی بڑی چٹانوں کے پاس سے گذرتا جو اونٹوں کی مثل تھیں تو انہوں بھی نگل لیتا، وہ درختوں کے نیچے آتا تو پتے خود بخود جھڑنے لگتے اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کے دانتوں کے پیسنے کی آواز سنی۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ ہیبت ناک منظر دیکھا تو آپ پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے۔ پھر اپنے رب کو یاد کیا اور ندامت آمیز کیفیت میں کھڑے ہو گئے(2)۔

قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ ٭ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾

"حکم ہوا اسے پکڑ لو اور مت ڈرو ہم لوٹا دیں گے اسے اپنی پہلی حالت پر ۱ؔ"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 216

لے اے کلیم واپس آ ؤ اور اسے پکڑلو اور ڈریئے مت۔ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۞ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ میرے حضور ڈرانہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) پھر (وہ ظالم بھی اگر نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد تو میں بے شک غفور رحیم ہوں)

ہم اسے بالکل پہلی ہیئت پر لوٹا دیں گے۔سیرہ فعلۃ کے وزن پر سیر سے مصدر ہے اس کا معنی طریقہ اور ہیئت ہے اور سیرۃ ترکیب نحوی کے اعتبار سے سنعیدھا کی ضمیر منصوب سے بدل اشتمال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اصل میں الی سیرتھا تھا یا یہ کہا جائے گا کہ اعادٗ عادہ سے منقول ہے اور عاد الیہ کے معنی میں ہے یا ظرف کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی سنعیدھا فی سیرتھا تھا۔ یا فعل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا اس طریقہ پر منصوب ہے ضربتہ سوطاً۔ (یعنی مفعول مطلق کے قائم مقام اس کا آلہ رکھا جائے) یا یہ مفعول ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ نعید جعل کے معنی کی تضمین کے ساتھ ہے۔ یعنی ہم اس عصا کو لوٹا دیں گے درآں حالیکہ ہم اس کو پہلی حالت پر بنا دیں گے پھر اس سے اسی طرح نفع اٹھائے گا جس طرح تو پہلے اٹھاتا تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک اونی قمیص پہنی ہوئی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے سانپ کو پکڑنے کا حکم دیا تو آپ نے قمیص کی ایک طرف اپنے ہاتھ پر لپیٹ دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ کھولنے کا حکم فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ کھول دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے ہاتھ پر کپڑا لپیٹا تو موسیٰ علیہ السلام سے ایک فرشتہ نے کہا جناب جس مصیبت سے آپ بچنا چاہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ اس کا حکم فرما دیں تو کیا یہ کپڑا تمہیں اس مصیبت سے بچا سکتا ہے؟ فرمایا نہیں لیکن میں خلیفہ ہوں اور میری تخلیق ہی کمزور کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ سے کپڑا اتار دیا اور (توکل برخدا کر کے) اپنا ہاتھ سانپ کے منہ میں ڈال دیا۔ تو وہ فوراً پہلے کی طرح ڈنڈا بن گیا۔ اور آپ کے ہاتھ ان شاخوں پر تھے جہاں آپ سہارا لینے کے وقت ہاتھ رکھا کرتے تھے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزات دکھانے کا اس لئے ارادہ فرمایا تا کہ جب فرعون جیسے ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے آپ اپنے ڈنڈے کو پھینکیں (اور یہ سانپ بن جائے) تو آپ گھبرا نہ جائیں (1) امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا پر کھانا مشکیزہ اٹھاتے تھے اور وہ آپ کے ساتھ چلتے ہوئے کلام بھی کرتا تھا۔ آپ اسے زمین پر مارتے تو اس کا کھانا نکل آتا، آپ اسے زمین میں گاڑھتے تو پانی نکل آتا، جب آپ اسے کھینچ لیتے تو پانی رک جاتا، اور کبھی آپ کا دل پھل فروٹ کھانے کا ہوتا تو اسے گاڑھ دیتے، اس پر ٹہنیاں پتے اور پھل لگ جاتے اور جب کنویں سے پانی نکالنے کا ارادہ فرماتے تو اسی عصا کو لٹکاتے تو وہ کنویں کی مقدار لمبا ہو جاتا۔ اور اس کی شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ آپ پانی نوش فرما لیتے۔ رات کو وہی عصا چراغ کا کام دیتا اور جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تو آپ اسی ڈنڈے کے ساتھ جنگ کرتے اور اپنا دفاع کرتے (2)۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۙ﴿۲۲﴾

''اور (حکم ملا) دبالو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے لے یہ نکلے گا خوب سپید ہو کر بغیر کسی بیماری کے یہ دوسرا معجزہ (ہم نے تمہیں دیا) ہے ۲ ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریہ) 2۔ ایضاً صفحہ 215

۱۔ امام بغوی فرماتے ہیں جناح سے مراد بائیں بغل ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی تحت لکھا ہے۔ جناح الانسان انسان کے بازو کو کہتے ہیں اور یہ بغل تک کو شامل ہے(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ پرندے کے پروں سے استعارہ ہے۔ ان کو جناح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں کو جھکا تا ہے(2)۔ قاموس میں ہے کہ جوانح سے مراد وہ پسلیاں ہیں جو سینے کے نیچے ہوتی ہیں اور سینے سے ملی ہوئی ہوتی ہیں اس کا واحد جانحۃ ہے(3)۔ جناح کا لفظ ید (ہاتھ) عضو مضد (بازو) اور ابط (بغل) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تخرج جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اضمم یدک الی جناحک واَخرِجْ تَخرُجْ۔ بیضاء کا معنی چمک دار ہے۔ یہ تخرج کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔ من غیر سوءٍ یعنی بغیر کسی عیب اور قبح کے یہ برص کی بیماری سے کنایہ ہے کیونکہ طبیعت برص کی بیماری (جس سے جسم پر سفید داغ بن جاتے ہیں) نفرت کرتی ہے۔ یہ بیضاء کے متعلق ہے کیونکہ یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ گویا ابیضت من غیر سوءٍ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ایسا نور تھا جو دن رات سورج اور چاند کی طرح چمکتا تھا(4)۔

۲۔ ایۃً اخری یعنی تمہارے دعویٰ نبوت کی صداقت پر یہ دوسری دلیل ہے اور یہ تخرج کی ضمیر مستتر سے یا بیضاء کی ضمیر سے دوسرا حال ہے۔ یاخذ مضمر یا دونک (بمعنی خذ) مضمر کا مفعول ہے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۳﴾

''تا کہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں ۱''

۱۔ لنریک خذیا دونک مضمر کے متعلق ہے یا جس فعل پر آیت یا قصہ دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے تا کہ تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔ الکبری یا تو ایاتنا کی صفت ہے۔ لنریک کا دوسرا مفعول ہے اور من آیاتنا اس سے حال ہے۔ الکبر کی بجائے الکبری فرمایا تا کہ آیات کے سرے مل جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کلام میں اضمار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے لِنُرِيَكَ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى مِنْ اٰيَاتِنَا۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ مبارک اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانی تھی(5)۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾

''(اب) جایئے فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے ۱''

1۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی صداقت کی دونشانیاں لے کر فرعون کے پاس جاؤ اور اسے میری عبادت کی دعوت دو، وہ حد سے بڑھ گیا ہے اور سرکشی اور نافرمانی میں انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے مملکت اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر الوہیت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ انہ طغیٰ کا جملہ اذھب کی تعلیل بیان کر رہا ہے۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾

''آپ نے دعا مانگی اے میرے پروردگار کشادہ فرما دے میرے لئے میرا سینہ ۱''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 609 (العلمیۃ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 216 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216
6۔ ایضاً

1۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے التجا کی کہ میرا سینہ کشادہ فرما دے، اس میں وہ عرفان اور معارف ڈال دے جن کا ادراک عقل انسانی سے وراء ہے۔ اوران ادراکات میں ایک درک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انسان کسی چیز کے نفع اور نقصان کے پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ عرض کی اے مولا ایسا یقین اور عرفان عطاء فرما کہ دل سے فرعون کا اور اس کے لشکریوں کا خوف نکل جائے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں آپ کی مراد یہ تھی کہ میرا سینہ اس طرح منشرح فرما دے کہ میں تیرے سوا کسی سے نہ ڈروں۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سطوت وشوکت سے اور اس کے لشکر کی ہیبت سے بہت خوفزدہ تھے اس لئے آپ نے اس خوف سے نجات کی التجا کی (1)۔

وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾

''اور آسان فرما دے میرے لئے میرا یہ (کٹھن) کام 1 ''

1۔ نافع اور ابوعمرو نے لِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے میرے پالنہار تو نے تبلیغ رسالت کا کام میرے کندھوں پر ڈالا ہے۔ اس کو میرے لئے آسان فرما دے تا کہ مجھ سے کسی مشکل اور کٹھن کام کی تکلیف کا اندیشہ دور ہو جائے اور تکالیف کے کانٹوں کو برداشت کر کے میرا نفس لذت محسوس کرے۔ لی ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے اشرح لی اور یسر لی فرمایا تو مشروح اور مُيَسّر (جس کی شرح کرنی ہے اور جس کو آسان کرنا ہے) کا علم تو ہو گیا لیکن اس میں ابہام تھا۔ پھر مشروح اور میسر کو ذکر فرما کر ابہام کو دور کر دیا اور وہ مشروح ومیسر۔ سینہ اور امر ہیں۔ تو ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنا۔ یہ تاکید اور مبالغہ کے لئے ہے (کیونکہ ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنے میں اجمال اور تفصیل کے طریق سے ایک معنی کا تکرار ہوتا ہے)۔

وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾

''اور کھول دے گرہ میری زبان کی 1 ''

1۔ من لسانی یا تو عقدة کی صفت ہے یا احلل کے متعلق ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام صغر سنی میں فرعون کی پرورش میں تھے تو ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے اسے زور سے طمانچہ مارا اور اس کی داڑھی سے پکڑ لیا۔ فرعون نے اپنی بیوی آسیہ سے کہا یہ میرا دشمن ہے، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا (تمہارا دماغ اپنی جگہ پر ہے؟) یہ معصوم بچہ ہے۔ بے سمجھ ہے (اگر اس نے تجھے طمانچہ مار بھی دیا ہے تو کون سا آسمان گر پڑا ہے) ایک روایت میں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے جب آپ کا دودھ چھڑایا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو آسیہ کے پاس پہنچا دیا۔ آپ فرعون اور آسیہ کی پرورش میں تھے۔ دونوں نے آپ کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔ اسی صغر سنی کے دوران آپ ایک دن فرعون کے سامنے کھیل رہے تھے اور آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس سے آپ کھیل رہے تھے۔ آپ نے اچانک چھڑی اٹھائی اور فرعون کے سر پر دے ماری۔ (فرعون کو غصہ آیا) اور اس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا اے بادشاہ یہ معصوم بچہ ہے، اسے کوئی سمجھ نہیں ہے، اس کی بے سمجھی کا تو اگر چاہتا ہے تو تجربہ کر لے۔ آسیہ دو تھال (ڈش) لے کر آئی جن میں سے ایک میں آگ کے انگارے تھے اور دوسری میں جواہر و موتی تھے۔ وہ دونوں تھال جب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھے گئے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواہر اٹھانے کا ارادہ کیا لیکن جبرئیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ آگ پر رکھ دیا اور ایک انگارہ اٹھا کر منہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریہ)

میں ڈال لیا۔ اس سے آپ کی زبان جل گئی اور اس پر ایک گرہ بن گئی (1)۔

عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ فرعون ایک دن موسیٰ علیہ السلام کو اٹھائے ہوئے تھا تو آپ نے اس کی داڑھی سے پکڑا اور اسے زور سے کھینچا۔ وہ ظالم غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا۔ یہ چھوٹا بچہ ہے اسے تو انگاروں اور جواہر و یاقوت کے فرق کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ آپ کے سامنے یہ دونوں چیزیں لائی گئیں تو آپ نے جواہر کو اٹھانے کا ارادہ فرمایا لیکن جبرئیل نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ انگارے پر رکھا اور انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال دیا جس کی وجہ سے آپ کی زبان جل گئی اور گرہ پڑ گئی۔

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾

''تا کہ اچھی طرح سمجھ سکیں وہ لوگ میری بات [1]''

[1] آپ کی زبان کی گرہ مکمل طور پر کھلنے میں اختلاف ہے۔

جو علماء فرماتے ہیں کہ آپ کی زبان کی گرہ مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی ان کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (منظور کر لی گئی ہے تیری درخواست اے موسیٰ) کیونکہ جو آپ نے دعا اور التجا کی تھی اس آیت میں اس کی قبولیت کا مژدہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کی زبان کی گرہ بھی کھل گئی تھی اور جو کہتے ہیں کہ یہ گرہ نہیں کھلی تھی وہ اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں۔ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے کہا ہے۔ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ۔ ترجمہ:۔ کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا پہلے قول کا۔ دوسرے طبقہ کے علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ آپ نے مطلقاً اپنی زبان کی گرہ کھولنے کا سوال نہیں کیا تھا بلکہ اتنی گرہ دور کرنے کا سوال کیا تھا جو دوسروں کو بات سمجھانے سے مانع ہو، اسی وجہ سے اس کو نکرہ ذکر فرمایا اور یفقھو کو امر کے جواب میں مجزوم ذکر فرمایا ہے۔

وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾

''اور مقرر فرما میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے [1]''

[1] وزیراً، وزرٌ سے مشتق ہے جس کا معنی بوجھ ہے۔ چونکہ وزیر امیر (بادشاہ) کا بوجھ اٹھاتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں یا یہ اس الوزر سے مشتق ہے۔ جس کا معنی وہ پناہ گاہ ہے جو پہاڑ میں ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ اس کی رائے اور مشورے کی وجہ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور تمام امور میں اس کی طرف پناہ لیتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں۔ اسی سے الموازرۃ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل ازیر ہے اور یہ الازر سے مشتق ہے۔ جس کا معنی قوت ہے، یہ فعیل بمعنی مفاعل ہے جیسے عشیر بمعنی معاشر اور جلیس بمعنی مجالس ہے۔ چونکہ اموازر میں ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے اس لئے ازیر میں بھی ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے کیونکہ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ من اھلی یا تو وزیر کی صفت ہے یا اجعل کے متعلق ہے اور ھارون اجعل کا مفعول اول ہے اور وزیر مفعول ثانی ہے لیکن اہمیت کے پیش نظر اسے مقدم کیا گیا ہے۔ اور لی یا تو فعل کے متعلق ہے۔ یا محذوف کے متعلق ہو کر وزیراً سے حال ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لی مفعول ثانی ہو اور وزیراً مفعول اول ہو۔ اور ہارون وزیر کا عطف بیان ہو۔ یہ بھی ترکیب ہو سکتی ہے کہ وزیراً مفعول اول ہو اور من

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریۃ)

اھلی مفعول ثانی ہو اور لی تبیین ہو جیسے وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ میں ہے اخی کو ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اخی، ہارون سے بدل ہے یا مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔

اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ۟ۙ

''مضبوط فرمادے اس سے میری کمر لے''

لے قاموس میں الازر کا معنی احاطہ، قوت، ضعف ضد التقویه اور پیٹھ لکھا ہے(1)۔ معنی یہ ہے کہ اس سے میری کمر مضبوط کر دے، یا میری قوت مضبوط کر دے یا میرے ضعف کو قوت عطا فرمادے۔

وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ۟ۙ

''اور شریک کر دے اسے میری (اس) مہم میں لے''

لے اسے امر نبوت اور تبلیغ میں میرا شریک بنا دے۔ ابن عامر نے اشدد کو الف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور اشرک کو مضارع کا صیغہ کر کے ھمزہ کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔ جمہور علماء نے اشدد کو ہمزہ وصلی مفہوم کے ساتھ اور اشرک کو ہمزہ قطعی مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اجعل سے بدل اشتمال ہے۔

كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۟ۙ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ۟ؕ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ۟

''تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں اور ہم کثرت سے تیرا ذکر کریں بیشک تو ہمارے (ظاہر باطن کو) خوب دیکھنے والا ہے لے''

لے کلبی نے نسبح کا معنی نصلی کیا ہے، یعنی ہم کثرت سے تیری نماز پڑھیں(2) آپ نے یہ درخواست اس لئے کی تھی کیونکہ تعاون رغبت کو مزید بڑھاتا ہے اور زیادہ نیکیاں کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے، تو ہمارے حال سے اچھی طرح باخبر ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ تعاون ہمارے لئے بہتر ہے اور تجھے یہ بھی علم ہے کہ میرے اس معاملہ میں جس کا تو نے مجھے حکم فرمایا ہے ہارون بہتر مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰى ۟

''جواب ملا منظور کر لی گئی ہے آپ کی درخواست اے موسیٰ لے''

لے سئول بروزن فعلٌ ہے اور یہ مفعول کے معنی میں ہے جیسے خبز بمعنی مخبوز اور اکل بمعنی ماکول ہوتا ہے۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى ۟ۙ

''اور ہم نے احسان فرمایا تھا تم پر ایک بار پہلے بھی لے''

لے یہ محذوف قسم کا جواب ہے، یعنی قسم بخدا ہم نے تم پر انعام کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی۔ مرۃ اخری مَنَنَّا کی ظرف ہے۔ بعض نے مَرَّۃً اُخْرٰی کا معنی اس مرتبہ کیا ہے۔

اِذْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا یُوْحٰۤى ۟ۙ

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 491 (التراث العربی)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

"جب ہم نے وہ بات الہام کی تھی تمہاری ماں کو[1] جو الہام ہی کئے جانے کے قابل تھی [1]۔"

[1] اذ تعلیل کے لئے ہے اور مَنَنَّا کی ظرف بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں وحی سے مراد الہام ہے یا خواب میں بتانا ہے یا اس وقت جو نبی تھا اس کے ذریعے بتانا ہے یا فرشتے کے ذریعے بتانا ہے جیسے حضرت مریم کو فرشتے کے ذریعے پیغام بھیجا تھا لیکن یہ نبوت کے طریقہ پر نہ تھا۔

نوٹ: وحی اور نبوت تشریعی انبیاء کرام کے ساتھ مختص ہے اور انبیاء کرام سب مرد تھے اور یہ سلسلہ نبوت محمد ﷺ پر ختم ہو گیا۔ لیکن وہ وحی جو تشریعی نہیں ہوتی خواہ وہ بطریق الہام ہو یا ملائکہ کی کلام کے ذریعے ہو (جس طرح مریم علیہا السلام کے ساتھ ہوئی تھی) انبیاء کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ یہ اولیاء کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور یہ غیر تشریعی وحی کا سلسلہ نبی کریم ﷺ کے بعد بھی منقطع نہیں ہوا۔ اسی طرح پیروی کی وجہ سے کمالات نبوت کا حصول بھی غیر انبیاء کے لئے ہوتا رہتا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ الفتوحات کے دوسو بہترویں باب میں لکھتے ہیں کہ نبوت تشریع کے حکم کے اعتبار سے اس امت میں ختم ہو چکی ہے لیکن اس کی میراث ختم نہیں ہوئی۔ پس کچھ لوگ نبوت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ رسالت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ نبوت اور رسالت دونوں کے وارث ہوتے ہیں۔ علماء جو یہ فرماتے ہیں کہ نبوت اختصاص الٰہی ہے اس سے مراد نبوت تشریعی ہے، یعنی وحی الٰہی کے ذریعے احکام کا نزول انبیاء کرام پر ہوتا ہے اور یہی نبوت تشریعی ہے۔ جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے۔ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے فتوحات کے باب الصلوٰۃ میں بھی اس طرح لکھا ہے۔ فرماتے ہیں یہ مقربین لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا۔ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ۔ میں نے سورۂ نساء اور سورۂ واقعہ میں ذکر کیا ہے کہ مقربین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو وارثہ کمالات نبوت حاصل ہوتے ہیں، وہ وحی جو تشریعی نہیں ہے انبیاء کرام کے ساتھ مختص نہیں ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ نَاسٌ مُحَدَّثُوْنَ فَإِنْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ فَإِنَّهُ عُمَرُ۔ تم سے پہلی امتوں میں کچھ لوگ محدث تھے میری امت میں سے اگر کوئی ایک محدث ہے تو وہ عمر ہے (1)۔ بخاری، مسلم، نسائی اور ابو نعیم الموصلی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث اس طرح مروی ہے۔ لَقَدْ كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ رِجَالٌ يُكَلَّمُوْنَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُوْنُوا أَنْبِيَاءَ فَإِنْ يَكُنْ مِنْ أُمَّتِي أَحَدٌ فَعُمَرُ۔ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے کامل مرد تھے جن سے (وحی کے ذریعے) کلام کی جاتی تھی لیکن وہ انبیاء نہیں تھے پس اگر میری امت میں کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَوْ كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ(2) (اگر میرے بعد نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتا۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے، ابن حبان اور حاکم نے عقبہ بن عامر سے روایت کی ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے، طبرانی نے عصمہ بن مالک سے روایت کی ہے۔ ابو سعید الخدری اور ابن عساکر نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔

شیخ شعرانی الیواقیت والجواہر میں فرماتے ہیں کیا الہام بغیر واسطہ کے ہو سکتا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ ہاں ہو سکتا ہے، کبھی بندے کو اس خاص وجہ سے الہام ہوتا ہے جو ہر بندے اور اس کے رب کے درمیان ہوتی ہے، اور اس وجہ کو فرشتہ بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس وجہ کے انکار کی طرف لوگ جلدی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام پر انکار کیا تھا۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ رسول اور نبی فرشتہ کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن غیر رسول اس کا اثر محسوس کرتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 556 (قدیمی) 2۔ ایضاً، صفحہ 558

نہیں کرتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ غیر رسول کو کبھی فرشتہ کے ذریعے الہام فرماتا ہے۔ اور کبھی سارے واسطے ختم کر کے اس مخصوص تعلق اور وجہ کی بناء پر الہام فرماتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم ترین القاء ہے۔ اور یہ القاء رسول اور ولی دونوں کو ہوتا ہے۔

شیخ عبدالوہاب الشعراوی، شیخ ابوالمواہب الشاذلی قدس اللہ سرہما سے روایت کر کے لکھتے ہیں کہ جب بعض لوگوں نے کسی کے اس قول پر اعتراض کیا کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بات بتائی تو آپ نے فرمایا اس قول کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بطریق الہام بات بتائی۔ اور یہ الہام اولیاء کرام کی وحی ہے، یہ وہ انبیاء کرام والی وحی نہیں ہے۔ ان کا انکار صرف اس پر ہو سکتا ہے جو یہ کہے۔ كَلَّمَنِيْ رَبِّيْ كَمَا كَلَّمَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ کہ میرے رب نے مجھ سے کلام فرمایا جس طرح اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا (شیخ موصوف کا کلام ختم ہوا)

میں کہتا ہوں ولی بھی فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جیسے مریم نے جبرئیل امین کو دیکھا تھا جب وہ بشری لباس میں تشریف لائے تھے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں)

۱؎ مایوحیٰ سے مراد ایسی چیز ہے جو صرف وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے یا وہ اس لائق ہے کہ اسے وحی کیا جائے کیونکہ اس کی شان بہت بلند ہے اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾

''یہ کہ رکھ دو اس معصوم بچے کو صندوق میں پھر ڈال دو اس صندوق کو دریا میں پھینک دے گا اسے دریا ساحل پر ۱؎ پھر پکڑے گا اسے وہ شخص جو میرا بھی دشمن ہے اور اس بچے کا بھی دشمن ہے ۲؎ اور (اے موسیٰ) میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جناب سے (تاکہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے اور (اس تدبیر کا منشا یہ تھا) کہ آپ کی پرورش کی جائے میری چشم (کرم) کے سامنے ۳؎''

۱؎ اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ وحی بمعنی قول ہے یا مصدریہ ہے اور اس سے پہلے باء حرف جر مقدر ہے۔ الْيَمُّ سے مراد دریائے نیل ہے۔ الساحل سے مراد جانب ہے۔ جانب کو ساحل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ پانی اس جانب (کنارہ) کو چھیلتا ہے اور اتارتا ہے اس سے جو اس کے اوپر ہوتا ہے۔ یہاں فليلقه امر کا صیغہ ذکر فرمایا تاکہ ماقبل کلام سے مناسبت رہے لیکن اس کا معنی خبر ہے، یعنی دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔ لفظی تناسب کے اعتبار سے عطف کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ امر کا صیغہ اپنے معنی پر ہے۔ دریا کو حکم ہو رہا ہے اور یہ اس امر پر معطوف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ احسن الی زید وليحسن زيد الیک بعض علماء فرماتے ہیں اس کا عطف قلنا کی تقدیر کے ساتھ اوحینا پر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہو گی قلنا ليلقه اليم بالساحل۔ میں کہتا ہوں امر اگر خبر کے معنی میں ہے تو پھر وہ وحی میں داخل ہے۔ اور اگر امر حکم کے معنی میں ہو تو پھر قلنا کی تقدیر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اقذفيه في اليم پر بھی جائز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دریا کو حکم کیسے ہو سکتا ہے، دریا تو عقل اور سمجھ رکھتا ہی نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر تکوینی ہے، اس کے لئے تعقل (سمجھنا) ضروری نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جب دریا کا موسیٰ علیہ السلام کو ساحل پر ڈالنا واجب تھا کیونکہ ارادہ الٰہی اس کے متعلق ہو چکا تھا تو

اللہ تعالیٰ نے دریا کو ایسے بنادیا گویا وہ عقل مند ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر پر مطلع ہے۔ پھر یاخذکو امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ذکر فرمایا۔

۳۔ عدو لی وعدوله سے مراد فرعون ہے۔ صوفیاء میں سے محققین فرماتے ہیں جمادات اگرچہ ہماری نسبت کے اعتبار سے ناسمجھ اور بے عقل ہیں اور ہمارے لئے ان سے خطاب کرنا بھی جائز نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے امر کے لئے یہ ذی شعور اور اطاعت گذار ہیں جیسا کہ قرآنی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ واذنت لربها و حقت (اور کان لگا کر سنے گی/گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے) قالتا اتینا طائعین (دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پہاڑ پہاڑ کو نداء دیتا ہے۔ کہ اے فلاں کیا تیرے سے کوئی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے گذرا ہے(1)۔ مولانا روم نے فرمایا

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند پیش تو مردہ و برحق زندہ اند

مٹی، ہوا، پانی آگ سب اللہ کے بندے ہیں اے انسان تیرے سامنے یہ مردہ ہیں لیکن اللہ کے لئے زندہ ہیں

فرعون پر دشمن ہونے کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نسبت سے حقیقت ہے کیونکہ وہ مشرک تھا (اور مشرک اللہ کے دشمن ہیں) لیکن موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے اس کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا تو وہ اس وقت آپ کا دشمن نہ تھا۔ اسی وجہ سے عدو کا لفظ مکرر ذکر فرمایا کیونکہ حقیقت ومجاز کا ایک لفظ میں جمع کرنا ممتنع تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عدو کا تکرار مبالغہ کے لئے ہو۔ اور دونوں لفظوں سے مراد مستقبل کی بات ہو یا موجود وقت مراد ہو کیونکہ فرعون کاہنوں کی خبروں کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے درپے تو تھا۔ کیونکہ فرعون کو کاہنوں نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیری بادشاہی کو ختم کردے گا۔ اسی وجہ اس نے بہت سی تعداد میں بنی اسرائیل کے بچے قتل کروادیے تھے۔ اسے معلوم نہ ہوسکا کہ موسیٰ وہ بچہ ہے ورنہ وہ اسے بھی قتل کردیتا۔ تمام ضمیریں موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ بعض کو موسیٰ کی طرف اور بعض کا تابوت کی طرف لوٹنا نظم کلام میں تنافر کا باعث بنتا ہے۔ سمندر میں ڈالا جانے والا اگرچہ بالذات تابوت تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام بھی بالعرض ان صفات سے موصوف تھے کیونکہ آپ تابوت کے اندر تھے۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے تابوت بنایا اور اس میں دھنی ہوئی روئی رکھی پھر اس میں موسیٰ علیہ السلام کو رکھ دیا۔ پھر تابوت میں جو کچھ شگاف اور دراڑیں تھیں ان کو بند کر کے دریائے نیل میں ڈال دیا۔ دریائے نیل سے ایک بڑی نہر نکل کر فرعون کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ فرعون اپنی بیوی آسیہ کے ساتھ اسی نہر کے کنارے بیٹھا تھا کہ پانی اس تابوت کو بہا کر لے آیا۔ فرعون نے اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو حکم دیا کہ اس تابوت کو نکال لاؤ۔ وہ تابوت نکال کر لے آئے اور اس کا دروازہ کھولا تو اس میں ایک بچہ تھا جو انتہائی خوش شکل اور خوبصورت تھا۔ فرعون نے جب اسے دیکھا تو اس کی من بھاتی صورت پر فریفتہ ہوگیا(2) اس چیز کا اظہار قرآن نے وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ کے الفاظ میں کیا ہے۔ مِنّی کا لفظ ظرف مستقر ہے اور محبت کی صفت ہے یا القیت کی ظرف لغو ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تجھ پر اپنی محبت کا پرتو ڈالا جو میری طرف سے ہے اور جسے میں نے دلوں میں تخلیق کیا ہے۔ یا یہ معنی کہ میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی یعنی میں نے تجھ سے محبت کی جب کسی سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس سے محبت فرماتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ میں نے اس سے محبت کی اور اپنی مخلوق کے دلوں میں بھی اس کی محبت پیدا فرمادی۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جو بھی آپ کو ایک نگاہ دیکھ لیتا دیوانہ ہوجاتا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں میں اتنی

1۔ معجم کبیر، جلد 9، صفحہ 103 (العلوم والحکم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

ملاحت تھی کہ جو بھی آپ کے دیدار سے مشرف ہوتا اسے آپ سے عشق ہو جاتا(1)۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تیرے دل میں اپنی طرف سے محبت ڈالی اور وہ محبت تجھ پر غالب آ گئی اور تو مجھ سے دل و جان سے محبت کرنے لگا اور تو نے اپنے دل کو میری محبت کے لئے خاص کر دیا اور کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہوا اور تو محبت کرنے والوں کا سردار بن گیا۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت موسیٰ کلیم کے تعین کا مبدء مُحِبِّیَة محضہ تھا اور پیارے محمد ﷺ کے تعین کا مبدء محبوبیت محضہ تھا۔ اسی وجہ سے موسیٰ کلیم عاشقوں کے سردار ہیں اور محبوب کریم ﷺ محبوبوں کے سردار ہیں۔

ایک صوفی کشف کی نظر سے محبت کے دائرہ میں ایک محیط دیکھتا ہے جو خلت ہے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے۔ اور ایک اسے مرکز نظر آتا ہے جو محبت صرفہ ہے اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے اور مرکز محیط سے افضل، اعلیٰ اور وسیع ہوتا ہے، مرکز اور محیط کی نسبت ایسی ہے جیسے چاند کی نسبت ہالہ سے ہے۔ پھر مزید بلندی کے وقت مرکز دائرہ محبت میں محیط نظر آتا ہے اور یہ موسیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے اور اس بلندی میں جہاں مرکز محیط بن گیا ہے وہ جو مرکز ہے وہ محبوب کریم ﷺ کا مبدء تعین ہے۔ جب محبوب کریم ﷺ محبوبیت کے اس انتہائی مقام پر فائز ہیں تو آپ کا مبدء تعین دائرہ محبوبیہ صرفہ کا مرکز ہوا اور دائرہ محبوبیت کے محیط کو آپ ﷺ نے اپنی امت کے بعض افراد کے لئے چھوڑ دیا (یہاں محیط سے مراد محبوبیت ممتزجہ ہے) اور جس ذات کے لئے یہ محبوبیت ممتزجہ آپ ﷺ نے چھوڑی ہے وہ مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ کی ذات ہے۔ آیت کے الفاظ کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ دریا نے آپ کو ساحل پر پھینکا تھا اور پھر آل فرعون نے آپ کو اٹھا لیا تھا تا کہ انجام کار وہ ان کا دشمن اور حزن کا باعث ہو جائے اگر صحیح ہو کہ آل فرعون نے انہیں دریا سے نکالا تھا (جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے) تو تطبیق اس طرح ہو گی کہ دریا نے انہیں اس نہر کے منہ پر ڈال دیا۔ جو فرعون کے باغ کی طرف جاتی تھی۔ پھر اس نہر نے انہیں باغ کے تالاب میں پہنچا دیا تھا اور آل فرعون نے انہیں تالاب سے نکالا تھا۔ القیت کا عطف اوحینا پر ہے۔

؎ تصنع کا یہاں معنی تربیی ہے۔ یعنی تیری تربیت کی جائے اور تجھ سے احسان کیا جائے۔ یہ صنعت فرس سے مشتق ہے جس کا معنی کہ میں نے گھوڑے کی اچھی طرح دیکھ بھال کی اور جعفر نے اس کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ امر ہے۔ عینی کو نافع اور ابو عمر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ علی عینی لتصنع کی ضمیر مرفوع سے حال ہے۔ جمہور کی قرات کے مطابق و لتصنع ایک علت مضمرہ پر معطوف ہے جس کی تقدیر لیتعطف علیک ہے یا یہ فعل معلل کے اضمار کے ساتھ سابقہ جملہ پر معطوف ہے اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہے فعلت ذالک لتصنع اور ابو جعفر کی قرأت پر یہ یا خذہ پر معطوف ہو گا۔

إِذْ تَمْشِيٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ ۖ فَرَجَعْنَٰكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِيٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ ۝

"یاد کرو جب چلتے چلتے آئی آپ کی بہن اور کہنے لگی (فرعون کے اہل خانہ سے) کیا میں بتاؤں تمہیں وہ آدمی جو اس کی پرورش کر سکے ؎ پس (یوں) ہم نے آپ کو لوٹا دیا آپ کی ماں کی طرف ؎ تا کہ (آپ کو دیکھ کر) اپنی آنکھ ٹھنڈی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

کرے اور غم ناک نہ ہو اور (تمہیں یاد ہے جب) تو نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو پس ہم نے نجات دی تھی تمہیں غم و اندوہ سے اور ہم نے تمہیں اچھی طرح جانچ لیا تھا[3] پھر تم ٹھہرے رہے کئی سال اہل مدین میں پھر تم آ گئے ایک مقررہ وعدہ پر اے موسیٰ ہے"

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ کا نام مریم تھا۔ یعنی یاد کرو جب تیری بہن مریم آئی تا کہ تیری خبر معلوم کرے، انہوں نے بہت سے دودھ پلانے والی عورتوں پر تمہیں پیش کیا اور تو نے کسی ایک کے پستان کو منہ لگانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اذ ظرف ہے القیت کی یا لتصنع کی یا یہ اذ اوحینا سے بدل ہے اس بناء پر کہ اس سے مراد وسیع وقت ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اذ تعلیل کے لئے ہے۔ آپ کی ہمشیرہ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک عورت بتاتی ہوں جو اسے دودھ پلائے گی اور یہ اس کے سینے سے چمٹ جائے گا۔ جب آپ کی ہمشیرہ نے یہ کہا تو وہ اس کی بات کے قائل ہو گئے۔ ہمشیرہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو لے آئی اس نے سینہ سے لگایا تو آپ نے ان کا دودھ قبول فرما لیا۔

[2] ہم نے جو آپ کی والدہ سے وعدہ کیا تھا انا رادوہ الیک تو اس کو پورا کرتے ہوئے ہم نے تجھے تمہاری ماں کی طرف اپنی حسن تدبیر سے لوٹا دیا ہے تا کہ تیری ملاقات سے ان کی مامتا کو ٹھنڈک اور سکون نصیب ہو اور تیرے فراق میں پریشان نہ ہو یا تو ان کے فراق میں غمزدہ نہ ہو۔ ایک اور افعال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اے موسیٰ یاد کرو جب تم نے ایک قبطی ظالم شخص کو قتل کیا تھا جب کہ تجھ سے ایک اسرائیلی نے مدد طلب کی تھی۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی۔ کعب الاحبار نے اسی طرح فرمایا ہے(1)۔ ہم نے تمہیں اس قتل پر مغفرت کا مژدہ سنا کر تم سے غم و اندوہ کے گہرے بادل دور کر دیئے اور فرعون کے قصاص لینے کے خوف سے مدین کی طرف ہجرت کے ذریعے امن دیا تھا۔

[3] فتوناً مصدر ہے جیسے قعود مصدر ہے یا یہ جمع ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کا معنی اختبرناک اختبارا کیا ہے۔ یعنی ہم نے تجھے اچھی طرح آزمایا۔ ضحاک نے یہ معنی لکھا ہے۔ ابتلیناک ابتلاءً ہم نے تمہیں خوب آزمائش میں مبتلاء کیا(2) یہ معنی فتوناً کے مصدر ہونے کے اعتبار سے ہے۔ یہ معنی کہ ہم نے مختلف آزمائشوں کے ذریعے تمہیں آزمایا اس صورت میں فتوناً جمع فتن ہے یا یہ فتنۃ کے معنی میں ہے اور تاء کا اعتداد ترک کیا گیا ہے۔ حجرۃ اور بدرۃ میں تاء کو ذکر نہ کر کے حجور اور بدور ذکر کیا جاتا ہے۔ مجاہد نے یہ معنی لکھا ہے اخلصناک اخلاصاً ہم نے تمہیں چن لیا ہے۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ فتون سے مراد آپ کا آزمائشوں میں واقع ہونا ہے۔ جن سے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاصی عطا فرمائی تھی۔ پہلی آزمائش یہ تھی کہ آپ کی والدہ آپ کے ساتھ اس سال حاملہ ہوئیں جس سال میں فرعون پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیتا تھا۔ آپ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں پھینکنا، اپنی ماں کے علاوہ کسی دایہ کے دودھ پینے سے روک دینا، آپ کا فرعون کی داڑھی کھینچنا حتی کہ اس نے آپ کو قتل کا ارادہ کر لیا تھا، آپ کا موتیوں کی بجائے آگ کا انگارہ اٹھا لینا پھر آپ کا قبطی کو قتل کرنا۔ پھر آپ کا مدین کی طرف نکل جانا۔ میں کہتا ہوں پھر مدین کی طرف ہجرت کرتے وقت مختلف مشقتیں برداشت کرنا۔ مثلاً وطن کا چھوڑنا، اپنے رشتہ داروں کی جدائی اٹھانا، احتیاط کے ساتھ پیدل چلنا، زاد راہ کا ساتھ نہ ہونا اسی طرح تکلیفیں اٹھانا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھے یکے بعد دیگرے مشقت کی بھٹی میں ڈال کر خوب صاف و شفاف کر لیا جس طرح سونے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور اس کے خبث اور کھوٹ کو دور کر کے سونے کو خالص کر دیا جاتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریۃ)

موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے نکاح کرنے کے بعد مہر کی ادائیگی کے لئے کئی سال حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے رہے۔ مدین مصر سے آٹھ مراحل کے فاصلہ پر ہے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس اٹھائیس سال رہے۔ دس سال ان کی بیٹی کے مہر کے طور پر اور اٹھارہ سال ویسے بعد میں رہے (اس عمر کی تکمیل کے لئے جس میں انبیاء کو نبوت ملتی ہے یعنی چالیس سال) حتیٰ کہ آپ کی اولاد ہوگئی (1)۔

یعنی پھر تم وادی مقدس میں آئے اس وقت پر جو میں نے تیرے آنے کے لئے مقرر کیا تھا محمد بن کعب نے یہی مفہوم لکھا ہے۔ یا اس مقدار میں جس میں انبیاء کی طرف وحی کی جاتی ہے (2)۔ یعنی جب تیری عمر چالیس سال ہوگئی، یہ عبدالرحمٰن بن کیسان کی توجیہ ہے اور اکثر مفسرین کا بھی یہی خیال ہے۔ یعنی وہ وقت جو اللہ تعالیٰ نے رسالت عطا کرنے کا مقرر فرمایا تھا اور وہ چالیس سال کی عمر کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محبت اور انس کی وجہ سے یا موسیٰ کا تکرار فرمایا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا من احب شیئاً اکثر ذکرہ (3) (جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے) اس حدیث کو صاحب مسند الفردوس نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔

وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ﴿٤١﴾

''اور میں نے مخصوص کرلیا ہے تمہیں اپنی ذات کے لئے 1 ''

1 یعنی میں نے تمہاری تربیت کی اور خوب تربیت کی۔ نفسی کو کوفیوں اور ابن عامر نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظاً یاء کو وصل کی صورت میں التقاء ساکنین کی وجہ سے ساقط کر دیتے ہیں۔ جبکہ باقی قراء یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یعنی میں نے تیری تربیت کی اور میں نے تجھے اپنے لئے منتخب فرمایا ہے تاکہ تو ظاہر و باطن میں کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو' میں کہتا ہوں اس کا یہ معنی بھی ممکن ہے میں نے تجھے پیکر اخلاق حسنہ بنایا اور میں نے تیری اس طرح تربیت کی ہے کہ تو اب مجھ سے مناجات کرنے' میرا قرب حاصل کرنے اور میرے پیغام پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾

''اب جائیے آپ اور آپ کا بھائی میری نشانیاں لے کر اور نہ سستی کرنا میری یاد میں 1 ''

1 آیاتی سے مراد معجزات ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نو نشانیاں مراد ہیں جو اللہ نے آپ کو عطاء فرمائی تھیں (4)۔ سدی نے ولاتنیا کا معنی لاتفترا کیا ہے یعنی ڈھیلا نہ پڑنا۔ محمد بن کعب نے لاتقصرا معنی لکھا ہے۔ یعنی کوتاہی نہ کرنا۔ قاموس میں ونی کا معنی تھکاوٹ، سستی اور کمزوری لکھا ہے (5)۔ ذکری کی یاء کو ابن عامر اور کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ لفظاً یاء کو وصل کی صورت میں گرا دیتے ہیں اور باقی قراء یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو وحی کیا گیا تھا کیونکہ ہارون علیہ السلام اس وقت مصر میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے جائیں اور ہارون علیہ السلام کو مصر میں وحی فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام سے ملو۔ پس موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی ملاقات ہوئی، موسیٰ علیہ السلام نے وہ حکم سنایا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے آنے کی خبر سنی تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ کنز العمال: 1829 (التراث الاسلامی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ) 5۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1761 (التراث العربی)

انہوں نے راستہ میں ان کا استقبال کیا۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے دونوں کی طرف وحی فرمائی۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾

"آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس وہ سرکش بنا بیٹھا ہے [1]"

[1] اس کی سرکشی کا یہ عالم ہے کہ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اکیلے موسیٰ علیہ السلام کو جانے کا حکم دیا پھر انہیں اور ان کے بھائی کو جانے کا حکم دیا، اس لئے کلام میں تکرار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا جانا مطلقاً ہے اور دوسرا جانا مقید ہے، اس لئے تکرار نہیں ہے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

"اور گفتگو کریں اس کے ساتھ نرم انداز سے [1] شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے [2]"

[1] ابن عباس نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تم کلام میں درشتی اور سختی نہ کرنا۔ عکرمہ اور سدی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ اور ہارون نے اس سے کلام کرتے ہوئے اسے کنیت سے پکارا۔ انہوں نے اسے ابوالعباس کہہ کر پکارا۔ بعض نے لکھا ہے ابوالولید کہہ کر پکارا۔

مقاتل فرماتے ہیں نرم قول سے یہ مراد ہے هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے اور (کیا تو چاہتا ہے کہ) میں تیری رہبری کروں تیرے رب کی طرف تاکہ تو (اس سے) ڈرنے لگے (1)۔ کیونکہ یہ انداز کلام ایسا ہے جس میں عرض اور مشورہ کی صورت میں دعوت ہے۔ یہ انداز اس لئے اپنایا تاکہ عارضی اقتدار کے نشہ میں بدمست فرعون جہالت کی بناء پر ان پر حملہ نہ کر دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو اس مغرور انسان سے بڑے لطیف اور شیریں لہجہ میں کلام کرنے کا حکم اس لئے دیا کیونکہ موسیٰ پر اس کا حق تربیت تھا، اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا پوسا تھا اور آپ کی صغرسنی میں اس نے پرورش کی تھی۔ سدی کہتے ہیں قول لین سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور وعدہ کیا کہ اگر تو ایمان قبول کرے تو تجھے ایسی جوانی ملے گی جو کبھی زوال پذیر نہ ہوگی اور تجھے ایسی بادشاہی ملے گی جو تجھ سے مرنے سے پہلے چھینی نہیں جائے گی اور کھانے پینے اور نکاح کی لذت مرنے کے وقت تک تجھ میں باقی رہے گی اور جب مرے گا تو جنت ملے گی۔

فرعون کو یہ بات اچھی لگی۔ لیکن ہمیشہ ہامان سے مشورہ کر کے کوئی حتمی فیصلہ کرتا تھا، ہامان اس وقت موجود نہ تھا۔ جب ہامان آیا اور فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا اس کے سامنے ذکر کیا اور کہا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بات قبول کرلوں۔ ہامان نے اسے کہا میں تو تجھے دانشور اور صاحب رائے سمجھتا تھا (لیکن تو تو کودن ہے) تو رب ہے اور اب تو مربوب بننے کا ارادہ کرتا ہے۔ اب تک تیری عبادت ہوتی رہی اب تو غیر کی عبادت کرنا چاہتا ہے۔ فرعون کی رائے کو ہامان نے بدل دیا اور وہ ایمان قبول کرنے سے محروم رہا۔

[2] شاید اس کے دل میں تمہاری صداقت متحقق ہو جائے یا اگر تمہاری صداقت اس پر متحقق نہ ہو اور نصیحت قبول نہ بھی کرے تو کم از کم اس کے دل میں خوف خدا کی چنگاری سلگ جائے۔ لعل کے معنی میں جو رجا اور امید ہے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں بلکہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے علم سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو علم تھا کہ یہ غرور و تکبر کی جس گہری وادی میں بھٹک رہا ہے کبھی واپس نہیں آئے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ)

یہ جملہ قولا کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی اس سے نرم انداز میں گفتگو کرو، جب کہ فرعون کے نصیحت قبول کرنے اور اس کے ڈرنے کا وقت ہو یا قولا کی علت کی بناء پر منصوب ہے۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں یہ حکم فرعون کے علاوہ کسی طرف پھیرا جائے تو یہ معنی ہوگا کہ شاید نصیحت قبول کرنے والا نصیحت قبول کرے اور ڈرنے والا ڈر جائے (1)۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾

''دونوں نے عرض کی اے ہمارے رب! ہمیں یہ خوف ہے کہ وہ دست درازی کرے گا ہم پر یا سرکشی سے پیش آئے گا ل''

ل موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے عرض کی ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ قتل کرنے اور مارنے میں جلدی کرے گا اور دعوت کی تکمیل اور معجزات کے اظہار سے پہلے ہمارا کام تمام کر دے گا۔ ابن عباس نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ فرط علیه فلان عرب اس وقت کہتے ہیں جب کوئی تکلیف پہنچانے میں جلدی کرے (2)۔ فرط سے مشتق ہے جس کا معنی بڑھنا ہے۔ اسی سے الفارط (آگے بڑھنے والا) ہے یا کہیں ایسا نہ ہو تیری ذات کے متعلق کوئی ایسا بکواس کرے جس سے تیری ذات منزہ و مبرا ہے کیونکہ اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے' اندیشہ ہے کہ تیری عبادت کی نافرمانی میں کہیں اور زیادہ نہ ہو جائے۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾

''ارشاد ہوا ڈرو نہیں میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دیکھ رہا ہوں ل''

ل انني' لا تخافا کی تعلیل ہے۔ یعنی ڈرو نہیں کیونکہ میں حفاظت اور مدد کرنے کے لئے تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری پکار سنوں گا اور جو کچھ وہ تمہارے ساتھ کرے گا میں اس کو دیکھ رہا ہوں گا۔ میں اس سے تمہارا دفاع کروں گا، میں تم سے بے خبر نہیں ہوں' تم پریشان نہ ہو' یا یہ معنی کہ تمہارے اور فرعون کے درمیان جو بات ہوگی اور معاملہ ہوگا میں اسے دیکھوں گا اور سنوں گا اور ہر حال میں میں تمہاری مدد کروں گا اور تم سے تکلیف کو دور کروں گا۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی چیز پر قادر نہیں ہوگا کیونکہ میں تمہارا محافظ ہوں در ان حالیکہ میں سننے والا اور دیکھنے والا ہوں۔ جب محافظ قادر' سننے والا اور دیکھنے والا ہو تو حفاظت مکمل ہوتی ہے۔

فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾

''پس (بے خوف و خطر) اس کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ ہم دونوں تیرے رب کے فرستادہ ہیں پس بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور انہیں (اب مزید) عذاب نہ دے ہم لے آئے ہیں تیرے پاس ایک نشانی تیرے رب کے پاس سے ل اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے ۲''

ل فارسل پر فاء سببیہ ہے۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو شام کی طرف بھیج دے یا یہ معنی کہ انہیں اپنی بیگار اور کاموں سے آزاد کر اور انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے دے۔ ہم تیرے پاس اپنی رسالت و نبوت کی صداقت پر ایک نشانی لائے ہیں۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے آیت (ایک نشانی) کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ آپ کے پاس دو نشانیاں تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دلیل سے بات ثابت کرنا چاہتے تھے۔ نشانیوں کی وحدت اور تعدد کی طرف اشارہ مقصود نہ تھا۔ اسی طرح قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ میں اور فات باية میں مفرد لفظ ذکر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (التجاریة) 2۔ ایضاً

فرمایا ہے۔

۲ے یہ جملہ معترضہ ہے، مطلب یہ ہے کہ میرا سلام ملائکہ کا سلام اور جنت کے فرشتوں کا سلام ہدایت یافتہ لوگوں پر ہے یا یہ معنی کہ ہدایت کے پیروکاروں کے لئے دنیا میں مصیبت اور آخرت میں عذاب سے سلامتی ہے۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٤٨﴾

''بے شک وحی کی گئی ہے ہماری طرف کہ عذاب (خداوندی) اس پر آئیگا جو جھٹلاتا ہے (کلام الٰہی کو) اور روگردانی کرتا ہے ۱ے''

۱ے یعنی دنیا و آخرت کا عذاب تو اسے ملے گا جو رسولوں کو جھٹلاتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی عبادت سے روگردانی کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ جملہ تذییل ہے یا آپ کے رسول ہونے کی تعلیل ہے۔ میں کہتا ہوں یہ انا رسولا ربک سے بدل ہے۔ اس کلام میں حذف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اس کے پاس آئے اور پیغام خداوندی سنایا اور حذف کا فائدہ کلام میں اختصار ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ اطاعت شعار کو جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ ضرور کرتا ہے۔

قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَىٰ ﴿٤٩﴾

''فرعون نے پوچھا موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے ۱ے''

۱ے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں کہا تمہارا وہ رب کون ہے جس نے تم دونوں کو بھیجا ہے۔ اس نے خطاب دونوں سے کیا تھا لیکن ندا کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو خاص فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے موسیٰ علیہ السلام اصل تھے اور ہارون علیہ السلام آپ کے وزیر اور تابع تھے یا اس سابقہ تعلق تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا یا وہ گفتگو سے سمجھ گیا تھا کہ مرتبہ تبلیغ آپ کو حاصل ہے اور آپ کے بھائی صرف فصاحت وضاحت کے لئے ساتھ ہیں۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ﴿٥٠﴾

''فرمایا ہمارا رب وہ ہے جس نے عطا کی ہر چیز کو (موزوں) صورت پھر (مقصد تخلیق کی طرف) ہر چیز کی رہنمائی کی ۱ے''

۱ے حسن اور قتادہ فرماتے ہیں ہر چیز کو صلاحیت عطا فرمائی اور پھر اس کی اس طرف رہنمائی کی جو اس کے لئے باعث اصلاح ہے' مجاہد فرماتے ہیں ہر چیز کو وہ صورت عطا فرمائی جس پر وہ ہے اور اس نے حضرت انسان کی تخلیق چوپاؤں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح نہیں فرمائی اور جانور کو انسانی تخلیق کے مطابق پیدا نہیں فرمایا پھر ہر چیز کو اس کے کھانے پینے اور نکاح کے جو منافع ہیں ان کی طرف رہنمائی فرمائی(1)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں ہر چیز کو اس کی اپنی جنس سے مادہ عطا فرمائی۔ مرد کو عورت اور اونٹ کو اونٹنی۔ گدھے کو گدھی گھوڑے کو گھوڑی پھر اس کی رہنمائی فرمائی کہ جفتی اور جماع کیسے کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ معنی ہے کہ ہر چیز جس جس چیز کی محتاج ہے اور اسے جس چیز کی ضرورت ہے وہ عطا فرمادی' مفعول ثانی کو مقدم فرمایا کیونکہ مقصود اس کا بیان ہے پھر ہر چیز کو یہ بھی سکھادیا کہ ان اعضاء اور قوتوں سے کس طرح کام لے اور اپنی بقاء اور اپنے کمال کو کیسے حاصل کرے۔ خواہ وہ کمال طبعی ہے یا اختیاری۔ امام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (التجاریہ)

بیضاوی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جملہ میں انتہائی بلاغت ہے کیونکہ کل موجودات کی ان کے مراتب کے ساتھ خبر دی گئی ہے اور اس جملہ میں اس چیز کا بھی بیان ہے غنی قادر اور منعم علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور باقی کائنات کی ہر چیز اپنی ذات، صفات اور افعال میں اپنی تخلیق اور اپنی بقاء میں اس کی محتاج ہے۔ اسی جامع جواب کی وجہ سے کافر مبہوت ہو گیا تھا اور فرعون نے پینترا بدلا اور کلام کا رخ دوسری باتوں کی طرف موڑ دیا(1)۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾

''اس نے کہا (اچھا یہ بتاؤ) کیا حال ہوا پہلی قوموں کا؟ 1 ''

1 پہلی قوموں سے مراد قوم نوح، عاد اور ثمود ہیں جنہوں نے بتوں کی پوجا کی اور قیامت کا انکار کیا۔ فرعون پوچھنے لگا ذرا بتاؤ تو سہی پہلی قوموں کے مرنے کے بعد ان کو کیا ہوا تھا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَى ﴿۵۲﴾

''فرمایا ان کا علم میرے رب کے پاس ہے جو کتاب میں (مرقوم) ہے 1 نہ بھٹکتا ہے میرا رب اور نہ (کسی چیز کو) بھولتا ہے 2 ''

1 موسیٰ علیہ السلام نے پھر بڑا اچا تلا جواب دیا ان کے اعمال میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہیں۔ لوح محفوظ میں سب کچھ مرقوم ہے۔

2 اور میرے رب کی شان ہے کہ نہ وہ بھٹکتا ہے اور نہ وہ بھولتا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا کتاب کی صفت ہے۔ یعنی سب کچھ اس کتاب میں محفوظ ہے جسے اللہ تعالیٰ نہ گم کرتا ہے اور نہ اسے بھولتا ہے۔ الضلال کا معنی کسی چیز کی جگہ کا بھول جانا ہے اور اس تک رہنمائی حاصل نہ ہونا ہے اور نسیان کا معنی یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح تجھ سے محو ہو جائے کہ اس کا خیال بھی تیرے دل میں نہ کھٹکے اور یہ دونوں چیزیں اس ذات کے لئے محال ہیں جو عالم بالذات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لایضل ربی کا معنی یہ ہے کہ نہ تو اس سے کوئی چیز غائب ہوتی ہے اور نہ وہ کسی چیز سے غائب ہوتا ہے اور لا ینسی کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے معاملات کو بھولتا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ قوموں کو ان کے ہر نیک و بدعمل کی جزاء و سزا دے گا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾

''وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا 1 اور بنا دیئے تمہارے فائدہ کے لئے اس میں راستے اور اتارا آسمان سے پانی 2 پھر ہم نے نکالے پانی کے ذریعے 3 (شکم زمین سے) جوڑے گوناں گوں نباتات کے 4 ''

1 الذی اسم موصول ربی کی صفت یا محذوف مبتدا کی خبر ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے یا مدح کے طور پر منصوب ہے۔ کوفیوں نے یہاں اور سورۂ زخرف میں مَهْدًا پڑھا ہے اور سورۂ نبا میں بھی ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے۔ باقی قراء نے **مهادا** پڑھا ہے۔ مہاد اس چیز کا اسم ہے جو بچھائی جائے مثلاً بستر یا مہد کی جمع ہے یعنی زمین کو اس نے تمہارے لئے بچھونا بنایا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 625 (العلمیۃ)

۲ے سلوک کا معنی راستہ میں چلنا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔ سلک کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے۔ سَلَکَ الْمَکَانَ سُلُوْکًا وَسَلَکَهُ غَیْرُهٗ(1)۔ یعنی پہلی صورت میں لازم ہے اور مکان ظرف ہے اور دوسری صورت میں متعدی ہے۔ آیت میں متعدی استعمال ہوا ہے اور السبل کو مجازاً مفعول بہ بنایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ظرف ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے مجازاً جاری ہونے کی نسبت نہر کی طرف کی جاتی ہے۔ حالانکہ نہر جاری نہیں ہوتی، پانی جاری ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی بندہ نوازی دیکھو کہ اس نے اس زمین میں تمہارے لئے بلند و بالا پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں کے درمیان راستے بنا دیئے ہیں جن پر تم بآسانی سفر کرتے ہو۔ اس نے اس لئے یہ راستے بنائے ہیں تا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تم سفر کر کے زمین میں چھپے خزانے اور منفعت بخش اشیاء حاصل کر سکو۔ حضرت ابن عباس نے جو اس آیت کے تحت سَهَّلَ لَكُمْ فِيْهَا طُرُقًا فرمایا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں السلک کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے تمہاری خاطر زمین میں راستے داخل کر دیئے(2)۔ اسی معنی میں یہ ارشاد ہے مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ۔ یعنی اس عمل نے تمہیں سقر میں داخل کیا۔ وانزل من السماء ماءً سے مراد بارش ہے۔

۳ے ہم اس پانی کے ذریعے گوناں گوں نباتات کے جوڑے نکالتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انزل من السماء ماءً پھر موسیٰ علیہ السلام کا خطبہ مکمل ہوتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو خطاب کرتے ہوئے اپنی قدرت کی نشانیوں کو بیان فرما رہے ہیں جن کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کا تعارف کرا رہے تھے۔ ظاہر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ اس نے تم پر بارش برسائی اور تم پر احسان جتلاتے ہوئے فرمایا اخرجنا بہ تا کہ تم شکر سے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ یا یہ موسیٰ علیہ السلام کا ہی کلام ہے اور معنی یہ ہے کہ اس نے انسانوں سے ہماری جنس کے بیٹے پیدا فرمائے۔

۴ے ازواجاً کا مطلب اصنافاً ہے، یعنی مختلف اقسام اصناف کو ازواج اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہوتی ہیں۔ من نبات ازواج کی صفت اور بیان ہے۔ شتیٰ ازواج کی صفت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ نبات کی صفت ہو کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے جس میں واحد، جمع برابر ہوتے ہیں۔ شتی جمع ہے شتیت کی۔ جیسے مریض کی جمع مرضیٰ ہے اور یہ شت الامر سے مشتق ہے جس کا معنی جدا جدا ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین سے اگنے والی نباتات کی صورتیں، اغراض اور منافع بالکل الگ الگ کر دیئے ہیں، ان میں بعض انسان کے لئے مفید ہیں اور بعض حیوانات کی اصلاح کے لئے ہیں۔

كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾

'' خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ[1]۔ بیشک اس میں (ہماری قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں دانشوروں کے لئے[2] ''

۱ے دعیٰ کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عرب کہتے ہیں رعیت القوم فرعت۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جانوروں کو چراؤ۔ یہ امر اباحت کے لئے اور نعمت یاد دلانے کے لئے ہیں۔ یہ جملہ قول کے ارادہ پر اخرجنا کی ضمیر سے حال ہے، یعنی

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1249 (التراث العربی)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریۃ)

ہم نے کلوا وارعوا کہتے ہوئے مختلف نباتات پیدا فرمائے۔ تمہارے کھانے اور جانوروں کے چارہ کی منفعت کے لئے ہم نے نباتات تیار کئے ہیں اور ان میں تصرف کی تمہیں اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔

۲؎ ذالک کا مشار الیہ زمین کو بچھونا بنانا' آسمان سے بارش نازل کرنا اور زمین کے بطن سے انتفاع کے لئے نباتات پیدا کرنا ہے۔ فرمایا یہ سب چیزیں اور یہ سب افعال خالق کے وجود' اس کے واجب الوجود' اس کے احاطہ علم' اس کی قدرت کاملہ' اس کی تخلیق' اس کے کمالات سے متصف ہونے اور نقائص سے پاک ہونے کی بین دلیل ہیں۔ اولی النھیٰ سے مراد ذوی العقول اور دانشمند ہیں نھیٰ جمع ہے نھیۃ کی عقل کو ناھیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ برائیوں اور کوتاہیوں سے روکتی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

''اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے ۱؎ اور (روز حشر) اسی سے ہم تمہیں نکالیں گے ایک بار پھر ۲؎''

۱؎ منھا میں ھا ضمیر کا مرجع الارض ہے۔ یعنی ہم نے زمین کی مٹی سے تمہارے باپ آدم اور تمہارے بدنوں کا مواد تیار کیا کیونکہ نطفہ انسانی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے اور غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا ہم نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا۔ امام بغوی نے عطاء الخراسانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فرشتہ اس مکان سے مٹی اٹھاتا ہے جہاں انسان نے دفن ہونا ہوتا ہے اور اس مٹی کو نطفہ میں ڈال دیتا ہے پس مٹی اور نطفہ سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے(1)۔

عطاء کے قول کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی ناف میں مٹی ضرور ہوتی ہے جس سے اس کی تخلیق ہوتی ہے پھر جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس مٹی کی طرف اسے لوٹا دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کی تخلیق ہوئی تھی اور اسی مٹی میں اسے دفن کر دیا جاتا ہے۔ میں' ابوبکر اور عمر ایک مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی ایک مٹی میں دفن ہوں گے(2)۔ اس حدیث کو خطیب نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔ ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں نقل کیا ہے۔ شیخ محدث مرزا محمد الحارثی بدخشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس حدیث کے شواہد ابن عمر' ابن عباس' ابوسعید' ابوہریرہ سے مروی ہیں۔ یہ تمام احادیث ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اس لئے یہ حدیث کثرت طرق کی بناء پر حسن ہے اور اس حدیث کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے جو علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری کتاب الجنائز میں محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں اگر میں قسم اٹھاؤں تو میں اپنی قسم میں بالکل سچا ہوں گا اور مجھے کچھ تردد نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ' ابوبکر اور عمر کی تخلیق ایک مٹی سے فرمائی ہے(3) اسی طرح ابن عساکر نے عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ تجھے مبارک ہو تو میری مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور تیرا باپ (جعفر) ملائکہ کے ساتھ آسمان میں اڑتا ہے(4) اسی طرح دیلمی نے مسند الفردوس میں اور ابن نجار نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا آزاد کرنے والے کا خمیر میری مٹی سے ہے(5) شاید یہ رسول اللہ ﷺ نے کسی غلام کو آزاد کرنے والے شخص سے فرمایا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ)
2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 565 (التراث الاسلامی)
3۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 7، صفحہ 150 (ابن تیمیہ)
4۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 27، صفحہ 261 (الفکر)
5۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 317 (التراث الاسلامی)

ان مذکورہ بالا احادیث، اقوال سلف صالحین اور حضرت عطاء کی تاویل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگ کسی نبی کی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اسے اصالۃ الطینہ کہتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ حضرت محمد ﷺ کی مٹی سے تخلیق ہوئے ہیں، اسے اصطلاح صوفیاء میں اصالۃ الکبریٰ کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے جس روز آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا تو زمین کے بعض اجزاء کو بعض افراد کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا اور بعض دوسرے اجزاء کو دوسرے لوگوں کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا۔ زمین کا وہ ٹکڑا جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا تھا، اس پر انوار و تجلیات اور برکات الٰہیہ کا نزول ہمیشہ سے ہوتا رہا جو تجلیات اس نبی کے ساتھ مختص تھیں حتی کہ وہ مٹی اس قابل ہو گئی کہ اس سے نبی کے بدن مبارک کو تیار کیا جائے پھر وہ مٹی جو نبی کی تخلیق کے لئے تیار کی گئی تھی اس سے تخلیق نبی کا جسم مقدس تیار کرنے کے بعد ممکن ہے کچھ مٹی بچ گئی ہو اور وہ مٹی پھر دوسرے لوگوں کے لئے مادہ بن گئی ہو اور وہ غیر بھی اس سے مشرف ہو جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی پھوپھی کھجور کے درخت کی عزت کرو(1) کیونکہ یہ تمہارے باپ آدم کی بقیہ مٹی سے پیدا کی گئی ہے اور اللہ کے نزدیک کوئی درخت اس درخت سے افضل نہیں ہے جس کے نیچے حضرت مریم بنت عمران نے عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا تھا۔ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو تازہ کھجوریں کھلاؤ اور اگر یہ نہ ہوں تو چھوارے کھلاؤ۔ اس حدیث کو ابو یعلی الموصلی نے اپنی مسند میں، بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن حاتم، العقیلی، ابن عدی، ابن السنی اور ابونعیم نے الطب میں اور ابن مردویہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کیا ہے، ابن عساکر نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھجور، انار اور انگور آدم علیہ السلام کی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں(2)۔ شیخ احمد مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوب نمبر 99 جلد ثالث میں اصالۃ الکبریٰ کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض لوگوں نے جہالت یا عناد کی وجہ سے حضرت کے اس دعویٰ کا انکار کیا ہے۔ ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو اولیاء اللہ سے عناد اور دشمنی رکھتا ہے اور ان کے متعلق حسن ظن نہیں رکھتا۔

۲۔ مرنے کے بعد تمہارے اجزاء کو بکھیرنے اور منتشر کرنے کے ساتھ ہم تمہیں لوٹائیں گے اور پھر قیامت کے روز تمہیں مرکب کر کے سابقہ صورتوں پر اٹھائیں گے اور تمہارے ان ڈھانچوں میں پھر سے روح لوٹا دیں گے۔

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۶﴾

"اور ہم نے دکھلا دیں فرعون کو اپنی ساری نشانیاں پھر بھی اس نے جھٹلایا اور ماننے سے انکار کر دیا ۱؎"

۱؎ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے انہیں معجزات دکھائے لیکن اس کے باوجود وہ بدبخت انکار اور تکذیب پر مصر رہا۔ کلھا کی تاکید یا تو تمام اقسام کو شامل کرنے کے لئے یا ہر ہر فرد کو شامل کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہاں اضافت عہد کے لئے ہے اور آیات سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾

"کہنے لگا موسیٰ! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ نکال دو ہمیں اپنے ملک سے اپنے جادو کی طاقت سے ۱؎"

۱؎ قال کا فاعل فرعون ہے اور یہ کذب و ابیٰ سے بدل اشتمال ہے یا تاکید ہے اور استفہام تقریری ہے۔ ارضنا سے مصر کی زمین

1۔ تفسیر قاسمی، جلد 3، صفحہ 390 (بیروت) 2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 339 (التراث الاسلامی)

مراد ہے۔ اے موسیٰ آپ یہی چاہتے ہیں کہ تو ہمارے ملک پر غالب آ کر خود اقتدار سنبھالے۔

فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

'' سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں جادو ویسا ہی پس (اب) مقرر کر و ہمارے اور اپنے درمیان مقابلے کا دن نہ ہم پھریں اس سے اور نہ ہی تو پھرے جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو لے۔''

لے ابوجعفر نے لا نخلفه کو جواب امر کی بناپر مجزوم پڑھا ہے کیونکہ اخلاف وعدہ میں ہوتا ہے، زمان اور مکان میں نہیں ہوتا اور یہاں مضاف محذوف ہے تقدیر اس طرح ہے مکان موعد۔ مکانا محذوف مکان سے بدل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مضاف موعد سے پہلے مقدر نہ ہو اور مکانا مصدر یا اس فعل کی وجہ سے منصوب ہو جس پر مصدر دلالت کر رہا ہے۔ سوی کو ابن عامر، حمزہ، عاصم اور یعقوب نے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ عِدًی و عُدًی اور طوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جگہ ایسی ہو جو مسافت کے اعتبار سے ہمارے اور تمہارے درمیان برابر برابر ہو۔ سوی کی یہ تشریح قتادہ مجاہد نے فرمائی ہے۔ اور ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ کلبی کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین ہموار ہو (1)۔ ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے اسے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش اور ابوعمرو نے اپنی اصل پر بین بین پڑھا ہے اور باقی قراء نے اپنے اصول پر فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ یَوْمُ الزِّیْنَةِ وَ اَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

'' آپ نے فرمایا (تمہارا چیلنج منظور ہے) جشن کا دن تمہارے لئے مقرر کرتا ہوں۔ اور یہ خیال رہے کہ سارے لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں لے۔''

لے موعد سے پہلے مکان مضمر ہے، یعنی تمہارے لئے وعدہ کا وقت تمہارے میلہ اور جشن کا دن ہے یا یوم سے پہلے موعد مضمر ہے، یعنی موعدکم موعد یوم الزینة یا یہ معنوی حیثیت سے فرعون کے سوال کا جواب ہے کیونکہ جشن کا دن، مشہور مکان پر دلالت کرتا ہے جہاں لوگ اس روز جمع ہوتے ہیں۔ مجاہد، قتادہ، مقاتل اور سدی فرماتے ہیں ان کی عید کا ایک دن متعین تھا جس میں وہ زیب و زینت کرتے تھے اور ہر سال اس میں اجتماع کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نیروز کا دن تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ عاشورہ کا دن تھا (2)۔ موسیٰ علیہ السلام نے مشہور میلہ کے دن کا تعین اس لئے فرمایا تا کہ حق کا علم بلند ہو اور باطل ساری دنیا کے سامنے رسوا اور ذلیل ہو۔ ضحی سے مراد چاشت کا وقت ہے۔ یہ اس لئے فرمایا تا کہ کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہے۔ وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ کا عطف یوم پر ہے یا زینة پر ہے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَیْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

'' پھر فرعون واپس مڑا اور اکٹھا کیا اپنی فریب کاریوں کو پھر خود آیا لے۔''

لے یعنی فرعون نے اپنے جادوگروں کو جمع کیا تا کہ موسیٰ علیہ السلام پر غلبہ حاصل کرے اور پھر وقت مقرر پر مقابلہ کی جگہ پہنچ گیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ)　2۔ ایضاً

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾

''فرمایا ان فرعونیوں کو موسیٰ نے کم بختو! نہ بہتان باندھو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے [1] ورنہ وہ تمہارا نام ونشان مٹادے گا کسی عذاب سے [2] اور (اس کا یہ اٹل قانون ہے) کہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے جو افتراء بازی کرتا ہے [3]۔''

[1] امام بغوی فرماتے ہیں لھم کی ضمیر ان جادوگروں کے لئے ہے جنہیں فرعون نے مقابلہ کے لئے بلایا تھا اور ان کی تعداد بہتر 72 تھی اور ہر جادوگر کے ساتھ ایک رسی اور عصا تھا۔ حضرت کعب فرماتے ہیں چار سو تھے۔ بعض علماء نے ان کی تعداد 12000 بارہ ہزار لکھی ہے۔ بعض نے فرمایا اس سے بھی زیادہ تھے (1)۔ ویلکم ہلاکت کے معنی میں الزم کا مفعول بہ ہے، یعنی الزمکم اللّٰہ الویل ای الھلاک یا یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ ای ھلکتم ھلاکا یا یہ حرف ندا کے حذف کے ساتھ منادیٰ ہے ای ویلکم۔ یہ دعائیہ یا ندائیہ جملہ ہے اور کلام میں شروع ہونے سے پہلے منھی عنہ کے ارتکاب کی وجہ سے بری حالت کے اظہار کے لئے نہی کے مقدمہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ کذبا، لا تفتروا کا مفعول مطلق ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کا شریک بنا کر اللہ پر کوئی جھوٹ نہ بولے۔

[2] فیسحتکم کو حفص، حمزہ اور کسائی نے یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے یاء اور حاء کے فتحہ کے ساتھ فعل مجرد سے پڑھا ہے۔ معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ اسحات نجد اور تمیم کی لغت ہے اور السحت حجاز کی لغت ہے۔ مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں اس کا معنی فیھلککم (وہ تمہیں ہلاک کر دے گا) ہے۔ قتادہ نے اس کا معنی فیستاصلکم کیا ہے یعنی وہ تمہیں جڑ سے اکھیڑ دے گا (2)۔

[3] یقیناً نامراد ہوا وہ شخص جس نے بھی اللہ پر افتراء باندھا۔ واقعی اسی طرح ہے کہ فرعون نے اللہ پر افتراء باندھا اور فریب کیا تا کہ اس کا اقتدار اور سیاست کا سکہ ہمیشہ چلتا رہے اور اس کی باطل خدائی کا ڈنکا بجتا رہے لیکن اس کی ہزار حیلہ سازیوں کے باوجود اس کو کچھ فائدہ نہ ہوا (انجام کار رسوا و ذلیل ہو کر اس دنیا سے دفع ہو گیا)

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾

''پس وہ جھگڑنے لگے اس کام کے متعلق آپس میں اور چھپ چھپ کر مشورے کرنے لگے [1]۔''

[1] فرعون اور اس کے بلائے ہوئے جادوگر موسیٰ کلیم اور ہارون علیہما السلام کی بھرے مجمع میں آمد اور جرأت و بے باکی دیکھ کر سرگوشی کرنے لگے اور جھگڑنے لگے کہ ان پاکبازوں کے ساتھ مقابلہ کرنا ٹھیک بھی ہے یا نہیں (کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں) محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرجدار آواز میں پوری جرأت اور استقامت سے یہ فرمایا ویلکم لا تفتروا علی اللّٰہ کذبا تو وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے یہ کسی جادوگر کا قول وکلام نہیں ہے (3) النجویٰ اسم ہے یا مصدر ہے۔ اس کا معنی سرگوشی کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی کسی بلند جگہ پر علیحدہ ہونا ہے۔ زمین کے اونچے اور بلند حصے کو اس کی بلندی کی وجہ سے نجوہ کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل النجاۃ ہے جس کا معنی الخلاص ہے، یعنی ایسا مشورہ اور معاونت جس میں نجات اور خلاصی ہو۔ کلبی کہتے ہیں انہوں نے آپس میں سرگوشی کی کہ اگر موسیٰ علیہ السلام ہم پر غالب آ گئے تو ہم اس کی اتباع کریں گے (4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریۃ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

"وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے بلاشبہ یہ دو جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ نکال دیں تمہیں [1] تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور مٹادیں تمہاری (تہذیب وثقافت کے) مثالی طریقوں کو [2]"

[1] باہمی تنازع اور جھگڑا کے بعد ان کا مشورہ اس بات تک پہنچا کہ جادوگر ہیں اور ہمیں اپنے ملک سے دیس نکالا دے کر خود مسند اقتدار پر براجمان ہونا چاہتے ہیں اور ہماری ساری تہذیب وثقافت کو ختم کر کے نئے طور طریقے نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقتاً یہ قول فرعون کا ہے باقی سب چار و ناچار اس کے ساتھ اس بات پر متفق ہو گئے تھے۔ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو گفتگو کے دوران یہ بھی کہا تھا کہ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (اے موسیٰ تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے ملک سے اپنے جادو کے ذریعے ملک بدر کر دو) اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے تنازع کا سورۂ مؤمن میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ ... اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ تک اسی تنازع کا تذکرہ ہے۔

ابن کثیر اور حفص نے هذان سے پہلے ان کو نون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ نون مخففہ من مثقلہ ہے اور لساحران پر لام یہ فرق بتانے کے لئے ہے کہ یہ ان نافیہ ہے اور لام بمعنی الا ہے (یعنی یہ دونوں نہیں ہیں مگر جادوگر) ابن کثیر نے هذان کے نون کو بھی مشدد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ان کو مشددہ پڑھا ہے' ابوعمرو نے هذان کو ان کے اسم کی حیثیت سے اصل کے مطابق هذین پڑھا ہے، باقی قراء نے هذان پڑھا ہے۔ ان (مشددہ) کے بعد هذان کو خلاف اصل پڑھنے کی توجیہات میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ کی سند سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں یہ کاتب کی غلطی ہے لیکن یہ قول درست نہیں ہے اور اجماع کے مخالف ہے (اس لئے قابل غور ہی نہیں ہے) بعض علماء فرماتے ہیں ابوالحارث بن کعب' خثعم اور کنانہ قبائل کی لغت پر ہے کیونکہ وہ تثنیہ کو حالت رفعی' نصبی اور جری میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ الف کو علامت تثنیہ بناتے ہیں اور تثنیہ کا اعراب تقدیری کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں اتانی الزیدان' رایت الزیدان' مررت بالزیدان اسی طرح یہ مذکورہ قبائل یاء ساکن ماقبل مفتوح کو تثنیہ میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کسرت یداہ و رکبت علاہ اصل میں یدیہ اور علیہ تھا۔ اسی طرح اسماء ستہ مکبرہ جب ی متکلم کے علاوہ کسی دوسرے اسم کی طرف مضاف ہوں تو ان کو الف کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً شاعر کہتا ہے۔

اِنَّ اَبَاهَا وَاَبَا اَبَاهَا قَدْ بَلَغَا فِي الْمَجْدِ غَايَتَاهَا

بعض علماء فرماتے ہیں ان کا اسم ضمیر شان محذوف ہے اور هذان لساحران ان کی خبر ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی انه هذان لساحران۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان بمعنی نعم (ہاں) ہے اور اس کا مابعد مبتدا اور خبر ہیں۔

روایت ہے کہ ایک بدو اونٹنی پر سوار ہو کر عبداللہ بن الزبیر کے پاس کچھ مانگنے کے لئے آیا لیکن آپ نے اسے کوئی چیز نہ دی بدو کہنے لگا اللہ لعنت کرے اس اونٹنی پر جو مجھے سوار کر کے تیرے دروازے پر لے آئی ہے۔ آپ نے جواب فرمایا ان وصاحبها (ہاں اس کے مالک پر بھی اللہ لعنت فرمائے) تو یہاں آپ نے ان بمعنی نعم استعمال فرمایا ہے(1) امام بیضاوی فرماتے ہیں لیکن ان آخری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریہ)

دوصورتوں میں مبتدا کی خبر پر لام کا دخول لازم آئے گا حالانکہ یہ بغیر ضرورت کے خبر پر لام داخل نہیں کیا جاتا (بلکہ یہ لام مبتدا کی موصوفیت کی تاکید کے لئے وضع کیا گیا ہے) بعض علماء خبر پر لام کے دخول کے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں ان هذان لهما ساحران ہے یا (ان بمعنی نعم) کی صورت میں نعم هذان لهما ساحران ہے، یعنی اصل میں خبر پر لام داخل نہیں ہے بلکہ مبتدا مقدر پر لام داخل ہے۔ اس میں ضمیر شان کو حذف کیا گیا ہے اور هما کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ لیکن امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ جو اسم لام ابتداء سے مؤکد ہوا سے حذف کرنا مناسب نہیں ہے(1) (کیونکہ حذف تاکید سے جو غرض مقصود ہے اس کے منافی ہے)

ؔ من ارضکم سے مراد مصر ہے۔ مثلی، امثل کی تانیث ہے اس کا معنی افضل ہے۔ ابن عباس نے طریقتکم المثلی کا معنی قوم کے اشراف اور سرکردہ لوگ کیا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ هو لاء طریقة قومهم یعنی وہ لوگ قوم کے سردار ہیں شعبی نے حضرت علی سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ یہ دونوں شخص لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں بنواسرائیل نفری اور مال کے اعتبار سے زیادہ تھے۔ تو اللہ کے دشمن فرعون نے (بنواسرائیل کو بھڑکانے کے لئے) کہا کہ یہ دونوں حضرات سب لوگوں کو اپنا متبع اور پیروکار بنانا چاہتے ہیں(2) فرعون نے یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد کی تھی جب آپ نے اسے کہا کہ ارسل معي بني اسرائيل (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے) بعض علماء فرماتے ہیں طریقتکم المثلی سے مراد ہے اس نے طریقہ اور دین بنالیا، یعنی اس نے قوم کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا کہ یہ دونوں تمہاری معاشرتی قدروں اور تمہارے دین کو مٹانا چاہتے ہیں جس پر تم عرصہ دراز سے کاربند ہو۔ اس مفہوم کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ (مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دین کو بدل دے گا) یریدان کا جملہ هذان کی دوسری خبر ہے یا ساحران کی ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

فَاَجْمِعُوْا كَیْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾

''پس یکجا کرلو اپنی حیلہ سازیوں کو ؎ پھر آؤ پرے باندھے ہوئے ؎ اور کامیاب ہوگا آج وہ گروہ جو (اس مقابلہ میں) غالب رہا ؎''

؎ ابوعمرو نے اجمعوا کو همزه وصلی اور میم مفتوح کے ساتھ مجرد فعل سے پڑھا ہے یہ قرأت فَجَمَعَ كَیْدَهٗ کے مطابق ہے، جب کہ باقی قراء نے ہمزہ قطعی اور میم مکسور کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جمع اور اجمع دونوں کا معنی ایک ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کا معنی ہے تم اتفاق رائے کرلو۔ پختہ عزم کرلو اور اختلاف نہ کرو تا کہ تمہارے معاملہ میں گڑبڑ نہ ہو۔

؎ صف مصدر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو خط مستوی پر بنانا جیسے لوگ یا درخت لائن میں سیدھے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ یہاں مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یعنی صف بستہ ہوکر آؤ، اکٹھے ہوکر ہمارے مقابلہ میں آؤ کیونکہ یک زبان اور اتفاق رائے سے آنا دیکھنے والوں کے دلوں میں زیادہ ہیبت ڈالتا ہے۔ مقاتل اور کلبی نے یہی تشریح لکھی ہے۔ اس کی نظیر قرآن میں بھی ہے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 634 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریہ)

کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں۔ صَفًّا ترکیب نحوی کے اعتبار سے اور اس معنی کے اعتبار سے ایتوا کے فاعل سے حال ہوگا۔ ابوعبیدہ جو لغت کے امام ہے وہ فرماتے ہیں الصف کا معنی المجمع ہے۔ جائے نماز کو الصف اسی معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ متعین جگہ پر آ جاؤ(1)۔

۳ۓ آج وہی کامیاب ہوگا اور مطلوب پا لے گا۔ جو غالب آئے گا یہ جملہ معترضہ ہے، یعنی ماقبل اور مابعد کلام سے لفظی یا معنوی کوئی تعلق نہیں ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی ﴿۶۵﴾

”جادوگر بولے اے موسیٰ! کیا پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم ہو جائیں پہلے پھینکنے والے لے“

1۔ جادوگر جب مقررہ جگہ پہنچے تو نبی کا پاس ادب کرتے ہوئے یا اپنے فریب ودجل کی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنی کامیابی پر وثوق اور اعتماد کی بناء پر کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تم اپنا عصا پہلے ڈالو گے یا ہم پہلے رسیاں ڈالیں۔ ان موصول حرفی دونوں مقامات پر اپنے صلہ سے مل کر مضمر فعل کی وجہ سے محل نصب میں ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اِختِرَ امّا القائک اولاً و اما کوننا اول من القی اور دوسری ترکیب کے اعتبار سے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا مر الذی حان حینۃ اما القائک اولا و اما کوننا اول الملقین ۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ﴿۶۶﴾

”آپ نے فرمایا نہیں تم ہی (پہلے) پھینکو لے پھر کیا تھا یکا یک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں ۲ۓ“

لے موسیٰ علیہ السلام نے ادب کے مقابلہ میں ادب پیش کرتے ہوئے فرمایا پہلے تم اپنے جادو کا مظاہرہ کرو یا اس لئے آپ نے انہیں پہلے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالنے کو کہا کیونکہ آپ کو ان کے جادو کی کوئی پروا نہیں تھی اور چونکہ انہوں نے اپنی کلام میں پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف میلان کا اظہار کیا تھا، اس لئے آپ نے ان کو مزید مائل وقائل کرنے کے لئے انہیں ایسا پہلے کرنے کو کہا اور ان کی کلام میں زیادہ بلاغت ہے بنسبت اس کلام کے جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔ آپ نے انہیں فرمایا جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ظاہر کرو اور اپنی کوشش سے جادو کو مضبوط کرلو کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ باطل کے مغرور سر پر حق کا ایک ہی کوڑا برسے گا اور اس کا سارا نشہ اور تکبر کافور ہو جائے گا اور حق کا علم اپنی پوری بلندی پر لہرائے گا۔

۲ۓ عصیّ اصل میں عصوو تھا، دونوں واؤ یا سے بدل کر ادغام ہوگئیں اور پھر صاد کو یاء کی مناسبت سے کسرہ دے دیا گیا۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فالقوا حبالھم و عصیھم فاذا حبالھم الخ یعنی انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو ان کی رسیاں دوڑتے ہوئے سانپ نظر آنے لگیں۔ اذا ظرف زمان ہے اور مفاجاۃ کے فعل کے ساتھ منصوب ہے اور جملہ اسمیہ کی طرف مضاف ہے۔ حبالھم وعصیھم مبتداء ہے اور مابعد خبر ہے اور ضمیر عائد یا تو یخیل کی ضمیر ہے یا انھا کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریۃ)

ضمیر ہے اور یہ جملہ ابتدائیہ ہے۔ یخیل کو ابن ذکوان نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس میں ضمیر مرفوع حبالاورعصی کی طرف راجع ہے۔ انھا تسعی یخیل کی ضمیر سے بدل اشتمال ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ یخیل پڑھا ہے۔ اور اس قرأت پر انھا تسعی لیخیل کا نائب الفاعل ہوگا۔ اس واقعہ میں ہے کہ جب انہوں نے اپنی رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی نظر بندی کر لی۔ موسیٰ علیہ السلام اور لوگوں کو یوں محسوس ہونے لگا کہ زمین سانپوں سے بھر گئی ہیں جو ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾

"موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا[1]"

[1] خیفۃً میں تنکیر تعلیل کے لئے ہے، یعنی آپ کے دل میں کچھ وحشت سی آئی۔ الوجس کا اصل معنی آہستہ آواز ہے۔ قاموس میں ہے الوجس الفزع یقع فی القلب او السمع من صوت اوغیرہ(1) یعنی وجس کا معنی وہ گھبراہٹ ہے جو دل میں واقع ہوتی ہے یا اس کا معنی آواز وغیرہ کا سننا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بشری تقاضا پر آپ نے یہ گمان کیا شاید یہ پھنکارنے اور دوڑنے والے سانپ ان کی طرف آرہے ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کچھ خوف نہ تھا، صرف آپ کو اپنی قوم کا خوف تھا کہ کہیں معاملہ ان پر خلط ملط نہ ہو جائے اور کہیں یہ میرے بارے میں شک میں نہ پڑ جائیں اور اتباع سے گریز کریں(2)
اس جملہ کا عطف فاذا حبالھم پر ہے۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾

"ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے[1]"

[1] یہ جملہ خوف سے نہی کی علت اور غلبہ کے ثبوت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ استیناف' حرف تحقیق اور ضمیر فعل خبری کی تعریف اور لفظ علو (جو ظاہری غلبہ پر دلالت کرتا ہے) اور پھر صیغہ اسم تفضیل لگا کر جملہ کو مؤکد کیا گیا ہے۔

وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

"اور زمین پر پھینک دو جو (عصا) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے یہ نگل جائے گا جو انہوں نے کاریگری کی ہے[1] انہوں نے جو کاریگری کی ہے وہ تو فقط جادو کا فریب ہے[2] اور نہیں فلاح پاتا جادوگر جہاں بھی وہ جائے[3]"

[1] الق کا عطف لا تخف پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صراحۃً یہ نہیں فرمایا کہ ڈنڈا زمین پر پھینکو مبہم فرمایا جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے زمین پر پھینکو۔ اس کی وجہ یا تو ان جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کی تحقیر کرنے کے لئے ہے، یعنی آپ ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کی پرواہ نہ کریں اور اپنے ہاتھ کی چھڑی پھینکیں یا ان کی بڑائی کی وجہ سے ایسا ابہام فرمایا، یعنی تم ان جسموں کی کثرت اور بڑائی کو خاطر میں نہ لاؤ کیونکہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا اثر ان سب سے زیادہ ہے۔
تلقف کو حفص نے لام کے سکون سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے لام کو فتحہ اور ق کو مشدد پڑھا ہے۔ اصل میں یہ تتلقف باب تفعل تھا، ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔ تاء مضارع تانیث اور خطاب دونوں کا احتمال رکھتی ہے۔ تانیث کی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 792 (التراث الاسلامی)

صورت میں ضمیر کا مرجع عصا ہوگا اور خطاب کی صورت میں فعل کی نسبت سبب کی طرف ہوگی۔ ابن ذکوان نے حال یا استیناف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔

۲۔ اِنَّ کے بعد ما یا تو موصول ہے یا مصدر یہ ہے ساحر فاعل کے وزن پر ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے حمزہ اور کسائی نے سِحْرٌ سین کے کسرہ اور بغیر الف کے مصدر کے طور پر پڑھا ہے۔ کید سحر میں اضافت بیانیہ ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے کید ذی سحر مضاف کو حذف کیا گیا ہے یا ساحر کو سحر مبالغہ کے لئے کہا گیا ہے۔ ساحر سے مراد جنس ساحر ہے۔

۳۔ ساحر کبھی کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی جائے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جادوزمین کے کسی خطہ میں سعادت مند نہیں ہوتا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جب بھی حیلہ سازی کرتا ہے کامیاب نہیں ہوتا(1)۔ ابن ابی حاتم اور ترمذی نے جندب بن عبداللہ البجلی سے روایت فرمایا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جادوگر کو پاؤ تو اسے قتل کردو پھر آپ ﷺ نے آیت لَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی تلاوت فرمائی فرمایا جہاں بھی ہو امن میں نہیں ہوتا(2)۔ اِنَّمَا صَنَعُوْا کا جملہ تلقف کی تعلیل کے محل میں ہے۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ۝

"پس گرا دیئے گئے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے انہوں نے (برملا) کہہ دیا (اے لوگو! سن لو) ہم ایمان لے آئے ہیں ہارون اور موسیٰ کے رب پر ۱؎"

۱؎ اس کلام میں اختصار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ فالقیٰ موسیٰ عصاہ فصارت ثعبانا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بڑا سانپ بن گیا اور کچھ جادوگروں نے اپنی مہارت سے جادوگری کی تھی، اس کو نگل گیا۔ جادوگر پہچان گئے کہ یہ جادو کی کرشمہ سازی نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پس اس معرفت وعرفان نے انہیں اللہ کے حضور سربسجود ہونے پر مجبور کردیا۔ وہ اپنی جادوگری سے توبہ کرتے ہوئے یا آیات الہیہ کو دیکھ کر ان کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو گئے اور برسر محفل کہہ دیا ہم تو موسیٰ اور ہارون کے رب پر صدق دل سے ایمان لے آئے ہیں۔ ہارون اور موسیٰ کے درمیان واؤ مطلق جمع کے لئے ہے۔ ہارون کو پہلے ذکر کرنے میں سورۂ اعراف اور شعراء کی آیات کے ساتھ تعارض کی کوئی دلیل نہیں ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے ہارون کا ذکر بعد میں ہے۔ یہاں ہارون کی تقدیم آیت کے سرے ملانے کے لئے ہے۔ قالوا امنا کا جملہ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا سے بدل اشتمال ہے یا اس کی تاکید ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۟ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ۝

"فرعون (گویا رائے ضبط نہ رہا) بولا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں نے تمہیں (مقابلہ کی) اجازت دی وہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سکھایا ہے جادو (کا فن) ۱؎ تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کاٹ ڈالوں گا تمہارے ہاتھ پاؤں یعنی ایک طرف کا ہاتھ ایک طرف کا پاؤں اور سولی چڑھاؤں گا تمہیں کھجور کے تنوں پر ۲؎ اور تم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریۃ) 2۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 541 (العلمیۃ)

خوب جان لوگے کہ ہم میں سے کس کا عذاب شدید اور دیرپا ہے ۳؎ ''

۱؎ قال کا فاعل فرعون ہے۔ امنتم کو حفص نے خبر کے طور پر اور باقی قراء نے استفہام انکاری کے طور پر پڑھا ہے۔ اور امنا کا صلہ لام اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ اس میں اتباع کا معنی پایا جاتا ہے (ایسی صورت کو علماء تضمین کہتے ہیں) موسیٰ کلیم تمہارا استاد ہے اور تم سب اس کے شاگرد ہو، ایمان تو تم میرے کہنے سے پہلے بھی لا چکے تھے۔ اس کا غلبہ ایک استاد اور لیڈر کی حیثیت سے ہوا ہے، نبوت کی وجہ سے یہ غلبہ نہیں ہے، اس نے خود تمہیں یہ جادو سکھایا اور تم نے جو کچھ کیا اس کی موافقت میں کیا یہ جملہ معترضہ ہے۔

۲؎ اس نے کہا میں تمہارا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دوں گا۔ من ابتدائیہ ہے اور لا قطعن کے متعلق ہے۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور مصدر محذوف قطعاً کی صفت ہے۔ یعنی کاٹنا ایسا ہوگا کہ ہر عضو دوسرے عضو کے مخالف ہوگا۔ یعنی دائیں بائیں میں اختلاف ہوگا، دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں ہوگا۔ یا من ایدیکم و ارجلکم سے حال ہے۔ فی جذوع النخل فرمایا ہے حالانکہ مقام کے تقاضا کے مطابق علی ہونا چاہئے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مصلوب کے صلیب میں پوری طرح فٹ آنے کو تشبیہ دی گئی ہے اس چیز سے جو کسی برتن میں فٹ آتی ہے، یہاں اس نے کھجوروں سے سولی دینے کا ذکر کیا کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہیں اور ان پر لٹکایا ہوا بندہ دور سے نظر آتا ہے۔

۳؎ اس وقت تمہاری آنکھیں کھلیں گی کہ رب موسیٰ پر ایمان لانے پر میں سخت اور دائمی عذاب دیتا ہوں یا موسیٰ کا رب ایمان نہ لانے پر زیادہ سخت عذاب دیتا ہے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ

''انہوں نے کہا (اے فرعون) ہمیں اس کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہم ہرگز ترجیح نہیں دیں گے۔ تجھے ان روشن دلیلوں پر جو ہمارے پاس آئی ہیں ۱؎ پس (ہمارے بارے میں) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر دے (ہمیں ذرا پرواہ نہیں) ۲؎ تو صرف اس (فانی) دنیوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے ۳؎ ''

۱؎ البینٰت سے مراد واضح معجزات ہیں مثلاً ید بیضا اور عصا اور بعض علماء فرماتے ہیں البینٰت سے مراد دلالات ہیں، ان کی دلالات میں سے یہ تھا کہ انہوں نے کہا اگر موسیٰ جادوگر ہیں پھر ہماری رسیاں اور لاٹھیاں کیا ہیں۔ بعض فرماتے ہیں البینٰت سے مراد تبیین اور علم ہے۔ امام بغوی نے قاسم عن ابی بردہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب وہ جادوگر تو بہ کرنے کے لئے سجدہ میں گرے تو اس وقت تک سر نہ اٹھایا۔ جب تک کہ جنت اور دوزخ کو دیکھ نہ لیا۔ یا جنتیوں کے ثواب اور ان کی رفیع منازل کو دیکھ نہ لیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انہوں نے فرعون کو کہا ہم تجھے ترجیح نہیں دیں گے (1) الخ۔

۲؎ الذی سے پہلے واؤ عاطفہ ہے۔ اور اس کا عطف ماجاءنا پر ہے یا واؤ قسمیہ ہے اور ما موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ فاقض کا مفعول بہ ہے۔ یا یہ معنی کہ تو حکم دے تو حکم دینے والا ہے اس صورت میں اسم موصول مفعول مطلق ہوگا۔ اس معنی کے اعتبار سے مفعول بہ بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ قضاء بمعنی حکم باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور یہاں بہ کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔

۳؎ هذه الحیاة الدنیا مضاف کے حذف کے ساتھ ظرف زمان ہے، یعنی تو نے جو کچھ کرنا ہے اس فانی اور عارضی زندگی میں کرنا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریۃ)

تیرا حکم اور تیری سلطانی عنقریب ختم ہو جائے گی۔ جو تیرے جی میں آتا ہے تو اسے کر گذر۔ اب ہم نے جو شراب حق کا جام لاالہ فام نوش کیا ہے اسے تیری ان دھمکیوں کی ترشی کبھی نہیں اتار سکتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرعون نے جو سولی چڑھانے اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دھمکی دی تھی وہ اس نے پوری کی تھی اور سب سے پہلے ایسی سزا کا آغاز اس نے کیا تھا۔ یہ قول ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے وہ اس کی دھمکی کو پورا نہ کر سکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۗ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿٧٣﴾

''یقیناً ہم ایمان لائے ہیں اپنے رب پر تا کہ وہ بخش دے ہمارے لئے ہماری خطاؤں کو اور اس قصور کو بھی جس پر تم نے مجبور کیا ہے یعنی فن سحر ۱؎ اور اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے ۲؎''

۱؎ شراب حق سے مست ہو کر انہوں نے فرعون کی دھمکیاں سن کر کہا ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں تا کہ وہ ہمارے کفر و معاصی کو معاف فرما دے اور جس جادو پر تو ہمیں مجبور کرتا رہا اس کے گناہ پر بھی قلم عفو پھیر دے۔ یہ جملہ لن نؤثرک کے معنی کو پختہ کرنے کے لئے ہے۔ من السحر ما کا بیان ہے اور ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ انہوں نے کیسے کہا ہے وما اکرھتنا علیہ (جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) حالانکہ وہ خود اپنی مرضی سے آئے تھے اور فرعون کی عزت کی قسم کھا کر انہوں نے کہا تھا کہ غلبہ ہمارا ہوگا۔ فرعون نے انہیں جادو سیکھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ امام بغوی نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ فرعون لوگوں کو جادو سیکھنے پر مجبور کرتا تھا تا کہ جادو کی اصل باقی رہے، دنیا سے ختم نہ ہو جائے، اس نے ان لوگوں کو بھی ابتدا میں مجبور کیا تھا۔ مقاتل کہتے ہیں جادوگر بہتر تھے۔ دو قبطی تھے اور ستر بنی اسرائیل سے تھے۔ فرعون بنی اسرائیل کو مجبور کیا کرتا تھا کہ وہ جادو سیکھیں۔ تو ان کے قول ما اکرھتنا کا یہی مطلب ہے۔

عبدالعزیز بن ابان کہتے ہیں کہ جادوگر نے فرعون سے کہا ہمیں پہلے موسیٰ کی زیارت کرا، جب وہ سویا ہوا ہو تو اس نے ان کو بلایا۔ موسیٰ علیہ السلام سو رہے تھے اور آپ کا ڈنڈا آپ کی حفاظت کر رہا تھا جادوگروں نے دیکھ کر کہا یہ جادو نہیں ہے کیونکہ جادوگر جب سوتا ہے تو اس کا جادو باطل ہو جاتا ہے لیکن فرعون نے انہیں مقابلہ پر مجبور کیا تو وما اکرھتنا کا یہی مفہوم ہے (1)۔

۲؎ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ تجھ سے بلکہ ساری مخلوق سے بہتر ثواب دینے والا ہے اسے جو ایمان لاتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے اور وہ تجھ سے اور ساری مخلوق سے دائمی عذاب دینے والا ہے اسے جو مجرم بن کر اس کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں یہ فرعون کے قول اَیُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى کا جواب ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۗ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴿٧٤﴾

''بیشک جو شخص بارگاہ الٰہی میں مجرم بن کر آئے تو اس کے لئے جہنم کا (شعلہ زار) ہے نہ وہ مر ہی سکے گا اس میں اور نہ وہ زندہ ہوگا ۱؎''

۱؎ یعنی جو کفر اور خداوند ذوالجلال کی نافرمانی کرتے ہوئے مرے گا تو اسے جہنم میں ڈالا جائے گا، جہاں نہ اسے موت آئے گی کہ وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریۃ)

عذاب سے چھٹکارا پالے اور نہ اس میں اس کے لئے کچھ خوشگوار زندگی ہوگی۔

وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۙ﴿۷۵﴾

"اور جو شخص حاضر ہوگا بارگاہ الٰہی میں مومن بن کر اس حال میں کہ اس نے عمل بھی نیک کئے ہوں تو یہ وہ (سعادت مند) ہیں جن کے لئے بلند درجات ہیں ۱؎"

۱؎ قالون، ابوجعفر اور یعقوب نے یاتہ کو وصل میں ھمزہ کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوشعیب نے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

قد عمل الصالحت' مومناً کی ضمیر سے حال ہے۔ العلیٰ جمع ہے علیا کی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

"یعنی سدا بہار باغات رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ (خوش نصیب) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ہے جزاء ان کی جنہوں نے (اپنا دامن ہر آلائش سے) پاک رکھا ۱؎"

۱؎ جنت عدن' الدرجات سے بدل ہے یا عطف بیان ہے خالدین فیھا لھم میں ضمیر مجرور سے حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے یا الاستقرار ہے۔ مَنْ تزکیٰ سے مراد وہ نفوس ہیں جو گناہ اور کفر کی آلودگی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں کلبی کہتے جو اپنے نفس کی زکوٰۃ دیتے ہیں اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں(1)۔ امام احمد' ترمذی' ابن ماجہ اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید الخدری سے اور طبرانی نے جابر بن سمرہ سے اور ابن عساکر نے ابن عمر اور حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ تمام صحابہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلند درجات پر فائز اہل جنت کو نیچے والے ایسے دیکھیں گے جیسے تم آسمان کے افق پر چمکنے والے ستارے کو دیکھتے ہو' ابوبکر اور عمر ان بلند درجات والوں میں سے ہیں(2) امام احمد اور بخاری و مسلم نے حضرت ابوسعید سے اور ترمذی نے ابوھریرہ سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ اہل جنت' بلند غرفات اور محلات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم مشرق و مغرب کے افق پر غروب ہونے والے ستارے کو دیکھتے ہو اور یہ اتنی دوری اور بلندی ان کے مراتب میں فرق کی وجہ سے ہوگی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ پھر انبیاء کی منازل کو تو کوئی دوسرا نہیں پا سکے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ لوگ جو اللہ پر صدق دل سے ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی(3) (وہ انبیاء کے ساتھ ہوں گے) یہ تینوں آیات جادوگروں کے کلام ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہیں کہ یہ ان کے قول وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى کی علت ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتدائی کلام بھی ہو سکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تصدیق فرما رہا ہے۔

وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾

"اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف کہ راتوں رات لے چلئے میرے بندوں کو (مصر سے) (راہ میں سمندر حائل ہو) تو عصا کی ضرب سے ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ بنا لیجئے نہ تمہیں پیچھے سے پکڑے جانے کا ڈر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (التجاریۃ) 2۔ مجم کبیر، جلد 2، صفحہ 254 (العلوم والحکم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 416 (وزارت تعلیم)

ہوگا اور نہ کوئی اور اندیشہ[1]۔''

[1] جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرنے اور بنی اسرائیل کو اس کی قید سے آزاد کرنے کا ارادہ فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے لے چلئے۔ اس جملہ کا عطف وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ پر ہے۔ اس میں خطاب سے غیبہ کی طرف التفات ہے۔ ما ضرب کا معنی یہاں اجعل ہے اور یہ عربوں کے اس قول سے ہے ضرب له من ما له سهماً (اس نے فلاں کے لئے اپنے مال سے حصہ مقرر کیا) یا یہ فاتخذ من ضرب اللبن سے ہے۔ (جب کوئی اینٹیں بنانے کا کام کرے) میں کہتا ہوں تقدیر کلام اس طرح بھی ممکن ہے فاضرب بعصاک البحر یکن طریقاً (یعنی اپنا عصا سمندر پر مارو تو راستہ ہو جائے گا) (پہلی دونوں صورتوں میں جب کہ فاضرب 'اجعل' اتخذ کے معنی میں ہو تو طریقاً مفعول بہ بنے گا اور مفسر کی تقدیر پر یکن محذوف کی خبر بنے گا) یبساً مصدر ہے اور طریقاً کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور قراء نے لا تخاف کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ اضرب کے فاعل سے حال یا طریقاً کی صفت ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہوگا تم سمندر پر ڈنڈا مارو دراں حالانکہ تم دشمن کے پکڑے جانے سے امن میں ہو اور سمندر میں ڈنڈا مار کر ایسا خشک راستہ بناؤ جو دشمن کے پکڑنے سے محفوظ ہے۔ حمزہ نے لاتخف یعنی جزم کے ساتھ نہی کا صیغہ پڑھا ہے یا جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔ لا تخشیٰ مستقل کلام ہے۔ اور اس کا عطف لا تخاف پر ہے اور اس کے آخر میں الف حمزہ کی قرأت پر اطلاق کے لئے ہے جیسے تظنون باللّٰه الظنونا میں ہے یا یہ لاتخف کے فاعل سے حال ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق سمندر پر عصا مارا تو وہ پھٹ گیا اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو بالکل خشک کر دیا اور وہ سب اس میں سے صحیح وسلامت گذر گئے۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾

''پھر فرعون نے ان کا تعاقب کیا اپنے لشکروں سمیت پس چھا گئیں فرعونیوں پر سمندر کی (تند موجیں) جیسا کہ چھا گئیں ان پر[1]''

[1] فاتبعهم محذوف کلام پر معطوف ہے۔ یعنی فاسری موسیٰ بقومه فاتبعهم بجنوده میں باء بمعنی مع ہے۔ یعنی جب فرعون کو خبر ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کو لے کر نکل گئے ہیں تو اس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اتبع باب افعال ہے۔ لیکن بمعنی افتعال ہے اور باء تعدیہ کے لئے ہے۔ بعض علماء نے باء کو زائدہ لکھا ہے یعنی اس کے لشکر نے پیچھا کیا اس آخری تاویل کی بناء پر فرعون کی اپنی ذات کے نکلنے پر کوئی دلیل نہ ہوگی حالانکہ وہ خود بھی نکلا تھا۔ الیم کا معنی سمندر ہے۔ اور اس سے پہلے من بیانیہ یا تبعیضیہ ہے یہ ما غشیهم سے حال ہے۔ اس کلام میں مبالغہ ہے کہ ان پر سمندر کی موجیں اس طرح چھائیں کہ جن کی کیفیت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غشیهم میں ضمیر منصوب فرعون اور اس کے لشکریوں کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلی ضمیر فرعون اور اس کے لشکر کے لئے ہے اور دوسری موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے لئے ہے۔ یعنی فرعون اور اس کے لشکر پر وہ سمندری موجیں چھا گئیں اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم پر نہ چھائیں پس وہ نجات پا گئے۔

وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ ﴿٧٩﴾

''اور گمراہ کر دیا فرعون نے اپنی قوم کو اور نہ دکھائی انہیں سیدھی راہ[1]۔''

لے اس آیت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ فرعون نے دین میں اپنی قوم کو گمراہ کیا اور انہیں سیدھی راہ نہ دکھائی، اس صورت میں اس کے قول وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ کی تکذیب اور اس کا استہزاء ہے۔ یا یہ معنی کہ سمندر میں اس نے ان کو گم کر دیا اور خود بھی نجات نہ پاسکا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ۝۸۰

''اے بنی اسرائیل (دیکھو!) ہم نے بچا لیا تمہیں تمہارے دشمن سے اور ہم نے تم سے وعدہ کیا (کوہ) طور کی دائیں جانب کا اور ہم نے اتارا تم پر من وسلویٰ لے''

لے یا تو یہ خطاب ان بنی اسرائیل کو ہے جو عہد نبوی ﷺ میں موجود تھے اور ان کے آباء پر کئے جانے والے احسان کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں خطاب بنی اسرائیل سے نہیں قریش سے تھا۔ یا یہ خطاب ان سے ہے جن کو اللہ نے فرعون کو ہلاک کرنے کے بعد نجات عطا فرمائی تھی۔ اس صورت میں قلنا مقدر ہوگا اور یہ ایک سائل کے جواب میں ہے جو کہتا ہے کہ نجات کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تو فرمایا ہم نے کہا اے بنی اسرائیل الخ۔ پہلی تقدیر کے اعتبار سے کم ضمیر سے پہلے مضاف محذوف ہوگا، یعنی ہم نے تمہارے آباء کو نجات دی۔ عدو سے مراد فرعون ہے جانب الطور ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ الا یمن جانب الطور کی صفت ہے اس کی وجہ ادنیٰ مناسبت ہے۔ کیونکہ وہ پہاڑ موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا ورنہ پہاڑ کی تو کوئی دائیں یا بائیں جانب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے، تورات عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا اور فرمایا اپنی قوم کے چیدہ چیدہ ستر آدمی ساتھ لے آ ؤ ملابست اور قریبی تعلق کی بناء پر وعدہ کی نسبت لوگوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ وعدہ صرف موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝۸۱

''کھاؤ ان پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا ورنہ اترے گا تم پر میرا غضب اور وہ بدنصیب اترتا ہے جس پر میرا غضب تو یقیناً وہ گر کر رہتا ہے لے''

لے قول کی تقدیر کے ساتھ 'کلوا' نزلنا کے فاعل سے حال ہے۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے طیبات سے مراد لذائذ یا حلال چیزیں ہیں۔ مِنْ بیانیہ یا تبعیضیہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے انجیتکم و واعدتکم اور ما رزقتکم، یعنی واحد کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بطور تعظیم نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور نزلنا میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ لَا تَطْغَوْا کا مفہوم یہ ہے۔ کہ جو میں نے تمہیں مال و دولت عطا کیا ہے اس کو استعمال کر کے شکر میں کوتاہی نہ کرنا اور اسراف، کنجوسی، تکبر اور حقدار کو حق عطا نہ کر کے حد سے تجاوز نہ کرنا۔ کسائی اور اعمش نے یحل کو حلولہ کے ضمہ کے ساتھ اور من یحلل کو لام کے ضمہ کے ساتھ باب نصر ینصر حلول سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی نزول ہے۔ باقی قراء نے یحل کی حاکو اور یحلل میں لام کو کسرہ کے ساتھ باب ضرب یضرب سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ حَلَّ الدین سے مشتق ہوگا۔ جس کا معنی قرض کی ادائیگی کا واجب ہونا ہے۔ یعنی جس پر غضب الٰہی کا کوڑا برسے گا وہ آگ کے گڑھے میں گرے گا۔

وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی ﴿۸۲﴾

''اور میں بلاشبہ بہت بخشنے والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے بعد ازاں ہدایت پر مستحکم رہتا ہے۔[1]''

1۔ فرمایا جو شرک سے توبہ کرے، اللہ اور اس کے رسول جو کچھ لے کر آئے اس پر ایمان لائے اور اللہ کریم نے جو احکام دیئے ہیں ان پر عمل پیرا ہو اور پھر ہدایت پر قائم و دائم رہے تو میں اللہ اس کے پہلے سارے گناہوں کو بخشنے والا ہوں۔ ثم اهتدی کے معنی میں اختلاف ہے، عطاء نے ابن عباس سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ایمان لانے اور نیک عمل کی توفیق اللہ کریم کی طرف سے سمجھے۔ قتادہ اور سفیان الثوری فرماتے اسلام کو لازم پکڑے رکھے اور اس پر ہی اسے موت آئے۔ الشعبی مقاتل اور کلبی کہتے ہیں اس نے جان لیا کہ اس عمل کا مجھے ثواب ملے گا۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں اس نے علم سیکھا تا کہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ کیسے عمل کرنا ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں۔ وہ ہدایت مذکورہ پر مستحکم رہا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں پھر وہ سنت اور جماعت پر قائم رہا (1) میرے نزدیک اس کا یہ معنی کہ پھر اسے اللہ کے قرب کی راہ ملی جو بلا کیف ہے اور قرب کے بلند مدارج تک پہنچنے کا راستہ ملا۔

وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۸۳﴾

''اور کس وجہ سے تم جلدی آ گئے اپنی قوم سے اے موسیٰ۔[1]''

1۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے اور بنی اسرائیل کے خطاب انجینا کم پر معطوف ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ستر افراد منتخب فرمائے تا کہ وہ آپ کے ساتھ طور پر چلیں اور تورات لے آئیں۔ موسیٰ علیہ السلام رب کریم کے شوق و محبت میں ان کو چھوڑ کر پہلے طور پر پہنچ گئے اور انہیں فرمایا کہ تم میرے پیچھے پہاڑ پر آ جانا۔ موسیٰ علیہ السلام کے جلدی پہنچنے پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ سے پوچھا کہ جلدی کیسے آ گئے (2)۔ میں کہتا ہوں یہ سوال بطور تقریر ہے جیسے محبوب محب کو انتہائی جذب و شوق کی کیفیت میں دیکھ کر پوچھتا ہے آپ کیسے آئے اور محبوب کی غرض یہ ہوتی ہے کہ محب اپنے عشق و شوق کا اظہار کرے۔ لیکن ساتھیوں کو چھوڑ کر آنے کی وجہ سے کچھ انکار بھی فرمایا۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو امروں کی طرف سے جواب دیا اور انکار کے جواب کو مقدم فرمایا کیونکہ وہ اہم تھا۔

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیْ وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ﴿۸۴﴾

''عرض کی وہ یہ ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی جلدی تیری بارگاہ میں اس لئے حاضر ہو گیا ہوں میرے رب کہ تو راضی ہو جائے۔[1]''

1۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار وہ مجھ سے چند ہی قدم پیچھے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان کچھ زیادہ مسافت نہیں ہے، وہی تھوڑا سا فاصلہ جو عام طور پر قافلہ کے افراد میں ہوتا ہے۔ عجلت کا عطف هُمْ اُوْ لَاءِ پر ہے۔ یا قد مقدر کے ساتھ حال ہے۔ الیک سے مراد وہ مکان ہے۔ جس پر اللہ نے ان پر تجلیات ڈالنے اور کلام کا شرف بخشنے کا وعدہ فرمایا تھا رب اصل میں یاربی تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں لترضی کا مطلب یہ ہے کہ تیرے حکم کو جلدی پورا کرنا اور تیرے عہد کو نبھانا تیری رضا کے حصول کا باعث بنتا ہے، اسی لئے میں نے جلدی کی۔ میں کہتا ہوں لترضی کا مطلب یہ ہے کہ تیری غایت محبت اور ملاقات کے اشتیاق اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

تیری کلام کو سننے کے ذوق کی وجہ سے میں نے جلدی کی جیسا کہ محبوب کی ملاقات کے وقت کی قربت کا تقاضا ہے اور یہ محبت و شوق تیری رضا کا مقتضی ہے۔

وعدہ وصل چوں شود نزدیک   آتش عشق تیز گردد

جب وصل و وصال کا وعدہ نزدیک آتا جاتا ہے، عشق کی آگ مزید تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾

''ارشاد ہوا کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد[1] اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے[2]''

[1] فتن سے مراد آزمائش میں ڈالنا یا گمراہ کرنا ہے، یعنی ہم نے بچھڑے کے اظہار کے ساتھ انہیں آزمایا کہ یہ اس کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں۔ یا یہ معنی کہ ہم نے انہیں بچھڑے کی عبادت کی وجہ سے گمراہ کر دیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ فانا قد فتنا عجلت الیک پر مرتب ہے۔ تو ظاہر کلام کا تقاضا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا جلدی آنا فتنہ کا سبب بنا کیونکہ فاء سببیہ ہے۔ تو اس میں سببیت کی وجہ کیا ہے؟ میں کہتا ہوں شاید یہ وجہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو مخلوق خدا کی دو طرح سے ہدایت کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے، ایک ظاہراً وہ انہیں اسلام کی دعوت دیں اور اسلامی احکام سے انہیں آگاہی بخشیں۔ دوسرا باطناً کہ مخلوق کو اللہ کی طرف اس طرح کھینچنا کہ وہ باقی سب مخلوق سے کٹ جائیں اور ان کے دلوں پر ایمان اور معرفت کے نور کا فیضان فرمائیں تاکہ ایمان کے لئے ان کے سینے کھل جائیں اور حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھیں اور یہ کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ انبیاء کرام پوری توجہ مخلوق خدا کی طرف نہ فرمائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام شوق دیدار الٰہی میں طور پر جلدی آ گئے تو ان کی باطنی توجہ امت سے کٹ گئی جس کی وجہ سے امت فتنہ اور ضلال میں مبتلا ہو گئی (اس لئے فاء نا کی فاء کو سببیہ بنانا درست ہے اور اس کلام کو عجلت پر مرتب کرنا بھی صحیح ہے)

اسی وجہ سے بعض صوفیاء فرماتے ہیں الولایۃ افضل من النبوۃ۔ بعض علماء نے صوفیاء کے اس قول کی یہ تفسیر کی ہے کہ نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے۔ فرمایا ولایت کے نبوت سے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ولایۃ کا مقتضی ہر وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہنا اور ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا ہے جب کہ نبوت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ مخلوق کی طرف متوجہ رہے (یعنی ان کی ظاہری و باطنی صفائی میں مصروف رہے) لیکن تحقیق وہ ہے جو حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمت اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں نبوت مطلقاً ولایت سے افضل ہے کیونکہ ولایت تجلیات صفاتیہ سے عبارت ہے، جب کہ نبوت تجلیات ذاتیہ سے معنون ہے، اس لئے کہاں ذات اور کہاں صفات ان کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں نبوت اور ولایت ہر ایک کے لئے عروج اور نزول ہے۔ صوفی مرتبہ عروج میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ کمال حاصل کرے اور مرتبہ نزول میں مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ مخلوق کی تکمیل کرے (یعنی ناقصوں کو کامل بنائے اور کاملوں کو راہنما بنائے) لیکن ولایت کی نسبت میں ولی کا عروج صفات کی طرف ہوتا ہے ذات کی طرف نہیں ہوتا (یعنی وہ صرف صفات کی سیر کرتا ہے ذات تک اس کی رسائی نہیں ہوتی (جب کہ نبی کا عروج ذات کی طرف ہوتا ہے) اور ولی نزول کے وقت مبدء فیض کی طرف متوجہ ہوتا ہے مخلوق کی طرف کلیۃً متوجہ نہیں ہوتا۔ اور نبوت نزول کے وقت بالکلیہ مخلوق کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس حالت میں وہ ظاہراً اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو منقطع

دیکھتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے انتہائی شاق اور گراں ہوتی ہے، انتہائی مشقت اور تنگی میں ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ اس کیفیت میں اللہ سے منقطع نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ اس کا سینہ گنجینہ ان دونوں جہتوں کا جامع ہوتا ہے بلکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حکم سے ہی مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے۔ اسی وجہ سے اس سیر کو سیراً من اللہ باللہ کہا جاتا ہے۔ **فانی فی الوصال عبید نفسی و فی الھجران مولیٰ للموالی**۔ میں وصال میں اپنے نفس کا ایک ادنیٰ غلام ہوتا ہوں اور ہجر میں سرداروں کا سردار ہوتا ہوں۔ ہم نے سورۂ اَلَمْ نَشْرَحْ میں فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کی تفسیر کے تحت اس مسئلہ کو پوری شرح و بسط سے لکھا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات عطاء کرنے اور وعدہ پورا کرنے کے بعد فرمایا ہو کہ اپنی قوم کے پاس جاؤ۔ ہم نے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور ضلال کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ ضلالت خود ہی اس نے ان میں پیدا فرمائی تھی اور سامری میں اضلال کا فعل بھی خود اس نے پیدا فرمایا تھا۔ اور سامری کی طرف اضلال کی نسبت فرمائی کیونکہ اضلال کا کسب اس نے کیا تھا اور اس نے لوگوں کو بچھڑے کی پوجا کی طرف بلایا تھا۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ چھ لاکھ افراد بچھڑے کی عبادت میں مبتلا ہوئے تھے، صرف بارہ ہزار افراد اس گمراہی سے بچے تھے (1)۔ قاموس میں ہے کہ سامری یہ کرمان کا کافر تھا یا بنی اسرائیل کا سردار تھا اور سامرجگہ کی طرف منسوب ہے (2) امام بیضاوی فرماتے ہیں بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کی طرف منسوب ہے جسے سامرہ کہا جاتا تھا۔ اس سامری کا اصل نام موسیٰ بن ظفر تھا اور یہ منافق تھا (3)۔

فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ ﴿۸۶﴾

"(یہ سنتے ہی) لوٹے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر ہو کر فرمایا اے میری قوم! کیا وعدہ نہیں کیا تھا تم سے تمہارے رب نے بہت عمدہ وعدہ ۱؎ تو کیا طویل مدت گذر گئی ہے اس وعدہ پر (اور تم اس کے ایفاء سے مایوس ہو گئے) یا تم یہ چاہتے ہو کہ اترے تم پر غضب تمہارے رب کی طرف سے اس لئے تم نے توڑ ڈالا میرے ساتھ کیا ہوا وندہ ۲؎"

۱؎ چالیس دن پورے کرنے اور تورات لینے کے بعد موسیٰ علیہ السلام قوم کے فعل پر بڑے غصہ اور اضطراب میں واپس پلٹے۔ وعداً مصدر کی بناء پر منصوب ہے یا مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے اس بناء پر کہ وعدہ بمعنی الموعود ہے۔

۲؎ اَفَطَالَ میں استفہام انکاری ہے۔ اور فاء عاطفہ ہے۔ اور عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتاثرھم بمصاحبتی ایاکم فامنتم باللہ وحدہ وعدتمونی ان تکونوا بعدی علی ذالک فطال علیکم العھد**۔ تمام قراء نے **یحل** کو باب **ضرب یضرب** سے حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمہاری حماقت کی بھی کوئی حد ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 577 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 648 (العلمیہ)

کہ تم نے ایسے کام کا ارادہ کیا ہے جو غضب الٰہی کا موجب ہے اور میرے ساتھ جو تم نے ایمان پر ثابت قدم رہنے اور میرے احکام کی بجا آوری کا وعدہ کیا تھا، اسے تم نے پس پشت ڈال دیا۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾

"کہنے لگے نہیں توڑا ہم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ اپنے اختیار سے [1] بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر لاد دیے گئے تھے بوجھ قوم (فرعون) کے زیورات سے [2] سو ہم نے (سامری کے کہنے پر) انہیں پھینک دیا [3] اسی طرح سامری نے بھی (اپنے حصہ کے زیور) پھینک دیئے [4]"

[1] ملکنا کو نافع، ابوجعفر اور عاصم نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، حمزہ اور کسائی نے میم کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ملکت الشی کے مصدر میں یہ ساری لغتیں موجود ہیں، یعنی جب انسان اللہ کی طرف کسی مصیبت یا فتنہ میں مبتلا ہوتا ہے، اپنے آپ کا کچھ مالک و مختار نہیں ہوتا۔ قاموس میں بھی یہی معنی لکھا ہے۔

[2] حملنا کو نافع، ابن کثیر اور حفص نے حاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابوعمر، حمزہ، کسائی، یعقوب اور ابوبکر نے حاء کے فتحہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اوزاراً سے مراد بوجھ ہیں۔ من زينة القوم اوزار کی صفت ہے۔ یہ وہ زیورات تھے جو شادی کے بہانے فرعونیوں سے بنی اسرائیل نے عاریۃً لیئے تھے اور یہ اس رات لئے تھے جس رات مصر سے کوچ کرنے کا ارادہ تھا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان زیورات کو انہوں نے اوزار (بوجھ) اس لئے کہا تھا کیونکہ وہ انہوں نے عاریۃً لئے تھے اور پھر واپس نہیں کئے تھے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب فرعونیوں کو غرق کیا تو سمندر نے ان کے زیورات باہر پھینک دیئے تھے اور بنی اسرائیل نے اٹھا لیئے تھے اور یہ مال غنیمت تھے اور اس زمانہ میں مال غنیمت کا استعمال حلال نہیں تھا، اس وجہ سے انہوں نے ان زیورات کو اوزار کہا۔

[3] امام بغوی فرماتے ہیں انہوں نے اپنے زیورات ایک گڑھے میں پھینکے تھے، یہ مشورہ انہیں سامری نے دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک ان زیورات کو اس گڑھے میں پھینک دو۔ سدی فرماتے ہیں یہ بات انہیں حضرت ہارون نے فرمائی تھی کہ مال غنیمت حلال نہیں اس لئے ایک گڑھا کھودو اور اس میں تمام زیورات پھینک دو۔ موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائیں گے جو چاہیں گے حکم فرمائیں گے (2)۔

[4] سامری کے پاس جو زیورات تھے وہ اس نے بھی پھینک دیئے۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے آگ جلائی اور فرمایا جو کچھ تمہارے پاس فرعونیوں کے زیورات ہیں اس میں پھینک دو تو تمام نے پھینک دیئے۔ پھر سامری کے پاس جو جبرئیل امین کے گھوڑے کے پاؤں کی مٹی تھی وہ اس نے پھینکی۔ قتادہ فرماتے ہیں کچھ مٹی اس نے اپنے عمامہ میں رکھ لی تھی (3)۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۚ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

"پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لئے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا پھر سامری اور اس کے چیلوں نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کہا (اے فرزندانِ یعقوب) یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے ۱؎"

۱؎ اخرج کا فاعل سامری ہے۔ لھم ضمیر کا مرجع بنی اسرائیل ہیں۔ جسداً عجلاً سے بدل ہے لہ خوار عجلاً کی صفت ہے سامری اور اس کے چیلوں نے کہا موسیٰ السلام اس خدا کو یہاں چھوڑ کر طور پر تلاش کرنے گئے ہیں یا یہ معنی کہ موسیٰ علیہ السلام پہلے جس ایمان پر قائم تھے وہ انہوں نے ترک کر دیا ہے اور اللہ کا انکار کر دیا ہے۔

اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

"کیا ان احمقوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا ۱؎"

۱؎ استفھام انکاری ہے اور جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا ینظرون فلا یرون یا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی افروا بالوھیتھا فلا یعلمون ھذا الحمقاء (یعنی کیا انہوں نے اس بچھڑے کی الوہیت کا اقرار کیا یہ احمق اتنا بھی نہیں جانتے) ان لا یرجع میں ان مخففہ من مثقلہ ہے، اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ یعنی انہ لا یرجع ذالک العجل یعنی وہ تو ان کی بات کا جواب ہی نہیں دیتا اور نہ ان سے ابتداء کلام کرتا ہے۔ پس جب وہ ان سے کم درجہ ہے تو انہوں نے اسے کیسے اپنا معبود بنا لیا؟ نہ تو وہ انہیں کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع و نقصان ان سے روک سکتا ہے پھر یہ عبادت کا مستحق کیسے بن گیا ہے؟ امام بغوی نے لکھا ہے کہ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت ہارون علیہ السلام سامری کے پاس سے گذرے، وہ بچھڑے کا ڈھانچہ تراش رہا تھا۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ سامری نے کہا میں ایک ایسی چیز بنا رہا ہوں جو نفع دے گی، نقصان نہ دے گی، آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت ہارون نے دعا فرمائی اے اللہ! اسے اپنی خواہش کے مطابق وہ عطاء فرما۔ پس سامری نے بچھڑے کے منہ میں جبرئیل کے گھوڑے کے پاؤں سے لگی مٹی ڈالی تو وہ بیل کی طرح ڈکارنے لگا۔ یہ حضرت ہارون کی دعا سے سب کچھ ہوا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک آزمائش تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آزمایا تھا (۱)۔

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾

"اور بے شک کہا تھا انہیں ہارون نے (موسیٰ کی واپسی سے پہلے) اے میری قوم تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بیحد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو ۱؎"

۱؎ لقد الخ محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ جملہ وَ لَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ پر معطوف ہے۔ حضرت ہارون نے فرمایا اے میری قوم تمہیں بچھڑے کے ذریعے آزمائش میں ڈالا گیا ہے کہ تم توحید پر ثابت قدم رہتے ہو یا گمراہ ہو جاتے ہو۔ تمہارا پروردگار رحمٰن ہے، تمہارا اپنا وجود اور اس کی نشوونما کے لئے یہ رنگا رنگ کائنات اس کی رحمت بے پایاں کا اثر ہے، اسی پر ثابت قدم رہو اور بچھڑے کی عبادت سے انکار میں میرے حکم کی اطاعت کرو۔ فاتبعونی پر فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ اس کا ماقبل مابعد کا سبب ہے۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ﴿۹۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 225 (التجاریہ)

"قوم نے کہاہم تواسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ علیہ السلام ۱؎"

۱؎ حضرت ہارون علیہ السلام کی تبلیغ کا انہوں نے کچھ اثر قبول نہ کیا اور اس بےبس گنگے بہرے بچھڑے کی عبادت پر ڈٹے رہنے کا عزم کیا تو حضرت ہارون علیہ السلام بارہ ہزار لوگوں کے ساتھ ہوگئے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی اور توحید پر قائم اور مضبوط رہے تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام واپس پلٹے تو قوم میں شوروغل سنا اور دیکھا کہ قوم کے افراد بچھڑے کے اردگرد ناچ رہے ہیں۔ وہ ستر آدمی جو آپ کے ساتھ تھے انہوں نے کہا یہ فتنہ کی آواز ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی یہ بدلی ہوئی حالت دیکھ کر حضرت ہارون کو پکڑ لیا دائیں ہاتھ سے ان کا سر اور بائیں ہاتھ سے ان کی داڑھی پکڑلی اور غضبناک لہجہ میں کہنے لگے۔

قَالَ يٰهٰرُوۡنُ مَا مَنَعَكَ اِذۡ رَاَيۡتَهُمۡ ضَلُّوۡۤا ۙ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيۡتَ اَمۡرِىۡ ﴿۹۳﴾

"موسیٰ نے (آ کر غصہ سے) کہا اے ہارون کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو (انہیں چھوڑ کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا ۱؎ کیا تو نے بھی میری حکم عدولی کی ۲؎"

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مجازاً دعا کی جگہ منع ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کسی چیز سے پھرنے والے اور کسی چیز کے ترک کی طرف دعوت دینے والے کے درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں ان لا تتبعن میں لا زائدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کس چیز نے تجھے روکا تھا میری پیروی سے اور اس وصیت کو پورا کرنے سے جو میں نے تجھے کی تھی کہ مخلوق خدا کو توحید کی دعوت دیتے رہنا اور انہیں (شمشیر و) سناں اور (دست و) زبان کے ذریعے شرک سے منع کرتے رہنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ معنی کہ تو میرے پیچھے کیوں نہ چلا آیا تاکہ مجھے قوم کے کرتوتوں کی خبر دیتا۔ اور تمہارا ان کو چھوڑ نا ان کے اس فعل بد پر زجروتوبیخ بن جاتا۔ تتبعن میں ابن کثیر نے دونوں صورتوں میں یاء ساکنہ کو قائم رکھا ہے، جب کہ نافع اور ابوعمر نے صرف وصل کی صورت میں قائم رکھا ہے اور دوسرے قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔

۲؎ افعصیت امری میں استفہام انکاری ہے اور یہ جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اوضیت بما فعلوا واقمت فیھم وفعصیت۔ کیا تو ان کے فعل سے راضی تھا اور تو ان میں ٹھہرا رہا اور تو نے بھی میری حکم عدولی کی ہے۔

قَالَ يَبۡنَؤُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡيَتِىۡ وَلَا بِرَاۡسِىۡ‌ ۚ اِنِّىۡ خَشِيۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَيۡنَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَلَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِىۡ ﴿۹۴﴾

"ہارون نے کہا اے میرے ماں جائے (بھائی) ۱؎ نہ پکڑو میری داڑھی کو اور نہ میرے سر (کے بالوں) کو ۲؎ میں نے اس خوف سے (ان پر سختی نہ کی) کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے پھوٹ ڈال دی بنی اسرائیل کے درمیان اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا ۳؎"

۱؎ حضرت ہارون نے يَبۡنَؤُمَّ فرمایا۔ تاکہ حضرت موسیٰ کے دل میں رحمت اور نرمی کا جذبہ پیدا ہو۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ واقعی حضرت موسیٰ ان کے اخیافی بھائی تھے۔ لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور ہارون ماں باپ دونوں کی طرف سے بھائی تھے۔

۲؎ نافع اور ابوعمرو نے راسی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا میرے سر کے بال نہ کھینچئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت سختی سے اور غصہ میں آپ کے بال کھینچے تھے۔ انی خشیت نہی کی علت ہے، یعنی اگر میں ان

کے ساتھ قتال کرتا تو بنی اسرائیل کئی گروہوں میں بٹ جاتے اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہتے۔
ع آپ نے فرمایا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ میں نے جو تمہیں وصیت کی تھی اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ تم وہ بھول گئے تھے اور تم نے اس کی حفاظت نہیں کی۔ آپ کی ہر وصیت نرمی کرنے پر اور سختی نہ کرنے پر دلالت کرتی تھی اور اصلاح خون ریزی کے منافی ہے اس لئے میں نے جنگ و جدل سے گریز کیا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾

''آپ نے پوچھا اے سامری (اس فتنہ انگیزی) سے تیری غرض کیا تھی لے''

لے امام بیضاوی فرماتے ہیں خطب مصدر ہے خطب الشئی کا جس کا معنی کسی چیز کو طلب کرنا ہے معنی یہ ہے کہ اے سامری تیرا اس فعل سے مطلوب کیا تھا کس وجہ سے تو نے یہ کھیل کیا۔ کس چیز نے تجھے اس کام پر ابھارا۔ نہایہ میں ہے۔ ماخطبک ای ماشانک وحالک کیا حال ہے تیری شان کیا ہے اور خطب اس کام کو کہتے ہیں جس کے متعلق خطاب کیا جائے۔ اس کا معنی شان اور حال بھی ہے۔ قاموس میں الخطب الشان والا مر عظم او صغر (ا)۔ خطب شان اور کام کو کہتے ہیں خواہ وہ کام عظیم ہو یا حقیر ہو۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾

''اس نے کہا میں نے دیکھی ایسی چیز جو لوگوں نے نہ دیکھی پس میں نے مٹھی بھر لی رسول کی سواری کے نشان قدم کی خاک سے پھر اسے ڈال دیا (اس ڈھانچہ میں) اور اس طرح آراستہ کردی میرے لئے میرے نفس نے یہ بات لے''

لے حمزہ اور کسائی نے لم یبصروا کو تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے علماء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ قبضۃ مصدر ہے تعداد بیان کرنے کے لئے اور یہ قبض سے مشتق ہے اور مقبوض کے معنی میں ہے۔ رسول سے مراد جبرئیل علیہ السلام ہے، یعنی میں نے جبرئیل کے گھوڑے کے نشان قدم سے مٹھی بھر لی پھر میں نے اسے اس بچھڑے کے منہ میں ڈال دیا۔
بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ زیورات سے بنا ہوا بچھڑا اس مٹی کی وجہ سے ڈکارنے لگا تھا جو جبرئیل کے نشان قدم سے لی گئی تھی اور سامری جبرئیل کو پہچانتا تھا کیونکہ جس سال سامری کو ماں نے جنم دیا تھا اس سال فرعون بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ اس کی ماں نے فرعون کے خوف سے اسے ایک غار میں رکھ دیا تھا[اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا تا کہ اس کی نشوونما کا اہتمام کرے۔ کیونکہ اللہ نے اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو آزمائش میں ڈالنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جبرئیل امین اس کی پرورش کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔
سامری نے کہا میرے نفس نے ہی مجھے ترغیب دی کہ میں ایسا کروں۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي

ا۔ ... جلد 1 صفحہ 157 (التراث العربی)

الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

”آپ نے (غصہ سے) فرمایا جا چلا جا۔ پس تیرے لئے اس زندگی میں تو یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے اور بیشک تیرے لئے ایک اور وعدہ (عذاب) بھی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور (ذرا) دیکھ اپنے اس خدا کی طرف جس پر تو جم کر بیٹھا رہا (اس کا کیا حشر ہوتا ہے) ہم اسے جلا ڈالیں گے [1] پھر ہم بکھیر کر بہا دیں گے اس سمندر میں اس کی (راکھ) کو [2]“

[1] سامری کو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی مجلس سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور فَاِنَّ پر فاء سببیہ ہے، یعنی آپ نے فرمایا دفع ہو جا، دنیا میں تیرے لئے یہ سزا اور عقوبت ہے کہ تو جب کسی کو دیکھے گا تو کہے گا مجھے ہاتھ نہ لگاؤ، میرے قریب نہ آؤ۔ میں کہتا ہوں شاید یہ اس وجہ سے وہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں وحشت ڈال دی تھی، وہ کسی سے مانوس نہیں ہوتا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر اتفاقاً وہ کسی کو چھو لیتا یا اسے کوئی دوسرا چھو لیتا تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا۔ اسی خوف کی وجہ سے وہ یہ کہتا تھا کہ مجھے کوئی نہ چھوئے۔ وہ جنگل میں تنہا رہا اور پھر بدکے ہوئے وحشی کی طرح گھومتا پھرتا مر گیا۔ امام بغوی لکھتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا تھا کہ اس کے ساتھ میل جول اور تعلق ختم کر دو۔ ابن عباس نے فرمایا تجھے اور تیرے بچے کو نہ چھونا ہے(1)۔ موعداً سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ لن تخلفه کو ابن کثیر، ابو عمرو اور یعقوب نے لام کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی تو عذاب الٰہی سے غائب نہ ہوگا اور نہ تیرے لئے کوئی فرار کی جگہ ہوگی بلکہ قیامت کے روز تجھے عذاب ملے گا اور یہ بھی جائز ہے کہ اخلفت الموعد سے مشتق، ہو معنی یہ ہوگا کہ تو وعدہ کی خلاف ورزی نہ پائے گا۔ دوسرے قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے کے وعدہ میں خلاف ورزی نہیں فرمائے گا۔ ظلت اصل میں ظللت تھا تخفیفاً پہلے لام کو حذف کیا گیا ہے۔ یعنی تو جس باطل خدا کی عبادت پر جمار ہا ذرا دیکھ ہم کیسے اس کی درگت بناتے ہیں ہم اسے آگ کے ساتھ جلا دیں گے یا ریتی کے ساتھ اس کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔ حرق کا معنی ریتی کے ساتھ کسی چیز کو رگڑنا ہے۔ مبالغہ کے لئے باب تفعیل بنایا گیا ہے اور جعفر نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] پھر ہم اس کی راکھ کو یا اس کے رگڑے ہوئے چورے کو دریا میں ڈال دیں گے، اس کا ایک ذرہ بھی تمہیں نہیں ملے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی پوجا کرنے والوں کی حماقت کے اظہار کے لئے ایسا کیا۔ تاکہ جس میں کچھ بھی عقل ہوگی تو سمجھ جائے گا کہ جس کے سامنے ہم اپنی جبینیں خم کرتے رہے اس میں تو اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنا آپ بچا سکے۔

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

”تمہارا معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ گھیر رکھا ہے اس نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے [1]“

[1] یعنی عبادت کا مستحق تو صرف اللہ ہے کیونکہ کمال علم اور کمال قدرت میں اس کا کوئی ہمسر اور مثل نہیں ہے اور اس کے علم محیط نے ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے، وہ ذات ہمہ بیں اور ہمہ دان ہے۔ یہ بچھڑا جو زیورات کو کوٹ کوٹ کر تیار کیا گیا ہے اور پھر آگ کے شعلوں کے سپرد کیا گیا ہے، وہ نہ تمہارا معبود تھا اور نہ وہ کچھ دیکھتا اور جانتا تھا۔ وہ اگر زندہ بھی ہوتا تو غباوت و حماقت کی ایک مثال ہوتا (ایسے بے بس اور بے زبان کی عبادت اور اس کے سامنے جبیں فرسائی سے تمہیں شرم آنی چاہئے تھی، بڑا حیف ہے تمہاری عقل پر)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 226 (التجاریہ)

علماً نسبت سے تمیز ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَ قَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۟ۖۚ

''یوں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے خبریں ان لوگوں کی جو پہلے گزر چکے اور ہم نے مرحمت فرمایا آپ کو اپنی جناب سے ایک پندنامہ ۱؎''

۱؎ کذالک مصدر محذوف اقتصاصاً کی صفت ہے اور ہم نے تجھ پر پہلی امتوں کے واقعات بیان فرمائے تاکہ تیرے علم میں اضافہ ہو تیرے معجزات میں زیادتی ہو اور آپ ان میں غور و فکر کریں۔ نیز تیری امت کے صاحب فراست اور صاحب بصیرت لوگوں کو تنبیہ ہو جائے۔ قد آتینک نقص کے فاعل سے حال ہے۔ ذکراً سے مراد قرآن ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو قرآن جیسی مقدس کتاب عطا فرمائی جو ان قصص و واقعات پر مشتمل ہے اور اس لائق ہے کہ اس میں غور و فکر کیا جائے۔ ذکراً پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو اپنی جناب سے ذکر جمیل اور لوگوں کے درمیان عظیم شہرت عطا فرمائی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے آپ کے ذکر کو اپنے ذکر کے ساتھ اذان، اقامت اور تشہد وغیرہ میں ملا دیا ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۟ۙ

''جو شخص روگردانی کرے گا اس سے وہ اٹھائے گا قیامت کے دن ایک بوجھ ۱؎''

۱؎ من اعرض عنه یا تو ذکراً کی صفت ہے یا مستانفہ جملہ ہے، یعنی جو قرآن سے منہ موڑے گا اور اس پر ایمان نہیں لائے گا اور اس کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہو گا یا یہ معنی کہ اے محبوب جو تیرے ذکر سے اعراض کرے گا اور بعض علماء نے عنه کی ضمیر کا مرجع اللہ کو بنایا ہے، اس وقت یہ معنی ہو گا جو اللہ سے اعراض کرے گا۔ وزراً کا معنی بوجھ ہے اور یہاں گناہوں کا بوجھ مراد ہے۔ سورہ مریم میں يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کے تحت ابن ابی حاتم کی روایت گزر چکی ہے جو انہوں نے عمرو بن قیس الملائی سے روایت کی ہے، اس حدیث میں ہے کہ کافر کا عمل انتہائی قبیح شکل اور بدبو کے ساتھ آئے گا اور اسے کہے گا کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ وہ کہے گا نہیں، صرف اتنا نظر آ رہا ہے کہ اللہ نے تیری شکل بڑی قبیح بنائی ہے اور تیری بدبو بڑی خبیث ہے۔ وہ کہے گا تو دنیا میں اسی طرح رہا، میں تیرا برا عمل ہوں۔ وہاں تو مجھ پر لمبا عرصہ سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہوں گا اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (وہ اپنی پیٹھوں پر اپنے بوجھ اٹھائے ہوں گے) یا یہ معنی کہ وہ بڑی بھاری سزا برداشت کریں گے۔ سزا کو وزر سے تعبیر کیا ہے گویا اسے تشبیہ دی گئی ہے بوجھ اٹھانے کی مشقت سے۔ وہ بوجھ جس کو اٹھانا مشکل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے کمر دوہری ہو جاتی ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَ سَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۟ۙ

''یہ لوگ ہمیشہ اس بوجھ تلے دبے رہیں گے ۱؎ اور بہت تکلیف دہ ہو گا ان کے لئے روز قیامت یہ بوجھ ۲؎''

۱؎ فیه میں ضمیر کا مرجع جزاء الوزر یعنی اس گناہ کی جزاء میں ہمیشہ رہیں گے یا یہ معنی کہ وہ اس بوجھ کو ہمیشہ اٹھائے رہیں گے۔ خَالِدِيْنَ فيه يَحْمِلُ کے فاعل سے حال ہے۔ من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے يَحْمِلُ مفرد کا صیغہ ذکر فرمایا اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے (خالدین) کا صیغہ جمع فرمایا۔

۲؎ حملاً ساء میں مبہم ضمیر کی تمیز ہے اور مخصوص بالذم (وزرهم) محذوف ہے اور لهم میں لام بیان کے لئے ہے۔

یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ جو کسی انسان نے ناحق دنیا کا مال لیا ہوگا وہ قیامت کے دن اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ناحق کسی کا مال نہ لے ورنہ قیامت کے روز اللہ کے حضور وہ اسے اٹھائے ہوئے جائے گا۔ میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اللہ کے حضور حاضر ہو اور اس پر اونٹ بلبلا رہا ہو اور گائے ڈکار رہی ہو اور بکری میمنا رہی ہو(1)۔ یہی حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو حمید الساعدی سے صدقات میں سے کوئی چیز ناحق لینے والے عامل کے بارے نقل کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ایک بالشت زمین ظلم سے لے گا، قیامت کے روز سات زمینوں میں سے اتنی زمین کا طوق اس کے گلے میں ہوگا(2)۔ طبرانی نے الحکم بن الحارث السلمی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمانوں کے راستہ سے ایک بالشت غصب کر لے گا، قیامت کے روز وہ سات زمینوں سے اتنی مقدار اٹھائے ہوئے ہوگا(3)۔ امام احمد اور طبرانی نے یعلی بن مرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص ظلماً ایک بالشت زمین کسی کی لے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں تک گڑھا کھودنے کا مکلف بنائے گا۔ پھر قیامت کے روز اسے ان زمینوں کا طوق پہنا دیا جائے گا اور لوگوں کے فیصلہ تک وہ زمین اس کے گلے میں رہے گی(4)۔

طبرانی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو زمین کی ایک بالشت ظلماً لے گا قیامت کے روز سات زمینوں میں سے اتنی مقدار اس کے گلے میں ڈالی جائے گی(5)۔ اسی طرح طبرانی نے ابن مالک اشعری سے روایت کی ہے۔ امام احمد اور شیخین نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں خیانت کی برائی بیان کی اور اس کا حکم بیان فرمایا پھر فرمایا میں تم میں سے کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے روز آئے تو اس کی گردن پر اونٹ بلبلا رہا ہو اور پھر وہ مجھ سے عرض کرے یا رسول اللہ! میری مدد فرمائیے۔ میں اسے کہوں اللہ کے مقابلہ میں' میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں نے تمہیں پیغام الٰہی پہنچا دیا تھا(6)۔ اسی حدیث میں فرمایا وہ آئے اور اس کی گردن پر گھوڑا ہنہنا رہا ہو اور بکری میمنا رہی ہو۔ ابو یعلی اور بزار نے عمر بن خطاب سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ صدقہ اکٹھا کرنے والوں کے متعلق بھی اسی طرح کا ارشاد وارد ہے جب وہ خیانت کریں۔ حضرت سعد بن عبادہ اور ہلب کی حدیث امام احمد نے اسی طرح روایت کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ کی حدیث بزار نے' ابن عباس، عبادہ بن الصامت اور ابن مسعود کی حدیث طبرانی نے نقل کی ہے۔ طبرانی اور ابو نعیم نے الحلیہ میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ضرورت سے زائد مکان بنایا وہ اسے کندھے پر اٹھانے کا مکلف کیا جائے گا(7)۔ ابوداؤد' ابن ماجہ اور طبرانی نے جید سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک انصاری کے قبہ سے گزرے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو تعمیر اس سے زیادہ ہوگی وہ قیامت کے روز مالک پر وبال ہوگی۔ جب اس قبہ کے مالک کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ بات پہنچی تو اس نے اس قبہ کو گرا دیا(8)۔

طبرانی نے حضرت واسلہ بن الاسقع کی حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔ منذری کہتے ہیں اس حدیث کے بہت سے شواہد

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 156 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 332 (وزارت تعلیم) 3۔ معجم کبیر، جلد 3، صفحہ 215 (العلوم والحکم)
4۔ معجم کبیر، جلد 22، صفحہ 270 (العلوم والحکم) 5۔ ایضاً، صفحہ 292 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 122 (قدیمی)
7۔ معجم کبیر، جلد 10، صفحہ 152 (العلوم والحکم) 8۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 711 (نور محمد)

ہیں۔ طبرانی نے الاوسط میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک کنویں سے گزرے جس کا پانی کھینچا جا رہا تھا، فرمایا اگر اس کنویں کا مالک اس کنویں کا حق ادا نہیں کرے گا تو قیامت کے دن وہ اسے اٹھائے ہوئے ہوگا۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾

''جس روز پھونکا جائے گا صور میں ۱؎ اور ہم جمع کریں گے مجرموں کو اس دن اس حال میں کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی ۲؎۔''

۱؎ ابو عمرو نے ینفخ کو ننفخ یعنی نون مفتوحہ اور فاء کے ضمہ کے ساتھ جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے صور کے متعلق نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نسائی ابن حبان حاکم بیہقی اور ابن مبارک نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ مسدد نے ابن مسعود سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۲؎ زرقاً المجرمین میں سے حال ہے۔ الزرقة آنکھ کی سیاہی میں سبزی کو کہتے ہیں۔ مجرموں کا یہ وصف اس لئے بیان فرمایا کیونکہ عربوں کے نزدیک یہ بدترین رنگ ہے اور عرب ایسی آنکھ کو ناپسند کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رومی مسلمانوں کے دشمنوں کے دشمن تھے اور وہ نیلی آنکھوں والے تھے۔ قیامت کے روز قبروں سے اٹھیں گے تو ان کی آنکھیں نیلی اور چہرے کالے سیاہ ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زرقا سے مراد اندھا ہونا ہے۔ کیونکہ نابینا شخص کی آنکھ کی پتلی نیلی ہوتی ہے۔ یہ تاویل اس ارشاد کے موافق ہے وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ بعض علماء فرماتے ہیں زرقا سے مراد عطاشاً ہے (یعنی پیاسے ہوں گے)

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾

''چپکے چپکے آپس میں کہیں گے کہ نہیں رہے تم دنیا میں مگر صرف دس دن ۱؎۔''

۱؎ یتخافتون یا تو المجرمین سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے چونکہ خوف و ہراس ان کے دل پر چھایا ہوگا اس لئے آہستہ آہستہ باتیں کریں گے۔ ان لبثتم الا عشرا یتخافتون کا مفعول ہے۔ وہ دنیا کے زوال یا آخرت کی مدت کے طویل ہونے یا آخرت کی تکالیف کا مشاہدہ کرنے اور یہ جاننے کے بعد کہ ہم نے دنیا کی زندگی کو خواہشات نفس کی پیروی میں برباد کیا اس لئے ہم ان تکالیف کے مستحق ہوئے ہیں۔ دنیا کے ضیاع پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی دنیا کی عمر کو قلیل تصور کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ کہیں گے ہم قبور میں دس دن ٹھہرے۔ بعض فرماتے ہیں وہ کہیں گے دونوں صوروں کے پھونکنے کے درمیان دس دن ہم ٹھہرے حالانکہ ان کے درمیان چالیس سال مدت ہوگی کیونکہ دونوں صوروں کے درمیان ان سے عذاب اٹھالیا جائے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان لبثتم کا جملہ یقولون کی تقدیر کے ساتھ یتخافتون سے عطف بیان یا بدل ہو یا اس کے فاعل سے حال ہو۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

''ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہیں گے جبکہ ان میں سب سے زیادہ زیرک کہے گا کہ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر صرف ایک

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 65 (وزارت تعلیم)

دن لے۔''

لے نحن اعلم اور یتخافتون الخ ان دونوں جملوں کے درمیان ایک جملہ معترضہ ہے، یعنی جس طرح انہوں نے کہا ہے معاملہ ایسا نہیں ہے۔

امثلھم سے مراد وہ جوان سے زیادہ عقلمند اور قول و عمل کے اعتبار سے معتدل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قول کے قائل کو ترجیح دی ہے کیونکہ دنیا کی مدت آخرت کی طوالت کی نسبت سے ایک دن کی مانند ہے یا کئی دوسری وجوہ کے اعتبار سے اس کو پسند فرمایا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ بنی ثقیف کے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کے دن پہاڑ کیسے ہوں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی(1)۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾

''اور وہ آپ سے پہاڑوں کے انجام کے متعلق پوچھتے ہیں آپ فرمایئے میرا رب انہیں جڑوں سے اکھیڑ کر پھینک دے گا لے''

لے ابن المنذر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ قریش نے پوچھا تھا کہ تمہارا رب قیامت کے دن ان پہاڑوں سے کیا کرے گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یوچھا نہیں گیا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھیں تو یہ جواب دینا۔ اسی وجہ سے جواب کو یہاں فاء سے شروع کیا گیا ہے، جبکہ باقی تمام جواب فاء کے بغیر ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ

النسف کا معنی اکھیڑنا ہے، یعنی جڑوں سے اکھیڑ کر ریت کی طرح پیس دے گا پھر ان پر ہواؤں کو بھیجے گا جو انہیں اڑا کر لے جائیں گی۔

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾

''پس بنا چھوڑے گا اس پہاڑی علاقہ کو کھلا ہموار میدان لے''

لے قاموس میں قاعاً کا معنی نرم زمین لکھا ہے(2) اور صفصفاً کا معنی مستویاً (برابر) لکھا ہے(3)۔

لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾

''نہ نظر آئے گا تجھے اس میں کوئی موڑ اور نہ کوئی ٹیلہ لے''

لے عوجاً کا معنی کجی، موڑ ہے اور امتا کا معنی چھوٹا ٹیلا ہے۔ اگر تم ہندی مقیاس سے پہاڑوں میں غور کرو گے تو تمہیں ان کے تین احوال نظر آئیں گے۔ پہلے دو احوال احساس کے اعتبار سے اور تیسرا حال مقیاس کے اعتبار سے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں حالتوں کا کوئی علیحدہ واضح فرق نظر نہ آئے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں ان میں کوئی پستی اور بلندی نظر نہ آئے گی۔ حسن فرماتے ہیں عوج کا معنی نشیب ہے اور امت سے مراد فراز ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1014 (التراث العربی)
3۔ القاموس المحیط، صفحہ 1103 (التراث العربی)

فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

"اس روز سب لوگ پیروی کریں گے پکارنے والے کی [1] کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اس سے اور خاموش ہو جائیں گی سب آوازیں رحمٰن کے خوف سے پس تو نہ سنے گا (اس روز) مگر مدہم سی آہٹ [2]"

1۔ یتبعون الداعی جملہ متانفہ ہے یا یوم القیامۃ سے بدل ہے۔ داعی سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ آپ بیت المقدس کی چٹان پر کھڑے ہو کر لوگوں کو محشر کی طرف بلائیں گے۔ آپ اعلان فرمائیں گے اے بوسیدہ ہڈیاں، پھٹی ہوئی کھالیں اور ٹوٹے ہوئے بال اللہ تمہیں فیصلہ کے لئے جمع ہونے کا حکم دیتا ہے۔ ابن عساکر نے زید بن جابر الشافعی سے اسی طرح نقل کی ہے۔

2۔ لا عوج کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو انحراف اور عدول کی گنجائش نہ ہوگی، کوئی اس سے ادھر ادھر کھسکنے کی طاقت نہ رکھتا ہوگا۔ خشعت الاصوات یتبعون کے فاعل سے قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے یا یتبعون پر معطوف ہے اور خشعت بمعنی تخشع ہے، یعنی رحمٰن کی ہیبت سے آوازیں خاموش ہو جائیں گی۔ فلا تسمع پر فاء سببیہ ہے اور خطاب غیر معین مخاطب کو ہے۔ همس اس خفیف آواز کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے چلنے کے وقت سنائی دیتی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں پست آواز اور پست کلام کو همس کہتے ہیں۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں بغیر آواز کے ہونٹوں کے حرکت دینے کو همس کہتے ہیں (1)۔ ابن ابی حاتم نے ابی طلحہ کے طریق سے ابن عباس سے مذکورہ بالا آیت کی یہ تشریح روایت کی ہے۔

قاعاً کا معنی ہموار، صفصفاً ایسا میدان جس میں کوئی چیز اگی ہوئی نہ ہو۔ عوجاً وادیٔ امتاً ٹیلہ (2)، خشعت الاصوات آوازیں خاموش ہوں گی۔ همساً ہلکی آواز۔

اور ایک دوسرے طریقے سے یہ تشریح بھی مروی ہے قاعاً صفصفاً بالکل ہموار زمین جس میں کسی قسم کا نشیب و فراز نہ ہو۔ ایک اور سند سے همساً کا معنی پاؤں کے چلنے کی آواز منقول ہے، یعنی لوگوں کے محشر کی طرف منتقل ہوتے وقت ان کے قدموں کی آواز۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾

"اس دن نہیں نفع دے گی کوئی سفارش [1] سوائے اس شخص کی شفاعت کے جسے رحمٰن نے اجازت دی اور پسند فرمایا ہو اس کے قول کو [2]"

1۔ لا تنفع الشفاعۃ جملہ متانفہ ہے۔ استثناء شفاعت سے ہے، مطلب یہ ہوگا کہ کسی کی شفاعت کسی کو کوئی فائدہ نہ دے گی مگر جس کو شفاعت کا اللہ تعالیٰ اذن عطا فرمائے گا یا یہ استثناء اعم المفاعیل سے ہے، یعنی کسی کو شفاعت فائدہ نہ دے گی مگر جس کی سفارش کے لئے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے گا کہ اس کے لئے شفاعت کی جائے پس شفاعت اس کے لئے نفع بخش ہوگی۔ پہلے معنی کے اعتبار سے من بدل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہوگا اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔

2۔ شفیع کا اللہ کی بارگاہ میں بلند مرتبہ ہے، اس لئے اس کی سفارش اسے پسند ہے یا یہ معنی کہ شفاعت کرنے والے کا قول اسے مشفوع کے بارے پسند ہے یا شافع کا قول مشفوع کی وجہ سے پسند ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یعنی مشفوع نے لا الہ الا اللہ کہا اس لئے اس کے حق میں سفارش قبول ہے (3) میں کہتا ہوں یہ تفسیر اس کے لئے ہے جسے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع دے گی۔

1۔ تفسیر [illegible]، جلد [illegible]، صفحہ 227 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 550 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 التجاریۃ

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

''وہ جانتا ہے لوگوں کے آنے والے حالات کو اور ان کے گزرے ہوئے واقعات کو اور لوگ نہیں احاطہ کر سکتے اس کا اپنے علم سے ۱''

۱۔ یعلم کا فاعل الرحمٰن ہے۔ ایدیھم کی ضمیر سے مراد شفاعت کرنے والے اور جن کی سفارش کی جائے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے دنیا کے حالات اور قبور کے حالات اور آخرت کے حالات سب کو جانتا ہے۔ یہ جملہ الرحمن سے حال ہے۔ علماً نسبت سے تمیز ہے، مطلب یہ کہ انسانوں کا علم اللہ تعالیٰ کی معلومات کو محیط نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا علم اس کی ذات کو محیط نہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر ایک اسم موصول کے لئے ہے یا دونوں کے مجموعے کے لئے ہے کیونکہ مخلوق کو اللہ کی تمام معلومات کا علم نہیں ہے۔

وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾

''اور (فرط نیاز سے) جھک جائیں گے سب (لوگوں کے) چہرے حی و قیوم کے سامنے ۱ اور نامراد ہوا جس نے لادا اپنے (سر) پر ظلم (کا بار گراں) ۲''

۱۔ یعنی قیدی جس طرح اپنے چہرے جابر بادشاہ کے سامنے جھکائے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح روز قیامت اللہ کی بارگاہ میں لوگ اپنے چہرے جھکائے ہوئے ہوں گے۔ عنی یعنی عناء جھک جانا اور انتہائی تکلیف اٹھانا۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسی ذلت اور خضوع کے معنی کی وجہ سے قیدی کو عانی کہتے ہیں (1)۔ الحی وہ ذات جس پر موت طاری نہ ہو اور اس کے لئے موت ممکن بھی نہ ہو۔ کیونکہ جس کی حیات زوال پزیر ہو وہ اپنی حقیقت میں مردہ ہے (اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر موت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی حیات جائز الزوال ہے) القیوم وہ ذات جس نے ہر نفس کے کسب کو قائم رکھا ہوا ہے اور ساری مخلوق کے امور کی تدبیر فرماتا ہے الوجوہ سے مراد اصحاب الوجوہ ہیں۔ ظاہر کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس سے تمام لوگوں کے چہرے مراد ہوں لیکن صرف مجرمین کے چہرے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں الوجوہ پر الف لام عوضی ہوگا۔ اس مفہوم کی تائید مابعد کلام بھی کرتی ہے۔

۲۔ ظلماً سے مراد شرک ہے۔ ابن عباس نے یہ معنی فرمایا کہ جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا وہ خسارے میں ہے (2) یہ جملہ معترضہ ہے یا اس چیز کے بیان کے لئے جملہ متانفہ ہے جس کی وجہ سے ان کے چہرے جھکے ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ الوجوہ سے حال ہو۔ طلق بن حبیب فرماتے ہیں یہاں العنا کا معنی حی قیوم کو سجدہ کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں اس مفہوم کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا کہ حی قیوم کے لئے لوگوں نے سجدہ کیا اور گھاٹے میں ہے جس نے شرک کیا اور اس کی بارگاہ میں سجدہ نہ کیا۔ اور عنت الوجوہ کا جملہ خشعت پر معطوف ہے یا خشعت کے فاعل سے قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔

وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

''اور جو شخص کرتا ہے نیک اعمال اور وہ ایماندار بھی ہو تو اسے اندیشہ نہ ہوگا کسی ظلم کا یا حق تلفی کا ۱''

۱۔ من شرطیہ ہے اور من الصالحت میں من بعضیہ ہے، یعنی جو فرائض پورے کرتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من ابتدائیہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو ومن یعمل عملاً کائناً من النیات الصالحات ہے، یعنی جو کوئی نیک نیتی سے عمل کرتا ہے۔ وھو مومن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

یعمل کی ضمیر مرفوع سے حال ہے، یعنی ایمان طاعات کی صحت اور نیکیوں کی قبولیت کے لئے شرط ہے۔ فلا یخاف شرط کی جزاء ہے۔ ابن کثیر نے فلا یخف جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ ظاہر کا تقاضا بھی یہ ہے کہ یہ مجزوم ہو کیونکہ یہ شرط کی جزاء ہے اور فاء سببیہ ہے۔ امام بیضاوی وغیرہ فرماتے ہیں یہ نہی کا صیغہ ہونے کی بناء پر مجزوم ہے(1)۔ جمہور علماء نے یا تو محذوف جزاء کی تعلیل کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے من یعمل من الصالحت وھو مومن یفلح لانه لا یخاف یا اسے مبتدا محذوف کی خبر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور جملہ اسمیہ شرط کی جزاء ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فھو لا یخاف۔ یعنی اسے گناہوں پر زیادتی کا اندیشہ نہ ہوگا اور نہ اسے اپنی نیکیوں کے ثواب میں کمی کا خطرہ ہوگا۔ ابن عباس نے اس آیت کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں نہ اس کی نیکیوں کے ثواب میں کمی ہوگی اور نہ اس پر کسی اور مجرم کا گناہ لادا جائے گا۔ ضحاک فرماتے ہیں اس کو ناکردہ گناہ پر پکڑ نہ ہوگی یا اس کی نیکی کا حسن ضائع نہ ہوگا۔ ھضم کا اصل معنی توڑ پھوڑ ہے، اسی سے ھضم الطعام ہے(2)۔ اور جملہ شرطیہ عنت الوجوہ پر معطوف ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

"اور اسی طرح ہم نے اتارا اس کتاب کو قرآن عربی زبان میں اور طرح طرح سے بیان کیں اس میں گناہوں کی سزائیں تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں یا پیدا کر دے یہ قرآن ان کے دلوں میں یہ سمجھ ۱"

اس کا عطف وکذالک نقص علیک پر ہے۔ اور کذالک مصدر محذوف کی صفت ہے اور انزلناہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ انزلناہ میں ضمیر منصوب قرآن کی طرف راجع ہے، یعنی جس طرح ہم نے آپ پر گذشتہ قوموں کے حالات بیان کئے اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا، جس کا انزال آسمانوں اور زمین کے خالق کی طرف سے ہونے میں اس انزال جیسا ہے اور وعدہ وعید سے لبریز ہونے میں بھی اس قوم کے حالات کے انزال جیسا ہے۔ یہ قرآن عربی زبان میں ہے، اس کا اسلوب بیان اور طرز ادا ایک ہے اور اس کا ہر لفظ معجزہ ہے۔ ہم نے اس میں وعیدیں بیان کیں تا کہ لوگ شرک اور گناہ سے اجتناب کریں اور ان میں تقویٰ کا ملکہ پیدا ہو جائے یا قرآن ان کے لئے نصیحت اور اعتبار پیدا کر دے۔ جب وہ اس کو سنیں گے تو وہ انہیں گناہوں سے روکے گا۔ اگرچہ وہ کلیتہً گناہوں سے مجتنب نہ ہوں گے تو بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ اس نکتہ کی بناء پر تقویٰ کی نسبت ان کی طرف کی کیونکہ تقویٰ ان کے لئے ملکہ ہے۔ اور احداث کی نسبت قرآن کی طرف کی اور احداث کی قرآن کی طرف نسبت مجازی ہے۔ یعنی سبب کی طرف کے قبیل سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے سبب ان کے لئے نصیحت و موعظت پیدا فرما دے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں او بمعنی واو ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

"پس اعلیٰ و ارفع ہے جو اللہ سچا بادشاہ ہے ۱ اور نہ عجلت کیجئے قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ پوری ہو جائے آپ کی طرف اس کی وحی ۲ اور دعا مانگا کیجئے میرے رب! اور زیادہ کر میرے علم کو ۳"

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 661 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریہ)

۱۔ اس ارشاد میں تکلم سے غیبت کی طرف التفات ہے اور فاسبیت کے لئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق کے کلام سے بالا ہے، جس طرح اس کی ذات ہر ذات سے اعلیٰ اور بے مثال ہے اور وہ اپنی صفات میں بھی مخلوق کی صفات سے بلند ہے۔ مشرکین جو اس کے متعلق یاوہ گویاں کرتے ہیں، وہ اس سے منزہ اور مبرا ہے۔ اور وہ اس سے بھی کہیں بلند ہے جو کامل لوگ اس کی صفات بیان کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی تھی اَللّٰهُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ عَلٰی مَا اَرَدْتَ۔ وہ وہ ذات ہے جس کا حکم بھی نافذ ہے، جس کی بادشاہی قدیم ہے اور جس کا قہر مان عام ہے، اس کا وجود اس کی کامل صفات اور اس کی شاہی اس کی ذات کے تقاضا کے ساتھ قائم ہے۔ اس کی سلطنت میں فساد اور زوال کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

۲۔ یعقوب نے ان یقضی کو نون کے فتحہ اور ضاء کے کسرہ اور یاء کے فتح کے ساتھ بطور تعظیم جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور وحیہ پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھی ہے، جب کہ باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور ضاد کے فتح کے ساتھ غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور وحیہ کو نائب فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ جبرئیل کے وحی پہنچانے سے پہلے قرأت قرآن میں جلدی کرنے سے نہی کی گئی ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (اے حبیب) آپ حرکت نہ دیں اپنی زبان کو اس کے ساتھ تاکہ آپ جلدی یاد کریں) مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے اصحاب پر نہ قرآن کو پڑھیے اور نہ انہیں لکھوایئے حتی کہ اس کے معانی تیرے لئے واضح ہو جائیں(1) پس یہ مجمل کا بیان آنے سے پہلے اس کی تبلیغ کرنے سے نہی ہے۔

۳۔ یعنی آپ استعجال (جلدی پڑھنے) کی بجائے علم کی زیادتی کا سوال کرو کیونکہ جو آپ کو وحی کی جاتی ہے وہ یقیناً آپ کو ازبر ہو جائے گی (آپ کے سینہ گنجینہ میں وحی کو محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری ہے)

وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

''اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد ۱''

۱۔ قد پر لام جواب قسم مقدر کے لئے ہے، یعنی قسم بخدا ہم نے آدم کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ وہ اس درخت سے نہ کھائے۔ قاموس میں عهد الیه کا معنی اوصاه (میں نے اسے تاکیدی حکم دیا) لیکن وہ عہد کو بھول گئے اور جو انہیں درخت سے دور رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اسے چھوڑ بیٹھے اور ہم نے مامور کی حفاظت میں زیادہ سختی نہ پایا۔ یا منهی عنه سے زیادہ صبر کرنے والا نہ پایا۔ عزم کا لغوی معنی دل میں کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کرنا ہے، اسی معنی میں یہ ارشادات ہیں۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر)۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ۔ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (قاموس میں ہے عزم علیه اراد فعله وقطع علیه(2)۔ اس نے کسی کام کے کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یا جدفی الامر۔ کام کے کرنے میں وہ کوشاں ہے اور سنجیدہ ہے نہایہ میں عزم کا معنی الجد اور الصبر لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کسی کام کے کرنے کا پختہ عزم کرنا اس کام کے کرنے میں سنجیدہ اور کوشاں ہونے اور اس کام کی مشقتوں پر صبر کرنے کو لازم ہے' بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہم نے درخت کا پھل کھانے پر اس کا ارادہ نہیں پایا بلکہ انہوں نے بھول کر کھایا تھا۔ یعنی گناہ اور معصیت پر ان کا کوئی دلی ارادہ نہ تھا۔ ولم نجد اگر بمعنی علم افعال قلوب سے ہو تو فله

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 228 (التجاریۃ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1497 (التراث العربی)

عزماً اس کے دومفعول ہوں گے اور اگر عدم کی ضد وجود ہے تو عزماً مفعول ہوگا اور لہ حال ہوگا یالم نجد کے متعلق ہوگا اور عهدنا کا جملہ بقول صاحب کشاف اور امام بیضاوی صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ پر معطوف ہے۔یعنی گناہوں کی سزاؤں کے سننے کے بعد عہد توڑ نا ان کا کوئی نیا کام نہیں ہے بلکہ نبی آدم کی بناء پر عصیان پر ہے اور نسیان ان کی سرشت میں ہے(1) عَهِدْنَا اِلٰی آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ اس سے پہلے ہم نے آدم کو درخت سے دور رہنے کا تاکیدی حکم دیا تھا لیکن وہ بھول گیا۔ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے،فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو ان کی پیٹھ پر اپنا دست قدرت پھیرا تو آپ کی پیٹھ سے آپ کی ساری اولاد نکل آئی جنہیں اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا فرمانا تھا اور انہیں سے ہر انسان کی آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھ دی۔پھر ان تمام کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا گیا۔آدم علیہ السلام نے پوچھا یارب یہ کون ہیں فرمایا یہ تیری اولاد ہے۔ایک شخص کو آدم علیہ السلام نے دیکھا تو وہ آپ کو بہت اچھا لگا اور اس کے آنکھوں کے درمیان کی چمک بھی بہت بھلی معلوم ہوئی۔پوچھا یارب یہ کون ہے۔اللہ نے فرمایا یہ داؤد ہے۔پوچھا یارب اس کی عمر تو نے کتنی مقرر فرمائی ہے فرمایا ساٹھ سال،حضرت آدم نے عرض کی یارب اسے میری عمر کے چالیس سال عطا فرمادے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدم کی عمر سے صرف چالیس سال باقی رہ گئے تو ملک الموت ان کے پاس آئے۔آدم علیہ السلام نے کہا ابھی میری عمر کے چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ ملک الموت نے کہا جناب! کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو عطا نہیں کئے تھے۔آدم علیہ السلام نے انکار کیا۔پس آپ کی اولاد نے بھی انکار کیا۔آدم علیہ السلام بھول گئے اور درخت کھالیا تو آپ کی اولاد بھی بھول گئی،حضرت آدم سے خطا ہوئی تو آپ کی اولاد سے بھی خطا ہوئی(2)۔بعض محققین فرماتے ہیں کہ صاحب کشاف اور بیضاوی نے اس جملہ کا جو عطف بیان کیا ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ صرفنا کا تعلق کذالک سے ہے۔اور کذالک معطوف ہے و کذالک نقص علیک پر اور یہ اشارہ ہے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جب کہ آدم علیہ السلام کا واقعہ نسیان اور مخالفت امر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے مشابہ نہیں ہے۔بلکہ یہ هل اتاک حدیث موسیٰ پر معطوف ہے کیونکہ یہ قد اتاک کے معنی میں ہے اور آدم علیہ السلام کا واقعہ گذشتہ واقعات میں سے ہے۔واللہ اعلم۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

''اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا (سوائے ابلیس کے) 1؎ اس نے (حکم بجالانے سے) انکار کر دیا 2؎''

1؎ اس وقت اس کی حالت کو یاد کرو تا کہ تم پر عیاں ہو جائے کہ وہ بھول گئے تھے۔یہ جملہ معطوف ہے لقد عهدنا الی آدم پر۔لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اذکر کی تقدیر پر یہ جملہ انشائیہ ہو جائے گا اور لقد عهدنا جملہ خبریہ ہے جملہ انشائیہ کا جملہ خبریہ پر عطف درست نہیں ہے۔ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ اذکر سے پہلے نقول مقدر ہے۔تو پھر موافقت و مناسبت پیدا ہو جائے گی اور عطف درست ہوگا۔

2؎ ابی کا جملہ سابقہ کلام کی تاکید ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ استثناء کی علت ہو۔اس صورت میں اس کا مفعول مقدر ماننا جائز نہ ہو

1۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ،جلد5،صفحہ 64-663 (العلمیہ) 2۔مشکوۃ المصابیح،صفحہ 23 (قدیمی)

گا اور نہ کسی چیز کا اپنے لئے علب بنالازم آئے گا بلکہ ابا فعل لازم کے قائم مقام ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے طاعت اور حکم ماننے سے انکار ظاہر کیا۔

فَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ ٱلْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰٓ ﴿١١٧﴾

''اور ہم نے فرمایا اے آدم بے شک یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے [1] تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ [2]''

[1] یہ جملہ مقدرہ پر معطوف ہے، یعنی فادخلنا آدم الجنة فقلنا له الخ (ہم نے آدم کو جنت میں داخل کیا اور ہم نے کہا) ھذا کا مشارٌ الیہ ابلیس ہے۔ لفظاً آدم علیہ السلام کو شیطان کی اتباع سے منع کیا گیا ہے لیکن معنیً دونوں میاں بیوی کو منع کیا جا رہا ہے کہ اس کی پیروی نہ کریں ورنہ یہ بدبخت تمہارے جنت سے اخراج کا سبب بنے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ جنت سے تمہیں اس کی اتباع اور رب کی حکم عدولی کے سبب نکال دے گا۔ فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ عداوت عدم اتباع کا سبب ہے، جس سے معنیً آدم و حواء کو روکا گیا ہے۔

[2] فتشقیٰ نہی کے جواب میں فاء کے بعد ان مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے، یعنی اس کی پیروی نہ کرنا اور جنت سے نکلنے کے اسباب کے قریب نہ جانا ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ کھیتی باڑی کرنا، فصل کاٹنا اسے پیسنا، روٹی تیار کرنا ان سب معاملات کی مشقت تمہیں کرنا ہوگی۔ امام بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ آدم علیہ السلام کے پاس ایک سرخ بیل آیا تھا۔ جس سے آپ ہل چلاتے تھے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے تھے، یہی وہ مشقت ہے جس کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے(1)۔ حضرت حواء علیہا السلام بھی جنت سے خروج میں شریک تھیں لیکن آیات کے سروں کی محافظت کے لئے خطاب آدم علیہ السلام کو فرمایا اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدم علیہ السلام حضرت حوا کے نگہبان اور سربراہ تھے۔ اس لئے ان کی صرف مشقت ذکر کی گئی جو بیوی کی مشقت کو بھی لازم ہے۔ (خاوند بے چین اور مشکل میں ہو تو بیوی کا مشقت اور تکلیف میں ہونا قدرتی امر ہے) یا شقاء سے مراد طلب معاش کی مشقت ہے اور یہ مردوں کا کام ہے اور انکی ذمہ داری ہے، اس لئے مفرد ضمیر ذکر فرما کر آدم کو خطاب فرمایا۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا۟ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١١٩﴾

''بے شک تمہارے لئے یہ ہے کہ تمہیں نہ بھوک لگے گی یہاں اور نہ تم ننگے ہو گے اور تمہیں نہ پیاس لگے گی یہاں اور نہ دھوپ ستائے گی [1]''

[1] عکرمہ فرماتے ہیں سورج کی تپش نہ پہنچے گی کیونکہ جنت میں دھوپ ہے ہی نہیں، جنتی لمبے لمبے سائیوں میں ہوں گے۔ یہ ارشاد جنت میں اسباب کفایت کا بیان ہے کہ اس میں سیر ہو کر کھانا پینا، زرق برق لباس اور عمدہ رہائش تھکن اور مشقت برداشت کئے بغیر تمہیں میسر ہیں۔ یہاں محنت اور کمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نافع اور ابو عمر نے انک کو ان لک پر عطف کی بناء پر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے ان لا تجوع پر عطف کی بناء پر ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وانک میں واو حرف عطف ان کے قائم مقام ہے (اس پر سوال وارد ہوتا ہے انّ مکسورہ انّ مفتوحہ پر داخل نہیں ہوتا کیونکہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 228 (التجاریہ)

اس طرح دو حرفوں کا اجتماع لازم آتا ہے جو ہم معنی ہیں) لیکن یہاں واؤ حرف عامل کی حیثیت سے انّ کے قائم مقام ہے، حرف تحقیق کی حیثیت سے نہیں اس لئے واؤ کا انّ پر دخول ممتنع نہیں ہوگا جیسا کہ انّ مکسورہ کا انّ مفتوحہ پر دخول ممتنع ہوتا ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ انّ پر دخول بغیر فاصلہ کے جائز نہیں ہوتا لیکن فاصلہ کے ساتھ جائز ہوتا ہے جس طرح کہ اس آیت میں فاصلہ کے ساتھ ہے پس یہ کہنا جائز ہوتا ہے انّ فی علمی انک قائم ان اعظامک علی واجبٌ۔

فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا یَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

''پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اس نے کہا اے آدم کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو۔[1]''

[1] شیطان نے وسوسہ ڈالا آدم علیہ السلام کے دل میں۔ قال یآدم سے وسوسہ کا بیان شروع ہو رہا ہے یعنی اس نے ادم سے کہا میں تمہیں ایک ایسا درخت بتاتا ہوں۔ جس کا پھل انسان کھالے تو ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور کبھی موت کی کلفت سے دوچار نہیں ہوتا۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ٘ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

''سو (اس کے پھسلانے سے) دونوں نے کھا لیا اس درخت سے تو (فوراً) برہنہ ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور وہ چپکانے لگ گئے اپنے (جسم) پر جنت (کے درختوں) کے پتے اور حکم عدولی ہو گئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا۔[1]''

[1] درخت کا پھل کھانے سے جب جنتی لباس اتر گیا تو آدم وحواء اپنے جسم پر انجیر کے درخت کے پتے چمٹانے لگے۔ غویٰ کا معنی مطلوب و مقصود سے ہٹ جانا اور حق کی شاہراہ سے چوک جانا اور بامراد نہ ہونا ہے۔ کیونکہ انہوں نے درخت کا پھل ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے کھایا حالانکہ وہ اخراج جنت اور فناء کا سبب تھا۔ یا یہ مطلب کہ اللہ نے جو حکم دیا تھا اس کو چھوڑ بیٹھے یا جو صواب اور رشد کا راستہ تھا اس سے ہٹ گئے کیونکہ دشمن کے دھوکا میں آ گئے تھے۔ ابن الاعرابی نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا آرام وسکون خود ختم کیا تھا اور عزت وکرامت کا مقام چھوڑ کر عجز اور ذلت کے مقام پر اترے تھے اور راحت کی زندگی چھوڑ کر تکلیف اور تھکن کی زندگی اختیار کی تھی(1)۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں یہ کہنا تو جائز ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی لیکن آدم کو عاصی (گنہگار) کہنا جائز نہیں کیونکہ عاصی وہ ہوتا ہے جو نافرمانی کے فعل کا عادی ہو جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو ایک مرتبہ کپڑا سیئے اس کے لئے کہتے ہیں خاط فلاں ملاں نے کپڑا سیا، اسے خیاط نہیں کہتے جب تک کہ کوئی شخص کپڑے سینے کا عادی نہ ہو(2)۔ حضرت امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت آدم اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنے رب کے حضور میں تکرار ہوا، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تو آدم ہے، تجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے۔ تجھ میں اپنی خاص روح پھونکی ہے، تجھے اس نے مسجود ملائکہ بنایا، تجھے اس نے جنت کے بلند و بالا محلات میں رہائش عطا فرمائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 229 (التجاریۃ)
2۔ ایضاً

پھر تو نے اپنی خطاء کی وجہ سے سب انسانوں کو زمین پر اتارا۔ حضرت آدم نے فرمایا تو موسیٰ ہے، تجھے رشد و ہدایت کی تختیاں عطاء فرمائیں جس میں ہر چیز کا بیان تھا۔ شرف کلام بخشنے کے لئے اس نے تمہیں اپنا قرب خاص عطاء کیا۔ بتاؤ میری تخلیق سے کتنی مدت پہلے اللہ تعالیٰ نے تورات لکھی تھی؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال۔ حضرت آدم نے فرمایا کہ تورات کی تختیوں میں کیا یہ لکھا ہوا ہے۔ وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی (آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی سو وہ بامراد نہ ہوا) موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں (یہ تو لکھا ہوا ہے) آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا پھر تم مجھے اس عمل پر ملامت کرتے ہو جو اللہ نے میری تخلیق سے چالیس سال قبل لکھ دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام اس جواب سے موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے (1)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے آدم تو ہمارا باپ ہے اور تو نے ہمیں جنت سے نکالا۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا اے موسیٰ اللہ نے تجھے شرف کلام بخشا، تجھے اپنے دست قدرت سے تورات عطاء فرمائی تو مجھے اس کام پر ملامت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال قبل میری تقدیر میں لکھ دیا تھا۔ پس آدم علیہ السلام موسیٰ پر غالب آ گئے (2) (آپ نے آخری جملہ تین مرتبہ فرمایا)

اگر یہ کہا جائے کہ نسِیَ سے مراد نسی العهد ہے (یعنی آدم علیہ السلام عہد کو بھول گئے) تو پھر آپ کے حق میں عَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ کیوں فرمایا گیا (یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی) حالانکہ بھول کر کسی فعل کو کرنا معاف ہے۔ اس کو نافرمانی سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بھول پر مؤاخذہ اور گرفت نہ ہونا۔ اس امت مرحومہ محمدیه علی صاحبها الصلوة والتسلیم کے ساتھ مختص ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ (3) یعنی میری امت سے خطاء و نسیان کا مؤاخذہ نہیں ہے اور جس کام پر انہیں مجبور کیا جائے اور وہ کر بیٹھیں تو اس پر بھی ان کی گرفت اور پکڑ نہیں ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے ثوبان اور ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کی قید سے یہ ارشاد فرمایا۔ مطلقاً نہیں فرمایا جیسا کہ مجنون، سونے والا اور بچے کا حکم مطلقاً بیان فرمایا ہے۔ مجنون کی کوئی خطاء نہیں لکھی جاتی حتیٰ کہ وہ ہوش مند ہو جائے۔ سونے والے سے بھی قلم اٹھا لیا گیا ہے حتیٰ کہ بیدار ہو جائے اور بچے سے بھی مؤاخذہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے۔ جیسا کہ ہم نے یہی مسئلہ تفصیل سے سورۂ بقرہ میں رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا کے تحت بیان کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ خطاء اور نسیان پر مؤاخذہ پر دلالت کرتی ہے اور یہ عقلاً ممتنع بھی نہیں ہے کیونکہ گناہ زہر کی مانند ہیں جس طرح جان بوجھ کر یا بھول کر زہر کا کھانا ہلاکت کا باعث بنتا ہے اسی طرح گناہ بھی سزا کا موجب ہوتے ہیں بشرطیکہ اللہ کریم معاف نہ فرمادے اگرچہ وہ گناہ بغیر ارادہ اور قصد کے بھی ہوں۔ کلبی کہتے ہیں بنو اسرائیل جب کسی حکم الٰہی کو بھول جاتے یا غلطی کرتے تو فوراً ان پر سزا مسلط کی جاتی، ان پر گناہ کے مطابق کھانے پینے کی چیزیں حرام کر دی جاتی تھیں۔ میں کہتا ہوں اسی وجہ سے آدم علیہ السلام پر بھی جنت کا کھانا اور مشروبات حرام کئے گئے تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے سیئات (گناہ) شمار ہوتی ہیں۔ خطاء اور نسیان کا اگرچہ عام انسان سے آخرت میں مؤاخذہ نہ ہوگا اور آگ کے ذریعے عذاب نہ ہوگا لیکن خواص کے بلند مرتبہ کی وجہ سے خطاء و نسیان پر اور خلاف اولیٰ پر بھی مؤاخذہ ہوگا اور یہ مؤاخذہ اور گرفت آخرت میں آگ کے عذاب سے نہ ہوگی بلکہ دنیا میں ان کے دلوں پر کچھ تاریکی چھا جاتی ہے اور محرومی کے معاملات اور آتش ہجر و فراق سے دوچار ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے دل پر بھی غبار آتا ہے اور میں ایک دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں (4) اس حدیث کو مسلم، احمد، ابوداؤد اور نسائی نے الاغر المزنی سے

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 20-19 (قدیمی)　　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 229 (التجاریہ)
3۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 233، حدیث 10307 (التراث الاسلامی)　　　4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)

روایت کیا ہے۔ صاحب مدارک فرماتے ہیں انبیاء کرام سے اس نسیان کا مواخذہ ہوتا ہے جس سے اگر وہ محفوظ رہنے کی کوشش کرتے تو محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض علماء فرماتے ہیں نبوت سے پہلے انبیاء سے گناہ صغیرہ کا صدور جائز ہے۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴿۱۲۲﴾

''پھر (اپنے قرب کے لئے) چن لیا انہیں اپنے رب نے اور (عفو ورحمت سے) توجہ فرمائی ان پر اور ہدایت بخشی 1''

1۔ یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے قرب کے لئے چن لیا اور توبہ کی ترغیب اور توفیق کے لئے انہیں اپنا قرب بخشا جبی کا مادہ اصل میں جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں جبی الخراج اس نے ٹیکس جمع کیا۔ اجتباء باب افتعال ہے اور اس کا معنی قریب کرنا ہے جس کو اصطفاء لازم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے عفو ورحمت سے آپ کی طرف توجہ فرمائی اور آپ کو توبہ کی توفیق بخشی۔ حتی کہ آدم علیہ السلام نے ان الفاظ میں دعا مانگی۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا۔ یا یہ معنی کہ مراتب قرب کی طرف ہدایت فرمائی۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

''حکم ملا دونوں اتر جاؤ یہاں سے اکٹھے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے 1 پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو نہ وہ بھٹکے گا اور نہ بدنصیب ہوگا 2''

1 منھا کی ضمیر کا مرجع جنت ہے اور یہ خطاب آدم وحواء کو ہے چونکہ ان کا اترنا ان کی اولاد کے اترنے کو لازم ہے اس لئے یہ خطاب تبعاً آپ کی اولاد کو بھی ہے اس لئے تاکید جمع ذکر فرمائی اور بعضکم میں ضمیر بھی جمع ذکر فرمائی۔ تمہاری آپس میں دینوی اور دینی عداوت ہوگی۔

2 اما میں ما زائدہ ہے اور تاکید کے لئے ہے، اس میں ان شرطیہ کے نون کو مدغم کیا گیا ہے۔ ھدی سے مراد کتاب اور رسول ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن پڑھے گا اور اس کے احکام کی اتباع کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں گمراہی سے بچالے گا اور روز قیامت برے انجام سے محفوظ فرمالے گا(1)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى۔ امام شعبی فرماتے ہیں قرآن کی اتباع کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں گمراہ ہونے اور آخرت میں عذاب الیم میں مبتلا ہونے سے بچالیا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

''اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لئے زندگی (کا جامہ) تنگ کر دیا جائے گا 1 اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے 2''

1 ذکری سے مراد وہ ہدایت ہے جو میری یاد دلاتی ہے اور وہ شخص جو میری عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ یعنی جو میری ہدایت (کتاب) سے روگردانی کرے گا اور جو میری عبادت کی طرف بلانے والے (رسول) سے منہ موڑے گا (دنیا اس کی اجیرن بنادی جائے گی اور اس کا دل ہر وقت تنگ اور گھٹن محسوس کرے گا) ضنکا مصدر ہے اور معیشۃ کی صفت واقع ہو رہا ہے، جب مصدر کو صفت بنایا جائے تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریۃ)

وہ مبالغہ پر دلالت کرتا ہے اس لئے مذکر اور مونث دونوں کی صفت واقع ہوسکتا ہے۔امام بغوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابو ہریرہ اور ابو سعید الخدری سے روایت فرماتے ہیں کہ معیشةً ضنکاً سے مراد عذاب قبر ہے(1)۔البزار نے جید سند کے ساتھ ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فان له معيشة ضنكاً سے مراد قبر ہے۔ابوسعید فرماتے ہیں قبر اسے یوں دبائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔بعض مسانید میں مرفوعاً مروی ہے کہ قبر آدمی پر یوں مل جائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی (دائیں پسلیاں بائیں طرف اور بائیں پسلیاں دائیں طرف ہو جائیں گی) اور قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا(2)۔سنن ترمذی میں یہ ارشاد حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔الحسن فرماتے ہیں اس سے مراد زقوم (کا درخت) زریع (کی خاردار بوٹی) کھلانا اور دوزخ میں پیپ پلانا مراد ہے۔عکرمہ فرماتے ہیں اس سے مراد حرام مال ہے۔ضحاک فرماتے ہیں خبیث کمائی ہے۔ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد شقاوت اور بدبختی ہے(3)۔میں کہتا ہوں ضنک کا اطلاق حرام کسب خبیث اور شقاوت سب پر ہوتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں قبر یا آگ میں تنگ مقام پر پہنچانے والی ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔اِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيۡنَ۔ (اور جب انہیں پھینکا جائے گا اس آگ میں کسی تنگ جگہ سے زنجیروں میں جکڑ کر) ابن عباس سے مروی ہے کہ ہر وہ مال جو انسان کو ملے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اور وہ اس میں تقوی اختیار نہ کرے تو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔پس معیشةً ضنكاً سے یہی مراد ہے، جس قوم نے حق سے اعراض کیا دراں حالانکہ وہ خوشحال ہوتے ہیں اور مزید کی خواہش میں غرق ہوتے ہیں۔تو ان کی زندگی بھی تنگ ہوتی ہے (کیونکہ وہ ہر وقت مال و دولت اور حشمت و ثروت کی تلاش میں بے چین و بے سکون رہتے ہیں) وہ اللہ تعالیٰ کے بارے سوئے ظن رکھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مال کے خرچ پر انہیں اس کا نعم البدل عطا نہیں فرمائے گا۔سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا معنیٰ قناعت کا چھین لینا ہے حتی کہ مال و دولت کے انبار موجود ہونے کے باوجود ان کی آنکھیں سیر نہیں ہوتیں(4) ان دونوں اقوال کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ جو ذکر الٰہی سے منہ موڑتا ہے تو اس کا مطمح نظر اور مقصود دل دنیا کا مال و متاع ہو جاتا ہے اور اسی مال و متاع کی زیادتی کے لئے صبح و شام ہلاک ہوتا رہتا ہے اور اس کی کمی کے خوف سے ہر وقت بے چین اور ہلکان رہتا ہے۔جب کہ مومن کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ آخرت کا طلبگار اور عطاء الٰہی پر قانع اور شاکر ہوتا ہے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے پس اس کی زندگی شبنم کی طرح پاکیزہ اور ہر آلائش سے پاک ہوتی ہے۔میں کہتا ہوں اس تاویل کے مطابق من اعرض عن ذکری سے مراد وہ کافر نہیں ہوگا جو ایمان کی دولت سے ہی منہ موڑے ہوئے ہے بلکہ وہ شخص مراد ہوگا جو کثرت مال کے لالچ میں ذکر الٰہی سے اعراض کئے ہوئے ہے۔کیونکہ عام لوگ دنیا کی طلب اور تلاش میں مستغرق ہوتے ہیں۔اور اس کی کمی کا انہیں ہر وقت خدشہ لگا رہتا ہے پس جو مال کی زیادتی کی خاطر ذکر الٰہی سے اعراض کرتا ہے اور دنیا کے مال و متاع کی فکر میں ہر لحہ مصروف رہتا ہے تو ایسے شخص کی زندگی تاریک کر دی جاتی ہے اور اس پر اس کے رزق کے معاملات خلط ملط کر دیئے جاتے ہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ معیشةً ضنکاً سے مراد دنیا اور مصیبت ہے تو پھر یہ کفار اور فُسّاق سے مختص نہیں ہے بلکہ انبیاء وصلحاء پر بھی دنیا کے اندر تکالیف آتی رہتی ہیں (مثلاً) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا انبیاء کرام ہوتے ہیں پھر جو دوسرے لوگوں سے افضل ہوتے ہیں پھر جو ان کے بعد دوسرے لوگوں سے افضل ہوتے ہیں، ہر شخص کو اس کے دین کے مطابق آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے۔کوئی شخص دین میں جتنا مضبوط

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریۃ)   2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریۃ)   3۔ایضاً   4۔ایضاً

ہوگا تو اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوگی۔ جو دین میں نرم ہوگا تو اسے بھی اپنے دین کی مقدار آزمایا جائے گا۔ بندہ آزمائش میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ آزمائش اسے گناہوں سے اس طرح پاک کر دیتی ہے کہ وہ زمین پر چل رہا ہوتا ہے لیکن اس کے دامن پر کسی خطاء کا داغ نہیں ہوتا(1) اس حدیث کو امام احمد اور بخاری نے ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت سعد سے اور طبرانی نے حضرت حذیفہ کی ہمشیرہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے تاریخ میں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے حسن سند کے ساتھ اس طرح نقل کیا ہے دنیا میں سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا نبی ہوتا ہے یا صفی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس سوال کا جواب دو طرح سے ہے۔

1۔ آیت میں معیشۃ ضنکاً (تنگ زندگی) کفار کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یہ آیت اس ارشاد کی مثل ہے۔ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہمارے ذکر سے اعراض کرے گا ہم اسے دنیا میں قلیل معیشت عطاء کریں گے چونکہ دنیا کا سب مال ومتاع قلیل ہے۔ ہم اسے گنے چنے ایام زیست تنگی کی صورت میں عطاء کریں گے پھر اسے قیامت کے روز اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

2۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی تھکن اور مصیبت سے خالی نہیں ہے خواہ کوئی مومن ہو یا کافر، ہر شخص کو مصائب وشدائد سے واسطہ پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ۔ (اے انسان تو محنت سے کوشاں رہتا ہے اپنے رب کے پاس پہنچنے تک) لیکن انسان کے لئے یہ مصائب وتکالیف گناہوں کے مٹانے اور درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔ ظاہراً اگرچہ مومن تنگی میں بھی ہوتا ہے تو معنیً وہ کشادگی میں ہوتا ہے اور باطناً یہ مشکلات ومصائب اس کے اخروی عذاب کے لئے نمونہ ہوتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مومن کو اپنے رب سے پیار ہے پس محبوب کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے وہ اس میں لذت اور فرحت محسوس کرتا ہے کیونکہ ضرب الحبیب زبیب (محبوب کی سزا میں بھی مٹھاس ہے) ابن ماجہ عبدالرزاق اور حاکم نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا انبیاء پھر صلحاء ہوتے ہیں، ان میں کوئی فقر (غربت) کی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے حتیٰ کہ پہننے اور لیٹنے کے لئے اس کے پاس ایک عباء ہوتی ہے۔ اور اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں وہ ان کو مارتا ہے۔ لیکن جتنا تم میں سے کوئی عطاء پر خوش ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ مصیبت پر شاداں وفرحاں ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ؕ ابن عباس نے اعمیٰ کا معنی بینائی سے محروم فرمایا ہے اور مجاہد فرماتے ہیں اعمیٰ سے مراد محبت سے محروم شخص ہے(2) ابن عباس کے قول کی تائید آئندہ آیت سے ہوتی ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ﴿۱۲۵﴾

''وہ کہے گا اے میرے رب کیوں اٹھایا ہے تو نے مجھے نابینا کر کے میں تو (پہلے بالکل) بینا تھا1''

1۔ حشرتنی کی یاء کو نافع نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اعمیٰ کا معنی آخرت میں محبت سے محروم درست نہیں کیونکہ پھر وقد کنت بصیرا کا معنی یہ ہوگا کہ دنیا میں میرے پاس محبت تھی۔ حالانکہ ایسے شخص کے پاس تو دنیا میں بھی کوئی محبت نہ تھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ۔ (اور جو پوجتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں) اور اسی طرح ارشاد۔ وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (اور

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 300 (دلی محمد تاجران کتب کراچی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریۃ)

جوشخص بنار ہا اس دین میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا) ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس سے پوچھا کہ کہیں قرآن نے مجرموں کی آنکھوں کے نیلا ہونے کا ذکر فرمایا ہے وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَىٕذٍ زُرْقًا اور کہیں اندھا ہونے کا ذکر فرمایا ہے وَنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ان میں تطبیق کیسے ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا قیامت کے روز مجرم ایک حال میں نیلی آنکھوں کے ساتھ ہوں گے اور دوسرے حال میں اندھے ہوں گے۔

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

"اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری آیتیں سو تو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے فراموش کردیا جائے گا[1]"

[1] کذالک فعل محذوف کے متعلق ہے، یعنی تو نے ایسا ہی کیا۔ ذالک کا مشارالیہ مبہم ہے جس کی تفسیر اتتک ایاتنا الخ کا ارشاد کررہا ہے۔ آیات سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدت پر دلالت کرتی ہیں یا آیات سے مراد انبیاء کرام پر نازل ہونے والی آیات ہیں۔ ارشاد ہے اے انسان تو نے ہماری آیات کی طرف التفات نہ کیا اور تو نے انہیں اندھے شخص کی طرح دیکھا تک نہیں جیسے تو نے ہماری آیات کو چھوڑا تھا، آج تمہیں بھی آگ میں ڈال کر چھوڑ دیا جائے گا (تیری آہ و فغاں کی طرف رحمت الٰہی قطعاً متوجہ نہ ہوگی) بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے الامر کذالک (معاملہ اسی طرح ہے) اور اتتک کا جملہ مقام تعلیل میں ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ یُؤْمِنْۢ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

"اور یونہی ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جس نے حد سے تجاوز کیا اور ایمان نہ لایا۔ اپنے رب کی آیتوں پر اور (سن لو) آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیرپا ہے۔[1]"

[1] یعنی جو خواہشات نفس میں منہمک رہے گا اور ہماری آیات سے روگردانی کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائے گا اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگا تو ہم ایسے نابینا اور بدکردار کو ایسی ہی سزا دیں گے اور آخرت کا عذاب تو اس تنگ زندگی اور اندھے پن سے بھی زیادہ سخت اور کرخت ہے۔ یہ جملہ من اعرض عن ذکری الخ پر معطوف ہے۔

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

"کیا (یہ بات) انہیں راہ راست نہ دکھا سکی کہ کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے (بداعمالیوں کے باعث) ان سے پہلے برباد کردیا چلتے پھرتے ہیں یہ لوگ جن کے (اجڑے ہوئے) مکانوں میں اس میں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں دانشمندوں کے لئے[1]"

[1] افلم یهد کی ضمیر کا مرجع الهدی ہے۔ اور اس سے مراد کتاب یا رسول ہے۔ یا ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے جس کا ذکر کذالک نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ میں ہے۔ اس صورت میں کلام کے اندر تکلم سے غائب کی طرف التفات ہوگا۔ اس

تا دیل کی تائید افلم نهد (جمع متکلم) کی قرأت بھی کرتی ہے، مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ نے قرآن نے یا رسول نے کفار مکہ کو ہدایت نہیں کی۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی انہیں صراط مستقیم دکھایا گیا لیکن انہوں نے خود ہدایت پر گمراہی کو پسند کیا۔ فلوتعقیب کے لئے ہے۔ اور محذوف کلام معطوف ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ الم یبین لهم فلم یهد لهم لفظاً بیان کے بعد عدم ہدایت کا انکار ہے اور معنیٰ ہدایت کے بعد ان کے ہدایت حاصل نہ کرنے کا انکار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں افلم یهد لهم کلام سابق کے مفہوم پر معطوف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کا ذکر اس ارشاد میں فرمایا۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدٰیَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی اور کفار کا حال اس ارشاد میں فرمایا۔ ومن اعرض عن ذکری فان له معیشةً ضنکاً۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو فریقین کا حال بیان فرمایا ہے اس سے کیا ان کے لئے معاملہ واضح نہیں ہوا اور ان کو راہنمائی نہیں ملی؟ بعض علماء فرماتے ہیں افلم یهد کم اهلکنا الخ کے مدلول کی طرف منسوب ہے، کم خبریہ ہے اور قرون سے مراد سابقہ قومیں ہیں یا الم یهد جملہ کے مضمون کی طرف منسوب ہے، یعنی کیا ہمارا قوموں کو ہلاک کرنا بھی ان کی ہدایت کا باعث نہ بنا۔ یمشون فی مساکنهم، القرون سے حال ہے۔ یا لھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اس تقدیر پر جب کہ فعل الم یهد کی نسبت کم اهلکنا کے جملہ کے مضمون کی طرف ہو، یعنی کفار مکہ کو راہ ہدایت نہ ملی حالانکہ وہ گذشتہ قوموں کے اجڑے دیار میں چلتے پھرتے ہیں۔ اولی النهی سے مراد ذوی العقول (صاحب عقل) لوگ ہیں۔ عقل کو ناہیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ غفلت اور آنکھ بند کر کے چلنے سے روکتی ہے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

''اور اگر ان کے انجام کے متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا[1] اور ان کے لئے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا[2] بھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔''

[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے اس کی رحمت کے طفیل ان کافروں کو نیست و نابود نہیں کیا جاتا اور قیامت تک کفار کو عذاب دینے میں تاخیر کا وعدہ دے دیا ہے۔ سبقت کا جملہ کَلِمَةٌ کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر محذوف ہے یعنی لو لا کَلِمَةٌ سبقت حاصلةٌ یعنی اگر ہمارا یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو جس طرح قوم عاد ثمود اور ان جیسی دوسری نافرمان اور سرکش قوموں پر عذاب نازل ہوا اسی طرح ان کو بھی ہم عذاب کی چکی میں پیس دیتے، ان کا بھی نام نشان مٹا دیتے۔ لزاماً مصدر ہے باب مفاعلہ کا، مبالغہ کے لئے بطور صفت استعمال ہوا ہے یا یہ اسم فاعل یا اسم آلہ کے معنی میں ہے۔ لزوم کی زیادتی کی وجہ سے لزوم کے آلہ کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اسے لازم کیا گیا ہے (کیونکہ لازم ملزوم سے جدا نہیں ہوتا جس طرح کہ آلہ اس چیز سے جدا نہیں ہوتا جس کے لئے وہ آلہ ہوتا ہے) خلاصہ یہ ہے کہ ان کا تقاضا تو ہے کہ ان پر عذاب کا کوڑا برسایا جائے لیکن ہماری حکمت کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس لئے ان پر عذاب نہیں ہوتا۔

[2] اجلٌ مسمی کا عطف کلمته پر ہے۔ یعنی اگر دنیا میں ان کی بقاء متعین نہ ہوتی یا قیام قیامت کا وقت متعین نہ ہوتا یا ان کے عذاب کا وقت متعین نہ ہوتا (تو ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی) کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ولو لا کلمة سبقت من ربک واجلٌ مسمی لکان لزاماً۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اجل مسمی اس ضمیر پر معطوف ہو جو کان میں پوشیدہ ہے۔ اور کان کے اسم اور کان کے درمیان خبر کے ساتھ فاصلہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ اگر تیرے رب کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو فوری

عذاب اور وہ عذاب جس کا وقت متعین ہے دونوں ان کو لازم ہوتے اور جملہ شرطیہ یعنی لو لا کلمة الی الخ اس جملہ محذوف پر معطوف ہے جو کم اھلکنا کے ارشاد سے مفہوم ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ کم اھلکناقبلھم من القرون یمشون فی مساکنھم وھولاء لکفار مثلھم فی استحقاق نزول العذاب ولو لا کلمة سبقت من ربک لکان لزاماو اجل مسمیٰ۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

"پس (اے حبیب) صبر فرمائیے ان کی (دل دکھانیوالی) باتوں پر[1] اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے لمحوں میں اس کی پاکی بیان کرو اور دن کے اطراف میں بھی تاکہ آپ خوش رہیں[2]"

[1] اے پیارے حبیب آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کافروں کا عذاب ایک مدت تک متاخر ہے تو آپ ان کی دل آزار باتوں پر صبر کیجئے جو یہ آپ کے متعلق کرتے ہیں، آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے نماز اور تسبیح کی توفیق دی ہے اس پر اس کی حمد و شکر کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کریں۔ یہ گویا اشارہ ہے کہ اگر کسی بندے سے عبادت و ریاضت کا فعل صادر ہو تو اسے اس پر اترانا نہیں چاہئے بلکہ اس عبادت اور سجدہ ریزی کی توفیق اور کرم نوازی پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے جیسا کہ ایاک نعبد کے بعد وایاک نستعین کا قول اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی تیری عبادت پر مدد مانگتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت سے ہر نماز میں سورۂ فاتحہ کی قرأت کے وجوب کو مستنبط کیا جائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی صراحۃً فرمایا ہے لا صلوة الا بفاتحة الکتاب(1) ایک روایت میں ہے۔ لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الکتاب (یعنی جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں) اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے صحیحین میں اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ یہ استنباط اس طرح ہے کہ آیت کریمہ تقاضا کرتی ہے کہ نماز ادا کرو الحمد کے اتصال کے ساتھ لیکن اتصال اور تلبس مجمل ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اس کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ تلبس بالحمد سے مراد سورۂ فاتحہ الحمد للہ رب العالمین الی آخرہ کا پڑھنا ہے۔

قبل طلوع الشمس سے مراد صبح کی نماز اور قبل غروبھا سے مراد نماز عصر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبل غروبھا سے مراد نصف النہار کے بعد کا وقت ہے اور اس سے ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں مراد ہیں۔ اور من اناء اللیل سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز کا وقت ہے۔ اناء جمع ہے انی کی۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے رات کا پہلا وقت مراد ہے(2) میں کہتا ہوں اس سے نماز تہجد بھی مراد لینا ممکن ہے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ پر واجب تھی اور ظرف فسبح کے متعلق ہے۔ فسبح یعنی رات کی خاموش گھڑیوں میں خصوصی طور پر نماز ادا کرو کیونکہ اس وقت دل کسی دوسری چیز سے مشغول ہونے سے محفوظ ہوتا ہے اور نفس اس وقت آرام اور سکون کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس وقت کی عبادت میں مشقت زیادہ ہوگی اور جتنی مشقت میں عبادت کی جائے۔ وہ عبادت افضل اور احسن ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (بلاشبہ رات کا قیام (نفس کو) سختی سے روندتا ہے اور بات کو درست کرتا ہے) اطراف النہار کا عطف قبل طلوع الشمس پر ہے یا من آنای اللیل کے محل پر ہے۔ خصوصیت اور مزید

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 169 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 232 (التجاریۃ)

تاکید کے ارادہ سے شاید فجر اور عصر کی نمازوں کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ فجر نیند کا وقت ہے اور عصر دنیا کے امور میں مصروفیت اور مشغولیت کا وقت ہے۔ یہ آیت اس ارشاد کی مثل ہے۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔ (پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی) اور لفظ جمع (اطراف) کے ساتھ ان دو نماز کا ذکر اس لئے ہے کہ یہاں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے (ہر شخص جانتا ہے کہ دن کے اطراف دو ہی ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسری آیت میں مراد و مقصود پر نص ذکر کی گئی ہے۔ فرمایا وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (اس لئے تثنیہ کی جگہ جمع کا استعمال جائز ہے) یا اطراف النھار سے مراد صرف ظہر کی نماز ہے کیونکہ اس کا وقت دن کے نصف اول کا اختتام اور نصف آخر کی ابتداء ہے۔ تو اس کو جمع ذکر کرنا ان دو نصفوں کے اعتبار سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آناء اللیل سے مراد عشاء اور اطراف النھار سے مراد ظہر اور مغرب ہیں کیونکہ ظہر دن کے پہلے طرف کے آخر میں اور دوسرے طرف کی ابتداء میں ہوتی ہے پس یہ دو طرفیں ہیں اور تیسری طرف غروب شمس ہے۔ اور اس وقت مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے (اس لئے اطراف کا جمع ذکر ہونا درست ہے) یا اطراف النہار سے مراد دن کے اوقات میں نوافل ہیں۔

۲۔ یعنی ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھے ایسا اجر ملے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ کسائی اور ابوبکر نے ترضی کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی تاکہ تیرا رب تجھے خوش کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تجھ سے راضی ہوگا جیسے ارشاد ہے وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (وہ اپنے رب کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے) بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا یہ معنی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ مقام شفاعت پر فائز فرمائے گا حتی کہ آپ خوش ہو جائیں گے جیسے ارشاد فرمایا وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ امام بخاری، مسلم، امام احمد اور اصحاب سنن نے جریر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ آپ ﷺ نے چودھویں کے چاند کو دیکھا اور فرمایا تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور اس رؤیت میں تمہاری آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی۔ اگر تمہیں طاقت ہے کہ تم صبح اور عصر کی نماز سے مغلوب نہ ہو تو ایسا ضرور کرو (1) پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا۔ ابن ابی شیبہ، ابن مردویہ، بزار اور ابو یعلیٰ نے ابو رافع سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آیا تو آپ ﷺ نے مجھے ایک یہودی سے آٹا ادھار لینے کے لئے بھیجا۔ دوسری روایت میں ہے کہ اتنا اتنا آٹا یا یہ فرمایا کہ مجھے رجب کا چاند (نظر آنے) تک آٹا ادھار دو یہودی نے کہا کوئی چیز رہن رکھے بغیر نہ دوں گا۔ میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس واپس آیا اور یہودی کا بیان سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا اگر وہ مجھے بیچے یا مجھے ادھار دے تو میں اسے ضرور واپس کروں گا، میں آسمان اور زمین میں امین ہوں۔ فرمایا میری یہ لوہے کی زرہ اس کے پاس لے جاؤ۔ میں ابھی لے کر گیا نہ تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾

''اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے۔ کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب و زینت ہیں دنیوی زندگی کی لے (اور انہیں اس لئے دی ہیں) تاکہ ہم آزمائیں انہیں ان سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1105 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 560 (العلمیہ)

۲؎ اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے ۳؎ ''

۱؎ اس کا عطف فاصبر پر ہے۔ جب ولولا کلمة سبقت کا ارشاد کفار سے فوری عذاب کے انتفاء اور مئوخر عذاب کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے تو اس پر فاء سببیہ کے ذریعے ان دو جملوں کو مرتب فرمایا ہے جن میں سے ایک فوری عذاب کے انتفاء پر صبر کے حکم پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ آپ ان کے مال و دولت کو للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں کیونکہ آخرت میں ان پر عذاب کا مسلط ہونا یقینی ہے۔

ازواجاً، متعنا کا مفعول ہے اور منھم، ازواجاً کی صفت ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ازواجاً به کی ضمیر مجرور سے حال ہو اور منھم مفعول بہ ہو اور منھم میں من بعضیہ ہے۔ زهرة الحیاة الدنیا اس فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے جس پر متعنا دلالت کر رہا ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اعطینا هم زهرة الحیاة الدنیا یا یہ متعنا کے ساتھ ہی منصوب ہے۔ اس بناپر کہ اس کے ضمن میں اعطینا کا معنی موجود ہے۔ یا به کے محل سے بدلیت کی بناء پر منصوب ہے یا مضاف کی تقدیر کے ساتھ ازواجاً سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اگر ازواجاً سے مراد اصناف الکفرہ ہو۔ اور مضاف کی تقدیر کے بغیر ہوگا اگر ازواج سے مراد اصناف المال ہو۔ یعقوب نے زھرہ کو ھاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی ایک لغت ہے۔ جیسے جھرۃ میں جھرۃ ایک لغت ہے۔ یا یہ زاہر کی جمع ہے اور کفار کی صفت کے طور پر ذکر کی گئی ہے کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے تھے اور اس کی نعمتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ قاموس میں ازدھار کا معنی احتفاظ اور خوش ہونا لکھا ہے(1)۔

۲؎ یعنی ہم انہیں آزمائیں گے یا یہ معنی کہ ہم کفر وگمراہی میں چھوڑ دیں گے کہ وہ دنیا میں سرکش ہو کر گھومتے پھریں یا یہ معنی کہ ہم انہیں آخرت میں عذاب دیں گے اس لئے کہ ہم نے انہیں دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز کیا تھا۔

۳؎ آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہدایت اور نبوت کا منصب رفیع عطاء فرمایا ہے یا حلال روزی اللہ نے آپ کو عطا کی ہے یا آخرت میں جنت اور مراتب قرب عطا فرمائے گا۔ کفار کے مال ومتاع سے ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ آپ کو جو کچھ ملا ہے دائمی اور سرمدی ہے، جب کہ کفار کا ساز وسامان فانی اور عارضی ہے۔ رزق ربک خیرٌ وابقی کا جملہ لا تمدن کے فاعل سے حال ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو اللہ کی عزت (ہدایت ایمان) کو عزت نہیں سمجھتا اس کی روح حسرتوں اور آرزوؤں میں ہی نکل جاتی ہے۔ جو شخص لوگوں کے مال ومتاع کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ ہمیشہ پریشان اور غمگین رہتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اللہ کی نعمتیں صرف کھانے پینے اور پہننے میں ہیں تو اس کا عمل کم ہوتا ہے اور عذاب الٰہی سامنے ہوتا ہے(2)۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

''اور حکم دیجئے اپنے گھر والوں کو نماز کا ۱؎ اور خود بھی پابند رہئے اس پر نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا ۲؎ (بلکہ) ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو ۳؎ اور اچھا انجام پرہیز گاری کا ہی ہوتا ہے ۴؎ ''

۱؎ اہل سے مراد قوم اور آپ ﷺ کے سارے امتی ہیں، اس کا عطف لا تمدن پر ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو نماز کا حکم دیا

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 568 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 232 (التجاریہ)

اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اپنے متعلقین اور اپنے جانثاروں کو نماز کا حکم دو، جب کہ اس سے پہلے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ بھوک اور فقر پر ایک دوسرے کی معاونت کریں، صبح و شام اپنی معیشت کی فکر میں نہ لگے رہیں اور ارباب ثروت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں۔ (بلکہ نماز کے ذریعے اپنے رب کریم کے در رحمت پر ہر لحہ دستک دیتے رہیں، وہی رازق ہے اور وہی ہر چیز کا حقیقی مالک ہے) پھر فرمایا نماز پر خود بھی حسب معمول مداومت اختیار کیجئے۔

۲۔ ہم آپ کو یہ تکلیف نہیں دیتے کہ تم ہماری مخلوق کے کسی فرد واحد کو روزی عطاء کرو، ہم رزق رسانی کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالتے، ہم تو آپ سے حسن عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ جملہ نماز پر صبر کرنے کی تعلیل کے مقام پر ہے۔

۳۔ آپ کو بھی رزق ہم دیتے ہیں، آپ امور آخرت کو سنوارنے کی فکر کریں معیشت کی فکر کرنے کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں، یہ جملہ رزق کا سوال نہ کرنے کی علت ہے۔

۴۔ عاقبة سے مراد عمل صالح کے بعد کا ثواب اور جزاء ہے جیسا کہ برے عمل کے بعد کی سزا کو عقاب کہا جاتا ہے۔ التقوی سے مراد اہل تقوی ہیں۔ ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں اور لوگ جنہوں نے آپ ﷺ کی تصدیق کی آپ ﷺ کی اتباع کی اور مجھ سے ڈرتے رہے ان کے لئے اچھا انجام ہے (1) سعید بن منصور نے اپنی سنن میں، طبرانی نے الاوسط میں، ابونعیم نے الحلیہ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے اہل کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی تو آپ انہیں نماز کا حکم دیتے (2) اور یہ آیت تلاوت فرماتے۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَ لَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾

"اور کفار کہتے ہیں کہ (یہ نبی) کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب کے پاس سے (ان سے پوچھو) کیا نہیں آ گیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی نازل شدہ کتابوں میں ہے۔ ۱"

۱۔ مشرکین مکہ ہر وقت یہ رٹ لگائے رکھتے کہ محمد ﷺ اپنی نبوت کی صداقت پر اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لے آئے۔ اس جملہ کا عطف یقولون پر ہے۔ یعنی واصبر علی مایقولون و علی ما قالوا انہوں نے ان آیات کا جو حضور لے کر آئے تھے ہٹ دھرمی کی بناء پر انکار کیا اور اپنی طرف سے تجویز کردہ نشانیوں کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسے ابدی اور سرمدی معجزہ کو اتار کر ان کا منہ بند کر دیا کیونکہ معجزہ کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت کا اعلان کرنے والا خارق للعادت کے طور پر علم و عمل کے ساتھ مختص ہو، یعنی اس کے پاس علمی یا عملی ایسی خصوصیت ہو جو کسی دوسرے کے پاس نہ ہو۔ اور یہ ایک حقیقت مسلمہ ہے کہ علم عمل کی اصل ہے اور علم عمل سے قدر و منزلت میں بلند ہے اور اثر میں دیرپا ہے۔ تو جو معجزہ علمی ہوگا وہ یقیناً علمی معجزات سے افضل اعلیٰ ہوگا پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں وجوہ اعجاز میں سے ایک واضح وجہ کے ساتھ تنبیہ فرمائی اور فرمایا کیا نہیں آ گیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی سماوی کتب میں ہے۔ الم یهد میں استفهام انکاری ہے اور واؤ عاطفہ ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے۔

الم یعرفوا صدقک فی ادعاء النبوة ولم تاتهم بیان ما فی الصحف الاولی

یعنی کیا ان عقل کے اندھوں کو آپ کی نبوت کے دعویٰ کی سچائی معلوم نہیں ہوئی اور پہلی کتب سماویہ تورات، انجیل اور دوسرے صحیفوں کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 233 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

بیان ان کے پاس نہیں آیا۔قرآن حکیم سابقہ کتب کے عقائد و احکام کا خلاصہ ہے، جب کہ اس کو لے کر آنے والا امی ہے۔جس نے کسی کے سامنے کبھی زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا کہ اسے کسی نے ایسا معجز کلام سکھا دیا ہو(کیا یہ قرآن میرے محبوب کی نبوت کی صداقت کی بین دلیل نہیں ہے)اور قرآن جس طرح آپ ﷺ کی نبوت کا واضح ثبوت اور نا قابل تردید دلیل ہے اسی طرح یہ سابقہ کتب کی صحت پر بھی شاہد عادل ہے۔اس حیثیت سے یہ معجزہ ہے(کیونکہ ایک امی نے اس میں سابقہ کتب کے احکام بیان کئے ہیں جب کہ اس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی)جب کہ دوسری کتب سماویہ ایسی نہیں ہیں،ان کو ایک ایسے شاہد کی ضرورت تھی جو ان کی صداقت کی گواہی دے۔واللہ اعلم۔نافع،ابوعمر و اور حفص نے تاتھم کو تانیث کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کیساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کیا ان لوگوں کے پاس پہلی امتوں کے حالات نہیں پہنچے جو پہلی کتب میں موجود تھے کہ انہوں نے بھی اپنی من پسند دلیلوں کا مطالبہ کیا تھا۔پھر جب ان کے پاس ان کی تجویز کردہ دلیلیں اور نشانیاں آئیں تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔پھر کیسے ہم نے فوراً عذاب کی بجلی ان پر برسائی تھی اور ان کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔پس اگر یہ بھی ایمان نہ لائے اپنی تجویز کردہ دلیل پر تو ان پر بھی عذاب کا کوڑا برسے گا۔اور ان کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔

وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰی ﴿۱۳۴﴾

"اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس سے پہلے تو کہتے ہمارے رب کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تا کہ ہم پیروی کرتے تیری آیتوں کی اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوئے [1]"

[1] اهلكنا هم میں هم ضمیر سے مراد کفار قریش ہیں۔بعذاب اهلكنا کے متعلق ہے من قبله یعنی بعثت محمد ﷺ سے پہلے یا بیان اور نصیحت سے پہلے کیونکہ تذکیر و بینہ بھی دلیل کے معنی میں ہے۔فنتبع میں فاء کے بعد ان مضمرہ ہے کیونکہ یہ حرف تخصیص لولا کے جواب میں ہے اور وہ بمعنی استفهام ہے۔آیات سے مراد رسول پر نازل ہونے والی آیات ہیں۔من قبل نتبع کے متعلق ہے۔ذلیل ہونے سے مراد قتل ہونا،قیدی ہونا ہے۔اور رسوائی سے مراد جہنم میں داخل ہونے کے ساتھ رسوائی ہے۔

مسئلہ: یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی عقلاء پر اللہ کی ذات اور اس کی توحید پر ایمان لانا واجب تھا اور رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی کفر عذاب کے استحقاق کا سبب تھا۔رسولوں کی بعثت تو فقط اتمام حجت اور عذر کو ختم کرنے کے لئے ہے۔نیز یہ اس کریم کا مزید فضل و احسان ہے یہ امام حنیفہ کا قول ہے جب کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس کے خلاف ہے۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَ مَنِ اهْتَدٰی ﴿۱۳۵﴾

"(اے حبیب) آپ انہیں فرمائیے ہر شخص (انجام کا) منتظر ہے سو تم بھی انتظار کرو تم عنقریب جان لوگے کون ہیں سیدھی راہ (پر چلنے) والے اور کون ہدایت یافتہ ہیں [1]"

[1] مشرکین ہر وقت اس انتظار میں رہتے کہ حوادثات زمانہ کے طوفان آئیں گے اور محمد ﷺ کے چراغ زیست کو بجھا دیں گے۔

جب ان کا گلشن ہستی مٹ جائے گا تو ہماری ساری بیقراریاں اور بے چینیاں ختم ہو جائیں گی تو فرمایا انتظار کرو قیامت کے روز حقیقت حال کھل جائے گی، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ جنت کے راستہ پر کون گامزن تھا اور کون ہدایت یافتہ تھا یا دائمی نعمتوں کی طرف کون راہنمائی حاصل کر چکا تھا۔ من دونوں جگہ استفهام کے لئے ہے اور مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا من موصولہ ہو۔ لیکن پہلا موصولہ نہیں کیونکہ اس کے لئے ضمیر عائد نہیں ہے پس دوسرا من جملہ استفهامیہ پر معطوف ہوگا۔ اور فستعلمون کا فعل معلق ہوگا اس بناء پر کہ علم بمعنی معرفت ہے یا من کا عطف اصحاب الصراط پر ہے یا صرف الصراط پر ہے اس بنا پر کہ صراط سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس واطہر ہو۔ حمزہ اور کسائی تشقیٰ سے من اهتدیٰ تک امالہ کرتے ہیں اور ابوعمر وصرف وہاں امالہ کرتے ہیں جہاں راء آیا ہے جیسے الثرى من افترى و لا تعرىٰ اور ان کے علاوہ میں بین بین کرتے ہیں اور ورش تمام میں بین بین پڑھتے ہیں اور باقی قراء فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

حاکم نے المستدرک میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ معقل بن یسار سے اور بغوی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے سورۂ بقرہ ذکر اول سے عطا کی گئی اور سورۂ طٰہٰ اور حٰمٓ والی سورتیں اور جسم والی سورتیں الواح موسیٰ سے عطاء کی گئیں۔ اور فاتحہ الکتاب سورۂ بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے عطاء کی گئیں اور مفصل مجھے زائد عطاء ہوئیں۔ حاکم نے مستدرک میں الطبر انی اور ابن ماجہ نے حضرت امامہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا اسم اعظم جس کے ساتھ دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے، وہ تین سورتوں میں ہے، سورۂ بقرہ، سورۂ ال عمران اور سورۂ طٰہٰ (1)۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين شفيع المذنبين۔ سورۂ طٰہٰ کا ترجمہ بتوفیق الٰہی 1421 بمطابق 2 اگست بروز بدھ صبح پونے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔

یا مالک الملک یا حی یا قیوم میری اس کاوش کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول فرما اور اسے میرے لئے بروز قیامت باعث نجات بنا اور اس کے طفیل میری اولا د کو دین متین کی خدمت کے لئے قبول فرما۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین یا ارحم الراحمین آمین بجاه سید المرسلين محمد ﷺ و اصحابه وازواجه وسلم۔

1۔ معجم کبیر، جلد 8، صفحہ 237، حدیث: 7925 (العلوم والحکم)

سورۃ الانبیاء

ایاتھا ۱۱۲ سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَآءِ مَکِّیَّۃٌ ۲۱ رکوعاتھا ۷

سورۂ انبیاء مکی ہے، اس میں سات رکوع اور ایک سو بارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

آغاز ترجمہ: بروز بدھ صبح آٹھ بجے 2 اگست 2000ء۔ یہ سورت مکی ہے، اس میں سات 7 رکوع 112 آیتیں ہیں۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱

''قریب آ گیا ہے لوگوں کے لئے ان کے (اعمال کے) حساب کا وقت [1] اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں [2]۔''

[1] جو زمانہ بیت گیا ہے اس کی نسبت سے زندگی کے باقی ایام کم ہیں، اس لئے فرمایا ان کے حساب کی گھڑی قریب ہے۔ للناس پر لام بعض علماء کے نزدیک بمعنی من ہے اور اقترب کے متعلق ہے اور بعض علماء کے نزدیک اضافت کی تاکید کے لئے ہے۔ اصل میں اس طرح ہوگا اقترب حساب الناس۔ الناس پر الف لام جنس کے لئے ہے اور بعض کے نزدیک عہدی ہے اور مراد کفار ہیں۔ اس قول کی تائید و هم فی غفلة کا ارشاد بھی کرتا ہے۔

[2] دنیا کی لذتوں اور نفسانی خواہشات میں یوں کھوئے ہوئے ہیں کہ اپنی زندگی کے اعمال کے حساب سے غافل ہیں اور بداعمالیوں پر جو انہیں سزا ملنے والی ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں اور حساب کے متعلق سوچنے اور حساب و کتاب کے لئے تیار ہونے سے نرے غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے غفلت کے بعد اعراض کی صفت بیان فرمائی تاکہ وہ شخص خارج ہو جائے جو ذکر الٰہی میں استغراق کی وجہ سے کائنات کی ہر چیز سے مستغنی ہے۔ الناس پر اگر الف لام استغراقی ہو تو ضمیر منفصل کا مرجع عام کے بعض افراد ہوں گے جیسا کہ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ...... وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں بعولتهن کی ضمیر کا مرجع المطلقات میں سے مطلقات رجعیات ہیں (یعنی عام کے بعض افراد مراد ہیں کیونکہ جن عورتوں کو طلاق مغلظہ دی گئی ہو ان کو ان کے خاوند لوٹانے کا حق نہیں رکھتے) معرضون ضمیر کی خبر ہے اور فی غفلة خبر کی ضمیر مستتر سے حال ہے یا فی غفلة اور معرضون دونوں ضمیر کی خبریں ہیں اور پھر جملہ الناس سے یا حسابهم سے رابطہ کے حذف کے ساتھ حال ہے۔ حساب سے مراد بندوں نے جو کچھ کیا اور اپنے اعمال کے مطابق جس کے مستحق ہیں اس کا اظہار ہے اور اقترابه سے مراد قیامت کا قریب ہونا ہے۔

مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ یَلْعَبُوْنَ ۝۲

''نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ نصیحت ان کے رب کی طرف سے [1] مگر یہ کہ وہ سنتے ہیں اسے اس حال میں کہ وہ (لہو) لعب میں (مگن) ہوتے ہیں [2]۔''

۱؎ من زائدہ ہے اور ذکر' یاتی کے فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور من ربھم ذکر کی صفت ہے یا یاتیھم کے متعلق ہے۔ محدث بھی ذکر کی صفت ہے۔

ذکر محدث سے مراد کلام اللہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے لیکن اس کا نزول بندوں کی مصلحتوں کے مطابق مختلف اوقات میں ہوتا رہا ہے تاکہ بندوں کو بار بار متنبہ کیا جائے اور وہ اس نعمت عظمیٰ سے نصیحت حاصل کریں تو اس کا نزول حادث ہے اور نزول کا حادث ہونا ذات منزل کے قدیم ہونے کے منافی نہیں ہے (خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے لیکن اس کا نزول حادث ہے پس معتزلہ اس آیت سے قرآن کے حدوث کو ثابت نہیں کر سکتے)

۲؎ یعنی جب کسی نئی آیت کا نزول ہوتا ہے تو یہ ہدایت حاصل کرنے کی بجائے مذاق اڑاتے ہیں' سنجیدگی سے غور و فکر کی زحمت گوارا ہی نہیں کرتے۔ اپنے انجام بد سے بے فکر ہونے' غفلت اور عدم توجہ کی انتہا کو پہنچنے کی وجہ سے قرآن کا استہزاء کرتے ہیں۔ وھم یلعبون' استمعوہ کے فاعل سے حال ہے۔

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۗ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۗ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③

''غافل ہوتے ہیں ان کے دل ۱؎ اور (آپ کے خلاف) سرگوشیاں کرتے ہیں ۲؎ ظالم (وہ کہتے ہیں) کیا ہے یہ مگر ایک بشر تمہاری مانند ۳؎ تو کیا تم پیروی کرنے لگے ہو جادو کی ۴؎ حالانکہ تم دیکھ رہے ہو (کہ یہ تمہاری طرح بشر ہے) ۵؎''

۱؎ لاھیۃ قلوبھم' یلعبون کے فاعل سے یا استمعوہ کے فاعل سے حال ہے اور مستثنیٰ ما یاتیھم کی ضمیر منصوب سے حال ہے یا ما یاتیھم کے مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی کسی حال میں ان کے پاس کوئی ذکر نہیں آتا مگر وہ سننے کے وقت قرآن کے استہزاء اور انجام کی بے فکری کے جامع ہوتے ہیں۔ مستثنیٰ کے مصدر کی صفت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کوئی نیا ذکر ان کے پاس نہیں آتا مگر اس کو سنتے ہیں غفلت اور لہو و لعب میں مگن ہو کر۔

ابوبکر الوراق فرماتے ہیں القلب اللاھی وہ ہے جو دنیا کی زیب و زینت اور بہجت میں کھویا ہوا ہو اور آخرت کی ہولناکیوں سے غافل ہو۔ ما تاتیھم کا جملہ ھم فی غفلۃ کی علت ہے۔

۲؎ وہ انتہائی خفیہ طریقہ سے سازشیں کرتے ہیں یا یہ معنیٰ کہ وہ اس طرح سازشیں کرتے ہیں کہ کوئی ان کی سرگوشی کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ الذین ظلموا' اسروا کا فاعل ہے اور اسروا میں واو زائدہ ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ آنے والا فاعل جمع ہے یا اس کا فاعل ضمیر ہی ہے اور الذین ظلموا' ضمیر سے بدل ہے اور اس اسلوب کا مقصود یہ ہے کہ وہ ظلم میں حد سے تجاوز کرنے والے ہیں یا اسم موصول مبتدا ہے اور اس سے پہلا جملہ اس کی خبر ہے اور اس کی اصل ھؤلاء اسروا النجوی ہے۔ ان کے ظلم پر مہر ثبت کرنے کے لئے ھؤلاء کی جگہ اسم موصول ذکر فرمایا۔ یا اسم موصول (الذین) مبتدا محذوف کی خبر ہے' تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ھم الذین ظلموا یا اسم موصول اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا بطور ذم منصوب ہے اور اسروا النجوی کا جملہ یلعبون پر معطوف ہے یا یلعبون کے فاعل سے حال ہے یا استمعوہ پر معطوف ہے یا ما یاتیھم پر معطوف ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔

۳؎ وہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کے لئے یہ دلیل دیتے کہ یہ ہماری طرح بشر ہے' وہ یہ گمان کرتے تھے کہ رسول کے لئے فرشتہ ہونا

ضروری ہے گویا ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ رسول' بھیجنے والے کی جنس سے ہونا ضروری ہے اور وہ ملائکہ کو الملک القھار کی جنس سے سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہیں اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ ان کے یہ سب نظریات باطل اور غلط ہیں۔

حق یہ ہے کہ رسول کے لئے ان کی جنس سے ہونا ضروری ہے جن کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا ہے کہ وہ اس سے اکتساب فیض کر سکیں اور الملک القھار کی ذات لَمْ یَکُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ہے، اس کا کوئی ہم پلہ اور ہم جنس نہیں ہے۔ مثلکم بشر کی صفت مؤکدہ ہے۔

ے پھر جب انہیں کہا جاتا کہ اگر واقعی یہ نبی نہیں ہے تو آئے دن اس سے معجزات کا ظہور کیوں ہوتا ہے؟ تو وہ رسالت و نبوت پر دلالت کرنے والے معجزات کا رد یہ کہہ کر کرتے کہ یہ جادو ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو۔ یعنی یہ رسول نہیں ہے کیونکہ یہ بشر ہے اور جو اس سے خوارق العادت افعال کا اظہار ہوتا ہے یہ جادو کا کرشمہ ہے۔ استفہام انکاری ہے' فاء عاطفہ ہے' اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ السحر مفعولیت یا علیت کی بناء پر منصوب ہے اور مفعول محذوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے اتصدقونه فی دعوی الرسالة فتاتون السحر یعنی تم اس کی دعویٰ رسالت میں تصدیق کرتے ہو اور تم جادو کی اتباع کرتے ہو یا یہ معنی کہ تم محمد ﷺ کی اس جادو کی وجہ سے پیروی کرتے ہو جو وہ لے کر آئے ہیں۔ جب معجزات کے جادو ہونے پر کوئی دلیل نہ پاتے کیونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تو ہٹ دھرمی کی بناء پر بغیر کسی دلیل کے اس کے جادو ہونے کا دعویٰ کرتے اور کہتے تم دیکھ رہے ہو کہ یہ جادو ہے، اس میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ے یہ جملہ تاتون کے فاعل سے حال ہے اور افتاتون السحر کا جملہ' ھل ھذا الا بشر سے بدل اشتمال ہے اور ھل ھذا الا بشر کا جملہ النجوی سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا قالوا کا مفعول ہے اور قالوا کا جملہ اسروا النجوی کے جملہ کا بیان ہے یا اس کا بدل ہے یا ماذا قالوا کا جواب جملہ مستانفہ ہے۔ اس خفیہ سوچ و بچار سے ان کا مقصود آپس میں مشورہ کرنا تھا تا کہ ہم کسی ایسی متفقہ بات پر پہنچ جائیں جو قصر نبوت میں شگاف ڈال دے اور ان کی ابھرتی ہوئی تحریک میں فساد و انتشار پیدا کر دے اور ہماری اس بات کو سننے والا ابتداءً رد نہ کر سکے لیکن ان نادانوں کو یہ معلوم نہ تھا جس نور کی حفاظت اللہ تعالیٰ فرما رہا ہو اس کو پھونکوں سے بجھانا ناممکن ہے۔ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔ یہ (نادان) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے لیکن اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا خواہ ناپسند کریں اسے کوئی کافر۔

قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ٘ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۝

''(نبی کریم نے) فرمایا میرا رب جانتا ہے جو بات کہی جاتی ہے آسمان اور زمین میں اور وہی ہر بات سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے[1]''

[1] حمزہ' کسائی اور حفص نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اخبار کی بناء پر قال پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے امر کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فی السماء والارض' القول سے حال ہے، یعنی میرا پروردگار ہر اس بات کو جانتا ہے جو زمین کی پستیوں یا آسمان کی بلندیوں میں کی جاتی ہے خواہ کہنے والا بلند آواز سے کہے یا آہستہ آواز سے' وہ خفیہ رازوں (بلکہ تہاں خانہ دل میں اٹھنے والی خواہشوں) کو بھی جانتا ہے وہ ان کی ہر بات کو سننے والا ہے اور ان کے ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے۔

بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَةٍ كَمَاۤ

اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۵﴾

''وہ کہتے ہیں بلکہ یہ پریشان خواب ہیں (نہیں) بلکہ اس نے خود گھڑا ہے اسے (نہیں) بلکہ وہ شاعر ہے [1] (اگر وہ سچا نبی ہے) تو لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی جس طرح بھیجے گئے تھے پہلے انبیاء [2]''

[1] شانِ رسالت میں جو انہوں نے کہا تھا کہ یہ بشر ہے اور بشر اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اب اس کلام سے اعتراض کر کے قرآن کے متعلق جو انہوں نے بک بک کی تھی اس کو حکایت کیا جا رہا ہے' وہ کہتے یہ قرآن اللہ کی طرف نازل شدہ نہیں ہے بلکہ پریشان خواب ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کفار کے قول افتاتون السحر سے اضراب ہے اور معنی یہ کہ وہ کہتے ہیں یہ جادو ہے بلکہ پریشان خواب ہیں اور قالوا کا کلمہ اس مقدر قالوا کی لفظی تاکید ہے جو سابق کلام سے مفہوم ہے۔ کبھی کہتے نہیں بلکہ یہ اس نے خود گھڑا ہے' خواب میں بھی اسے یہ دکھائی نہیں دیا۔ یہ کفار کے اس قول اضغاث احلام سے اضراب ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ خود تراشیدہ ہے بعض کہتے ہیں محمد ﷺ شاعر ہیں اور جو انہوں نے کلام پیش کیا ہے وہ شعر ہے (۱)۔ مفتریٰ (گھڑا ہوا) اور شعر میں فرق یہ ہے کہ مفتریٰ وہ جھوٹی کلام ہوتی ہے جس سے متکلم سامع سے واقع کے غیر مطابق ہونے کے باوجود تصدیق چاہتا ہے اور شعر مقدمات سے مرکب کلام ہوتا ہے جو سامع کے ذہن میں ترغیب' ترہیب' خوف' شوق' سرور' غم' تعظیم' تحقیر کا اثر پیدا کرتا ہے اور اس سے مقصود تصدیق نہیں ہوتی بلکہ نفوس میں تاثیر پیدا کرنا منظور ہوتا ہے گویا یہ انشاء کے قبیل سے ہے۔ کبھی کبھی مقدمات شعر یہ موثرہ کے ساتھ جھوٹی یا سچی بات جمع ہوتی ہے اور یہ مثنویات اور غزلیات میں پائی جاتی ہے۔ یہ سب کفار کی لایعنی باتیں تھیں اور سب غلط اور فاسد ہیں کیونکہ یہ سب باتیں انہوں نے بغیر کسی جرم کے اپنے منہ سے بنائیں ہیں، ان کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔

[2] کہتے ہیں محمد ﷺ اگر دعویٰ نبوت میں سچے ہیں تو کوئی دلیل لائیں جیسا کہ پہلے رسول اپنی صداقت پر دلائل لائے تھے کَمَا اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ' آیت کی صفت ہے۔ یہاں تشبیہ صحیح ہے کیونکہ ارسال' آیت کے لانے کے معنی کو متضمن ہے۔ ''کما'' میں ما موصولہ ہے یا موصوفہ ہے اور پھر یہ محذوف موصوف کی صفت ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فلیاتنا بایة کائنة کالآیة التی ارسل بھا الاولون من الرسل۔ یعنی محمد ﷺ اپنی صداقت کے لئے کوئی نشانی لائیں جو پہلے رسولوں کی نشانیوں کے مشابہ ہو۔ جیسا صالح علیہ السلام کی اونٹنی' عصا موسوی' ید بیضا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے اور مردوں کو زندہ کرنا' بیماروں کو شفا بخشنا' عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے۔

ابن جریر نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں' اہل مکہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا' جو کچھ آپ کہتے ہیں اگر یہ حق ہے تو اس صفا کی پہاڑی کو ہمارے لئے سونا بنا دو۔ اسی اثناء میں جبریل امین تشریف لائے اور کہا اگر آپ چاہیں تو وہی ہو جائے گا جو آپ کی قوم آپ سے مطالبہ کرتی ہے لیکن اگر ان کی تجویز کے مطابق پہاڑ سونا بن گیا اور پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو انہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی قوم کو مہلت دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں اپنی قوم کے لئے مہلت کا متمنی ہوں (2)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا۔

مَاۤ اٰمَنَتۡ قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡیَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا ۚ اَفَهُمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 234 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 563 (العلمیہ)

''نہیں ایمان لائی ان سے پہلے کوئی بستی جسے ہم نے تباہ کیا تھا تو کیا اب یہ لوگ ایمان لے آئیں گے ۱؎ ''

۱؎ قبلھم میں ضمیر سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ من قریة سے مراد من اھل قریة ہے اور من زائدہ ہے اور قریة فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اھلکنا' قریة کی صفت ہے، یعنی جب ان کی مجوزہ آیات اور نشانیاں ان کے پاس آ گئیں اور وہ ایمان نہ لائے تو ہم نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ افھم یومنون' استفہام انکاری ہے اور فاء' ما آمنت پر عطف کے لئے ہے۔ اہل مکہ پہلے لوگوں سے عناد اور ہٹ دھرمی میں زیادہ سخت ہیں' جب پہلے لوگ مجوزہ نشانیاں دیکھنے کے بعد ایمان نہیں لائے تو یہ بد بخت یقیناً ایمان نہیں لائیں گے لیکن اس آیت میں اشارہ ہے کہ ان کی مجوزہ نشانیاں نہ لانا بھی ان کی بقاء کی خاطر ہے۔ اگر وہ نشانیاں پیش کر دی جاتیں اور یہ ایمان نہ لاتے تو یہ بھی اسی عذاب کے مستحق ہوتے جس کے پہلے منکر لوگ ہوئے تھے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝

''اور نہیں رسول بنا کر بھیجا ہم نے (اے حبیب) آپ سے پہلے مگر مردوں کو ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف ۱؎ پس (اے منکرو!) پوچھو اہل علم سے ۲؎ اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے ۳؎ ''

۱؎ نوحی کو حفص نے بطور تعظیم جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور کافروں کے قول ھل ھذا الا بشر مثلکم کا رد ہے۔

۲؎ اگر تم خود اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تو اہل کتاب کے علماء سے پوچھو کہ پہلے انبیاء و رسل بشر تھے یا ملائکہ تھے تاکہ تمہارا شبہ اور خلش ختم ہو جائے۔

۳؎ ان کنتم لا تعلمون شرط ہے اور سابقہ کلام کی دلالت کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اور کفار مکہ کو اہل کتاب سے پوچھنے اور ان کی طرف رجوع کرنے کو کیوں کہا گیا حالانکہ وہ بھی شان مصطفیٰ کے منکر تھے تو فرماتے تھے اس کی دو وجہیں ہیں یا تو اس لئے کہ مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ کے متعلق ان سے مشاورت کرتے تھے اور ان کی بات پر یقین کرتے تھے یا اس لئے کہ اھل تواتر کی اخبار علم کا فائدہ دیتی ہیں اگرچہ وہ کفار ہی ہوں۔

وَمَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا لَّا يَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوۡا خٰلِدِيۡنَ ۝

''اور نہیں بنائے ہم نے ان انبیاء کے (ایسے) جسم ۱؎ کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے تھے ۲؎ ''

۱؎ جعلنھم میں ضمیر منصوب سے مراد پہلے رسل ہیں۔ جسدا کو آیت کے الفاظ کے تقاضا کے مطابق اجساداً ہونا چاہیئے تھا (کیونکہ جعل بمعنی میسر ہے اور ھم ضمیر اس کا مفعول اول اور جسداً مفعول ثانی ہے' مفعول اول جمع ہے تو پھر جمع کی خبر مفرد کیسے ہو سکتی ہے' نیز لا یاکلون، جسداً کی صفت ہے' تو جمع کی ضمیر مفرد کی طرح لوٹانی کیسے جائز ہے) لیکن جسداً فرمانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یا تو یہ اسم جنس ہے یا یہ اصل میں مصدر ہے یا اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یا ضمیر کل واحد کی تاویل میں ہے۔ جسد وہ جسم ہوتا ہے جو ذی لون یعنی رنگ والا ہو۔ اسی وجہ سے جسد کا اطلاق پانی اور ہوا پر نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جسد وہ جسم ہوتا ہے جو مرکب ہو کیونکہ

اس کی اصل کسی شے کو جمع کرنا اور اس کو سخت بنانا ہے۔

۲۔ یاکلون الطعام کا جملہ جسدا کی صفت ہے اور ماجعلنا کا جملہ مستانفہ ہے جو کفار کے قول مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ (کیا ہے اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے) کے جواب میں ہے و ماکانوا خالدین' سابق کلام کی تاکید اور ثبوت ہے کیونکہ کھانے کے ساتھ زندہ رہنا تحلیل کے لوازم میں سے ہے جو تحلیل فناء اور عدم دوام کا باعث ہے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝

''پھر ہم نے سچا کر دکھایا انہیں (جو) وعدہ (ہم نے ان سے کیا تھا) پس ہم نے نجات دی انہیں اور ان لوگوں کو جن کو ہم نے (بچانا) چاہا ۱؎ اور ہم نے ہلاک کر دیا حد سے بڑھنے والوں کو ۲؎ ''

۱؎ وعدہ سے مراد دشمنوں پر فتح ہے۔ یہ جملہ ایک محذوف جملہ پر معطوف ہے پھر وہ محذوف جملہ وما ارسلنا قبلک الا رجالا الخ پر معطوف ہے۔

پہلے مشرکین نے پہلے انبیاء پر بھی لایعنی اعتراض کئے تھے اور بھونڈے قسم کے اشکال اٹھائے تھے جیسا کہ یہ بد بخت تمہارے اوپر طعن واعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان نا ہنجاروں اور بدکرداروں پر انہیں فتح و نصرت بخشیں گے تو ہم نے ان سے یہ کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، ہم نے رسولوں کو عذاب کفار کی ولآ زار و دلخراش باتوں سے نجات دی اور ان لوگوں کو بھی نجات دی جو ان انبیاء پر ایمان لائے تھے اور انہیں بھی بچا لیا جن کے بچانے میں ہماری کوئی حکمت تھی جیسا کہ ہمیں معلوم تھا کہ فلاں یا اس کی اولاد سے کوئی مومن ہوگا۔ مشرکین عرب بھی اسی بناء پر عذاب سے محفوظ رکھے گئے تھے (کہ ان کی اولاد اور نسل سے مومن و موحد پیدا ہونے والے تھے)

۲؎ ہم نے کفر و معاصی میں حد سے تجاوز کرنے والوں پر عذاب نازل کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

''بے شک ہم نے اتاری تمہاری طرف ایک کتاب جس میں تمہارے لئے نصیحت ہے ۱؎ کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے ۲؎ ''

۱؎ یہ خطاب قریش کو ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے، یعنی اے قریش مکہ یہ جو کتاب ہم نے تمہیں عطاء فرمائی ہے اگر تم اس کا علم حاصل کر و تو تمہارے لئے اس میں شرف اور عظمت ہے یا اس لئے اس میں تمہارے لئے شرف ہے کہ یہ تمہاری زبان میں ہے اور تم میں سے ایک ذی شان شخص پر اتری ہے یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں تمہارا اور تمہارے تمام دینی امور کا ذکر فرمایا ہے۔ امام بیضاوی نے ذکر کا معنی شہرت کیا ہے۔ یا ذکر کا معنی نصیحت ہے، یعنی اس میں تمہارے لئے نصیحت ہے یا ذکر سے مراد مکارم اخلاق ہیں، یعنی اس کتاب میں ایسے مکارم اخلاق ہیں جن سے تم اپنا ذکر جمیل منا چاہتے ہو(1)۔ مجاہد نے ذکر کا معنی حدیثکم کیا ہے یعنی جس میں تمہارا تذکرہ ہے، اس کا معنی زبان پر جاری کرنا' شہرت' تعریف' نماز' دعا اور کتاب ہے جس میں دین کی تفصیل اور قوموں کے حالات ہوں(2)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 10 (العلمیۃ)　2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 560 (التراث العربی)

۲۔ افلا تعقلون کا عطف انزلنا پر ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے اور ہمزہ استفہامیہ انکار کے لئے ہے کیا تمہارے پاس اتنی بھی عقل و سمجھ نہیں ہے کہ تم یہ سوچ سکو کہ اس کتاب میں ہماری اصلاح کے قوانین ہیں اور ہماری عظمت و شہرت کا سامان ہے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۱۱

''اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں (کیونکہ) وہ ظالم تھیں اور ہم نے پیدا فرما دی ان کی (بربادی) کے بعد ایک دوسری قوم ۱؎''

۱؎ یعنی ہم نے بہت سی بستیوں میں رہنے والوں کو ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا اس لئے کہ انہوں نے کفر و معاصی کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور انہیں ہلاک کرنے کے بعد ان کی جگہ دوسری قوموں کو ہم نے ان کا وارث بنا دیا۔

فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ ۝۱۲

''پس جب انہوں نے محسوس کیا ہمارا عذاب تو فوراً انہوں نے وہاں سے بھاگنا شروع کر دیا ۱؎''

۱؎ احسو کی ضمیر کا مرجع اہل ہے جو قریۃ کی طرف مضاف ہے۔ لما ظرف ہے اور مفاجات کے معنی میں ہے اور یہ جملہ ایک مقدر جملہ پر معطوف ہے اور پھر یہ دونوں جملے ان کو ہلاک کرنے کا بیان ہیں، یعنی جب ہم نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ہم نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو اس سے فوراً بھاگنے لگے۔

لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْــٴَـلُوْنَ ۝۱۳

''اب مت بھاگو! اور واپس لوٹو ان آسائشوں کی طرف جو تمہیں دی گئی تھیں اور (لوٹو) اپنے مکانوں کی طرف ۱؎ تا کہ تم سے باز پرس کی جائے ۲؎''

۱؎ اس کلام سے پہلے کلام مقدر ہے اور جملہ اس سوال کے جواب میں مستانفہ ہے کہ ان کے بھاگنے کے وقت انہیں کہا گیا، یعنی زبان حال یا زبان قال سے بطور استہزاء انہیں یہ کہا گیا۔ یہ بات کہنے والا فرشتہ تھا یا اسی بستی کے مومنین تھے۔ اتراف کا معنی نعمت پر گھمنڈ کرنا' اترانا ہے۔ الخلیل فرماتے ہیں مترف وہ ہوتا ہے جس کی زندگی خوشحال ہو اور اس کی زندگی میں غم اور پریشانی کم ہو۔

۲؎ تا کہ کل تم سے پوچھا جائے کہ تم پر اور تمہارے اموال پر کیا گزری اور تم علم اور مشاہدہ سے سائل کا جواب دو یا یہ معنی کہ لوٹو اور اپنی عیش و طرب کی مجالس اپنے خدمت گزاروں اور غلاموں کے ساتھ سجاؤ اور وہ تم سے پوچھیں کہ حضور! اب ہمارے لئے کیا ارشاد ہے؟ یا یہ مطلب کہ تم واپس آؤ تا کہ لوگ تم سے تمہاری مجلسوں میں مصائب و تکالیف کے بارے میں پوچھیں یا یہ معنی کہ کل تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پوچھا جائے یا تمہیں عذاب دیا جائے، سوال کرنا عذاب کے مقدمات میں سے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں واپس پلٹو تا کہ تم سے تمہارے نبی کے قتل کے متعلق پوچھا جائے(1)۔ امام بغوی لکھتے ہیں یہ آیت کریمہ حضور بستی والوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ یہ یمن کا دیہات تھا اور اس کے باشندے عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ان کی طرف اپنا ایک نبی مبعوث فرمایا۔ اس نے انہیں توحید کی دعوت دی، احکام الٰہیہ سے آگاہ کیا لیکن ان بدبختوں نے نبی کو جھٹلایا، اس کی تکذیب کی اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا حتیٰ کہ اس نے بعض کو قیدی بنالیا اور بعض کو قتل کر دیا' جب ان کو قتل کیا جا رہا تھا تو بہت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 235 (التجاریہ)

شرمندہ ہوئے اور بھاگ نکلے' فرشتوں نے انہیں بطور استہزاء کہا اب بھاگو مت اور اپنے مال' محلات اور ماڑیوں کی طرف لوٹو تا کہ تم سے سوال کیا جائے (1)۔ قتادہ فرماتے ہیں تا کہ تم سے دنیا کا مال و اسباب مانگا جائے پھر جسے تم چاہو عطاء کر دو، جسے چاہو روک دو، تم اہل ثروت و حشمت ہو۔ بخت نصر نے ان کا پیچھا کیا تھا اور تلواروں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ آسمان سے آواز آئی۔ انبیاء کا انتقام! جب انہوں نے یہ خوفناک منظر دیکھا تو اپنے جرموں کا اعتراف کیا لیکن اس وقت اعتراف بے سود تھا (2)۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کلام انہوں نے ایک دوسرے سے کی ہو کہ بھاگو نہیں، اپنے گھروں کی طرف لوٹو اور اپنے اموال کی طرف پلٹو تا کہ تم سے بطور (دیت) مال مانگا جائے اور تم مال دے کر قتل سے بچ جاؤ' آسمان سے ندا آئی نبیوں کا بدلہ۔ تلواروں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر انہوں نے اپنے جرائم کا اقرار کیا۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾

''کہنے لگے وائے شومئی قسمت ہم ہی ظالم تھے 1۔''

1۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ (جملہ مستانفہ سابقہ کلام پر سوال کا جواب ہوتا ہے)

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

''پس وہ یونہی شور و پکار کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے (انگاروں) کی طرح کر دیا 1۔''

1۔ ان کے یاویلنا کے قول کو دعوی سے تعبیر کیا ہے گویا کہ یہ کہنا ہے اے ویل (ہلاکت) آ جا یہی تیرا وقت ہے۔ تلک یا تو ما زالت کا اسم اور دعواھم خبر ہے۔ یا تلک خبر ہونے کے اعتبار سے محل نصب میں ہے اور دعواھم، ما زالت کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (یہ دونوں تراکیب درست ہیں کیونکہ مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہیں) یہاں حصید بمعنی محصود ہے (درانتی سے کاٹی ہوئی فصل) اسی وجہ سے اس کو جمع ذکر نہیں کیا گیا۔ خامدین خمدت النار سے مشتق ہے۔ حصید کے ساتھ اس کا ذکر ایک اسم کی طرح ہے (کیونکہ جعل تین مفعولوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا اس کا پہلا مفعول ضمیر ہے اور حصیداً خامدین ایک مفعول کی حیثیت سے دوسرا مفعول ہے) جس طرح کہ جعلته حلوا حامضا (یعنی میں نے اسے دونوں ذائقوں کا جامع بنا دیا) اس جملہ میں حلواً حامضاً ایک مفعول کے قائم مقام ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں کٹی ہوئی کھیتی اور بجھے ہوئے آگ کے انگاروں کا مجموعہ بنا دیا۔ یا خامدین' صفت ہے حصیداً کی۔ یا حمیداً کی ضمیر سے حال ہے (حصیداً چونکہ فعیل بمعنی مفعول ہے اس لئے یہ واحد تثنیہ' جمع' مذکر' مونث کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے اس لئے خامدین جمع اس کی ضمیر سے حال بن سکتا ہے)۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے دل لگی کرتے ہوئے 1۔''

1۔ یعنی ہم نے اس عالم رنگ و بو کو کھیل' تماشا کے لئے پیدا نہیں فرمایا بلکہ اس رنگا رنگ جہان میں کئی حکمتیں مضمر ہیں یہ نگاہ ہوش رکھنے والوں کے لئے قابل دید ہے اور صاحب بصیرت لوگوں کے لئے نصیحت ہے' لوگوں کی معیشت و آخرت کے امور کا سبب ہے' اس لئے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 235 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

اس نظام عالم کو دیکھ کر، اپنے علم (عقیدہ توحید) اور عمل (احکام شریعت کی پابندی) کی تکمیل کرو، اس کی رنگینیوں میں کھو کر نہ رہ جاؤ، چشم ہوش کھولو! یہ دنیا تو بہت جلد فناء ہونے والی ہے۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾

''اگر ہمیں یہی منظور ہوتا کہ ہم (اس کائنات کو) کھیل تماشہ بنائیں تو ہم بنا لیتے اسے خود بخود (ہمیں کون روک سکتا تھا) [1] مگر ہم ایسا کرنے والے نہیں ہیں [2]''

[1] ابن عباس فرماتے ہیں **لھو** سے مراد عورت ہے۔ حسن اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ وطی کو لغت میں **لھو** کہا جاتا ہے اور عورت **لھو** (وطی) کا محل ہے۔ کلبی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ **لھو** سے مراد اولاد ہے۔ سدی کا بھی یہی قول ہے(1) کیونکہ انسان اپنے چھوٹے بچوں سے کھیلتا ہے، اس لئے **لھو** سے مراد اولاد ہے۔ یعنی اگر ہماری شان کے یہ لائق ہوتا تو ہم ایسا کر دیتے لیکن بیوی اور ولد ہر ایک اپنی جنس سے ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل اور بے مثال ہے، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے اور نہ ہم پلہ۔ پس ثابت ہوا کہ اس کے لئے بیوی یا بچہ ہونا محال ہے۔ محال چیز کے ساتھ ارادہ الہیہ کا تعلق محال ہے۔ پس جب محال چیز کے ساتھ ارادہ الہیہ کا معلق ہونا محال ہے تو بیوی اور بیٹا بنانے سے اس کے ارادہ کا معلق ہونا بھی محال ہے۔

[2] **ان كنا فاعلين** شرط ہے لیکن سابق کلام کی دلالت کی وجہ سے اس کی جزاء محذوف ہے، یعنی اگر ہم بیوی اور فرزند بناتے یا کائنات ارضی و سماوی کو فقط کھیل تماشہ بناتے تو ہمیں کون روک سکتا تھا لیکن ہم ایسا کرتے نہیں کیونکہ یہ ہماری شان الوہیت کے منافی ہے۔ قتادہ، ابن جریج اور مقاتل فرماتے ہیں ان نفی کے لئے ہے اور یہ جملہ سابقہ شرط کے لئے نتیجہ کی مانند ہے(2)۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾

''بلکہ ہم تو چوٹ لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ کچل دیتا ہے اور وہ یکا یک ناپید ہو جاتا ہے اور (اے باطل پرستو!) تمہارے لئے ہلاکت ہے ان (نازیبا) باتوں کے باعث جو تم بیان کرتے ہو [2]''

[1] سابق کلام کے مضمون پر اس کا عطف ہے۔ یعنی ہمارا تخلیق ارض و سماء سے مقصود لہو و لعب نہیں بلکہ ہم حق کے ذریعے باطل کا سر کچلتے ہیں۔ حق سے مراد اللہ کی ذات سے بیوی اور فرزند سے منزہ ہونے پر دلالت کرنے والی آیات ہیں اور باطل سے مراد کفر اور کذب ہے جو کافر کہتے تھے کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ **دمغ** ایسی ضرب جس سے سر اور دماغ پھٹ جائے اور روح نکلنے کا باعث بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کے ذریعے باطل کو کچلنے اور احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے استعارۃً یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ قذف کا معنی دور پھینکنا ہے جو پھینکی ہوئی چیز کی صلابت کو مستلزم ہے۔ مقصود یہ ہے کہ حق کا پھریرا رفعتوں کے ساتویں آسمان پر لہرائے اور باطل کا منہ کالا ہو اور بے نام و نشان ہو جائے اس کا کچھ بھی باقی نہ رہے۔

زھق کا معنی ہلاک ہونا اور باطل ہونا ہے۔ قاموس میں بھی زھق کا معنی اضمحل (یعنی کمزور اور ہلاک ہونا) درج ہے(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں زھوق کا مطلب روح کا نکلنا ہے۔ استعارہ مرشحہ بنانے کے لئے اس کو ذکر فرمایا ہے۔ اے باطل کے پرستارو!

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 235 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1184 (التراث العربی)

تمہارے لئے ہلاکت ہے ان ناروا باتوں کی وجہ سے جو تم اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کہتے ہو۔ ما مصدر یہ موصولہ اور موصوفہ تینوں احتمال رکھتا ہے۔ ولکم الویل الخ کا جملہ فاذا ھو زاھق پر معطوف ہے یا حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝۱۹

''اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو (فرشتے) اس کے نزدیک ہیں وہ ذرا سرکشی نہیں کرتے اس کی عبادت سے اور نہ ہی وہ تھکتے ہیں [1]۔''

[1] اس عالم بالا و پست میں جو کچھ ہے تخلیق بھی اس کی ہے اور ملکیت بھی اسی کی ہے کوئی چیز اس کی اہل اولاد اور ہم پلہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ومن عندہ سے اس قربت کا اظہار ہے جو الفاظ اور تحریر کے احاطہ سے وراء ہے، اس کی کیفیت محسوس تو کی جاسکتی ہے لیکن بیان نہیں ہوسکتی اور اس سے مراد فرشتے انبیاء اور ان کے پیروکار ہیں من عندہ کا عطف من فی السموٰت والارض پر ہے اور ان کا علیحدہ ذکر تعظیم کے لئے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ من اس سے اعم بھی ہے کیونکہ بعض فرشتے جیسے حاملین عرش وغیرہم اور انبیاء ملائکہ اور دائرۃ الظلال آسمان اور زمین میں ہونے سے بلند ہیں یا من عندہ مبتدا ہے اور لا یستکبرون الخ خبر ہے۔ استحسر کا معنی تھک جانا اور عاجز آجانا ہے استحسار حسور سے ابلغ ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ ان کی عبادت بڑی مشکل اور دائمی ہے، اس سے تھک جانا یا عاجز آجانا بھی ایک حقیقت ہے لیکن مقربین بارگاہ الٰہی اس سے تھکتے نہیں بلکہ اس میں لذت اور سکون محسوس کرتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس عبادت میں مصروف رہتے ہیں کیونکہ اس کا چھوڑنا اپنے لئے ہلاکت سمجھتے ہیں۔

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝۲۰

''وہ (اس کی) پاکی بیان کرتے رہتے ہیں رات اور دن اور وہ اکتاتے نہیں [1]۔''

[1] کعب الاحبار فرماتے ہیں۔ مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے تسبیح ایسے ہے جیسے انسان کے لئے روح ہے۔ لا یفترون، یسبحون کی ضمیر سے حال ہے۔ یا لا یستکبرون و لا یستحسرون کی ضمیر سے حال ہے اور لا یستکبرون کا جملہ اپنے معطوف سے مل کر من عندہ سے حال ہے۔ اس تقدیر پر کہ من عندہ معطوف ہے من فی السموٰت پر اور عبارت سے مراد یہ ہے کہ ان مقربین سے دوام حضور اور ذکر خفی کا انقطاع ناممکن ہے (خواہ وہ مقربین انسانوں میں سے ہیں یا فرشتوں میں سے) جس طرح حیوان کے لئے ہوا میں سانس کا انقطاع ممکن نہیں اور سمندری حیوان کے لئے پانی سے انقطاع ممکن نہیں ہے اور جب اسے دوام حضور حاصل ہوتا ہے تو جب بھی وہ کوئی کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتا ہے، وہ خوراک کھاتا ہے پانی پیتا ہے اور آرام کرتا ہے (تو اس سے اس کا مقصود تن پروری اور جان کا سکھ نہیں ہوتا) بلکہ یہ سب امور وہ اطاعت الٰہی پر مزید قوت کے ساتھ کاربند رہنے کے لئے کرتا ہے۔ وہ نکاح کرتا ہے تو اس غرض سے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت ادا کرے' آپ کی امت میں اضافہ کرے اور آپ ﷺ کے حکم تَنَاكَحُوْا فَاِنِّيْ مُبَاهِيْ بِكُمُ الْاُمَمَ (نکاح کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا) کی پیروی میں حقوق زوجیت ادا کرتا ہے' ایسے شخص سے کبھی معصیت سرزد نہیں ہوتی کیونکہ معصیت کا صدور عموماً غفلت کی بناء پر ہوتا ہے اور اگر بتقدیر الٰہی اس سے معصیت صادر بھی ہو جائے تو وہ شرمندہ ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے اور پھر يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں کو نیکیوں میں

تبدیل فرما دیتا ہے۔ اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ عالم کا سونا بھی عبادت ہے۔ جو شخص دوام حضوری کے مرتبہ پر فائز ہوجاتا ہے تو اس پر واقعی یہ ارشاد صادق آتا ہے لا یستحسرون یسبحون اللیل والنھار لا یفترون۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

''کیا بنا لیے ہیں انہوں نے خدا (اہل) زمین سے جو مردوں کو زندہ کرسکتے ہیں [1]''

[1] ام منقطعہ بمعنی بل ہے اور استفہام انکار کے لئے ہے، یہ سابق کلام کے مضمون سے اعراض ہے کیونکہ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ اور وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اور بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ان تمام اقوال سے ان کا مقصود نبوت پر طعن کرنا تھا تو معنی ہوا کہ انہوں نے نبوت اور قرآن پر طعن نہیں کیا بلکہ انہوں نے بہت سے خدا بنا لیے ہیں۔ من الارض۔ الھۃ کی صفت ہے یا فعل کے متعلق ہے خواہ من بعضیہ ہو یا ابتدائیہ ہو، یعنی انہوں نے جواہر ارض مثلاً پتھر، سونے، چاندی یا کسی اور چیز سے خدا گھڑ لئے ہیں۔ من الارض ذکر کرنے سے مقصود ان تراشے ہوئے بتوں کی تحقیر ہے، تخصیص مقصود نہیں ہے۔ ھم ینشرون۔ یہ بھی الھۃ کی صفت ہے، یعنی جو مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اس سے مقصود کفار کی جہالت کا اظہار اور ان سے استہزاء ہے کیونکہ عبادت کا مستحق وہ ہوسکتا ہے جو مردوں کو زندہ کرنے، زندوں کو مارنے اور اپنے اطاعت شعار بندوں کو انعام واکرام سے نوازنے پر قادر ہو۔ پس جب بتوں کو الوہیت میں شریک ٹھہراتے تھے تو گویا وہ ان کے زندہ کرنے کی قدرت کا دعویٰ کرتے تھے اور یہ چیز بداہۃً باطل ہے۔ استہزاء میں مبالغہ کرنے کے لئے ضمیر زائد ذکر کی گئی ہے جو ان کے ساتھ مردوں کے زندہ کرنے کی صفت کے اختصاص کا شعور دیتی ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

''اگر ہوتے زمین وآسمان میں کوئی اور خدا سوائے اللہ تعالیٰ کے تو یہ دونوں برباد ہوجاتے [1] پس پاک ہے اللہ تعالیٰ جو عرش کا رب ہے ان تمام نازیبا باتوں سے جو وہ کرتے ہیں [2]''

[1] فیھما کی ضمیر سے مراد آسمان اور زمین ہیں اور یہاں الا بمعنی غیر الھۃ کی صفت ہے یہاں استثناء نہیں ہے کیونکہ یہاں استثناء متصل اور استثناء منفصل دونوں مشکل ہیں کیونکہ مستثنیٰ منہ قطعاً مستثنیٰ کو شامل نہیں ہے (کیونکہ مستثنیٰ منہ جمع ہے اور نکرہ ہے اور جمع جب نکرہ ہو تو محققین کے نزدیک اس سے استثناء نہیں ہوتی کیونکہ اس میں ایسا عموم نہیں ہوتا کہ اگر استثناء نہ ہوتا تو مستثنیٰ اس میں داخل ہوتا) (یہاں اگر الا کو حرف استثناء قرار دیا جائے تو معنی مراد کے خلاف ہو جائے گا اس لئے یہاں الا کو غیر کے معنی میں صفت قرار دیا گیا ہے) اور الا کے مابعد کو وہی اعراب دیا گیا ہے جو غیر کو دیا جاتا ہے جب وہ بطور استثناء استعمال ہو۔

یعنی اگر اس زمین وآسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ خدا ہوتے تو یہ زمین وآسمان برباد ہوجاتے۔ کیونکہ اگر مقصود (زمین وآسمان کے بنانے اور قائم رکھنے میں) موافقت کرتے تو تمام خداؤں کی قدرت کا تصادم لازم آتا اور اگر ایک دوسرے کی مخالفت کرتے تو یقیناً رکاوٹ پیدا ہوجاتی۔ یہ جملہ ام منقطعہ کے مفہوم کی توبیخ کے لئے علت ہے۔

[2] سبحان مصدر ہے اور اس کا فعل ہمیشہ محذوف ہوتا ہے، یعنی اسبح اللّٰہ سبحانا میں اللہ کی ہر عیب ونقص سے پاکی بیان کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ عرش عظیم کا مالک ہے جو عرش تمام اجسام کو محیط ہے اور کائنات کی تدبیر کا محل اور تقادیر عالم کا منشا اور سرچشمہ ہے اور اس

کی حیثیت عالم کبیر میں ایسی ہے جیسے انسان کے جسم میں دماغ کی ہے۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کو پاک اور مبرا بیان کرتا ہوں ان خرافات سے جو مشرک بکتے ہیں کہ اس کا کوئی شریک ہے، اس کی بیوی اور فرزند ہے (لاحول ولا قوۃ الا باللہ)

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

''نہیں پرسش کی جاسکتی اس کام کے متعلق جو وہ کرتا ہے اور ان (تمام سے) باز پرس ہوگی ۱؎''

۱؎ اس کی عظمت اور شان و شوکت اتنی بلند ہے کہ اس سے کسی کام پر پرسش نہیں ہو سکتی وہ الوھیت میں منفرد ہے اور اس کی بادشاہی اور اقتدار ذاتی ہے۔ جب بھی وہ کوئی کام کرتا ہے تو اپنی ملک میں ہی اس کا تصرف ہوتا ہے اور مالک اپنی ملک میں جیسے چاہے تصرف کرے، اس پر عقل و نقل اعتراض کی اجازت نہیں دیتے۔ باقی جو بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں ان سے ان کے افعال پر باز پرس ہو گی کیونکہ وہ جو بھی کریں گے اللہ تعالیٰ کی ملک میں تصرف ہوگا اور مالک کی اجازت اور اباحت کے بغیر تصرف جائز نہیں ہوتا۔ اس لئے ان تمام سے پوچھ گچھ ہوگی۔ ھم یسئلون کا جملہ حال ہے یا سابق کلام پر معطوف ہے اور لا یسئل کا جملہ اپنے معطوف سے مل کر سابق کلام کی علت ہے کیونکہ جو مسئول ہے وہ اس کا شریک نہیں ہو سکتا جس سے کوئی پرسش نہ ہو۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾

''کیا انہوں نے بنالئے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ۱؎ (اے حبیب) آپ (انہیں) فرمائیے پیش کرو اپنی دلیل ۲؎ یہ قرآن جو نصیحت ہے میرے ساتھ والوں کے لئے اور دوسری کتب جو نصیحت ہیں میرے پیشروؤں کے لئے (سب موجود ہیں ان کا کوئی حوالہ دو) ۳؎ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے ۴؎ اس لئے وہ (اس سے) منہ پھیرے ہوئے ہیں ۵؎''

۱؎ مشرکین کے کفر کی انتہا کو بیان کرنے، ان کا منہ بند کرنے اور ان کی نادانی اور جہالت کے اظہار کے لئے انکار و توبیخ کو دوبارہ ذکر فرمایا، یا یہ زجر و توبیخ اور انکار دوبارہ اس لئے ذکر فرمایا تا کہ ان کی عقلی دلیل کے انکار کو نقلی دلیل کے انکار کے ساتھ ملایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا وہ ایسے خدا پاتے ہیں جو مردوں کو زندگی کی نعمت عطا کرتے ہوں کہ انہوں نے ان میں خصائص الوہیت دیکھ کر انہیں خدا بنا لیا ہے یا سابقہ کتب میں اس کے شریک بنانے کا حکم پایا ہے کہ انہوں نے حکم کی پیروی میں الله بنائے ہیں۔ اس تاویل کی یہ بات تائید کرتی ہے کہ پہلی کلام پر اس حکم کو مرتب فرمایا جو عقلاً ان کے قول کے فساد پر دلالت کرتا ہے اور دوسری کلام پر اس حکم میں مرتب فرمایا جو نقلاً ان کے قول کے فساد پر دلالت کرتا ہے۔

۲؎ اس کے شریک ٹھہرانے پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرو کیونکہ کوئی قول اور دعویٰ بغیر دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتا۔ دلیل وہ کیسے پیش کر سکتے ہیں جبکہ ان کے قول کے فساد پر تمام عقلی اور نقلی دلائل متفق ہیں۔

۳؎ معی کو حفص سے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا، یعنی قرآن، تورات اور انجیل جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہیں، قیامت تک میری امت کے لئے نصیحت ہیں۔ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ سے مراد سابقہ امتوں کی نصیحت

ہے۔عطاء، ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں۔ ذکر من معی سے مراد تورات اور انجیل ہیں، یعنی اے عقل کے دشمنو! کتب سماویہ قرآن، تورات اور انجیل کی طرف رجوع کرو، کیا ان میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو شریک بنایا ہے یا بیٹا بنایا ہے(1) یا اس نے کسی غیر کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ توحید، رسول کی بعثت اور کتابوں کے نزول کی صحت پر موقوف نہیں ہے۔ اس لئے نقل کے ساتھ اس کا استدلال صحیح ہے، اگر یہ کہا جائے کہ مشرکین مکہ تو کتب سماویہ پر ایمان رکھتے ہی نہیں تھے خصوصاً قرآن کی تو ہر جگہ وہ مخالفت کرتے تھے تو پھر ان کے خلاف ایسی حجت کو پیش کرنا کیسے صحیح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کتب سماویہ خصوصاً قرآن کی صحت اس کے اعجاز کی وجہ سے بالکل واضح ہو چکی تھی تو ان کا انکار عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تھا۔ پس ان کے انکار کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کو ایک مسلمہ دستاویز بنا کر پیش کیا کیونکہ نظر انصاف میں یہ مسلمہ حقیقت تھی۔

۴؎ ایسے احمق ہیں کہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے حالانکہ حق کا نور ہر سو پھیلا ہوا ہے لیکن ان دل کے اندھوں کو اس کا نکھرا ہوا رخ تاباں نظر ہی نہیں آتا۔ یہ اس نصیحت سے اضراب ہے جو ذکر من معی کی اضافت سے مفہوم ہے۔

۵؎ اسی وجہ سے توحید اور اتباع رسول سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی بھیجی اس کی طرف کہ بلاشبہ نہیں ہے کوئی خدا بجز میرے پس میری عبادت کیا کرو۱؎''

۱؎ حفص اور حمزہ نے نوحی کو نون اور حاء کے کسرہ کے ساتھ جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول (یوحی) کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی توحید کا امر قرآن، تورات اور توحید جو ان کے ہاں موجود ہیں ان میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ ہم نے جو بھی رسول مبعوث کیا اسے توحید کی دعوت کی وحی کی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

''وہ کہتے ہیں بنالیا ہے رحمٰن نے (اپنے لئے) بیٹا سبحان اللہ (یہ کیونکر ہو سکتا ہے) بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں۱؎''

۱؎ اس کا عطف ام اتخذوا الهة من الارض کے مضمون پر ہے۔ یعنی انہوں نے اللہ کے شرکاء بنا لئے اور کہا کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں۔ یہ آیت بنوخزاعہ کے بارے نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے(2)۔ فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے، فرشتے تو اس کے مقربین ہیں اور اس کی مخلوق ہیں۔

لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

''نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہیں۱؎''

۱؎ یعنی وہ اس کی اجازت کے بغیر بات بھی نہیں کرتے۔ اصل میں یہ لا یسبق قولهم قوله واذنه تھا، یعنی ان کی بات اللہ کی بات سے سبقت نہیں کرتی۔ لیکن سبق کو ان کی ذوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور قول کو محل اور آلہ بنایا ہے اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ سبقت جس کا یہاں ثبوت ہو رہا ہے اگرچہ وہ ان کی بات کا اللہ تعالیٰ کی بات سے سبقت لے جانا ہے لیکن قیامت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریۃ)　　2۔ ایضاً

اور غلاظت میں ان کی ذ توں کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے سبقت لے جانے کے قائم مقام ہے اور اقتصار اور ضمیر کے تکرار سے بچنے کے لئے لام کو اضافت کے قائم مقام رکھا۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گزر چکا ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لئے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ (اس کی بے نیازی کے باعث) اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں [1]''

[1] جو کچھ یہ کرتے ہیں یا کریں گے وہ ہمہ دان اور ہمہ بیں جانتا ہے۔ یہ جملہ سابق کلام کی علت اور مابعد کے لئے تمہید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل کے ذریعے ان کا احاطہ کیا ہے، اس لئے اپنے نفسوں کو ضبط میں رکھتے ہیں اور اپنے حالات کی تاڑ کرتے ہیں۔ اس کی ہیبت کی وجہ سے وہ کسی کی سفارش نہیں کریں گے مگر جس کی سفارش وہ خود پسند فرمائے گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں لمن ارتضی سے مراد لا الہ الا اللّٰہ کہنے والا ہے اور مجاہد فرماتے ہیں جس سے اللہ راضی ہے(1)۔

خشیة اس خوف کو کہتے ہیں جس میں تعظیم بھی ہو۔ اسی وجہ سے خشیت کو علماء سے خاص کیا گیا ہے اور اشفاق وہ خوف ہے جس کے ساتھ اعتناء ہوتا ہے (یعنی خائف خیال کرتا ہے کہ کہیں مجھے تکلیف نہ پہنچ جائے)

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو [1]''

[1] اگر مخلوق میں سے کوئی فرد یا بفرض محال ملائکہ میں سے کوئی یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ کے سوا تو ہم اسے جہنم کا ایندھن بنائیں گے اس آیت سے مقصود کسی غیر کے رب ہونے اور فرشتوں کے رب ہونے کے دعویٰ کرنے کی نفی کرنا ہے اور جس کے متعلق مشرکین نے الوہیت کا دعویٰ کر رکھا تھا ان کو دھمکی اور وعید سنا کر مشرکین کو دھمکی دینا ہے۔ یہ آیت کریمہ بالکل اس آیت کریمہ کی طرح ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا

ترجمہ: ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کو وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلد ہی جمع کرے گا ان سب کو اپنے ہاں۔

قتادہ فرماتے ہیں اس آیت سے مراد ابلیس ہے کیونکہ اس نے اپنی عبادت کی دعوت دی تھی اور اپنی اطاعت کا حکم دیا تھا(2) وہ یا تو حقیقتاً ملائکہ سے تھا یا ان سے الحاق کی وجہ سے حکماً فرشتوں سے تھا، اس لئے فرشتوں کے ضمن میں اس کا ذکر ہوا ہے ورنہ فرشتوں میں سے اور کسی نے بھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ انی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"کیا کبھی غور نہیں کیا کفر و انکار کرنے والوں نے کہ آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کر دیا انہیں ۱؎ اور ہم نے پیدا فرمائی پانی سے ہر زندہ چیز ۲؎ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لاتے ۳؎"

۱؎ ابن کثیر نے واؤ عطف کے بغیر الم یر پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کانت نہیں فرمایا کیونکہ آسمانوں کی جماعت اور زمین کی جماعت مراد ہے۔ رتقاً کا معنی ابن عباس' ضحاک' عطاء اور قتادہ نے ایک چیز کا دوسری چیز سے ملا ہوا ہونا' چمٹا ہوا ہونا کیا ہے(1)۔ الرتق کا لغوی معنی بند کرنا اور ملانا ہے اور الفتق کا معنی پھٹنا اور کھولنا ہے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، پھر ہوا کو پیدا فرمایا۔ اسے ان کے درمیان سے گزارا اور اس کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور کھول دیا۔ مجاہد اور سدی فرماتے ہیں۔ آسمان تمام ایک طبقہ میں جڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جدا جدا کر کے سات آسمان بنا دیئے اور اسی طرح زمین بھی ایک طبقہ میں جڑی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے کھول کر سات زمینیں بنا دیں۔ عکرمہ اور عطیہ فرماتے ہیں۔ آسمان کا منہ بند تھا، زمین پر کوئی بارش نہیں ہوتی تھی اور نہ زمین پر کوئی چیز پیدا ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے آسمان کا منہ کھولا تو بارش برسنے لگی اور زمین کا منہ کھولا تو اس سے ہر قسم کی بوٹیاں اور پودے اگنے لگے(2)۔ اس تاویل اور معنی کے اعتبار سے السموٰت سے مراد آسمان دنیا ہوگا اور پھر اس کا جمع ہونا اس کے مختلف آفاق کے اعتبار سے ہے۔ یا تمام آسمان مراد ہیں اس نظریہ پر کہ بارش میں تمام آسمانوں کا دخل ہے اور یہ قول اظہر ہے کیونکہ کافر اور ہر عقل مند دیکھتا اور جانتا ہے کہ پہلے بارش نہیں ہوتی تھی پھر ہونے لگی' پہلے زمین پر نباتات نہ تھیں پھر اگنے لگیں تو گویا یہ ایک حادث امر ہے اور ہر حادث کے لئے ایک واجب الوجود محدث کا ہونا ضروری ہے۔ اس تاویل کے اعتبار سے رتق اور فتق کا معنی ظاہر ہے لیکن یہ مفہوم کہ پہلے جڑے ہوئے تھے پھر ہوا کے ذریعے ان کو علیحدہ علیحدہ کیا گیا یہ معنی کفار پر ظاہر نہیں ہے لیکن علماء سے استفسار اور کتب سماویہ کے مطالعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۲؎ وَجَعَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ کا عطف فتقناھما پر ہے، یعنی ہم نے آسمان کو پھاڑا اور اس سے پانی برسایا اور زمین کو پھاڑا اور اس سے نباتات نکالیں اور وہ پانی جس کو ہم نے آسمان سے اتارا تھا اس سے ہم نے زندہ چیز پیدا فرمائی اور ففتقناھما، کانتا پر معطوف ہے اور یہ آسمانوں اور زمین پر محمول ہے اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ الرابط محذوف ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی وجعلنا من الماء کل شیئ کائن بینھما یا یہ جملہ کلام سابق کے مضمون پر معطوف ہے کیونکہ استفہام رؤیت کی نفی کے انکار کے لئے ہے جو ثبوت رؤیت کو مستلزم ہے اور یہ رتق اور فتق کے حصول کو مستلزم ہے۔ پس تقدیر یوں ہوگی حصل فتق السموٰت والارض بعد رتقھما وجعلنا من الماء کل شیئ حیی، یعنی آسمانوں اور زمین کے جڑے ہوئے ہونے کے بعد جدائی ہمارے اذن سے ہوئی اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا فرمایا۔

اگر جعل بمعنی خلق ہو (جعل بسیط) تو ظرف اس کے متعلق ہوگی اور اگر جعل بمعنی صیر ہو (یعنی جعل مرکب ہو) تو ظرف مستقر مفعول ثانی ہوگی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریۃ)
2۔ ایضاً

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے ایسے پودے پیدا فرمائے ہیں جن میں زندگی پانی کی وجہ سے ہے اوران کا پانی سے ہونا بالکل ظاہر ہے کیونکہ وہ پانی حیوان کے نطفہ کے قائم مقام ہے۔ اسی طرح بعض حیوانات جیسے کیڑے مکوڑے ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے رطوبات سے پیدا کیا لیکن اکثر حیوانات جن کو اللہ تعالیٰ نے نطفہ سے پیدا فرمایا ہے۔ ان کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بارش کے پانی سے پیدا فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب پانی حیوان کی بقاء کے لئے ایک عظیم عنصر اور مواد ہے اور اس کی ہر حیوان کو شدید ضرورت ہے اور ہر حیوان اس سے نفع اٹھاتا ہے تو گویا اس کی تخلیق بھی اسی سے ہوئی ہے پس مجازاً یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقنا من الماء کل شیٔ حیی اور صیرناہ منہ یعنی ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے تخلیق کیا ہے جیسے کہا گیا ہے خلق الانسان من عجل (چونکہ انسان ہر کام کی طرف جلدی کرتا ہے) اس لئے مجازاً کہا گیا ہے کہ انسان جلدی اور عجلت کے خمیر سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں مضاف مقدر ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو وجعلنا من الماء بقاء کل شیٔ حیی یعنی ہر زندہ کی بقاء ہم نے پانی کے ساتھ کر دی ہے، یعنی ہر زندہ چیز بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اکثر مفسرین اور ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر زندہ چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے(1)۔ امام احمد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے(2) میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ نطفہ سے پیدا کی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ترجمہ (اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے) اور یہاں اس تاویل پر شی سے مراد حیوان ہے اور کل سے مراد اکثر ہے جیسا کہ اس ارشاد نبوی میں ہے كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے باز پرس ہوگی اور یہ بھی جائز ہے کہ الماء سے مراد مطلق پانی ہو۔ جو حیوان کے نطفہ اور رطوبت جس سے حشرات و نباتات پیدا ہوتے ہیں سب کو شامل ہو۔ واللہ اعلم۔

ع استفہام انکاری ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے۔ یعنی ان قطعی دلائل کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے جو صانع کے واجب الوجود ہونے صفات کمالیہ سے متصف ہونے اور ذات وصفات میں یکتا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾

''اور ہم نے بنا دیئے زمین میں بڑے بڑے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے ان کے ساتھ اور بنا دیں ہم نے ان پہاڑوں میں کشادہ راہیں تاکہ وہ (اپنی منزل مقصود کا) راستہ پا سکیں ۱؎''

۱؎ رواسی کا مطلب ثوابت ہے اور یہ رسا سے مشتق ہے جس کا معنی ثابت ہونا ہے اور مراد پہاڑ ہیں (کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ پر ثابت ہوتے ہیں) ان تمید بھم مضاف کی تقدیر کے ساتھ یا لام علت اور لا نافیہ کے ساتھ مفعول لہ ہے اور التباس سے امن کی وجہ سے لام علت اور لا نافیہ کو حذف کیا گیا ہے۔ فیھا کی ضمیر کا مرجع الارض ہے یا رواسی ہے فجاجا جمع ہے فج کی اور اس سے مراد دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ راستہ ہے۔ قاموس میں اسی طرح اس کا معنی لکھا ہے(3)۔ سبلاً سبیل کی جمع ہے جس کا معنی واضح راستہ ہے(4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریہ) 2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 323 (صادر)

3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 310 (التراث العربی) 4۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1338 (التراث العربی)

فجاجاً کو مقدم کیا گیا ہے حالانکہ وہ سبل کی صفت ہے تاکہ وہ سبلا سے حال بن سکے اور اس بات پر دلالت کرے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا ہے وہ اسی طرح کشادہ ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فجاجاً مفعول ہو اور سبلاً اس سے بدل ہو تا کہ ضمناً دلالت کرے کہ اس نے انہیں تخلیق کیا اور مسافروں کے لئے کشادہ تخلیق کیا ہے، بدل کی صورت میں اس میں تاکید بھی ہو گی۔ لعلھم یھتدون یعنی اپنے مقاصد و مصالح کو پالیں۔

وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اور ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو (شکست وریخت) سے محفوظ ہے اور وہ لوگ (اب بھی) اس کی نشانیوں سے روگردانی کئے ہوئے ہیں 1۔''

1۔ یعنی آسمان کو ایسی چھت بنایا جو اس کی قدرت کاملہ سے بغیر ستونوں کے محفوظ ہے یا اس کی مشیئت سے وقت معلوم تک گرنے اور فساد سے محفوظ ہے یا شہابوں کی وجہ سے شیطانوں کی چوری چھپے آسمانی گفتگو سننے سے محفوظ ہے لیکن یہ لوگ آسمان کے احوال اور اس میں جو چاند، سورج اور ستارے جو اللہ کی وحدت، کمال قدرت اور حکمت بالغہ کی بین دلائل ہیں ان میں غور وفکر نہیں کرتے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اور وہی ہے جس نے پیدا فرمایا لیل ونہار کو اور مہر و ماہ کو سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں 1۔''

1۔ اس آیت میں قدرت کی بعض نشانیوں کا بیان ہے۔ فلک سے مراد ستاروں کا مدار ہے (1) اور کلام عرب میں ہر گولائی مائل چیز کو فلک کہتے ہیں، اس کی جمع افلاک ہے اسی سے فلک المغزل ہے (چرخہ کا دمڑکہ) حضرت حسن فرماتے ہیں فلک چرخہ کے دمڑکہ کی طرح ایک چکی ہے، یعنی جس فلک میں ستارے چلتے ہیں وہ چکی کے پڑ کی طرح گول ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں فلک سے مراد وہ آسمان ہے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں اور ہر ستارہ اس آسمان میں چلتا ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ کلبی فرماتے ہیں الفلک سے مراد آسمان کی گولائی ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں فلک ایک موج کا نام ہے جسے اس کے طبقہ میں روک دیا گیا ہے اور وہ آسمان کے نیچے ہے، شمس وقمر اور ستارے اس میں چلتے ہیں (3)۔ میں کہتا ہوں۔ صحیح یہ ہے کہ فلک سے مراد آسمان ہے اور اس پر تنوین اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک افلاک میں سے ایک فلک میں ہے اور وہ آسمان دنیا ہے اگرچہ کواکب کا مدار مختلف افلاک پر ہے۔ الفلک سے مراد جنس ہے جیسے عرب کہتے ہیں کساھم الامیر حلۃ (بادشاہ نے سب کو ایک ایک جوڑا پہنایا) تو اسی طرح فلک سے مراد بھی یہ ہے کہ ہر ایک سیارہ اپنے اپنے فلک میں گھومتا ہے۔ یسبحون کی ضمیر کا مرجع شمس وقمر ہیں لیکن ان کے مطالع کے اعتبار سے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا اور ایسا صیغہ استعمال فرمایا جو عقلاء کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ سباحت حقیقت میں عقلاء کا فعل ہے واللہ اعلم۔

ابن المنذر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے وصال کی خبر دی گئی تو آپ نے عرض کی یا رب مَنْ لِاُمَّتِیْ یارب میری امت کے لئے اب کون ہوگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا (4)۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1259 (التراث العربی)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 238 (التجاریہ)
3۔ ایضاً　　4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 572 (العلمیہ)

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۞

''اور نہیں مقدر کیا ہم نے کسی انسان کے لئے جو آپ سے پہلے گزرا (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا تو اگر آپ انتقال فرما جائیں تو کیا یہ لوگ (یہاں) ہمیشہ رہنے والے ہیں لے''

لے خلد کا معنی ہیشگی اور دنیا میں بقائے ودوام ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا ہم محمد (ﷺ) پر گردش زمانہ کا انتظار کرتے ہیں، ایک نہ ایک دن ان کی زندگی کا چراغ گل ہو ہی جائے گا(1)۔ فاء ماقبل کے ساتھ شرط کا تعلق جوڑنے کے لئے ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے اس معنی کے ثبوت کے بعد (کہ اگر آپ انتقال فرما جائیں گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے) اور یہ جملہ یعنی افان مت الخ ما جعلنا لبشر الخ کے جملہ کے مضمون پر معطوف ہے، یعنی یہ حقیقت ہے کہ آپ ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں پس اگر آپ کا وصال ہوگا تو کیا یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَیْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ۞

''ہر نفس موت (کا مزہ) چکھنے والا ہے اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے لے اور (آخر کار) تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ آنا ہے ۲ے''

لے یعنی بدن سے روح کی جدائی کا کڑوا ذائقہ ہر ذی روح نے چکھنا ہے۔ یہ جملہ وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد کے جملہ کے ثبوت کے لئے ہے۔ شر اور خیر سے مراد سختی، نرمی، صحت، بیماری، غنی، فقر اور ہر وہ چیز جسے انسان پسند کرتا ہے یا ناپسند کرتا ہے۔ فتنہ کا معنی آزمائش ہے اور یہ نبلوکم کا مفعول مطلق ہے، یعنی ہم تمہیں آزمائش میں ڈالیں گے خوشحالی اور تنگ دستی کے ساتھ تا کہ ظاہر ہو جائے کہ نعمتوں کے ملنے کے بعد تم شکر کرتے ہو یا نافرمانی کرتے ہو اور غیر پسندیدہ حالات پر تم صبر کرتے ہو یا شکوی کی زبان کھولتے ہو۔ یعنی ہم تمہارے ساتھ آزمائش کرنے والے کی طرح کا معاملہ کریں گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تو پہلے ہی ہے کہ انسان نے کیا کرنا ہے)

۲ے پھر تم نے ہماری بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور ہم تمہیں اپنے اعمال کے مطابق جزاء اور سزا دیں گے۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ یہ قیامت کا برپا کرنا ابتلاء اور ثواب وعقاب عطا کرنے کے لئے ہے۔

ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابوجہل اور ابوسفیان کے پاس سے گزرے، جبکہ وہ باہم محو گفتگو تھے۔ جب ابوجہل نے آپ ﷺ کو دیکھا تو ہنس پڑا اور ابوسفیان کہنے لگا۔ دیکھو یہ بنی عبد مناف سے نبی ہے ابوسفیان کو غصہ آ گیا اور کہا تم بنی عبد مناف کا نبی ہونے کو ناپسند کرتے ہو۔ نبی کریم ﷺ نے یہ ساری گفتگو سن لی اور ابوجہل کی طرف متوجہ ہوئے تو اس پر خوف طاری ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا شاید تو اپنی بدزبانی سے نہیں رکے گا یہاں تک کہ تجھ پر بھی ایسی ہی آفت آن پڑے جو تیرے چچا پر پڑی تھی، اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی(2)۔

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۞

''اور جب دیکھتے ہیں آپ کو وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے تو آپ سے بس تمسخر کرنے لگتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہی وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 238 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 573 (العلمیہ)

صاحب ہیں جو (برائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں تمہارے خداؤں کا ۱؎ حالانکہ وہ (کفار) رحمٰن کے ذکر سے خود (یکسر) انکاری ہیں ۲؎ ''

۱؎ ھزوا مصدر ہے اور یہ مھزوا بہ کے معنی میں ہے۔ اھذا یذکر الھتکم ان یتخذونک الا ھزوا کا بیان ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح بنے گی یقولون اھذا الذی یذکر الھتکم بسوء۔ قرآن میں مطلق ذکر کرنے کو بیان فرمایا بسوء ذکر نہیں کیا کیونکہ دلالت حال سے یہ چیز عیاں ہے کیونکہ دشمن کا ذکر خیر سے نہیں، برائی سے ہی کیا جاتا ہے اور محبوب کا ذکر ہمیشہ خیر سے کیا جاتا ہے۔

۲؎ ذکر الرحمن سے مراد توحید باری تعالیٰ یا تعظیم الٰہی ہے یا رسول مبعوث فرما کر مخلوق کو رہنمائی کرنا ہے یا کتابوں کا نازل کرنا ہے یا قرآن حکیم ہے۔ یعنی وہ بد بخت اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور توحید کے منکر ہیں یا جو اس کریم نے اپنی رحمت و کرم نوازی سے مخلوق کی رہنمائی کے لئے رسولوں کا سلسلہ شروع فرمایا یا کتابوں کو نازل فرمایا یا قرآن جیسی پاکیزہ کتاب عطا فرمائی۔ ان تمام نعمتوں کے وہ منکر ہیں۔ وہ نادان کہتے ہیں لا رحمن الا رحمن الیمامہ یعنی رحمٰن یمامہ کے سوا کوئی رحمٰن نہیں ہے، اس سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب ہوتا تھا۔ پس یہ زیادہ حق دار ہیں کہ ان کا استہزاء کیا جائے جو اپنے مالک و خالق کی نعمتوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ ھم ضمیر کا تکرار تاکید یا تخصیص کے لئے ہے یا مبتدا اور خبر کے درمیان خبر کے معمول کے فاصلہ کے وقوع کی وجہ سے ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝

''انسان کی سرشت میں ہی جلد بازی ہے ۱؎ میں عنقریب تمہیں (خود ہی) اپنی نشانیاں دکھاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو ۲؎ ''

۱؎ جب کسی شخص میں کثرت سے کوئی وصف پایا جائے تو عرب کہتے ہیں خلق منہ۔ وہ اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں خلقت من تعب۔ خلقت من غضب و خلق فلان من الکرم (یعنی تیری طبیعت میں اکتاہٹ ہے؟ تیری سرشت میں غصہ ہے، کرم و سخاوت اس کی فطرت ہے) مبالغہ کے لئے طبع کو مطبوع کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

سعید بن جبیر اور سدی کہتے ہیں جب آدم علیہ السلام کے سر اور آنکھوں میں روح داخل ہوئی تو آپ نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا پھر جب روح پیٹ میں پہنچی تو آپ کو کھانے کا شوق ہوا۔ آپ نے جنت کے پھلوں کی طرف جلدی کی حالانکہ ابھی تک روح ٹانگوں میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی، اسی وجہ سے گر گئے۔ اسی وجہ سے کہا گیا خلق الانسان من عجل۔ یہاں انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ آپ کی اولاد میں عجلت موروثی ہے جو آپ کی طرف سے ورثہ میں ملی ہے (1)۔ انسان اسی وجہ سے کفر کی طرف لپکتا ہے اور جلدی عذاب کا مطالبہ کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں صوفیاء کے قول کے مطابق تفسیر ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام عالم اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا پرتو اور عکس ہے اور تمام مخلوقات کے تعینات کا مبدء اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات مختلف ہیں۔ جیسا کہ الصبور (بہت زیادہ صبر کرنے والے) اس کے اسماء حسنیٰ سے ہے۔ اسی طرح سریع الحساب (جلدی حساب لینے والا ہے) بھی اس کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ پس استعجال جو اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے اور یہ انسان کی صفت عجلت کا یہی مبدء تعین ہے۔ اس وجہ سے انسان کی سرشت اور فطرت میں عجلت ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 238 (التجاریہ)

اگر یہ کہا جائے کہ جلد بازی اللہ کی صفات سے ہے تو پھر یہ محمود اور اچھی چیز ہوگی لیکن آیت کریمہ کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مذموم چیز ہے۔ دوسرا یہ کہ جب عجلت انسان کی فطرت کا حصہ ہے تو پھر اسے اس سے روکا کیوں جاتا ہے کیونکہ تبچر اور فطرت کا ترک انسان کی قدرت میں ہی نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی عجلت کوئی مذموم اور قبیح چیز نہیں ہے بلکہ اس میں افراط اور بے موقع عجلت ناپسندیدہ اور مذموم ہے جیسا کہ قرآن نے انبیاء کرام کی اسی صفت پر مدح و تعریف کی ہے کہ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وہ نیکیوں کے حصول میں جلدی کرتے ہیں۔ پس اس کا ممنوع پہلو افراط ہے اور بے موقع عجلت ہے اور اس کو ترک کرنا انسان کے بس میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جلدی سے تخلیق کیا کیونکہ اس کی تخلیق جمعہ کے دن ہر چیز کے بعد فرمائی اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے اس کی تخلیق کو جلدی جلدی مکمل فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے روح کو اس کے سر میں پھونکا تو آدم علیہ السلام نے عرض کی یارب سورج کے غروب ہونے سے پہلے میری تخلیق جلدی جلدی مکمل فرما دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جلدی میں پیدا کیا گیا۔ ایسا نہیں کہ دوسرے انسانوں کی طرح ترتیب وار پہلے نطفہ' پھر علقہ' پھر مضغہ بنا کر پیدا کیا گیا ہو۔ ایک قوم کا خیال ہے، کہ عجل کا معنی مٹی ہے یعنی انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے(1) جیسا کہ ایک شاعر نے عجل بمعنی گیلی مٹی استعمال کیا ہے۔

وَالنَّبْعُ فِي الصَّخْرَةِ الصَّمَّاءِ مُنْبَتَةٌ	وَالنَّخْلُ تَنْبُتُ مِنَ الْمَاءِ وَالْعَجَلِ (2)
نبع چٹانوں اور پتھروں میں اگتا ہے	جبکہ کھجور پانی اور مٹی سے اگتی ہے

قاموس میں بھی العجل کا معنی مٹی لکھا ہوا ہے(3)۔ یہ جملہ ان کے قول متی ھذا الوعد (قیامت کب آئے گی) پر اعتراض اور طعن کی تمہید ہے۔

لے میں بدر کے موقع پر اپنی قدرت کی نشانیاں (انتقامی کارروائی) دکھاؤں گا اور آخرت میں دوزخ کے عذاب کا مشاہدہ کراؤں گا' مقررہ وقت سے پہلے اس کے آنے کا مطالبہ نہ کرو۔ فلا تستعجلون پر فاء سببیہ ہے اور ساوریکم پر معطوف ہے۔ یہ دوسرا جملہ معترضہ ہے جو ان مشرکین کے عذاب کو بعید سمجھنے اور مذاحاً جلدی طلب کرنے کے رد میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بدبخت کہتے فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ۔ ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں یہ نضر بن الحارث کے حق میں نازل ہوئی جب اس نے جلدی عذاب کو طلب کیا تھا۔

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾

''اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ (قیامت کا) وعدہ؟ (بتاؤ نا) اگر تم سچے ہو لے''

لے یہ جملہ اذ راک الذین کفروا الخ کے جملہ شرطیہ پر معطوف ہے یا یقولون پر معطوف ہے جو اھذا الذی یذکر الھتکم سے پہلے مقدر ہے۔ ان کنتم صادقین شرط ہے اور اس کی جزاء سابقہ کلام کی دلالت کی وجہ سے ذکر نہیں کی گئی۔

لَوْ یَعْلَمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا حِیْنَ لَا یَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 239 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1360 (التراث العربی)

''کاش جانتے کفار (اس وقت کو) جب وہ نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ (کے شعلوں) کو اور نہ اپنی پشتوں سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ۱ ''

۱ لو کا جواب محذوف ہے اور حین' یعلم کا مفعول بہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کاش کافر اس وقت کو جانتے جب آگ کا عذاب ہر طرف سے انہیں گھیر لے گا اور وہ اس سے دفاع کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں گے اور کوئی دوسرا بھی ان کو اس عذاب سے بچانے کے لئے مدد نہیں کرے گا کیونکہ وہ کفر پر اڑے رہے تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں۔ یعلم کا مفعول متروک ہے اور حین فعل مقدر کی ظرف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لو کان لهم علم لما استعجلوا یعلمون ماهم علیه حین لا یکفون۔ اگر ان (نادانوں کو) علم ہوتا تو عذاب کا جلدی مطالبہ نہ کرتے اور اپنے عقیدہ کے بطلان کو جان لیں گے جب نہ روک سکیں گے آگ کے عذاب کو۔ اس صورت میں یہ دو جملے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یعلم کا مفعول مقدر ہو یا حین فعل مقدر کی ظرف ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو لو یعلم الذین کفروا ما ینزل بهم حین لا یکفون عن وجوههم النار یعنی اگر کافر جان لیتے کہ ان پر عذاب نازل ہوگا اور یہ اس سے اپنا دفاع بھی نہ کر سکیں گے تو یہ عذاب کی جلدی نہ مچاتے اور یہ نہ کہتے کہ قیامت کب آئے گی۔

بَلْ تَأْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝

''بلکہ وہ آئے گی ان کے پاس ناگہاں سو انہیں بدحواس کر دے گی پھر وہ نہ اسے رد کر سکیں گے اور نہ ہی انہیں مزید مہلت دی جائے گی ۱ ''

۱ تاتی میں ضمیر کا مرجع آگ' یا وعدہ یا الحین ہے۔ مونث کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا کہ الوعد بمعنی العدة ہے اور الحین بمعنی الساعة ہے اور یہ جملہ متی هذا الوعد کے جملہ کے ضمن میں جو استبعاد ہے اس سے اضراب ہے یا لو یعلم الذین کفروا کے جملہ کے مضمون سے اضراب ہے۔ بغتة کا معنی فجئة (اچانک) ہے اور یہ مصدریت یا حال کی بناء پر مفعول ہے، یعنی دنیا میں انہیں مہلت دی گئی ہے لیکن آخرت میں انہیں کوئی مہلت نہیں دی جائے گی۔ ولاهم ینصرون اور ولاهم ینظرون میں مسند الیہ کو مسند پر مقدم کیا گیا ہے تاکہ اس حکم کے کفار کے ساتھ خاص ہونے پر دلیل ہو جائے اور یہ بھی اس میں شعور ملتا ہے کہ گناہگار مومنین کی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام' ملائکہ اور نیک صالح لوگ شفیع بن کر مدد کریں گے، ان کو مہلت بھی ہوگی اور ان کی بخشش بھی ہو جائے گی۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

''اور بیشک مذاق اڑایا گیا ان رسولوں کا بھی جو آپ سے پہلے تشریف لائے تھے پس نازل ہوا ان لوگوں پر جو تمسخر کیا کرتے تھے ان میں سے وہ عذاب جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۱ ''

۱ اس کلام کا عطف واذا راک الذین کفروا الخ پر ہے اور لام محذوف قسم کا جواب ہے نیز اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور دین اور داعی دین سے تمسخر کرنے والوں کو وعید سنائی گئی ہے۔ جو لوگ استہزاء کرتے ہیں انہیں اس استہزاء کی جزاء ضرور ملے گی۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۭ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾

”آپ پوچھئے (اے منکرو!) کون ہے جو نگہبانی کرسکتا ہے تمہاری رات بھر اور دن بھر خدائے رحمٰن سے (اگر وہ تمہیں عذاب دینا چاہے) مگر (ان سے کیا پوچھنا) یہ تو اپنے رب کے ذکر سے ہی روگرداں ہیں 1 “

1 اس ارشاد میں سوال کے حکم سے اضراب ہے، یعنی اے پیارے حبیب انہیں رحمٰن کی یاد دلایئے اور اس کے عذاب سے انہیں ڈرایئے پھر فرمایا ان سے سوال کیا کرنا ہے؟ یہ تو قرآن کی اثر آفریں آیات اور اللہ تعالیٰ کے مواعظ ونصائح سے بالکل غافل ہیں، انہیں تمہارا وعظ ونصیحت کرنا کچھ مفید نہیں ہوگا یا یہ معنی کہ یہ عقل کے پجاری بلکہ عقل کے دشمن رحمٰن کو خاطر میں ہی نہیں لاتے چہ جائیکہ یہ اس کے عذاب سے ڈریں۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

”کیا ان کے اور خدا ہیں جو بچا سکتے ہیں انہیں (عذاب سے) ہمارے سوا وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ انہیں ہماری تائید میسر ہوگی 1 “

1 تمنعهم' الهة کی صفت اول ہے اور من دوننا صفت ثانی ہے یا حال ہے، یہ بھی سوال کے امر سے اضراب ہے کیونکہ اعراض کرنے والے سے سوال بعید ہے اور اس کے غلط عقیدہ کی وجہ سے سوال کرنا مزید عجیب ہے۔ استفہام یہاں ان کے عقائد کے انکار کے لئے ہے۔ یعنی جس طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بت عذاب سے بچالیں گے یہ درست نہیں ہے یہ تو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے، ان سے اگر ایک مکھی بھی کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اس سے وہ حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ لا يستطيعون کا جملہ انکار کی تعلیل ہے۔ ولاهم منا يصحبون کا عطف لا يستطيعون پر ہے، یعنی ان کافروں کے تراشے ہوئے بتوں کو ہماری کوئی تائید اور نصرت حاصل نہ ہوگی جیسا کہ انبیاء ملائکہ اور اولیاء کرام جو گنہگار مومنین کی شفاعت کریں گے انہیں تائید الٰہی اور نصرت ربانی حاصل ہوگی۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ وہ ہم سے محفوظ نہ ہوں گے (1)۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب ان کے جھوٹے خداؤں پر ہی ہوگا۔ اسی طرح قرآن حکیم کی دوسری آیت ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ عطیہ فرماتے ہیں يصحبون کا معنی یہ ہے کہ وہ ہمارے پڑوس میں نہ ہوگا۔ مجاہد فرماتے ہیں ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ قتادہ فرماتے ہیں انہیں شفاعت اور کسی کو مدد کرنے کی اجازت کے ساتھ تائید نہیں ملے گی (2)۔ یہ معنی پہلے معنی کے مطابق ہے اور تیسرا اور چوتھا معنی دوسرے معنی کے مطابق ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

”بلکہ ہم نے (عیش وآرام کا) سامان دیا انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو حتی کہ (اسی عیش وآرام میں) ان پر لمبا عرصہ گزر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 239 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

گیا (اور وہ سرکش ہو گئے) ا۔ کیا ۲۔ وہ ملاحظہ نہیں کر رہے کہ ہم زمین (کی وسعتوں) کو گھٹاتے چلے جار ہے ہیں اس کی (چاروں) سمتوں سے کیا وہ (ہماری تقدیر پر) غالب آ سکتے ہیں ۳۔"

ا۔ اس آیت کریمہ میں ان کے اس غلط نظریہ سے اضراب ہے کہ ہمارے بت ہمارے محافظ ہیں اور ان کو اس اپنی حفاظت کا تصور اس بناء پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب الیم تک آہستہ آہستہ پہنچانے کے لئے انہیں مہلت دی تھی اور ان کو عمر کے ایک مخصوص وقت میں نعمتوں سے لطف اندوز کیا تھا۔ نیز یہ اعراض ہے ان کے اس عقیدہ کے بطلان سے کہ ہمیں جو اللہ تعالیٰ نے یہ عزت و ناموری عطاء فرمائی ہے یہ ہمارے ذاتی کمال کی بناء پر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں غرق کرنے کے لئے مہلت دی تھی لیکن وہ یہ خیال کرنے لگے کہ یہ نعمتیں اور سکون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے آیت کا آئندہ حصہ اس کی تائید کرتا ہے کہ یہ ان کی جھوٹی امیدیں ہیں۔

۲۔ ہمزہ انکاری ہے اور فا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیری عبارت اس طرح ہوگی الا ینظرون فلا یرون بالابصار۔ یا یہ تقدیر ہوگی الا یتفکرون فلا یعلمون۔

۳۔ الارض سے مراد کفار کی زمین ہے، یعنی ہم ان کی زمین پر مسلمانوں کو تسلط اور غلبہ دے رہے ہیں، کیا اب بھی یہ لوگ اللہ کے رسول اور مومنین پر غالب آئیں گے افھم میں بھی ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء ناتی پر عطف کے لئے ہے، یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ مشرک رسول اللہ اور مومنین پر غالب آ جائیں۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْیِ ۖ٘ وَ لَا یَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا یُنْذَرُوْنَ۝

"آپ فرمایئے میں تمہیں ڈراتا ہوں صرف وحی سے ا۔ اور نہیں سنا کرتے بہرے پکارنے کو ۲۔ جب انہیں (عذاب الٰہی سے) ڈرایا جاتا ہے ۳۔"

ا۔ یہ جملہ ان کو جلدی عذاب طلب کرنے کی نہی اور اس کو بعید نہ سمجھنے کے ثبوت کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب کی دھمکی میں تمہیں اپنی طرف سے نہیں دے رہا بلکہ یہ علیم وخبیر ذات کی طرف سے ہے جو مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے وہی تمہیں سناتا ہوں اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی اخبار میں تخلف اور کذب کا احتمال نہیں ہے، اس لئے اس عذاب کو بعید نہ سمجھو اور اس کے لئے جلدی نہ مچاؤ۔

۲۔ ابن عامر نے باب افعال سے لا تسمع مخاطب معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور الصم کو منصوب پڑھا ہے اور یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، جبکہ باقی قراء نے فعل مجرد سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور الصم کو نائب فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ یہ جملہ قل کے فاعل سے یا محذوف سے حال ہے۔ الصم پر لام عہدی ہے، یعنی آپ استہزاء کرنے والے اور جلدی عذاب طلب کرنے والے کفار سے کہہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ضمیر کی جگہ الصم استعمال فرمایا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ لوگ حق کی آواز سننے اور اس سے نفع حاصل کرنے میں بالکل بہرے ہیں۔

۳۔ اذا ما الخ سمیع کی ظرف ہے یا الدعاء کی ظرف ہے اور یہ قید اس لئے لگائی ہے کیونکہ کلام اس انداز میں ہو رہی تھی۔ دوسری وجہ اس تقلید کی ان کے بہرے پن اور ان کے اکھڑ پن میں مبالغہ کا اظہار ہے۔

وَ لَىٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَیَقُوْلُنَّ یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا

ظٰلِمِیْنَ ﴿۴۶﴾

''اور اگر (صرف) چھو جائے انہیں ایک جھونکا تیرے رب کے عذاب کا تو (سارا نشہ ہرن ہو جائے) یوں کہنے لگیں صد حیف! بیشک ہم ہی ظالم تھے [1]''

[1] یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ حضرت ابن عباس نے نفحۃ کا معنی طرف فرمایا ہے، یعنی پلک جھپکنے کی دیر۔ اور بعض فرماتے ہیں قلیل ابن جریج نے اس کا معنی نصیب کیا ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں نفخ فلان لفلان من ماله یعنی فلاں نے فلاں کو اپنے مال سے حصہ عطاء کیا۔ بعض نے نفخہ کا معنی ضربۃ کیا ہے اور اس صورت میں یہ نفحت الدابة برجلها(۱) (چوپائے نے پاؤں مارا) النفح کا اصل معنی پاکیزہ خوشبو کا مہکنا ہے۔ اس میں کئی اعتبار سے مبالغہ ہے۔ جس کا ذکر فرمایا اور پھر نفحة ذکر فرمایا جس میں قلت کا معنیٰ ہے اور فعلة کا وزن استعمال فرمایا جو وحدت پر دلالت کرتا ہے۔

یعنی اگر ایک لحہ کے لئے بھی اللہ کا ان پر عذاب آ جائے تو یہ خود ہی اپنی زبانوں سے اعتراف جرم کرنے لگیں اور اپنے شرکیہ کرتوتوں پر اظہار ندامت کرنے لگیں لیکن جب ایسا ہوگا تو اس وقت ندامت سے کف افسوس ملنا اور آنسو بہانا کچھ مفید نہ ہوگا۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِیْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہم رکھ دیں گے صحیح تولنے والے ترازو قیامت کے دن [1] پس ظلم نہ کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے [2] اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے [3]''

[1] قسط یا تو ذوات القسط کے مفہوم میں ہو کر صفت ہے یا مصدر ہے اور مبالغہ کے لئے بطور صفت استعمال ہوا ہے اور موصوف کے جمع اور صفت کے مفرد ہونے کا اشکال پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مصدر ہے اور مصدر جب صفت واقع ہو تو واحد، جمع سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ہم میزان رکھیں گے قیامت کے روز جزاء دینے کے لئے یا قیامت کے دن حاضر لوگوں کے لئے یا لام اس میں فی کے معنی میں توقیت کے لئے ہے جیسے اس مثال میں ہے جِئْتُ لِخَمْسٍ خَلَوْنَ مِنَ الشَّهْرِ (اس مثال میں لام وقت کے لئے استعمال ہوا ہے) اور معنی کے اعتبار سے تعلیل کے لئے ہے اور مضاف محذوف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ میزان رکھنا بطور تمثیل استعمال ہوا ہے، حقیقتاً کوئی ترازو اور میزان نہ ہوگا یہ صرف حساب کے درست ہونے اور اعمال کے مطابق جزاء ملنے کے لئے مجازاً استعمال ہوا ہے۔ اہل سنت و جماعت کے علماء کے نزدیک یہ تاویل قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بدعتی لوگوں کا قول ہے۔ صحیح یہ ہے کہ میزان ہوگا اور حقیقی معنی میں ہوگا۔

ابن المبارک نے الزہد میں، الاجری نے الشریعہ میں حضرت سلمان سے موقوفاً اور ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں کلبی کے طریق سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان (سوئی) اور دو پلڑے ہیں۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی مثل میزان کے دو پلڑے بنائے ہیں۔ بیہقی نے ابن عمر عن عمر بن خطاب کے سلسلہ سے حدیث جبریل نقل کی ہے کہ جبریل نے ایمان کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ، ملائکہ، رسل پر ایمان لائے اور جنت، دوزخ اور میزان پر ایمان لائے اور مرنے کے بعد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 240 (التجاریہ)

اٹھنے اور خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لائے۔ پوچھا حضور اگر میں ایسا کروں تو میں مومن ہوں گا۔ فرمایا ہاں۔ پھر جبریل نے خود ہی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے سچ فرمایا(1)۔

حاکم نے المستدرک میں مسلم کی شرط پر سلمان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز میزان رکھا جائے گا اور اگر اس میں آسمانوں اور زمینوں کا وزن کیا جائے تو بھی اس میں گنجائش ہے (2)۔ امام ترمذی اور بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی حضور! قیامت کے دن میری شفاعت فرمانا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں شفاعت کروں گا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ فرمایا سب سے پہلے تو مجھے پل صراط پر تلاش کرنا۔ میں نے عرض کی حضور! اگر آپ وہاں نہ ملے تو پھر۔ فرمایا اگر میں پل صراط پر نہ ملوں تو پھر مجھے میزان کے پاس تلاش کرنا۔ میں نے عرض کی حضور اگر آپ وہاں بھی نہ ملیں تو پھر۔ فرمایا پھر مجھے حوض کوثر پر تلاش کرنا۔ میں ان تین مقامات میں سے کسی ایک پر ضرور ہوں گا(3)۔

الحاکم، بیہقی اور آجری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ کیا تم لوگ قیامت کے روز اپنے اہل کو یاد کرو گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تین مقامات پر کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا(4)۔

(i) جہاں میزان رکھا ہوگا حتیٰ کہ انسان اپنے میزان کا بھاری ہونا یا ہلکا ہونا دیکھ نہ لے۔

(ii) جہاں نامہ اعمال اڑ رہے ہوں گے حتیٰ کہ انسان جان لے کہ اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں آتا ہے یا بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے۔

(iii) جہاں پل صراط ہوگا حتیٰ کہ انسان جان لے گا کہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ میزان کے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں بعض ہم نے سورۃ القارعہ میں فمن ثقلت کی تفسیر میں ذکر کی ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے میزان دکھانے کے متعلق سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر پلڑا شرق و مغرب کے درمیان دکھایا تو داؤد علیہ السلام پر غشی طاری ہوگئی۔ پھر جب افاقہ ہوا تو عرض کی الٰہی! کون اس ترازو کو نیکیوں سے بھر سکے گا۔ فرمایا اے داؤد جب میں اپنے کسی بندے پر راضی ہوں گا تو میں اسے ایک چھوارے سے بھر دوں گا۔ (5)

یہاں موازین کو جمع ذکر فرمایا ہے۔ علامہ نسفی بحرالکلام میں اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ 1۔ ہر انسان کے لئے علیحدہ میزان ہوگا۔ 2۔ یا جمع ذکر فرمایا ہے لیکن مراد واحد ہے اور یہ میزان کی عظمت اور بڑائی پر دلالت کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ یہاں ملائکہ جمع ذکر فرمایا ہے لیکن مراد صرف جبریل ہیں، اسی طرح فرمایا یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ یہاں رسل جمع ذکر فرمایا ہے لیکن مراد صرف محمد ﷺ کی ذات اقدس واطہر ہے۔ 3۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میزان کے ہر جز کو میزان شمار کرتے ہوئے مجموعہ پر جمع کا اطلاق فرما دیا۔ جیسے سراویل (سلوار) سروالۃ کی جمع ہے، اس میں بھی ہر جزء کا اعتبار کر کے مجموعے پر جمع کا اطلاق کیا گیا ہے۔

ع یعنی بغیر کسی سبب کے نیکیوں میں کمی نہیں کی جائے گی اور بغیر کسی سبب برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ مثقال مصدر میمی ہے۔ نافع نے مثقال کو کان کا فاعل بناتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے اور کان کو تامہ بنایا ہے اور باقی قراء نے کان کو ناقصہ بناتے ہوئے مثقال کو خبر کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے اور کان کا اسم ضمیر کو بنایا ہے جو اس عمل کی طرف راجع ہے جو موازین سے مفہوم ہے۔ ان کان

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 257 (العلمیہ) 2۔ متدرک حاکم: 8739 (العلمیہ) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 66 (وزارت تعلیم)
4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 486 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 240 (التجاریہ)

مثقال حبة من خردل شرط ہے اور معطوف محذوف ہے اور آتینا بھا جزاء ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ ان کان العمل مثقال حبة من خردل یعنی اصغر صغیراً و کبیراً اتینا بھا (یعنی چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے عمل کو ہم لے آئیں گے) یہ بھی ہوسکتا ہے ان متصل ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ کسی کا کچھ حق ضائع نہ کیا جائے گا اگر چہ وہ حق رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا۔ اس صورت میں اتینا بھا کا جملہ ظلم کی نفی کے بیان کے لئے مستانفہ ہوگا اور ضمیر کا مرجع مثقال ہوگا اور اس کے مؤنث ہونے کی وجہ حبة کی طرف اضافت ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت فرمایا ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کا حساب ہوگا جس کی نیکیوں اور برائیوں کے موازنہ کے وقت ایک نیکی بھی زیادہ ہوگی تو وہ جنت میں جائے گا اور جس کی ایک برائی بھی نیکیوں سے زیادہ ہوگی تو وہ دوزخ میں جائے گا اور فرمایا ایک رائی کے دانہ کے برابر نیکی کے ساتھ میزان ہلکا اور بھاری ہوگا اور جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی وہ اعراف میں ہوں گے اور وہ پل صراط پر کھڑے ہوں گے۔

ع کفی بنا میں باء زائدہ ہے اور ضمیر متکلم فاعل ہے اور فاصلہ کی وجہ سے ایسا جائز ہے حاسبین تمیز یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ حاسبین کا معنی سدی نے محصین کیا ہے، یعنی شمار کرنے والے اور حسب کا معنی القدر ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں عالمین حافظین (ہم جاننے والے اور یاد کرنے والے ہیں) کیونکہ جو کسی چیز کا حساب کرتا ہے وہ اس کو جانتا بھی ہے اور اس کو یاد بھی کرتا ہے(۱)۔ اللہ تعالیٰ کافی ہے حساب کرنے والا کیونکہ اس کے علم اور عدل سے کسی کا علم وعدل زیادہ نہیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِیَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَۙ۝۴۸

''اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کے لئے لے''

لے فرقان سے مراد وہ کتاب ہے جس نے حق و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا یعنی تورات۔ اور ضیاء پر تنوین تعظیم کے لئے ہے اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے ذریعے جہالت اور حیرت کی تیرگیوں میں روشنی حاصل کی جائے۔ ذکراً للمتقین یعنی اس سے متقین نصیحت حاصل کرتے ہیں یا یہ معنی کہ اس میں متقین کے لئے ضرورت کے تمام شرعی احکام ہیں۔

ابن زید فرماتے ہیں فرقان سے مراد دشمنوں پر نصرت و فتح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوم بدر کو یوم فرقان فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرقان سے مراد سمندر کا پھٹنا ہے اور ضیاء اور ذکر سے مراد تورات ہے یا ذکر سے مراد وحی غیر متلو ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتی تھی اور اس کے ذریعے آپ بنی اسرائیل کو پند و نصائح فرماتے تھے۔

الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَ هُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ۝۴۹

''جو ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے نیز وہ قیامت سے بھی ترساں رہتے ہیں لے''

لے اسم موصول متقین کی صفت ہے یا مدح کی وجہ سے منصوب ہے یا مرفوع ہے بالغیب فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ وھم من الساعة مشفقون میں ضمیر کا ذکر کرنا اور اس پر حکم کو مرتب کرنا مبالغہ اور تعریض کے لئے ہے اور یہ پورا جملہ صلہ پر عطف یا حال ہے۔

وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۝۵۰

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 240 (التجاریۃ)

''اور یہ قرآن نصیحت ہے بڑی بابرکت ہم نے (ہی) اسے اتارا ہے ۱ تو کیا تم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہو ۲ ''

۱ هذا کا مشارالیہ قرآن ہے اور ترکیب کلام میں هذا مبتدا ہے اور اس کی خبر ذکر مبارک ہے۔ مبارک، ذکر کی صفت ہے اور اس پر تنوین تعظیم کے لئے ہے، یعنی یہ ذکر عظیم ہے جس میں خیر کثیر ہے۔ انزلناه ذکر کی دوسری صفت ہے۔

۲ خطاب اہل مکہ کو ہے اور اس چیز کے ثبوت کے بعد کہ یہ منزل من الله ہے اور اس میں بہت بڑی برکتیں ہیں، ان کے انکار پر زجر و توبیخ کے لئے استفہام انکاری ذکر فرمایا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

''اور یقیناً ہم نے مرحمت فرمائی تھی ابراہیم کو ان کی دانائی اس سے پہلے اور ہم ان کو خوب جانتے تھے ۱ ''

۱ یہ جواب ہے محذوف قسم کا۔ یعنی ہم نے ابراہیم کو بتوں کی عبادت سے اجتناب کی صلاحیت عطاء فرمائی اور رشدہ کی ضمیر کی طرف اضافت اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ اس دانائی اور بصیرت میں آپ کا بلند عظیم اور منفرد مقام تھا۔ من قبل یعنی موسیٰ ہارون اور محمد ﷺ سے پہلے۔ یعنی محمد ﷺ کی طرف جو ہم نے وحی کی ہے یہ کوئی نیا انجان اور انوکھا عمل نہیں ہے بلکہ مخلوق کی اصلاح تو سنت الٰہیہ ہے، یہ سلسلہ تو متواتر اور پیہم چل رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من قبل سے مراد یہ ہے کہ بلوغت سے پہلے جب ایک سرنگ سے نکلے تھے حالانکہ اس وقت آپ کم سن تھے تو آپ نے کہا انی وجهت لله الخ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں بچپن میں ہی نبوت کے منصب عظیم پر فائز فرمادیا تھا جیسا کہ یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا یا یہ معنی کہ نبی بنانے سے پہلے ہم نے انہیں دانائی اور فراست عطاء فرمائی تھی اور ہم خوب جانتے تھے کہ ابراہیم ہدایت نبوت کے اہل تھے کیونکہ اس کے تعین کا مبداء اللہ کی صفت علم اور صفت ہدایت ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

''یاد کرو جب آپ نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پوجا پاٹ پر تم جمے بیٹھے ہو ۱ ''

۱ ظرف آتینا یا رشدہ کے متعلق ہے یا یہ محذوف اذکر کے متعلق ہے۔ بتوں کی تحقیر اور ان کے احترام پر زجر و توبیخ کے لئے آپ نے انہیں مورتیاں (التماثیل) فرمایا کیونکہ تمثال وہ صورت ہوتی ہے جس میں نہ روح ہوتی ہے اور نہ نفع و نقصان دیتی ہے۔ لام اختصاص کے لئے ہے، تعدیہ کے لئے نہیں ہے کیونکہ عکوف کا تعدیہ علیٰ سے ہوتا ہے یا لام بمعنی علی ہوگا یا عکوف کے ضمن میں عبادت کا معنی ہے، اس لئے صلہ لام ذکر فرمایا۔

قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

''وہ بولے پایا ہے ہم نے اپنے باپ (دادوں) کو کہ وہ ان کے پجاری تھے ۱ ''

۱ یعنی ہمارے اس عقیدے پر کوئی علمی، عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے بلکہ ہم نے اپنے آباء کو ان مجسموں کے سامنے جبیں فرسائی کرتے دیکھا تھا۔ پس ہم بھی ان کی تقلید میں آنکھیں بند کئے ایسا کر رہے ہیں۔ یہ جواب ہے اس مفہوم کا جو سوالیہ انداز میں آپ نے ان سے بتوں کی عبادت کے بارے میں ضمناً کیا تھا۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

''آپ نے فرمایا بلاشبہ ہتارہے ہوتم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی گمراہی میں ۱؎''

۱؎ حضرت ابراہیم نے جرأت مندانہ لہجہ میں فرمایا ان پتھروں کی بے سود اور بےضرر مورتیوں کی پوجا کرنے میں تم کھلی گمراہی میں ہو اور پھر جو گمراہ تھے ان کی تقلید کرنا گمراہی ہی گمراہی ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾

''انہوں نے پوچھا کیا تم ہمارے پاس کوئی سچی بات لے کر آئے ہو یا (صرف) دل لگی کر رہے ہو ۱؎''

۱؎ وہ چونکہ اپنے آباء کو جادہ حق پر سمجھتے تھے اس لئے حضرت ابراہیم کا یہ جملہ سن کر چونک گئے اور ان کی گمراہی کو بعید سمجھتے ہوئے کہا کہ یہ تم ہنسی مذاق کے طور پر کہہ رہے ہو یا تمہارے پاس کوئی علمی قطعی دلیل بھی ہے، اپنے آباء کے عقیدہ کو گمراہی سے بعید سمجھتے ہوئے انہوں نے استفہام انکاری استعمال کیا۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾

''آپ نے فرمایا (دل لگی نہیں کر رہا) بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا فرمایا ہے ۱؎ اور میں اس (صداقت) پر گواہی دینے والوں سے ہوں ۲؎''

۱؎ آپ نے فرمایا نادانو! تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ رب السموٰت والارض سے وصف بیان فرمایا تا کہ ان جہلاء کا قول رد ہو جائے جو یہ کہتے ہیں کہ رب کا اطلاق سلطان اور بادشاہ پر ہوتا ہے۔ یہ اضراب ہے اس قول سے کہ میں دل لگی کر رہا ہوں۔ فرمایا میری بات کی دلیل یہ نیلگوں آسمان اور گوناں گوں صفات کی حامل زمین ہے، یہ زبان حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور ان کا حادث اور ممکن ہونا ان کے خالق ہونے کی بین دلیل ہے اور ممکنات کے خالق کے لئے واجب الوجود اور صفات سے متصف ہونا اور یکتا ہونا ضروری ہے اور ایسی صفات سے متصف ذات ہی عبادت کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اس قابل نہیں کہ اشرف المخلوق حضرت انسان اس کے سامنے اپنی طلعت زیبا کو جھکائے۔

۲؎ ذالکم کا مشارالیہ مذکور توحید ہے، یعنی جو چیزیں قدرت خداوندی کی معترف ہیں اور زبان حال سے یا زبان قال سے اس کی عظمت و کبریائی کی گواہی دے رہی ہیں، میں بھی ان سے ہوں جیسے زمین و آسمان اور ساری کائنات زبان حال سے اس کی ربوبیت پر شاہد عادل ہے۔

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اور بخدا میں بندوبست کروں گا تمہارے بتوں کا جب تم چلے جاؤ گے پیٹھ پھیرتے ہوئے ۱؎''

۱؎ کید کا لفظی معنی مکر و حیلہ ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ میں تمہارے ان بتوں کی درگت بناؤں گا یا اس کو توڑنے کا ہر حیلہ اپناؤں گا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں تاء قسمیہ واؤ کا بدل ہے جو باء کا بدل ہے اور اس میں تعجب ہے۔ لفظ کید اور تاء کا استعمال جس میں تعجب کا معنی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ معاملہ بڑا مشکل اور کٹھن تھا اور بڑی تدبیر اور منصوبہ سازی کا حامل تھا (1) کیونکہ نمرود اور ساری مخلوق خدا ایسا نہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 39 (العلمیۃ)

چاہتی تھی اور نمرود کو ظاہری جاہ وجلال بھی حاصل تھا (تو ایسے ماحول میں عقائد پر حملہ بلکہ ان کے معبودوں پر حملہ واقعی بڑا ہی مشکل امر تھا) اس کلام کا عطف قال کی تاویل کے ساتھ سابقہ قال پر ہے۔ حضرت امام بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور مجاہد نے فرمایا کہ آپ نے یہ ارشاد قوم سے خفیہ فرمایا تھا، اس وقت صرف ایک شخص موجود تھا لیکن اسی شخص نے آپ کا یہ راز فاش کر دیا تھا اور اس شخص نے کہا ہم ایک جوان کو سنتے رہتے ہیں کہ وہ بتوں کا برائی سے تذکرہ کرتا ہے اور اس کا نام ابراہیم ہے (1)۔

سدی فرماتے ہیں مشرک سال میں ایک عید مناتے تھے اور جب اس عید کی محفل سے واپس آتے تھے تو بتوں کے پاس جا کر جبیں فرسائی کرتے اور اپنی نیاز مندیاں پیش کرتے، اس کے بعد اپنے گھروں کو پلٹتے تھے۔ اس سال جب عید کا دن آیا تو ابراہیم کو باپ نے کہا اے ابراہیم آج اگر تو ہمارے ساتھ ہماری عید کی اس پر رونق محفل میں آ جائے تو ہمارا دین تجھے بڑا بھلا معلوم ہوگا۔ اس مشورہ پر ابراہیم ان کے ساتھ چل پڑے لیکن راستہ پر آپ رکے اور فرمایا میں بیمار ہوں۔ میرے پاؤں میں درد ہے۔ جب سب لوگ چلے گئے اور صرف کمزور لوگ باقی تھے تو آپ نے فرمایا قسم بخدا میں تمہارے ان بے جان مجسموں کو توڑ ڈالوں گا۔ تو بعض لوگوں نے آپ کی یہ کلام سن لی۔ پھر حضرت ابراہیم ان کے بت خانہ میں آئے۔ اس بت خانہ میں ایک بڑا بت رکھا تھا جس کے اردگرد چھوٹے بت پڑے تھے۔ مشرک محفل عید میں جانے سے پہلے اپنے بتوں کے سامنے کھانا رکھ گئے تھے اور یہ سوچ کر گئے تھے کہ جب ہم واپس آئیں گے تو ہمارے اس کھانے میں ہمارے معبود برکت ڈال چکے ہوں گے اور واپسی پر ہم یہ برکت آمیز کھانا کھائیں گے۔ جب حضرت ابراہیم نے بتوں کے سامنے کھانا دیکھا تو بطور استہزاء فرمایا تم کھاتے کیوں نہیں۔ جب کسی نے جواب نہ دیا (اور انہیں جواب کی طاقت ہی نہ تھی) تو فرمایا بولتے کیوں نہیں۔ پھر آپ ہتھوڑا لے کر دائیں ہاتھ سے بتوں کو توڑنا شروع فرما دیا (2)۔ دائیں ہاتھ کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ بائیں سے زیادہ قوی ہوتا ہے یا یمین بمعنی قسم ہے، یعنی اس قسم کی وجہ سے آپ نے انہیں توڑنا شروع کر دیا۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

"پس آپ نے انہیں ریزہ ریزہ کر ڈالا مگر ان کے بڑے بت کو کچھ نہ کہا تاکہ وہ لوگ (اس افتاد کے بارے میں) اس کی طرف رجوع کریں۔ [1]"

[1] جعلهم میں ضمیر منصوب کا مرجع بت ہیں۔ جذاذا کو جمہور علماء نے جیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے فعال بمعنی مفعول ہے جیسے حطام ہے اور یہ جد سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جمع ہے لیکن اس کا لفظاً واحد نہیں ہے۔ کسائی نے جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت ہے، اس صورت میں بھی بمعنی مفعول ہوگا یا یہ جذیذ کی جمع ہے جیسے خفیف کی جمع خفاف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام بت خانہ میں رکھے ہوئے بتوں کا حلیہ بگاڑ دیا لیکن آپ نے بڑے بت کو نہ توڑا، آپ نے کلہاڑا آخر میں اس بڑے بت کی گردن میں لٹکا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بے جان و بے عقل بتوں کے لئے ضمیر جمع مذکر ذکر فرمائی ہے حالانکہ یہ اس اہل نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرک انہیں اپنا خدا گمان کرتے تھے، اس لئے ان کے عقیدہ کے مطابق ضمیر استعمال فرما دی۔ الیہ کی ضمیر کا مرجع یا تو ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی وہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹیں اور پوچھیں کہ ہمارے بتوں کی یہ درگت کس نے بنائی ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بتوں کی مخالفت اور دشمنی میں پورے معاشرہ کے اندر مشہور تھے۔ پس جب وہ آپ کے پاس آ کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 241 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

جھگڑیں گے تو آپ ان پران باطل خداؤں کی بے بسی پر حجت قائم کریں گے کہ تمہارے یہ خدا اتنے بے چارے اور کمزور ہیں کہ اپنی الوہیت کو بچانے کے لئے ایک آدمی کا مقابلہ بھی نہ کر سکے (جبکہ تم ہو کہ صبح و شام دست بستہ ان کی عبادت میں مصروف ہو) یا الیہ کی ضمیر کا مرجع ان کا بڑا بت ہے کہ وہ اس سے حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے رجوع کریں اور پھر جب وہ بے جان بت انہیں کوئی جواب نہیں دے گا تو رسوا اور شرمندہ ہوں گے کیونکہ معبود تو اس شان کا مالک ہوتا ہے کہ اسے ہر چیز کا علم بھی ہوتا ہے اور اپنے وفا شعاروں اور اطاعت گزاروں کی فریاد کو بھی سنتا ہے۔ جب یہ جواب نہ دے گا تو خود بخود ذلیل ہو کر واپس آ جائیں گے۔

یا الیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی جب اس بے بسی اور لاچاری کی حالت میں اپنے بتوں کو دیکھیں گے تو رب حقیقی کی طرف رجوع کریں گے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

''وہ بولے کس نے یہ حال کیا ہے ہمارے بتوں کا بیشک وہ ظالموں میں سے ہے [1]''

[1] من استفہامیہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصولہ ہو اور پھر اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہو اور انه لمن الظالمین خبر ہو۔ یعنی جس نے ہمارے خداؤں کا یہ ہوش ربا حشر کیا ہے یقیناً اس نے خداؤں پر یہ جرأت کر کے بڑا ظلم کیا ہے یا توڑنے میں اتنی زیادتی کر کے ظلم کیا ہے یا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس تقدیر پر کہ پہلا جملہ استفہامیہ ہو۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾

''(چند آدمیوں نے) کہا ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان کا ذکر (برائی سے) کیا کرتا ہے اسے ابراہیم کہا جاتا ہے [1]''

[1] یذکرھم' فتی کی صفت ہے اور پھر اس کے ذریعے یذکر کا سمعنا کے ساتھ تعلق ہے اور یہ ترکیب ابلغ ہے کیونکہ اس میں ذکر کی نسبت آپ کی طرف حقیقتاً ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یذکر' سمعنا کا مفعول ثانی ہو کیونکہ سمعنا میں ضمناً علم کا معنی پایا جاتا ہے۔ یقال لهٗ یہ فتی کی دوسری صفت ہے اور ابراہیم ھو مبتدا محذوف کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کی وجہ سے مرفوع ہو کیونکہ ابراہیم سے مراد (مسمی نہیں) اسم ہے۔

جب نمرود اور قوم کے دوسرے سرداروں کو اپنے بتوں کے ابراہیم کے ہاتھوں اس حشر نشر کا علم ہوا تو یہ کہا

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

''کہنے لگے تو پھر (پکڑ کر) لاؤ اسے سب لوگوں کے روبرو [1] شاید وہ اس کے متعلق کوئی شہادت دیں [2]''

[1] بعض علماء فرماتے ہیں اعین الناس سے مراد قوم کے رؤسا اور وڈیرے ہیں اور علی فاتوا کے متعلق ہے۔ جیسا کہ اتیت علی القاضی میں علی اتیت کے متعلق ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں علی اعین الناس' بہ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی لوگوں کے سامنے لے آؤ اس طرح کہ لوگوں کی نظریں اس کی صورت میں یوں جمی ہوئی ہوں جیسے سوار سواری پر جما ہوا ہوتا ہے۔

[2] تاکہ لوگ آپ کے اس فعل پر گواہی دیں (کیونکہ ویسے وہ بغیر کسی وجہ کے آپ کو گرفتار کرنا نہیں چاہتے تھے) یا یہ معنی کہ لوگ موجود ہوں اور دیکھیں کہ ہم اپنے خداؤں کے مجرم کو کیسی عبرت ناک سزا دیتے ہیں۔ یہ معنی محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے اور پہلا معنی الحسن'

قتادہ اور سدی نے بیان کیا ہے(1)۔

قَالُوْٓا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾

"(ابراہیم پکڑ کر لائے گئے تو) لوگوں نے پوچھا اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے حرکت کی ہوگی سوان سے پوچھو! اگر یہ گفتگو کی سکت رکھتے ہوں لے"

لے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فعل کی نسبت ان کے بڑے بت کی طرف کی ہے (حالانکہ یہ سب آپ نے خود کیا تھا) تو اس کی تین وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس فعل کا سبب ان کا بڑا بت تھا اس لئے آپ نے فعل کی نسبت اس کی طرف کر دی (کیونکہ آپ نے دیکھا کہ لوگ دوسرے بتوں کے سامنے بھی اپنے تحائف ونذرانے رکھتے تھے لیکن اس بڑے بت کی بہت زیادہ تعظیم اور توقیر کرتے تھے تو آپ کے غصہ اور غیظ کا سبب یہی بڑا بت بنا تھا) دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے تعریضی اسلوب پر ان کو خاموش کرنے اور بڑے بت کا مذاق اڑانے کے ساتھ اپنے فعل کا ثبوت دیا ہے۔ جیسے کوئی شخص بہت گندہ لکھتا ہو، جبکہ آپ بہت اچھا لکھتے ہوں آپ نے کوئی تحریر لکھی ہو اور وہ شخص آپ سے پوچھے یہ تحریر آپ نے لکھی ہے تو آپ کہیں نہیں بلکہ آپ نے لکھی ہے (چونکہ وہ ایسا عمدہ لکھ نہیں سکتا اس لئے یہ آپ کا اپنا ثبوت ہے اور دوسرے کے ساتھ استہزاء بھی ہے) یا تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے ان کے اعتقاد کے لزوم کے مطابق کہا ہے کہ بڑے بت کو غصہ آتا ہے کہ میرے ساتھ دوسروں کی عبادت کیوں کی جائے۔ قتیبی کہتے ہیں **فعلہ کبیرھم** کا تعلق معناً **ان کانوا ینطقون** کے ساتھ ہے۔ یعنی **ان کانوا ینطقون** اس فعل کے لئے شرط ہے، یعنی اگر بولنے پر بت قادر ہیں تو اس فعل پر بھی قادر ہوں گے تو آپ نے انہیں دکھا دیا کہ تمہارے بت بولنے سے بھی عاجز ہیں اور کلام کے ضمن میں ہے کہ یہ میں نے خود کیا ہے (یہ تو بولنے سے عاجز ہیں اتنے بڑے فعل کے بدرجہ اولی عاجز ہیں)

کسائی سے روایت ہے کہ وہ **بل فعلہ** پر وقف کرتے تھے۔ یعنی سائل کی کلام میں جو ابراہیم مذکور ہے اس نے کیا ہے۔ پس فعل ضمیر کی طرف منسوب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے **فعلہ من فعلہ** (یہ سب اس نے کیا جس نے کیا) اس کا فاعل حذف ہے لیکن یہ جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کسائی سے جو روایت کیا گیا ہے۔ بل کا کلمہ اس معنی کی تائید نہیں کرتا کیونکہ فعل کی اپنی ذات کی طرف نسبت سے اعراض اس فعل کے نہ کرنے پر دلالت کرتا ہے ورنہ یہ معنی ہوگا میں نے نہیں کیا بلکہ میں نے کیا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی حدیث بھی **بل فعلہ** پر وقف کی مخالفت کرتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم نے سوائے تین مقامات کے کبھی ظاہراً بھی جھوٹ نہیں بولا۔ دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (1) **انی سقیم** (میں بیمار ہوں) (2) **بل فعلہ کبیرھم** (ان کے بڑے نے یہ کیا ہوگا) اور تیسری مرتبہ اس وقت جب ایک دن آپ حضرت سارہ کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گزرے تو لوگوں نے بتایا کہ ایک شخص نے یہاں پڑاؤ کیا ہے جس کے ساتھ ایک حسین وجمیل عورت ہے۔ بادشاہ نے آپ کو بلا بھیجا اور حضرت سارہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ میری بہن ہے پھر آپ حضرت سارہ کے پاس واپس آئے(2) تو انہیں فرمایا کہ ظالم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 242 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 474 (وزارت تعلیم)

بادشاہ نے اگر جان لیا کہ تو میری بیوی ہے تو وہ مجھ سے تجھے چھین لے گا اس لئے اگر وہ تجھ سے پوچھے تو اسے کہنا کہ میں اس کی بہن ہوں کیونکہ اسلام میں تو میری بہن ہے۔ سطح زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ پھر ظالم بادشاہ نے حضرت سارہ کو بلا بھیجا۔ حضرت سارہ کو اس کے پاس لے جایا گیا تو حضرت ابراہیم نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ جب حضرت سارہ اس کے کمرہ میں داخل ہوئیں تو اس نے بری نیت سے آپ کو پکڑنا چاہا لیکن کسی دست غیبی نے اس کو پکڑ لیا اور زور سے دبوچا حتیٰ کہ وہ تکلیف کی وجہ سے پاؤں زمین پر مارنے لگا اور کہا تو میرے لئے اللہ سے دعا کر میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہوگیا لیکن پھر اس نے دوبارہ آپ کو پکڑنے کا ارادہ کیا۔ پھر کسی غیبی طاقت نے اسے دبوچ لیا، پہلے کی طرح پکڑا یا اس سے بھی زیادہ۔ پھر اس نے کہا آپ میرے لئے دعا کریں میں تجھے اب کچھ تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ آپ نے دعا فرمائی تو پھر وہ تکلیف سے آزاد ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دربان کو بلایا اور کہا تو میرے پاس کسی انسان کو نہیں کسی جن کو لایا ہے۔ پھر اس نے حضرت سارہ کو خدمت کے لئے حاجرہ (لونڈی) عطاء کی۔ حضرت سارہ واپس آئیں تو ابراہیم کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابراہیم نے اشارہ سے پوچھا کیا ہوا۔ حضرت سارہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کافر کا مکر اس کے سینہ میں لوٹا دیا اور اس نے خدمت کے لئے حاجرہ دی ہے۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں یہی تمہاری ماں ہے۔ اے خالص نسب والو! اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجازاً ان تعریضی باتوں کو کذبات سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ظاہراً اور صورتاً یہ باتیں کذب کے مشابہ تھیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے برائی کی سزا کو مجازاً سزا سے تعبیر فرمایا ہے۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا حضرت ابراہیم نے صراحۃً فرمایا ہے کہ تو میری اسلام میں بہن ہے تو گویا آپ نے تعریض فرمائی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا تھا اور آپ کی شان اس سے بہت بلند وبالا ہے۔ (تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذومعنی کلام کرنا مخاطب جس سے کچھ اور مفہوم سمجھ رہا ہو اور متکلم کچھ اور مراد لے رہا ہو)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام بتوں سے سوال کرنے کو کہا حالانکہ بات بڑے بت کی چل رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام بت وہاں موجود تھے (اگرچہ کسی کا کان نہیں تھا اور کسی کی ناک نہیں تھی)

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

"(لاجواب ہو کر) اپنے دلوں میں غور کرنے لگے پھر بولے بلاشبہ تم ہی زیاں کار ستمگار ہو[1]"

[1] یعنی وہ حضرت ابراہیم کے چونکا دینے والے برجستہ جملے سن کر غور وفکر کرنے لگے اور سمجھ گئے کہ ابراہیم علیہ السلام جوان تراشیدہ مورتیوں کی الوہیت کی نفی کرتا ہے وہ حق ہے اور جو ہم اندھی تقلید میں ان کی پوجا پاٹ کرتے ہیں یہ بالکل غلط اور ناروا ہے۔ پھر اپنے دلوں میں یا ایک دوسرے کو کہنے لگے بے نفع، بے ضرر اور گنگے مہروں کی عبادت کر کے تم اپنے آپ پر بہت ظلم کرتے رہے ہو یا یہ معنی کہ اس شخص سے سوال کرنا تمہارا ظلم ہے (اپنے معبودوں سے پوچھو کہ ان کو زیروزبر کس نے کیا) یا تمہارا اس کو ظالم کہنا بہت بڑا ظلم ہے۔ (اس نے تو حقیقت کو بے نقاب کیا ہے)

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

"پھر وہ اوندھے ہو کر (اپنی سابقہ گمراہی کی طرف) پلٹ گئے اور کہنے لگے تم خوب جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں[1]"

[1] یعنی عقول کی طرف رجوع کرنے کے بعد پھر وہ اپنے کفر اور ہٹ دھرمی کی طرف لوٹ گئے، ان کے باطل کی طرف لوٹنے کو کسی چیز

کے الٹے ہو جانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کہنے لگے آپ ہمیں ان سے پوچھنے کے متعلق کہتے ہیں حالانکہ قسم بخدا آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بولنے سے عاجز ہیں۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا یَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾

''آپ نے فرمایا (نادانو!) کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان (بے بس بتوں) کی جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں [1]''

[1] اس کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتعترفون بان ھؤلاء لا ینطقون ولا نفعکم شیئاً ولا یضرون وانکم انتم الظالمون فی عبادتھا افتعبدون بعد ذالک۔** یعنی تم جانتے بھی ہو کہ یہ نہ کچھ بولتے ہیں اور نہ کچھ نفع ونقصان کے مالک ہیں اور ان کی عبادت کر کے اپنے اوپر تم ظلم کرتے ہو پھر بھی تم ان کی عبادت کرتے ہو حالانکہ اگر تم ان کی عبادت کرتے بھی رہو تو بھی یہ تمہیں کچھ نفع نہیں دے سکتے اور اگر تم ان کی عبادت چھوڑ دو تو تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ ان کی عبادت پر انکار اور انہیں توبیخ کی جا رہی ہے کہ بڑے نادان ہو کہ تم خود اعتراف بھی کرتے ہو کہ یہ پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں ہیں، نفع ونقصان سے انہیں کوئی تعلق نہیں پھر تم ان کی عبادت کیوں کرتے ہو۔ یہ چیزیں تو الوہیت کے منافی ہیں۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾

''تف ہے تم پر نیز ان بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا [1] کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے [2]''

[1] **اف** کو ابن کثیر اور ابن عامر نے بغیر تنوین کے فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے نافع اور حفص نے تنوین کے ساتھ اور باقی قراء نے بغیر تنوین کے پڑھا ہے جیسا کہ سورۂ اسراء میں گزر چکا ہے۔ یہ محل رفع نہیں ہے کیونکہ یہ **ویل له** کے طریقہ پر نکرہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے یا یہ اسم فعل ہے جس کا معنی تضجر ہے۔ یعنی بہت افسوس ہے کہ عقیدہ کفریہ کے بطلان کے باوجود تم باطل پر ڈٹے ہوئے ہو اور افسوس ہے تمہارے ان من گھڑت معبودوں کی معبودیت پر حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ انسان کی عبادت کے یہ مستحق نہیں ہے' اف وہ آواز ہے جو کسی چیز کو ناپسند کرتے ہوئے یا کسی چیز سے بیزار ہونے کے وقت انسان منہ سے نکالتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی حقیر جاننا اور برا سمجھنا ہے۔ حدیث شریف میں ہے آپ ﷺ نے ایک دفعہ بدبو محسوس کی تو اظہار نفرت کرتے ہوئے کپڑا اپنے ناک پر رکھا اور فرمایا اف اف۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی حقیر جاننا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی برا اور بدبودار ہے (1)۔

[2] استفہام برائے توبیخ ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتنظرون فلا تعقلون** کیا تم آنکھوں سے ان کے بے حس و بے حرکت ہونے کو دیکھتے ہو اور پھر سمجھتے نہیں ہو کہ یہ بت عبادت کے مستحق نہیں ہیں۔ عبادت کا مستحق تو صرف اللہ ہے۔ جب دلائل سے ابراہیم علیہ السلام غالب آ گئے اور وہ کوئی جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو آپ کو وہ تکلیف پہنچانے کے درپے ہو گئے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿٦٨﴾

''(سب یک زباں ہو کر) بولے جلا ڈالو اس کو اور مدد کرو اپنے خداؤں کی اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو [1]''

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 45 (العلمیہ)

ل ان کنتم فاعلین شرط ہے لیکن سابق کلام کی دلالت کی وجہ سے جزاء ذکر نہیں کی گئی۔ یہ بات جس شخص نے کہی تھی اس کا تعلق اکراد قبیلہ سے تھا اور بعض علماء نے اس کا نام ھنون لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا تھا اور وہ قیامت تک نیچے دھنستا ہی جائے گا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس سزا کا مشورہ نمرود نے دیا تھا۔ جب ابراہیم کو جلا دینے پر اتفاق رائے ہو گیا تو انہوں نے آپ کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور اس کے اردگرد ایک چاردیواری بنادی۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے آپ کو قید کرنے کے لئے شہر میں ایک تنور یا بھٹی نما کوئی جگہ بنائی پھر وہ ایک مدت تک مختلف قسم کی لکڑیاں اکٹھی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مذہبی جوش اتنا تھا کہ جو شخص مریض ہوتا وہ کہتا اگر اللہ نے مجھے شفا دی تو میں ابراہیم کو جلانے کے لئے لکڑیاں جمع کروں گا۔ عورتوں کو کوئی حاجت ہوتی تو وہ کہتیں اگر میرا یہ کام ہو گیا تو میں ابراہیم کو جلانے کے لئے لکڑیاں لاؤں گی۔ لوگ مرتے وقت وصیت کرتے کہ میرے مرنے کے بعد لکڑیاں خرید کر اس ایندھن میں ڈالنا۔ عورتیں چرخہ کات کر اس کی مزدوری سے لکڑیاں خریدتیں اور ثواب کی نیت سے ان لکڑیوں میں اضافہ کرتیں۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں انہوں نے ایک مہینہ لکڑیاں جمع کیں، جب جمع کر چکے تو آگ جلائی گئی پھر آگ بھڑک اٹھی اور اس کے شعلے اتنے بلند تھے کہ اگر کوئی پرندہ اس کے پاس سے بھی گزر تا تو اس کی گرمی کی وجہ سے مر جاتا۔ انھوں نے سات روز ان لکڑیوں کو جلتے رہنے دیا۔ روایت ہے کہ اب انہیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس بھڑکتی آگ میں ابراہیم کو ڈالیں کس طرح (انسان کا ازلی دشمن) شیطان آ گیا، اس نے انہیں منجنیق کا علم دیا پس انہوں نے منجنیق کے ذریعے پھینکنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ حضرت ابراہیم کو ایک بلند منزل پر لے گئے آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منجنیق میں ڈال دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر جن وانس کے سوا زمین و آسمان کی ہر چیز کی چیخ نکل گئی۔ اے ہمارے پروردگار ابراہیم تیرا خلیل ہے اور اسے آگ میں ڈالا جا رہا ہے، اس کے سوا سطح زمین پر کوئی بھی تیرا عبادت گزار نہیں ہے تو اجازت فرما کہ ہم اس کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ واقعی میرا خلیل ہے، اس کے سوا میرا کوئی خلیل نہیں ہے، میں اس کا معبود ہوں میرے سوا اس کا کوئی معبود نہیں ہے۔ اگر وہ تم سے مدد یا دعا چاہتا ہے تو تمہیں اس کی امداد کی اجازت ہے اور اگر وہ توحید کا علمبردار میرے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں مانتا اور کسی غیر سے کچھ نہیں مانگتا (اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا ہی ہے) اور میں اس کا ولی ہوں تم میرے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ (وہ جانے اور اس کا رب جانے) جب انہوں نے آپ کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو پانی کا فرشتہ حاضر ہوا اور عرض کی ابراہیم! اگر تم چاہو تو میں اس آگ کو یکدم بجھا دوں ہوا کا فرشتہ آیا عرض کی قبلہ! اگر آپ چاہیں تو میں اس آگ کو ہوا سے اڑا دوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کمال استغناء کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حَسْبِیَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ (میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر کارساز ہے)(1) ابی بن کعب سے مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے لئے جب انہوں نے باندھا تو آپ نے پڑھا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الْمُلْكُ لَا شَرِيْكَ لَكَ پھر انہوں نے آپ کو جب منجنیق میں بٹھا دیا تو جبریل امین حاضر ہوئے عرض کی اے ابراہیم کوئی میرے لائق خدمت ہو (تو حاضر ہوں) حضرت ابراہیم نے فرمایا۔ اے جبریل مجھے تیری اعانت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جبریل نے عرض کی اپنے رب سے ہی ہاتھ اٹھا کر التجا کر لو۔ فرمایا حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُهٗ بِحَالِیْ وہ میرے حال سے خوب واقف ہے مجھے عرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 243 (التجاریۃ)

کعب الاحبار فرماتے ہیں کائنات کی ہر چیز اس آگ کو ابراہیم کی خاطر بجھا رہی تھی لیکن گرگٹ آگ کو بھڑ کانے کے لئے پھونکیں مار رہی تھی (1)۔

امام بغوی نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے ام شریک سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا یہ حضرت ابراہیم پر آگ کو بھڑکا رہی تھی (2)۔

امام بخاری اور مسلم نے صحیحین میں اور طبرانی نے ابن عباس سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا گرگٹ کو قتل کر دو اگر چہ وہ کعبہ کے اندر بھی ہو (3)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو فویسق (فاسق کا بچہ) فرمایا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے گرگٹ کو پہلے برچھے کے ساتھ قتل کر دیا اس کے (نامہ اعمال میں) سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسرے برچھے کے ساتھ قتل کیا اسے اس سے کم نیکیاں ملیں گی اور جس نے تیسرے برچھے کے ساتھ قتل کیا اسے اس سے کم نیکیاں ملیں گی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (5)۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾

''(جب آپ کو آتشکدہ میں پھینکا گیا تو) ہم نے حکم دیا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا باعث بن جا ابراہیم کے لئے لے''

لے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ سلاماً ارشاد نہ فرماتے تو حضرت ابراہیم آگ کی ٹھنڈک کی وجہ سے فوت ہو جاتے (6)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کلام میں کئی اعتبار سے مبالغہ ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو قدرت الٰہی کے تابع ظاہر فرمایا ہے کہ اس کے حکم سے کسی چیز کو جلاتی ہے، اس کے حکم سے کسی کو راحت پہنچاتی ہے نیز ابردی کی بجائے کونی بردا فرمایا ہے اصل میں ذات برد تھا مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں سلاماً اپنے فعل کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی سلمنا سلاماً علیہ (7)۔ امام بغوی فرماتے ہیں آثار میں معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمایا تو اس دن سطح زمین پر کوئی آگ نہ رہی سب بجھ گئیں اور دنیا میں کسی شخص نے اس دن آگ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ ''علی ابراہیم'' نہ فرماتے تو آگ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی ہو جاتی (8)۔ میں کہتا ہوں آگ پہلے کی طرح جلانے کی صفت سے متصف تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے اسے اذیت اور تکلیف سے خالی کر دیا جیسا کہ علی ابراهیم کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ سدی کہتے ہیں فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو پہلوؤں سے پکڑا اور بڑے آرام سے زمین پر بٹھا دیا۔ جب آپ اس آتشکدہ میں اترے تو وہاں میٹھے پانی کا چشمہ تھا اور سرخ رنگ کے گلاب کے خوبصورت پھول تھے۔ کعب فرماتے ہیں آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بال بھی بیکا نہ کیا لیکن جن رسیوں سے آپ کو باندھا گیا تھا انہیں جلا دیا۔ علماء فرماتے ہیں حضرت ابراہیم آگ میں سات دن رہے تھے۔ منہال بن عمرو فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے فرمایا جو دن میں نے آگ میں گزارے وہی دن میری زندگی کے عمدہ ترین دن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 243 (التجاریۃ)　2۔ ایضاً　3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 247 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 236 (قدیمی)　5۔ ایضاً　6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 244 (التجاریۃ)
7۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 46 (العلمیہ)　8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 244 (التجاریۃ)

تھے، اللہ تعالیٰ نے ان ایام میں خصوصی انعامات سے نوازا تھا(1)۔ ابن یسار فرماتے ہیں سائے کے فرشتے کو ابراہیم کی صورت میں بھیجا، وہ حضرت ابراہیم کے پہلو میں بیٹھ کر انس ومحبت کی باتیں کرتا تھا۔ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو جنت سے ریشمی قمیص اور جائے نماز دے کر بھیجا۔ جبریل نے قمیص آپ کو پہنا دی اور جائے نماز پر بٹھا دیا اور پھر جبریل قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جبریل نے کہا اے ابراہیم! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ آگ ہمارے احباب کو کوئی گزند نہیں پہنچاتی۔ پھر نمرود نے اپنے محل کی بالکونی سے حضرت ابراہیم کو دیکھا تو عجب نظارہ دیکھا کہ ابراہیم ایک باغیچہ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور فرشتہ آپ کے پہلو میں بیٹھ کر محو گفتگو ہے۔ جبکہ آپ کے اردگرد آگ لکڑیوں کو جلا رہی ہے۔ نمرود نے اپنے محل کے اوپر سے آواز دی۔ ابراہیم! تیرے خداوند عظیم کی قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ تیرے درمیان اور جو کچھ میں (آگ) دیکھ رہا ہوں اس کے درمیان حائل ہو چکا ہے۔ اے ابراہیم کیا تو اس آگ سے نکل بھی سکتا ہے فرمایا ہاں۔ پھر نمرود نے پوچھا کیا تجھے کوئی خدشہ ہے کہ اگر تو اس میں ٹھہرا رہا تو یہ آگ تجھے جلا دے گی فرمایا نہیں۔ نمرود نے کہا پھر کھڑے ہو جاؤ اور باہر نکل آؤ۔ حضرت ابراہیم آگ کے شعلوں کے درمیان سے چلتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ جب آپ باہر آ گئے تو نمرود نے پوچھا جناب آگ میں آپ کے ساتھ کون تھا وہ تو بالکل آپ کی تصویر تھا اور آپ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا وہ سایہ کا فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے میری طرف بھیجا تھا تا کہ میری تنہائی کی اکتاہٹ کو دور کرے۔ نمرود نے کہا میں تیرے خداوند عظیم کے لئے قربانی دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جب تو نے سارے خداؤں کی عبادت سے منہ موڑ کر اس کی عبادت اور توحید کو اپنایا تو اس نے جو تمہارے ساتھ حسن سلوک کرنے میں اپنی عزت و قدرت کا کرشمہ دکھایا ہے اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس کی رضا کے لئے چار گائے ذبح کروں گا۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا جب تک تو مشرکانہ عقائد اور اس غلط دین کا پیرو ہے اللہ تعالیٰ تیری قربانی قبول نہیں فرمائے گا۔ تو اپنا یہ غلط مذہب چھوڑے گا تب تیری کوئی قربانی قبول ہوگی۔ نمرود نے کہا میں اپنی سلطنت تو چھوڑ نہیں سکتا۔ آپ کا دین اپنانے میں مجھے اپنی بادشاہی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے لیکن میں اس کے لئے گائے ذبح کروں گا۔ تو نمرود نے گائیں ذبح کیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی زک پہنچانے سے باز آ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے یہ منظر دکھا کر حضرت ابراہیم کو اس کی آزادیوں اور پابندیوں سے بچا لیا۔

شعیب الجبائی فرماتے ہیں جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی(2)۔

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۚ

''انہوں نے تو ابراہیم کو گزند پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو ناکام بنا دیا لہ''

لہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح نامراد و ناکام کیا کہ قیمتوں میں اور خرچ میں خسارہ ہو گیا اور وہ اپنی مراد کو نہ پا سکے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے خسارہ کی یہ تدبیر فرمائی کہ اس نے نمرود پر مچھروں کو مسلط کر دیا جنہوں نے اس کا گوشت نوچ لیا اور اس کا خون چوس لیا اور ایک مچھر اس کے دماغ میں داخل ہو گیا جس نے اسے ڈنگ مار مار کر ہلاک کر دیا۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں بعض لوگ نمرود اور اس کے چیلوں کے خوف کے باوجود حضرت ابراہیم پر ایمان لے آئے تھے جب انہوں نے دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم پر آگ کو ٹھنڈا اور باعث راحت بنا دیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 244 (التجاریۃ)   2۔ ایضاً صفحہ 245

حضرت لوط جو آپ کے بھتیجے تھے وہ بھی آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ حضرت لوط ہاران کے بیٹے تھے اور ہاران تارخ کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیم بھی تارخ کے بیٹے تھے اور تارخ، ثالث کے بیٹے تھے جن کو ناخور بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم پر حضرت سارہ جو آپ کے چچا کی بیٹی تھی وہ بھی ایمان لے آئی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ اور لوط کی معیت میں عراق کے شہر کوثی سے ہجرت کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دین کی حفاظت اور سکون سے اپنے رب کی عبادت کرنے کی خاطر ہجرت فرمائی کیونکہ آپ نے فرمایا انی مهاجر الی ربی۔ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ آپ سفر کرتے کرتے حران میں اترے، پھر کچھ وقت وہاں ٹھہرے رہے پھر سفر شروع کر دیا حتیٰ کہ مصر پہنچ گئے پھر مصر سے شام تشریف لے گئے۔ فلسطین کے مقام سبع پر اترے جو شام سے بارہ میل کی مسافت پر ہے۔ حضرت لوط ان بستیوں میں تشریف لے گئے جن کو بعد میں نافرمانی کی وجہ سے الٹ دیا گیا تھا۔ یہ بستیاں فلسطین کے مقام سبع سے ایک دن اور ایک رات کی مسافت پر ہیں یا اس سے بھی قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو ان بستیوں کے باشندوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا تھا(1)۔

وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ۝

"اور ہم نے نجات دی آپ کو اور لوط کو۔ اس سرزمین کی طرف (ہجرت کا حکم دیا) جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا تمام جہان والوں کے لئے ۱"

۱۔ الی الارض، نجینا کے متعلق ہے کیونکہ اس کے ضمن میں سیرناہ کا معنی موجود ہے۔ برکت سے مراد شادابی، درختوں کی کثرت، نہروں اور پھلوں کی فراوانی ہے اور عمومی برکات میں سے ایک بڑی برکت یہ بھی ہے کہ اس زمین (شام) میں اللہ نے زیادہ انبیاء مبعوث فرمائے۔ ابی ابن کعب فرماتے ہیں اس زمین کو برکت والی زمین اس لئے فرمایا کیونکہ اس میں میٹھا پانی ہے جس کی اصل بیت المقدس کے صخرہ کے نیچے ہیں(2) (یعنی یہ چشمہ شیریں بیت المقدس سے نکلتا ہے اور پھر اس کا پانی اس بابرکت زمین میں پہنچتا ہے) بغوی نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے حضرت کعب سے فرمایا کہ تم مدینہ طیبہ کیوں نہیں جاتے حالانکہ وہ آپ ﷺ کی ہجرت گاہ ہے، وہاں آپ کی قبر انور ہے۔ حضرت کعب نے فرمایا اے امیر المومنین میں نے اللہ کی کتاب (تورات) میں یہ پڑھا ہے کہ شام کی زمین اللہ کا خزانہ ہے اور اس کے بندوں میں سے برگزیدہ بندوں کا خزانہ ہے(3)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی، بہتر لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت گاہ کی طرف ہجرت کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں ہے، زمین میں سے بہتر لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت گاہ کو لازم پکڑیں گے اور زمین پر شریر لوگ رہ جائیں گے، ان کی زمینیں ان کو باہر پھینک دیں گی اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو ناپسند فرمائے گا، آگ انہیں بندروں اور خنزیروں کے ساتھ ہانک کر جمع کرے گی۔ جہاں وہ رات گزاریں گے آگ بھی ان کے ساتھ رات گزارے گی۔ جب وہ قیلولہ کریں گے تو آگ بھی ان کے ساتھ وہاں ٹھہرے گی۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے(4)۔

زید بن ثابت سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شام کو مبارک ہو۔ ہم نے عرض کی حضور! کس وجہ سے؟ فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 245 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 336 (نور محمد کارخانہ تجارت)

ملائکہ رحمت اس کے اوپر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں(1)۔اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرموت کی طرف سے یا فرمایا حضرموت سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو جمع کرے گی۔ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر آپ ایسے حالات میں ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا تم شام کو لازم پکڑنا۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

ابو حوالہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لشکر ہوں گے، ایک لشکر شام کا ہوگا، ایک لشکر یمن کا ہوگا اور ایک لشکر عراق کا ہوگا۔ابن حوالہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر میں ایسے حالات کو پاؤں تو میں کیا کروں۔فرمایا علیک بالشام تم پر شام کو پکڑنا لازم ہے کیونکہ اللہ کی زمین سے بہتر زمین ہے، اللہ کے بہتر بندے اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یمن کو لازم پکڑنا اور اپنے آپ کو غدا سے سیسر کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے لئے شام اور شام والوں کا وکیل و ذمہ دار ہے(3)۔اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔شریح بن عبید سے مروی ہے۔فرماتے ہیں حضرت علی کی مجلس میں اہل شام کا ذکر ہوا اور کہا گیا کہ جناب آپ ان پر لعنت کریں۔آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابدال شام میں ہوں گے اور ابدال چالیس مرد ہیں جب ان میں سے ایک مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا پیدا فرما دیتا ہے، ان کی وجہ سے بارش نازل ہوتی ہے اور مسلمانوں کو ان کی وجہ سے فتح نصیب ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے شامیوں پر عذاب نہیں آتا۔اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے ایک نور کا ستون دیکھا ہے جو میرے سر کے نیچے سے پھیلتا ہوا نکلا ہے حتیٰ کہ شام میں جا کر ٹھہرا ہے۔اس حدیث کو بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے(4)۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝

''اور ہم نے عطا فرمایا انہیں اسحٰق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا) پوتا[1] اور سب کو ہم نے صالح بنایا[2]''

[1] نافلة یعنی فعل کے لفظ کے بغیر مصدر مفعول مطلق ہے جیسا کہ عافیۃ مصدر ہے، مجاہد اور عطاء نے نافلۃ کا معنی عطیہ کیا ہے اور فرماتے ہیں یہ اسحٰق اور یعقوب سے حال ہے کیونکہ وہ دونوں اللہ کی عطاء سے تھے۔حسن اور ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی فضل اور مہربانی ہے اور یہ علت کی بناء پر منصوب ہے۔ابن عباس، ابی بن کعب، ابن زید اور قتادہ فرماتے ہیں نافلۃ سے مراد یعقوب علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت ابراہیم کو آپ کی اس دعا کی وجہ سے عطا فرمائے تھے (رب هب لی من الصالحين) لیکن یعقوب علیہ السلام آپ کو اضافی اور زائد طلب عطاء فرمائے تھے اور النافلۃ کا معنی زائد اور اضافی ہے(5) اور یہ یعقوب سے حال ہے اور قرینہ کی وجہ سے اس ترکیب میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

[2] ان چاروں حضرات ابراہیم، لوط، اسحٰق اور یعقوب کو ہم نے نیک صالح بنایا تھا، یعنی ان کے دل غیر خدا کی محبت اور توجہ سے کلیۃً پاک تھے، ان کے نفس اوصاف کمالیہ سے متصف تھے اور برے اخلاق سے بالکل منزہ و صاف تھے اور ان کے بدن گناہوں کی آلائشوں سے بالکل پاکیزہ تھے۔ہر لحظہ اطاعت الٰہی میں مشغول رہتے تھے چونکہ صلاح، فساد کی ضد ہے خواہ وہ دل میں ہو یا قلب میں ہو یا نفس

1۔مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 582 (نور محمد)　2۔ایضاً　3۔سنن ابی داؤد، صفحہ 336 (نور محمد)
4۔دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 6، صفحہ 449 (العلمیہ)　5۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 245 (التجاریۃ)

میں ہو۔ یعنی ہم نے انہیں دل، بدن اور نفس ہر اعتبار سے پاک صاف کر دیا تھا۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ﴿۷۳﴾

''اور ہم نے بنا دیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لئے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے اور ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ وہ نیک کام کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیا کریں اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے [1]''

[1] یعنی یہ مقدس ہستیاں لوگوں کی احکام الٰہیہ کی طرف رہنمائی کرتی تھیں کیونکہ ہم نے انہیں تکمیل خلائق کے لئے بھیجا تھا اور ہم نے انہیں نیک کام بتائے، جن میں ذاتی حسن ہے اور شرع نے ان میں حسن پیدا کیا ہے۔ اقام اصل میں اقامة تھا، مضاف الیہ کو تاء کے قائم مقام رکھا اور تاء کو حذف کر دیا۔ اقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة کا عطف فعل الخیرات پر ہے اور یہاں عام پر خاص کو اہتمام کی زیادتی کی خاطر عطف کیا گیا ہے۔ اصل کلام اس طرح ہوگی اوحینا الیهم ان یفعلوا الخیرات و یقیموا الصلوة اقامة و یوتوا الزکوة ایتاءً یعنی مصدر بھی ساتھ ذکر تھے پھر افعال کو حذف کر کے مصادر کو مفاعیل کی طرف مضاف کر دیا گیا۔

وَ لُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىِٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ ﴿۷۴﴾

''اور لوط کو ہم نے حکومت اور علم عطا فرمایا اور نجات دی اسے اس گاؤں سے جس کے باشندے بہت رذیل کام کیا کرتے تھے۔ بے شک وہ لوگ بڑے نابجار اور نافرمان تھے [1]''

[1] لوطاً فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے، جس کی تفسیر آتیناکر رہا ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہے اور اتیناه اسی سے بدل اشتمال ہے۔

حکماً سے مراد یا تو حکمت ہے یا نبوت یا جھگڑوں میں فیصلہ کرنے کی قوت ہے۔ علماً سے مراد ذات الٰہی اور صفات الٰہی کی معرفت اور وہ تمام علوم ہیں جو شان انبیاء کے لائق ہوتے ہیں۔ قریہ سے مراد سدوم کی بستی ہے، اس بستی کے لوگ لڑکوں سے برائی کرتے، غلیلوں کے ساتھ ڈھیلے پھینکتے اور پرندوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ یہاں فعل کی نسبت قریہ کی طرف کی گئی ہے۔ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے (یعنی اصل میں اہل القریۃ تھا) اس کی دلیل آیت کے آئندہ الفاظ بھی ہیں اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ۔ انهم کانوا کا جملہ کانت تعمل الخبائث کی تعلیل ہے۔

وَ اَدْخَلْنٰهُ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۷۵﴾

''اور ہم نے اسے داخل کر لیا ہے اپنے (حریم) رحمت میں بیشک وہ نیکوکاروں میں سے تھا [1]''

[1] فی رحمتنا کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اسے اپنی رحمت کے مستحق بندوں میں داخل کر دیا یا اپنی جنت میں داخل کر دیا۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عالم مثال میں کشف کی نظر سے دائرہ کی ہیئت پر دکھائی دیتی ہیں اور صوفی ان میں داخل دکھائی دیتا ہے اس حال میں کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے فانی اور صفات الٰہیہ کے اعتبار سے باقی ہوتا ہے اور یہ فی رحمتنا اسی

کیفیت سے کنایہ ہو۔

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّیۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۶﴾

''اور یاد کرو نوح کو جب انہوں نے (ہمیں) پکارا پیش ازیں تو ہم نے قبول فرمایا ان کی دعا کو اور بچایا انہیں اور ان کے گھر والوں کو سخت مصیبت سے [1]''

[1] نوحاً کا عطف لوطاً پر ہے، یعنی ہم نے نوح کو بھی حکمت وعلم عطاء فرمایا۔ اذ نادی، 'اذکر فعل محذوف کے ساتھ منصوب ہے یہ جملہ معترضہ ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے اذکر لوطاً و نوحاً اس صورت میں اذ نادیٰ' لوطاً کے مضاف محذوف سے بدل اشتمال ہوگا۔ من قبل' نادی کی ظرف ہے، یعنی اس نے مذکور افراد سے پہلے ہمیں پکارا۔ الکرب العظیم سے مراد شدید غم ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کرب عظیم سے مراد غرق ہونا اور قوم کی تکذیب کی مصیبت اور تکلیف ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر تمام انبیاء کرام سے زیادہ تھی اور مصائب اور اذیتیں بھی آپ نے سب سے زیادہ برداشت کیں(1)۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم آپ کو اتنا سخت پیٹتی تھی کہ آپ زمین پر (بے ہوش ہوکر) گر پڑتے تھے اور آپ کو ایک چمڑے میں لپیٹ کر پھینک دیتے تھے اس گمان سے کہ آپ مر چکے ہیں۔ آپ دوسرے دن پھر تشریف لاتے اور انہیں پوری دردمندی اور سوز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے۔ محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر اللیثی سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ قوم نوح حضرت نوح علیہ السلام کو پکڑ لیتی ہے اور ان کا گلہ گھونٹ دیتی حتیٰ کہ آپ بے ہوش ہو جاتے لیکن پھر جب اس پیکر صبر و رضا کی طبیعت سنبھلتی تو یہ دعا مانگتے رَبِّ اغۡفِرۡ لِقَوۡمِیۡ فَاِنَّهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ اے میرے پروردگار میری قوم کو معاف فرمادے۔ یہ میری عظمت کو نہیں پہچانتی۔

وَ نَصَرۡنٰهُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۷۷﴾

''اور ہم نے ان کی حمایت کی اس قوم کے مقابلہ میں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا بیشک وہ بڑے نابکار لوگ تھے پس ہم نے غرق کر دیا ان سب کو [1]''

[1] امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کو ان دو برائیوں کی وجہ سے ہلاک کیا تھا جو جس قوم میں بھی جمع ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کر دیتا ہے وہ دو برائیاں یہ ہیں۔ 1۔ حق کو جھٹلانا۔ 2۔ اور برائی میں منہمک ہونا(2)۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ اِذۡ یَحۡكُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِیۡهِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكۡمِهِمۡ شٰهِدِیۡنَ ﴿۷۸﴾

''اور یاد کرو داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے ایک کھیتی کے جھگڑے کا جب رات کے وقت چھوٹ گئیں اس میں ایک قوم کی بکریاں اور ہم ان کے فیصلہ کا مشاہدہ کر رہے تھے [1]''

[1] ابن مسعود، ابن عباس اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ کھیتی انگوروں کی تھی جس پر انگوروں کے گچھے لگ چکے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 50 (العلمیۃ)

وہ کوئی دوسری کھیتی تھی(1)۔ اذنفشت' یحکمان کی ظرف ہے۔ رات کو بغیر چرواہے کے جانوروں کے چرنے کے لئے نفشت استعمال ہوتا ہے(2) اور دن کو بغیر چرواہے کے جانوروں کے چرنے کے لئے ہلمت استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اصل معنی بکھرنا اور منتشر ہونا ہے جیسا ارشاد ہے کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان و داؤد کے لئے لحکمھم میں ضمیر جمع استعمال فرمائی ہے لیکن مراد دو ہی ہیں کیونکہ جمع کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں استعمال ہوا ہے۔ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السدس۔ آیت کریمہ میں اخوۃ سے مراد بالاجماع اخوین ہے(3)۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝

''سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان کو ۱؎ اور ان سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم ۲؎ اور ہم نے فرمانبردار بنا دیا داؤد کا پہاڑوں اور پرندوں کو وہ سب ان کے ساتھ مل کر تسبیح کہا کرتے ۳؎ اور (یہ شان) ہم دینے والے تھے ۴؎''

۱؎ ففھمناھا میں ضمیر منصوب کا مرجع فیصلہ یا فتویٰ ہے، یعنی سلیمان کو ہم نے الہام کر دیا وہ فیصلہ جو ہمیں پسند تھا، اس کلام میں کئی جملے حذف ہیں۔ اصل مفہوم اس طرح ہے کہ سلیمان نے اس کے مطابق فیصلہ سنایا جیسے ہم نے اسے سمجھایا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے فیصلہ اور فتویٰ سے رجوع فرمالیا اور سلیمان کے فیصلہ پر تصدیقی دستخط فرما دیئے۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت داؤد پر قرآن پڑھنا بڑا آسان کر دیا گیا تھا۔ آپ سواریوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دیتے۔ پھر سواریوں پر زینیں ڈالنے سے پہلے ہی قرآن ختم کر لیتے تھے اور آپ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے(4)۔

میں کہتا ہوں حدیث شریف میں قرآن سے مراد زبور ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس اور قتادہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ قرآن سے مراد زبور ہے۔ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ حاکم جب کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے اس کی رائے بدل جائے تو اس کے لئے اپنے فیصلہ سے رجوع کرنا جائز ہے جیسا کہ داؤد علیہ السلام نے کیا تھا۔

دو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے۔ ایک بکریوں کا مالک تھا اور دوسرا کھیتی کا مالک تھا۔ کھیتی والے نے کہا کہ اس شخص کی بکریاں رات کو میری فصل میں چھوٹ گئیں اور سارا کھیت چٹ کر گئیں اور کھیت میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا (آپ ہمارے درمیان فیصلہ فرمائیں) حضرت داؤد علیہ السلام نے کھیتی کے بدلے بکریاں اسے دے دیں۔ وہ دونوں یہ فیصلہ سن کر سلیمان علیہ السلام کے پاس سے گزرے۔ حضرت سلیمان نے پوچھا تمہارا فیصلہ کیسے ہوا۔ انہوں نے فیصلہ سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا اگر ان کا فیصلہ میرے سپرد کر دیا جاتا تو میں کچھ اور فیصلہ کرتا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں ایسا فیصلہ کرتا جو دونوں کے لئے زیادہ بہتر ہوتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حضرت سلیمان کی اس بات کی خبر پہنچی تو آپ نے انہیں بلا بھیجا اور فرمایا تم فیصلہ کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت داؤد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریہ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 827 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 485 (وزارت تعلیم)

علیہ السلام نے انہیں نبوت اور والد ہونے کا واسطہ دے کر فرمایا تم مجھے اس فیصلہ کے متعلق بتاؤ جو دونوں فریقوں کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا بکریاں کھیتی والے کو دے دو، وہ ان کے دودھ، اون، صوف اور دوسرے منافع حاصل کرے اور بکریوں والا کھیتی والے کے لئے زمین میں بیج ڈالے اور ان کی دیکھ بھال کرے۔ جب کھیتی اتنی مقدار کو پہنچ جائے جیسی کہ بکریوں نے کھائی تھی تو کھیتی کھیتی والے کے حوالے کی جائے اور بکریاں بکریوں والے کو دی جائیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا تمہارا فیصلہ درست ہے۔ پھر آپ نے اسی فیصلہ کے مطابق حکم سنایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جس روز سلیمان علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت آپ کی عمر گیارہ سال تھی (1)۔

ابن ابی شیبہ نے المصنف میں، ابن المنذر اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے اسی طرح یہ واقعہ روایت کیا ہے جیسا کہ علامہ بغوی نے نقل کیا ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کا فتویٰ حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کی نقل ہے جو آپ جنایت کرنے والے غلام کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنایت کرنے والا غلام اس شخص کو دے دیا جائے جس کا اس نے نقصان کیا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا فتویٰ امام شافعی کے فتویٰ کی طرح ہے کہ آپ فرماتے ہیں اگر کوئی غلام بھاگ جائے اور کسی کا نقصان کر دے تو تاوان غلام کی کمائی سے پورا کیا جائے گا اور پھر غلام مالک کو واپس کر دیا جائے گا (2)۔

میں کہتا ہوں امام ابوحنیفہ کا قول جو امام بیضاوی نے نقل کیا ہے یہ مطلق نہیں ہے بلکہ آپ غلام کے مالک کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر چاہے تو غلام نقصان والے کے حوالے کر دے یا جنایت کا نقصان خود ادا کرے۔ علامہ جصاص فرماتے ہیں ان سے ضمانت اس لئے لی گئی تھی کیونکہ انہوں نے بکریوں کو چھوڑ رکھا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم اسلام میں منسوخ ہو چکا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں اگر رات کو جانور چھوٹ کر کسی کا کھیت ضائع کر دیں تو جانوروں کے مالک پر تلف شدہ کھیت کی ضمانت ہوگی۔

(میں کہتا ہوں حضرت داؤد کے دور میں ان بکریوں کی قیمت اس کھیتی کے برابر تھی جو انہوں نے ضائع کی تھی، اسی وجہ سے آپ نے بکریاں کھیتی کے مالک کو دینے کا فیصلہ فرمایا تھا واللہ اعلم) اور دن کے وقت اگر جانور چھوٹ کر کھیتی کو اجاڑ دیں تو ان کے مالک پر ضمان نہیں ہے کیونکہ معاشرہ کا عرف یہ ہے کہ کھیتی کے مالک دن کے وقت کھیتی کی خود حفاظت کرتے ہیں اور جانور دن کے وقت چرنے کے لئے چھوڑے جاتے ہیں اور رات کو اپنے باڑوں میں باندھے جاتے ہیں اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں دن یا رات کو اگر جانور چھوڑ کر کسی کی کھیتی اجاڑ دیں تو کوئی ضمانت نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے **العجماء جرمها جبار** (3) (جانور کسی کو زخم لگا دے تو اس کا تاوان نہیں ہے) اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں امام محمد نے فرمایا **العجماء** سے مراد چھوڑے ہوئے جانور ہیں۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل حرام بن سعد بن محیصہ کی حدیث ہے کہ براء بن عازب کی اونٹنی چھوٹ گئی اور کسی کے باغ میں داخل ہوگئی اور اسے اجاڑ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دن کے وقت باغ والوں پر باغ کی حفاظت لازم ہے اور رات کے وقت اگر جانور چھوٹ کر ضائع کر دیں تو جانوروں والوں پر (باغ، کھیتی) کی ضمانت ہوگی۔

اس حدیث کو امام مالک نے موطاء میں اور امام شافعی نے امام مالک سے اور اصحاب سنن اربعہ دار قطنی، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 52 (العلمیۃ) 3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 631 (نور محمد)

روایت کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں ہم نے اپنے مسئلہ میں اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کیونکہ اس کی سند متصل ہے اور اس کے راوی معروف ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس حدیث کا مدار زہری پر ہے اور اس میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ موطا کی روایت ہے اور الیث نے زہری سے اور زہری نے ابومحیصہ سے روایت کی ہے لیکن اس میں اونٹنی کا ذکر نہیں ہے۔ معن بن عیسیٰ نے مالک سے روایت کی ہے اس میں عن جدہ محیصہ کی زیادتی ہے۔ معمر نے زہری سے اور انہوں حرام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اس کی متابع نہیں ہے۔ ابوداؤد اور ابن حبان نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اوزاعی، اسمعیل بن امیہ اور عبداللہ بن عیسیٰ تمام نے زہری سے اور زہری نے حرام سے اور انہوں نے البراء سے روایت کی ہے۔ میں کہتا ہوں ابن جوزی نے احمد کے طریقے سے تحقیق التعلیق میں اسی طرح روایت کی ہے۔ الحافظ ابن حجر فرماتے ہیں حرام نے براء سے نہیں سنا ہے۔ عبدالحق نے ابن حزم کی تبع میں اسی طرح لکھا ہے۔ نسائی نے محمد بن ابی حفصہ کے طریق سے زہری سے روایت کیا ہے کہ مجھے ابوامامہ بن سہل نے بتایا کہ براء کی اونٹنی الخ۔ ابن ابی ذئب نے زہری سے روایت کیا ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے ان ناقۃ البراء الخ ائمہ ثلاثہ نے العجماء جرحہا جبار کی حدیث کو دن کے وقت کے نقصان کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حکم کی قطعیت میں عام بھی خاص کی طرح ہوتا ہے۔ تخصیص کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ دونوں حکم متصل نہ ہوں اور نہ نسخ کا حکم لگایا جا سکتا ہے جب تک کہ ایک حکم دوسرے حکم سے متاخر نہ ہو۔ پس جب یہ دونوں حکم (تخصیص و نسخ) ثابت نہیں ہیں تو تعارض باقی رہے گا۔ اس لئے شک کی وجہ سے ضمان لازم نہ ہوگی۔ جب دونوں حدیثوں کے درمیان تعارض ہے تو قیاس کی طرف رجوع کرنا واجب ہوگا اور قیاس عدم ضمان کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جانوروں کا فعل مالک کی طرف منسوب نہیں ہے۔ کیونکہ نہ اس نے چھوڑا ہے نہ اس نے انہیں ہانکا ہے اور نہ وہ انہیں آگے سے پکڑے ہوئے تھا۔ اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ جس شخص نے مسلمانوں کے راستہ پر جانور کو چھوڑ دیا اور انہوں نے منہ کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو وہ ضامن ہوگا کیونکہ جب تک وہ جانور راستہ پر سیدھا چلتا جائے گا تو اس کا چلنا مالک کی طرف منسوب ہو گا اور جب مڑ جائے گا یا ادھر ادھر چل پڑے گا تو اس کے ارسال کا حکم منقطع نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر سواری کے ساتھ اس کا مالک سوار ہو یا آگے سے اسے کھینچ رہا ہو یا پیچھے سے ہانک رہا ہو اور سواری کسی کو روند ڈالے یا اگلا پاؤں یا پچھلا پاؤں یا سر مار دے یا کاٹ دے یا کسی چیز سے ٹکرا جائے خواہ کھڑی ہو یا چل رہی ہو اور وہ جگہ اس کی ملکیت ہو یا اجارۃً یا اعارۃً اس کی ملکیت میں ہو تو سواری کے مالک پر تاوان نہ ہوگا مگر پہلی صورت میں جب سوار ہو اور سواری کسی کو روند ڈالے تو اس پر ضمان ہوگی کیونکہ اس صورت میں مالک ہی براہ راست تلف کرنے والا ہے۔ کیونکہ سواری اور مالک دونوں کا بوجھ تلف ہونے والی چیز پر پڑا ہے گویا دونوں نے مل کر اسے ضائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی صورتوں میں وہ براہ راست تلف کرنے میں ملوث نہیں ہے بلکہ وہ سبب بنا ہے اور مسبب پر اس وقت تاوان ہوتا ہے، جبکہ اس کی طرف سے تعدی پائی جائے لیکن یہاں چلانے اور ٹھہرانے میں اس کی کوئی تعدی اور زیادتی نہیں ہے (یعنی اس میں اس کا ارادہ شامل نہیں ہے) لیکن اگر وہ ایسی جگہ پر ہو جو اس کی ملکیت نہ ہو لیکن اس کو اس پر چلنے کی اجازت ہو جیسے شارع عام ہوتی ہے لیکن ٹھہرانے کی اجازت نہیں ہوتی اور صحراء میں چلانے اور ٹھہرانے دونوں طرح کی اجازت ہوتی ہے، اس صورت میں سوار پیچھے سے ہانکنے والا اور آگے سے چلانے والا تمام سابقہ صورتوں میں ضامن ہوگا لیکن اگر سواری نے پیچھے پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو مالک ضامن نہ ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے راستہ میں چلنا سلامتی کی شرط کے

ساتھ مباح ہے کیونکہ وہ من وجہ اپنے حق میں تصرف کر رہا ہے اور من وجہ غیر کے حق میں تصرف کر رہا ہے کیونکہ وہ راستہ تمام لوگوں میں مشترک ہے۔ ہم اباحت کو سلامتی کی شرط کے ساتھ مقید کرتے ہیں تا کہ دونوں فریقوں کا بھلا ہو۔ پھر سلامتی کی شرط کے ساتھ ان صورتوں کو مقید کرتے ہیں جن سے احتراز (بچنا) ممکن ہے اور جن صورتوں میں بچنا ممکن نہیں ہے ان کو اس شرط سے مقید نہیں کرتے کیونکہ اس طرح تصرف سے روکنا لازم آتا ہے۔ روندنے سے احتراز ممکن ہے کیونکہ یہ چلانے کی ضروریات سے نہیں ہے اور پچھلے پاؤں کے مارنے اور دم سے نقصان پہنچانے سے بچاؤ ممکن نہیں ہے، جبکہ سواری چل رہی ہو پس ایسی صورتیں سلامتی کی شرط کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ اگر سوار نے سواری کو راستہ پر روک لیا تو اس نے پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو سوار ضامن ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں ایسی صورتوں میں بھی اس پر کچھ واجب نہ ہوگا جب تک کہ سوار کی طرف سے سواری کو مارنا یا ہانکنا نہ پایا جائے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے **العجماء جبار** (جانور کا نقصان پہنچانا رائیگاں ہے) امام شافعی فرماتے ہیں اگر مالک نے سواری کو ہانکا یا مارا یا اس نے کوئی ایسا فعل نہیں کیا اور پھر جانور نے اپنے منہ یا ہاتھ یا پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو ضامن ہوگا۔ امام احمد فرماتے ہیں جانور نے منہ کے ساتھ یا اگلے پاؤں کے ساتھ جنایت کی، جبکہ مالک جانور پر سوار تھا تو اس پر ضمان واجب ہوگی اور جو پچھلے پاؤں سے نقصان کرے اس کی ضمان نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے **الرجل جبار** (ٹانگ کا نقصان رائیگاں ہے) اس حدیث کو دار قطنی نے سعید بن مسیب سے مرسلا روایت کیا ہے۔

فائدہ: مجاہد فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ صلح تھا اور حضرت داؤد کا فیصلہ حکم تھا اور **الصلح خیر** (صلح بہتر ہے) بعض علماء فرماتے ہیں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان دونوں کا فیصلہ وحی کے مطابق تھا اور سلیمان کا حکم داؤد علیہ السلام کے حکم کے لئے ناسخ تھا۔ یہ ان علماء کا قول ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام کے لئے اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز ہی نہیں کیونکہ وحی کی وجہ سے وہ اجتہاد سے مستغنی ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں انبیاء سے اجتہادی خطاء بھی جائز نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ دونوں کا فیصلہ اپنے اپنے اجتہاد پر مبنی تھا مگر داؤد علیہ السلام کا اجتہاد درست فیصلہ تک نہ پہنچا، جبکہ سلیمان علیہ السلام کا اجتہاد درست تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی تعریف فرمائی ہے۔ انبیاء کے اجتہاد میں خطاء جائز ہے لیکن وہ اس خطاء پر برقرار نہیں رہتے۔

ﷲ حضرت حسن فرماتے ہیں اگر **وکلا اتینا حکما و علما** کا ارشاد نہ ہوتا تو حکام ہلاک ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اجتہاد کی تعریف فرمائی ہے اور جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ ہر مجتہد صواب کو پہنچنے والا ہوتا ہے وہ اسی آیت سے حجت پکڑتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کی دلیل نہیں ہے بلکہ **ففھمناھا سلیمان** تو اس بات کی دلیل ہے کہ سلیمان کا فیصلہ درست تھا نہ کہ داؤد علیہ السلام کا۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کہ ہر مجتہد مصیب نہیں ہوتا' حضرت عمرو بن العاص فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر صحیح فیصلہ کرے تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر فیصلہ درست نہ ہوا تو مجتہد کو ایک اجر ملے گا(1)۔ اس حدیث کو بخاری' مسلم' احمد، اصحاب سنن اربعہ نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے یہ حدیث ہماری حجت ہے، ہمارے خلاف حجت نہیں ہے کیونکہ یہ صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے اور کبھی صحیح فیصلہ پر پہنچتا ہے اور مجتہد غلطی پر بھی ماجور ہوتا ہے۔ یہ ارشاد مجتہد کے ہمیشہ مصیب ہونے پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ خطاء اور صواب دو متضاد

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 76 (قدیمی)

چیزیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے خطاء (غلطی کرنے) پر اجر ملتا ہے بلکہ حق کی تلاش میں جو وہ محنت اور کوشش کرتا ہے اس پر اسے اجر ملتا ہے کیونکہ تلاش حق میں محنت کرنا عبادت ہے اور اس سلسلہ میں خطاء معاف ہے، جبکہ وہ صحیح فیصلہ پر نہ پہنچے اور صحیح فیصلہ پر پہنچنے کی صورت میں اس کو دو اجر ملیں گے، ایک کوشش کا اجر اور دوسرا صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا اجر۔

شیخین نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ دو عورتیں تھیں، جن کے پاس اپنا اپنا بچہ تھا، اچانک ایک بھیڑیا آیا اور ایک کا بچہ اٹھا کر لے گیا۔ ہر عورت دوسری کو کہتی کہ وہ تمہارا بچہ لے گیا ہے۔ وہ دونوں فیصلہ کرانے کے لئے حضرت داؤد کے پاس آئیں، آپ نے فیصلہ بڑی عورت کے حق میں کر دیا۔ وہ یہ فیصلہ سن کر حضرت سلیمان کے پاس آئیں اور اپنا ماجرا سنایا۔ آپ نے فرمایا چھری لے آؤ میں اس بچہ کے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دوں گا۔ چھوٹی عورت نے کہا حضرت! اللہ آپ پر رحم کرے آپ ایسا نہ فرمائیں یہ بچہ اس عورت کا ہے (تو آپ نے اس چھوٹی عورت کی شفقت دیکھ کر) فیصلہ چھوٹی کے حق میں فرما دیا(1)۔

ے حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر الٰہی میں جب سستی آ جاتی تو پہاڑ اور پرندے ذکر کرتے تاکہ آپ ان کا ذکر سن کر دوبارہ چست و چوبند ہو جائیں۔ **معاً** کا تعلق **سخرنا** یا **یسبحن** کے ساتھ ہے۔ لفظ کے اعتبار سے پہلی ترکیب بہتر ہے اور معنی کے اعتبار سے دوسری ترکیب افضل ہے۔ **یسبحن** کا جملہ جبال سے حال ہے اور تسخیر کی وجہ بیان کرنے کے لئے جملہ مستانفہ ہے۔ **الطیر** کا عطف **الجبال** پر ہے یا مفعول معہ ہے۔ جبال کو طیر پر مقدم کیا گیا ہے کیونکہ پہاڑوں کا تسبیح کرنا اور ان کا مسخر ہونا زیادہ تعجب خیز ہے۔ وہب فرماتے ہیں پہاڑ حضرت داؤد علیہ السلام کے جواب میں تسبیح بیان کرتے تھے اور اسی طرح پرندے بھی آپ کی تسبیح کے جواب میں تسبیح کرتے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں **تسبحن** کا مطلب نماز پڑھنا ہے، یعنی جب داؤد علیہ السلام نماز پڑھتے تو پہاڑ اور پرندے بھی نماز پڑھتے تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام پتھروں اور درختوں کی تسبیح کو سمجھتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب داؤد علیہ السلام تسبیح میں سست پڑ جاتے تو اللہ تعالیٰ انہیں پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سناتا تاکہ وہ تسبیح کرنے میں دوبارہ شوق کرنے لگیں(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں **یسبحن**، **سباحۃ** سے مشتق ہے۔ جس کا معنی چلنا ہے یعنی جب داؤد علیہ السلام چلتے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپ کے ساتھ چلتے۔

ے اور ہم ہی سلیمان کو فیصلہ سمجھانے والے اور ہم ہی ہر ایک کو علم و حکمت عطاء فرمانے والے اور پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کے لئے مسخر کرنے والے تھے۔

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝۸۰

"اور ہم نے سکھا دیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدہ کے لئے تاکہ وہ زرہ بچائے تمہیں تمہاری زد سے ۱؎ تو کیا تم (اس احسان کا) شکریہ ادا کرنے والے ہو ۲؎"

۱؎ **لبوس** ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو پہنی جاتی ہے اور مجازاً ہر اسلحہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں مراد لوہے کی زرہیں ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں حلقوں اور کڑیوں والی زرہ سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے بنائی تھی، جبکہ پہلے زرہ بالکل سیدھی ہوتی تھی(3)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 77 (قدیمی)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 247 (التجاریۃ)　3۔ ایضاً

حدیث پاک میں گزر چکا ہے کہ داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ ابوجعفر، ابن عامر، حفص اور یعقوب نے تاء کے ساتھ تحصنکم پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع صنعة ہے یا دروع کی تاویل پر لبوس ہے اور ابوبکر نے متکلم کا صیغہ نحصنکم پڑھا ہے، باقی قراء نے یاء کے ساتھ یحصنکم پڑھا ہے اور ضمیر داؤد علیہ السلام کے لئے ہے یا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس صورت میں تکلم سے غائب کی طرف التفات ہوگا۔ باس سے مراد حرب (جنگ) ہے۔ لکم، علمناہ کے متعلق ہے اور تحصنکم اس کا حرف جر کے اعادہ کے ساتھ بدل اشتمال ہے۔

۲؎ فھل انتم شاکرون میں خطاب اہل مکہ کو ہے مبالغہ اور توبیخ کے لئے شکر کے امر کو استفہام کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾

"اور ہم نے سلیمان کے لئے ۱؎ تند و تیز ہوا کو فرمانبردار بنا دیا ۲؎ چلتی تھی وہ ہوا ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنا دیا تھا اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے ۳؎"

۱؎ لسلیمان کا عطف مع داؤد پر ہے اور الریح کا عطف (ایک حرف عطف کے ساتھ) الجبال پر ہے کیونکہ یہ دونوں ایک عامل کے دو مفعول ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے مع استعمال فرمایا جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے لام استعمال فرمایا (حالانکہ ہاتھ میں لوہے کا نرم ہونا اور اس سے زرہیں بنانا اور اسی طرح ہوا کا سلیمان علیہ السلام کے تخت کو اڑانا ہر ایک چیز ہر نبی کے لئے معجزہ ہے اس فرق کی وجہ کیا ہے) اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام اپنے معجزہ سے اس طرح خدمت لیتے تھے جس طرح مالک اپنی مخلوق سے خدمت لیتا ہے، اسی ملکیت کے اظہار کے لئے لام استعمال فرمایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے وقت پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح میں موافقت کرنا معجزہ ہے لیکن ان کے معجزہ کی یہ کیفیت نہیں ہے جیسی مملوک کی نسبت مالک کی طرف ہوتی ہے(1) بعض محققین علماء فرماتے ہیں پہاڑوں اور پرندوں کا حضرت داؤد کے ساتھ تسبیح کرنا حضرت داؤد کے حکم کے بغیر ہوتا تھا اس لئے ان کے ساتھ مع کا کلمہ ذکر فرمایا اور ہوا کا چلنا حضرت سلیمان کے حکم سے تھا اس لئے ان کے ساتھ لام کا کلمہ ذکر فرمایا۔

۲؎ عاصفۃ الریح سے حال ہے۔ اس سے مراد تیز ہوا ہے۔ وہ ہوا آپ کے تخت کو تھوڑی سی مدت میں بہت دور لے جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرعت رفتار کو بیان کرتے ہوئے فرمایا غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ (اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی) اور وہ ہوا فی نفسھا بڑی نرم اور پیاری ہوتی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت سلیمان کے ارادہ کے مطابق ہوا کبھی نرم ہوتی تھی اور کبھی تند و تیز ہوتی تھی۔

۳؎ تجری بامرہ دوسرا حال ہے یا پہلے حال سے بدل ہے یا پہلے حال کی ضمیر سے حال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الی الارض میں الی بمعنی من ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی منزل شام تھی جو انبیاء کا وطن ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں الی اپنے معنی میں ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صبح سویرے آپ یہاں سے جاتے تھے اور شام کے وقت اپنی منزل کی طرف واپس آتے تھے اور ہم ازل سے ہر چیز کو جانتے تھے اس لئے ہمارا ہر کام اور ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے، ہم نے سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ہوا وغیرہ کی جو سرفرازیاں

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 58 (العلمیہ)

عطاء کی تھیں ان چیزوں نے (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) کو اپنے رب کریم کے حضور خشوع و خضوع کرنے کا باعث بنایا۔

حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام جب اپنی مجلس سے باہر تشریف لاتے تو پرندے آپ پر اپنے پروں سے سایہ کرتے تھے اور جن آپ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔ حتیٰ کہ آپ اپنے تخت پر تشریف فرما ہو جاتے۔ آپ بہت زیادہ جنگجو تھے، ہر وقت کسی نہ کسی مہم پر رہتے تھے۔ بہت کم ہی گھر بیٹھتے تھے، جب بھی کسی جگہ پر کسی بادشاہ کی خبر پہنچتی تو آپ اس کو بلاتے اور اسے دعوت حق دیتے تھے۔ جب آپ کسی مہم کو سر کرنے کا ارادہ فرماتے تو اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیتے پھر ایک تخت تیار کیا جاتا اور اس کے اوپر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے خصوصی لکڑی کی مسند لگائی جاتی پھر اس تخت پر لوگوں، چوپایوں اور آلات حرب کو سوار کیا جاتا۔ جس کو آپ نے ساتھ لے جانا ہوتا، جب وہ سارے سوار ہو جاتے تو آپ ہوا کو حکم دیتے، ہوا اس تخت کے نیچے سے گزرتی اور اسے اٹھا لیتی اور جب اوپر چلی جاتی تو آپ اسے نرم ہونے کا حکم دیتے، تیز رفتار اتنی کہ ایک ماہ کی مسافت صبح کو اور ایک ماہ کی مسافت شام کو طے کر لیتی تھی۔ لشکر کو اٹھائے ہوئے وہ ہوا اتنی نرم ہوتی کہ کسی کھیتی سے گزرتی تو وہ کھیتی بالکل حرکت بھی نہ کرتی اور نہ کسی پرندے کو نقصان پہنچاتی اور نہ مٹی اڑاتی تھی۔ وہب بیان فرماتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ دجلہ کے کنارے ایک جگہ پر لکھا ہوا تھا اور یہ تحریر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھیوں میں سے کسی نے لکھی تھی، وہ لکھنے والا جن تھا یا انسان (تحریر یہ تھی) ہم اس جگہ اترے لیکن ہم نے یہاں رات نہ گزاری، صبح ہم اصطخر سے چلے تھے اور ہم نے یہاں قیلولہ کیا تھا، ہم پچھلے پہر یہاں سے انشاء اللہ رخصت ہوں گے اور رات شام میں گزاریں گے(1)۔

مقاتل فرماتے ہیں، جنہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ریشم اور سونے کی تاروں سے ایک قالین بنایا تھا جس کی لمبائی اور چوڑائی ایک فرسخ تھی۔ اس قالین کے درمیان حضرت سلیمان کے لئے سونے کا منبر رکھا جاتا تھا، آپ اس پر تشریف فرما ہوتے اور آپ کے اردگرد تین ہزار سونے اور چاندی کی کرسیاں لگی ہوئی ہوتی تھیں۔ انبیاء کرام سونے کی کرسیوں پر بیٹھتے اور علماء چاندی کی کرسیوں پر بیٹھتے، ان کے اردگرد لوگ ہوتے اور لوگوں کے اردگرد جن اور شیطان ہوتے، پرندے حضرت سلیمان علیہ السلام پر سایہ کرتے تھے، اس لئے آپ کو دھوپ نہ لگتی تھی۔ صبح کی ہوا اس قالین کو صبح سے دوپہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کراتی اور دوپہر سے شام تک ایک مہینہ کی مسافت طے کراتی(2)۔

سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت سلیمان کے ساتھ چھ لاکھ کرسیاں ہوتی تھیں۔ آپ کے قریب انسان بیٹھتے اور ان کے پیچھے جن بیٹھتے۔ پرندے آپ کے اوپر سایہ کرتے پھر اس پورے مجمع کو تخت سمیت ہوا اٹھا لیتی تھی۔

حسن فرماتے ہیں ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں میں مشغول ہوئے تو آپ کی نماز عصر فوت ہو گئی۔ آپ کو غصہ آیا تو آپ نے گھوڑوں کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی جگہ اس سے بہتر چیز (ہوا) کی سواری عطا فرما دی۔ ہوا آپ کے حکم سے چلتی تھی جیسے آپ چاہتے تھے۔ ایلیا سے صبح چلتے، اصطخر میں قیلولہ کرتے پھر یہاں سے چلتے اور شام کو بابل پہنچ جاتے۔

ابن زید فرماتے ہیں آپ کی لکڑی کی ایک سواری تھی، اس میں ہزار حصے تھے اور ہر حصہ میں ہزار کمرے تھے۔ اس سواری پر آپ کے ساتھ انسان اور جن سوار ہوتے، ہر حصہ کے نیچے ہزار جن ہوتے۔ وہ اس طرح لکڑی کے مرکب کو اٹھاتے تھے۔ جب وہ سواری اوپر ہو جاتی تو نرم نرم ہوا آتی پھر وہ اس سواری کو لے کر اڑاتی۔ آپ ایک ایسی قوم کے پاس قیلولہ فرماتے جو آپ سے ایک ماہ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 248 (التجاریۃ)　2۔ ایضاً

مسافت پر ہوتی اور شام پھر ایسی قوم کے پاس کرتے جو ایک مہینہ کی مسافت پر ہوتی۔ قوم کو پتہ ہی نہ ہوتا کہ لشکر سمیت ان کے پاس پہنچ جاتے۔

روایت ہے کہ سلیمان علیہ السلام اہل عراق سے صبح کے وقت روانہ ہوئے پھر مرو میں قیلولہ فرمایا پھر نماز عصر بلخ کے شہر میں پڑھی۔ اس دوران آپ کو اور آپ کے لشکر کو ہوا اٹھائے ہوئے تھے اور پرندے آپ پر سایہ فگن تھے۔ پھر آپ بلخ سے ترکستان پہنچے پھر چین کی زمین پر قدم رنجہ فرما ہوئے۔ صبح ایک مہینہ کی مسافت طے فرماتے اور شام سے پہلے بھی ایک مہینہ کی مسافت طے فرماتے۔ پھر آپ کا لشکر مشرق کی طرف ساحل سمندر کی طرف مڑا حتی کہ قندھار کی زمین پر پہنچ گیا۔ پھر یہاں سے مکران کرمان پہنچے پھر یہاں سے ہوتے ہوئے فارس کی زمین پر پہنچے، یہاں کئی روز قیام فرمایا۔ یہاں سے صبح چلے تو دوپہر کسکر میں گزارا پھر شام پہنچے، آپ کا پایہ تخت تدمر کا شہر تھا۔

شام سے عراق جانے سے پہلے آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے سفید سنگ مرمر اور زرد پتھروں سے ایک عمارت تعمیر کریں۔ نابغہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ سلیمان کو جب اس کے مالک حقیقی نے حکم دیا کہ اٹھو اور کائنات ارضی کی تجدید کرو اور جنوں کے لشکر کو میں نے حکم دیا ہے کہ وہ پتھر اور چٹانیں گھڑ کر تعمیر کریں(1)۔

وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ ۚ وَ کُنَّا لَہُمۡ حٰفِظِیۡنَ ﴿۸۲﴾

"اور ہم نے مسخر کر دیئے شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرتے ان کے لئے اور کیا کرتے طرح طرح کے [1] اور کام اور ہم ہی ان کے نگہبان تھے [2]"

[1] من نکرہ موصوفہ ہے یا موصولہ ہے اور الریح پر معطوف ہے اور من الشیاطین حال مقدم ہے یا من مبتدا ہے اور ظرف خبر ہے۔ یعملون کا عطف یغوصون پر ہے۔ جنات سمندروں میں غوطہ زن ہو کر موتی اور جواہر نکال کر لاتے تھے اور اس کے علاوہ وہ دوسرے مشقت کے کام کرتے مثلاً بلند و بالا عمارتیں بناتے، مجسمے اور بڑے بڑے حوض اور ایک جگہ پر قائم رہنے والی دیگیں، شہروں اور محلات کی تعمیر اور دوسری عجیب و غریب صنعتیں وغیرہ۔

[2] ہم جنات کی نگرانی کرتے تھے تاکہ حضرت سلیمان کے حکم کی نافرمانی نہ کریں زجاج فرماتے ہیں اور نگہبانی کرتے تھے تاکہ جو کچھ انہوں نے حضرت کے حکم سے بنایا ہے اسے دوبارہ توڑ نہ دیں۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام جب کسی جن کو انسان کے ساتھ کسی کام کے لئے بھیجتے تو آپ انسان کو فرماتے کہ جب یہ کام سے فارغ ہو جائے تو اسے دوسرے کام پر لگا دینا کیونکہ جنوں کی یہ عادت ہے کہ جب یہ کسی کام سے فارغ ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا تو یہ پہلے کئے ہوئے کام کو ہی توڑ دیتے ہیں(2)۔

وَ اَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿ۚۖ۸۳﴾

"اور یاد کرو ایوب کو جب پکارا انہوں نے اپنے رب کو [1] کہ مجھے پہنچی ہے سخت تکلیف [2] اور تو ارحم الراحمین ہے (میرے حال زار پر رحم فرما) [3]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 249 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

لے نادی کا معنی دعا کرنا ہے اور ایوب اذ نادی اعراب میں نوحاً اذ نجینا کی طرح ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں ایوب علیہ السلام کا تعلق روم سے تھا اور آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے ایوب بن احرص بن رازرخ بن روم بن حیص بن الحق بن ابراہیم علیہما السلام اور آپ کی والدہ لوط بن ہاران کی اولاد سے تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو چن لیا تھا اور مرتبہء نبوت پر فائز فرمایا تھا۔ نیز آپ کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو وسیع فرما دیا تھا۔ شام کے علاقہ میں آپ کی ملکیت میں ایک وادی تھی جس میں ہموار اور پہاڑی ہر قسم کی زمین تھی۔ آپ کے پاس ہر قسم کا مال تھا اونٹ، گائیں، بکریاں، گھوڑے اور گدھے سب موجود تھے۔ مال کی کثرت اور زیادتی میں کوئی شخص آپ سے افضل نہ تھا، آپ کے پاس پانچ سو جوڑیاں تھیں۔ جن کو پانچ سو غلام جوتتے تھے اور ہر غلام کے لئے ایک بیوی، اولاد اور مال تھا۔ ہر جوڑی کے سامان کو اٹھانے کے لئے ایک گدھی تھی اور ہر گدھی کے تین، چار اور پانچ یا اس سے بھی زیادہ بچے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو بچے اور بچیاں بھی کثرت سے عطا فرمائی تھیں۔ آپ ایک نیکوکار، پرہیزگار، مسکینوں پر رحم فرمانے والے شخص تھے۔ آپ مسکینوں کو کھانا کھلاتے، بیوہ عورتوں اور یتیموں کی کفالت فرماتے مہمانوں کی عزت کرتے اور مسافروں کو منزل مقصود تک پہنچانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ہر لحہ شکر ادا فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق پورے فرماتے تھے۔ ابلیس لعین کے داؤ سے آپ محفوظ تھے۔ عام طور پر اہل ثروت جس طرح ذکر الٰہی اور یاد الٰہی سے غافل ہوتے تھے آپ ایسی کیفیت سے بالکل مبرا تھے۔ آپ کے تین اصحاب تھے جو آپ پر ایمان لاتے تھے اور آپ کی تصدیق کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق یمن سے تھا جس کا نام الیقن تھا اور دو کا تعلق حضرت ایوب کے شہر سے تھا۔ ایک کا نام بلدا اور دوسرے کا نام صافر تھا۔ یہ تینوں جوان تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ شیطان پر آسمانوں پر جانے کی پابندی نہ تھی وہ آسمانوں میں جہاں جانا چاہتا تھا جا سکتا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا تو ابلیس کو چار آسمانوں سے روک دیا گیا پھر جب محمد ﷺ تشریف لائے تو باقی آسمانوں سے بھی اسے روک دیا گیا۔ جب حضرت ایوب ذکر الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف تھے تو فرشتوں نے حضرت ایوب کے لئے مل کر دعا کی۔ بغاوت اور حسد کی آگ میں ابلیس جل گیا۔ وہ فوراً آسمان کی اس جگہ پہنچا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ شیطان نے کہا یا اللہ میں نے تیرے بندے ایوب کو دیکھا ہے تو نے چونکہ اس پر انعام کیا ہے اس لئے وہ تیرا شکر ادا کرتا ہے، تو نے اسے عافیت دی ہے اس لئے وہ تیری حمد و ثناء میں رطب اللسان رہتا ہے، اگر تو اس سے یہ ساری نعمتیں چھین لے تو پھر یہ تیرا شکر و اطاعت نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے شیطان میں نے تجھے اس کے مال پر تسلط عطا کیا ہے۔ ابلیس دوڑتا ہوا زمین پر آیا اور اپنے تمام چیلوں کو جمع کیا اور انہیں کہا کس کو یہ طاقت ہے مجھے ایوب کے مال پر تسلط عطا کیا گیا ہے مال کا خسارہ ایسا خسارہ ہے جس پر بڑے بڑے دل گردے والے بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک شیطان نے کہا مجھے یہ قوت ہے تو کیا چاہتا ہے۔ میں آگ کا بگولا بن کر اس کی ہر چیز جلا دوں گا۔ ابلیس نے اسے کہا جا اور جب اس کے اونٹ چراگاہ میں چر رہے ہوں تو انہیں جلا دے، وہ شیطان زمین کے نیچے سے آگ کا شعلہ بن کر نکلا، جو چیز اس کے قریب آتی جل جاتی۔ اس نے حضرت ایوب کے سب اونٹوں کو جلا دیا۔ پھر شیطان اونٹوں کے نگران کی شکل میں ایوب کے پاس آیا، جبکہ آپ کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہے تھے۔ شیطان جو انسانی شکل میں آیا ہوا تھا حضرت ایوب سے کہنے لگا ایوب تو نے دیکھا کہ آگ آئی اور اس نے تیرے اونٹ ہی جلا دیئے اور دوسرے کے اونٹ بھی راکھ کر دیئے۔ حضرت ایوب نے فرمایا سب تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے وہ اونٹ عطا فرمائے تھے، اسی نے لے لئے ہیں۔ میں اپنے مال اور جان کو فنا ہونے والا جانتا ہوں۔ ابلیس نے کہا تیرے رب نے آسمان سے آگ برسائی جس نے سب اونٹ جلا

دیئے۔ لوگ حیران اور متعجب تھے۔ بعض کہتے ایوب کسی کی عبادت نہیں کرتا یہ کسی دھوکا میں ہے۔ بعض کہتے اگر ایوب کا کوئی خدا ہوتا تو ان کے اونٹ ضائع نہ ہوتے۔ بعض کہتے اللہ تعالیٰ نے اس لئے ان کے ساتھ ایسا کیا ہے تاکہ ان کے دشمن خوش ہوں اور دوست پریشان ہوں۔ حضرت ایوب نے کہا الحمد للہ جب میں دنیا میں آیا تھا تو برہنہ تھا اور پھر جب واپس جاؤں گا تو بھی برہنہ ہوں گا۔ پھر قیامت کے دن جب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا تو تب بھی برہنہ ہوں گا۔ تیرے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب تجھے کوئی چیز عاریۃً ملے تو تو پھولے نہ سمائے اور جب وہ عاریۃً چیز واپس لے تو تو آہ و فغاں شروع کر دے۔ تیرا اور تیرے مال کا اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تجھ میں بھلائی دیکھتا تو تیری روح کو ان روحوں کے ساتھ قبل کرتا اور تو شہید ہو جاتا لیکن اس نے تجھ میں برائی دیکھی ہے اس لئے اس نے تمہیں ان شہداء سے نکال دیا ہے۔ ابلیس اپنے چیلوں کی طرف ذلیل و رسوا ہو کر لوٹا اور انہیں کہا تمہارے پاس کیا طاقت ہے میں تو ایوب کو زخمی نہیں کر سکا۔ ایک شیطان نے کہا میرے پاس یہ طاقت ہے اگر تو چاہے تو میں ایک چیخ ماروں جسے کوئی بھی ذی روح سنے گا تو اس کی روح نکل جائے گی۔ شیطان نے اسے کہا ان کی بکریاں جہاں چر رہی ہیں وہاں جاؤ اور ان کے درمیان چیخ مارو۔ اس نے ابلیس کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے بکریوں کے ریوڑ میں جا کر چیخ ماری تو وہ سب مر گئیں پھر وہ چرواہے کی شکل میں ایوب کے پاس آیا، حضرت ایوب کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابلیس نے پہلے کی طرح گفتگو کی تو حضرت ایوب نے بھی پہلے کی طرح جواب دیا۔ پھر ابلیس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور کہا تمہارے پاس کون سی طاقت ہے میں تو ایوب کے دل کو زخمی نہیں کر سکا۔ ایک جن نے کہا میرے پاس طاقت ہے، میں تند و تیز ہوا بن کر ہر چیز کو اڑا لے جاؤں گا۔ ابلیس نے اسے کہا تم جاؤ اور ان کی کھیتیوں پر حملہ کر دو وہ شیطان چلا گیا لوگوں کو محسوس نہ ہوا حتیٰ کہ ایک تیز آندھی چلی جو ہر چیز کو اڑا کر لے گئی۔ یوں محسوس ہوتا گویا یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر ابلیس ایک کسان کی صورت میں ایوب کے پاس آیا۔ آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے پہلے کی طرح گفتگو کی' حضرت ایوب نے بھی پہلے کی طرح جواب دیا۔ جب حضرت ایوب کا تمام مال ضائع ہو گیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور راضی بقضاء الٰہی ہوئے اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ جب ابلیس نے حضرت ایوب کا سارا مال ضائع کر دیا تو پھر اوپر چڑھ گیا اور کہا الٰہی ایوب کو تو نے جو اولاد عطاء کی ہے اور تو نے مال عطا کیا ہے اسی وجہ سے وہ تیرا شکر کرتا ہے۔ کیا تو مجھے اس کی اولاد پر تسلط دیتا ہے۔ کیونکہ یہ اولاد کی تکلیف ایسی تکلیف ہے جس سے بڑے بڑے مردوں کے کلیجے پگھل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا میں نے تجھے اس کی اولاد پر بھی تسلط عطاء کیا ہے۔ دشمن خدا چلا گیا۔ حضرت ایوب کی اولاد کے پاس آیا جبکہ وہ اپنے محل میں تھے۔ اس نے محل کو ہلایا اور دیواروں کو آپس میں ٹکرایا پھر لکڑیاں اور پتھر ان کے اوپر پھینکے حتیٰ کہ سب جب زخمی ہو گئے تو ابلیس نے محل کو اٹھا کر الٹا کر کے پھینک دیا، وہ ایوب کے پاس معلم بن کر آیا جو ان کو حکمت سکھایا کرتا تھا۔ زخمی حالت میں آیا، جبکہ اس کا خون اور دماغ بہہ رہا تھا۔ کہنے لگا ایوب اگر آپ اپنے بیٹوں کو دیکھتے کہ انہیں کیسے عذاب دیا گیا اور کیسے انہیں الٹا گرایا گیا، جبکہ ان کے خون اور دماغ بہہ رہے تھے اگر آپ دیکھتے کہ ان کے پیٹ کیسے پھٹے تھے اور ان کی انتڑیاں کیسے بکھری پڑی تھیں اور ان کے دل کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کو اولاد کا غم اور تکلیف یاد دلاتا رہا حتیٰ کہ آپ کا دل پسیج گیا اور آپ رونے لگے پھر آپ نے مٹی کی مٹھی بھر کر اپنے سر پر ڈال دی اور کہا کاش مجھے میری ماں جنم ہی نہ دیتی۔ ابلیس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً اوپر گیا اور اس وقت وہ ایوب کی جزع فزع پر خوش تھا۔ اتنے میں ایوب واپس پلٹے اور توبہ و استغفار کیا۔ فرشتے حضرت ایوب کی توبہ لے کر اوپر چڑھے اور ابلیس سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ ابلیس ذلیل و رسوا ہو کر ٹھہر

گیا اور کہا یا الٰہی ایوب پر مال اور اولاد کا غم تو آسان تھا کیونکہ انہیں تو نے نفس کی صحت سے نواز ا تھا اور اسے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مال اور اولاد پھر عطاء فرما دے گا کیا تو مجھے ان کے جسم پر تسلط عطاء فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا تجھے میں نے اس کے جسم پر بھی تسلط عطا کیا لیکن اس کی زبان اور اس کے دل پر تجھے تسلط نہ ہوگا اللہ تعالیٰ جانتا تھا اور ان چیزوں پر تسلط اپنی رحمت کی بناء پر عطا نہ فرمایا تا کہ ایوب کے اجر میں اضافہ ہو اور صبر کرنے والوں کے لئے نمونہ بن جائیں اور ہر ابتلاء میں عبادت گزاروں کے لئے نصیحت بن جائیں تا کہ دنیا والے صبر اور ثواب کی امید میں آپ سے مانوس ہوں۔ ابلیس جلدی سے حضرت ایوب کے پاس پہنچا تو اس نے آپ کو سجدہ میں پایا۔ آپ کے سر اٹھانے سے پہلے وہ آپ کے سامنے سے آیا اور آپ کے ناک میں پھونک ماری جس کی وجہ سے آپ کا سارا جسم پھول گیا اور سر سے پاؤں تک پورے جسم پر پھنسیاں نکل آئیں۔ وہ پھنسیاں بکریوں کے جگر جتنی بڑی بڑی تھیں۔ آپ کے جسم میں خارش شروع ہوگئی۔ پہلے آپ اپنے ناخنوں سے کھجلاتے رہے حتیٰ کہ ناخن گر گئے پھر کھردرے ٹاٹ سے کھجلایا حتیٰ کہ ٹاٹ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا پھر ٹھیکریوں اور پتھروں سے کھجلایا آپ متواتر اسی طرح کھجلاتے رہے حتیٰ کہ گوشت گرنے لگا اور جسم میں بدبو پیدا ہوگئی۔ شہر والوں نے بدبو کی وجہ سے شہر سے نکال دیا اور انہیں ایک اروڑی پر ڈال دیا اور اوپر ایک چھپر بنا دیا۔ سب لوگ آپ کو چھوڑ گئے لیکن آپ کی وفادار بیوی رحمت بنت افرائیم بن یوسف بن یعقوب نے اسے نہ چھوڑا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کی بیوی یوسف علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ جیسا کہ ہم نے سورۂ یوسف میں بیان کیا ہے۔ وہ آپ کے پاس آتی رہتی تھی اور جس چیز کی آپ کو ضرورت ہوتی وہ بھی مہیا کرتی تھی، جب تینوں ساتھیوں نے الیفن' یلدد اور صافر نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے تو انہوں نے بہتان طرازی شروع کر دی، وہ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن انہوں نے آپ کے دین کو نہ چھوڑا۔ جب آزمائش لمبی ہوگئی تو وہ تینوں آپ کے پاس گئے اور آپ سے نازیبا گفتگو کرنے لگے اور کہنے لگے جس گناہ کی وجہ سے تم سزا میں مبتلا ہو اس سے توبہ کرو۔

راوی کہتے ہیں ان تینوں کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا، جو عنفوان شباب پر تھا، وہ بھی ایمان لے آیا تھا، اس نے تینوں افراد کو کہا اے عمر رسیدہ لوگو آپ لوگ اپنی بزرگی کی وجہ سے بات کرنے کے زیادہ مستحق ہو لیکن آپ لوگوں نے جو بات کی ہے اس سے بہتر بات بھی کر سکتے تھے اور جو تم نے رائے دی ہے اس سے بہتر رائے دے سکتے تھے۔ حضرت ایوب کا تم پر حق ہے اور تم پر ان کی ذمہ داری ہے۔ اے لوگو! تمہیں معلوم ہے تم نے کس شخص کی توہین کی ہے اور کس شخص کی نافرمانی کی ہے اور وہ مرد کامل ہے جس کی تم نے عیب جوئی کی ہے اور اس پر بہتان باندھا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی اس کے چیدہ اور اہل زمین میں سے برگزیدہ ہیں۔ پھر تمہیں یہ بھی معلوم نہیں اور نہ تمہیں اللہ نے مطلع کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے انہیں مقام نبوت پر فائز فرمایا ہے کبھی وہ اس سے ناراض نہیں ہوا ہے اور جو کرامت وعزت اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہے وہ اللہ نے واپس نہیں لی ہے اور تم اتنا عرصہ ان کی معیت میں رہے ہو کیا کبھی ایوب نے اللہ تعالیٰ کے متعلق کبھی کوئی غلط بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے برگزیدہ بندوں انبیاء وصالحین کو آزمائش میں ڈالا ہے اور یہ مصائب وآلام ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے ہوں بلکہ یہ آزمائشیں تو ان کی مراتب کی بلندی کے لئے ہوتی ہیں۔ اگر آپ لوگ ایوب کو اس مرتبہ پر فائز نہیں سمجھتے تو کم از کم تمہارے بھائی تو ہیں اور کسی عقلمند کے لئے یہ مناسب نہیں کہ تکلیف کے وقت اپنے بھائی کو چھوڑ جائے اور مصیبت میں ابتلاء کے وقت اس کو عار دلائے اور اس کی عیب جوئی کر کے ایسی باتوں کے

ساتھ جن کی حقیقت کا اسے علم ہی نہیں ہے حالانکہ اس کا بھائی پہلے ہی غمگین وحزین ہو بلکہ مروت کا تقاضا تو یہ ہے کہ بھائی اپنے مصیبت زدہ بھائی پر رحم کرے اور اس کے ساتھ غم میں شریک ہو اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کرے اور اس کی صحیح کام کی طرف رہنمائی کرے۔ وہ شخص قطعاً دانشمند اور عقلمند نہیں جو ان باتوں سے جاہل ہو۔ اے عمر رسیدہ لوگو! اللہ کی عظمت وجلال کی قسم موت کا ذکر تمہاری زبانوں کو کاٹتا ہے اور تمہارے دلوں کو توڑتا ہے، کیا تم بے خبر ہو کر اللہ کے کچھ برگزیدہ بندے ایسے ہوتے ہیں جو خشیت الٰہی کی وجہ سے خاموش ہوتے ہیں حالانکہ نہ وہ عاجز ہوتے ہیں اور نہ گونگے ہوتے ہیں بلکہ وہ بڑے فصیح وبلیغ، ذکی ہوتے ہیں۔ معرفت الٰہی کی شراب طہور سے مست ہوئے ہیں لیکن عظمت الٰہی کی وجہ سے ان کی زبانیں بولنے سے عاجز ہوتی ہیں۔ ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہوتا ہے اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ان کی عقول حیران وششدر ہوتی ہیں، ہر وقت ان پر جلال الٰہی اور عظمت کا رعب چھایا رہتا ہے۔ لیکن جب اس کیفیت سے باہر آتے ہیں اور ہوش وحواس قائم رکھتے ہیں تو پھر نیک اعمال کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں، اپنے آپ کو ظالموں اور گنہگاروں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ ابرار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والا اور اپنے آپ کو کوتاہی کرنے والا شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ بڑے دانشمند اور طاقتور ہوتے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ چھوٹے اور بڑے کے دل میں اپنی رحمت کے طفیل حکمت کے انمول موتی ڈالتا ہے۔ پھر جب دل میں حکمت پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ اس کو بندے کی زبان پر ظاہر فرماتا ہے، حکمت کا تعلق عمر، بڑھاپے اور تجربے سے نہیں ہے، جب اللہ تعالیٰ بچپن میں ہی کسی شخص کو حکمت سے نوازتا ہے تو حکماء کی مجلس میں اس کا مرتبہ کم نہیں ہوتا (اگرچہ وہ عمر میں چھوٹا ہوتا ہے) اور حکمت کے حامل لوگ جانتے ہیں کہ عزت کا نور دین خداوندی ہے۔

پھر حضرت ایوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے ان سے اعراض فرمایا اور آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرنے لگے۔ عرض کی اے میرے پروردگار تو نے مجھے کس لئے پیدا فرمایا؟ کاش تو میری تخلیق ہی نہ کرتا کاش مجھے اپنے جرم کا علم ہو جاتا اور اپنے اس فعل کا پتہ چل جاتا جس کی وجہ سے تو نے مجھ سے اعراض فرمالیا ہے۔ اگر میں نے کوئی گناہ کیا تھا تو تو مجھے موت دے دیتا اور مجھے اپنے آباء کے ساتھ ملادیتا۔ میرے لئے اس کیفیت سے موت بہتر تھی۔ کیا میں مسافروں کے لئے پناہ گاہ اور مسکینوں کے لئے قرار گاہ نہ تھا اور یتیموں بیواؤں کا نگران وخیر خواہ نہ تھا۔ الٰہی! میں تیرا بندہ ہوں اگر تو مجھ پر احسان فرمائے تو یہ تیرا کرم ہے اور اگر تو مجھے تکلیف پہنچائے تو تجھے اختیار ہے تو نے مجھے مصیبتوں کا نشانہ اور آزمائش کی آماجگاہ بنا دیا۔ مجھ پر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ اگر تو اس کو پہاڑ پر مسلط کرتا تو وہ بھی برداشت نہ کرسکتا۔ پھر میرے جیسا ناتواں کیسے برداشت کرے گا۔ تیرے فیصلہ اور قضا نے مجھے پست کر دیا ہے اور تیری سلطنت اور غلبہ نے بدحال کر دیا ہے اور میرے جسم کو نحیف وکمزور کر دیا ہے۔ اگر میرا رب اپنی ہیبت کو میرے سینہ سے نکال دے اور میری زبان کو آزاد کر دے تاکہ میں دل کھول کر اپنے دکھوں کا اظہار کرسکوں پھر بندے کو اپنے نفس پر حجت قائم کرنے کی اجازت بھی ہو تو مجھے یقین ہے کہ وہ کریم ذات مجھے اس تکلیف سے نجات عطاء فرمادے گی۔ لیکن وہ ذات مجھ سے بہت بلند وبالا ہے، وہ مجھے دیکھتا ہے لیکن میں اسے نہیں دیکھتا۔ وہ میری بات سنتا ہے لیکن میں اسے نہیں سنتا۔ وہ میری طرف نظر عنایت نہیں کرتا ہے اور نہ مجھ پر رحم فرماتا ہے اور نہ وہ میرے قریب ہے اور نہ مجھے قریب کرتا ہے کہ میں اپنی گزارش کرسکوں اور اپنی برأت کا اظہار کرسکوں اور اپنی طرف سے مخاصمہ کرسکوں۔ حضرت ایوب نے جب یہ کہا تو آپ کے اصحاب آپ کے پاس بیٹھے تھے، فوراً ایک بادل چھا گیا، آپ کے

اصحاب نے اسے عذاب الٰہی گمان کیا۔ پھر اس بادل سے آواز آئی اے ایوب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تیرے قریب ہوں اور ہمیشہ تیرے قریب رہا ہوں اٹھ اور اپنا عذر پیش کر اور اپنی برأت کا اظہار کر اور اپنا دفاع کر۔ اپنا کمر بند مضبوطی سے باندھ اور اگر تجھے طاقت ہے تو اس جابر کے مقام پر کھڑا ہو جو کسی جابر سے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ تیرے نفس نے تجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جو توانی طاقت کے ساتھ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے (لیکن ایسا ہرگز نہیں) تو اس دن کہاں تھا جس دن میں نے زمین کو تخلیق کیا تھا اور اس کو اس کی بنیادوں پر رکھا تھا کیا تو اس کی اطراف پھیلانے کے وقت میرے ساتھ تھا؟ کیا تجھے علم ہے کہ میں نے اسے کس مقدار میں بنایا ہے اور کس چیز پر اس کو رکھا ہے؟ کیا تیرے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے پانی نے زمین کو اٹھایا ہوا ہے؟ یا کیا تیری حکمت سے زمین کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے آسمان کو ہوا میں چھت کی صورت میں بنایا؟ نہ تو وہ اوپر سے کسی رسی سے باندھا ہوا ہے اور نہ نیچے سے کوئی اس کا ستون ہے کیا تیری حکمت سے اس کا نور جاری ہے یا اس کے ستارے اپنے اپنے مدار میں رواں دواں ہیں یا گردش لیل ونہار کیا تیرے حکم سے ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے نہریں جاری فرمائیں اور دریاؤں سمندروں کو پانی سے بھر دیا۔ کیا تیرے حکم سے پانی کی موجیں اپنی حدود سے تجاوز کرتی ہیں یا کیا تیری قدرت سے رحم کے صدف کا منہ کھلتا ہے۔ جب مدت حمل پوری ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے پانی کو مٹی پر روکا اور میں نے بلند و بالا پہاڑ قائم کر دیئے۔ کیا تو جانتا ہے کہ کس چیز پر میں نے ان کو گاڑھ دیا ہے اور یہ کتنے وزنی میں نے بنائے ہیں۔ کیا تیرے پاس ایسی طاقت ہے کہ تو ان کو اٹھا سکے۔ کیا تو جانتا ہے کہ پانی آسمان کی کس جگہ سے نازل ہوتا ہے؟ کیا تو جانتا ہے کہ بادل کس سے بنتا ہے؟ کیا تو جانتا ہے کہ اولوں اور برف کا خزانہ کہاں ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ دن کے وقت رات کا خزانہ کہاں ہوتا ہے اور رات کے وقت دن کا خزانہ کہاں ہوتا ہے، ہوا کا خزانہ کہاں ہوتا ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے درخت کس زبان میں کلام کرتے ہیں اور کس ذات نے مردوں کے اندر عقل کی دولت رکھی ہے، کانوں اور آنکھوں کے سوراخ کس نے بنائے۔ فرشتے کس کی حکومت کے سامنے سرنگوں ہیں اور جابر لوگ کس کی طاقت کے سامنے مغلوب ہیں اور کس نے خاص اپنی حکمت سے رزق کو تقسیم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کے سامنے اپنی قدرت کی نشانیوں کا کثرت سے ذکر فرمایا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کیا (اے ساری قدرتوں کے مالک!) جو کچھ تو نے ارشاد فرمایا اس کے جواب سے میری ذات بہت حقیر ہے۔ میری زبان گنگ ہے اور میری عقل بہت پیچھے ہے اور میری قوت بہت کمزور ہے۔ اے میرے معبود! مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ تو نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں وہ سب تیری قدرت کی کرشمہ سازی ہے اور تیری حسن تدبیر کی مرہون منت ہے بلکہ تیری قدرت اس سے بھی کہیں بلند و بالا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر تو کوئی کام کرنا چاہے تو کوئی طاقت تجھے عاجز نہیں کر سکتی اور تیری نظر سے کچھ مخفی نہیں ہے۔

اے میرے الہ! جب مجھے مصیبت نے چاروں طرف سے گھیر لیا تو میری زبان سے بے ساختہ یہ جملے نکل پڑے، میں ضبط نفس نہ کر سکا۔ مصیبت نے ہی مجھے بولنے پر اور شکایت کی زبان کھولنے پر مجبور کیا۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں دھنس جاتا اور میں ایسی کلام نہ کرتا جو میرے رب کریم کی ناراضگی کا باعث بنی تھی۔ کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتا، میں نے اپنے عذر کو پیش کرنے کے لئے زبان کھولی کاش میں خاموش رہتا تاکہ تو مجھ پر اپنی رحمت کا مینہ برساتا۔ مجھ سے شکایت کا کلمہ صادر ہوا لیکن آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔

میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا ہے اور اپنی زبان کو دانتوں کے نیچے دبا دیا ہے اور اپنے چہرے پر برائے ندامت و افسوس مٹی مل لی ہے۔ میں آج تجھ سے پناہ طلب کرتا ہوں، اس مصیبت میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں مجھے اس مصیبت سے بچا لے۔ میں تیرے عذاب سے بچنے کے لئے تیری بارگاہ میں فریاد کناں ہوں تو میری مدد فرما، میں تجھ سے مدد کا طلبگار ہوں تو میری اعانت فرما۔ میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں تو ہی میری کفالت فرما۔ میں تجھ سے حفاظت چاہتا ہوں مجھے ہر موذی چیز سے محفوظ فرما، میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں میرے عیبوں پر پردہ ڈال دے۔ آئندہ میں کوئی ایسا قول وفعل نہیں کروں گا جو تجھے ناپسند ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی اخلاص میں ڈوبی ہوئی دعا کو قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ میرا علم تجھ میں نافذ ہے اور میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے، میں نے تجھے معاف کر دیا اور تیرے اہل اور مال تجھ پر لوٹا دیا اور ان کی مثل تجھے اور بھی عطا فرما دیا تا کہ تیری ذات بعد میں آنے والوں کے لئے نشانی بن جائے اور تو مصیبت زدوں کے لئے عبرت ہو اور صبر کرنے والوں کے لئے تسلی کا باعث ہو۔ اپنا پاؤں (زمین پر) مارو۔ یہ نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا چشمہ ہے اور اس میں تیرے لئے شفا ہے اور اپنے اصحاب کے لئے قربانی دو اور ان کے لئے مغفرت طلب کرو۔ انہوں نے تیرے بارے میں میری نافرمانی کی ہے۔ حضرت ایوب نے اپنا پاؤں زمین پر مارا تو ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ آپ اس میں داخل ہوئے اور غسل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام بیماریاں اس پانی سے دور فرما دیں۔ پھر آپ باہر تشریف لائے اور بیٹھ گئے۔ آپ کی زوجہ محترمہ آئی، انہوں نے آپ کو اپنی جگہ پر تلاش کیا تو آپ وہاں نہ ملے۔ حیران و ششدر ہو کر کھڑی ہو گئی (کہ ایوب جو اپنی جگہ سے ادھر ادھر حرکت نہ کر سکتے تھے کہاں چلے گئے) پھر حضرت ایوب سے پوچھنے لگی اے اللہ کے بندے کیا تجھے اس شخص کے متعلق کچھ علم ہے جو یہاں مصیبت و بیماری میں پڑا ہوتا تھا۔ حضرت ایوب نے فرمایا ہاں مجھے علم ہے۔ مجھے کیوں نہ علم ہو۔ یہ جملہ کہہ کر مسکرائے اور پھر فرمایا وہ میں ہی تو ہوں۔ آپ کے ہنسنے سے بیوی پہچان گئی اور ان کے گلے لگ گئی(1)۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں عبداللہ کی جان ہے، بیوی آپ کے گلے سے چمٹی رہی حتیٰ کہ ہلاک شدہ مال اور اولاد ان کے سامنے سے اللہ تعالیٰ نے گزار دیا۔ اس کا ذکر آیت کریمہ میں ہے(2)۔

۲۔ مسنی کو حمزہ نے یاء کے سکون کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الضر بری حالت کو کہتے ہیں خواہ وہ نفس میں ہو یا بدن میں یا مال میں یا عزت میں ہو۔ قاموس میں ہے۔ الضر بالفتح اور بالضم کا معنی ضد النفع ہے یا بالفتح مصدر ہے اور بالضم اسم ہے(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بالفتح ہر ضرر کے لئے ہے اور بالضم نفس کی بری حالت کے ساتھ خاص ہے جیسے مرض اور بدنی کمزوری وغیرہ(4)۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا کے وقت اور اس سبب کے بارے میں اختلاف ہے جس کی وجہ سے آپ نے انی مسنی الضر کہا تھا اور اسی طرح آپ کی مصیبت کی مدت کے متعلق بھی اختلاف ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن شہاب نے حضرت انس سے حدیث نقل کی ہے کہ ایوب علیہ السلام اٹھارہ سال مصیبت میں مبتلا رہے۔ وہب کہتے ہیں ایوب علیہ السلام پورے تین سال مصیبت میں گرفتار رہے، ایک دن بھی زائد نہیں تھا۔ کعب فرماتے ہیں ایوب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 601 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 465 (العلمیہ)

علیہ السلام سات سال مصیبت میں مبتلا رہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ سات سال' سات ماہ اور سات دن مبتلا رہے۔ حسن فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام سات سال اور کچھ مہینے بنی اسرائیل کی اروڑی پر پڑے رہے اور کیڑے آپ کے اوپر گھومتے رہے۔ آپ کی بیوی رحمت کے سوا کوئی آپ کے قریب نہیں آتا تھا۔ وہ آپ کی خدمت پر لگی رہی اور آپ کے لئے کھانے لاتی تھی۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے تو وہ بھی آپ کے ساتھ حمد کرتی تھی۔ حضرت ایوب علیہ السلام اس کیفیت میں ذکر الٰہی کرتے رہے اور مصیبت پر صبر کرتے رہے(1)۔

ابلیس حضرت ایوب کا یہ صبر اور ایسی حالت میں بھی ذکر الٰہی دیکھ کر چیخ پڑا اور روئے زمین پر رہنے والے اپنے لشکروں کو جمع کیا۔ جب وہ جمع ہو گئے تو انہوں نے پوچھا اتنی جزع فزع کیوں کر رہے ہو؟ ابلیس نے کہا مجھے تو اس بندے نے عاجز کر دیا ہے جس کا نہ میں نے مال چھوڑا ہے، نہ اولاد لیکن ہر تکلیف پر اس کے صبر میں اضافہ ہوتا گیا ہے پھر مجھے اس کے جسم پر تسلط دیا گیا، میں نے اپنی سازش سے اسے اروڑی پر ڈال دیا جہاں اس کی بیوی کے سوا کوئی اس کے قریب نہ آتا تھا۔ اب میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے بھٹکانے کے لئے تم میری مدد کرو۔ چیلوں نے کہا تم وہ چال اور حیلہ سازیاں کیوں نہیں استعمال کرتے؟ جن کے ذریعے تم نے گزشتہ لوگوں کو گمراہ کیا تھا۔ ابلیس نے کہا میں وہ سارے حربے استعمال کر چکا ہوں، اب تم کوئی اور تدبیر سوچو اور مجھے بتاؤ۔ چیلوں نے کہا جس حیلہ سے تو نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا تھا وہ کیا تھا؟ اس نے کہا میں نے عورت کے ذریعے ان کو جنت سے نکالا تھا۔ انہوں نے کہا ایوب پر بھی عورت کے ذریعے وار کرو۔ ایوب اپنی بیوی کی بات نہ موڑے گا۔ کیونکہ وہی ان کی خدمت گزار ہے اور دوسرا کوئی ان کے پاس نہیں آتا ہے' ابلیس نے کہا تم نے ٹھیک کہا ہے۔ ابلیس چلا گیا اور ان کی بیوی کے پاس انسانی شکل میں پہنچ گیا۔ پوچھا تمہارا خاوند کہاں ہے۔ اے اللہ کی بندی! بیوی نے کہا یہی تو ہے جو اپنے پھوڑوں کو کھجلا رہا ہے اور کیڑے جس کے جسم پر گھوم رہے ہیں۔ شیطان نے ان کی یہ بات سنی تو اسے کچھ امید لگ گئی یہ کلمات وہ بے صبری کی وجہ سے کہہ رہی ہے۔ اس لعین نے بیوی کے دل میں وسوسہ ڈالا اور اسے گزشتہ زندگی کی نعمتیں اور مال و متاع کی یاد دلائی اور حضرت ایوب کے جمال و جوانی کا زمانہ یاد دلایا اور اب وہ جس کرب میں مبتلا تھے اس کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ مصیبت تو کبھی اب دور نہ ہوگی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں بیوی کو جب خوشحالی کا زمانہ یاد آیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ ابلیس جان گیا کہ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ وہ ایک بکری کا بچہ لے کر آیا اور کہا کہ ایوب غیر اللہ کے نام پر یہ بکرا ذبح کریں تو اس مصیبت سے بچ جائیں گے۔ بیوی چیختی چلاتی ہوئی آئی اور کہا اے ایوب کب تک اس عذاب میں مبتلا رہو گے' تمہارا مال کہاں گیا' تمہاری اولاد اور دوست احباب کہاں گئے۔ وہ تمہارا جمال اور حسین جسم کہاں گیا۔ یہ بکری کا بچہ ذبح کرو اور آرام حاصل کرو۔ حضرت ایوب نے فرمایا اللہ کا دشمن (ابلیس) تیرے پاس پہنچ گیا ہے اور تجھ میں پھونک مار دی ہے۔ تو مال اولاد اور صحت پر کیوں رو رہی ہے۔ وہ مجھے عطاء کس نے کئے تھے۔ بیوی نے کہا اللہ نے۔ پھر پوچھا اس نے ہمیں ان نعمتوں سے کتنا عرصہ لطف اندوز کیا۔ بیوی نے کہا اسی 80 سال۔ اور اب کتنا عرصہ اس نے مجھے تکلیف میں مبتلا رکھا ہے۔ عرض کی سات سال اور کچھ مہینے۔ پھر انصاف تو یہ ہے کہ اسی 80 سال میں مصیبت پر صبر کروں جیسا کہ ہم اسی 80 سال خوشحالی میں رہے۔ قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی تو میں تجھے سو کوڑے ماروں گا کیونکہ تو نے مجھے غیر اللہ کے نام پر بکرا ذبح کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جو کچھ تو کھانا پینا لاتی ہے وہ مجھ پر حرام ہے اور جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74 (الفکر)

کچھ تو لے کر آتی ہے تیرے اس مشورہ کے بعد کوئی چیز چکھوں تو مجھ پر حرام ہے تو مجھ سے جدا ہو جا آئندہ میں تجھے یہاں نہ دیکھوں۔ حضرت ایوب نے اسے دور کر دیا اور وہ چلی گئی۔ جب حضرت ایوب نے دیکھا کہ اب نہ کھانا ہے، نہ پینے کی کوئی چیز ہے اور نہ کوئی دوست ہے تو آپ رب کے حضور سجدہ میں گر گئے اور عرض کی رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ(1)۔

3 اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ پر ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی تکلیف کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی غایت رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے مطلوب ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی تکلیف کا ذکر فرمایا اور اس اسلوب کی وجہ سوال میں ایک مخصوص لطف ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِیْنَ ﴿۸۴﴾

''تو ہم نے قبول فرمالی اس کی فریاد اور ہم نے دور فرما دی جو تکلیف انہیں پہنچ رہی تھی 1 اور ہم نے عطا کئے اسے اس کے گھر والے نیز اتنے اور 2 ان کے ساتھ اپنی رحمت خاص سے اور یہ نصیحت ہے عبادت گزاروں کے لئے 3 ''

1 اللہ تعالیٰ نے اپنے صابر و شاکر بندے کی دعا کو شرف قبول عطاء فرمایا اور فرمایا اپنا پاؤں زمین پر مارو' پاؤں مارا تو چشمہ جاری ہو گیا۔ فرمایا اس میں غسل کرو' غسل کیا تو ہر بیماری اور تکلیف دور ہو گئی اور آپ کا حسن و شباب پہلے سے کہیں زیادہ ظاہر ہو گیا۔ پھر آپ چالیس قدم چلے تو دوبارہ حکم ہوا کہ ایک مرتبہ پھر زمین پر پاؤں مارو۔ آپ نے پاؤں مارا تو ایک اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ رواں ہو گیا' آپ نے اس کا پانی پیا تو باطنی بیماریاں دور ہو گئیں۔ آپ تمام مردوں سے زیادہ صحت منداور حسین و جمیل ہو گئے۔ آپ نے ایک قیمتی جوڑا زیب تن فرمایا اور اپنے مال واہل کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوگنا کر دیا تھا۔ قسم **بخدا** یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ پانی جس سے آپ نے غسل فرمایا تھا اس کے چھینٹوں سے ٹینے پر سونے کی ٹکڑیاں اترنے لگیں اور ایوب علیہ السلام ان پر ہاتھ مارنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اے ایوب کیا میں نے تجھے غنی نہیں کر دیا۔ حضرت ایوب نے کہا کیوں نہیں' لیکن یہ تیری برکت ہے اور تیری برکت سے کون سیر ہوتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایوب علیہ السلام برہنہ غسل فرما رہے تھے تو آپ کے اوپر سونے کی ٹکڑیاں گرنے لگیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام ان کی مٹھیاں بھر بھر کے کپڑے میں ڈالنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ندا دی اے ایوب کیا میں نے تجھے غنی نہیں کر دیا۔ عرض کی تیری عزت کی قسم یقیناً تو نے مجھے غنی فرما دیا ہے لیکن تیری برکت سے میں مستغنی نہیں ہو سکتا(2)۔ حسن فرماتے ہیں حضرت ایوب غسل کر کے باہر تشریف لائے تو ایک بلند مقام پر تشریف فرما ہو گئے(3)۔ آپ کی بیوی نے سوچا کہ اگر ایوب نے مجھے نکال دیا ہے تو میں اسے کس کے سپرد کر سکتی ہوں' کیا میں اسے چھوڑ دوں، وہ جزع فزع کرتے ہوئے اس دارفانی سے چل بسے اور ضائع ہو جائے اور اس کو درندے کھا جائیں۔ (نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو گا) میں ضرور اس کی طرف لوٹ کر جاؤں گی آپ کی بیوی رحمت لوٹ کر آئی تو وہاں نہ کوئی اروڑی تھی اور نہ وہاں پہلے کا سا منظر تھا' ساری صورت حال بدل چکی تھی۔ جہاں وہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا وہاں بیوی چکر کاٹنے لگی اور ایوب کی تلاش میں رو رہی تھی۔ حضرت ایوب ان کی تلاش کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایوب علیہ السلام چونکہ نیا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے اس لئے بیوی ان سے پوچھنے سے جھجک رہی تھی۔ حضرت ایوب نے اسے خود

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 75-74 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 42 (وزارت تعلیم) 3۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 592 (العلمیہ)

بلا لیا اور پوچھا اے اللہ کی بندی تو کس کی تلاش میں ہے؟ بیوی رحمت رونے لگی اور کہا میں اس شخص کی تلاش کر رہی ہوں جو یہاں اروڑی پر مصیبت میں مبتلا پڑا ہوا تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں ہو رہا کہ وہ ضائع ہو گیا ہے یا اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ حضرت ایوب نے پوچھا وہ تیرا کیا لگتا؟ تھا روتے ہوئے کہا وہ میرا سرتاج تھا۔ حضرت ایوب نے پوچھا کیا تو اسے دیکھے تو پہچان لے گی، بیوی نے کہا جس نے بھی اس کو دیکھا ہے وہ اس سے مخفی نہیں ہو سکتا۔ بیوی خوف کی حالت میں غور سے حضرت ایوب کو دیکھنے لگی اور پھر کہا جب وہ صحیح اور تندرست تھا تو کچھ تیرے مشابہ تھا۔ حضرت ایوب نے فرمایا میں ہی وہ ایوب ہوں جس کو ابلیس کے لئے بکرا ذبح کرنے کا مشورہ دیتی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور شیطان کی نافرمانی کی۔ اللہ تعالیٰ سے میں نے دعا کی تو اس نے اپنی بندہ نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر یہ کرم فرمایا جو تیرے سامنے ہے۔

وہب کہتے ہیں حضرت ایوب کئی سال تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد جب ابلیس پر غالب آ گئے اور وہ آپ کے قدم ڈگمگا نہ سکا تو ابلیس آپ کی بیوی کے سامنے ایسی خوبصورت ہیئت میں آیا کہ بنی آدم میں جسم، جمال اور مضبوط ہڈیوں کے اعتبار سے کوئی ایسا سواری پر سوار نہ ہوگا اور اس کی سواری بھی رونق، کمال اور ہڈیوں کی مضبوطی میں لاجواب تھی۔ شیطان نے آپ کی زوجہ محترمہ کو کہا تو مجھے جانتی ہے۔ بیوی نے کہا نہیں۔ ابلیس نے کہا میں زمین کا خدا ہوں اور میں وہ ذات ہوں جس نے تیرے خاوند کو اس تکلیف میں مبتلا کیا ہے کیونکہ اس نے آسمان کے خدا کی عبادت کی ہے اور مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے میں اس سے ناراض ہو گیا ہوں۔ اگر وہ مجھے ایک سجدہ کر دے تو میں اس کو اور تجھے سارا مال ومتاع اور اولاد واپس کر دوں گا کیونکہ وہ سب کچھ میرے پاس ہے اور شیطان نے وہ سب کچھ اس وادی میں دکھا بھی دیا جس وادی میں وہ ضائع ہوا تھا۔ وہب کہتے ہیں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ شیطان نے بیوی سے کہا اگر تیرا خاوند کھانا کھائے اور بسم اللہ شریف نہ پڑھے تو اسے اس تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ واللہ اعلم (1)۔

بعض کتب میں ہے کہ ابلیس نے بیوی کو کہا کہ تو مجھے سجدہ کرتا کہ میں تجھے مال اور اولاد واپس کر دوں اور تیرے خاوند کو بھی عافیت دے دوں۔ بیوی حضرت ایوب کے پاس آئی اور ابلیس کی ساری گفتگو سے آگاہ کیا۔ حضرت ایوب نے فرمایا اللہ کا دشمن تیرے پاس پہنچ گیا ہے تاکہ وہ تجھے تیرے دین سے برگشتہ کر دے۔ پھر حضرت ایوب نے قسم اٹھائی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی تو وہ انہیں سو کوڑے ماریں گے۔ ابلیس نے جب آپ کو اور آپ کی بیوی کو کفر کی دعوت دی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی انی مسنی الضر۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوب کی بیوی رحمت پر بھی رحم فرمایا کیونکہ انہوں نے تکلیف کے وقت ایوب علیہ السلام کے ساتھ صبر کیا تھا اور اس کے لئے حکم میں تخفیف فرما دی اور ایوب کو قسم پوری کرنے کی یہ تدبیر بتائی کہ اپنے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کا گٹھا لو اور اسے مارو اور اپنی قسم کو نہ توڑو۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے چھوٹی چھوٹی سو لکڑیوں پر مشتمل ایک مٹھی لے کر اپنی بیوی کو مارا۔

ایک روایت میں ہے کہ ابلیس نے ایک تابوت بنایا اور اس میں دوائیں رکھ کر حضرت ایوب کی بیوی کے راستہ پر بیٹھ کر لوگوں کا علاج کرنے لگے۔ آپ کی بیوی گزری تو کہا میرا بھی ایک مریض ہے کیا تو اس کا علاج کرے گا۔ ابلیس نے کہا ہاں ضرور علاج کروں گا قسم بخدا میں اور کچھ مال ومتاع نہیں چاہتا علاج کا صرف یہ صلہ چاہتا ہوں کہ جب میں اسے شفا دوں تو وہ کہے کہ تو نے مجھے شفا دی۔ بیوی نے ایوب کے پاس ابلیس کا یہ مکالمہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا وہ ابلیس ہے، اس نے تجھے دھوکا دیا ہے اور آپ نے قسم اٹھائی کہ اگر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 76 (الفکر)

اللہ نے شفادی تو اسے سوکوڑے ماریں گے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی لوگوں کا گھریلو کام کاج کر کے حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے خوراک لاتی تھی۔ جب تکلیف کا سلسلہ طویل ہو گیا تو لوگوں نے بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، سلسلہ یہاں تک پہنچ گیا کہ کوئی شخص انہیں کام پر نہیں لگاتا تھا۔ ایک دن خوراک کی تلاش میں پھرتی رہی لیکن کوئی چیز نہ مل سکی۔ آخر کار اس نے اپنے سر کے بال کاٹ کر ایک روٹی کے بدلے فروخت کئے اور وہ روٹی ایوب کو پیش کر دی۔ ایوب علیہ السلام نے پوچھا تیرے بال کہاں ہیں، تو اس نے بتایا کہ میں نے روٹی کے بدلے فروخت کر دیئے ہیں۔ اس وقت حضرت ایوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی رَبِّ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ۔

ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ جملہ اس وقت آپ کی زبان پر آیا جب کیڑے آپ کے دل اور زبان کی طرف جانے لگے۔ آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر یہ زبان اور دل کو کاٹ کر کھا گئے تو ذکر و فکر نہ ہو سکے گا(1)۔

حبیب بن ثابت نے لکھا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے تکلیف کا اظہار اس وقت کیا جب تین باتوں کا ظہور ہوا۔ 1۔ جب آپ کے اصحاب آپ کی خبر سن کر آپ کے پاس آئے اور دیکھا کہ آپ کی آنکھیں زائل ہو چکی ہیں اور نہایت برا حال ہے تو انہوں نے کہا کہ اگر اللہ کی بارگاہ میں تمہارا کوئی مرتبہ ہوتا تو تجھے یہ تکلیف نہ پہنچتی۔2۔ آپ کی بیوی نے جب خوراک کی خاطر اپنی مینڈھیاں فروخت کر دی تھیں اور ان کے عوض کھانا لے کر آپ کو پہنچایا تھا۔3۔ جب ابلیس نے کہا تھا کہ میں اس شرط پر تمہارا علاج کرتا ہوں جب تم کہو کہ میں نے تجھے شفادی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ابلیس نے حضرت ایوب کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تمہاری بیوی نے بے حیائی کا ارتکاب کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی مینڈھیاں کاٹی گئی ہیں۔ اس وسوسہ کے پیدا ہونے پر آپ کے لئے صبر کرنا مشکل ہو گیا اور بیوی کو بلا کر کہا میں تجھے سو کوڑے لگاؤں گا۔

بعض علماء نے مسنی الضر کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مجھے دشمنوں کے خوش ہونے کے دکھ نے آ لیا ہے' بعض روایات میں ہے کہ آپ سے شفا ملنے کے بعد پوچھا گیا کہ آپ کے لئے سب سے تکلیف دہ امر کیا تھا۔ فرمایا میری تکلیف پر میرے دشمنوں کا خوش ہونا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ آپ نے اس وقت کہا تھا جب ایک کیڑا آپ کی ران سے گر گیا تو آپ نے اسے اٹھا کر اپنی ران پر رکھ دیا اور فرمایا کھا' اللہ نے مجھے تیری خوراک بنایا ہے۔ اس کیڑے نے ایسا کاٹا کہ سب کیڑوں کے کاٹنے کی تکلیف سے اس کی تکلیف زیادہ ہوئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو صابر کہا ہے حالانکہ انہوں نے انی مسنی الضر۔ ومَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ کی کلام کے ساتھ شکوہ کیا تھا اور جزع و فزع کا اظہار کیا تھا۔

بعض علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ شکوہ و شکایت نہیں تھا بلکہ یہ حقیقت میں دعا تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا فاستجبنالہ ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جزع اس کو کہتے ہیں جب مخلوق کے پاس شکایت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے دکھوں اور تکالیف کا اظہار کرنا نہ تو جزع ہے اور نہ صبر کا ترک ہے۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَحُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ (میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں)(2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 76 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 77

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں جس نے لوگوں کے سامنے تکلیف کا اظہار کیا، جبکہ وہ قضاءِ الٰہی پر راضی تھا تو یہ جزع نہیں ہے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس حالت مرض میں پہنچے تو پوچھا کیا حال ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مغموم ہوں اور مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں کہتا ہوں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے جو ابن الجوزی نے نقل کی ہے کہ جبریل نے کہا اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرماتے ہیں اور تیرا حال پوچھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا ہائے میرا سر۔ یہ آپ ﷺ نے اس وقت کہا تھا جب حضرت عائشہ نے سر درد کی تکلیف میں کہا تھا ہائے میرا سر(1)۔

میں کہتا ہوں ابن اسحاق اور احمد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ جنت البقیع سے واپس تشریف لائے اور میرے پاس آئے درآنحالیکہ آپ کے سر میں درد تھا اور میں بھی سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔ میں نے کہا وارأساہ (ہائے سر) تو آپ ﷺ نے فرمایا بَلْ اَنَا وَاللّٰهِ وَارَأسَاهُ (بلکہ میں بھی کہتا ہوں قسم بخدا ہائے میرا سر)

لے حضرت ابن مسعود، ابن عباس، قتادہ، حسن اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پہلی اولاد کو ہی زندہ فرمادیا تھا اور ان کے مثل اور بھی عطاء فرمائے تھے۔ قرآن کے الفاظ کا ظاہر تو اسی کا مقتضی ہے۔

حسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی مثل اس مال سے عطاء فرمائے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پہلے زندہ کر دیا تھا(2)۔ اس کی دلیل ضحاک کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بیوی کو شباب عطا فرمایا تھا، اس سے چھبیس لڑکے پیدا ہوئے تھے۔

وھب کہتے ہیں آپ کی سات لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے تھے۔

ابن یسار کہتے ہیں آپ کے سات بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں۔ حضرت انس سے مرفوع روایت ہے کہ حضرت ایوب کے دو کھیت تھے ایک گندم کا اور دوسرا جو کا۔ اللہ تعالیٰ نے دو بادل بھیجے ایک بادل نے گندم کے کھیت پر سونا انڈیلا اور دوسرے بادل نے جو کے کھیت پر چاندی انڈیلی۔

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جو یہ پیغام لے کر آیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے صبر کی وجہ سے آپ پر سلام بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں تم اپنے کھلیان کی طرف جاؤ۔ آپ اس کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کھلیان پر سونے کی ٹڈیاں بھیج دیں۔ ایک ٹڈی اڑی تو ایوب علیہ السلام اس کے پیچھے گئے اور اسے اپنے کھلیان کی طرف واپس لے آئے۔ فرشتہ نے کہا کیا جو کچھ تیرے کھلیان کے اندر ہے وہ کافی نہیں ہے (کہ تم اڑنے والی ٹڈی کے پیچھے دوڑ گئے ہو) حضرت ایوب نے کہا یہ میرے رب کی برکات میں سے ہے اور میں اس کی برکت سے کبھی سیر نہیں ہوں گا(3)۔

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب کو دنیا میں ان کے اہل کی مثل عطاء کئے تھے جو ہلاک ہو چکے تھے۔ وہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں کئے گئے تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں۔ حضرت ایوب سے کہا گیا کہ تیری اولاد آخرت میں تجھے ملے گی اگر تم چاہتے تو ہم دنیا میں تجھے وہ عطاء فرمادیں اور اگر تو چاہے تو وہ آخرت میں تجھے ملیں اور ہم ان کی مثل دنیا میں اور عطاء فرمادیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا وہ مجھے آخرت میں ملیں اور ان کی مثل دنیا میں عطاء کئے جائیں۔ اس صورت میں آیت کا معنیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 78 (الفکر)　　2۔ ایضاً، صفحہ 79-78　　3۔ ایضاً، صفحہ 79

یہ ہوگا کہ ہم نے آخرت میں ان کے اہل انہیں عطاء کئے اور ان کی مثل دنیا میں عطاء کئے۔ اہل سے مراد اولاد ہے۔

۳ رحمۃً فعل محذوف کا مفعول بہ ہے یعنی وھبنا رحمۃً (ہم نے اسے رحمت عطا کی) یا مفعول مطلق ہے فعل آتینا کا اور یہ ضربتہ سوطاً کے قبیل سے ہے (یعنی مصدر کی جگہ آلہ کو رکھا گیا ہے)

ذکری کا عطف رحمۃ پر ہے یعنی صبر ایوب عبادت گزاروں کے لئے ایک نصیحت ہے تاکہ وہ بھی مشکل وقت میں ایوب علیہ السلام کی طرح صبر کریں تاکہ انہیں بھی ثواب اور اجر ملے جس طرح ایوب کو ملا تھا۔ یہ ترکیب بھی ہوسکتی ہے کہ رحمۃً اور ذکریٰ اتینا فعل کے مفعول لہ ہوں، یعنی ہم نے ایوب کو اہل عطاء فرمائے اور ان کی مثل بھی عطاء فرمائے اپنی رحمت کی وجہ سے اور عبادت گزاروں کو یاد دلانے کے لئے کہ ہم ان پر بھی رحم فرمائیں گے اور احسان کے ساتھ انہیں یاد کریں گے اور ان کو فراموش نہیں کریں گے۔

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِدۡرِیۡسَ وَ ذَا الۡکِفۡلِ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾

''اور یاد کرو اسماعیل وادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) کو۔ ۱ یہ سب صابروں کے گروہ سے تھے ۲''

۱ یہ سب اسماء ترکیب میں نوحاً کی طرح ہیں۔ ذی الکفل کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ عطاء فرماتے ہیں وہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی تھی کہ میں تیری روح قبض کرنا چاہتا ہوں، تم اپنی بادشاہی بنی اسرائیل پر پیش کرو جو شخص اس عظیم منصب کو قبول کرے وہ رات کو نماز ادا کرے گا، کسی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرے گا، دن کے وقت روزہ رکھے گا اور کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرے گا، لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلے کرے گا اور غصہ نہیں کرے گا۔ اسے یہ حکومت دے دو۔ اس نبی نے یہ لوگوں کے سامنے منصب رفیع رکھا تو ایک نوجوان اٹھا اور کہا میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں اس نے یہ ذمہ داری قبول کی اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قدردانی فرماتے ہوئے اسے نبی بنایا، اس نوجوان کا نام ذوالکفل تھا (1)۔ مجاہد فرماتے ہیں جب الیسع علیہ السلام بوڑھے ہوگئے تو انہوں نے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہا تاکہ وہ ان کی زندگی میں لوگوں کے امور سنبھالے اور وہ خود اپنی نظروں سے دیکھ لیں کہ یہ کیسے کام کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا جو میری تین باتوں کو قبول کرے گا میں اسے خلیفہ بناؤں گا۔ دن کو روزہ رکھے، رات کو قیام کرے اور غصہ نہ کرے۔ ایک آدمی اٹھا جو بظاہر حقیر نظر آتا تھا۔ اس شخص نے کہا یہ ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ حضرت الیسع نے اس دن اس کو رد فرمادیا۔ آپ نے دوسرے دن یہی اعلان فرمایا سب لوگ خاموش رہے صرف اسی شخص نے کہا میں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں۔ حضرت الیسع نے اسے خلیفہ بنادیا۔ ایک دن ابلیس اس خلیفہ کے پاس ایک بوڑھے انسان کی شکل میں آیا، جبکہ خلیفہ کے قیلولہ اور آرام کا وقت تھا۔ خلیفہ نہ دن کے وقت سوتا تھا اور نہ رات کے وقت آرام کرتا تھا، صرف دوپہر کے وقت تھوڑا سا آرام کرتا تھا۔ ابلیس نے انسانی شکل میں آکر دروازہ کھٹکھٹایا، پوچھا کون ہے۔ اس نے کہا میں ایک بوڑھا مظلوم شخص ہوں، خلیفہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ ابلیس نے کہا میرا اور میری قوم کا جھگڑا ہے انہوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور ایسی ایسی مجھ سے زیادتی کی ہے، وہ بات کو طول دیتا رہا حتیٰ کہ خلیفہ کے آرام کا وقت نکل گیا۔ خلیفہ نے کہا شام کو میں تیرا حق دلا دوں گا۔ پچھلے ٹائم اس نے مجلس لگائی تو اس نے بوڑھے کو ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ دوسرے دن عدالت لگائی تو پھر بوڑھا (ابلیس) نظر نہ آیا۔ جونہی قیلولہ کرنے کے لئے پہنچا تو ابلیس نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ پوچھا کون؟ اس نے کہا بوڑھا مظلوم۔ خلیفہ نے پھر دروازہ کھول دیا اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 79 (الفکر)

کہا گیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ جب میں مجلس عدل قائم کروں تو تم آ جانا۔ بوڑھے نے کہا وہ بڑی بری قوم ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ تیری مجلس لگی ہوئی ہے تو کہتے ہیں ہم تیرا حق ادا کر دیں گے اور جب مجلس برخاست ہوتی ہے تو منکر بن جاتے ہیں۔ خلیفہ نے کہا اب تم جاؤ' شام کے وقت جب مجلس عدل قائم ہو تو اس وقت آ جانا' اس دن بھی اس بوڑھے نے خلیفہ کی نیند حرام کر دی' شام کو جب مجلس عدل شروع ہوئی تو وہ بوڑھا نظر نہ آیا۔ خلیفہ پر نیند غالب آ رہی تھی اس نے اپنے دربان کو کہا کہ کسی کو دروازہ کے قریب نہ آنے دینا تا کہ میں کچھ آرام کر لوں، مجھے نیند بہت سخت آئی ہوئی ہے۔ جب خلیفہ کے قیلولہ کا وقت تھا تو بوڑھا پھر آ گیا۔ محافظ نے اسے اجازت نہ دی۔ جب بوڑھا عاجز ہو گیا تو اس نے روشندان دیکھا' اس نے دیوار پھلانگی اور روشندان سے اندر داخل ہو کر اندر سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ خلیفہ بیدار ہوا تو اس نے محافظ کو آواز دی اے فلاں میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ محافظ نے کہا جناب ادھر سے کوئی داخل نہیں ہوا۔ دیکھو وہ کہاں سے آیا ہے؟ خلیفہ نے دروازہ دیکھا تو وہ واقعی بند تھا۔ اس شخص نے کہا لوگ تمہارے دروازے پر جھگڑے لے آئے ہیں اور تم سوئے ہوئے ہو۔ خلیفہ نے اس شخص کو پہچان لیا اور کہا تو اللہ کا دشمن (ابلیس) ہے۔ بوڑھے نے کہا ہاں۔ تو نے مجھے عاجز کر دیا ہے اور میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا تا کہ تجھے غصہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے تجھے بچا لیا ہے۔ اس خلیفہ کو ذوالکفل کہا گیا کیونکہ اس نے جو ذمہ داری قبول کی تھی اس کو احسن طریقے سے نبھایا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابلیس اس خلیفہ کے پاس آیا اور کہا میرا ایک مقروض ہے جو رقم کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہے آپ میرے ساتھ چلیں اور میرا قرض وصول کروا دیں، خلیفہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ جب بازار میں پہنچا تو ابلیس پیچھے سے کھسک گیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ اس نے خلیفہ سے معذرت کر لی کہ میرا مقروض بھاگ گیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ ذوالکفل وہ شخص تھا جس نے عہد کیا تھا کہ مرتے دم تک ہر رات سو رکعت ادا کروں گا۔ اس نے اپنے اس عہد کو پورا کیا تھا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ذوالکفل نبی تھا یا (ولی تھا) بعض مفسرین فرماتے ہیں وہ نبی تھا جیسا کہ سیاق کلام دلالت کر رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ذوالکفل سے مراد زکریا علیہ السلام ہیں(1)۔ ابوموسیٰ فرماتے ہیں وہ نبی نہیں تھا بلکہ ایک نیک آدمی تھا(2)۔

؎ جن نفوس قدسیہ کا اوپر تذکرہ ہوا ہے وہ سب مشکلات و مصائب پر صبر کرنے والے تھے اور شہوات اور معاصی سے اجتناب کرنے والے تھے۔

وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾

''اور ہم نے داخل فرمایا انہیں اپنی خاص رحمت میں یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے ؎''

؎ رحمت سے مراد نبوت' درجات قرب اور جنت ہے۔ اس جملہ کا عطف کل من الصابرین پر ہے۔ قد کی تقدیر کے ساتھ الصابرین کی ضمیر سے حال ہے یعنی یہ ہستیاں ہر قسم کے فساد سے مبرا تھیں۔

وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ﳓ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾

''اور یاد کرو ذوالنون کو جب وہ چل دیا غضبناک ہو کر ؎ اور یہ خیال کیا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے ؎ پھر اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 80 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 81

نے پکارا (تہ درتہ) اندھیروں میں کہ کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاک ہے تو بیشک میں ہی قصورواروں سے ہوں ۔''

۱؎ ذی النون سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ ذا النون کے اعراب کی وہی صورتیں ہیں جو ہم نے نوحاً اور نادیٰ کے تحت ذکر کی ہیں۔ مغاضباً کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں وہ اپنی قوم پر ناراض اور غضبناک تھے۔ العوفی اور دوسرے علماء نے ابن عباس سے یہی قول روایت فرمایا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یونس علیہ السلام اور اس کی قوم فلسطین میں رہتے تھے۔ ایک بادشاہ نے ان پر حملہ کیا اور ساڑھے نو قبیلے قیدی بنا کر لے گئے اور دو قبیلے باقی بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے شعیاء نبی کی طرف وحی بھیجی کہ تم حرقیا بادشاہ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ کسی طاقتور نبی کو بھیجو، میں ان لوگوں کے دلوں میں یہ ڈال دوں گا کہ وہ بنی اسرائیل کو اس طاقتور نبی کے ساتھ آزاد کر کے بھیج دیں۔ حرقیا بادشاہ نے حضرت شعیاء سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے میں کس نبی کو بھیجوں (بادشاہ کی مملکت میں پانچ انبیاء مبعوث تھے) شعیاء نے مشورہ دیا کہ یونس علیہ السلام کو بھیجو، وہ طاقتور اور امین ہے۔ بادشاہ نے یونس علیہ السلام کو بلایا اور کہا کہ تم جاؤ اور بنی اسرائیل کو چھڑا لاؤ۔ حضرت یونس علیہ السلام نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ نے تجھے مجھے بھیجنے کا حکم دیا ہے حرقیا بادشاہ نے کہا نہیں۔ کیا اس نے تجھے میرا نام بتایا ہے؟ فرمایا نہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا میرے علاوہ دوسرے انبیاء زیادہ طاقتور ہیں۔ انہوں نے جب حضرت یونس علیہ السلام پر اصرار کیا تو آپ نبیؑ بادشاہ اور قوم سے ناراض ہو کر نکل پڑے اور بحر روم پر پہنچے اور کشتی پر سوار ہو گئے (2)۔

عروہ بن زبیر، سعید بن جبیر اور چند دوسرے علماء کا خیال ہے کہ آپ اپنے رب کی خاطر قوم سے ناراض ہو کر بھاگ گئے تھے کیونکہ آپ نے قوم کو کہا تھا کہ عذاب آئے گا لیکن عذاب نہ آیا۔ آپ نے اپنی قوم میں رہنا پسند نہ فرمایا کیونکہ معاملہ آپ کی وعید کے خلاف ظاہر ہو چکا تھا اور آپ کو معلوم نہ ہوا کہ قوم سے عذاب کسی سبب سے دور ہو گیا ہے تو آپ کا غصہ وعید کے خلف کی وجہ سے تھا کہ لوگ انہیں کذاب کہیں گے۔ حکم الٰہی کو ناپسند کرنے کی وجہ سے نہ تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ قوم کی عادت تھی کہ وہ جھوٹے شخص کو قتل کر دیتے تھے، اس لئے آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ قوم مجھے قتل کر دے گی کیونکہ جب مقررہ مدت میں عذاب نہ آیا تو آپ کو غصہ آ گیا۔

مغاضباً باب مفاعلہ ہے لیکن یہاں اشتراک کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مسافرہ اور معاقبہ کی طرح ایک طرف سے فعل کے پائے جانے پر دلالت کرتا ہے پس مغاضباً کا معنی غضبان ہوگا (3)۔

الحسن فرماتے ہیں آپ اپنے رب سے ناراض ہو کر نکلے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قوم کی طرف نکلنے کا حکم فرمایا تھا تا کہ وہ انہیں عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور انہیں دعوت توحید دیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کی طرف جانے سے پہلے تیاری کرنے کی مہلت مانگی تو ارشاد ہوا یہ کام بہت جلدی کرنا ہے۔ آپ نے عرض کی مجھے جوتا پہننے کی اجازت دی جائے تو یہ مہلت بھی نہ ملی۔ آپ کی طبیعت میں تنگی تھی، اس لئے آپ ناراض ہو کر نکل پڑے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں جبریل علیہ السلام یونس علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ اہل نینویٰ کے پاس جاؤ اور انہیں عذاب الٰہی سے ڈراؤ۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا میں کوئی سواری تلاش کرتا ہوں۔ جبریل نے کہا اس معاملہ میں تاخیر نہیں، بہت جلدی چاہئے۔ آپ ناراض ہو کر کشتی میں سوار ہو گئے (4) وہب کہتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (الفکر)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً صفحہ 82

ہیں یونس بن متی ایک نیک شخص تھے اور آپ کی طبیعت میں سختی تھی، جب ان پر نبوت کا بوجھ ڈالا گیا تو آپ اس بوجھ کے نیچے دب گئے اور پھر بھاگ نکلے۔ اسی وجہ سے اولوالعزم پیغمبروں میں سے آپ کا نام اللہ تعالیٰ نے نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو اولوالعزم نبیوں کے صبر کرنے کی طرح صبر کرنے کا حکم فرمایا۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اور ارشاد فرمایا وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (پس (اے محبوب) آپ صبر کیجیے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا تھا) (اور نہ ہو جائیے مچھلی والے کی مانند)(1)

۲۔ یعقوب نے یاء کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ مجہول پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے۔ قدر کا لفظ اسی معنی میں قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو وسیع فرماتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے۔ عطاء اور بہت سے دوسرے علماء فرماتے ہیں القدر کا معنی قضاء ہے۔ یعنی ہم اس پر سزا کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے۔ مجاھد، ضحاک اور کلبی کہتے ہیں القدر کا معنی قضاء ہے۔ حضرت ابن عباس سے العوفی نے روایت کیا ہے۔ کہا جاتا ہے قدر اللّٰہ تقدیرا اور قدر قدراً ہم معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ۔

ابن کثیر نے دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں قرأتوں کا معنی ایک ہے۔ اس تاویل کی تائید عمر بن عبدالعزیز اور زہری کی قرأت کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یونس نے یہ خیال کیا کہ ہم اس کے معاملہ میں اپنی قدرت کو عمل میں نہیں لائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کی حالت کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ہمارے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی قوم کو ذلت میں چھوڑ کر چلا گیا اور یہ گمان کیا کہ ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے (2)۔ ابن زید کہتے ہیں یہ توبیخ اور انکار کے لئے استفہام ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کیا اس نے گمان کیا ہے کہ ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ظن شیطانی خطرہ تھا جو آپ کے وہم تک پہنچ گیا تھا پس مبالغہ کے لئے اس کو ظن سے تعبیر کیا گیا۔

الحسن فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب یونس علیہ السلام سے گناہ سرزد ہوا تو آپ اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو کر چل پڑے۔ شیطان نے آپ کو راہ راست سے بھٹکانا چاہا حتیٰ کہ انہوں نے گمان کیا کہ ہم اس پر قادر نہ ہوں گے۔ آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے تھے اس لئے غیرت الٰہی نے یہ پسند ہی نہیں کیا کہ انہیں شیطان کے حوالے کر دیں۔ اللہ نے انہیں مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا۔ آپ وہاں چالیس دن رہے۔ عطاء فرماتے ہیں آپ مچھلی کے پیٹ میں سات دن رہے۔ بعض فرماتے ہیں تین دن رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مچھلی انہیں چھ ہزار سال کی مسافت پر لے گئی اور بعض علماء فرماتے ہیں ساتویں زمین کی حد تک لے گئی۔ پھر وہاں مچھلی کے پیٹ میں آپ نے توبہ کی اور واپس پلٹے (3)۔

۳۔ ظلمات سے مراد یا تو سخت تاریکی ہے یا رات کی تاریکی یا سمندر کی تاریکی اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی ہے۔ یہ جملہ محذوف جملوں پر معطوف ہے جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ حضرت یونس علیہ السلام غصہ کی حالت میں نکلے پس انہوں نے یہ گمان کیا کہ ہم اس پر قادر نہیں ہیں۔ پھر وہ سمندر پر پہنچے پھر کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی رک گئی قرعہ اندازی کی گئی تو آپ کا نام نکلا۔ آپ نے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا پھر مچھلی نے انہیں نگل لیا پھر آپ نے تاریکیوں میں یوں پکارا کہ کوئی معبود نہیں سوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 82 (الفکر)   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً، صفحہ 83

تیرے، پاک ہے تو بیشک میں ہی قصورواروں سے ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو وحی فرمائی کہ اسے پکڑ لے لیکن نہ ان کے گوشت کو خراش آئے اور نہ ان کی کوئی ہڈی ٹوٹے۔ مچھلی نے آپ کو پکڑ لیا اور سمندر کی تہہ میں لے گئی۔ جب وہ سمندر کے نیچے پہنچی تو یونس علیہ السلام نے تسبیح سنی تو سوچا یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ یہ سمندر کے جانوروں کی تسبیح ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں تسبیح کی تو ملائکہ نے آپ کی تسبیح سنی۔ فرشتوں نے عرض کی اے ہمارے رب ہم ایک اجنبی زمین میں ایک خفیف سی آواز سن رہے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے ایک مجہول مکان میں معروف آواز سن رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ہمارا بندہ یونس ہے جس نے میری نافرمانی کی تھی اور میں نے مچھلی کے پیٹ میں اسے محصور کر دیا تھا۔ فرشتوں نے عرض کی کیا وہ نیک آدمی جس کا نیک عمل ہر روز تیری بارگاہ میں پہنچتا ہے۔ فرمایا ہاں۔ اس وقت فرشتوں نے حضرت یونس علیہ السلام کی فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ (پھر ہم نے ڈال دیا انہیں کھلے میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے)(1)

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸

''پس ہم نے ان کی پکار کو قبول فرمالیا اور نجات بخش دی انہیں غم (واندوہ) سے اور یونہی ہم نجات دیا کرتے ہیں مومنوں کو[1]''

[1] یعنی ہم نے ان کلمات کی وجہ سے خطاء کے غم، مچھلی کے نگلنے کا غم یا تاریکیوں کے غم سے نجات دی۔ بالکل اسی طرح جب بھی کوئی مومن اخلاص کے ساتھ ہمیں پکارتا ہے اور ہماری بارگاہ سے استغاثہ کرتا ہے تو ہم اسے نجات دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں جو دعا مانگی تھی (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) جو مسلمان ان کلمات کے ساتھ دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے(2)۔

اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور حاکم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ حاکم کی حدیث اس طرح ہے کیا میں تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف یا مصیبت میں گرفتار ہو اور وہ یہ دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس تکلیف کو دور فرما دے گا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ ذی النون (حضرت یونس علیہ السلام) کی دعا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

ابن جریر نے اس طرح روایت کی ہے کہ اللہ کا اسم جس کے ساتھ دعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اس کے ساتھ سوال کیا جائے تو عطا فرماتا ہے۔ وہ اسم یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

ہم نے سورۂ آل عمران کی ابتداء میں ذکر کیا تھا کہ اسم اعظم نفی اور اثبات ہے اور لا اله الا هو اور لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ کا درجہ لا اله الا الله سے بلند ہے کیونکہ ضمائر خالص ذات پر دلالت کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ کا مرتبہ لا اله الا هو سے بلند ہے کیونکہ خطاب کی ضمیر حضور کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن عامر اور ابوبکر نے ننجی کو جیم کی شد اور یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کی اصل باب تفعیل کا مضارع ہے پھر اجتماع مثلین کی وجہ سے دوسرے نون کو حذف کیا گیا جیسا کہ تتظاهر میں تاء کو حذف کیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ فاکلمہ ہے تو اس کا حذف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 83 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13، صفحہ 32 (العلمیۃ)

کرنا علامت مضارع کے خلاف سے اولیٰ ہے کیونکہ علامت مضارع ایک مخصوص معنی کے لئے ہوتی ہے اور دونوں نونوں کی حرکتوں کا اختلاف اعتراض کا باعث نہیں ہوسکتا کیونکہ حدف کا باعث ہم مثل لفظوں کا اجتماع ہے اور ادغام متعذر ہے اور تتجافی میں حذف ممتنع ہے کیونکہ التباس کا اندیشہ ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اصل میں نجی ماضی مجہول کا صیغہ ہے جو مصدر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ قول مردود ہے کیونکہ فعل مصدر کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا، جب فعل کا مفعول صراحۃً مذکور ہو نیز ماضی کا آخر ساکن بھی نہیں ہوتا (1)۔ بعض علماء نے امام بیضاوی کے اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ مفعول کی موجودگی میں فعل کو مصدر کی طرف منسوب کرنا شاذ ہے اور شاذ کا وقوع قرآن میں اس کی فصاحت کی وجہ سے ممتنع نہیں ہے اور کبھی کبھی یاء مفتوحہ کو عرب ساکن کر دیتے ہیں جیسے بقی میں کرتے ہیں وہ بقی کو بقی پڑھتے ہیں۔ جمہور قراء نے باب افعال سے دونونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور لکھنے میں ایک نون اس لئے ہے کیونکہ دوسرا نون ساکن ہے اور ساکن زبان پر ظاہر نہیں ہوتا، اس لئے لکھنے میں اس کو حذف کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ الا میں نون کو حذف کر دیتے ہیں کیونکہ الا اصل میں ان لا تھا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کو رسالت کب ملی۔ اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد آپ کو رسالت عطاء فرمائی کیونکہ سورۃ صافات میں ہے فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ اس کے بعد فرمایا وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (2)۔

بعض دوسرے علماء فرماتے ہیں اس سے پہلے آپ کو رسالت ملی تھی اس کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔

میں کہتا ہوں فنبذناہ کے بعد وارسلناہ الی ماۃ الف اوریزیدون سے استدلال ضعیف ہے کیونکہ واو مطلقاً جمع کے لئے آتی ہے، یہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۸۹

''اور یاد کرو زکریا کو جب انہوں نے پکارا اپنے رب کو کہ اے میرے پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے لے''

لے زکریا اذ نادی کا اعراب بالکل نوحاً اذ نادی جیسا ہے۔ وانت خیر الوارثین' لا تذرنی کے فاعل سے حال ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے کہ مخلوق کے فناء ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہنے والا ہے اور ہر خلیفہ سے وہ بہتر ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ؗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝۹۰

''تو ہم نے اس کی دعا کو قبول فرمالیا اور اسے یحییٰ (جیسا فرزند) عطا فرمایا اور ہم نے تندرست کر دیا ان کی خاطر ان کی اہلیہ کو۔ بیشک وہ بہت سبک رو تھے نیکیاں کرنے میں اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے اور وہ ہمارے

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 469 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 84 (الفکر)

سامنے بڑا عجز و نیاز کیا کرتے تھے ل۔"

ل حضرت زکریا کی زوجہ محترمہ بانجھ تھیں لیکن ہم نے اسے قابل ولادت بنا دیا۔ وغباً یا تو مفعول لہ ہے یا حال ہے، یعنی ان کی رغبت کی وجہ سے یا وہ ہماری ملاقات اور ہمارے قرب میں رغبت رکھتے تھے اور دعاؤں کی قبولیت کی امید رکھتے تھے اور ثواب میں رغبت رکھتے تھے یا طاعت میں رغبت رکھتے تھے۔

احمد نسائی حاکم اور بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ(1) (نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے) وھباً بھی مفعول لہ یا حال ہے، یعنی خوف کی وجہ سے ہمیں پکارتے ہیں یا محرومی یا معصیت یا عذاب سے ڈرتے ہوئے ہمیں پکارتے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں خشوع وہ خوف ہے جو دل کو لاحق ہوتا ہے۔ جب کامل طور پر عظمت الٰہی کا انسان کو عرفان نصیب ہوتا ہے تو دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے عجز و انکساری کرنا خشوع ہے(2)۔ انهم كانوا يسارعون

مذکورہ نفوس قدسیہ کی مدح ہے اور گزشتہ کلام کی تعلیل ہے، یعنی ہم نے انہیں نبوت اور علم عطا فرمایا کیونکہ وہ نیکیوں میں جلدی کرنے والے تھے یا یہ مطلب کہ ان معزز افراد کو یاد کرو کیونکہ وہ نیکیاں کرنے میں سبک رو تھے حتیٰ کہ لوگوں نے ان کی۔ اقتداء کی انہیں جو کچھ بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا وہ سب کچھ انہیں خصائل حمیدہ کی وجہ سے ملا۔

وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

"اور یاد کرو اس خاتون کو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو پس ہم نے پھونک دیا اس میں اپنی روح سے ل اور ہم نے بنا دیا اسے اور اس کے بیٹے کو (اپنی قدرت کی) نشانی سارے جہان والوں کے لئے ۲۔"

ل التي احصنت فرجها سے مراد مریم بنت عمران ہیں جنہوں نے حلال اور حرام سے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ اور یہ اذکر کی تقدیر کے ساتھ منسوب ہے۔ جبریل نے آپ کی قمیص کے گریبان میں پھونک ماری تو وہ پھونک آپ کے پیٹ تک پہنچ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پھونک کے ساتھ عیسیٰ بن مریم کو پیدا فرمایا۔ روحنا سے مراد وہ روح ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل نے پھونکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی اپنی طرف نسبت اظہار شرف کے لئے فرمائی ہے یا روح سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور من زائدہ ہے یا روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔

۲ ہم نے مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے کے قصہ یا حالت کو بغیر باپ کے بچے کے پیدا کرنے پر اپنے کمال قدرت پر دلیل بنایا ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾

"(اے ان انبیاء کو ماننے والو!) یہی (توحید) تمہارا دین ہے جو ایک دین ہے ل اور میں تمہارا پروردگار ہوں پس میری بندگی کیا کرو ۲۔"

ل یعنی تمہاری ملت توحید اور تمام انبیاء پر ایمان لانے والی ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ کا اقرار کرنے والی ہے، حکم الٰہی کو دل کے

1۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 128 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 85 (الفکر)

کانوں سے سننے اور احکام الٰہی کی اتباع کرنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو جو اوامر و نواہی عطاء فرمائے ان تمام کو برحق تسلیم کرنے والی ہے۔ یہ تمام ملل حقہ کی طرف اشارہ ہے یا ملت اسلام مراد ہے، یعنی اے لوگو! تم پر واجب ہے کہ تم اسی ملت پر قائم رہو۔ امةً حال کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں عامل اشارہ کا معنی ہے۔ تمہاری ملت ایک ہے۔ انبیاء کی ملل میں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسری ملتیں صحت اتباع میں اس کی شریک نہیں۔ ارشاد فرمایا وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ (اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے) امۃ مشتق ہے ام یام سے جس کا معنی قصد کرنا ہے پھر اس کا اطلاق اس جماعت پر بھی ہونے لگا جو ایک مقصد پر متفق ہو، یک دین کی پیروکار ہو اور ایک طریقہ اور راستہ پر گامزن ہو۔ چونکہ دین وسنت دونوں مقصود ہوتے ہیں، اس لئے ان کے اتباع کرنے والوں کو امت کہا جاتا ہے (1)۔

ے میرے سوا تمہارا کوئی رب نہیں ہے اس لئے تم میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

وَ تَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَیۡنَهُمۡ ؕ كُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ ﴿۹۳﴾

"مگر لوگوں نے پارہ پارہ کر ڈالا اپنے دین کو آپس میں (آخر کار) سب ہماری طرف ہی لوٹنے والے ہیں لے"

لے کلام میں خطاب سے غائب کی طرف التفات کیا گیا ہے اور تفعل بمعنی تفعیل ہے، یعنی لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگے، ان کو ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ ہر فرقہ اور گروہ نے ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہم انہیں ان کے عقائد و اعمال کے مطابق جزاء و سزا دیں گے۔

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا كُفۡرَانَ لِسَعۡیِهٖ ۚ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوۡنَ ﴿۹۴﴾

"پس جو شخص کرتا رہا کوئی نیک کام بشرطیکہ وہ مومن ہو تو رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا اس کی کوشش کو اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں لے"

لے یعنی جو رائی کے دانہ کے برابر بھی نیک عمل کرے گا، جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کی شریعت پر ایمان لانے والا ہو تو اس کی کوشش کو ثواب سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔ ثواب کو ایمان کی شرط کے ساتھ مقید فرمایا کیونکہ تمام اعمال کا اعتبار دولت ایمان کی موجوگی پر ہے۔ یہاں کفر کو استعارۃً ثواب سے روکنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جیسے شکر کو ثواب کے عطاء کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں جنس کی نفی مبالغہ کے لئے ہے۔ ہر انسان کی کوشش اور عمل کو فرشتے لکھ رہے ہیں۔

وَ حَرٰمٌ عَلٰی قَرۡیَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَاۤ اَنَّهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۹۵﴾

"اور ناممکن ہے اس بستی کے لئے جس کو ہم نے برباد کر دیا کہ اس کے باشندے پھر لوٹ کر آئیں لے"

لے ابوبکر اور حمزہ نے حرام کو حاء کے کسرہ، راء کے سکون اور الف کے بغیر پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے حاء اور راء کے فتح اور ان کے درمیان الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے حل وحلال اور اس کا معنی ہے ممتنع اور جس کا وجود متصور نہ ہو۔ وحرام علی قریة اهلکناها ترکیب نحوی کے اعتبار سے مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی سابقہ آیت کا حکم جو نیکوکار کی نیکی کے ضائع نہ کرنے کا بیان

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1420 (التراث العربی)

کیا گیا ہے اس بستی کے باشندوں کے لئے نہیں ہے جو کفر پر ہلاک ہوئے کیونکہ ان کے اعمال تو ہم رائیگاں کر دیں گے یا یہ معنی کہ ایسے لوگوں کا توبہ یا زندگی کی طرف لوٹنا ممتنع ہے، یہ معنی اس صورت میں ہوگا جب لا یرجعون حرام کے متعلق ہو یا یہ معنی کہ سزا کے لئے ان کو زندہ کر کے نہ اٹھانا ناممکن ہے، اس معنی کے اعتبار سے انھم لا یرجعون کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ توبہ و اخلاص کے ساتھ ہماری طرف نہیں آئیں گے یا یہ معنی کہ وہ دنیا کی طرف نہیں لوٹیں گے تا کہ وہ سابقہ کفر سے توبہ کر کے اور ایمان قبول کر کے تلافی کر سکیں اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ ان اپنے اسم اور خبر سے مل کر مبتدا ہو اور حرام اس کی خبر ہو۔ یعنی حساب و جزاء کے مقام کی طرف ان کا نہ لوٹنا ممتنع ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ ایسی بستی کے باشندوں کا دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنا ممتنع ہے(1)۔ اس صورت میں یہ مبتدا خبر ہوں گے اور لا یرجعون میں لا زائدہ ہوگا۔ ان تمام تاویلات پر یہ آیت کافروں کے لئے وعید ہے جیسا کہ سابقہ آیت مومنین کے لئے وعدہ تھی۔

حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں گے یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے۔''[1]

[1] ابن عامر، ابوجعفر اور یعقوب نے فتحت کو تاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یاجوج اور ماجوج دو قبیلوں کے نام ہیں۔ ان سے پہلے مضاف محذوف ہے، یعنی ان کے بند کھول دیئے جائیں گے اور بھیڑ یئے کی تیزی کی طرح تیز دوڑیں گے۔ حدب کا معنی اونچائی، ٹیلہ اور بلندی ہے۔ ہم نے سورۂ کہف میں فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ الخ کے ارشاد کے تحت حضرت نواس بن سمعان کی حدیث ذکر کی تھی جس میں یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو بھیجے گا اور ہر اونچی جگہ سے نیچے اتریں گے۔ میں کہتا ہوں اونچی جگہ سے نیچے اترنے کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ یاجوج و ماجوج کی قرارگاہ پہاڑوں کے پیچھے ہے۔ اس لئے وہ پہاڑوں کے اوپر سے آئیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھم ضمیر کا مرجع تمام لوگ ہیں۔ مجاہد نے اسے کل جدث پڑھا ہے جس کا معنی قبر ہے اور ضمیر کا مرجع لوگ ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ لوگ اپنی قبور سے جلدی جلدی نکلیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ (تو فوراً وہ اپنی قبروں سے نکل نکل کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے)

حضرت حذیفہ بن اسد الغفاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کس چیز پر بحث کر رہے ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی حضور ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ فرمایا دس نشانیوں کے ظہور سے پہلے قیامت قائم نہ ہوگی۔ پھر آپ نے یہ دس نشانیاں بیان فرمائیں۔ 1۔ دھواں۔ 2۔ دجال۔ 3۔ دابۃ۔ 4۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ 5۔ عیسیٰ بن مریم کا نزول۔ 6۔ یاجوج و ماجوج۔ (تین مرتبہ دھنسنا) 7۔ مشرق میں زمین کا دھنسنا۔ 8۔ مغرب میں زمین کا دھنسنا۔ 9۔ جزیرہ عرب میں زمین کا دھنسنا۔ 10۔ آخر میں یمن سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہانک کر لے آئے گی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آگ قعر عدن سے نکلے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔ ایک دوسری روایت میں دسویں نشانی اس ہوا کو فرمایا جو لوگوں کو سمندر میں ڈال دے گی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 86 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 393 (قدیمی)

حتی ابتدائیہ ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس کا ماقبل اس کے مابعد کا سبب ہے جیسے عرب کہتے ہیں مرض فلان حتی لا یرجونہ یہ حرام کے متعلق ہے یا محذوف کلام کے متعلق ہے۔ جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے یا یہ لا یرجعون کے متعلق ہے، یعنی ان کے اعمال کا احباط جاری رہے گا یا ان کی توبہ کی نامقبولیت جاری رہے گی یا دنیا کی طرف ان کا لوٹنا ممتنع رہے گا یا جزاء کے لئے ان کا زندہ نہ کرنے کا امتناع جاری رہے گا حتی کہ ان کی آنکھیں پھٹی ہوں گی یا یہ معنی کہ وہ کفر پر ہلاک ہوں گے حتی کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آ جائے گا یا یہ معنی کہ وہ توبہ کی طرف یا دنیا کی طرف نہیں لوٹیں گے حتی کہ ایسا ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ بعد والا جملہ شرطیہ ہے۔ اذا فتحت یاجوج و ماجوج شرط ہے اور وھم من کل حدب ینسلون یاجوج و ماجوج سے حال ہے اور اگر ضمیر کا مرجع لوگ ہوں تو یہ شرط پر معطوف ہوگا۔

وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ۝۹۷

"(تب معلوم ہوگا کہ) قریب آ گیا ہے سچا وعدہ[1] تو اس وقت تاڑے لگ جائیں گی نظریں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا[2] (کہیں گے) صد حیف[3] ہم تو غافل رہے اس امر سے بلکہ ہم تو ظالم تھے[4]"

[1] اقترب کا عطف فتحت پر ہے۔ فراء اور نحاۃ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ واو زائدہ ہے اور جملہ شرط کی جزاء ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ وَنَادَیْنٰهُ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا تو ہم نے ان کو ندا دی۔ اس قول کے قائلین نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر ایک شخص نے یاجوج و ماجوج کے خروج کے بعد بچھیرا پالا ہوگا ابھی سوار نہ ہوا ہوگا کہ قیامت قائم ہو جائے گی (1)۔ اس قول کا رد اس طرح کیا گیا ہے کہ واو زائدہ نہیں ہے اور شرط کی جزاء فاذاھی شاخصة ہے۔

[2] اذا مفاجاتیہ ہے جو فا جزائیہ کے قائم مقام ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ اِذَاهُمْ یَقْنَطُوْنَ۔ جب یہ اذا فاء کے ساتھ مل کر آتا ہے تو شرط کے جزاء کے ساتھ اتصال پر دلالت کرتا ہے اور تاکید پیدا کرتا ہے اور ھی ضمیر قصہ ہے یا ضمیر مبہم ہے اور الابصار اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ شاخصة مبتدا ہے، صفت کو اپنے فاعل کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ الابصار اس کا فاعل ہے یا الابصار مبتدا ہے اور شاخصة خبر ہے۔ عرب کہتے ہیں شخص بصرہ یعنی اس کی آنکھ کھل گئی اور حیرانی اور ہولناکی کی وجہ سے بند نہیں ہوتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھی مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی قیامت اتنی قریب ہے گویا بالکل آ چکی ہے اور شاخصة ابصار الذین کفروا جملہ مستانفہ ہے۔

[3] یاویلنا اس سے پہلے یقولون مصدر ہے اور یہ اسم موصول سے حال ہے۔ یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ فاذا ھی شاخصة شرط پر معطوف ہو اور جزاء یقولون یاویلنا ہو۔

[4] قد کنا کا جملہ یاویلنا کے قول کی تعلیل ہے۔ یعنی ہم اس دن سے بے خبر رہے اور قدرت کی نشانیوں میں غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا یا غیر کی عبادت کر کے ہم اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 607 (العلمیۃ)

إِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾

"(اے مشرکو!) تم اور جن بتوں کی تم عبادت کیا کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر ۱؎ سب جہنم کا ایندھن ہوں گے ۲؎ تم اس میں داخل ہونے والے ہو ۳؎"

۱؎ ما سے مراد غیر ذوی العقول بت اور سامری کا بنایا ہوا بچھڑا ہے۔ کفار کو رسوا کرنے کے لئے ان کو جلایا جائے گا کہ جن کی تم عبادت کرتے تھے وہ خود آگ کا ایندھن ہیں اور ما میں وہ ذوالعقول بھی شامل ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے جیسے شیطانوں میں سے جنہوں نے جھوٹی خدائی کا دعویٰ کیا اور انسانوں میں سے جیسے فرعون، نمرود اور ان جیسے دوسرے خدا ہونے کا دعویٰ کرنے والے لیکن وہ ذوالعقول جن کی پوجا کی جاتی ہے لیکن وہ اس کو پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اس سے منع کرتے ہیں (جیسے عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ) وہ اس ما کے عموم میں داخل نہیں ہیں کیونکہ عقل ونقل اس کے خلاف ہے ارشاد ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یہ مفہوم اس تقدیر پر ہوگا جب ما ذوی العقول اور غیر ذوی العقول کے لئے عام ہو جیسا کہ اکثر محققین کا مختار مذہب ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن زبعری نے روایت کی ہے کہ اس نے حضور ﷺ سے پوچھا کیا یہ وعید ہمارے معبودوں کے ساتھ خاص ہے یا ہر معبود کے لئے ہے جو اللہ کے سوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہر اس شخص کے لئے ہے جس کی بھی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہے (اور وہ اس کو پسند کرتا ہے) اس حدیث کو امام بیضاوی نے نقل کیا ہے(1) اور اسے ابوداؤد، ابن المنذر، ابن مردویہ اور طبرانی نے ابن عباس سے ایک اور سند سے نقل کیا ہے۔

اور اگر ما کو غیر ذوالعقول کے لئے تسلیم کیا جائے تو کسی تخصیص وتوضیح کی ضرورت نہیں۔ جو ذوی العقول معبود ہونے کو پسند نہیں کرتے وہ اس میں داخل ہی نہ ہوں گے۔

۲؎ وہ چیز جس کے ذریعے آگ کو بھڑکایا جاتا ہے اسے حصب کہتے ہیں۔ یہ ضحاک کا قول ہے اور یہ حصبه، یحصبه سے مشتق ہے جس کا معنی کنکریاں پھینکنا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اہل یمن کی لغت میں حصب کا معنی حطب یعنی لکڑیاں ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں حبشہ کی لغت میں اس کا معنی حطب ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب نے اسے حطب جہنم پڑھا ہے، یعنی جہنم کا ایندھن(2)۔

۳؎ اے مشرکو! تم اپنے معبودوں کے ساتھ دوزخ میں اترو گے۔ انتم لها واردون۔ جملہ متانفہ ہے یا حصب و جهنم سے بدل ہے اور لها میں لام علی کے عوض ہے اور یہ اختصاص اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کا ورود اور اترنا اس کی وجہ سے ہے اس سے پہلے مشرکین سے کلام غائب کے صیغوں میں تھی لیکن اب مخاطب کے صیغے ذکر فرمائے۔

لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَ كُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾

"(سوچو!) اگر یہ خدا ہوتے تو نہ داخل ہوتے جہنم میں اور (جھوٹے خدا اور ان کے پجاری) سب اس میں ہمیشہ رہیں گے ۱؎"

۱؎ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس سے پہلے قول مقدر ہے کفار کے آگ میں داخل ہونے اور ان کے معبودوں کے داخل ہونے کے بعد کفار

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 476 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 88 (الفکر)

کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے ایسا کہا جائے گا۔ یہ جھوٹے معبود اوران کے پجاری سب اس آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی ان کو خلاصی نہ ہوگی و کل فیھا خالدون کا عطف انتم لھا واردون پر ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۞

''وہ جہنم میں (شدت عذاب سے) چیخیں گے ۱؎ اور وہ اس میں اور کچھ نہ سن سکیں گے ۲؎''

۱؎ زفیر کا معنی سخت آواز اور زور سے سانس لینا ہے۔ یہاں بعض فعل کو کل کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور یہ جملہ خالدون کی ضمیر سے حال ہے۔

۲؎ یہ جملہ ظرفیہ پر معطوف ہے یا حال ہے۔ ابن جبیر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ جب دوزخ میں صرف ہمیشہ رہنے والے باقی رہ جائیں گے تو ان کو لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا جن میں کیل بھی لوہے کے ہوں گے پھر ان تابوتوں کو دوسرے لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا پھر انہیں جہنم کے نیچے والے درجہ میں پھینک دیا جائے گا ان میں سے ہر ایک یہی خیال کر رہا ہوگا کہ میرے سوا کسی دوسرے کو عذاب نہیں ہو رہا ہے(1) پھر عبداللہ بن مسعود نے یہ آیت تلاوت فرمائی لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ

امام بغوی نے جو حدیث بیان فرمائی ہے اس میں ہے کہ ان کو آگ کے تابوتوں میں ڈالا جائے گا پھر ان تابوتوں کو دوسرے تابوتوں میں رکھا جائے گا پھر ان تابوتوں کو ایسے تابوتوں میں رکھا جائے گا جن میں آگ کے کیل ہوں گے وہ ان تابوتوں میں کچھ نہیں سن سکیں گے اور ان میں سے ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ میرے سوا کسی دوسرے کو عذاب نہیں ہو رہا ہے(2)۔

حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب انکم و ما تعبدون من دون الله حصب جهنم کا ارشاد نازل ہوا تو مشرک کہنے لگے۔ ملائکہ، عیسیٰ اور عزیر علیہم السلام کی بھی پوجا کی جاتی ہے (تو پھر ان کا کیا ہوگا) اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

إِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىٓ ۙ أُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۞

''بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے ۱؎''

۱؎ الحسنیٰ سے مراد منزلۃ القرب ہے یا اچھی خصلت ہے اور وہ سعادت ہے یا اطاعت کی توفیق ہے یا جنت کی شہادت ہے۔ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن خوش نصیبوں کو ہماری طرف سے ہدایت کی عنایت ہوئی آخر کار انہیں ولایت بھی نصیب ہوگی۔ ابن مردویہ اور الضیاء نے المختار میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن الزبعری نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا تو کہنے لگے اے محمد آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے تجھ پر یہ ارشاد نازل فرمایا ہے إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اللہ نے یہ نازل فرمایا ہے۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا پھر تو سورج، چاند، ملائکہ، عزیر علیہ السلام کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ کیا یہ سب ہمارے خداؤں کے ساتھ آگ میں ہوں گے۔ اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا ان الذین سبقت لهم منا الحسنىٰ اور وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا سے خَصِمُوْنَ تک نازل ہوا۔

امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور سرداران قریش حطیم کعبہ میں تھے (اور اس وقت کعبہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 608 (العلمیۃ)　　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (الفکر)

نصب تھے) نضر بن حارث آپ ﷺ سے مناظرہ کرنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے مسکت جواب دیا اور پھر یہ آیات تلاوت فرمائیں اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ الخ پھر آپ کھڑے ہوئے تو عبداللہ بن الزبعری لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔ ولید بن مغیرہ نے عبداللہ بن زبعری کو جو کچھ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا وہ بتا دیا۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا تم کہتے ہو کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں نے یہ کہا ہے۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا کیا یہود عزیر علیہ السلام کی اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کی اور بنو ملیح ملائکہ کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (یہود و نصاریٰ عزیر و مسیح کی نہیں) بلکہ شیطانوں کی پوجا کرتے ہیں(1)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اور ابن الزبعری کے متعلق یہ ارشاد نازل فرمایا مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے مگر کج بحثی کے لئے۔ درحقیقت یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں)

الواحدی نے ابن عباس سے امام بغوی کی روایت کی طرح روایت کیا ہے۔ اصول فقہ کی بعض کتب میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن زبعری کو فرمایا۔ تو اپنی قوم کی زبان سے بھی بے خبر ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ ما غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ یہ جواب کتب حدیث میں موجود نہیں ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں اس آیت میں ان کا کلمہ الا کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ قول دو وجوہ کے اعتبار سے غیر پسندیدہ ہے۔ 1۔ ان کا کلمہ الا کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ 2۔ استثناء کے لئے اتصال ضروری ہے اگرچہ بعض علماء کے نزدیک استثناء منفصل بھی جائز ہے اور ہم نے جو آیت کے نزول کا سبب ذکر کیا ہے وہ کلام کے انفصال پر دلالت کرتا ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک یہ آیت سابقہ آیت کی مخصص ہے کیونکہ ان کے نزدیک تخصیص اس کلام کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے جو مستقل ہو اور بعد میں اس کا نزول ہوا ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بعد میں نازل ہونے والی آیت ناسخ ہوگی مخصص نہ ہوگی، اور یہاں نسخ متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ نسخ امر میں ہوتا ہے اخبار میں نسخ نہیں ہوتا۔ پس یہ علیحدہ مستقل کلام ہے اور سابقہ کلام سے مجازی معنی کے مراد پر دلیل ہے۔ ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم الثعلبی اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا۔ جہنم سے دور رکھے جانے والوں سے میں' ابوبکر' عمر' عثمان' طلحہ، زبیر' سعید، سعد' عبدالرحمٰن بن عوف' ابوعبیدہ بن الجراح ہیں۔ پھر نماز کے لئے اقامت کہی گئی تو آپ اپنی چادر کھینچتے ہوئے کھڑے ہوئے اور ذیل کا ارشاد تلاوت فرمایا۔

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

"وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے۔"

۔ یہ مبعدون سے بدل ہے یا اس کی ضمیر سے حال ہے۔ دوزخ سے ان کے دور ہونے میں مبالغہ کرنے کے لئے یہ کلام ذکر کی گئی ہے۔ حسیس اس آواز کو کہتے ہیں جو محسوس ہو۔ یہاں ظرف (فیھا) کو اختصاص اور اہتمام کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ اس ارشاد میں دلیل ہے کہ صوفیاء کرام جن کے دل اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کی طرف رغبت نہیں رکھتے وہ بلا کیف وصل کی لذت میں ہمیشہ رہیں گے۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (الفکر)

كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''یہ نہ غمناک کرے گی انہیں بڑی گھبراہٹ [1] اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے (انہیں بتائیں گے) یہی وہ تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا [2]''

[1] یہ جملہ ان الذین سبقت کے ان کی دوسری خبر ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں الفزع الاکبر سے مراد نفخہ اخیرہ ہے کیونکہ ارشاد ہے وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (اور جس دن پھونکا جائے گا صور تو گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے)(1) میں کہتا ہوں نفخہ اخیرہ سے مراد وہ نفخہ ہے جو امور دنیا میں سے آخری ہوگا۔ ورنہ فزع کا نفخہ تو پہلا نفخہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے نفخہ الصعق مراد ہے اور یہ دونوں امر متلازم ہیں کیونکہ لوگ نفخہ اولی کے وقت گھبرائیں گے اور اس کی وجہ سے مرجائیں گے۔ قرطبی نے اسی قول کو صحیح کہا ہے۔ کیونکہ اکثر احادیث میں صرف دو نفخوں کا ذکر ہے۔ 1۔ نفخہ الصعق۔ 2۔ نفخہ البعث۔ ابن عربی نے تین نفخات کا ذکر کیا ہے۔ پہلا نفخہ الفزع، دوسرا نفخہ الصعق، تیسرا نفخہ البعث۔ میرے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں، الطبرانی نے المطولات میں، ابویعلی نے اپنی مسند میں، البیہقی نے البعث میں، ابوموسیٰ المدینی نے المطولات میں، علی بن معبد نے کتاب الطاعۃ والعصیان میں، عبد بن حمید نے اور ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابوہریرہ سے ایک طویل مرفوع حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ تین صور پھونکیں جائیں گے۔ پہلا نفخہ الفزع، دوسرا نفخہ الصعق، تیسرا نفخہ القیام الی رب العالمین۔ مزید تفصیل فزع کے متعلق احادیث میں وارد ہے۔ وہ ہم سورۂ نمل میں مذکورہ آیت کے تحت نقل کریں گے۔

حضرت الحسن فرماتے ہیں بڑی گھبراہٹ اس وقت ہوگی جب بندے کو آگ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا۔ ابن جریج فرماتے ہیں جب موت کو ذبح کیا جائے گا اور ندا دی جائے گی اے دوزخیو! تم نے ہمیشہ یہاں رہنا ہے اور اب کوئی موت نہیں ہے۔ سعید بن جبیر اور الضحاک فرماتے ہیں بڑی گھبراہٹ اس وقت ہوگی جب جہنم کو اوپر بند کر دیا جائے گا اور دوزخ کو اوپر سے اس وقت بند کر دیا جائے گا جب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوزخ سے نکال دے گا جن کو نکالنے کا اس نے ارادہ فرمایا ہوگا(2)۔

[2] یہ خوش نصیب جب اپنی قبروں سے باہر آئیں گے تو فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور جنت کے دروازوں پر انہیں خوش آمدید کہیں گے اور یہ بتائیں گے یہ تمہارا ثواب و اجر کا دن ہے، جن کا کتب سماویہ کے ذریعے تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ هذا يومكم کا جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ ملائکہ سے حال ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

''(یاد کرو) جس دن ہم لپیٹ دیں گے آسمان کو جیسے لپیٹ دیئے جاتے ہیں طومار میں کاغذات [1] جیسے ہم نے آغاز کیا تھا ابتدائے آفرینش کا اسی طرح ہم اسے لوٹائیں گے [2] یہ وعدہ (پورا کرنا) ہم پر لازم ہے یقیناً ہم (ایسا) کرنے والے ہیں [3]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 90 (الفکر) 2۔ ایضاً

ـلـ ابوجعفر نے تطوی کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور السماء کو نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دیا ہے اور جمہور قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور السماء کو نصب دی ہے۔ یہ اذکر فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے یا لا یحزنھم یا تتلقاھم کی ظرف ہے یا حال مقدرہ ہے۔ طی نشر کی ضد ہے اور اس کا معنی لپیٹنا ہے۔ السجل کا معنی الصحیفہ ہے اور یہ مساجلۃ سے مشتق ہے جس کا معنی لکھنا ہے۔ للکتب کو حمزہ' کسائی اور حفص نے جمع پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد "للکتاب" پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لکھنے کے لئے جس طرح کاغذ کو لپیٹا جاتا ہے یا جو لکھا جاتا ہے یا جس میں لکھا جاتا ہے اور اس کو لپیٹا جاتا ہے اسی طرح ہم آسمانوں کو لپیٹ دیں گے۔

جمع "للکتب" کے صیغہ کی قرأت اس مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ ابن عباس' مجاہد اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ السدی کہتے ہیں السجل ایک فرشتہ ہے جو لوگوں کے اعمال کو لکھتا ہے اور لام زائدہ ہے۔ جیسا کہ ردف لکم میں لام زائدہ ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجل' رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا۔ قاموس میں ہے کہ سجل' معاہدہ وغیرہ کی کتاب کو کہتے ہیں، اس کی جمع سجلات ہے، اس کا معنی حبشہ کی لغت میں کاتب اور مرد ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے کاتب کا نام بھی السجل ہے۔ ایک فرشتہ کا نام بھی ہے۔ السجل بالکسر سے مراد کتاب ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجل ایک پتھر تھا جس پر لکھا جاتا تھا پھر ہر اس چیز کو سجل کہا گیا جس پر لکھا جاتا تھا۔

ـ۲ـ کما میں ما کافہ یا مصدریہ ہے اور اول' بدأنا کا مفعول ہے، یعنی ہم نے جس طرح ابتداء عدم سے اس کو وجود بخشا اسی طرح ہم دوبارہ اسے لوٹائیں گے یا اس کے متفرق اجزاء کو جمع کریں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اول مضمر فعل کا مفعول ہو جس کی تفسیر نعیدہ کر رہا ہے دونوں تراکیب کے اعتبار سے معنیٰ ایک ہی ہے۔ اس آیت سے مقصود ابتدائے آفرینش کے ذریعے دوبارہ زندہ کرنے کی صحت کو بیان کرنا ہے۔ کیونکہ امکان ذاتی ہماری قدرت کے تحت داخل ہے اور ہماری قدرت قدیمہ کاملہ پہلی تخلیق اور دوسری تخلیق دونوں کو برابر شامل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کما میں ما موصولہ ہے اور بدأنا اس کا صلہ ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے اور کاف فعل محذوف کے متعلق ہے جس کی تفسیر نعیدہ کر رہا ہے اور اول خلق' بدأنا کی ظرف ہے یا ضمیر عائد محذوف سے حال ہے اس ترکیب کے اعتبار سے دوسری تخلیق پہلی تخلیق کی طرح ہوگی لیکن مخلوق جدا جدا ہوگی، یعنی پہلی اور دوسری تخلیق ایک دوسرے کے مثل ہوں گی۔ حق یہ ہے کہ دوسری تخلیق بعینہٖ پہلی تخلیق ہوگی' تمثیل صرف دونوں تخلیقوں میں ہے یا احوال و اوصاف میں ہے۔

امام بخاری' مسلم اور ترمذی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تمہیں اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں' پیدل' ننگے بدن' غیر مختون جمع کیا جائے گا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُهٗ (پھر فرمایا) سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا(3)۔

ـ۳ـ وعداً فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ نعیدہ کی تاکید ہے یا نعیدہ کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس نے ہمارے اعادہ کا وعدہ فرمایا ہے، یعنی جو بھی ہم نے وعدہ کیا ہے ہم پر اس کا پورا کرنا لازم ہے۔ تاکید بالائے تاکید کے لئے فرمایا انا کنا فاعلین۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

"اور بیشک ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں پند و موعظت کے (بیان کے) بعدـ۱ـ کہ بلاشبہ زمین کے وارث تو میرے نیک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 90 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1339 (التراث العربی)

3۔ [illegible]، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی کتب خانہ)

بندے ہوں گے ۲؎ “

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ سعید بن جبیر اور مجاہد فرماتے ہیں زبور سے مراد تمام کتاب سماویہ ہیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے۔ الشعبی فرماتے ہیں زبور سے مراد وہ کتاب ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور ذکر سے مراد تورات ہے۔ ابن عباس اور الضحاک فرماتے ہیں زبور سے مراد تورات اور ذکر سے مراد تورات کے بعد نازل ہونے والی کتب ہیں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں زبور سے داؤد علیہ السلام کی کتاب مراد ہے اور ذکر سے قرآن مراد ہے۔ ان دونوں تاویلوں کی صورت میں بعد بمعنی قبل ہوگا۔

۲؎ ارض سے مراد جنت ہے۔ حمزہ نے عبادی کو یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ آیت کریمہ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ کے ارشاد کی طرح ہے۔ فاسق لوگ جنت میں یا تو عذاب اور تطہیر کے بعد داخل ہوں گے یا مغفرت اور بخشش کے بعد داخل ہوں گے اور وہ اس وقت صالحین کے ساتھ مل جائیں گے اور ان کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے۔ مجاہد فرماتے ہیں الصالحون سے مراد محمد ﷺ کی امت ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ۔ اور وہ (خوش بخت) کہیں گے ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لئے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے)(2) بعض علماء فرماتے ہیں ارض سے مراد ارض مقدس ہے اور عبادی الصالحون سے مراد کمزور و ناتواں لوگ ہیں جو زمین کے مشارق و مغارب میں رہتے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں ارض سے مراد کفار کی زمین ہے جسے مسلمان فتح کریں گے۔ یہ ارشاد دین الٰہی کے غلبہ اور مسلمانوں کو اعزاز بخشنے کے لئے ہے (3) میں کہتا ہوں ارض سے مراد تمام زمین ہے۔ امام احمد نے حضرت مقداد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سطح زمین پر کوئی مٹی کا گھر اور اون کا خیمہ نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو اس میں داخل فرمائے گا عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کو ذلیل کرنے کے ساتھ یا تو اللہ تعالیٰ ان کو اسلام کی عزت عطاء کرے گا اور انہیں عزت والے لوگوں سے کر دے گا یا ان کو ذلیل کرے گا اور وہ کلمہ اسلام کو مجبوراً قبول کریں گے۔ مقداد فرماتے ہیں میں نے کہا پھر تو دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہوگا۔

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

” یقیناً اس قرآن میں کفایت ہے اس قوم کی (فلاح دارین) کے لئے جو عبادت گزار ہے ۱؎ “

۱؎ یعنی اس قرآن حکیم میں جو پند و نصائح، اخبار و مواعید ہیں وہ انسان کو جنت میں داخل کرنے کے لئے کافی ہیں کیونکہ یہ سب احکام جنت کا زاد راہ ہیں۔ جیسے مسافر کے زاد راہ کو بلاغ کہتے ہیں یا یہ معنی کہ مقصود و مطلوب تک پہنچنے کے یہ احکام سبب ہیں۔ یعنی جو ان احکام قرآنی سے نصیحت حاصل کرتا ہے وہ اپنے مطلوب ثواب کو پہنچ جاتا ہے۔ لقوم عابدین یا تو بلاغا کی صفت ہے یا اس کے متعلق ہے اور اس سے مراد وہ مومنین ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد تمام عالم ہیں۔ کعب الاحبار فرماتے ہیں اس سے مراد امت محمد یہ ہے جو نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں اور رمضان کے روزے رکھتے ہیں (4)۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لئے لے''

لے رحمۃً یا تو مفعول لہ کے اعتبار سے منصوب ہے یا ک ضمیر خطاب سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی جن وانس پر یہ ہماری رحمت ہے کہ ہم نے آپ کو مبعوث فرمایا تا کہ وہ آپ سے ہدایت حاصل کریں یا یہ معنی کہ ہم نے آپ کو مبعوث فرمایا حالانکہ آپ سراپا رحمت ہیں یعنی رحمت الٰہی کا سبب ہیں۔

حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن سعد اور حکیم نے ابی صالح سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ یعنی میں وہ رحمت ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمائی (1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے التاریخ میں روایت کیا ہے اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَلَمْ اُبْعَثْ عَذَابًا یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے عذاب بنا کر نہیں بھیجا۔

یہ جملہ ان فی هذا لبلاغاً پر معطوف ہے اور معنیٰ اس کی تاکید ہے کیونکہ قرآن جب بلاغا اور جنت کا زاد ہے تو اس رسول کا مبعوث کرنا جس پر قرآن نازل ہوا وہ یقیناً رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مجھے احکام اور پند و نصائح دیئے گئے ہیں وہ لوگوں کی سعادت کا سبب ہیں اور ان کی معاش و معاد کی صلاح کا موجب ہیں۔ پس جو اس سراپا رحمت سے فیض حاصل نہ کریں اور اس رحمت سے محروم ہیں تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، حضور کے رحمت ہونے کے یہ منافی نہیں ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں دنیا میں کفار کے لئے بھی رحمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی وجہ سے عذاب کو مؤخر کر دیا ان کی شکلیں نہیں بگڑتیں اور زمین میں دھنس نہیں جاتے اور ان کا نام و نشان نہیں مٹایا گیا (2)۔

قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

''فرما دیجئے کہ میرے پاس تو صرف وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا (وہی ہے جو) ایک خدا ہے لے پس کیا تم اسلام لانے کے لئے تیار ہو ۲''

لے یہ جملہ مستانفہ ہے، اس سوال کے جواب میں کہ میں جب رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں تو میں کیا کہتا ہوں؟ انما یوحیٰ میں ما کافہ ہے اور اس سے جو حصر مستفاد ہے وہ مبالغہ پر مبنی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ وحی کا مقصود اصلی توحید ہے گویا صرف یہی توحید کا حکم ہی میری طرف بھیجا گیا ہے کوئی دوسرا نہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے معاملہ میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے وہ صرف توحید ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما موصولہ ہو اور ان کا اسم ہو اور انما الهكم خبر کی حیثیت سے محل رفع میں ہو اور توحید کا اثبات دلیل سمعی کے ساتھ بھی درست ہے کیونکہ رسالت مرسل پر موقوف ہے پس یہاں کوئی دور لازم نہیں آتا۔

۲ یعنی سر تسلیم خم کرو اور خالصتاً اللہ کی عبادت کرو جیسا کہ وحی کا تقاضا ہے، جس کی حجت کے ساتھ تصدیق کی گئی ہے اور رحمت الٰہی کے حصول کی استعداد پیدا کرو۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 91 (العلمیۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 92 (الفکر)

''اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو آپ فرمادیجئے کہ میں نے آگاہ کر دیا ہے تمہیں پوری طرح ۱؎ اور میں نہیں سمجھتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ۲؎''

۱؎ اتمام حجت کے بعد بھی اگر وہ اسلام کی قبولیت سے منہ موڑیں اور رحمت الٰہیہ سے انکار کریں تو اے محبوب! آپ انہیں فرمادیں کہ مجھے جو احکامات دیئے گئے تھے وہ سب میں نے تمہیں پہنچا دیئے ہیں یا یہ معنی کہ میں تم سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان کوئی صلح نہیں اور اسلام کے احکام کی اطلاع یا اعلان جنگ میں نے کسی سے نہیں چھپایا۔ تم میں سے ہر ایک کو اطلاع ہو چکی ہے۔ اس ارشاد میں فرقہ باطنیہ اور رافضیوں کا رد ہے جو تقیہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ائمہ کرام اپنے اصحاب کو احکام شریعت پوشیدہ طور پر بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ اسلام کے احکام سے جو میں نے تمہیں بتائے ہیں یا جنگ کی اطلاع دی ہے اور اسلام اور کفر کی دشمنی کی اطلاع دی ہے اس کے علم میں میں اور تم برابر ہیں۔ یعنی کوئی دھوکا نہیں ہے جنگ کی تیاری کر لو۔ میں تمہیں برملا جنگ کی خبر دیتا ہوں، تمہاری اور ہماری جنگ کوئی پوشیدہ نہیں ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی کیا ہے کہ میں نے تمہیں خبر دی ہے کہ میں عدل اور استقامت رائے پر ہوں۔ میری رائے حجت اور دلیل سے آراستہ ہے۔

۲؎ یعنی مسلمانوں کے تم پر غالب آنے یا حشر کے قائم ہونے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ قریب پورا ہوگا یا دیر سے پورا ہوگا۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴿۱۱۰﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم (اپنے دل میں) چھپاتے ہو ۱؎''

۱؎ یعنی تم جو اعلانیہ اسلام پر طعن کرتے ہو اور خفیہ طور پر دلوں میں جو بغض اور کینہ رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی تمہیں جزاء دے گا۔ نفاق پر توبیخ اور اخلاص پر تحریص کے لئے یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَ إِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۱۱۱﴾

''اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا ۱؎ اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو ۲؎''

۱؎ ادری کا مفعول محذوف ہے، یعنی میں نہیں جانتا کہ کس سبب سے تمہارے عذاب میں تاخیر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن کو برابر جانتا ہے۔ جب اس جملہ میں کفار سے عذاب کو مؤخر کرنے کے سبب سے آپ ﷺ کی نفی کی گئی ہے تو یہ چیز ظن کی نفی کا وہم دلاتی ہے اور یہ وہم لعله الخ کے ارشاد میں واقع ہے۔ لعله کی ضمیر سابق مفہوم محذوف کی طرف راجع ہے۔ یعنی یہ تاخیر شاید تمہارے لئے اس قدر استدراج اور تمہاری آزمائش میں زیادتی کی خاطر ہو یا تمہارا امتحان لینے کی خاطر ہوتا کہ وہ دیکھے تم کفر کو چھوڑ کر نصیحت حاصل کرتے ہو یا نہیں۔

۲؎ متاع پر تنوین تحقیر کے لئے ہے۔ اسی طرح حین کی تنوین بھی تحقیر کے لئے ہے۔ اللہ کی طرف سے تمہیں بالکل قلیل طور پر لطف اندوز ہونا ہے جتنا کہ اس نے فیصلہ کر رکھا ہے۔ جلال الدین المحلی فرماتے ہیں یہ فتنہ کے مقابلہ میں ہے جس کی لعل کے ساتھ امید کی گئی ہے اور یہ ترجی کا محل نہیں ہے۔

قُلَ رَبِّ احْكُم بِالْحَقِّ ۗ وَ رَبُّنَا الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۱۲﴾

''آپ نے عرض کی میرے رب فیصلہ فرما دے (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ [1] اور (اے کفار!) ہمارا رب وہ ہے جو رحمٰن ہے اسی سے مدد طلب کی جاتی ہے ان باتوں پر جو تم کرتے ہو [2]''

[1] حفص نے قال ماضی کا صیغہ پڑھا ہے یہ خطاب سے غائب کی طرف التفات ہے اور جمہور قراء نے امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دعا کی اے میرے پروردگار ہمارے اور اہل مکہ کے درمیان ایسے عدل کے ساتھ فیصلہ فرما دے جو کفار کی تعذیب اور مسلمانوں کی نجات کا تقاضا کرتا ہے۔

[2] ربنا الرحمن مبتدا ہے اور خبر ہیں۔ المستعان الرحمٰن کی صفت ہے یا ربنا کی دوسری خبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا مقصود ہے ان باتوں پر جو وہ بکتے تھے۔ وہ غلط بیانی کرتے' باطل افواہیں پھیلاتے نیز طاقت اور شوکت بھی ان کے پاس تھی۔ وہ کہتے اسلام کا پھریرا چند دن بلند رہے گا پھر سرنگوں ہو جائے گا' کبھی کہتے اگر اسلام کی مخالفت اور داعی اسلام کی دشمنی پر جو عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے اگر یہ سچ ہوتا تو عذاب اتر چکا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب مکرم ﷺ کی اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ بدر کی جنگ میں مومنین کی مدد فرمائی اور کفار کو شکست فاش دی یا یہ معنی کہ جو تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کا بیٹا ہے اور محمد ﷺ کو جادوگر کہتے ہو اور قرآن کو شعر کہتے ہو۔ ان تمام الزامات کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد و معونت طلب کی جاتی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضور نبی رحمت ﷺ کی نظر عنایت سے سورۃ الانبیاء کا ترجمہ بروز سوموار 28 اگست 2000ء بمطابق 27 جمادی الاولی 1421ھ بوقت 8:50 اختتام پذیر ہوا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی نَعْمَائِهٖ وَآلَائِهٖ۔ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ لَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَّ اَصْلِحْ لِیْ شَانِیْ کُلَّهٗ۔ آمِیْنْ۔

وَ صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی حَبِیْبِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ ذُرِّیَّتِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔ آمِیْنُ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

سورة الحج

آیاتھا ۷۸ — سورۃ الحج مدنیۃ ۲۲ — رکوعاتھا ۱۰

سورۂ حج کے 10 رکوع اور 78 آیات ہیں ان میں سے بعض مدنی ہیں اور اکثر مکی ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانیوالا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①

''اے لوگو! ڈرو اپنے پروردگار (کی ناراضگی) سے بیشک قیامت کا زلزلہ[1] بڑی سخت چیز ہے[2]۔''

[1] اے لوگو! اپنے پروردگار کی ناراضگی اور سزا سے ڈرتے رہو اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرو۔ زلزلۃ الساعۃ کا معنی ہے قیامت قائم ہونے کیلئے زلزلہ کا تمام چیزوں کو حرکت دینا اور ہلا دینا۔ اس صورت میں اسناد مجازی ہے۔ (یعنی زلزلہ کی نسبت قیامت کی طرف مجازی ہے) یا قیامت میں تمام چیزوں کا حرکت کرنا اور ہل جانا۔ پس زلزلۃ کی الساعۃ کی طرف اضافت معنوی ہے اور اس میں فی مقدر ہے۔ یا اس میں مصدر کی اضافت ظرف کی طرف ہے اور الساعۃ کو قائم مقام مفعول کے رکھا گیا ہے۔

[2] شیئ عظیم سے مراد انتہائی خوفناک اور ڈراؤنی چیز ہے۔ چونکہ آیت کے پہلے حصہ میں قیامت کی گھبراہٹ اور سختی سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے اِنَّ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر اس حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ کہ وہ اپنی عقلوں سے قیامت کا تصور کریں اور یہ جان لیں کہ تقوی کا لباس پہننے کے بغیر کوئی شی انہیں اس کی سختی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

اس زلزلہ کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ علقمہ اور شعبی نے کہا ہے کہ یہ زلزلہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے اور قیامت قائم ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہوگا(1)۔ اور علامہ جلال الدین محلی نے یہ کہا ہے کہ یہ زلزلہ مغرب کی جانب سے سورج طلوع ہونے سے پہلے آئے گا(2)۔ اسی قول کو علامہ ابن عربی اور علامہ قرطبی نے اختیار کیا ہے اور اس کا قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

''جس روز تم اس (کی ہولناکیوں) کو دیکھو گے تو غافل ہو جائے گی ہر دودھ پلانیوالی (ماں)[1] اس (لخت جگر) سے جس کو اس نے دودھ پلایا[2]، اور گرا دے گی ہر حاملہ اپنے حمل کو[3] اور تجھے نظر آئیں گے لوگ جیسے وہ نشہ میں مست ہوں حالانکہ وہ نشہ میں مست نہیں ہونگے[4] بلکہ عذاب الٰہی بڑا سخت ہوگا (وہ اس کی ہیبت سے حواس باختہ ہوں گے)[5]۔''

[1] جس روز تم قیامت یا زلزلہ کی ہولناکیوں کو دیکھو گے۔ یوم ترونھا، تَذْهَلُ فعل کی ظرف ہے۔ مرضعۃ وہ عورت جو اپنے بچے کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 94 (الفکر)　2۔ تفسیر جلالین، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)

دودھ پلا رہی ہو۔ اور کہا جاتا ہے امراۃ مرضع یعنی ایسی عورت جس میں دودھ پلانے کا وصف موجود ہو۔ (چاہے اس وقت نہ بھی پلا رہی ہو) جیسا کہ لفظ حائض اور حامل کا اطلاق اسی عورت پر ہوتا ہے جو حیض اور حمل والی ہو اگر چہ اس وقت اسے حیض نہ آ رہا ہو اور وہ حاملہ نہ ہو (جبکہ حائضہ وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو اور حاملہ وہ عورت جس کا حمل موجود ہو۔) (یعنی ہر دودھ پلانے والی اس ہولناکی کے سبب اپنے بچے سے غافل ہو جائے گی۔)

۲۔ عماء ارضعت میں ماموصولہ ہے یا مصدریہ ہے یعنی وہ عورت اس زلزلہ کے خوف سے دہشت زدہ ہو جائے گی اور وہ اس سے غافل ہو جائے گی جسے وہ دودھ پلا رہی تھی اور اس بچے کے منہ سے اپنا پستان نکال لے گی۔ یا وہ عورت دودھ پلانے سے غافل ہو جائے گی۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ انّ کی دوسری خبر ہے۔ اور اس میں رابطہ ترونھا کی ضمیر ہے یا یہ جملہ اس کی عظمت شان اور شدت کی علت بیان کر رہا ہے۔

۳۔ اور ہر حاملہ عورت اس زلزلہ کے خوف سے اپنا جنین گرا دے گی۔ تضع کا عطف تذھل پر ہے۔ حسن نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ دودھ پلانے والی اپنے بچے کو دودھ چھڑانے سے غافل ہو جائے گی اور حاملہ عورت کے پیٹ سے نامکمل بچہ گر جائے گا۔

۴۔ حسن نے کہا ہے کہ خوف کے سبب لوگ تجھے نشہ میں مست نظر آئیں گے(1) حالانکہ وہ شراب کے نشہ میں مست نہیں ہوں گے۔ حمزہ اور کسائی نے سکاری کو سکری وماھم بسکری پڑھا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور یہ سکران کی جمع ہے(2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ سکر کو علت کے قائم مقام رکھتے ہوئے اسے سکری پڑھا گیا ہے جیسا کہ عطشی ہے(3)۔ مزید فرمایا کہ تری الناس میں ضمیر واحد ہے۔ جب کہ اس سے قبل ترونھا صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کو تو سب ہی دیکھیں گے جب کہ سکر (نشے) کا اثر ہر ایک کو دوسرے پر دکھائی دے گا۔ (اور اپنی حالت سکر اسے نظر نہیں آئے گی اسلئے قیامت کے ذکر کے وقت صیغہ جمع ذکر کیا اور حالت نشہ کے ذکر میں صیغہ واحد ذکر فرمایا)

۵۔ بلکہ عذاب الٰہی بڑا سخت ہوگا پس اس کا خوف اور دہشت ان پر اتنی چھا جائے گی کہ ان کی عقلیں اڑ جائیں گی، وہ حواس باختہ ہو جائیں گے اور ان سے تمیز کی صلاحیت اٹھ جائے گی۔ یہ جملہ نفی سکر سے زلزلہ کے خفیف ہونے کے پیدا ہونے والے وہم کو ختم کرنے کیلئے ہے۔ (کہ وہ خفیف نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تو انتہائی شدید ہوگا)

علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ زلزلہ دنیا میں وقوع پذیر ہوگا (اور یہ قیامت کی علامات میں سے ہے) کیونکہ مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد تو حمل اور رضاع کا کوئی تصور نہیں ہوگا۔ (یعنی کوئی عورت حاملہ نہیں ہوگی کہ اس کا حمل ساقط ہو۔ اور نہ کوئی دودھ پینے والا بچہ اور نہ ہی کوئی دودھ پلانے والی عورت ہوگی۔) اس نظریہ کی تردید اس طرح ہوتی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ یایھا الناس اتقوا میں یا تو خطاب عام لوگوں کو ہے یا پھر ان خاص لوگوں کو جو کہ نزول آیت کے وقت موجود تھے۔ دونوں صورتوں میں وہ زلزلہ قیامت جس کی شرائط میں سے انتہائی خوفناک اور سخت ہونا ہے وہ مخاطبین کے حق میں امر بالتقوی کی علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی شدت اور دہشت صرف ان لوگوں پر طاری ہوگی جو اس زلزلہ کے وقت موجود ہونگے۔ لہٰذا اس کی شدت نہ تو تمام لوگوں کو محسوس ہوگی اور نہ ہی ان لوگوں کو جو حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 95 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 489 (العلمیہ)

عنہما نے فرمایا کہ زلزلۃ الساعۃ نفخہ بعث اورلوگوں کے قبروں سے اٹھنے کے بعد ہوگا(1)۔حلیمی وغیرہ نے اس مؤقف کو اختیار کیا ہے۔اور کہا ہے کہ اس آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ دودھ پلانے والے بچے سے غافل ہو جائیگی اور حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا، یہ شدت خوف اور انتہائی زیادہ گھبراہٹ کو بیان کرنے کیلئے بطور مجاز وتمثیل بیان کیا گیا ہے۔ورنہ حقیقۃً ایسا نہیں ہوگا۔اس کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا (وہ دن بچوں کو بوڑھا کردے گا) حالانکہ حقیقۃً اس دن کوئی بچہ بوڑھا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس طرح مجازاً اس دن کی دہشت اور ہولناکی کو بیان کرنا مقصود ہے۔اور اس مؤقف کی تائید اس حدیث طیبہ سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔وہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آیت کریمہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ...... عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ۔نازل ہوئی(2)۔

حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ دن کونسا ہے؟ تو صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ اسلام سے فرمائے گا (اپنی اولاد میں سے) دوزخ کیلئے حصہ بھیجو۔الحدیث۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عمرانؓ بن حصین اور حضرت ابوسعیدؓ خدری وغیرہ سے روایت ہے کہ یہ دونوں آیتیں غزوہ بنی مصطلق کے دوران رات کے وقت نازل ہوئیں۔رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام کو) بلایا اور انہیں یہ آیتیں پڑھکر سنائیں۔(انہیں سن کر وہ اتنا روئے) کہ اس رات سے بڑھکر کہیں بھی اتنے زیادہ رونے والے لوگ نہیں دیکھے گئے۔پس جب صبح ہوئی تو لوگوں نے اپنے گھوڑوں سے زینیں نہیں اتاریں۔خیمے نہیں لگائے اور ہانڈیاں تک نہیں پکائیں بلکہ کچھ لوگ روتے رہے اور کچھ غمزدہ متفکر حالت میں بیٹھے رہے۔تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس دن کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مکرم ہی بہتر جانتے ہیں۔تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وہ دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا اٹھو اور اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ بھیجو۔تو آدم علیہ السلام عرض کریں گے کیا تمام سے؟ کتنا کتنا؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ہر ہزار میں سے نوسوننانوے جہنم کیلئے اور ایک جنت کیلئے۔یہ بات مسلمانوں پر انتہائی گراں ثابت ہوئی۔انہیں شدید ضرب لگی اور وہ رونے لگے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ تو نجات کون پائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم خوش رہو، صراط مستقیم پر چلتے رہو اور قریب ہوتے جاؤ۔کیونکہ تمہارے ساتھ دو مخلوقیں اور بھی ہونگی جو ہر قوم سے زیادہ ہونگی اور وہ یاجوج ماجوج ہیں۔پھر ارشاد فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت کا تیسرا حصہ تم ہوگے۔پس یہ سن کر انہوں نے اللہ کی عظمت و کبریائی بیان کی اور اس کی حمد وثنا کی۔پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا نصف تم ہوگے۔یہ سن کر انہوں نے اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا دوتہائی تم ہوگے۔بیشک اہل جنت کی ایک سوبیس صفیں ہونگی، ان میں سے اسی ۸۰ صفیں میری امت کی ہونگی اور مسلمان (تعداد کے اعتبار سے) کفار کے مقابلے میں اتنے کم دکھائی دیں گے جیسے اونٹ کے پہلو میں تل کا نشان اور گھوڑے کے پاؤں میں دوسرے رنگ کا کوئی نشان۔بلکہ اسطرح جیسے سفید رنگ کے بیل کی پشت پر سیاہ رنگ کا بال اور سیاہ بیل پر سفید رنگ کا بال۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونگے۔حضرت عمرؓ نے

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 94 (الفکر)　　2۔جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی کتب خانہ)

عرض کی کیا ستر ہزار؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں ستر ہزار اور ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار۔ یہ سن کر حضرت عکاشہ بن محصنؓ کھڑے ہوئے عرض کی یارسول اللہ ﷺ (دعا فرمائیے کہ) اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں سے کر دے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو بھی ان میں سے ہے۔ پھر انصار میں سے ایک آدمی اٹھا اور عرض کی اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے بھی ان میں سے ایک کر دے تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا سبقک بھا عکاشۃ اس بارے میں عکاشہ تجھ سے سبقت لے گئے ہیں(1)۔

پہلے نظریہ کے قائل (یعنی کہ زلزلہ ساعت نفخہ اول سے پہلے ہے) اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث قطعاً اس پر دلالت نہیں کرتی کہ زلزلہ اس وقت ہوگا، جبکہ آدم علیہ السلام کو دوزخ کیلئے اپنی اولاد میں حصہ نکالنے کا حکم ہوگا (یعنی ان دونوں کا وقوع ایک ہی وقت میں ہوگا) بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس دن زلزلہ آئیگا اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو دوزخ کیلئے اولاد میں سے حصہ نکالنے کا حکم ہو گا۔ گویا جب حضور نبی کریم ﷺ نے اس زلزلہ کے بارے خبر دی جو نفخہ اولیٰ سے پہلے ہوگا، تو ساتھ ہی دیگر خوفناک اور دہشت زدہ کر دینے والے امور کا بھی تذکرہ فرمادیا۔ اور انہی میں سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوگا کہ دوزخ کیلئے اپنی اولاد میں سے حصہ نکالیئے۔ پس یہ حکم بھی اسی دن ہوگا۔ لیکن یہ اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ یہ نفخہ اولی کے ساتھ متصل بھی ہو۔

میں کہتا ہوں یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جسے شیخین نے صحیحین میں آپ کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم! تو حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے لَبَّیْکَ وَ سَعْدَیْکَ وَ الْخَیْرُ فِیْ یَدَیْکَ میں حاضر میں حاضر تمام بھلائیاں تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا (اپنی اولاد میں سے) جہنم کیلئے حصہ نکالئے۔ وہ عرض کریں گے جہنم کیلئے کتنا حصہ ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے۔ تو اس وقت بچے بوڑھے ہو جائیں گے، حاملہ عورتیں اپنے حمل گرادیں گی اور لوگ نشے میں مست دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب انتہائی سخت ہوگا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ (اس ہزار میں) ہم میں سے وہ ایک کون ہوگا۔؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں بشارت ہو بیشک تم میں سے ایک آدمی اور یاجوج ماجوج میں سے ہزار (جہنم میں) ہوگا۔ پھر ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا چوتھائی حصہ تم ہوگے پس ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت میں سے ایک تہائی حصہ تم ہوگے۔ ہم نے پھر اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت کا نصف تم ہوگے تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا تذکرہ کیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا (تعداد کے اعتبار سے) تم لوگوں میں ایسے ہی نظر آؤ گے جیسے سفید رنگ کے بیل کی جلد میں سیاہ بال یا سیاہ رنگ کے بیل کی جلد میں سفید بال(2)۔ یہ حدیث صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بچوں کا بوڑھا ہونا اور حاملہ کے حمل کا ساقط ہونا دوزخ کی طرف بھیجنے کے حکم کے ساتھ متصل ہے (یعنی ان تمام کا وقت ایک ہے) بلکہ لوگوں کا قبروں سے اٹھایا جانا بھی زلزلہ سے مقدم ہوگا۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ یَتَّبِعُ كُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَیْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ یُضِلُّهٗ وَ یَهْدِیْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴿۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96-95 (الفکر)   2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 117 (قدیمی)

''اور بعض ایسے لوگ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم کے بغیر ۱؎ اور پیروی کرتے ہیں ہر سرکش شیطان کی ۲؎۔ جس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا تو وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا اور راہ دکھائے گا اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف ۳؎''

۱؎ اور بعض ایسے لوگ ہیں جو بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اسکے احکام کے بارے جھگڑتے ہیں۔ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے نازل ہوئی کیونکہ وہ زیادہ جھگڑالو تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور قرآن پہلے لوگوں کے افسانے اور قصے ہے۔ وہ بعث بعد الموت کا بھی انکار کرتا تھا۔ کہتا تھا وہ شے جو ایک بار خاک ہو جائے اسے دوبارہ زندہ کرنا محال ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابو مالک سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۲؎ اور جھگڑا کرنے میں یا عام حالات میں ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں جو بھی انہیں جنون اور انسانوں میں سے پیش آئے۔ مرید مرد سے ہے اس کا معنی ہے خالی ہونا، ننگا ہونا۔ اس لئے وہ آدمی جس کی داڑھی اور مونچھوں وغیرہ کے بال نہ ہوں وہ مرد کہلاتا ہے۔ اور مرید اور مارد کا معنی ہے جو خیر سے خالی ہو اور شر اور برائی میں مسلسل مصروف ہو۔ قاموس میں ہے کہ مرد یا باب نصر اور کرم ہے مصدر مرود اور مرادۃ آتا ہے صفت کے صیغے مارد (اسم فاعل)، مرید اور متمرد ہیں۔ اس کا معنی ہے آگے بڑھنا، سرکش ہونا یا اس حد اور عنایت سے آگے بڑھ جانا جس کی پابندی اس پر لازم تھی۔ مردہ کا معنی ہے اس نے اسے کاٹ دیا۔ اس نے اس کی عزت کو خاک میں ملا دیا مرد علی الشیء کا معنی ہے وہ اس شی کا مشتاق ہو گیا(1)۔

۳؎ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جو اس کی اتباع اور پیروی کرے گا وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا۔ فانہ یضلہ میں ان مفتوحہ اپنے جملہ کے ساتھ ملکر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور فاء کا مابعد جملہ اگر من شرطیہ ہو تو اس کی جزاء ہے اور اگر موصولہ ہو تو اس کا جواب ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جو شیطان کی پیروی کرے گا تو شیطان ضرور اسے سیدھے راستے سے بھٹکا دے گا اور اسے جہنم کی راہ دکھائے گا یا اسے ایسی راہ پر گامزن کر دے گا جو اسے جہنم کے عذاب تک لے جائے گی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہ کی ضمیر شیطان کی طرف راجع ہے اور من موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ یا من موصوفہ اپنی صفت کے ساتھ ملکر ان کی خبر ہے اور تولاہ میں لا ضمیر منصوب شیطان کی پیروی کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور فانہ یضلہ میں فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف من تولاہ پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ شیطان کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ شیطان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس سے وہ محبت اور دوستی کرتا ہے یا جس پر تسلط جما لیتا ہے اسے ضرور گمراہ کر دیتا ہے، بھٹکا دیتا ہے۔ زجاج نے اسی طرح کہا ہے۔

اور جملہ ومن الناس من یجادل فی اللہ اتقوا کے فاعل سے حال ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّجَادِلُ وَلَمْ یَتَّقِ۔ (اے لوگوں اللہ تعالیٰ سے ڈرو حالانکہ تم میں سے بعض وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اور ڈرتے نہیں) تو اس میں خطاب سے غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَ

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 461 (التراث العربی)

نُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰٓ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ۝

''اے لوگو! اگر تمہیں کچھ شک ہو (روز محشر) جی اٹھنے میں تو ذرا اس امر میں غور کرو کہ ہم نے ہی پیدا کیا تھا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کے ٹکڑے سے [1] بعض کی تخلیق مکمل ہوئی ہے اور بعض کی نامکمل [2] تا کہ ہم ظاہر فرما دیں تمہارے لئے (اپنی قدرت کا کمال) [3] اور ہم قرار بخشتے ہیں رحموں میں جسے ہم چاہتے ہیں ایک مقررہ میعاد تک پھر ہم نکالتے ہیں تمہیں بچہ بنا کر پھر (پرورش کرتے ہیں تمہاری) تا کہ تم پہنچ جاؤ اپنے شباب کو [4] اور تم میں سے کچھ (پہلے) فوت ہو جاتے ہیں اور تم میں سے بعض کو پہنچا دیا جاتا ہے نکمی عمر تک تا کہ وہ کچھ نہ جانے ہر چیز کو جاننے کے بعد [5] اور تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک پڑی ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر (بارش کا) پانی تو وہ تروتازہ ہو جاتی ہے اور پھولتی ہے اور اگاتی ہے ہر خوشنما جوڑے کو [6]''

[1] اے لوگو! اگر تمہیں (روز محشر) جی اٹھنے کے امکان میں اور اس پر ہماری قدرت کے ہونے کے بارے شک ہو تو ذرا اس امر میں غور کرو کہ ہم نے ہی تمہاری جنس کو پیدا کیا تھا۔ کم ضمیر صحیح سالم پیدا ہونے والے بچے کو بھی شامل ہے اور اس کو بھی جو قبل از وقت ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی انسان بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یعنی تم اپنی تخلیق کی ابتداء میں غور وفکر کرو، وہ تمہارے شک کا ازالہ کر دے گی۔ بیشک ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ان مادہ منویہ سے پیدا کیا ہے جو تمہاری کھائی ہوئی ان غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے جو مٹی سے اگتی ہیں۔ نطفہ سے مراد منی ہے یہ لفظ نطف سے مشتق ہے، اس کا معنی انڈیلنا، ٹپکانا ہے۔ علقہ کا معنی ہے جمے ہوئے خون کا ٹکڑا اور مضغۃ کا معنی ہے گوشت کا ٹکڑا، اصل میں اسے سے مراد گوشت کی اتنی مقدار ہے جسے چبایا جا سکتا ہے۔

[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مخلقۃ سے مراد وہ بچہ ہے جس کی خلقت مکمل ہو چکی ہو اور غیر مخلقۃ سے مراد وہ بچہ ہے جس کی خلقت مکمل نہ ہوئی ہو۔ مجاہد نے کہا ہے کہ مخلقۃ سے مراد وہ ہے جس کی صورت وشکل بنا دی گئی ہو اور غیر مخلقۃ سے مراد وہ ہے جس کی صورت وشکل نہ بنائی گئی ہو(1)۔ بعض نے کہا ہے کہ مخلقۃ سے مراد وہ بچہ ہے جسے عورت صحیح وقت پر جنم دیتی ہے۔ اور غیر مخلقۃ سے مراد قبل از وقت ساقط ہونے والا بچہ ہے۔ پس مذکورہ اقوال کے مطابق غیر مخلقۃ سے مراد ساقط ہونے والا بچہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مخلقۃ سے مراد وہ صحیح سالم تندرست بچہ ہے جس میں کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔ اور غیر مخلقۃ سے مراد وہ ہے جس میں کوئی نقص اور عیب ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ گوشت کے لوتھڑے کو متفاوت پیدا کرتا ہے۔ اس میں سے کوئی کامل الخلقت اور عیوب ونقائص سے مبرا ہوتا ہے اور کچھ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ پس گوشت کا یہ تفاوت لوگوں کی خلقت اشکال، قد وقامت کے لحاظ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 97 (الفکر)

سے لمبا ہونا اور چھوٹا ہونا اور اعضاء کے اعتبار سے کامل و ناقص ہونے کے تفاوت میں باقی رہتا ہے۔ اس تفصیل کے مطابق غیر مخلقة سے مراد ساقط ہونے والا بچہ نہیں اور اس صورت میں ہمیں یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ساقط ہونے والا بھی انسان کی جنس سے ہے کیونکہ یہ بھی انسان بننے کی استعداد رکھتا ہے۔ لیکن صحیح پہلا قول ہی ہے اور غیر مخلقه سے مراد ساقط ہونے والا بچہ ہی ہے۔

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ علماء نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب نطفہ رحم میں قرار پذیر ہو جاتا ہے تو فرشتہ اسے ہاتھ میں لیکر کہتا ہے اے پروردگار! یہ مخلقہ ہے یا غیر مخلقہ؟ اگر رب کریم فرمادے کہ یہ غیر مخلقہ ہے تو رحم اسے خون کی صورت میں پھینک دیتی ہے اور اس میں جان نہیں پڑتی۔ اور اگر رب کریم مخلقہ فرمادے تو پھر فرشتہ عرض کرتا ہے کیا یہ مذکر ہے یا مونث، یہ شقی ہے یا سعید، اس کی عمر کتنی ہوگی، اس کا عمل کیا ہوگا اور اس کا رزق کیسا ہوگا؟ تو اسے جواب دیا جاتا ہے لوح محفوظ کی طرف جاؤ۔ اس کے بارے میں ہر چیز تجھے وہاں مل جائے گی چنانچہ وہ فرشتہ لوح محفوظ کی طرف جاتا ہے اور اس میں سب کچھ لکھا ہوا پالیتا ہے۔ وہاں سے اسے نقل کر لیتا ہے اور آخری مرحلے تک اسے اپنے پاس رکھتا ہے(1)۔

۳۔ لنبین لکم کا تعلق خلقنا کم کے ساتھ ہے اور اسے مذکورہ تمام بیان کی قید کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی تاکہ اس تدریجی مراحل سے گزار کر ہم تمہارے سامنے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا اظہار کریں۔ تاکہ تم اس سے بعث بعد الموت پر استدلال کر سکو۔ کہ وہ شئی جو پہلی بار تخلیق کرنے میں تغیر وفساد کو قبول کرتی ہے وہ دوبارہ تخلیق کے دوران بھی اس تغیر وفساد کو قبول کر سکتی ہے۔ اور وہ ذات جو پہلی بار میں تبدیلی کرنے اور اس کی تصویر کشی پر قادر ہے وہ دوسری بار بھی اس کی قدرت رکھتی ہے۔ لنبین فعل کا مفعول محذوف ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ افعال جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کا اظہار ہوتا ہے اس کا احاطہ ممکن نہیں۔

بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے تاکہ ہم تمہارے لئے وہ کچھ بیان کر دیں جو تم نے کرنا ہے اور جو تم نے چھوڑنا ہے۔ اور جن چیزوں کی تمہیں عبادت و بندگی میں ضرورت ہوتی ہے، یعنی ہم نے تمہیں احکام تکلیفیہ کا پابند بنا کر پیدا کیا ہے۔

۴۔ و نقر فی الارحام ترکیب کلام میں حال ہے اور تقدیر کلام ونحن نقر ہے یا واؤ عاطفہ ہے اور یہ انا خلقناکم پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نطفہ کو رحموں میں قرار اور ثبات دیتے ہیں، پس نہ تو رحم اسے باہر پھینکتی ہے اور نہ اسے ساقط کرتی ہے۔ جتنی مدت ہم اسے قرار دینا چاہیں ایک مقررہ میعاد تک جس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اور اس سے مراد رحم سے ولادت کے وقت بچے کے خارج ہونے کا وقت ہے۔ پھر ہم تمہیں اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکالتے ہیں اس حال میں کہ تم چھوٹے بچے ہوتے ہو۔ ترکیب کلام میں طفلا کا لفظ نخرجکم کی کم ضمیر منصوب سے حال ہے۔ اور اسے یا تو کل واحد کے معنی کی تاویل میں حال بنایا گیا ہے یا جنس پر دلالت کرنے کی وجہ سے یا پھر اس لئے کہ یہ اصل میں مصدر ہے۔ لتبلغوا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ثم نربیکم لتبلغوا پھر ہم تمہاری پرورش کرتے ہیں تاکہ تم اپنے شباب کو پہنچ جاؤ۔ اور اشد شدة کی جمع ہے۔ جیسے انعم نعمة کی جمع ہے۔ یعنی تاکہ جو قوت وعقل کی صلاحیتیں تمہارے لئے مقدر کی گئی ہیں تم ان کے کمال اور انتہا تک پہنچ جاؤ۔ علماء نے کہا ہے کہ اس قوت و طاقت کا کمال تیس سے چالیس سال کی عمر کے درمیان حاصل ہو جاتا ہے۔

۵۔ تم میں سے بعض شباب کی عمر کو پہنچ کر یا اس سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں۔ ترکیب کلام میں ومنکم من یتوفی جملہ معترضہ ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 97 (الفکر)

یا حال ہے یا سابقہ جملے پر معطوف ہے۔

اور تم میں سے بعض کو انتہائی بڑھاپے اور نکمی عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے تا کہ وہ ہر چیز کو جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔ لکیلا یعلم یہ یرد کے متعلق ہے اور اس پر لام عاقبت کیلئے ہے۔ یعنی یہاں تک کہ وہ اس پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس پر وہ عقل وفہم کی قلت اور کمزوری کے سبب عہد طفولیت میں تھا پس وہ جس کا علم رکھتا تھا اسے بھول جاتا ہے اور جسے پہچانتا تھا اس کا انکار کر دیتا ہے۔

عکرمہؒ نے کہا ہے جو قرآن کریم پڑھتا ہے وہ اس حالت سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہ آیت بعث بعد الموت کے ممکن ہونے پر دوسری دلیل ہے۔ اس طرح کہ وہ مختلف امور اور متضاد احوال جو انسان پر زندگی کے مختلف مراحل میں طاری ہوتے ہیں (یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے) تو وہ ذات جو اس تغیر و تبدل پر قادر ہے وہ انہی کی مثل دوبارہ تغیر و تبدل کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔

لے اور تو زمین کو دیکھتا ہے کہ مردہ خشک پڑی ہے۔ ھامدۃ ھمدت النار سے مشتق ہے۔ اور یہ تب بولا جاتا ہے جب آگ بجھ کر راکھ ہو جائے۔ پھر جب ہم اس پر بارش کا پانی برساتے ہیں تو وہاں نباتات لہلہانے لگتیں ہیں۔ اور وہ پھولتی اور بڑھ جاتی ہیں۔ ربت کو ابوجعفر نے ہمزہ کے ساتھ ربات پڑھا ہے، سورہ حم السجدہ میں بھی اسی طرح کیا ہے۔ ربت کا معنی ہے بلند ہونا، پروان چڑھنا۔ مبرد نے کہا ہے (کہ زمین کی طرف لہلہانے کی نسبت بطور مجاز ہے) ورنہ مقصود یہ ہے کہ زمین کی نباتات لہلہانے لگتی ہیں اور خوب پھولتی بڑھتی ہیں۔ پس یہاں مضاف محذوف ہے۔ کیونکہ نباتات میں لہلہانے کا عمل بالکل اظہر ہے۔

(اور ہر خوشنما جوڑے کو اگاتی ہے) من کل زوج میں من زائدہ ہے۔ کل زوج سے مراد ہر صنف اور قسم ہے۔ اور بھیج کا معنی ہے خوشنما اور خوبصورت ہونا۔ قاموس میں ہے کہ بھیجۃ کا معنی ہے سرور اور خوشی۔ بہج باب کرم اس سے صفت کا صیغہ بہج اور مبھاج ہے۔ اور نجل کی طرف اس سے باب فرح بھی آتا ہے، اس سے صفت کے صیغے بہیج اور بہج ہیں۔ (ان دونوں صورتوں میں اسکا معنی ہے خوش ہوا) اس سے منع کی طرف باب فتح بھی آتا ہے اور اس سے باب افعال ابہج آتا ہے، اس صورت میں معنی ہے خوش کرنا۔ ابتھاج کا معنی سرور اور خوشی ہے(1)۔ ترکیب کلام میں تری الارض مکمل جملہ ان خلقاکم پر معطوف ہے۔ یہاں جملہ اسمیہ کی بجائے جملہ فعلیہ ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان صفات کا ظہور تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مذکورہ موضوع پر تیسری دلیل بیان فرمائی ہے جو بالکل ظاہر اور عام مشاہدہ میں ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ یُحْیِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾

"یہ (رنگا رنگیاں اس کی دلیل ہیں) کہ اللہ تعالیٰ ہی برحق ہے اور وہی زندہ کرتا ہے مردوں کو اور بلاشبہ وہی ہر چیز پر قادر ہے لے اور یقیناً قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھائے گا ان (مردوں) کو جو قبروں میں ہیں ہے"

لے ذلک اسم اشارہ ہے اس کا مشار الیہ مذکورہ بالا تفصیل ہے۔ یعنی انسان کے مختلف تخلیقی مراحل، اس پر متضاد احوال کا طاری ہونا اور زمین کا مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا وغیرہ۔ ترکیب کلام میں ذلک مبتدا ہے۔ اس کی خبر مابعد کلام ہے۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 285 (التراث العربی)

مذکورہ رنگینیاں اور تغیر و تبدیل اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ثابت اور برحق ہے، وہ فی ذاتہ متحقق ہے اور واجب الوجود ہے۔ اسی کے سبب تمام اشیاء معرض وجود میں آتی ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کسی ممکن کا پردہ عدم سے ظاہر ہونا محال اور ناممکن ہوتا۔ وہی بے جان نطفہ اور مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ بلاشبہ وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ کیونکہ اس کی یہ قدرت ذاتی ہے۔ اور اس کی ذات کی نسبت تمام چیزوں کی طرف مساوی ہے۔ (لہٰذا ہر شئی اس کی قدرت میں ہے) تو جب مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بعض مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تو بالیقین وہ تمام مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے اگر چہ وہ ریزہ ریزہ ہونے والی بوسیدہ ہڈی ہی کیوں نہ ہو۔

۲ یقیناً وہ ساعت آنے والی ہے جس میں دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائیگا اور مکمل طور پر ختم ہو جائیگا۔ اور یہ آئے دن کا تغیر و تبدل اسی کے مقدمات میں سے ہے۔ اس میں ذرہ بھر شک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق ان مردوں کو زندہ کر کے ضرور اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ اس کی جانب سے وعدہ خلافی کا قطعاً کوئی احتمال و امکان نہیں مذکورہ تین جملوں میں سے پہلا انسان کی تخلیق مختلف مراحل میں کرنے، اسے متضاد احوال کی طرف پھیرنے اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرنے کی علت فاعلیہ بیان کرنے کیلئے ہے۔ اور آخری دونوں جملے علت غائیہ اور نتیجہ کے بیان کیلئے ہیں۔ کیونکہ انسان وغیرہ کی تخلیق کا مقصد مدعیٰ معرفت الٰہی اور حسن عبادت ہے۔ ورنہ تو اس کی ایجاد عبث اور بے مقصد ہو جائے گی حالانکہ ساری کائنات کو اسی لئے پیدا کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان پر دلیل ہو جائے۔ اور وجوب معرفت پر وجوب عبادت مرتب ہوتا ہے اور وجوب عبادت پر جزاء و سزا کا قانون مرتب ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور جزاء و سزا کا کوئی تصور نہ ہو تو اس سے دین اسلام کو ماننے والوں، رب کریم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والوں اور انکار کرنیوالے مجرموں کے درمیان مساوات لازم آتی ہے۔ جس سے قانون عدل مختل اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَالَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔ (کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے تمہیں کیا ہے تم کیسے فیصلے کرتے ہو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

"اور انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے ۱ (تکبر سے) گردن مروڑے ہوئے ۲ تا کہ بہکا دے (دوسروں کو بھی) اللہ تعالیٰ کی راہ سے اس کے لیئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ہم چکھائیں گے اسے قیامت کے دن جلانے والی آگ کا عذاب ۳ (اس روز اسے بتایا جائیگا کہ) یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنیوالا نہیں ۴۔"

۱ علم سے مراد علم ضروری اور بدیہی ہے (یعنی ایسا علم جو نظر و فکر کے بغیر حاصل ہوتا ہے) اور ھدی سے مراد علم استدلالی اور نظری ہے جو معرفت الٰہی کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔ (علم نظری سے مراد وہ علم ہے جو نظر و فکر کے ساتھ حاصل ہوتا ہے) اور کتاب منیر سے مراد وہ روشن کتاب ہے جو حق کا مظہر ہو اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی انسان پر نازل ہو۔ پس انسان کیلئے یہی اسباب علم ہیں جن میں سے کسی ایک کے ساتھ اسے کسی شئی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ایک علم بدیہی دوسرا علم نظری اور تیسرا نقلی علم۔ (لیکن بعض لوگ ایسے بھی

ہیں جن کے پاس ان میں سے ایک بھی نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کے بارے جھگڑتے ہیں)

۲۔ عطف کا معنی ہے جانب، پہلو۔ عطفان دایاں اور بایاں دونوں پہلو۔ اور اس سے مراد بدن کا وہ حصہ ہے جسے آدمی اعراض کرتے وقت موڑ لیتا ہے اور پھیر لیتا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے اس سے مراد ہے لاوی عنقه۔ اس نے اپنی گردن کو موڑ لیا۔ حاصل معنی یہ ہے کہ جب اسے حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ تکبر کرتے ہوئے اکڑتے ہوئے اپنی گردن موڑتے ہوئے اعراض کر لیتا ہے۔ ابن عطیہ۔ ابن زید اور ابن جریج نے اسی طرح کہا ہے(1)۔

۳۔ لیضل عن سبیل اللّٰہ، یجادل کے متعلق ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یضل کو یاء مفتوح کے ساتھ مجرد ابواب سے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب افعال سے یاء کو مضموم پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ جھگڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ دوسرے کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔ یہاں خزی سے مراد قتل اور قید ہے۔ چنانچہ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط بدر کے دن مارے گئے، ان کے ساتھ مزید ستر کافر مارے گئے اور ستر قید ہو گئے۔

علامہ جلال الدین محلی نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے بارے نازل ہوئی اور وہ بدر کے دن قتل ہوا۔ ہم اسے قیامت کے دن جلانے والی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

۴۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے، تقدیر کلام یہ ہے کہ قیامت کے دن جب انہیں عذاب دیا جائیگا تو انہیں یہ کہا جائیگا کہ اس عذاب کا سبب تمہارا وہ کفر اور گناہ ہیں جو تم کرتے رہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہاں بندوں کی کثرت تعداد کے سبب ظلام مبالغہ کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ ما قدمت یداک پر معطوف ہے۔ ظلم کی نفی سے مراد کنایۃً عدل ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ میں محبت کی نفی بغض سے کنایہ ہے۔ اور عدل کفر اور گناہوں کے بدلے عذاب دینے کا سبب ہے۔ بخاری، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں آتے اور اسلام قبول کر لیتے۔ پھر اگر انکی عورتیں بچوں (لڑکوں) کو جنم دیتیں اور انکی گھوڑیاں بچے جنتیں تو وہ کہتے یہ دین بڑا اصالح اور اچھا ہے۔ اور اگر عورتوں کے ہاں اولاد نہ ہوتی اور گھوڑیاں بچے نہ جنتیں تو کہتے یہ دین بڑا برا ہے(2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪

" اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچا اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اس سے اور اگر پہنچے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے ۱۔ اس شخص نے برباد کر دی اپنی دنیا اور آخرت بھی تو کھلا ہوا خسارہ ہے ۲۔ "

۱۔ مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ حرف کا معنی کنارہ ہے۔ حرف الشیئ طرفہ شے کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد شک ہے۔ پس شک کرنے والا اور منافق مومنین اور کفار دونوں فریقوں کے کنارہ اور طرف میں ہی ہوتا ہے۔ کبھی وہ ایک فریق کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کی طرف۔ یا پھر یہ لشکر کے ایک کنارے اور ایک طرف میں کھڑے ہونے والے کی مثل ہے کہ اگر وہ یہ محسوس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 99 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 694 (وزارت تعلیم)

کرے کہ کامیابی اور فتح کے آثار نمایاں ہیں تو وٹھہرا رہتا ہے اور اگر صورت حال اسکے برعکس ظاہر ہوتو پھر وہ بھاگ نکلتا ہے۔

ابن ابی حاتم اور علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ان اعرابیوں کے بارے نازل ہوئی جو اپنے صحراؤں کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی مدینہ طیبہ پہنچ جاتا۔ اگر وہ جسمانی اعتبار سے پہلے کی نسبت صحت مند ہو جاتا، اس کی گھوڑی خوبصورت بچھڑا جنتی، اس کی بیوی بچے کو جنم دیتی اور اس کا مال پہلے سے بڑھ جاتا تو وہ کہتا یہ دین بڑا اچھا ہے، میں نے اس میں خیر اور بھلائی کو پایا ہے جس کے سبب مجھے راحت اور اطمینان حاصل ہوا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دین اسلامی کی برکت سے ہوا ہے(1)۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فان اصابه خَيْرُنِ اطمان بہ کا یہی معنی ہے۔ اور اگر وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسکی بیوی بچی کو جنم دیتی، اس کی گھوڑی بانجھ ہو جاتی اور مال میں کمی واقع ہو جاتی تو وہ کہتا جب سے میں اس دین میں داخل ہوا ہوں میں نے اس میں شر اور دکھ ہی پایا ہے۔ پس وہ اپنے دین سے پلٹ جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وان اصابته فتنة انقلب علی وجهه کا یہی معنی ہے۔ یعنی اگر وہ کسی بلا اور سختی میں مبتلا ہوتا تو وہ اپنے دین کو چھوڑ دیتا اور وہ اپنی ایڑیوں کے بل اپنے کفر کی طرف واپس لوٹ جاتا۔

ابن مردویہ نے عطیہ کی سند سے ابوسعید سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا تو اس کی بینائی جاتی رہی، مال ختم ہو گیا اور اولاد فوت ہو گئی تو اس نے بدشگونی کرتے ہوئے اس کا سبب اسلام کو قرار دیا۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی میری بیعت واپس کر دیجئے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسلام سے رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ تو اس نے عرض کی میں نے اس دین میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں پائی۔ میری بصارت ختم ہو گئی، مال جاتا رہا اور اولاد فوت ہو گئی۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے یہودی! اسلام لوگوں سے میل کچیل کو اسطرح صاف کرتا ہے جیسے آگ لوہے، سونے اور چاندی کی میل کو صاف کرتی ہے(2)۔

ے اس شخص نے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر دی، یعنی وہ آدمی جو دنیوی ابتلاء اور آزمائش کی وجہ سے دین سے مرتد ہو گیا اس کی دنیا بھی برباد ہو گی کہ اس کا مال ضائع ہو گیا، اولاد فوت ہو گئی۔ جو آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور اس کے ساتھ اسکی عزت و آبرو بھی جاتی رہی۔ اور اس کی آخرت بھی تباہ ہو گی کہ اس کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ کیلئے عذاب جہنم کا مستحق ہو گیا۔ اور یہ ایسا کھلا اور واضح خسارہ اور نقصان ہے جس کی مثل اور کوئی نہیں۔

يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۚ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

"وہ عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ ضرر پہنچا سکتا ہے اسے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے اسے۔ یہی تو انتہائی گمراہی ہے ۱۔ وہ پوجتا ہے اسے جس کی ضرر رسانی زیادہ قریب ہے اس کی نفع رسانی سے ۲۔ یہ بہت برا دوست ہے اور بہت برا ساتھی ہے۔ ۳"

۱۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی عبادت کرتا ہے کہ یہ اس کی عبادت نہ کرے تو وہ اسے کوئی ضرر اور تکلیف نہیں پہنچا سکتا اور اگر یہ اس کی عبادت کرتا رہے تو وہ اسے کوئی نفع نہیں دے سکتا۔ یہی عبادت انتہائی گمراہی اور حق سے دوری ہے۔ جب کوئی جنگل بیابان میں راستہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 99 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 624 (العلمیہ)

بھٹک جائے تو کہا جاتا ہے ضل فی التیہ، یعنی جب کوئی صراط مستقیم سے بہت دور ہو جائے تو اس کے لئے ضلال بعید کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں)

۲۔ لَمَنْ ضَرُّهٗ میں لام زائدہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اس کی پوجا اور عبادت کرتا ہے جس کی پوجا کا ضرر اور نقصان اس موہومہ نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے جس کی توقع کافر اس کی پوجا کے سبب رکھتا ہے اور نفع سے مراد شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسے بطور وسیلہ پیش کرنا ہے۔ اور عربوں کی یہ عادت اور محاورہ ہے کہ جو چیز بالکل موجود نہ ہو اس کے بارے کہتے ہیں ھذا شئ بعید۔ (یہ چیز بہت بعید ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ یعنی یہ رجوع بالکل نہیں ہے۔ اور جب بتوں کا نفع بعید ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ ان میں نفع بالکل نہیں ہے اور یہ کہا گیا کہ ان کا نقصان نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نقصان اور ضرر بالیقین ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں تاکید لفظی کے لئے دوبارہ یَدْعُوْا کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد کلام مستانفہ ہے۔ اور لَمَنْ ضَرُّهٗ میں لام محذوف قسم کے جواب کے لئے ہے۔ اور مَنْ موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ہے۔

۳۔ مولیٰ کا معنی معاون اور مددگار ہے۔ اور بعض نے کہا ہے یہاں اس کا معنی معبود ہے اور عشِیْر کا معنی ساتھی اور ساتھ رہنے والا ہے۔ یہاں مراد بت ہیں۔ خاوند چونکہ ہر وقت بیوی کے ساتھ ساتھ رہتا ہے، اسی وجہ سے عرب اسے عشیر کہا کرتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت کے مطابق یہ دونوں جملے الزامی اور مستانفہ ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ لَمَنْ ضَرُّهٗ میں لام یَدْعُوْا کے متعلق ہے اور یدعوا کا معنی ہے وہ گمان رکھتا ہے۔ اور زعم سے مراد ایسا قول ہے جو اعتقاد کے ساتھ ہو۔ یا پھر یہ کہا جاتا ہے کہ یَدْعُوْا قول کے قائم مقام بن کر جملہ مقولہ پر داخل ہے۔ ان دونوں تقدیروں کے مطابق لام محذوف قسم کے جواب پر واقع ہے اور مَنْ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جب قیامت کے دن کافر اس کے ضرر اور نقصان کو دیکھے گا تو یہ کہے گا کہ یہ بہت برا دوست ہے اور بہت برا ساتھی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے یدعوا لمن ضرہ اقرب من نفعہ یدعوا ۔ ابتدائے کلام میں یَدْعُوْا کے موجود ہونے کی وجہ سے اخیر کلام سے اسے حذف کر دیا گیا۔ اور پہلے یَدْعُوْا کا مفعول محذوف ہے اور مَنْ موصولہ کا تعلق دوسرے یَدْعُوْا سے ہے اور لَمَنْ ضَرُّهٗ میں لام محذوف قسم کے جواب میں ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لام معنی الیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾

”بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں۔ بیشک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے [1] اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہئے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا

ڈال کر) اسے کاٹ دے۔ پھر دیکھے آیا دور کر دیا ہے اس کی (خودکشی کی) تدبیر نے اس کے غم و غصہ کو۔''

1۔ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ جب نیک اور صالح بندۂ مومن کو ثواب اور مشرک کو سزا دینے کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اسے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے روکنے والا نہیں اور نہ ہی کوئی اس کے فیصلے کا انکار کرنے والا ہے (یعنی وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے کسی کو مجال انکار اور رد نہیں)

2۔ (اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی دنیا اور آخرت میں ہرگز مدد نہیں کرے گا) اس کلام میں ظن بمعنی وہم ہے اور یہ ایک ہی مفعول کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا اَنْ اپنے جملہ سمیت اس کا مفعول ہے۔ اور اگر ظن اپنے معنی میں ہو تو پھر یہی جملہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

اس کلام میں اختصار بھی ہے۔ مکمل کلام کا مفہوم اس طرح ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے نبی مکرم ﷺ کی مدد فرمائے گا۔ پس جو شخص اس کے خلاف گمان رکھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بغض و حسد رکھنے کی وجہ سے اس کے برعکس توقع رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ ایک رسی کے ذریعے اپنے گھر کی چھت سے لٹک جائے۔ یعنی اسے چاہئے کہ اپنے گھر کی چھت سے ایک رسی باندھے اور پھر اپنے گلے میں پھندا ڈال کر گلا گھونٹ لے کیونکہ گلا گھونٹنے والا اپنی سانس کی آمد و رفت کو روک کر اپنے آپ کو مار ڈالتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے دانت پیستا رہے گا اور غصے سے بھر کر جو چاہے کر گزرے حتیٰ کہ مر جائے۔ یہ امر تعجیز کے لئے ہے۔ (یعنی اس کا یہ وہم و گمان کبھی بھی حقیقت نہیں بن سکتا) حاسد کو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تو راضی نہیں تو غصے سے اپنا گلا گھونٹ لے اور مر جا۔

ابن زید نے کہا ہے کہ السماء سے مراد آسمان دنیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کی ہرگز مدد نہیں فرمائے گا اور اس بارے میں وہ آپ سے دھوکہ کرے گا تو اسے چاہئے کہ وہ اس سلسلہ کو جڑ سے ہی کاٹ دے (1) یہاں تک کہ اسی کے ذریعہ آسمان دنیا تک رسی باندھ لے اور آسمان تک جا پہنچے اور آسمان سے جو وحی آپ ﷺ کی طرف آتی ہے اس کو ہی بند کر دے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قبیلہ اسد اور غطفان کے بارے نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں دعوت اسلام دی تو اس وقت یہود اور ان کے درمیان (باہمی تعاون کا) معاہدہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے یہ کہا کہ اب ہمارے لئے اسلام قبول کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد (ﷺ) کی مدد نہیں کرے گا اور ان کے دین کو غالب نہیں کرے گا۔ اور اتنے میں ہمارے اور یہود کے درمیان معاہدہ بھی ٹوٹ جائے گا پس پھر نہ تو وہ ہمیں غلہ مہیا کریں گے اور نہ ہمیں رہنے کی جگہ دیں گے۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ نصر بمعنی رزق ہے۔ عرب کہتے ہیں من نصرنی نصرہ اللہ یعنی جو مجھے عطاء کرے گا اللہ تعالیٰ اسے دے گا۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ عرب کہتے ہیں ارض منصورۃ یعنی ایسی زمین جس میں بارش کے ذریعے خوب فصل ہو (3)۔ اس صورت میں ینصرہٗ کی ضمیر منصوب مَنْ موصولہ کی طرف راجع ہوگی۔ گویا آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں برا گمان رکھتا ہے اور یہ خوف رکھتا ہے کہ وہ اسے رزق نہیں دے گا۔ مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے بارے یہ خیال رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہرگز رزق نہیں دے گا تو اسے چاہئے اپنے گھر کی چھت سے رسی باندھ لے اور پھر پھندا گلے میں ڈال کر اپنا گلا گھونٹ لے اور رزق نہ دینے کے غصے میں جلتے ہوئے مر جائے۔ یا پھر ایک رسی آسمان دنیا تک پھیلا لے پھر اس کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 102 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

سب مسافت طے کرے یہاں تک کہ آسمان تک پہنچ جائے اور وہاں سے اپنا رزق لے آئے۔
ورش، ابوعمر اور ابن عامر نے ثُمَّ لْيَقْطَعْ کی لام کو لام امر ہونے کے سبب مکسور پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے مجزوم پڑھا ہے۔
۳ے رسی پھیلانے اور قطع مسافت کے ارادہ کے بعد یا گلا گھونٹنے کے ارادہ کے بعد وہ اپنے دل میں سوچے اور تصور کرے کہ کیا اس کی اس تدبیر نے اس کے غم وغصہ کو دور کر دیا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ مدد جو رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے اور اس (حاسد) کے غصے اور ناراضگی کا سبب بنی ہے، کیا یہ اسے روک سکتا ہے۔ حاسد کے اس عمل کو کید (تدبیر) کہا گیا ہے کیونکہ یہی فعل اس کی سعی وکوشش کی انتہاء ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور مَنْ كَانَ يَظُنُّ سے لیکر آخر تک جملہ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ کی تاکید ہے۔ یعنی جس طرح حاسد کا غصہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول مکرم ﷺ اور مومنین کی دنیا اور آخرت میں مدد ونصرت کے ارادے سے نہیں روک سکتا اسی طرح کوئی بھی اس شے کو نہیں روک سکتا جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ فرمالے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

''اور اسی طرح ہم نے اتارا ہے اس کتاب کو روشن دلیلوں کے ساتھ ۱ے اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ۲ے''

۱ے جس طرح ہم نے قرآن کریم میں موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے، توحید باری تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور آپ کی مدد ونصرت کے وعدے کے بارے واضح آیات ودلائل نازل کئے ہیں اسی طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کی صداقت کے بارے واضح دلائل اور آیات نازل کی ہیں۔ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کی تمام آیات بین اور واضح ہیں حالانکہ یہ ارشاد بھی ہے مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ۔ کہ قرآن کریم کی کچھ آیات متشابہات ہیں جن کا معنی مراد بہ مخفی اور پوشیدہ ہے تو اس طرح تو ان دونوں آیتوں میں تضاد اور منافات محسوس ہوتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت ان کے مابین کوئی منافات نہیں کیونکہ متشابہ آیت کا معنی مراد بہ اگرچہ مخفی ہوتا ہے مگر اس کا معجز ہونا اور صداقت رسول کی دلیل ہونا تو بالکل واضح اور بین ہوتا ہے۔
۲ے وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ کا جملہ لام تعلیل کے سبب محل جر میں ہے، اس کا عطف محذوف لفظ پر ہے اور قول باری تعالیٰ انزلناہ کے متعلق ہے۔ یعنی ہم نے قرآن کریم کو (لوگوں کے) مصالح کے لئے نازل کیا اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب جسے ہدایت دینا چاہے وہ ہدایت پا جائے یا جسے ہدایت پر ثابت رکھنا چاہے وہ ہدایت پر ثابت قدم رہے۔ اور اس جملے کا محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے۔ اس کا عطف انزلناہ کی ضمیر منصوب پر ہے۔ یعنی ہم نے یہ بھی نازل کیا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ھدایت فرما دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾

''بیشک اہل ایمان، یہودی، ستارہ پرست، عیسائی، آتش پرست اور مشرک۔ ضرور فیصلہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ ان سب (گروہوں) کے درمیان قیامت کے دن ۱ے بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے ۲ے''

۱ے اَلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے مراد بتوں کی پوجا اور عبادت کرنے والے ہیں اور يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کے درمیان ضرور فیصلہ فرمائے گا اور حق کے پرستاروں کو باطل کے پرستاروں سے الگ کر دے گا۔ اور (دونوں فریقوں کی)

حق پرستی اور باطل پرستی کو ظاہر فرمادے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسی جزاء عطا فرمائے گا جو اس کے مناسب اور لائق ہوگی لہٰذا وہ ایک فریق کو جنت میں داخل کردے گا اور دوسرے کو دوزخ کے حوالے کردے گا۔ مذکورہ تمام گروہوں پر جملے کی ابتداء میں حرف اَنَّ مزید تاکید کے لئے داخل کیا گیا ہے۔ پھر اسے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ کے ارشاد سے مزید پختہ اور مئوکد کیا ہے۔

۲؎ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کے احوال کا مشاہدہ کرنے کے سبب اسے جاننے والا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ وہ مسلمانوں اور اطاعت شعاروں سے مجرموں جیسا سلوک کرے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ اہل حق کو اہل باطل کی مثل قرار دے۔ کیونکہ وہ ہر شئی کے ظاہری اور باطنی احوال سے مکمل طور پر واقف وآگاہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ (۱۸)

"کیا تم ملاحظہ نہیں کررہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کررہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے نیز آفتاب، مہتاب، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے ۱؎ اور بہت سے انسان بھی (اسی کو سجدہ کرتے ہیں) اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے ۲؎۔ اور (دیکھو) جس کو ذلیل کردے اللہ تعالیٰ تو کوئی اسے عزت دینے والا نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے ۳؎۔"

۱؎ کیا تم جانتے نہیں کہ آسمانوں میں فرشتے اور زمین میں انسانوں اور جنات میں سے مومن اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کررہے ہیں۔ لفظ مَنْ اگرچہ عام ہے، مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے مگر چونکہ کفار کا ذکر مستقل کلام وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْعَذَابُ کے ذریعے الگ کردیا گیا ہے اس لئے یہاں مَنْ سے مراد صرف مومن ہی ہوں گے۔ مَنْ (اپنی عمومیت کے سبب کبھی ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے) مگر یہاں چونکہ و الشمس و القمر الخ کا عطف مَنْ فِیْ الارض پر کیا گیا ہے۔ عطف میں اصل یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ کے مابین مغائرت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں مَنْ صرف ذوی العقول کے لئے ہی ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ مَنْ کو اپنے عموم پر ہی محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو شامل ہے یا یہ ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر غالب قرار دیکر ان کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اکثر محققین کا قول یہ ہے کہ کسی غیر ناطق کو کلمہ مَنْ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا مگر جہاں کہیں ناطق اور غیر ناطق جمع ہوجائیں تو پھر ان کے لئے کلمہ مَنْ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اگر مَنْ سے عمومی معنی مراد لیا جائے تو پھر و الشمس و القمر کا اس پر عطف خاص کا عطف عام پر کرنے کے قبیلے سے ہے اور ان کی شہرت کے سبب ان کا ذکر علیحدہ کردیا گیا ہے لیکن سجدہ کرنا تو ان سے بعید ہے۔

محدثین اور علماء متقدمین کے نزدیک سجود سے مراد اطاعت اختیاریہ ہے۔ کیونکہ جمادات اگرچہ ہمارے نزدیک مردہ ہیں لیکن انہیں بھی کچھ نہ کچھ حیات حاصل ہے۔ اور وہ بھی اطاعت اختیار کے سبب اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے (زمین و

آسمان کے متعلق) فرمایا قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ۔ پتھر کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ۔ اور مزید ارشاد فرمایا وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو پکار کر کہتا ہے اے فلاں! کیا تجھ سے کوئی ایسا گزرا ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو۔ اسے طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے(1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ مذہب اچھا ہے اور اہل السنت کے قول کے موافق ہے(2)۔

۲۔ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ مبتدا ہے۔ اور دوسرا كَثِیْرٌ پہلے کی تاکید کے لئے مکرر ذکر کیا گیا ہے یا پھر کثرت میں اظہار مبالغہ کے لئے اسے لایا گیا ہے اور حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ مبتدا کی خبر ہے۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لئے عذاب مقرر ہو چکا ہے کیونکہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں۔ ان سے مراد کفار ہیں۔ پس یہ جملہ مَنْ فی الارض کی عمومیت کے لئے مخصص ہے کیونکہ یہ کفار کو مَنْ کے عموم سے خارج کر رہا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ مَنْ فِی الْاَرْضِ میں مَنْ بمعنی ما عموم کے لئے ہے۔ اور سجود سے مراد یہ ہے کہ تمام ممکنات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے مسخر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تدبیر اور حکم سے کسی کو مجال انکار نہیں اور ہر ایک کی ذات عظمت مدبر اور شان قدرت پر دلالت کر رہی ہے۔ قول باری تعالیٰ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ جس پر اس کے قسیم کی خبر دلالت کر رہی ہے اور وہ ہے حق لهم الثواب (یعنی بہت سے لوگ ہیں جن کے لئے ثواب ثابت ہو چکا ہے) یا پھر وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ فعل محذوف کا فاعل ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگا کہ بہت سے لوگ زمین پر پیشانی رکھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں۔ مذکورہ دونوں تقدیروں کے مطابق كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ جملہ مستانفہ ہے اور كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْعَذَابُ دوسرا جملہ مستانفہ ہے۔

بعض علماء فقہ کے نزدیک عموم مشترک جائز ہے۔ یعنی ایسا ایک لفظ جو دو معنوں میں مشترک ہو اس کا ایک ہی وقت میں دو معنوں میں سے ہر ایک میں استعمال جائز ہے۔ ایک معنی کے اعتبار سے اس کی نسبت دوسرے امر کی طرف ہوتی ہے لہٰذا انہوں نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ مفرد ہے اور یہ کلام سابق پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ سجدہ تسخیری اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کرتی ہے۔ اور سجدہ اطاعت وفرمانبرداری کثیر لوگ کرتے ہیں۔ (تو یہاں سجود کا لفظ دو معنوں میں مشترک ہے۔ ایک زمین پر پیشانی رکھنا اور دوسرا حکم کی تعمیل کرنا اور اس کا انکار نہ کرنا۔ لہٰذا جب سجدہ کی نسبت كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ کی طرف کی گئی تو سجدے سے مراد زمین پر پیشانی رکھنا ہوگا۔ اور جب اس کی نسبت دیگر ممکنات کی طرف کی گئی تو اس سے مراد حکم کی تعمیل کرنا ہوگا) اور كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْعَذَابُ مستقل جملہ مستانفہ ہے، یعنی بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لئے سجدہ اطاعت وفرمانبرداری سے انکار کرنے کے سبب عذاب ثابت اور مقرر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ كثیر مفرد ہو اور معنی اعم کے اعتبار سے اس کا عطف (ساجدین) سجدہ کرنے والوں پر ہو اور حَقَّ عَلَیْهِمُ الْعَذَابُ اس کی صفت ہو۔

۳۔ وَ مَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ۔ مبتدا ہے جس میں شرط کے معنی پائے جا رہے ہیں۔ اور اس کی خبر جزاء کے معنی کو متضمن ہے۔ اور وہ ہے فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ۔ معنی یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ شقاوت و بدبختی کے سبب ذلیل و رسوا کر دیتا ہے تو کوئی بھی اسے سعادت اور خوش بختی کے ساتھ عزت نہیں دے سکتا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ سابقہ جملہ اسمیہ پر معطوف ہے یا اس سے حال ہے۔ پس عزت و ذلت اور سعادت و

1۔ معجم کبیر طبرانی: 8542 (العلوم والحکم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 103 (الفکر)

شقاوت دونوں امر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مختص ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ٘ فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍؕ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ ﴿۱۹﴾

"یہ دو فریق ہیں جو جھگڑ رہے ہیں اپنے رب کے بارے میں لے تو وہ لوگ جنہوں نے نے کفر اختیار کیا تیار کر دیئے گئے ہیں ان کے لئے کپڑے آتش (جہنم) سے ع انڈیلا جائے گا ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی سے"

یہ دو فریق ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک فریق مومنین کا ہے اور ایک فریق مذکورہ بالا پانچ اقسام کے کفار کا۔ لفظ خصم کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور پھر معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اِخْتَصَمُوْا صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔ مذکورہ دونوں فریق اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے جھگڑ رہے ہیں یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور احکام کے بارے اختلاف کر رہے ہیں۔ (یعنی ربّھم سے پہلے دین، ذات، صفات اور امر میں سے کوئی لفظ محذوف ہے جو کہ مضاف ہے)

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ حضرت حمزہ، حضرت عبیدہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم، عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کے بارے نازل ہوا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے دن ہمارے مقابلے اور مبارزت کے بارے نازل ہوئی۔ حاکم نے ایک دوسری سند سے اس طرح نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے دن باہم ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دینے اور مقابلہ کرنے والوں کے بارے نازل ہوئی اور وہ حضرت علی، حضرت حمزہ، حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ ہیں(1)۔

علامہ بغوی نے قیس بن عباد سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا (کفار) سے جھگڑا کرنے کے سبب قیامت کے دن رحمت (الٰہی) کے سامنے سب سے پہلے دو زانو بیٹھنے والا میں ہی ہوں گا(2)۔

قیس کہتے ہیں کہ انہی لوگوں کے بارے یہ آیت نازل ہوئی جنہوں نے غزوہ بدر کے دن باہم ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دی اور مقابلہ کیا اور وہ حضرت حمزہ، حضرت علی، حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ ہیں(3)۔

محمد بن اسحٰق نے کہا ہے کہ غزوہ بدر کے دن عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اپنے بیٹے ولید بن عتبہ کے ساتھ نکلا اور مسلمانوں کی صفوں کے قریب پہنچ کر دعوت دی تو ان کے مقابلے کے لئے تین انصاری نوجوان عوف، حارث کے دونوں بیٹے معاذ اور معوذ، ان کی ماں کا نام عفراء تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم صفوں سے باہر آئے مشرکین نے انہیں دیکھ کر پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم گروہ انصار میں سے ہیں اور نسبا تمہارے ہمسر اور شرفاء ہیں۔ پھر ان میں سے کسی نے پکار کر کہا اے محمد (ﷺ) ہمارے مقابلے کے لئے ہماری قوم کے افراد باہر نکالیے جو ہمارے ہم مرتبہ اور برابر ہیں۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبیدہ بن حارث تم اٹھو۔ اے حمزہ بن عبدالمطلب تم باہر آؤ اور اے علی بن ابی طالب تم مقابلے کے لئے اٹھو۔ چنانچہ جب یہ لوگ صفوں سے نکل کر ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ تو انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔ تو ان کے نام سن کر انہوں

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 694 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 104 (الفکر) 3۔ ایضاً

نے کہا ہاں یہ لوگ ہمارے ہم کفو اور شرفاء ہیں۔ چونکہ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمر کے اعتبار سے بڑے تھے اس لئے ان کا مقابلہ عتبہ سے ہوا' پس حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقابلہ شیبہ سے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ولید بن عتبہ سے ہوا۔ پس حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو دیکھتے ہی دیکھتے بلا تاخیر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولید کو جہنم رسید کر دیا۔ لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عتبہ کے مابین چند ضربوں کا تبادلہ ہوا' دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور پھر حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اپنی تلواروں کے ساتھ عتبہ پر ٹوٹ پڑے اور اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اٹھا کر ان کے ساتھیوں کے پاس لے آئے۔ آپ کی ٹانگ کٹ چکی تھی اور اس سے گودا باہر بہہ رہا تھا۔ جب وہ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے کر رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی کیا میں شہید نہیں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ تو پھر حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اگر حضرت ابوطالب زندہ ہوتے تو وہ یقیناً (1) جان لیتے کہ ان کے ان اشعار کا سب سے زیادہ مستحق میں ہی ہوں۔ آپ فرماتے ہیں۔

كَذَبْتُمْ وَ بَيْتِ اللّٰهِ يُبْزِیْ مُحَمَّدًا وَلَمَّا نُطَاعِنْ دُوْنَهٗ وَ نُنَاصِلُ
وَنُسْلِمُهٗ حَتّٰى نُصَرَّعَ حَوْلَهٗ وَنُذْهَلَ عَنْ اَبْنَائِنَا وَالْحَلَائِلُ

بیت اللہ کی قسم! تم اس قول میں جھوٹے ہو کہ محمد (ﷺ) پر غلبہ پا لیا جائیگا (یہ تب تک ممکن نہیں) جب تک کہ ہم آپ ﷺ کی جانب سے کامل طور پر نیزہ زنی اور تیر اندازی نہیں کر لیں گے۔

اور ہم آپ کو اس وقت تک تمہارے حوالے نہیں کریں گے جب تک کہ ہم اپنی اولادوں اور بیویوں سے غافل ہو کر آپ کے گرد پچھاڑ نہیں دیئے جائیں گے۔ (یعنی جب تک ہم زندہ ہیں آپ ﷺ پر غلبے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا)

ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے' عبد بن حمید' ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں اور اہل کتاب کے بارے نازل ہوئی۔ اہل کتاب نے کہا ہم تمہاری نسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں' ہماری کتاب تمہاری کتاب سے مقدم ہے اور ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے مبعوث ہوئے۔ ان کے جواب میں اہل ایمان نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے قرب کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ ہم اپنے نبی ﷺ پر اور تمہارے نبی پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل فرمایا ہے اس کے سبب تم ہمارے نبی اور ہماری کتاب کو پہچانتے ہو اور صرف حسد کی بناء پر اس کا انکار کرتے ہو۔ پس یہی ان دونوں گروہوں کا اپنے رب کے بارے جھگڑا اور فساد تھا (2)۔

مجاہد اور عطاء بن رباح کلبی نے کہا ہے کہ دو گروہوں سے مراد مومن اور کسی بھی ملت سے تعلق رکھنے والے کافر ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا الآیۃ میں چھ مذاہب و ادیان کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے پانچ جہنمی ہیں اور ایک جنتی ہے۔ پس ارشاد باری تعالیٰ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ کا اشارہ انہی کی طرف ہے۔ ایک گروہ مومنین کا ہے اور بقیہ پانچوں مل کر ایک گروہ ہے (3) کیونکہ کفر کسی بھی نوع کا ہو وہ تمام کا تمام ملة واحدہ ہے۔

ان دونوں قولوں کا انحصار عموم الفاظ اور سیاق قصہ پر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تفسیر میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے خصوصیت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 105 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

سبب کا اعتبار نہیں ہوتا۔

عکرمہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں جھگڑا کرنے والے فریق جنت اور دوزخ ہیں (1)۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت اور دوزخ باہم جھگڑ پڑے۔ دوزخ نے کہا مجھے ترجیح حاصل ہے کیونکہ مجھ میں تکبر کرنے والے اور فخر کرنے والے داخل ہوں گے اور جنت نے کہا میرے لئے تو کچھ نہیں مجھ میں تو صرف کمزور، ضعیف اور فقیر قسم کے لوگ ہی داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کو فرمایا تو میری رحمت ہے میں تیرے سبب اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا رحم فرماؤں گا۔ اور دوزخ کو فرمایا تو میرا عذاب ہے میں تیرے سبب جسے چاہوں گا عذاب دوں گا۔ تم دونوں میں سے ہر ایک کو بھرنا ہے۔ پس جہنم تو تب بھرے گی جب رب کریم اپنا قدم قدرت اس میں رکھیں گے تو اس وقت وہ بھر جائیگی اور پکار اٹھے گی بس بس اور اس کے بعض حصے آپس میں مل جائیں گے (2) اور اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے کسی پر بھی زیادتی نہیں کرے گا (کہ جہنم کو بھرنے کے لئے اسے بلاوجہ اس میں ڈال دے) اور جنت کو بھرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا فرمادے گا۔

۲۔ پس وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کیلئے آتش جہنم سے ان کے لئے کپڑے تیار کر دیے گئے جو ان کی حیثیتوں اور درجوں کے اندازوں پر بنائے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ میں اسی فیصلہ کا ذکر ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں یہ پگھلے ہوئے تانبے کے کپڑے ہوں گے اور کوئی دھات بھی گرم کئے جانے کے بعد اس سے زیادہ سخت گرم نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ کفار کے بدنوں کو کپڑوں کی طرح ہی محیط ہوگا اس لئے اسے لفظ ثیاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اہل جہنم کو آگ کے ٹکڑے (بطور لباس) پہنائے جائیں گے (3)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم کا لباس پہنا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کا لباس پہنائے گا۔

بزار، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے سب سے پہلے آگ کا حلہ (پرہن) پہنایا جائے گا وہ ابلیس ہے، وہ اسے اپنے بھنوؤں پر رکھے گا اور اسے اپنے پیچھے گھسیٹا جائے گا اور اس کے پیچھے اس کی ذریت (اولاد) بھی آگ کے لباس کھینچتی جائے گی۔ اس وقت وہ پکار رہا ہوگا ہائے ہلاکت اور اس کی اولاد بھی پکار رہی ہوگی ہائے ہلاکت و بربادی۔ یہاں تک کہ یہ سب دوزخ پر کھڑے ہوں گے تو اس وقت انہیں کہا جائے گا تم ایک ہلاکت اور موت کو نہ پکارو بلکہ کثیر ہلاکتوں کو آواز دو (4)۔

ابونعیم نے وہب بن منبہ سے روایت نقل کی ہے اہل نار کو لباس پہنائے جائیگا حالانکہ (اس کی نسبت) ان کے لئے ننگا رہنا بہتر ہوگا۔ انہیں زندگی دی جائے گی حالانکہ ان کے لئے موت بہتر ہوگی (5)۔

ابو مالک اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسی نوحہ کرنے والی عورت جس نے موت سے قبل توبہ نہ کی تو قیامت کے دن اسے تارکول کی قمیص اور جرب (تلوار کا زنگ) کا کرتہ پہنائے جائیگا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 105 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 381 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 106 (الفکر) 4۔ مجمع الزوائد، جلد 10 صفحہ 719 الفکر
5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (العلمیۃ)

ابن ماجہ نے اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ نوحہ کرنے والی جب اس حال میں مرگئی کہ اس نے توبہ نہ کی تو اس کے لئے تارکول کا لباس اور آگ کے شعلوں کا کرتہ تیار کردیا گیا ہے(1)(جو اسے پہنایا جائیگا)

۳ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ مکمل جملہ لَهُمْ کی ضمیر سے حال ہے یا یہ دوسری خبر ہے اور حمیم سے مراد ایسا گرم پانی ہے جو اپنی حرارت اور گرمی کی انتہاء کو پہنچا ہوا ہو۔

یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا ۗ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۲۲﴾

”گل جائے گا اس کھولتے پانی سے جو کچھ ان کے شکموں میں ہے اور ان کی چمڑیاں بھی گل جائیں گی ۱ے اور ان (کو مارنے) کے لئے گرز ہوں گے لوہے کے ۲ے جب بھی ارادہ کریں گے اس سے نکلنے کا فرط رنج والم کے باعث تو انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں ۳ے اور (کہا جائے گا) کہ چکھو جلتی ہوئی آگ کا عذاب۔ ۴ے“

۱ے وہ کھولتا ہوا گرم پانی جو ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا اس کے سبب جو کچھ ان کے پیٹوں میں چربی اور انتڑیاں وغیرہ ہیں سب پگھل جائیں گی اور ظاہری جلد بھی گل جائے گی۔ یعنی اس پانی کی حرارت ان کے اندرونی اعضاء پر بھی ظاہری جسم کی طرح ہی اثر انداز ہوگی۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ الحمیم سے یا ھم ضمیر سے حال ہے۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حسن حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کھولتا ہوا گرم پانی اہل دوزخ کے سروں پر انڈیلا جائے گا یہاں تک کہ یہ ان کے شکموں کے اندر تک پہنچ جائے گا اور پھر جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے وہ ان کے قدموں کے درمیان سے بہہ کر نکل جائیگا۔ اسی کا نام صہر ہے۔ پھر یہی عمل بار بار کیا جائے گا۔ اور ہر بار وہ پھر پہلے کی طرح ہو جائیگا(2)۔

۲ے اور ان کو مارنے کے لئے لوہے کے گرز ہوں گے۔ مَقَامِعُ مَقْمَعَةٌ کی جمع ہے۔ درحقیقت اس سے مراد وہ آلہ ہے جس کی سخت ضرب کے سبب کسی شئی کو روکا جا سکتا ہو۔ لیث نے کہا ہے کہ مَقْمَعَةٌ کا معنی گرز ہے(3)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے قمعت رأسہ۔ اس کا معنی ہے میں نے اس کے سر پر سخت ترین ضرب لگائی(4)۔ ترکیب کلام میں وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ کا جملہ فِیْ بُطُوْنِهِمْ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے بارے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہیں گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا۔ ہر عضو پر گرز کی ضرب جا کر لگے گی اور وہ ہر ضرب کے ساتھ موت اور ہلاکت کو پکاریں گے(5)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، ابویعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ، ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ، حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوہے کا وہ گرز زمین پر رکھ دیا جائے اور اسے اٹھانے کے لئے تمام جن وانس اکٹھے ہو جائیں تو وہ اسے زمین سے نہ اٹھا سکیں گے اور اگر لوہے کے اس گرز کی ایک ضرب پہاڑ پر لگائی جائے تو

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 271 (العلمیۃ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 82 (فاروقی کتب خانہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 107 (الفکر)
4۔ ایضاً
5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (العلمیۃ)

وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ (ایسے بھاری اور وزنی گرز کے ساتھ اہل دوزخ کو مارا جائے گا) یہ شدید ضرب لگنے کے بعد وہ پھر پہلے کی طرح ہو جائیگا اور یہی عمل اس پر بار بار دہرایا جائے گا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے(1)۔

؎ جب بھی وہ اس غم واندوہ اور رنج والم کے باعث دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے جو جہنم میں ان کی جانوں کو لاحق ہوگا تو انہیں پھر اسی میں لوٹا دیا جائیگا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حرف جار کے اعادہ کے سبب ضمیر مجرور سے بدل اشتمال ہے۔ یہاں تقدیر عبارت اس طرح ہے کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِیْدُوْا فِیْهَا (کہ جب بھی وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے کہ اس سے نکل جائیں تو وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے) کیونکہ اعادہ تو ایک بار باہر نکلنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ (مگر چونکہ اہل جہنم کا اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں اس لئے یہاں اعادہ کو ارادہ پر مرتب کیا گیا ہے)

ترکیب کلام میں مکمل جملہ شرطیہ کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا سے آخر تک مَقَامِعُ کی صفت ہے اور اس میں رابطہ محذوف ہے۔ اصل کلام اس طرح ہے اُعِیْدُوْا بِهَا فِیْهَا۔

ابن ابی حاتم نے اس آیت کی وضاحت میں حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم بخدا! انہیں باہر نکلنے کی امید تک نہیں ہوگی کیونکہ ان کی ٹانگیں مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوں گی۔ البتہ آگ کے شعلے اپنے جوش کے ساتھ انہیں اوپر اٹھائیں گے اور اوپر سے گرزوں (کی ضربیں) انہیں پھر واپس لوٹا دیں گی(2)۔

میں کہتا ہوں کہ ارشاد باری تعالیٰ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا سے مراد یہ ہے کہ جب آگ کے شعلے انہیں اوپر اٹھائیں گے تو وہ گمان یہ کریں گے کہ وہ دوزخ سے باہر جا کر گریں گے۔ لیکن ایسے نہیں ہوگا بلکہ اوپر سے (فرشتوں) کے گرز انہیں پھر واپس لوٹا دیں گے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو صالح سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب کسی آدمی کو دوزخ میں پھینکا جائے گا تو وہ اس کی تہہ میں ہی پہنچ کر جا رکے گا۔ اس کے سبب جہنم کھولنے اور جوش مارنے لگے گی اور اسے اٹھا کر اوپر والے کنارے تک لے آئے گی۔ اس وقت اس کی جسمانی ہڈیوں پر گوشت کا نام ونشان تک نہ ہوگا (آگ اسے کھا چکی ہوگی فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگا) پھر ملائکہ اسے گرزوں کے ساتھ اوپر سے ماریں گے۔ نتیجتاً وہ دوزخ کی تہہ تک پھر نیچے گر جائے گا۔ پس مسلسل یہی عمل ہوتا رہے گا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ جہنمیوں کے سبب جہنم جوش مارنے لگے گی اور انہیں نیچے سے اوپر والے کنارے تک لے آئے گی چنانچہ وہ اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے لیکن جہنم پر مقرر فرشتے لوہے کے گرزوں سے انہیں ماریں گے اور پھر نیچے گرا دیں گے اور وہ ستر برس تک نیچے کی جانب لڑھکتا ہی جائے گا(3)۔

؎ اور (انہیں کہا جائے گا) کہ جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھو۔ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ کا جملہ اعیدوا پر معطوف ہے۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہے وقیل لھم ذوقوا۔ عذاب الحریق سے مراد شدید ترین جلا دینے والی آگ ہے۔ حریق (صفت مشبہ کا صیغہ ہے) یہ فَعِیْلٌ کے وزن پر بمعنی فاعل ہے (یعنی حریق بمعنی مُحْرِق ہے) جیسے الیم بمعنی مولم اور وجیع بمعنی موجع ہے۔

زجاج نے کہا ہے کہ جن لوگوں کا مذکورہ بالا آیات طیبات میں ذکر کیا گیا ہے وہ دو گروہوں میں سے ایک سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے گروہ کا ذکر آنے والی آیات میں آرہا ہے(4)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (العلمیہ)

2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 630 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 107 (الفکر) 4۔ ایضاً

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان بھی لے آئے اور عمل بھی نیک کرتے رہے جنتوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے ندیاں ۱؎ انہیں پہنائے جائیں گے جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار ۲؎ اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہو گی ۳؎ اور ان کی رہنمائی کی گئی تھی پاکیزہ قول کی طرف اور دکھایا گیا تھا انہیں راستہ اللہ تعالیٰ کا جو تعریف کیا گیا ہے ۴؎۔"

۱؎ اس آیت طیبہ میں اسلوب بیان تبدیل کر دیا گیا ہے اور جنت میں داخل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی کلام کو اِنَّ کے ساتھ مؤکد کر فرمایا ہے تاکہ اس سے اہل ایمان کی حالت کی قدر افزائی ہو اور ان کی عظمت شان بیان ہو۔

۲؎ يُحَلَّوْنَ حليت المرأة سے ماخوذ ہے، یہ جملہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی کسی عورت کو زیور پہنائے۔ ترکیب کلام میں یہ لفظ اسم موصول سے حال ہے۔ اَسَاوِرَ، اسورۃ کی جمع ہے اور اَسْوِرَةٌ سِوَارٌ کی جمع ہے۔ ترکیب کلام میں یہ لفظ مفعول محذوف کی صفت ہے۔ عبارت اس طرح بن جائے گی "يحلون حليا كائنا مِنْ اَسَاوِرَ" مِنْ ذَهَبٍ اس کا بیان ہے اور لُؤْلُؤًا، اَسَاوِرَ پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ انہیں جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔

نافع اور عاصم کی قرأت کے مطابق لُؤْلُؤًا کو یہاں اور سورۃ فاطر میں اَسَاوِرَ کے محل پر محمول کرتے ہوئے منصوب پڑھا گیا ہے یا پھر اسے نصب دینے والا فعل مضمر ہے اور اصل عبارت یؤتون لُؤْلُؤًا ہے۔ جبکہ باقی قرأ نے اَسَاوِرَ کے لفظ پر محمول کرتے ہوئے یا مِنْ ذَهَبٍ پر معطوف کرتے ہوئے لُؤْلُؤًا کو مجرور پڑھا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ اہل جنت میں سے ہر فرد کے ہاتھ میں تین کنگن پہنائے جائیں گے، ان میں سے ایک سونے کا ہوگا' ایک چاندی کا اور ایک موتیوں کا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ لُؤْلُؤًا میں واؤ کے بعد الف کا لکھا جانا اس کے منصوب ہونے کی تائید کرتا ہے۔

ابو عمرو نے کہا ہے کہ قرأ نے اس میں الف کو ایسے ہی ثابت لکھا ہے جیسے قالوا اور کانوا میں الف کو ثابت رکھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ یہ ہمزالف کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

ابو بکر اور ابو عمرو نے تمام قرآن کریم میں لُؤْلُؤًا اور اللُّؤْلُؤُا سے دوسرے ہمزہ کی تخفیف کے وقت چھوڑ دیا ہے۔ حمزہ نے حالت وقف میں دونوں ہمزوں کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے دوسرے ہمزہ کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے بشرطیکہ اس کی حالت نصبی نہ ہو اور بقیہ قرأ دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔

ترمذی' حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تلاوت فرماتے جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ اور پھر ارشاد فرماتے کہ ان پر ایسے تاج ہوں گے جن کا ادنیٰ موتی مشرق و مغرب کے مابین کو منور و روشن کر دے گا۔ اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے(1)۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 463 (العلمیۃ)

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر اہل جنت میں سے ادنیٰ فرد کے زیور کا مقابلہ تمام اہل دنیا کے زیورات سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ آخرت میں جو زیور اسے پہنائے گا وہ تمام اہل دنیا کے زیورات سے افضل و اعلیٰ ہوگا(1)۔

ابوالشیخ نے العظمہ میں کعب الاحبار سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ اپنی پیدائش کے دن سے اہل جنت کے لئے زیور بنا رہا ہے اور یوم قیامت تک اس میں مصروف رہے گا۔ اگر اہل جنت کے زیورات میں سے کوئی ایک بھی برآمد ہو جائے تو اس کے سامنے سورج کی روشنی بھی ماند پڑ جائے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ مومن کا زیور (اس کے ہاتھ اور پاؤں میں) وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا (پانی) پہنچتا ہے(2)۔

الزہد میں عمران بن خالد کی سند سے ایک تابعی کی روایت منقول ہے کہ صحابہ کرام نے فرمایا جس آدمی نے سونا پہننے کی قدرت رکھتے ہوئے نہ پہنا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں سونا پہنائے گا اور جس نے شراب پینے کی قدرت رکھتے ہوئے اسے پینا ترک کر دیا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں (شراب طہور) سے سیراب فرمائے گا۔ نسائی اور حاکم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (سونے کا) زیور اور ریشم پہننے والوں کو منع فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر تم جنت کا زیور اور ریشم پہننا پسند کرتے ہو تو دنیا میں یہ نہ پہنا کرو(3)۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں (جنت کا ریشم) نہیں پہنے گا(4)۔

یہ ترکیب کلام میں وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ کے فاعل سے حال ہے یا اس پر معطوف ہے۔

اسلوب کلام اس لئے تبدیل کر دیا گیا ہے تا کہ اس پر دلالت کرے کہ ریشم ان کا عرفی لباس ہے یا پھر اس لئے تا کہ آیات کے آخری حروف کا وزن ایک رہے۔

بزار، ابو یعلی اور طبرانی نے حضرت جابر کے واسطہ سے صحیح سند کے ساتھ ابوالخیر مرثد بن عبداللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس پر سندس (باریک ریشم) اگتا ہے، اسی سے اہل جنت کا لباس تیار ہوگا۔ نسائی، طیالسی، بزار اور بیہقی نے سند جید کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے پھٹ کر نکلیں گے، یعنی اہل جنت کے کپڑے جنت کا پھل دوبارہ پھٹنے سے نکلیں گے۔

ابن مبارک نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ مومن کا گھر ایک موتی ہوگا جو اندر سے خالی ہوگا۔ اس میں چالیس کمرے ہوں گے، ان کے درمیان میں ایک درخت ہوگا جس پر لباس اگے گا۔ پس بندۂ مومن جا کر اس سے اپنی انگلی کے ساتھ ستر جوڑے لباس نکال لے گا جو کہ موتیوں، زبرجد اور مرجان سے مزین اور آراستہ ہوں گے۔

فصل: شیخین نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ میں نے بذات خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تم ریشم

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 740 (الفکر)   2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 127 (قدیمی)

3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 212 (العلمیہ)   4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 867 (وزارت تعلیم)

اور دیباج نہ پہنو سونے چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور ان کی رکابیوں اور پیالوں میں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دنیا میں (کافروں کے لئے) ہیں اور آخرت میں تمہارے لئے ہیں(1)۔

شیخین نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں اسے نہیں پہن سکے گا (یعنی اس سے محروم رہے گا) اسی کی مثل حدیث حضرت انس اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی مروی ہے۔

نسائی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں شراب (طہور) نہیں پی سکے گا اور جو کوئی دنیا میں سونے چاندی کے برتنوں میں پیئے گا آخرت میں وہ ان میں نہیں پی سکے گا(2)۔

طیالسی نے صحیح سند کے ساتھ نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم پہنا، آخرت میں وہ اسے نہیں پہنے گا۔ اگر وہ جنت میں داخل بھی ہوا تب بھی اس لباس سے وہ محروم رہے گا(3)۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کو طوبیٰ کی طرف لے جایا جائے گا اور اس کے شگوفے اس کے لئے کھول دیئے جائیں گے (ان سے لباس برآمد ہوگا) اور وہ جس رنگ کا لباس چاہے گا، لے لے گا، چاہے تو سفید رنگ پسند کرے یا سرخ رنگ، چاہے تو سبز رنگ یا زرد رنگ اور اگر سیاہ رنگ پسند کرے (تو وہی لے لے گا) یہ لباس گل لالہ کی طرح ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ نرم اور خوبصورت ہوگا۔

حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اگر جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا دنیا میں پہنا جائے تو جو اس کی طرف دیکھے وہ غش کھا کر گر پڑے اور آنکھیں (اس کی چمک کو) برداشت نہ کر سکیں۔

صابونی نے المائتین میں حضرت عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ اہل جنت میں سے جو آدمی جنتی حلہ پہنے گا تو ایک ساعت میں اس میں ستر رنگ تبدیل ہوں گے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص جنت میں داخل ہو کر وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوگا تو نہ اس کا لباس بوسیدہ اور پرانا ہوگا اور نہ اس کا شباب (جوانی) ختم ہوگا(4)۔

وَهُدُوٓا۟ إِلَى ٱلطَّيِّبِ مِنَ ٱلْقَوْلِ سے پہلے قد مقدر ہے اور یہ الذین اسم موصول سے حال ہے جو کہ یدخل کا مفعول ہے۔ مفہوم یہ ہے درآنحالیکہ دنیا میں ان کی رہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی گئی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا پاکیزہ قول سے مراد لاالہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر والحمد للّٰہ کی شہادت دینا ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ قول طیب سے مراد قرآن ہے(5)۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ماضی مستقبل کے معنی میں ہے۔ یعنی جنت میں ان کی رہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی جائے گی اور اس سے مراد ان کا یہ قول ہے ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى صَدَقَنَا وَعْدَهُۥ اور دنیا میں انہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھایا گیا تھا جو تعریف کیا گیا ہے۔ صراط سے مراد اللہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 189 (قدیمی) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 141 (العلمیہ)
3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 212 (العلمیہ) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 380 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 108 (الفکر)

تعالیٰ کا دین یعنی دین اسلام ہے اور حمید سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو کہ بذات خود حمد وستائش کا مستحق ہے۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ ان کی راہنمائی جنت کے اس راستہ کی طرف کی جائے گی جو قابل تعریف ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ﹰالْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ ؕ وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۵﴾

”بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور (دوسروں کو) روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے ۱؎ اور مسجد حرام سے جسے ہم نے (بلاامتیاز) سب لوگوں کے لئے (مرکز ہدایت) بنایا ہے ۲؎ یکساں ہیں اس میں وہاں کے رہنے والے اور پردیسی ۳؎ اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق ہو تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب ۵؎“

۱؎ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور دوسرے لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ یہاں یَصُدُّوْنَ فعل مضارع ہے، اس سے مراد زمانہ حال اور استقبال نہیں بلکہ اس سے مراد استمرار ہے، یعنی مسلسل روکنا ہے جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے فلان یعطی و یمنع یعنی فلاں مسلسل عطاء کرتا رہتا ہے اور منع کرتا ہے چنانچہ اسی معنی کی بناء پر مضارع کا عطف ماضی پر کیا گیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ وَیَصُدُّوْنَ كَفَرُوْا، کے فاعل سے حال ہے اور اِنَّ کی خبر محذوف ہے جس پر آیت کا آخری حصہ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ دلالت کرتا ہے۔

۲؎ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف سَبِیْلِ اللّٰهِ پر ہے یا اسم جلالت لفظ اللہ پر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد حرام سے مراد صرف مسجد (کعبہ معظمہ) ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے مراد سارا حرم پاک ہے جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ حالانکہ یہ کہا گیا ہے کہ واقعہ معراج کا آغاز حضرت ام ہانی کے گھر سے ہوا (جو کہ حرم پاک میں تھا نہ کہ کعبہ معظمہ میں) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت طیبہ میں مسجد حرام کا اطلاق پورے حرم پاک پر کیا گیا ہے (لہٰذا اس آیت میں بھی مسجد حرام سے مراد سارا حرم ہے) کیونکہ مکہ مکرمہ کی آبادی سے حقیقی مقصد تو نماز کو قائم کرنا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بطور حکایت ذکر فرمایا ہے رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آیت طیبہ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ۔ میں مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہی لیا ہے۔ کیونکہ آپ نے کہا ہے کہ اس آیت کے مطابق کفار کو مطلقاً حرم پاک میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ ہم نے اس کے بارے گفتگو سورۂ توبہ میں کی ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ﹰالْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہے۔

۳؎ ابن کثیر نے اَلْبَادِ کو حالت فصل اور وصل دونوں میں اثبات یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ورش اور ابو بکر نے صرف وصل کلام میں اس طرح پڑھا ہے۔ حفص نے سواءً کو جعلنا کا مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور للنّاس ظرف لغو ہے۔ یا پھر سواء للنّاس میں ضمیر مستکن سے حال ہے اور للنّاس مفعول ثانی ہے اور العاکف اسی کے سبب مرفوع ہے۔ علاوہ ازیں باقی قرآء نے سواء کو مرفوع پڑھا ہے اس لئے کہ العاکف مبتدا ہے اور سواء اس کی خبر مقدم ہے یا پھر سواء صفت کے قبیلے سے ہونے کی بناء پر مبتدا ہے

اور العاکف اس کا فاعل ہے (جو سد مسد الخبر ہے) اور پھر مکمل جملہ جعلناہ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور للنّاس یا تو ھاء ضمیر سے حال ہے یا پھر ظرف لغو ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ للنّاس مفعول ثانی اور جملہ سابقہ کلام کا بیان ہو۔ یعنی ہم نے اسے لوگوں کے لئے ایسا مرکز ہدایت بنا دیا جس میں مقیم اور مسافر سب برابر ہیں۔

البادی سے مراد مسافر ہے اور یہ البدو کی طرف منسوب ہے، صاحب قاموس نے کہا ہے کہ البدو' البادیۃ البداو ۃ اور البدأۃ کا معنی حضر (شہر) کے برعکس ہے (1)۔ یعنی کسی آدمی کو بھی کسی دوسرے کے مقابلے میں شہر میں زیادہ اترنے کا حق حاصل نہیں اور جو آدمی بھی کسی جگہ پہلے قیام پذیر ہوگا کسی دوسرے کے لئے اسے وہاں سے نکالنا جائز نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ' سعید بن جبیر' قتادہ اور ابن زید نے اسی طرح کہا ہے۔ ان تمام کا یہ قول ہے کہ حرم پاک کی سرزمین کے مکانوں اور اترنے کی جگہوں میں مقیم اور مسافر کے حقوق برابر ہیں (2)۔

عبدالرحمٰن بن سابط نے کہا ہے کہ جب حجاج کرام مکہ مکرمہ میں آتے تھے تو اہل مکہ میں سے کسی کو بھی اپنے گھر میں فروکش ہونے کا ترجیحی حق باقی نہیں رہتا تھا اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کے دنوں میں لوگوں کو اپنے دروازے بند کرنے سے منع فرماتے تھے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے (3)۔
میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول عبدالرحمٰن بن عبد بن حمید نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک آدمی نے مروہ کے پاس آپ سے عرض کی اے امیر المومنین! آپ یہاں سے میرے لئے زمین کا کچھ حصہ علیحدہ کر دیجئے تو آپ اسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور اس سے اعراض فرما لیا اور ارشاد فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا حرم ہے، اس میں مقیم اور مسافر سب برابر ہیں۔ (ازالۃ الخفاء) عبدالرزاق نے ابن جریج سے یہ نقل کیا ہے کہ عطاء حرم پاک میں گھوڑوں کے داخلے سے منع کرتے تھے اور مجھے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل مکہ کو گھروں کے دروازے بند کرنے سے منع فرما رکھا تھا تاکہ حجاج کرام ان کے صحنوں میں قیام کر سکیں۔ سب سے پہلے وہاں سہیل بن عمرو نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اپنے کئے کی معذرت بھی پیش کی۔

پس اگر کہا جائے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے یہ قول صحیح ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں جیل خانہ بنانے کے لئے ایک گھر چار ہزار درہم کے عوض خریدا تھا۔ اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح بیہقی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مبارک خریدا تھا۔ اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے روایت ہے کہ انہوں نے دارالندوہ فروخت کیا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے مروی ہے کہ آپ نے مسجد کی توسیع کے لئے کچھ گھر ان کے مالکوں سے خریدے تھے اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ اور اس وقت رباط میں کثیر صحابہ کرام سکونت پذیر تھے مگر کسی نے بھی اس خرید وفروخت کا انکار نہیں کیا۔ (تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ بلکہ حرم پاک میں خرید وفروخت جائز ہے)

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 96 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر)

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ تمام آثار کو عمارت کی خرید وفروخت پر محمول کیا جائیگا کیونکہ عمارت تو بالیقین مالک کی ملکیت ہوتی ہے۔اور ممنوع زمین کی بیع ہے۔اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا نظریہ اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی اصح ترین روایت یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی زمین کو بیچنا اور وہاں کے مکانوں کو کرائے پر دینا جائز نہیں۔کیونکہ حرم پاک کی سرزمین آزاد ہے اور کسی کی بھی ملکیت نہیں۔اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بیت عتیق سے مراد سارے حرم کی سرزمین ہے۔کیونکہ حرم پاک کی سرزمین ہی قربانی کے جانور ذبح کرنے کے لئے مختص ہے۔

اور جو یہ قول ہے کہ اس کا معنی ہے ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلٰى مَكَانٍ يَّقْرُبُ مِنْهُ الْبَيْتُ الْعَتِيْقُ کہ اس سے مراد وہ جگہیں ہیں جو بیت اللہ شریف کے قریب ہیں۔تو یہ فقط ایک تکلف ہے اور تقدیر عبارت بلاضرورت ہے۔حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے لیکن ان کے نظریہ کا مبنیٰ اور مدار یہ ہے کہ مکہ مکرمہ بزور شمشیر فتح کیا گیا ہے اور جو شہر بزور شمشیر فتح کیا جائے وہ وقف ہوتا ہے،اس کی سرزمین کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوتی۔حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مئوقف یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے مکانوں کی خرید وفروخت اور انہیں کرائے پر دینا جائز ہے اور وہ اپنے مالکوں کی ملکیت ہیں۔یہی نظریہ حسن' طاؤس' عمرو بن دینار اور ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔اور آپ کے نزدیک آیت طیبہ میں مسجد حرام سے مراد صرف کعبہ معظمہ ہی ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے کعبہ معظمہ کو لوگوں کی نمازوں اور عبادات کا قبلہ بنادیا ہے،اس طرح کہ کعبہ معظمہ کی تعظیم' مسجد حرام میں نماز کی فضیلت اور بیت اللہ شریف کے طواف کے حکم میں مقیم اور مسافر سب برابر اور یکساں ہیں(1)۔ہم کہتے ہیں (کہ اگر مسجد حرام سے مراد فقط کعبہ معظمہ لیا جائے) تو پھر سیاق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ مقیم اور مسافر کی مساوات اور یکسانیت صرف مسجد حرام کے ساتھ مختص ہے اس کے باوجود کہ تمام مساجد اس حکم میں یکساں ہیں۔یعنی تمام مساجد میں مقیم اور مسافر برابر ہیں۔ہر ایک پر ہر مسجد کی تعظیم واجب ہے اور تمام مساجد تمام لوگوں کے لئے نماز اور دیگر طاعات کے ثواب کے لئے یکساں اور مساوی ہیں،سفر وحضر کے اختلاف کے سبب اس میں کوئی اختلاف رونما نہیں ہوتا۔(یعنی چاہے کوئی مقیم ہو یا مسافر۔اس کے لئے ثواب ایک ہی جیسا ہے)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد اور ایک جماعت نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل قول کہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مجاہد سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی قول مروی ہے۔امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم بن مہاجر کی سند سے مجاہد کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مکہ مکرمہ مباح ہے،اسکی زمین کو بیچنا اور مکانوں کو کرائے پر دینا حلال نہیں(2)۔ہمارے اس مؤقف کی دلیل وہ روایت ہے جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں نقل کی ہے کہ ہمیں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عبید اللہ بن ابی زیاد اور ابونجیح کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث کی خبر دی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا ہے لہٰذا اس کی زمینوں کو بیچنا اور ان کی قیمت کھانا حرام ہے۔

علامہ ابن جوزی نے التحقیق میں اپنی سند کے ساتھ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ مکہ مکرمہ حرام ہے' اس کی زمینیں حرام ہیں اور اس کے مکانوں کا کرایہ حرام ہے(3)۔

اگر یہ کہا جائے کہ دارقطنی نے کہا ہے حدیث کے مرفوع ہونے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو وہم ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ

1۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 109 (الفکر) 2۔شرح معانی الآثار،جلد 2،صفحہ 206 (امدادیہ)
3۔ابن جوزی،جلد 3،صفحہ 435 (المنارۃ الاسلامیہ)

روایت موقوف ہے تو اس کے بارے وضاحت یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے وہم کا دعویٰ کرنا (روایت کی) نفی پر شہادت دیتا ہے اور یہ قابل قبول نہیں بلکہ آپ تو ثقہ ہیں اور ثقہ راوی کا کسی حدیث کو مرفوع ذکر کرنا مقبول ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مرفوع سند کے ساتھ ایک روایت اس طرح نقل کی ہے کہ جس کسی نے مکہ مکرمہ کے گھروں کی اجرت میں سے کوئی چیز کھائی تو گویا وہ آگ کھا رہا ہے(1)۔

دار قطنی نے اپنی سند کے ساتھ اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر سے اور انہوں نے اپنے باپ اور عبداللہ بن باباہ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مکہ مکرمہ مباح ہے نہ اس کی زمین کو بیچا جا سکتا ہے اور نہ اس کے مکانوں کو کرائے پر دیا جا سکتا ہے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ اسماعیل بن ابراہیم کو یحییٰ اور نسائی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور ان کے باپ ابراہیم بن مہاجر بن جابر النخلی کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے کہ یہ منکر الحدیث ہے۔ ابن مدینی اور نسائی نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ لیکن سفیان، احمد، یحییٰ بن معین اور ابن مہدی نے کہا ہے کہ لا بأس بہ۔ ابوبکر بیہقی نے کہا ہے صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔

ابن جوزی نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن منصور سے روایت نقل کی ہے کہ ابومعاویہ نے اعمش اور مجاہد کے واسطہ سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بیشک مکہ مکرمہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے، اسکی زمین کو بیچنا اور اسکے مکانوں کا کرایہ لینا جائز نہیں(3)۔ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل روایت ہمارے نزدیک حجت ہے۔

ہمارے مخالفین نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ۔ (وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے) اور رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ و مامون ہو جائیگا(4)۔ (تو یہاں آیت کریمہ اور حدیث طیبہ میں مکانوں کی نسبت ان کے مالکوں کی طرف کی گئی ہے) اور یہ اضافت اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ان کے مالک ہیں۔ اور اگر یہ گھر ان کی ملکیت نہ ہوتے تو ان سے نکالے جانے کے سبب وہ مظلوم قرار نہ پاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافت یا تو ان کے ان میں رہائش پذیر ہونے کے سبب ہے یا پھر اس لئے کہ انہوں نے ان مکانوں کو تعمیر کیا۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے مسجد النبی ﷺ اور مسجد بنی فلاں۔ لہٰذا یہ اضافت اثبات ملکیت کے لئے نہیں۔ اور ظلماً انہیں گھروں سے نکالا جانا بھی اس پر دلالت نہیں کرتا کہ انہیں اپنے مملوکہ گھروں سے نکالا گیا ہے۔ (کیونکہ ظلم فقط مملوکہ گھروں سے نکالنے کے ساتھ مختص نہیں) بلکہ مسجد حرام سے انہیں نکال دینے کے سبب بھی ظلم تو ثابت ہو جاتا ہے۔ (حالانکہ یہ کسی کی ملکیت نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تمام لوگوں کے لئے برابر (ثواب) رکھا ہے۔ اور مزید فرمایا وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا۔ (اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے روکتا ہے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور وہ انہیں ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے)

مخالفین کی اس باب میں مضبوط ترین دلیل حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اپنے حج کے دوران کل آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا عقیل نے کوئی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 632 (العلمیۃ) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 58 (المحاسن)
3۔ ابن جوزی، جلد 3، صفحہ 436 (المنارۃ الاسلامیۃ) 4۔ ایضاً

اترنے کی جگہ چھوڑی ہے؟ پھر آپ ﷺ نے فرمان ان شاء اللہ تعالیٰ کل ہم خیف بنی کنانہ میں اتریں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ مسلمان کسی کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ متفق علیہ (1)۔

علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ مکہ مکرمہ میں اپنے گھر قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقیل نے کوئی زمین یا مکان چھوڑا ہے؟(2) زہری نے کہا ہے کہ عقیل اور طالب ابوطالب کے وارث بنے تھے اور حضرت جعفر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کسی بھی شئی کے وارث نہ بنے کیونکہ یہ دونوں مسلمان تھے جبکہ عقیل اور طالب دونوں ابھی کافر تھے کہ ابوطالب فوت ہو گئے۔ (اس لئے وہ اس کے وارث بنے)

حافظ نے محمد بن ابی حفصہ کی روایت کے آخر میں کہا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے جس گھر کی طرف حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اشارہ فرمایا ہے وہ ہاشم بن عبد مناف کا گھر تھا۔ پھر وہ ان کے بیٹے عبد المطلب کو ملا۔ پھر آپ نے اسے اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم فرمایا جب آپ عمر رسیدہ ہو گئے۔ پھر اس میں سے رسول اللہ ﷺ کو اپنے والد محترم حضرت عبد اللہ کا حصہ ملا۔ جس میں آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ پھر جب حضور نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی تو عقیل اور طالب سارے گھر کے والی بن گئے کیونکہ باپ کی طرف سے یہی دونوں اس کے وارث بنے تھے اور یہ دونوں ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اور چونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے سبب اپنا حصہ چھوڑ دیا تھا (لہٰذا اس پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا) پھر طالب میدان بدر میں قتل ہو گیا تو عقیل نے سارا گھر فروخت کر دیا۔

فاکہانی نے لکھا ہے کہ عقیل نے گھر فروخت نہیں کیا تھا بلکہ وہ گھر مسلسل عقیل کی اولاد کے قبضے میں رہا یہاں تک کہ انہوں نے وہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کو ایک لاکھ دینار کے عوض فروخت کر دیا۔

مذکورہ استدلال کا جواب یہ ہے کہ عقیل کا حالت کفر میں اس گھر کو بیچنا اس پر دلیل نہیں بن سکتا کہ اسلام میں (مکہ مکرمہ کے گھروں کو) بیچنا جائز ہے۔ اور میرے نزدیک حدیث طیبہ کی تاویل یہ ہے کہ اگر اس گھر کو عقیل نے فروخت نہیں کیا تھا تو اس وقت وہ اس کی ذاتی حاجات وضروریات میں مشغول تھا اور اگر فروخت کر دیا تھا تو پھر خریدنے والے کی حاجات میں مصروف تھا تو چونکہ وہ گھر خالی نہیں تھا اس لئے حضور نبی کریم ﷺ نے اس میں سکونت اختیار نہ فرمائی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی مکان (خالی) چھوڑا ہے؟ تو اس پر راوی کا یہ کہنا کہ عقیل ابوطالب کا وارث بنا یہ محض ایک شبہ ہے جس کا دارومدار ظن اور وہم پر ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد کہ کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ اس کا تعلق کسی اور واقعہ سے ہے لیکن راوی نے فقط ظن و وہم سے دونوں حدیثوں کو ملا دیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ اسی ارشاد کی بناء پر آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے۔ لہٰذا اس بناء پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد لَا یَرِثُ الْکَافِرُ الْمُؤْمِنَ وَلَا الْمُؤْمِنَ الْکَافِرُ نیا اور منفرد کلام ہے۔ اس میں یہ کوئی دلیل نہیں کہ مکہ کی سرزمین کسی کی ملکیت ہے۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین کو بیچنا جائز ہے۔ تو اس کے جواب میں ہمارا قول یہ ہے کہ ہم نے ایسی کثیر احادیث ذکر کی ہیں جو سرزمین مکہ کی خرید و فروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ وہ احادیث اپنی عبارت کے لحاظ سے خرید و فروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ وہ احادیث

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 192 حدیث: 3043 (الفکر)
2۔ ابن جوزی جلد 3، صفحہ 436 (المنارۃ الاسلامیۃ)

اپنی عبارت کے لحاظ سے خرید و فروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ حدیث اشارۃً بیع کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا ہماری روایات کی دلالت اولیٰ اور اقویٰ ہے۔ پھر اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ان احادیث کے مابین تعارض پایا جاتا ہے تو ایسی صورت میں بھی حرام کو مباح پر مقدم کرنا واجب ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس قاعدہ کی بناء پر کہ اباحت و حرمت کے تعارض کے وقت حرمت کو ترجیح حاصل ہے۔ سرزمین مکہ کی خرید و فروخت کرنے کو مکروہ تحریمی بنادیا ہے۔ اگر حضرت عبداللہ کا حصہ حضور نبی کریم ﷺ کو ملا تھا تو پھر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حصہ بغیر جابرانہ قبضے کے عقیل کے پاس پہنچا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ہے کہ کافر مسلمان کے مال پر جبر اور قبضہ کے بعد اس کا مالک بن جاتا ہے۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ موقف نہیں اور اگر کافر کو بالجبر قبضہ کے سبب ملکیت حاصل ہو جائے تو پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا اس حدیث میں کوئی معنی نہیں کہ کافر مومن کا وارث نہیں بنتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔

اگر وہ سارا گھر ابو طالب کا تھا تو پھر اس میں حضور نبی کریم ﷺ کے حصہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اگر چہ ہم ابو طالب کا مسلمان ہونا بھی فرض کر لیں۔ کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ابو طالب کے ورثاء میں سے نہیں۔ (کیونکہ بیٹوں کی موجودگی میں دادا کے مال کا پوتا وارث نہیں بن سکتا) نتیجۃً ہر تقدیر پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد " کیا عقیل نے ہمارے اترنے کے لئے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟" کی تاویل واجب ہے۔ اور جو تاویل میں نے ذکر کی ہے وہی اولیٰ اور موزوں ہے کیونکہ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت علی اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت ابو طالب کے وارث نہیں اور عقیل اکیلا ان کا وارث تھا۔ تب بھی حضور نبی کریم ﷺ جس طرح عاریۃً حضرت علی اور جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حصہ میں اتر سکتے تھے اسی طرح عقیل کی ملکیت میں بھی عارضی قیام فرماسکتے تھے۔

۶ اور جو مسجد حرام میں ناحق زیادتی کا ارادہ کرے چاہے مسجد حرام سے مراد فقط مسجد ہو یا سارا حرم ہو۔ تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ ترکیب کلام میں بعض نے کہا ہے کہ بالحاد مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے اور اس میں باءً زائدہ ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے تنبت بالدھن۔ اسی طرح اعمش کا قول ہے ضمنت برزق عیالنا ارماحنا(1)۔ اس میں بھی باءً زائدہ ہے۔ اور بظلم ظرف لغو یرد کے متعلق ہے۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور الحاد کی صفت ہے یا پھر یرد کے فاعل سے حال ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یُرِدْ کا مفعول محذوف ہے جو یہ شامل ہونے کو شامل ہوسکتا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے من یرد قولًا او فعلًا۔ اس ترکیب کے اعتبار سے بالحاد بظلم دونوں حال مترادف ہیں۔ یا حرف جار کے اعادہ کے سبب دوسرا پہلے سے بدل ہے۔ یا پھر اس کا صلہ ہے۔ یعنی یلحد بسبب الظلم۔ (جو ظلم کے سبب زیادتی کرے گا) یعنی جو بھی فعل منہی عنہ کا ارتکاب کرے اگر چہ وہ خادم کو گالی گلوچ دینا ہی ہو۔

۵ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ یہ من کا جواب شرط ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ہیں، حرم پاک میں زیادتی کرنے والا، اسلام میں طریقہ جاہلیت کو چاہنے والا اور بغیر حق کے کسی آدمی کا خون بہانے والا(2)۔

ترمذی، حاکم، بیہقی نے المدخل میں اور رزین نے اپنی کتاب میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 88 (الفکر)

نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چھ قسم کے آدمی ہیں جن پر میں نے لعنت کی ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر لعنت ہے اور ہر مستجاب الدعوات نبی علیہ السلام کی جانب سے بھی۔(1) کتاب اللہ میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے والا۔(2) تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والا۔(3) بالجبر حکومت کرنے والا کہ وہ اپنے اقتدار کے سبب ایسے آدمی کو عزت دے دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا ہے اور اسے وہ ذلیل ورسوا کر دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے۔(4) اللہ تعالیٰ کے حرم کو حلال سمجھنے والا۔(5) میری عترت (اہل بیت اطہار) جس کی تذلیل وحقارت کو) اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کو حلال خیال کرنے والا۔(6) اور میری سنت کو چھوڑنے والا(1)۔حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔

مذکورہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہے۔کیونکہ حرم پاک کو حلال سمجھنا اور اس میں ظلم و زیادتی کرنا حرام ہے چاہے وہ مسجد میں ہو یا مسجد سے باہر ہو۔

الحاد کا لغوی معنی اَلْمَيْلُ وَالْعُدُوْلُ عَنْ قَصْدِ السَّبِيْلِ ہے۔یعنی کجروی اختیار کرنا' ایک جانب جھک جانا اور میانہ روی (صراط مستقیم) سے پھر جانا۔مجاہد اور قتادہ کے قول کے مطابق یہاں الحاد سے مراد شرک کرنا اور غیر اللہ کی عبادت کرنا ہے۔

علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شئی ہے جو ممنوع ہو چاہے اس کا تعلق قول سے ہو یا فعل سے اگرچہ وہ خادم کو سب وشتم کرنا ہی ہو(2)۔

عطاء نے کہا ہے کہ اس سے مراد حرم پاک میں بغیر احرام کے داخل ہونا ہے اور وہاں ایسی چیزوں کا ارتکاب کرنا ہے جو حرم پاک میں ممنوع ہیں مثلاً شکار کو قتل کرنا اور درخت کو کاٹنا(3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ الحاد سے مراد حرم پاک میں تیرا اس آدمی کو قتل کرنا ہے جو تیرے قتل کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور تیرا ایسے آدمی پر ظلم کرنا ہے جو تجھ پر ظلم کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ضحاک کے قول کا بھی یہی مفہوم ہے۔مجاہد نے کہا ہے کہ مکہ مکرمہ میں گناہوں کی سزا بھی کئی گنا بڑھا دی جاتی ہے جیسے وہاں نیکیوں کا اجر کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔حبیب بن ابی ثابت کا قول ہے کہ الحاد سے مراد مکہ مکرمہ میں کھانے (کی اشیاء) کو ذخیرہ اندوز کرنا ہے(4)۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد باری تعالیٰ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ کی وضاحت میں کہا ہے کہ صحابہ کرام فرماتے تھے وہ آدمی جس نے صرف گناہ کا قصد کیا تو وہ گناہ اس کے نامہ اعمال میں اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ وہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔اور اگر مکہ مکرمہ میں کسی نے دوسرے آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا اگرچہ وہ آدمی عدن یا کسی اور شہر میں ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب چکھائے گا(5)۔(یعنی مکہ مکرمہ میں گناہ کا ارادہ بھی قابل مؤاخذہ ہے) سدی کہتے ہیں کہ اگر اس آدمی نے گناہ کا ارادہ کرنے کے بعد اس سے توبہ کرلی تو پھر اس کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے روایت ہے کہ آپ کے دو خیمے تھے ایک مقام حل میں تھا اور دوسرا حرم پاک میں۔جب آپ اپنے گھر والوں کو عتاب اور سرزنش کرنا چاہتے تو انہیں اس خیمے میں جاکر عتاب کرتے جو مقام حل میں تھا۔جب اس کے بارے آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ہم یہ گفتگو کرتے تھے کہ کسی آدمی کا حرم پاک میں کلا واللہ اور بلٰی واللہ کہنا بھی الحاد اور بے دینی ہے(6)۔

1۔شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 334 (العلمیہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر)

3۔ایضاً 4۔ایضاً 5۔ایضاً 6۔ایضاً، صفحہ 110

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیم (علیہ السلام) کیلئے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ [1] اور حکم دیا کہ شریک نہ ٹھہرانا میرے ساتھ کسی چیز کو اور صاف ستھرا رکھنا میرے گھر کو [2] طواف کرنے والوں' قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کیلئے [3]''

[1] اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کیلئے ایک معین جگہ مقرر فرما دی اور ہم نے اسے آپ کے لئے گھر تعمیر کرنے کی جگہ قرار دیا۔ مبواء کا معنی ہے منزل (اترنے کی جگہ) زجاج نے اسی طرح کہا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ لابراھیم میں لام زائدہ ہے اور مکان ظرف ہے۔ اس اعتبار سے معنی یہ ہے کہ جب ہم نے آپ کو معین جگہ میں اتارا۔ قاموس میں ہے بواہ منزلًا وفیہ انزلہٗ اس نے فلاں کو مخصوص جگہ اتارا۔ اور مبآءۃ کا معنی ہے منزل اترنے کی جگہ' قیام کرنے کی جگہ (1)۔ یہاں آیت کریمہ میں مکان البیت اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ طوفان نوح کے وقت کعبۃ اللہ کو آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا تھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ شریف تعمیر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو وہ نہیں جانتے تھے کہ بنیاد کہاں رکھی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جس کا نام ریح خجوج تھا۔ تو اس نے آپ کے لئے کعبہ کے اردگرد بنیاد سے زمین کو الٹ دیا (جس سے بنیادیں ظاہر ہوگئیں) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے (2)۔

ابن جریر' ابن ابی حاتم اور بیہقی نے دلائل میں سدی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جسے ریح خجوج کہا جاتا تھا اور اس کے دو پر اور ایک سر تھا اور وہ سانپ کی صورت میں تھی۔ پس اس سے کعبہ کے اردگرد بیت اللہ شریف کی پہلی بنیادوں سے زمین کو الٹ دیا (3)۔ (جس سے بنیادیں ظاہر ہوگئیں)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی حدود کے مطابق ایک ہوا بھیجی جو بیت اللہ شریف کے مقام پر آکر کھڑی ہوگئی۔ اس میں ایک سر تھا جو یہ گفتگو کر رہا تھا اے ابراہیم! میری مقدار بیت اللہ شریف بنا دو چنانچہ آپ نے اسی پر بنیاد رکھ دی (4)۔

[2] اَنْ لَّا تُشْرِكْ میں اَنْ مصدر یہ ہے جو فعل محذوف سے متعلق ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام سے شرک نہ کرنے کا عہد لیا یا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس طرح کیا کہ آپ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ (فعلنا ذلک لان لا تشرک) یا اَنْ مفسرہ ہے جو بَوَّاْنَا کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تعبد کے معنی کو متضمن ہے، جبکہ تبویہ تعبد کے لئے آتا ہے۔ اور تعبد امر اور نہی دونوں کو شامل ہے۔ لہٰذا یہ قول کے معنی میں ہے۔ بِیْ سے مراد ہے بعبادتی۔ (یعنی حکم دیا کہ میری عبادت میں کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا) اور میرے گھر کو بتوں اور غلاظت سے صاف ستھرا رکھنا۔ نافع' حفص اور ہشام نے بَیْتِیَ کو یاءِ مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے یاءِ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بیت کی اضافت اپنی طرف کرنا فقط بیت کی تشریف و تعظیم کے اظہار کے لئے ہے۔ اور اس

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 97 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (الفکر)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 636 (العلمیۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (الفکر)

لئے کہ یہ وہ مقام ہے جو رب کریم کی خصوصی تجلیات کا مہبط ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ کعبہ معظمہ بیت اللہ (اللہ تعالیٰ کا گھر) ہے اس کے باوجود کہ یہ جسم بھی رکھتا ہے اور دکھائی بھی دیتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت اور امر کے مشابہ ہے جو بے کیف ہے کیونکہ اس کی دیواریں اور سرزمین کعبہ کی مٹی تحت الثریٰ تک قبلہ نہیں۔ کیا آپ یہ جانتے نہیں کہ اگر اس مقام سے اس کی دیواروں اور مٹی کو اٹھا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تو قبلہ یہی پہلا مقام رہے گا، وہ جگہ قطعاً قبلہ نہیں بنے گی جہاں اس کی دیواریں اور مٹی منتقل کی گئی۔ اور اگر کعبہ معظمہ کی جگہ نئی دیواریں کھڑی کر دی جائیں (کعبہ کی تعمیر نو کر دی جائے) اور کسی دوسری جگہ کی مٹی یہاں منتقل کر دی جائے تو پہلے کی طرح مقام قبلہ رہے گا۔ تو اس سے بخوبی یہ جانا جا سکتا ہے کہ قبلہ ایک ایسا امر ہے جس کی کوئی کیفیت نہیں۔ اور وہ رب کریم کی غیر متکیف تجلیات کی برسات ہے اور ان کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جنہیں ادراک کی قوت اور توفیق رب کریم عطا فرماتا ہے۔

۳؎ طائفین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کعبہ معظمہ کے اردگرد طواف کرتے ہیں۔ رُکَّعٌ رَاکِعٌ کی جمع ہے۔ یعنی رکوع کرنے والے اور سجود سَاجِدٌ کی جمع ہے۔ یعنی سجدہ کرنے والے۔ ان دونوں کا ذکر بغیر حرف عطف کے کیا گیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ان سے مراد نماز پڑھنے والے لوگ ہیں۔ اور دوسرا اس لئے کہ سجدہ کے بغیر فقط رکوع کوئی مشروع عبادت نہیں۔ چونکہ قیام، رکوع اور سجود تینوں نماز کے ارکان ہیں اور یہاں نماز کو اپنے ارکان سے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر طہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ (اس لئے ان میں سے ہر ایک کے مقام کا پاک ہونا لازم اور ضروری ہے) لیکن روافض کا نظریہ یہ ہے کہ نماز میں طہارت فقط سجدے میں شرط ہے، یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ کا پاک ہونا ہی کافی ہے۔ کسی اور رکن کے لئے یہ شرط نہیں۔

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ یَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ ﴿۲۸﴾

"اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج ۱؎ کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پا پیادہ ۲؎ اور ہر دبلی اونٹنی پر سوار ہو کر جو آتی ہیں ہر دور دراز راستہ سے ۳؎۔ (اعلان کیجئے) تاکہ وہ حاضر ہوں اپنے (دینی و دنیوی) فائدوں کے لئے ۴؎ اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں ۵؎ پس خود بھی کھاؤ ان سے اور کھلاؤ مصیبت زدہ محتاج کو ۶؎"

۱؎ اور لوگوں میں حج کے لئے اعلان عام کر دو اور انہیں اس کے لئے پکارو۔ ظاہر کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عطف طَهِّرْ پر ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کے لئے اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے عرض کی کیا میری آواز پہنچ جائے گی؟ تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اذان دینا' آواز لگانا تم پر لازم ہے اور اسے پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔ چنانچہ آپ مقام ابراہیم پر کھڑے ہوئے تو وہ بلند ہو گیا یہاں تک کہ طویل اونچے پہاڑ کی مثل بلند ہو گیا۔ آپ نے اپنی انگلیاں دونوں کانوں میں رکھیں اور چہرے کو دائیں' بائیں اور مشرق کی طرف پھیرتے ہوئے (بآواز بلند) کہا اے لوگو! بیشک تمہارے رب نے ایک گھر بنایا ہے اور تم پر اس گھر کا حج فرض قرار دیا

ہے۔ پس تم اپنے رب کی دعوت کو قبول کرلو۔ تو وہ تمام افراد (جو قیامت تک حج کی سعادت حاصل کریں گے) انہوں نے اپنے باپوں کی پشتوں اور ماؤں کی رحموں سے یہ جواب دیا لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اہل یمن نے اس دعوت پر لبیک کہی اسی وجہ سے وہاں کے لوگ زیادہ حج کرتے ہیں۔ یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جبل ابی قبیس پر چڑھ کر آواز لگائی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس آیت میں الناس سے مراد اہل قبلہ ہیں (2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حسن نے یہ گمان کیا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ۔ نیا کلام ہے۔ اور اس میں خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے۔ آپ ﷺ کو حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان کرنے کا حکم ارشاد فرمایا گیا (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے لہٰذا تم حج کرو (4)۔ احمد، نسائی اور دارمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

ۓ یَاْتُوْکَ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یعنی وہ لوگ آپ کی دعوت پر حج کرنے کے لئے آئیں گے۔ عبارت کا مفہوم یہ ہے۔ ان تو ذن یاتوک۔ (تم آواز دو وہ تمہارے پاس آئیں گے)

رِجَالًا پیدل چلتے ہوئے۔ یہ راجل کی جمع ہے جیسا کہ قائم کی جمع قیام اور نائم کی جمع نیام ہے۔ یہ فقط وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی خبر ہے۔ اس میں قطعاً یہ ذکر نہیں ہے کہ جو لوگ سواری نہ پائیں ان پر بھی حج فرض ہے۔ لہٰذا یہ آیت داؤد ظاہری اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے لئے حجت نہیں بن سکتی۔ (ان کے نزدیک حج ان لوگوں پر بھی فرض ہے جن میں سواری میسر نہ ہو) ہم نے ان دونوں کے خلاف سورۂ آل عمران کی آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ کے تحت ان تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے جو فرضیت حج کے لئے شرط ہیں اور انہی میں یہ بھی ہے کہ حج فرض ہونے کے لئے زادراہ پر قادر ہونا اور سواری کا موجود ہونا شرط ہے۔

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ جو پیدل چلنے کی قدرت رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ پیدل چل کر حج کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پیدل چل کر آنے کا ذکر سوار ہو کر آنے سے پہلے کیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ پیدل چلنے میں مشقت اور تکلیف زیادہ ہے اور اس میں تواضع اور خشوع وخضوع بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ جس نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی اس پر رسول اللہ ﷺ نے پیدل حج واجب قرار دیا ہے اور نذر پوری کرنے کی صورت میں جانور کی قربانی واجب قرار دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج میں پیدل چلنا طاعت وعبادت ہے اور طاعت کا کم سے کم درجہ ندب (مستحب) ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ سوار ہو کر حج کرنا افضل ہے کیونکہ حج کے دوران پیدل چلنے سے بہت سی عبادات میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور دین اسلام میں رہبانیت جائز نہیں۔

ۓ اور ہر دبلی اونٹنی پر سوار ہو کر جو ہر دور دراز راستہ سے آتی ہیں۔ ضامر سے مراد ایسا کمزور اور نحیف اونٹ ہے جسے سفر کی دوری نے تھکا دیا ہو اور اسی بعد مسافت کے سبب وہ کمزور ہو گیا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر)　3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 432 (قدیمی)

ابن جریر نے مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ حجاج کرام سوار نہیں ہوتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ تو آپ نے انہیں زادِ راہ ساتھ لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی انہیں سوار ہونے اور دوران سفر تجارت کرنے کی رخصت بھی عنایت فرمادی۔

یَاْتِیْنَ ضَامِرٍ کی صفت ہے چونکہ ضامر کی طرف لفظ کل مضاف کیا گیا ہے اس لئے اس کے معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے یاتین صیغہ مؤنث کے ساتھ اس کی صفت ذکر کی گئی ہے۔ یا پھر یہ کل کی صفت ہے۔ اس صورت میں بھی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ مؤنث لایا گیا ہے۔ یعنی یَاْتُوْكَ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ اِلٰى مَكَّةَ مَرْكُوْبًا لِاَنْ یَحُجَّ۔ (وہ حج کرنے کیلئے آپ کے پاس ہر اس دبلی اونٹنی پر سوار ہو کر آئیں گے جو مکہ مکرمہ کی طرف آتی ہیں) فَجٍّ عَمِیْقٍ کا معنی ہے دور دراز راستہ۔

لِّیَشْهَدُوْا اَذِنْ کے متعلق ہے یا پھر یَاْتُوْكَ کے یعنی تاکہ وہ اپنے دینی یا دنیوی منافع کے لئے حاضر ہوں۔ منافع کو نکرہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں اس سے مراد منافع کی وہ خاص نوع ہے جو اس عبادت (حج) سے حاصل ہوتی ہے۔

حضرت محمد بن علی بن حسین بن علی الباقر علیہ السلام اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کہ یہاں منافع سے مراد عفو اور مغفرت ہے (1)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ (کی رضا) کیلئے حج کیا اور دوران حج نہ فحش گوئی کی اور نہ ہی فسق و فجور کا ارتکاب کیا تو وہ (اس طرح گناہوں سے پاک ہو کر) واپس لوٹے گا گویا آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہے۔ متفق علیہ (2)۔

سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ منافع سے مراد تجارت ہے (3)۔ یہی روایت زید کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے کیونکہ آپ نے منافع کا مفہوم اسواق (بازار) بیان کیا ہے۔

مجاہد کا قول ہے کہ اس سے مراد تجارت اور ہر وہ دنیوی یا اخروی امر ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے (4)۔

اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ تو اس میں ذکر ذبح اور نحر سے کنایہ ہے کیونکہ تمام ذبائح کے حلال ہونے کے لئے ذبح کے وقت ان پر اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرنا شرط ہے اور ساتھ ہی اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ اس عمل سے مقصود فقط قرب الٰہی کا حصول ہے۔

ایام معلومات سے مراد ذوالحجہ کے دس دن ہیں۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور انہیں معلومات اس لئے کہا گیا ہے تاکہ انہیں جاننے اور ان کا حساب رکھنے پر برانگیختہ کیا جائے کیونکہ ان کے اختتام پر حج ادا کرنے کا وقت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایّام معلومات سے مراد قربانی کا دن (یوم نحر دسویں ذی الحجہ کا دن) اور اس کے بعد کے تین ایام ہیں (5)۔

حضرت عطاء حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ان سے مراد نویں، دسویں ذی الحجہ کے دن اور ایام تشریق ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے معلومات سے مراد صرف ایام تشریق ہیں (6)۔

بھیمۃ الانعام سے مراد ھدی اور قربانی کے جانور ہیں چاہے قربانی واجب ہو یا مستحب۔ کیونکہ یہ نص مطلق ہے، فعل کو مرزوق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر)　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 245 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر)　　4۔ ایضاً　　5۔ ایضاً　　6۔ ایضاً

سے معلق کیا ہے اور مرزوق کی وضاحت بھیمۃ الانعام سے کی ہے، ایک تو اس لئے تا کہ تقرب الٰہی پر برانگیختہ کیا جائے اور دوسرا اس پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ ذکر الٰہی کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دم احصار کے علاوہ کسی قربانی کو یوم نحر اور اس کے بعد کے تین ایام کے سوا کسی دن ذبح کرنا جائز نہیں۔ (دم احصار سے مراد یہ ہے کہ حاجی کو احرام باندھنے کے بعد کسی دشمن کی جانب سے بالجبر راستے میں روک لیا جائے یا کسی اور سبب سے اسے کعبہ معظمہ تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جائے تو اس کے لئے اسی جگہ اپنا احرام کھول کر قربانی کا جانور ذبح کر دینا جائز ہے۔ اسی قربانی کو دم احصار کہا جاتا ہے۔ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھئے) ہمارا موقف یہ ہے کہ ایام معلومات کی قید محض اتفاقی ہے۔ (کیونکہ عام قربانی مقررہ دنوں میں ہی ہوتی ہے) اور مفہوم مخالف کے ہم قائل نہیں ہیں (کہ یہ کہہ دیں کہ جو قربانی ان ایام میں نہ کی جائے وہ ناجائز ہے) اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اقوال ذکر کر چکے ہیں۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نفلی نذر مانی ہوئی اور کفارہ کی ھدیٰ کے لئے یوم نحر اور ایام تشریق کا ہونا شرط نہیں کیونکہ یہ صحیح روایت ہے کہ جب حدیبیہ کے سال حضور نبی کریم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے چلے تھے تو آپ ﷺ یوم نحر تک مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ روایت صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ ذوالقعدہ میں نفلی قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز ہے۔ تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ یوم نحر کے سوا بھی قربانی کرنا طاعت اور عبادت ہے۔ اور طاقت مقصودہ نذر کے سبب واجب ہو جاتی ہے۔ تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ نذر کی قربانی بھی ایام نحر کے علاوہ دوسرے ایام میں ذبح کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک شکار کرنے کے سبب لازم ہونے والی قربانی اور کفارات کی قربانی کو ذبح کرنا نحر کے ساتھ مختص نہیں کیونکہ کفارہ کی قربانی بھی عبادت ہوتی ہے تو جب اس کا عبادت ہونا ثابت ہے تو پھر اس کا دیگر ایام میں ذبح کرنا بھی جائز ہے۔ اور شکار کی جزاء کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ یہ بھی مطلق ذکر ہے اسمیں یوم النحر کی قید مذکور نہیں۔ اور کتاب اللہ کے مطلق حکم کو اپنی جانب سے مقید کرنا جائز نہیں کیونکہ ایسا کرنا تو مطلق حکم کو منسوخ کرنا ہے لیکن حج قران اور حج تمتع کی قربانی یوم نحر کے ساتھ مختص ہے۔ اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دم احصار بھی یوم نحر کے ساتھ مختص ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اسمیں آپ سے اختلاف ہے۔ دونوں مسلکوں کا تفصیلی ذکر سورۃ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔

لے پس ان سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔ یہ امر استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں اس پر تمام کا اجماع ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ امر اباحت کے لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے فرمایا ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اپنی قربانیوں کا گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔

مسئلہ: اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جب نفلی ھدی ہو تو قربانی کرنے والے کے لئے اس کا گوشت کھانا جائز ہے اور اس کی دلیل وہ طویل حدیث ہے جو حجۃ الوداع کے بیان میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے قربانی کے لئے کچھ اونٹ لے کر آئے اور رسول اللہ ﷺ قربانی کی غرض سے اونٹ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان میں سے

تریسٹھ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ذبح کیے۔ باقی ماندہ اونٹ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دیئے جنہیں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذبح کیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے اپنی قربانی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شریک کرلیا۔ پھر آپ ﷺ نے ہر قربانی سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لینے کا حکم ارشاد فرمایا (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) اور پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا، بعد از اں حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں نے یہ گوشت تناول فرمایا اور اس کا شوربہ نوش فرمالیا، اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ (نفلی) قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے کیونکہ اگر اپنی قربانی سے کھانا مستحب نہ ہوتا تو حضور نبی کریم ﷺ ہر اونٹ سے گوشت لینے کا حکم ارشاد نہ فرماتے بلکہ ایک ہی اونٹ سے گوشت لینا کافی ہوتا۔

مسئلہ: اس پر تمام علماء متفق ہیں کہ وہ جانور جو شکار کی جزاء کے طور پر قربان کیا جائے اس کا گوشت (قربانی کرنے والے کے لئے) کھانا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شکار کی جزاء شکاری کا بدل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ۔ اور ہم سورۂ مائدہ کی تفسیر میں مماثلت کے بیان میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ شکار کی جزاء یا تو صورۃً شکار کی مثل ہونی چاہئے یا پھر قیمت کے اعتبار سے اس کی مثل ہونی چاہئے تو جب شکار آدمی پر حرام ہے تو پھر اس کا بدل بھی اسی کی طرح حرام ہوگا۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک و برباد کرے! کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربیاں حرام قرار دیں تو وہ انہیں اکٹھا کرتے رہتے اور پھر (پگھلا کر) اسے فروخت کر دیتے اور اس کی قیمت کھا لیتے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(2)۔

اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک نذر مانے ہوئے جانور کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں۔ مگر اس میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ اسی طرح جمہور کے نزدیک ان قربانیوں کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں جو جنایات کے سبب یا حج کو فاسد کرنے کے سبب آدمی کے ذمہ واجب الاداء ہوتی ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت ہے اور یہی مسلک اسحٰق کا بھی ہے کہ آدمی شکار کی جزاء اور نذر مانے ہوئے جانور کی قربانی کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ علاوہ ازیں ہر قسم کی قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے(3)۔ اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معلق روایت نقل کی ہے۔ چونکہ شکار کی جزاء کے طور پر ذبح کئے جانے والے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ اس لئے اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ کفارات' جنایات اور نذر مانے ہوئے جانوروں کی قربانی کا گوشت کھانا بھی حرام ہے۔ اس مسئلہ پر اجماع ہے۔ جامع بات یہ ہے کہ کفارات کی قربانیوں کو شکار کی جزاء پر قیاس کرنا درست ہے۔ لہٰذا کفارات کے طور پر ذبح کئے جانے والے جانوروں کے تمام اجزاء مکمل طور پر مستحقین کے حوالے کئے جانے چاہئیں۔ لیکن نذر مانے ہوئے جانور کی قربانی کو شکار کی جزاء پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ (کیونکہ یہ کسی جرم کے بدلے آدمی کے ذمہ واجب الاداء نہیں ہوتی) مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نذر یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ جانور جس کی نذر مانی گئی ہے اس کا گوشت اپنے تمام اجزاء کے ساتھ مستحق کے حوالے کر دیا جائے (لہٰذا قربانی کرنے والا اس سے کوئی حصہ نہیں کھا سکتا)

مسئلہ: اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ قربانی کا گوشت کھانا قربانی کرنے والے کیلئے جائز ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 399 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 232 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 130۔ حدیث: 2766 (الفکر)

قول کی دلیل یہ ہے کہ قربانی کرنا عبادت وطاعت ہے اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قربانی کا گوشت کھاؤ (دوسروں کو) کھلاؤ اور (اپنے پاس) ذخیرہ کر کے رکھ لو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کا یہ کہنا ہے کہ یہ قربانی مستحب اور مسنون ہے۔ اور ہم نفلی قربانی کا گوشت کھانے کے جواز پر اجماع پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ (لہٰذا بالاتفاق عام قربانی کا گوشت قربانی کرنے والے کیلئے کھانا جائز ہے)

مسئلہ: حج تمتع اور حج قران کی قربانی کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کی قربانی کا گوشت کھانا قربانی کرنے والے کے لئے جائز ہے کیونکہ یہ قربانی عبادت وطاعت ہے اور ہم اس سے قبل حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حکم ارشاد فرمایا ہر ذبح شدہ اونٹ سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے لو۔ پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا تو پھر دونوں نے وہ گوشت تناول فرمایا اور اس کا شوربہ نوش فرمالیا۔

علامہ ابن جوزی نے استدلال کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے اپنی سنن میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حج تمتع کی قربانی کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ اس کا گوشت صدقہ کر دیں سوائے اس کے جو ہم کھالیں۔ (یعنی کھانے سے جو گوشت بچ جائے اسے میں صدقہ کر دوں) تو یہ روایت صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ تمتع کی قربانی کا گوشت قربانی کرنے والے کے لئے کھانا جائز ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حج تمتع اور قران کی قربانی کا گوشت اور ہر واجب قربانی کا گوشت کھانا جائز نہیں، چاہے تو اس نے نذر کے سبب اس نے خود اپنے اوپر واجب کی ہو یا پھر کسی اور سبب سے اس پر واجب ہوگئی ہو۔ آپ نے اپنے موقف کے حق میں تین احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک حدیث حضرت ناجیہ خزاعی کی ہے کہ آپ ہی غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے قربانی کے اونٹوں کو لانے والے اور ان کے محافظ تھے۔ دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اور تیسری حدیث حضرت دویب بن حلحلہ کی ہے۔ ہم نے یہ تینوں احادیث اور ان کے جوابات سورۃ البقرۃ کی آیت فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ إِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ کی تفسیر میں ذکر کر دیئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قربانیوں کا گوشت کھانا جائز ہے، چاہے تو وہ قربانیاں واجب ہوں۔ حج تمتع اور قران کی قربانی۔ یا وہ نافلہ ہوں جیسا کہ ہم نے لفظ کے مطلق ہونے سے اس جانب اشارہ کر دیا ہے۔ پھر اس عام حکم سے اجماع کے سبب نذر مانی ہوئی قربانی کا حکم خاص کر دیا گیا ہے یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ یہ کلام حج کے بارے ہے اور نذر مانی ہوئی قربانی کا تعلق حج کے باب سے نہیں۔ البتہ شکار کی جزاء اور کفارات کے سبب واجب ہونے والی قربانیاں اگرچہ حج کے باب سے ہیں لیکن مسلمان کی ظاہر حالت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس دوران حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرے۔ لہٰذا اس آیت کا مراد یہ قربانیاں نہیں ہوسکتیں کیونکہ یہاں حکم حج مبرور کا دیا گیا ہے۔ (جو ہر قسم کی جنایت کی آلائش سے مبرہ اور پاک صاف ہو) واللہ اعلم۔

البائس سے مراد وہ شخص ہے جس کا فقر شدید ہو اور البوس کا معنی شدت احتیاج کا ہونا اور انتہائی نادار ہونا ہے۔ اور الفقیر یا تو البائس سے بدل ہے یا پھر اس کے لئے عطف بیان ہے۔

ثُمَّ لۡيَقۡضُوا تَفَثَهُمۡ وَلۡيُوفُوا نُذُورَهُمۡ وَلۡيَطَّوَّفُوا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيقِ ﴿٢٩﴾

"پھر چاہئے کہ دور کریں اپنی میل کچیل 1 اور پوری کریں اپنی نذریں 2 اور طواف کریں ایسے گھر کا جو بہت قدیم ہے۔ 3"

1۔ ورش' ابوعمرو' ابن عامر اور قنبل نے لِیَقْضُوْا کی لام کو مکسور پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہیں چاہئے وہ اپنی میل کچیل دور کریں۔ اس طرح کہ سر کا حلق کرائیں' لبیں کانیں' ناخن تراشیں' بغلوں اور زیر ناف بال صاف کریں۔ یہ تمام کام طواف زیارت سے پہلے احرام کھول کر کئے جاسکتے ہیں۔ محرم پر حلق کرانے کے بعد سوائے عورتوں کے تمام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اور طواف زیارت کے بعد عورتوں کی قربت بھی حلال ہو جاتی ہے۔ مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔

قضاء اصل میں فعل اور ادا کے معنی میں ہے۔ یعنی کوئی کام کرنا اور ادا کرنا۔ جیسے کہا جاتا ہے قَضٰی دَیْنَهٗ۔ (اس نے اپنا فرض چکا دیا) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (جب تم اپنے مناسک ادا کر چکو) اور فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ (اس نے انہیں سات آسمان بنا دیا) (چونکہ کام ہو چکنے کے بعد اس سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے) اس لئے قضا کو کسی کام سے فارغ ہونا مستلزم ہے۔ جیسا کہ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ (دو مدتوں میں سے جو میں پوری کر چکوں) چونکہ میل کچیل دور کرنے سے اس سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے (اس لئے فرمایا ثُمَّ لْیَقْضُوْا)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ قضاء التفث سے مراد تمام مناسک حج کو ادا کرنا ہے (1)۔

مجاہد نے کہا ہے کہ تفث سے مراد مناسک حج' لبوں کو لینا' بغلوں اور زیر ناف بال صاف کرنا اور ناخن تراشنا ہے (2)۔ بعض نے کہا ہے کہ تفث سے مراد رمی جمار کرنا ہے۔ پس معنی یہی ظاہر ہوا کہ ان تمام امور کو کرنا اور ان تمام کو ادا کرنے کا نام مقضاً ہے۔ (یعنی جب تم یہ افعال کر چکو)

زجاج کا کہنا ہے کہ تفث کا لفظ اور اس کا معنی ہمیں صرف قرآن کریم سے ملا ہے (3)۔ یہ لفظ کلام عرب میں عموماً استعمال نہیں ہوتا۔ اور لفظ ثُمَّ اس پر دلالت کرتا ہے کہ سر کا حلق اور طواف زیارت قربانی سے مؤخر کرنا واجب ہے۔ پس یہی ارشاد حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی دلیل ہے کہ رمی جمار' حج قران کرنے والے کی قربانی اور سر کے حلق کے درمیان ترتیب کا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ سعید بن جبیر' قتادہ' حسن اور نخعی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

لہٰذا جس کسی نے عمداً یا خطاءً اس ترتیب کو ترک کیا اس پر دم (ایک جانور کی قربانی) واجب ہوگا۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ جس کسی نے مناسک میں سے کسی عمل کو (اپنی ترتیب سے) مقدم یا مؤخر کیا تو اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور قربانی کرے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے موقوفاً روایت کیا ہے اور یہ موقوف حکماً مرفوع ہے۔ کیونکہ قضا بشکل غیر معقول کا ادراک رائے سے نہیں ہو سکتا۔ (یعنی کسی جرم کا کفارہ ادا نہیں۔ اور ابن عدی کا قول ہے کہ اس کی حدیث کو ضعفاء میں لکھا جائے گا۔

تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ وہ صدوق س طرح ادا کرنا جو عقلاً جرم سے مشابہت نہ رکھتا ہو رائے سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ بالیقین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ قول حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا ہوگا)

اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ حدیث کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جسے ابو حاتم نے منکر الحدیث کہا ہے۔ ابن مدینی نے اور نسائی نے اس کے بارے کہا ہے وہ قوی (سچ بولنے والا) راوی ہے اور کبار تابعین میں سے ہے اور مسلم نے اس کا متابع بھی ذکر کیا ہے۔ سفیان' احمد اور ابن مہدی نے اس کے بارے لا بأس به (اس میں کوئی ہرج نہیں) کہا ہے۔ پھر یہ حدیث فقط اسی راوی پر منحصر نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 113 (الفکر)   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً

بلکہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے بھی ذکر کیا ہے اور وہ سند یہ ہے۔ قال حد ثنا وهيب عن ايوب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه مثله اس کے بعد مذکورہ حدیث نقل کی ہے (اور اس سند میں ابراہیم بن مہاجر نام کا کوئی راوی نہیں)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مناسک کی ادائیگی میں ترتیب واجب ہے اور جس نے جان بوجھ کر ترتیب کو چھوڑ دیا اس پر دم واجب ہوگا۔ لیکن ترتیب کا وجوب عدم علم اور نسیان کے سبب ساقط ہو جاتا ہے۔ (یعنی اگر بھول کر یا ناواقفیت کی بناء پر ترتیب قائم نہ رہی تو پھر دم واجب نہیں ہوگا) اثرم نے آپ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بھی اسی پر دلالت کرتا ہے اور یہی قول میرے نزدیک فتویٰ کے لئے پسندیدہ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کثیر علماء سلف کا نظریہ یہ ہے کہ ترتیب سنت ہے واجب نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حلق کو رمی جمار اور قربانی کا جانور ذبح کرنے پر مقدم کرنا جائز نہیں۔ اسی کی مثل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں قربانی، رمی جمار، حلق اور تقدیم و تاخیر کے بارے عرض کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ یہ روایت متفق علیہ ہے (1)۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ قربانی کے دن منیٰ میں حضور نبی کریم ﷺ سے سوال کئے جا رہے تھے اور آپ ﷺ جواباً فرما رہے تھے کوئی ہرج نہیں۔ پس ایک آدمی نے عرض کی میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل حلق کرا لیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں، اب ذبح کر لے (2)۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا عرض کی میں نے رمی جمار سے قبل طواف زیارت کر لیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اس نے پھر عرض کی میں نے رمی جمار سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں (3)۔ طبرانی نے اس طرح روایت نقل کی ہے۔ کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے رمی جمار سے قبل بیت اللہ شریف کا طواف کر لیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اب رمی کر لو کوئی حرج نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے صراحۃً یہ ثابت ہے کہ اس نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل طواف کرنے کے بارے آپ سے سوال کیا تھا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال اس طرح کیا ہے کہ اگر ترتیب واجب ہوتی تو حضور نبی کریم ﷺ انہیں ان مناسک کے اعادہ کا حکم ارشاد فرماتے جو انہوں نے مقدم کئے تھے کیونکہ یوم نحر ان مناسک کو ادا کرنے کا وقت تھا۔ یا پھر حضور نبی کریم ﷺ انہیں جانور ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرماتے۔ (یعنی ان پر دم واجب کرتے) اور اگر آپ ﷺ نے انہیں ان میں سے کسی شئی کا حکم دیا ہوتا تو وہ بالیقین ہماری جانب نقل کیا جاتا۔ ایک تو اس لئے کہ اس واقعہ میں کثیر تعداد میں مخلوق شریک تھی اور ان میں ہر ایک مناسک کی حفاظت اور ان کی تبلیغ کا حریص تھا لیکن جب ایسی کوئی روایت منقول نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کوئی ایسا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ اور جب کوئی حکم ارشاد نہیں فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب واجب نہیں۔ کیونکہ یہ تو حاجت اور ضرورت کا وقت تھا اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 234 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

حاجت کے ہوتے ہوئے واجب کی تبلیغ ترک کرنا محال ہے۔ پس اس سے یہ معلوم ہوا کہ ترتیب واجب نہیں۔ اور جب یہ واجب نہیں تو پھر اسے عمداً ترک کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس واقعہ کے راویوں میں ایک راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حالانکہ آپ نے ہی فرمایا ہے کہ جس کسی نے مناسک میں سے کوئی شئی مقدم وموخر کی تو اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور قربانی کرے اور اگر راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہو تو وہ روایت مجروح ہوتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ راوی ایسی روایت پر مطلع ہے جو اس پہلی روایت کی ناسخ ہے۔ لیکن یہ قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تردید کے لئے کافی نہیں کیونکہ آپ کے نزدیک اگر راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہو تو وہ حدیث مجروح نہیں ہوتی۔ بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر کردہ اصول کے مطابق بھی یہ ان کے قول کو رد نہیں کرتا۔ کیونکہ راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہونے کی صورت میں روایت مجروح تب ہوتی ہے جب قول موقوف کو حدیث مرفوع کے حکم میں سمجھا جائے تو پھر وہ پہلی روایت کے ناسخ کے قائم مقام ہو جاتا ہے لیکن یہاں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ (اس لئے آپ کا قول اپنی روایت کے لئے ناسخ نہیں)

میں کہتا ہوں کہ جب تک احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہو تو ان میں سے کسی پر عمل ترک کرنے سے ان میں تطبیق کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول جو کہ مرفوع کے حکم میں ہے اور درجہ حسن تک پہنچا ہوا ہے ہم اسے عمداً ترتیب ترک کرنے پر محمول کریں گے۔ اور جس روایت سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے اسے نسیان اور عدم علم پر محمول کریں گے۔

پس ہم کہتے ہیں کہ ترتیب واجب ہے لیکن نسیان اور عدم علم کے سبب ساقط ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فوت شدہ نمازوں کے درمیان ترتیب واجب ہے لیکن نسیان کے سبب ساقط ہو جاتی ہے۔ روزے کی حالت میں (کھانے پینے وغیرہ سے) رکنا واجب ہے لیکن بھول کر کھانے پینے کے سبب یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے (اور روزہ نہیں ٹوٹتا) اسی طرح تکبیرات تشریق واجب ہیں لیکن نسیان کے سبب ساقط ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سر کا حلق کرانا واجبات احرام میں سے ہے، یہ رکن حج نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر علماء نے کہا ہے کہ یہ ارکان حج میں سے ایک رکن ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ضعیف روایت میں ہے اور امام ابو یوسف، امام احمد اور بعض اصحاب مالک نے یہ کہا ہے کہ سر کا حلق واجب نہیں بلکہ ایک امر مباح ہے۔

ہماری اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہی آیت ہے کیونکہ اس میں تفث (میل کچیل) دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے مراد حلق کرانا ہے۔ اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے لہٰذا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ رکن حج ہوا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت اگرچہ قطعی آیت طیبہ سے ہے۔ لیکن اس معنی پر آیت کی دلالت تاویل ظنی کے سبب ہے۔ کیونکہ آیت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس سے معنی کا قطعی اور یقینی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ (اسلئے یہ رکن نہیں بلکہ واجب ہے) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ سر کا حلق احرام کی پابندیوں کو ختم کر دیتا ہے (اس کے کھولنے کا سبب ہے) اور احرام حج کا رکن ہے۔ لہٰذا جس (حلق) کے سبب وہ کھل رہا ہے وہ بھی رکن ہے۔ جیسا کہ نماز میں سلام امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز کا رکن ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں حج کے لئے احرام کے شرط یا رکن ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس سے احرام کھل جاتا ہے وہ بھی رکن ہو یا شرط ہو۔

اسی طرح ہمارے نزدیک لفظ سلام کا رکن نماز ہونا بھی قابل تسلیم نہیں۔اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے سلام کو تحریمہ صلوٰۃ کی انتہا قرار دیا ہے۔اور فرمایا ہے کہ تحلیل صلوٰۃ سلام پھیرنا ہے۔پس اگر سلام نہ پایا گیا اور تحریمہ کی صورت میں کوئی ایسا عمل لایا گیا جو تحریمہ صلوٰۃ کے منافی ہو تو اس سے تحریم باطل ہو جاتی ہے حالانکہ تکبیر تحریمہ نماز کے لئے شرط ہے اور مختلف اقوال کے مطابق نماز کا رکن ہے۔پس تحریمہ باطل ہونے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔لیکن احرام حج افعال ممنوعہ کے کرنے سے باطل نہیں ہوتا۔جیسا کہ نماز کا تحریمہ باطل ہو جاتا ہے۔کیا آپ نہیں دیکھتے کہ وقوف عرفہ سے پہلے جماع کرنا فساد کا موجب ہوتا ہے اور اس پر اس حج کی قضاء واجب ہوتی ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ اس سے احرام باطل ہو جائے اور حج قائم رہے اور اس فاسد حالت میں اسے پورا کرنا اس کے ذمے لازم ہو۔(مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ احرام کے مسئلہ کو سلام کے مسئلہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اور یہ قیاس حجت نہیں)

مسئلہ: حلق راس کا اول وقت یوم نحر کی فجر ثانی سے شروع ہوتا ہے اور اکثر علماء کے نزدیک یوم نحر کی نصف رات سے شروع ہوتا ہے۔ ہماری دلیل حضرت عروہ بن مضرس کی روایت کردہ حدیث ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی ہمارے ساتھ مقام مزدلفہ میں اس فجر کی نماز میں حاضر ہوا درآنحالیکہ اس سے قبل دن یا رات کو وقوف عرفہ کر چکا ہو تو اس نے اپنا حج مکمل کر لیا اور وہ اپنا تفث دور کر لے (یعنی سر کا حلق کرا لے) اسے اصحاب سنن اربع اور حاکم نے روایت کیا ہے(1)۔اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ تمام اہل حدیث کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔لیکن بخاری و مسلم نے اسے صحیحین میں نقل نہیں کیا۔کیونکہ عروہ بن مضرس سے صرف شعبی روایت کرتے ہیں۔اور ہم نے عروہ بن زبیر کو پایا ہے کہ ان سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔

سر کے حلق کے آخری وقت کے بارے بھی اختلاف ہے۔پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ اس کے لئے کوئی آخری وقت مقرر نہیں۔پھر ائمہ کے مابین یہ بھی اختلاف ہے کہ آیا حلق کے لئے حرم پاک میں ہونا شرط ہے؟ تو اس کے بارے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ حلق کے لئے حرم پاک میں ہونا شرط نہیں۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ حلق دو اعتبار سے قابل ذکر ہے، ایک تو اس اعتبار سے کہ یہ احرام کو کھول دیتا ہے۔(یعنی اس کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں) اور دوسرا اس اعتبار سے کہ یہ مناسک حج میں سے ہے۔پس اس اعتبار سے کہ یہ احرام کو کھولنے والا ہے اس کے لئے کوئی آخری وقت معین نہیں اور نہ ہی یہ کسی معین جگہ کے ساتھ خاص ہے۔اور اس اعتبار سے کہ اس کا شمار مناسک حج میں ہے یہ یوم نحر اور حرم پاک دونوں کے ساتھ مختص ہے۔کیونکہ یہ ایک عبادت ہے جس کا ادراک رائے سے نہیں ہو سکتا۔لہٰذا اس کی انہی خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے گا جو شارع علیہ السلام نے بیان فرمائیں اور ان کے اعتبار سے اس کے لئے وقت اور جگہ دونوں متعین ہیں۔اور اس اعتبار سے یہ کہ احرام کو کھول دیتا ہے، اس امر کو رائے سے جانا جا سکتا ہے۔کیونکہ محلل (احرام کھولنے کا ذریعہ) وہی ہوتا ہے جو اپنے وقت اور محل کے بغیر کرنے سے جنایت (جرم) بن جاتا ہے۔اور سر کا حلق اسی طرح ہے۔کیونکہ اگر حلق کا وقت (یوم نحر) کے بعد ہوا اور وہ حرم پاک سے باہر کرایا جائے تو وہ احرام کو تو کھول دیتا ہے لیکن عبادت باقی نہیں رہتا۔لہٰذا واجب

1۔جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 109 (فاروقی کتب خانہ)

عبادت ترک کرنے کے سبب دم (ایک جانور کی قربانی) لازم ہوتی ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ذبح کرلو کوئی حرج نہیں۔ آپ ﷺ نے یہ اسے فرمایا تھا جس نے یہ عرض کی تھی۔ میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے حلق کرا لیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے بذات خود حدیبیہ کے سال مقام حدیبیہ پر حلق کرایا اور یہ مقام حل میں داخل ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ جس آدمی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں عرض کیا تھا کہ میں نے ذبح سے پہلے حلق کرا لیا ہے تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اب ذبح کرلو کوئی حرج نہیں۔ یہ عدم علم اور نسیان کے سبب ترتیب ساقط ہونے کا بیان ہے۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد تعیم زمان کے لئے نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے سوال کے وقت ابھی نحر کا دن باقی تھا کیونکہ اس نے نحر کے دن ظہر کے بعد یہ دریافت کیا تھا۔

رہا مسئلہ یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر حلق کرا دیا تھا تو اس کے بارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ حلق عبادت نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا تاکہ قطعی واپسی کا تمام کو علم ہو جائے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک محصر پر حلق واجب نہیں۔

میرے نزدیک اس کا جواب اس طرح ہے کہ محصر (جسے راستے میں روک لیا جائے) معذور ہوتا ہے لہٰذا اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ محصر کے لئے وقت داخل ہونے سے قبل حلق کرانا جائز ہے لیکن غیر محصر کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں' اس پر اجماع ہے۔ اسی طرح جگہ کا حکم بھی ہے۔ (کہ محصر جہاں ہو وہیں حلق کرا سکتا ہے، جبکہ غیر محصر کے لئے حرم کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے محصر پر غیر محصر کو قیاس نہیں کیا جا سکتا)

ہمارے نزدیک حلق کے لئے حرم پاک کا ہونا شرط ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ اس کی تفسیر عنقریب آئے گی۔ اور یہ ارشاد ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ اس آیت میں حلق کرانے اور بال ترشوانے کو دخول مسجد کے خواص میں سے قرار دیا ہے۔ اور اسلاف کا طریقہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ و تابعین وغیرہ تمام حج کے موقع پر منیٰ میں حلق کراتے رہے اور عمرہ کے موقع پر مروہ کے قریب۔ اور یہ دونوں مقام حرم پاک میں داخل ہیں۔

مسئلہ: حلق اور قصر کی واجب مقدار میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس وقت تک احرام نہیں کھل سکتا جب تک محرم سارے سر کا حلق یا قصر نہ کرالے۔ (قصر سے مراد بال ترشوانا ہے)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ چوتھائی سر کا حلق یا قصر کافی ہوتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ایک بال یا تین بالوں کا حلق یا قصر کافی ہوتا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ اس آیت سے قضاء تفث (حلق کرانا وغیرہ امور) کا وجوب ثابت ہے لیکن بالا جماع قضاء تفث واجب نہیں کیونکہ قصر (بال ترشوانا) جائز ہے۔ اور قصر کے سبب بعض میل کچیل دور ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض تفث کی قضاء ایک یا تین بال ترشوا دینے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جو کوئی ایک یا تین بالوں کا حلق کرا دے تو اسے عرب میں یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں نے اپنے سر کا حلق کرا دیا یا اس نے اپنے تفث (میل کچیل) کو دور کر دیا۔ لہٰذا اس کے لئے شرعاً ایک معین مقدار کا ہونا ضروری

ہے۔ چنانچہ شریعت نے وضو میں چوتھائی سر کو پورے سر کے قائم مقام قرار دیا ہے اس لئے چوتھائی سر کا مسح فرض قرار دیا اور بقیہ تمام اعضاء کو مکمل طور پر دھونا واجب قرار دیا۔ جیسا کہ ہم نے اس کی تحقیق سورۂ مائدہ کی آیت وضو کے ضمن میں ذکر کر دی ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ میں کہتے ہیں کہ چوتھائی سر کا حلق یا قصر ضروری ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ چوتھائی سر پورے سر کے قائم مقام ہے، ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان ائمہ کے نزدیک وضو کے دوران مکمل سر کا مسح کرنا فرض ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی یہ مروی نہیں کہ انہوں نے بعض سر کے حلق یا قصر کو کافی قرار دیا ہو۔ (لہٰذا مکمل سر کا حلق یا قصر کرانا لازم اور ضروری ہے۔

مسئلہ: بالا جماع حلق کرانا قصر کرانے کی نسبت افضل ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی؟ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرمایا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر فرمایا اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ کرام نے پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی۔ تب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی فرمایا۔ قصر کرانے والوں پر بھی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا قصر کرانے والوں پر بھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث مروی ہے اور یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں (1)۔

۲۔ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ۔ چاہئے کہ وہ اپنی نذریں پوری کریں۔ اس میں ابن ذکوان نے لام کو مکسور پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ ابوبکر نے لیوفو ا پڑھا ہے، اس میں فاء مشددہ ہے اور باب تفعیل ہے، جبکہ باقیوں نے باب افعال سے فاء مخففہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔

ایفائے نذر کا مفہوم بعض نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جو کچھ آدمی کے ذمے واجب ہوا ہے ادا کرنا چاہئے، اس کی نذر مان رکھی ہو یا بغیر نذر کے واجب ہو۔ کیونکہ جو آدمی اپنے ذمے سے واجب ادا کر دے عرب اس کے لئے بولتے ہیں وفیٰ بنذرہ۔

جمہور کے نزدیک نذر سے مراد آدمی کا اپنی ذات پر ایسی شئی کو واجب کرنا ہے جو اس پر واجب نہ ہو۔ پھر نذر کی دو قسمیں ہیں۔ (1) نذر منجز (غیر مشروط) مثلاً کوئی یہ کہہ دیتا ہے۔ قسم بخدا مجھ پر دو رکعت نماز پڑھنا لازم ہے۔ (2) نذر معلق (ایسی نذر جو کسی شرط کے ساتھ معلق ہو۔ پھر اس نذر معلق کی دو صورتیں ہیں۔

اگر اس میں شرط پسندیدہ اور اچھی ہو مثلاً کوئی یہ کہے اگر اللہ تعالیٰ نے میرے مریض کو شفاء عطا فرمائی یا میرا غائب واپس آ گیا تو مجھ پر اتنے روزے لازم ہیں۔ تو اس کا نام نذر تردد ہے۔

اور اگر شرط مکروہ اور ناپسندیدہ ہو مثلاً اگر میں زید سے کلام کروں تو مجھ پر حج لازم ہے تو اس کا نام نذر لطیاح ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ نذر سے مراد ایسی شئی کو اپنے ذمے واجب کرنا ہے جو اصلاً واجب نہ ہو۔ تو پھر اگر کسی نے (نذر کی صورت میں) ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کیا جو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر واجب ہو تو یہ نذر نہیں ہوگی بلکہ محض خبر ہوگی۔ مثلاً قسم بخدا! رمضان المبارک کے

۱۔ صحیحین (بخاری) جلد 1 صفحہ 233 (...) تعلیمی)

روزے رکھنا یا ظہر کی نماز ادا کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو ایسی صورت میں نہ تو اس پر نذر کا حکم مرتب ہوگا اور نہ ہی واجب کا، وصف اور مقدار آدمی کے تبدیل کرنے سے تبدیل ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی نے یہ کہا قسم بخدا دوسو درہم میں سے دس درہم زکوۃ ادا کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو اس صورت میں اس پر صرف پانچ درہم ہی لازم ہوں گے (جو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ ہیں) یا قسم بخدا ظہر کی چھ رکعت نماز مجھ پر لازم ہے۔ یا قسم بخدا! مجھ پر لازم ہے کہ میں ہر فرض نماز تازہ وضو کے ساتھ یا جماعت کے ساتھ ادا کروں گا۔ تو ان صورتوں میں ظہر کی نماز چار رکعت ہی ہوگی۔ بغیر تازہ وضو کے وضو کی حالت میں نماز جائز ہوگی۔ اسی طرح جماعت کے بغیر انفرادی حالت میں بھی نماز درست ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان قیود کے بغیر بھی نماز کو جائز قرار دیا ہے اور اگر ہم اس طرح نماز کو جائز تصور نہ کریں تو اس سے احکام الٰہی میں سے ایک حکم کو نسخ کرنا لازم آئیگا۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ ان قیود کے بغیر نماز جائز ہے تو پھر ایسی نذر کا کوئی فائدہ نہیں جس کے ذریعے ان امور کو اپنے ذمے واجب کیا جائے کیونکہ ان چیزوں کے مستقل نہ ہونے کی وجہ سے مثل معقول (کفارہ ادا کرنا) کے ساتھ نذر کو پورا کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی مثل معقول (قربانی کرنا) کے ساتھ ادائیگی ممکن ہے کیونکہ یہ تب ممکن ہوتی ہے جب شریعت کی جانب سے اس کا ثبوت ہو۔ اور شریعت کی جانب سے یہ ثابت نہیں۔ اور یہی معنی ہے علی کے اس قول کا کہ نذر کے سبب کسی شئی کے وجوب کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ طاقت مقصودہ ہو اور مستقل بذات ہو۔ لیکن اگر کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی پھر راستے میں وہ سوار ہوا تو پھر بطور کفارہ ایک جانور کی قربانی اس کے ذمہ لازم ہوگی کیونکہ شریعت کی جانب سے اس کی تعیین کی گئی ہے۔

جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس میں یہ اشکال بہر حال موجود ہے کہ جس نے دوسو درہم میں سے دس درہم زکوۃ ادا کرنے کی نذر مانی تو اس کی یہ توجیہہ ممکن ہے کہ ان میں پانچ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر واجب ہیں اور پانچ وہ ہیں جو نذر کے سبب اس نے اپنے ذمہ لازم کئے ہیں۔ تو اس سے حکم الٰہی کا نسخ تو لازم نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

وہ امور جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب نہیں (مگر آدمی نذر کے سبب انہیں اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے) ان کی تین اقسام ہیں۔ (1) امر طاعت (2) امر معصیت (3) امر مباح جس میں نہ طاعت کا معنی ہوتا ہے اور نہ ہی عصیاں (نافرمانی اور گناہ) کا۔

اگر نذر امر طاعت کے بارے ہو تو اس کام کے ذریعے اس نذر کو پورا کرنا بالاجماع واجب ہے۔ اس آیت میں اسی نذر کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول اور ضابطہ کے مطابق یہ نذر فرض اور قطعی نہیں۔ کیونکہ یہ ایسی آیت سے ثابت ہے جو عام مخصوص عنہ البعض ہے (اور ایسا عام فائدہ ظن کا دیتا ہے) لہٰذا یہ آیت ظنی الدلالۃ ہے۔ (اس لئے اس نذر کا ایفاء واجب ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق فرض ہے۔ کیونکہ جب اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے تو جس مقدار پر اجماع منعقد ہے اتنی مقدار میں یہ امر قطعی ہو چکا ہے۔ (اور امر قطعی الدلالۃ سے فرض ثابت ہوتا ہے) پھر نذر طاعت اگر منجز ہو تو اس سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں (بلکہ اسے پورا کرنا لازم اور ضروری ہے) ہاں اگر اسے پورا کرنے کی قوت اور طاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اس میں کفارہ قسم ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ نذر کسی شرط کے ساتھ معلق ہو اور پھر وہ شرط پائی جائے۔ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کے نزدیک اس کا حکم بھی نذر منجز کی طرح ہے کیونکہ آپ کے نزدیک نذر معلق بالشرط نذر منجز کی مثل ہے۔ گویا یہ اسی طرح ہے کہ جب شرط پائی گئی تو اس نے کہا قسم بخدا! مجھ پر ایسا کرنا لازم ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے اپنے وصال سے سات دن قبل اس موقف سے رجوع فرما لیا تھا اور فرمایا

کہ جب نذر معلق باشرط ہو تو حالف کو اختیار ہے چاہے تو بعینہ نذر کو پورا کرے اور چاہے تو کفارہ قسم ادا کرے۔ یہی قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ پس اگر اس (حالف) نے یہ کہا۔ اگر میں اس طرح کروں تو مجھ پر حج لازم ہے یا ایک سال کے روزے ہیں۔ اس صورت میں اگر وہ چاہے تو اپنی نذر پوری کرے اور اگر چاہے تو تین دن روزے رکھے۔ پہلا قول امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب ہے۔ اور اختیار والا قول نوادر میں ہے۔ (ظاہر مذہب سے مراد یہ ہے کہ آپ کا یہ قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی چھ کتابوں (الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، زیارات اور مبسوط) میں سے کسی میں ہے۔ اور نوادر سے مراد یہ ہے کہ یہ قول ان چھ کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہے) ظاہر مذہب کی دلیل یہ آیت اور متعدد احادیث ہیں۔ اور قول نوادر کی وجہ وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ کفارہ یمین ہی ہے (1)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ کفارہ ادا کرنے کے ساتھ نذر مطلقاً ساقط ہو جاتی ہے۔ پس اس طرح نصوص کے مابین تعارض آ جاتا ہے۔ لہٰذا وہ نصوص جو بعینہ نذر پورا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر منجز پر محمول کیا جائے گا اور جو کفارہ کے سبب نذر کے سقوط کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر معلق پر محمول کیا جائے گا۔ دونوں کے مابین وجہ فرق یہ ہے کہ نذر معلق فی الحال موجود نہیں ہوتی گویا اس میں نذر معدوم ہوتی ہے جب تک شرط نہ پائی جائے۔ اس لئے یہ قسم کی طرح ہی ہے کیونکہ جب تک قسم کو توڑا نہ جائے تب تک کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ گویا وہ بھی قسم کی گفتگو کرتے وقت معدوم ہوتا ہے۔ چنانچہ نذر معلق کا حکم قسم کی طرح ہی ہوگا۔ مگر نذر منجز اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ یہ اپنے وقت میں ثابت ہو جاتی ہے (یعنی فی الحال ثابت ہوتی ہے) لہٰذا وہ احادیث جن میں نذر کو بعینہ پورا کرنے کا حکم ہے ان پر نذر منجز کی صورت میں عمل کیا جائے گا۔

صاحب ہدایہ اور دیگر محققین علماء احناف کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ وہ نذر معلق جس میں نذر ماننے والے کو اختیار ہوتا ہے اس سے مراد نذر لجاج ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ وجود شرط چاہتا ہی نہیں۔ گویا وہ نذر کے وجوب کا ارادہ ہی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ فعل شرط کو اس میں مانع بنا دیتا ہے۔ کیونکہ انسان نہیں چاہتا کہ عبادات اس پر ہمیشہ واجب رہیں اگر چہ ان سے ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ اسے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں عبادت اس پر ثقیل ہو جائے (اور وہ اپنی غفلت کے سبب اسے ادا نہ کر سکے) اور پھر وہی عبادت اس کیلئے موجب سزا ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ نذر خیر (بھلائی) نہیں لاتی۔ بالخصوص جبکہ نذر ایسی عبادت کے بارے ہو جو آدمی پر شاق گزرتی ہے۔ مثلاً حج اور سال بھر کے روزے وغیرہ لیکن نذر تردد کا حکم یہ ہے کہ اسے بعینہ اس فعل کے ساتھ پورا کرنا لازم ہوتا ہے۔ جس کی نذر مانی گئی ہو۔ کیونکہ اس میں آدمی جب وجود شرط کا ارادہ کرتا ہے تو وہ ساتھ ہی وجود نذر کا بھی ارادہ کرتا ہے۔ پس یہ نذر معلق نذر منجز کے معنی میں ہے۔ لہٰذا یہ اسی کے حکم میں داخل ہوگی۔ یعنی بعینہ نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ اس سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ روایات جو بعینہ نذر کو پورا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر لجاج پر محمول کیا جائے گا۔ اس بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ یہی وہ تفصیل ہے جسے صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے۔ اور المنہاج میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اظہر قول بھی اسی طرح ہے۔ لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول اس طرح ہے کہ نذر لجاج کی صورت میں فقط کفارہ واجب ہوتا ہے۔ اور ایک قول اس طرح بھی ہے کہ ایسی صورت میں صرف نذر کو پورا کرنا ہی واجب ہے۔ کفارہ کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (ق، ک، ر)

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر کے سبب کسی شئی کے واجب ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شئی ایسے واجب کی جنس سے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ (مثلاً حج، نماز اور روزے وغیرہ کی نذر ماننا) منھاج میں ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر طاعت کی نذر ماننے کے سبب اس کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے اگر چہ وہ ایسے واجب کی جنس میں سے نہ بھی ہو جو اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ مثلاً مریض کی عیادت کرنا، جنازے اور سلام میں شریک ہونا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اعتکاف نذر کے سبب بالا جماع واجب ہو جاتا ہے حالانکہ یہ ایسے واجب کی جنس سے نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب ہو۔ (اور اگر یہ کہا جائے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے اور رمضان المبارک کے روزے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ ہیں۔ چنانچہ اعتکاف اسی واجب کی جنس سے ہے) تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اعتکاف کے لئے روزے کا شرط ہونا قابل تسلیم ہی نہیں۔ اور اگر ہم تسلیم کر بھی لیں تو بھی اعتکاف کی بعض شرائط کا اس واجب کی جنس سے ہونا ثابت ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ تو فقط اتنے سبب سے نذر کا لازم ہونا یہ تقاضا کرتا ہے کہ نذر کے سبب ہر قربت (عبادت) لازم ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ عبادت مقصودہ ہو یا غیر مقصودہ کیونکہ ہر عبادت اور قربت کے لئے اسلام اور اخلاص بنیادی شرطیں ہیں اور یہ دونوں ایسے فرض ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نذر کے سبب اعتکاف کا وجوب نذر کے سبب واجب ہونے والے روزے کے تابع ہے۔ (یعنی نذر کے سبب اعتکاف کا وجوب نذر کے سبب واجب ہونے والے روزے کے تابع ہے۔ (یعنی نذر کے سبب اعتکاف واجب تب ہوگا جب اس کے ساتھ نفلی روزہ بھی ہو) تو پھر اس سے یہ لازم آئے گا کہ اگر کسی نے رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو وہ اعتکاف اس پر واجب نہیں ہوگا۔ (کیونکہ رمضان المبارک کے روزے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہیں، ان کی موجودگی میں نذر کے سبب واجب ہونے والا روزہ ادا نہیں ہو سکتا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کا وجوب نذر مانے ہوئے روزے کے وجوب کے تابع نہیں۔ کیونکہ رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر ماننا اور پھر اسے ادا کرنا درست اور صحیح ہے۔) واللہ اعلم۔

مسئلہ: جب کوئی آدمی نذر طاعت کو اپنے معینہ اوقات میں پورا نہ کر سکے تو جمہور کے نزدیک اس پر اس کی قضاء واجب ہے۔ (یعنی اور دنوں میں اسے ادا کرنا اس کے ذمے لازم ہے۔) اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا اس صورت میں اس پر کفارہ یمین بھی واجب ہوگا یا نہیں؟

اس بارے حضرت سفیان ثوری نے یہ کہا ہے کہ اس پر قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر نذر ماننے والا قسم کی نیت نہ کرے اور صیغہ نذر سے گفتگو کرے چاہے نذر کی نیت کرے یا نہ کرے تو اس پر قضاء واجب ہوگی مگر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

اور اگر اس نے قسم کی نیت کی اور نذر کی نفی کر دی تو اس صورت میں کفارہ قسم واجب ہوگا، نذر کی قضاء لازم نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے قسم کی نیت کی تو اس صورت میں قضاء اور کفارہ دونوں اس پر واجب ہوں گے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ پہلی صورت میں یہ قسم ہے لہٰذا اس پر قضاء کے بغیر صرف کفارہ قسم واجب ہوگا۔ گویا اس نے صیغہ نذر سے مجازاً قسم کی نیت کر لی ہے۔

اور دوسری صورت میں وہ نذر ہوگی لہٰذا اس پر کفارہ کے بغیر صرف نذر کی قضاء واجب ہوگی کیونکہ جب ایک لفظ سے حقیقت اور مجاز

دونوں معنی مراد لئے جاسکتے ہوں تو حقیقت مجاز سے ارجح ہوتی ہے اور حقیقت و مجاز دونوں کو جمع کرنا بھی ممنوع ہوتا ہے۔

سفیان ثوری کے قول کا سبب یہ ہے کہ چونکہ اس نے ایسے صیغہ کے ساتھ نذر مانی ہے جو نیت کا محتاج نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں اگر وہ نذر کی نفی کر بھی دے تو بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ صیغہ نذر انشاء ہے جیسا کہ نکاح، طلاق، رجعت اور اعتاق وغیرہ۔ (لہٰذا جب صیغہ انشاء استعمال کیا جائے تو پھر اس کے حقیقی معنی کی نفی نہیں ہوسکتی۔) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جنہیں سنجیدگی سے لیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں اور اگر غیر سنجیدگی اور تمسخر وغیرہ کی حالت میں لیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں اور وہ ہیں نکاح، طلاق اور رجعت (1)۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے طلاق دی اس حال میں کہ وہ کھیل رہا ہو (یعنی مزاحیہ انداز میں اس نے طلاق دی) تو اس کی طلاق جائز ہے (واقع ہو جائیگی) اور جس کسی نے کھیل کے انداز میں (اپنے غلام کو) آزاد کیا تو اس کی آزادی جائز ہے (وہ واقع ہو جائے گی) (2)

ابن عدی نے الکامل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جن میں کھیل (مزاح) کا کوئی تصور نہیں۔ جس کسی نے کھیل کے انداز میں ان میں سے کسی کے بارے گفتگو کی تو وہ اس پر واجب (ثابت) ہو جائے گی۔ اور وہ ہیں طلاق، عتاق اور نکاح۔

عبدالرزاق نے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ ان دونوں نے فرمایا تین چیزوں میں کھیل (فراح) نہیں ہے۔ نکاح، طلاق اور عتاق۔ اور انہی سے ایک روایت میں چار چیزوں کا ذکر ہے اور چوتھی چیز نذر ہے اور نذر اپنے مقتضیٰ کے مطابق قسم ہوتی ہے کیونکہ اس میں وہ چیز جو واجب نہ ہو اسے اپنے اوپر واجب کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ چیز جو حرام نہ ہو اسے اپنے اوپر حرام کرنے سے قسم لازم آتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۝

پس اس سے معلوم ہوا کہ نذر کے قسم ہونے کے لئے نیت لازم نہیں (بلکہ اس میں بذات خود قسم کے معنی موجود ہیں) اور نہ ہی نذر میں قسم کے معنی کی نفی کرنے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اگر کسی نے اپنے قریبی (باپ یا بیٹے وغیرہ) کو خرید لیا تو خریدنے کے ساتھ ہی آزادی لازم ہو جائے گی، نہ اس میں آزادی کی نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور نہ ہی خریدتے وقت اس کی نفی کرنے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز حرام نہ ہو اسے اپنے اوپر حرام کرنے سے مطلقاً قسم لازم نہیں آتی۔ مثلاً طلاق کے سبب مطلقہ بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ عتاق کے سبب آزاد ہونے والی لونڈی حرام ہو جاتی ہے اور بیع سے بائع پر مبیع حرام ہو جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی صورت میں بھی قسم واقع نہیں ہوتی۔ لیکن جب تحریم میں بالارادہ قسم کی نیت پائی جائے تو پھر قسم ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ماریہ اور شہد کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے حرام کیا تھا۔ گویا ارشاد باری تعالیٰ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ میں تحریم قصدی کا ذکر ہے، تحریم التزامی کا نہیں۔ اور جب تحریم میں قسم کی نیت نہ ہو تو پھر وہ اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوتے ہوئے نذر ہوگی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 142 (فاروقی) 2۔ مصنف عبدالرزاق: 10249 (المکتب الاسلامی)

چاہے وہ نذر کی نیت کرے یا نہ کرے۔ اور جب قسم کی نیت ہو اور نذر کی نفی ہو تو وہ صرف قسم ہوگی۔ گویا اس صورت میں یہ اپنے مجازی معنی پر محمول ہوگی۔ لیکن جب قسم کی نیت ہو اور نذر کی نفی نہ ہو۔ چاہے نذر کی نیت ہو یا نہ ہو تو وہ اپنے صیغہ کے اعتبار سے نذر ہوگی اور اپنے مقتضیٰ (معنی) کے اعتبار سے قسم ہوگی۔ واللہ اعلم۔

فصل: نذر کی دوسری قسم نذر بالمعصیۃ (گناہ اور معصیت کی نذر ماننا) ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (1) ایسے عمل یا شئی کی نذر ماننا جس کا کوئی فرد بھی معصیت سے خالی نہ ہو۔ مثلاً شراب نوشی اور زناکاری کی نذر ماننا وغیرہ۔ تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ جب آدمی ایسی نذر سے قسم کا ارادہ کرے تو نذر منعقد ہو جائے گی۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کرے۔ اور اگر ایسی نذر میں قسم کا ارادہ نہ ہو تو نذر منعقد نہیں ہوگی، کلام لغو ہو جائے گا کیونکہ اس کے انعقاد میں کوئی فائدہ نہیں۔ اور بالا جماع اس آیت کریمہ سے ایسی نذر مراد نہیں اور نہ اسے پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائی کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

لیکن امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی نذر منعقد ہو جائے گی لیکن کفارہ قسم کی ادائیگی واجب ہوگی چاہے وہ قسم کی نیت کرے یا نہ کرے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اکثر مشائخ حنفیہ کا یہی موقف ہے۔ اسی طرح امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ اگر کسی نے نذر کی نسبت معاصی کی طرف کی مثلاً یہ کہا قسم بخدا فلاں کو قتل کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو وہ قسم ہوگی۔ اور اس پر اسے توڑ کر کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب لفظ کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرنا متعذر ہو تو پھر اسے مجازی معنی پر محمول کرنا واجب ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ معصیت کی نذر نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب آدمی اس سے قسم کی نیت کرے۔ (تب کفارہ قسم لازم ہوگا)

دوسری قسم ایسی معصیت کی نذر ماننا ہے جس کی جنس سے ایسی طاعت (عبادت) موجود ہو جو معصیت سے پاک ہو۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنے کی نذر ماننا اور طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنے کی نذر ماننا وغیرہ۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر کی یہ قسم منعقد ہو جاتی ہے۔ البتہ آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ عید کے دن روزہ نہ رکھے اور بعد میں اس کی قضاء کر لے۔ اس صورت میں اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھ لیا تو وہ بھی جائز ہوگا۔ اور اگر اس صورت میں قسم کی نیت ہو اور نذر کی نفی ہو تو پھر آدمی پر قسم کا کفارہ لازم ہوتا ہے۔ اور اگر قسم کی نیت کے ساتھ ساتھ نذر کی نفی نہ کی ہو تو نذر کی قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ جیسا کہ نذر طاعت کے بیان میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ عید کے دن روزہ نہ رکھے، بعد میں اس کی قضاء بھی کرے اور کفارہ بھی ادا کرے۔ اور اگر اس نے روزہ رکھا تو وہ بھی جائز نہیں ہوگا۔ اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اگر اس نے روزہ رکھ لیا تو وہ جائز ہوگا۔ (یعنی نذر پوری ہو جائے گی)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ نذر بالمعصیت کی پہلی قسم کی طرح یہ نذر بھی منعقد نہیں ہوگی کیونکہ دو معصیتوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور وہ شئی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو وہ بندے کے واجب کرنے سے واجب نہیں ہوتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ فرق یہ ہے کہ آدمی نے (بنیادی طور پر) روزے کی نذر مانی ہے اور روزہ اصلاً مشروع ہے۔ اور عید کے دن رکھنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار لازم آتا ہے۔ (گویا عید کے دن روزہ مشروع باصلہ ہے اور ممنوع لغیرہ ہے) لہٰذا اس کی نذر منعقد ہو جائے گی لیکن اس دن روزہ نہ رکھنا لازم ہے تاکہ آدمی روزہ سے متصل معصیت سے محفوظ رہ سکے۔ اور جو روزہ نذر کے سبب آدمی کے ذمے واجب ہوا تھا اسے ساقط کرنے کے سبب اس کی قضاء واجب ہوگی۔ لیکن اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھ لیا تو وہ اپنی نذر سے بری الذمہ ہو جائے گا کیونکہ جیسے اس نے اسے اپنے اوپر لازم کیا تھا اسے ویسے ہی ادا کر دیا۔

مذکورہ اختلاف کا دارومدار ایک اصولی اختلاف پر ہے اور وہ یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک افعال شرعیہ سے نہی قبح لغیرہ کو ثابت کرتی ہے لیکن اصلاً وہ افعال مشروع باقی رہتے ہیں۔ (یعنی اگر مشروع افعال سے کسی فعل سے روک دیا جائے تو اس کا سبب وہ خارجی امر ہوتا ہے جو فعل مشروع سے مل کر اس کے لئے قبح اور معصیت کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن اس سے فعل مشروع کا ذاتی اور اصل حکم باطل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ باقی رہتا ہے) جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ افعال شرعیہ سے نہی ان کی ذات میں قبح ثابت کرتی ہے۔ جس کے سبب وہ مشروع باقی نہیں رہتے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نذر منعقد ہو جاتی ہے اس لئے کہ وہ فعل طاعت ہے۔ نہ کہ اس لئے کہ وہ فعل معصیت ہے۔ لہٰذا اس نذر کے سبب اس پر کامل روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھا تو وہ ادا نہیں ہوگا۔ (کیونکہ وہ کامل نہیں) اور کثیر ایسے افعال ہیں جنہیں اپنے وقت پر ادا کرنا حرام ہوتا ہے لیکن ان کی قضاء لازم ہوتی ہے۔ مثلاً حائضہ عورت کے لئے رمضان المبارک کا روزہ اپنے وقت پر ادا کرنا حرام ہے لیکن بعد میں اس کی قضاء لازم ہے اور اگر اس نے اپنے وقت پر (حالت حیض میں) روزہ رکھ لیا تو اس کے ذمے سے فرض ادا نہیں ہوگا۔

فصل: تیسری قسم کسی امر مباح کو ترک کرنے کی نذر ماننا ہے تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا ہے کہ ایسی نذر لغو ہوتی ہے، وہ منعقد نہیں ہوتی مگر جبکہ اس میں قسم کی نیت ہو تو پھر قسم پوری نہ کرنے کی صورت سے کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایسی نذر کو پورا کرنا اس پر واجب نہیں ہوتا البتہ اس سے قسم منعقد ہو جاتی ہے۔ چاہے قسم کی نیت کرے یا نہ کرے۔ پس اگر قسم کو توڑے گا تو اس پر کفارہ قسم لازم ہوگا۔ یہی آپ کا راجح قول ہے۔ اسی طرح المنہاج میں ہے۔ اور اس کا سبب وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے، یعنی جب لفظ کو حقیقی معنی پر محمول کرنا متعذر ہو تو اسے مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایسی صورت میں مجازی متعین ہو جاتا ہے۔ (اور وہ قسم ہے کیونکہ جو چیز واجب نہ ہو اسے واجب قرار دینا تحریم مباح ہے اور تحریم مباح قسم ہے) میں کہتا ہوں کہ یہ حجت وہی پیش کر سکتا ہے جو اس کا قائل ہو کہ تحریم مباح قسم ہے۔ واللہ اعلم۔

اب ہم ان احادیث میں سے چند کا ذکر کریں گے جو مذکورہ بالا اقوال کے لئے شاہد ہیں تاکہ ان میں سے راجح اور مرجوع قول کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری بجالانے کی نذر مانی تو اسے چاہئے کہ وہ اطاعت بجالائے اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانی تو

اسے چاہئے کہ معصیت کا ارتکاب نہ کرے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے نذر صرف وہی ہوتی ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس آدمی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے نقل کیا ہے جس نے دھوپ میں کھڑے رہنے کی نذر مانی تھی۔ اور امام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرے واقعہ میں اسے نقل کیا ہے۔ اور ابوداؤد نے بھی اس نوع کی حدیث نقل کی ہے۔ ان احادیث کا عموم اس پر دلالت کرتا ہے کہ نذر بالطاعت منعقد ہو جاتی ہے چاہے اس کی جنس سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ کوئی واجب ہو یا نہ ہو۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معصیت کی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں اور نہ ہی ایسی نذر کو پورا کرنا لازم ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

ابوداؤد نے عمرو بن شعیب سے ان کے باپ اور دادا کے واسطہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ ابن آدم کے لئے ایسی شئی کی نذر نہیں جس کا وہ خود مالک نہیں(3)۔ اسی حدیث کی وجہ سے علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ اگر میں نے اس طرح کیا تو میرے مال میں سے ہزار درہم صدقہ ہوں گے۔ پھر اس نے وہ کام کر دیا۔ لیکن اس کی ملکیت میں صرف سو درہم ہیں۔ تو اس صورت میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح قول یہ ہے کہ اس پر صرف اتنا مال صدقہ کرنا لازم ہوگا جس کا وہ مالک ہے کیونکہ جس مال کا وہ مالک ہی نہیں (اسکی نذر نہیں ہوگی) کیونکہ نذر کی نسبت نہ ملکیت کی طرف ہوتی ہے اور نہ سبب ملکیت کی طرف۔

مسئلہ: کسی نے یہ کہا کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی مال نہیں تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا قسم بخدا مجھ پر لازم ہے کہ میں یہ بکری بیت اللہ شریف میں قربانی کروں گا اور اس نے اشارہ کسی دوسرے آدمی کی بکری کی طرف کیا (جس کا یہ خود مالک نہیں) تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(4) اور طبرانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ نذر قسم ہے اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ یہ حدیث بھی اپنے عموم کے سبب اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ: جس نے نذر مانی اور پھر اسے پورا نہ کیا چاہے اس لئے کہ وہ معصیت کی نذر ہونے کی بناء پر شرعاً ممنوع تھی یا وہ طبعاً ممنوع تھی یعنی ایسی چیز کی نذر تھی جسے پورا کرنا اس کی طاقت میں نہ تھا مثلاً ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھنے کی نذر۔ یا وہ اس کی طاقت تو رکھتا تھا لیکن اس کا وقت گزر چکا تھا اور اب اس کا تدارک ممکن نہیں یا تو اس لئے کہ وہ مباح الترک تھی یا جسکی نذر مانی تھی وہ شئی معین نہیں تھی مثلاً یوں کہا گیا اللہ کیلئے مجھ پر نذر ہے تو اس صورت میں اس پر قسم کا کفارہ واجب ہوگا۔ چاہے اس نے قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو قسم کی نیت کرنے کی صورت پر محمول کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے نذر مانی اور منذور بہ شئی کو معین نہ کیا تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ جس کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 991 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)

نے معصیت کی نذر مانی تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔ جس نے ایسی نذر مانی جسے پورا کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔ اور جس نے ایسی شئی کی نذر مانی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی نذر کو پورا کرے (1)۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور بعض نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف قرار دیا ہے۔ اور یہ حدیث سابقہ حدیث کا بیان ہے۔

مسئلہ: وہ آدمی جس نے نذر طاعت مانی۔ اور وہ اسے پورا کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو پھر اس کے لئے نذر سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں۔ اور اگر اس نے کفارہ ادا بھی کر دیا تو وہ نذر کی جانب سے کافی نہیں ہوگا۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا معصیت کی نذر (جائز) نہیں اور اسکا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ اسے نسائی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اپنے مطلق ہونے کے سبب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اس موقف کے لئے حجت ہے کہ معصیت کی نذر منعقد ہو جاتی ہے اور کفارہ واجب ہوتا ہے۔ لیکن اس کی سند اس طرح ہے کہ اسے محمد بن زبیر حنظلی نے اپنے باپ سے اور وہ عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں تو اس میں محمد بن زبیر راوی قوی نہیں۔ اس کی روایت کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ اسی حدیث کو ابن مبارک نے عبدالرزاق سے اور انہوں نے محمد کے باپ زبیر سے اسے روایت کیا ہے۔ حافظ نے اس کے بارے کہا ہے کہ یہ حدیث ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے جس میں سند صحیح ہے مگر معلول ہے۔ اسی حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب سنن، اور بیہقی نے زہری سے، انہوں نے ابوسلمہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن یہ سند منقطع ہے کیونکہ زہری کا ابوسلمہ سے سماع ثابت نہیں۔

ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو اس سند سے روایت کیا ہے۔ عن سلیمان بن بلال عن موسیٰ بن عقبہ و محمد بن عتیق عن زہری عن سلیمان بن ارقم عن یحییٰ بن کثیر عن ابی سلمہ عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نسائی نے کہا ہے کہ اس سند میں سلیمان بن ارقم راوی متروک ہے۔ اس میں یحییٰ بن کثیر کے کئی اصحاب نے ان سے مخالفت کی ہے اور انہوں نے یحییٰ بن کثیر کے واسطہ سے محمد بن زبیر حنظلی سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے عمران سے یہ روایت نقل کی ہے۔ پس اس طرح یہ سند اس پہلی روایت کی طرف ہی لوٹ آئی جو اس سے قبل بیان ہو چکی ہے۔

حافظ نے کہا ہے کہ عبدالرزاق نے اس حدیث کو معمر عن یحییٰ بن کثیر عن رجل من بنی حنیفہ وابی سلمہ کی سند سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ بنی حنیفہ کے آدمی سے مراد محمد بن زبیر ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ان کا بنی حنیفہ کہنا غلطی ہے کیونکہ ان کا تعلق بنی حنظلہ سے تھا۔ اس کی ایک اور مرفوع سند بھی ہے جس کے ساتھ یہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے

دار قطنی، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اسے غالب بن عبداللہ الجوزی عن عطاء کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس نے اپنے لئے معصیت کی نذر مانی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔ اس میں غالب بن عبداللہ راوی متروک الحدیث ہے۔ اس حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے کہ ابوداؤد نے اسے کریب کے واسطہ سے حضرت ابن

1۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 128 (وزارت تعلیم)

عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔اس کی اسناد حسن ہے لیکن اس میں بھی طلح بن یحییٰ راوی مختلف فیہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث باتفاق محدثین ضعیف ہے'' معصیت کی نذر (جائز) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔'' حافظ نے کہا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوعلی بن سکن نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اور پھر کہا ہے کہ اس پر محدثین کا اتفاق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الجامع الصغیر میں اس حدیث پر صحت کی علامت لکھی دی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کا موقف ہے کہ نذر معصیت کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ آپ نے اپنے اس قول میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ نذر دو طرح کی ہوتی ہے پس جس نے نذر بالطاعۃ مانی تو وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی اور اسے پورا کرنا لازم ہے اور جس کسی نے معصیت کی نذر مانی تو وہ شیطان کے لئے ہوگی اور اسے پورا کرنا جائز نہیں۔اس حدیث میں وجہ استدلال یہ ہے کہ کفارہ ادا کرنا تب واجب ہوتا ہے جب نذر کو پورا کرنا واجب ہو کیونکہ یہ کفارہ نذر پوری نہ کرنے کے گناہ کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور جب نذر کو پورا کرنا ہی واجب نہ ہو تو پھر اس پر کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا۔ لیکن یہ نص کے مقابلے میں عقلی استدلال ہے اور تمام صورتوں میں یہ جاری بھی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً جب کوئی اللہ تعالیٰ کے نام پر گناہ کرنے کی قسم کھاتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کو بے حرمتی سے بچالے (اور اس کی عظمت وشان قائم رہے) تو یہی صورت حال مذکورہ مسئلہ میں بھی ہے۔ حضرت ثابت بن ضحاک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے مقام بوانہ پر اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اپنی نذر کے بارے آپ ﷺ کو مطلع فرمایا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کیا عہد جاہلیت کے بتوں میں سے وہاں کوئی بت نصب تھا جس کی تو عبادت کرتا تھا۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہاں عہد جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ لگتا تھا۔ صحابہ کرام نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر۔ کیونکہ اس نذر کو پورا کرنا جائز نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی ہو اور نہ اسے پورا کرنا لازم ہے جس کا انسان مالک نہ ہو۔ اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے(1)۔

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں نے نذر مانی تھی کہ (اظہار مسرت کے لئے) میں آپ کے سر پر دف بجاؤں گی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر لے۔ رواہ ابوداؤد(2)۔ اور ایک روایت میں یہ زائد ہے کہ اس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اور میں نے یہ نذر مانی ہے کہ میں فلاں فلاں مقامات پر جانور ذبح کروں گی۔ اس میں عورت نے ان مقامات کا ذکر کیا جن پر عہد جاہلیت میں جانور ذبح کئے جاتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا اس مقام پر عہد جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی ایسا بت تھا جس کی عبادت کی جاتی تھی؟ اس نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا زمانہ جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ وہاں لگتا تھا؟ اس نے عرض کی نہیں تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں نظر پوری کرنے کا امر وجوب کے لئے نہیں۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ اور یہ اس لئے ہے تاکہ ان تمام

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم)

احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہو سکے۔ اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ نذر وہ ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔ لہٰذا وہ نذر جس میں طاعت وفرمانبرداری نہ ہو تو وہ یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ اسے پورا کرنا واجب ہو اور نہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہاں امر اباحت کے لئے ہوگا۔ اور معصیت کی نذر میں معصیت کو ترک کرنا اور کفارہ ادا کرنا لازم ہے تو یہاں بدرجہ اولیٰ ترک معصیت ہے۔

جس آدمی نے نذر طاعت مانی لیکن اسے اضافی قیود و اوصاف سے مقید کر دیا تو اگر وہ قیود اور اوصاف اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب فیہ اور پسندیدہ ہوں۔ درجات میں اضافے اور ثواب میں کثرت کا موجب ہوں تو پھر ان قیود و اوصاف سمیت نذر کو پورا کرنا واجب ہے۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب فیہ نہ ہوں اور درجات میں بلندی کا سبب نہ ہوں تو پھر آدمی پر ان شرائط کو پورا کرنا لازم نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان صفات اور قیود کے نہ پائے جانے کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس کے بارے وہی اختلاف ہے جو ہر مباح چیز کو نذر کے اسے ترک کرنے کے بارے ہے۔ پس جس نے یہ نذر مانی کہ وہ بازار میں یا ہفتے کے دن نماز پڑھے گا۔ یا یہ نذر مانی کہ وہ روزہ رکھے لیکن نہ بیٹھے گا' نہ گفتگو کرے گا اور نہ ہی کسی شئی کا سایہ حاصل کرے گا۔ یا یہ نذر مانی کہ وہ یہ درہم اس شہر میں اس فقیر پر صدقہ کرے گا۔ تو اس صورت میں اس پر نماز اور روزہ واجب ہو جائیں گے اور ساتھ ہی اس کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ جس جگہ پر جس وقت چاہے نماز پڑھ لے' اور روزہ رکھے اور اس کے ساتھ وہ گفتگو بھی کرتا رہے' چاہے تو بیٹھا رہے اور سایہ بھی حاصل کر لے۔ اسی طرح وہ جو درہم جس شہر میں جس فقیر پر چاہے صدقہ کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں کہ اس اثناء میں کہ حضور نبی کریم ﷺ ہمیں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک آپ ﷺ کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو کھڑا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اس کے بارے دریافت فرمایا تو صحابہ کرام نے عرض کی یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے کھڑے رہنے کی نذر مان رکھی ہے لہٰذا یہ نہ بیٹھتا ہے' نہ سایہ حاصل کرتا ہے' نہ کلام کرتا ہے اور روزہ رکھے ہوئے ہے۔ تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا اسے حکم دو کہ یہ چاہے تو کلام کرے' چاہے تو سایہ میں چلا جائے اور چاہے تو بیٹھ جائے اور اس کے ساتھ روزہ مکمل کر لے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی نذر پوری کرنا لازم ہے اور دیگر قیود کا لحاظ ضروری نہیں) آپ ﷺ نے اس موقع پر کفارہ کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔

اور جس آدمی نے یہ نذر مانی کہ وہ تین دن مسلسل روزے رکھے گا یا یہ نذر مانی کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی نذر کو (اسی صورت میں) مکمل کرے۔ لہٰذا اگر اس نے متفرق روزے رکھے یا بیٹھ کر نماز پڑھی تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہوگی اور اس پر اعادہ واجب ہوگا۔ کیونکہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کا اجر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے اجر کی نسبت نصف ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما' طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن سائب اور مطلب بن ابی وداعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابو داؤد نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے اور مسلم' ابو داؤد

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 991 (وزارت تعلیم)

اورنسائی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث روایت کی ہے اور روزوں میں تسلسل مرغوب فیہ امر ہے، اسی لئے کفارات کے روزوں میں تسلسل برقرار رکھنا واجب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے مطلق نماز کی نذر مانی تو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ نماز میں اصل یہی ہے کہ کھڑے ہو کر ادا کی جائے۔ اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر دونوں طریقوں سے نماز پڑھنا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ وہ پہلو کے بل یا چت لیٹ کر نماز پڑھے گا تو اس پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ حالت اختیار میں نماز کے دوران لیٹنا شرعاً معروف نہیں۔ جبکہ بیٹھ کر نماز پڑھنا معروف بھی ہے اور جائز بھی۔ ہاں اگر مریض ایسا ہو جو بیٹھنے پر قادر نہ ہو تو اگر اس نے لیٹ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اسے کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور اگر وہ نذر پوری کرنے سے پہلے پہلے صحت یاب ہو گیا تو پھر اس کے لئے لازم ہے کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے۔

مسئلہ: وہ آدمی جس نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے نزدیک اس کے لئے جائز ہے کہ وہ جس جگہ چاہے نماز پڑھے لے۔

امام زفر اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جس نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد یا مسجد حرام میں نماز پڑھ لی تو اس کی نماز جائز ہوگی اور نذر پوری ہو جائے گی اور جس نے مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو پھر اگر اس نے مسجد حرام میں نماز پڑھی تو اس کی نذر پوری ہو جائے گی اور اگر کسی اور جگہ نماز پڑھی تو نذر پوری نہیں ہوگی۔ اور جس نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی اور جگہ نماز پڑھے۔ (یعنی کسی اور جگہ نماز پڑھنے سے نذر پوری نہیں ہوگی) امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عطا فرما دی تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز ادا کروں گا تو آپ ﷺ نے اسے ارشاد فرمایا یہیں نماز پڑھ لو۔ اس نے دوبارہ یہی عرض کی تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا یہیں نماز پڑھ لو۔ اس نے تیسری بار پھر یہی عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری مرضی(۱)۔ (تمہیں اپنے کام کا اختیار ہے جیسے چاہو کر لو) اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ، دارمی رحمۃ اللہ علیہ اور طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے یہ کہتے ہیں کہ جس نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے مسجد حرام میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن مسجد حرام میں ہی تھے لیکن جو مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس کے لئے کیسے جائز ہے کہ وہ کسی اور جگہ نماز پڑھے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے ایک آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی نسبت محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا پچیس گنا زیادہ ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنا پانچ سو گنا زیادہ ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے ہزار نماز کا ثواب ہے۔ (مسجد نبوی ﷺ) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے اس کے لئے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے(2)۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 112 (وزارت تعلیم) 1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 190 (العلمیہ)

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری مسجد میں ایک نماز پڑھنا مسجد حرام کے سوا دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے بہتر ہے(1)۔ صحیحین کی اسی حدیث کی مثل امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وساطت سے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث طیبہ نقل کی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عطاء بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز پڑھنا مسجد حرام کے سوا دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز پڑھنا میری اس مسجد میں ایک لاکھ نماز پڑھنے سے افضل ہے(2)۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت اسی طرح مروی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب یہ دیا ہے کہ مذکورہ تمام احادیث فرائض کے ساتھ مختص ہیں۔ کیونکہ مساجد میں فرض نمازوں کی فضیلت مذکورہ ترتیب کے مطابق حق ہے۔ لیکن نوافل کا یہ حکم نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا فرض نماز کے سوا آدمی کی افضل ترین نماز اپنے گھر میں ہے۔ اسے شیخین نے صحیحین میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے(3)۔

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا میری اس مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے سوائے فرض نماز کے(4)۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ میرے نزدیک اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ پسندیدہ ہے(5)۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جب میرا غائب (گمشدہ آدمی) آ گیا یا جب میرا مریض شفایاب ہوا تو مجھ پر ایک مہینے کے روزے لازم ہیں۔ تو شرط پائے جانے کے بعد اس پر ایک مہینے کے روزے رکھنا واجب ہوں گے اور اگر اس نے شرط پائے جانے سے پہلے ایک مہینے کے روزے رکھ لئے تو وہ نذر کی طرف سے جائز نہیں ہوں گے۔ اور پھر شرط پائے جانے کے بعد دوبارہ روزے رکھنا اس پر واجب ہوں گے۔ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک شرط انعقاد سبب کے مانع ہے اور وجود سبب سے قبل ادا جائز نہیں ہوتی اور ان کے نزدیک شرط حکم کے مانع ہے نہ کہ سبب کے۔ لہٰذا ادا جائز ہوگی، جیسا کہ نصاب مکمل ہونے کے بعد سال گزرنے سے قبل زکوٰۃ کی ادائیگی جائز ہوتی ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے وجوب ادا کی نسبت کسی معین وقت کی طرف کی تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس معین وقت سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے۔ جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ نذر کی نسبت کسی خاص وقت کی طرف کرنا ایسے ہی ہے جیسے اسے کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے۔ (یعنی جس طرح اس میں ادائیگی کے صحیح ہونے کے لئے شرط کا وجود ضروری ہے اسی طرح نذر کی ادائیگی کے صحیح ہونے کے لئے اس معینہ وقت کا وجود بھی ضروری ہے) لیکن وہ دونوں یہ فرماتے ہیں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 447 (قدیمی)
2۔ شرح مشکل الآثار، جلد 2، صفحہ 61، حدیث: 597 (مؤسسۃ الرسالۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 101 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 149 (وزارت تعلیم)
5۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 200 (وزارت تعلیم)

کہ اس طرح نہیں بلکہ یہ تو نذر منجز ہے جسے وقت کی قید سے مقید کر دیا گیا ہے لہٰذا یہ قید لغو اور ناقابل اعتبار ہوں گی۔ جیسا کہ کوئی یہ کہے قسم بخدا! میں بازار میں نماز پڑھوں گا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ جہاں چاہے نماز پڑھ لے۔ اسی طرح کسی نے یہ نذر مانی کہ میں رجب کے مہینے میں روزے رکھوں گا یا یہ کہا کہ میں اس سال کے بعد تیسرے سال میں حج کروں گا تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ چاہے تو مقررہ وقت سے پہلے روزے رکھ لے اور حج بھی کر لے اور اگر چاہے تو وقت گزرنے کے بعد بھی وہ روزے اور حج ادا کر سکتا ہے۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں یہ کہا ہے کہ وہ وقت جس کی طرف اس نے اپنی نذر کی نسبت کی ہے اگر شرعاً فضیلت والا ہو پھر اس نے اس وقت سے پہلے ایسے وقت میں روزے رکھ لئے جو فضیلت کے لحاظ سے کم ہے تو اس کی نذر پوری نہ ہوگی بلکہ معینہ وقت آنے پر روزوں کا اعادہ اس پر واجب ہوگا تاکہ وہ وقت کی فضیلت کو بھی پا سکے۔ اور اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو پھر قبل از وقت روزے رکھ لینا جائز ہے۔ میرے نزدیک یہی اظہر ہے۔ مثلاً کسی نے یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ کا دن) یا یوم عاشوراء (دسویں محرم کا دن) یا ذوالحج کے پہلے نو دنوں یا محرم شریف کے مہینے کے روزے رکھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے ان مقررہ دنوں سے قبل روزہ رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح جس نے یہ نذر مانی کہ وہ وسط رات کے وقت نماز پڑھے گا تو پھر اس رات سے پہلے یا بعد دن کے وقت نماز پڑھنے سے نذر پوری نہیں ہوگی۔ (اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ نذر ماننے والا آنے والی رات تک زندہ باقی نہیں رہے گا اس لئے اس نے احتیاطاً دن کے وقت نماز پڑھ لی) تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ ظن غالب یہ ہے کہ وہ آنے والی رات تک زندہ رہے گا (کیونکہ اس کی موت کے آثار ظاہر نہیں)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یوم عرفہ کے روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اتنے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں کہ وہ اسے گزشتہ سال اور آنے والے سال کے گناہوں کا کفارہ بنا دیگا۔ اور یوم عاشوراء کے روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اتنے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ سارے سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا(1)۔ اسے مسلم، ابن حبان، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطہ سے حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اسی بارے میں حضرت زید بن ارقم، سہل بن سعد اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیث طبرانی نے روایت کی ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے بھی حدیث مروی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی ایسے دن نہیں جن میں عمل صالح ذی الحجہ کے ان ایام (ایام تشریق) کی نسبت اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا بھی (ان دنوں کے عمل کی نسبت) زیادہ پسند نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا بھی نہیں مگر جب کوئی آدمی اپنی جان و مال کے ساتھ گھر سے نکلا اور پھر ان میں سے کسی شئی کے ساتھ واپس نہ لوٹا (یعنی جان و مال دونوں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان کر دیئے تو ایسا جہاد (ان دنوں کے عمل صالح سے زیادہ پسندیدہ ہے) اسے ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے(2)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسے دن نہیں جن میں عبادت کرنا ذوالحجہ کے دس دنوں میں عبادت کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 94-93 (فاروقی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 331 (وزارت تعلیم)

نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو۔ بیشک ان میں سے ایک دن کا روزہ ایک سال (روزے رکھنے کے) مساوی ہے اور ان کی ایک ایک رات لیلۃ القدر کے برابر ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے(1)۔ اور یہ حدیث ضعیف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان المبارک کے روزوں کے بعد افضل ترین روزے شہر اللہ محرم الحرام کے روزے ہیں۔ اور فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز رات کی نماز ہے(2)۔ اسے مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں رویانی نے مسند میں اور طبرانی نے جندب سے نقل کیا ہے۔

جس کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے المبسوط میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ذکر کیا گیا ہے کہ اس آدمی کو اختیار ہے چاہے تو حج کے لئے سوار ہو کر جائے یا پیدل۔ یعنی اس پر پیدل حج کرنا واجب نہیں۔ علماء کے ایک اور گروہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اس قول کا انحصار اس سابقہ نظریہ پر ہے کہ جس نے طاعت وعبادت کی نذر مانی اور اس میں ایسی شرط لگادی جو طاعت نہیں، تو اس پر اس شرط کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا۔ قدوری اور دیگر اکثر متون میں (آپ رحمۃ اللہ علیہ کا) یہ موقف بیان کیا گیا ہے کہ وہ پیدل چل کر ہی حج ادا کرے گا اور طواف زیارت کرنے تک کسی سواری پر سوار نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہ مقام جہاں سے پیدل چلنے کا آغاز کرنا ہے اس کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ پیدل چلنے کا آغاز میقات سے کرے گا کیونکہ حج کے احکام وہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے بارے صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ اپنے گھر سے ہی پیدل چلے گا۔ کیونکہ عرفاً اس کی نذر سے یہی مراد ہے۔ لیکن اگر اس کی نیت اس کے خلاف ہو تو پھر نیت پر عمل لازم ہوگا۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ جو کچھ قدوری میں ذکر کیا گیا ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ نذر کے سبب اس پر پیدل چلنا واجب ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی موقف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

پہلا قول کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک سوار ہو کر حج کرنا پیدل چل کر حج کرنے کی نسبت افضل ہے۔ اور یہ دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ منذور کا عبادت ہونا ضروری ہے اور پیدل چلنے میں ترک اولیٰ لازم آتا ہے۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے استطاعت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور استطاعت میں سواری بھی شامل ہے)

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پیدل چل کر حج کرنا افضل ہے بشرطیکہ چلنے کی قدرت اور طاقت ہو۔ لیکن آپ کے نزدیک وہ شئی جس کی نذر مانی گئی ہے وہ ایسے واجب کی جنس سے نہیں جو واجبات مقصودہ میں سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب ہو۔ اور پیدل چلنا ایسے واجب کی جنس سے نہیں۔ (اس لئے پیدل چلنا ہی لازم اور ضروری نہیں ہوگا) اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے درمیان ان کے سہارے چل رہا تھا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا اسے کیا ہوا ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی۔ اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہے۔ اسے اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں کہ یہ اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کئے ہوئے ہے پھر آپ ﷺ نے اسے سوار ہونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ متفق علیہ(3)۔ اور مسلم شریف کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اے بوڑھے! سوار ہو جا کیونکہ اللہ

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 125 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 58 (فاروقی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)

تعالیٰ تجھ سے اور تیری نذر سے غنی ہے (اسے اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں)(1)

حضرت عقبہ بن عامر جہنی کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں میری بہن نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی پھر انہوں نے مجھے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں فتویٰ طلب کرنے کے لئے بھیجا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا چاہے تو پیدل چلے اور چاہے تو سوار ہو جائے۔ متفق علیہ (2)۔

دوسرا قول کرنے والوں کی حجت یہ ہے کہ پیدل چلنا عبادت مقصودہ ہے اور طواف زیارت میں پیدل چلنا واجب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ لہٰذا نذر کے سبب بھی پیدل چلنا واجب ہوگا۔ رہا ان کے استدلال کا جواب جو انہوں نے مذکورہ بالا احادیث سے کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس بوڑھے کو سوار ہونے کا حکم تب ارشاد فرمایا جب اسے دیکھا کہ وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں صراحۃً موجود ہے کہ آپ ﷺ نے اس بوڑھے کو دیکھا وہ اپنے بیٹوں کے درمیان ان کے سہارے سے چل رہا ہے۔ اسی طرح عقبہ کی بہن کے قصہ میں بھی ہے جو کہ ابوداؤد کی روایت میں مذکور ہے۔ کہ وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھیں۔ لہٰذا ان دونوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب پیدل چلنے کی قدرت اور طاقت نہ ہو تو پھر سوار ہونا جائز ہے۔ لیکن یہ احادیث پیدل چلنے کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔ بلکہ عذر کے سبب سوار ہونے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

مسئلہ: اگر پیدل چل کر حج کرنے کی نذر میں کوئی آدمی عذر کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہوا تو بالاجماع اس پر یہ واجب نہیں کہ وہ دوبارہ پیدل چل کر حج کرے۔ حالانکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر کردہ اصول پر قیاس کا مقتضی یہ ہے کہ سوار ہونے کے سبب نذر ماننے والا اپنی نذر سے بری الذمہ نہ ہو۔ (بلکہ اس کا اعادہ اس پر لازم ہو) جیسا کہ اگر کسی نے لگاتار روزے رکھنے یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر مانی (پھر وہ ایسا نہ کرے تو نذر پوری نہیں ہوتی) لیکن مذکورہ مسئلہ میں ہم نے قیاس کو اس لئے چھوڑ دیا ہے کیونکہ اس میں سوار ہونے کی رخصت نص سے ثابت ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ بالا احادیث سے تو رخصت صرف ان لوگوں کے لئے ثابت ہوتی ہے جو پیدل چلنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اور جو پیدل چلنے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے لئے یہ حکم نہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اگر چلنے کی طاقت رکھنے والا بغیر عذر کے سوار ہو تو وہ اپنی نذر سے بری الذمہ نہ ہو؟

ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ سوال کا جواب دو طرح سے ہوسکتا ہے ایک یہ کہ اکثر احکام شرعیہ عام ہوتے ہیں اور حج میں ظن غالب یہ ہے کہ عموماً پیدل چلنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ حج کے لئے زاد راہ اور سواری پر قادر ہونا اس لئے ضروری ہے کہ آدمی احکام حج ادا کرنے پر قادر ہو جائے۔ یہ فقط سہولت اور آسانی کے لئے نہیں۔ اور جس رخصت کے بارے ہم نے کہا ہے اس کی تائید حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا تو ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا۔ اور مزید یہ فرمایا کہ یہ بھی مثلہ کی ہی ایک صورت ہے کہ آدمی پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانے۔ پس جو کوئی پیدل حج کرنے کی نذر مانے۔ اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور کی قربانی دے دے اور سواری پر سوار ہو جائے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے اور ساتھ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے (3)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)　　2۔ ایضاً　　3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 340 (العلمیۃ)

جواب کی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر واجب عذر کے ساتھ یا بغیر عذر کے ترک ہو جائے تو وہ ہر صورت میں بصورت قضاء ادائیگی کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر اگر پیدل چلنا مستقل عبادت ہے تو پھر اس کا تقاضا ہے کہ بعینہٖ اسے بصورت قضاء ادا کیا جائے۔ اور اگر وہ عبادت کی جز یا شرط یا وصف ہے تو پھر چونکہ وہ مستقل عبادت نہیں اس لئے مثل معقول کے ساتھ اس کی قضاء کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ مثل غیر معقول کے ساتھ اس کی قضاء متصور ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ سجدہ سہو واجبات نماز کے لئے قضاء ہے۔ لیکن ایسی قضاء جو مثل غیر معقول ہو اس کا ادراک رائے اور قیاس سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا تعین شارع پر موقوف ہوتا ہے۔ پس اگر شارع کی جانب سے مثل غیر معقول ظاہر ہو جائے تو پھر اس کی قضاء اسی مثل غیر معقول کے ساتھ کی جائے گی اور اس عبادت کو دوبارہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ بصورت دیگر اس عبادت کو دوبارہ ادا کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب روزوں میں تسلسل اور نماز میں قیام کے لئے کوئی مثل غیر معقول ظاہر نہ ہوئی تو ہم نے یہ حکم لگا دیا کہ روزہ کا بھی اعادہ کیا جائے اور نماز بھی دوبارہ پڑھی جائے۔ اور پیدل چلنے کی مثل غیر معقول ایک جانور کی قربانی کا ہمیں علم ہو گیا تو یہ حکم لگا دیا گیا کہ حج دوبارہ نہ کیا جائے بلکہ اس واجب کی قضا ایک جانور کی قربانی سے کی جائے۔ لہٰذا معذور اور غیر معذور کے مابین فرق صرف یہ ہے کہ بالعذر چلنے کو ترک کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا، جبکہ بغیر عذر کے چھوڑنے والا گنہگار ہوگا۔ یہ مسئلہ ایسے ہی ہے جیسے وقوف مزدلفہ کو بغیر عذر کے ترک کرنا جائز نہیں لیکن عذر کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے۔ لیکن ہر دو صورت میں ایک جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جس کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی۔ پھر اس نے عذر کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہو کر حج کیا تو اس پر ایک بدنہ کی قربانی واجب ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین نے کہا ہے کہ ایسے آدمی پر دم لازم ہے اور وہ کم سے کم ایک بکری کی قربانی ہے اور جب کسی نے اپنے قول للہ علی ان احج ماشیا سے قسم کا ارادہ کیا تو پھر اس پر کفارہ قسم بھی لازم ہوگا۔ اسی طرح امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس پر صرف قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔ سوار ہونے کی صورت میں قربانی واجب ہونے کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ان کی بہن نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے سوار ہونے اور قربانی دینے کا حکم ارشاد فرمایا تھا(1)۔ اسے ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور اس کی سند حجت ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو حدیث صحیحین میں ہے اس میں اختصار ہے (کیونکہ اس میں قربانی کا ذکر نہیں) جبکہ ابوداؤد کی روایت میں قربانی کا ذکر ہے) اس لئے یہ حدیث مطلق قربانی کے واجب ہونے میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے۔ اگر چہ وہ مطلق قربانی بکری ہی ہو۔ (تو وہ بھی صحیح ہے)

ہم یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں قربانی کو بدنہ (اونٹ، گائے اور بھینس وغیرہ کی قربانی) کے ساتھ خاص کرنا حدیث طیبہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ابوداؤد، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی۔ اور وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کو تیری بہن کے پیدل چلنے کی کوئی ضرورت نہیں، پس اُسے چاہئے کہ وہ سوار ہو جائے اور ایک بدنہ بطور قربانی دے۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عقبہ بن عامر رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث اس طرح نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میری بہن نے

کعبہ معظمہ تک پیدل چل کر جانے کی نذر مانی تو آپ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اس کے پیدل چلنے سے مستغنی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے پیدل چلنے کی قطعاً ضرورت نہیں) اسے حکم دو کہ وہ سوار ہو جائے اور ایک بدنہ قربانی کرے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث حسن ہے، کیونکہ یہ ابن ابی داؤد سے اس سند کے ساتھ مروی ہے حدثنا عیسیٰ بن ابراہیم حدثنا عبدالعزیز بن مسلم حدثنا مطر الوراق عن عکرمۃ عنہ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ عبدالعزیز بن مسلم راوی مجہول ہے اور مطر الوراق کے بارے ابن سعد نے کہا ہے کہ یہ ضعیف فی الحدیث ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ ذہبی نے کہا ہے عبدالعزیز معروف راوی ہے لہٰذا جس نے اسے مجہول سمجھا ہے وہ اس کے لئے باعث ضرر نہیں۔ اور مطر الوراق رجال مسلم میں سے ہے اور ذہبی نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن معین نے اسے صرف عطاء سے روایت کرنے میں ضعیف الحدیث قرار دیا ہے، جبکہ یہ روایت تو عکرمہ سے مروی ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے راویوں کے قوی ہونے کی بناء پر مطلق قربانی کا قول کیا ہے اور اسے بدنہ کے ساتھ مقید نہیں کیا۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ حدیث جس میں مطلق قربانی کا ذکر ہے اس کے راویوں کا قوی ہونا اولاً تو قابل تسلیم ہے ہی نہیں اور اگر ہم تسلیم کر بھی لیں تب بھی راویوں کی قوت کے سبب حدیث کو ترجیح تب حاصل ہوتی ہے جب دو روایتوں کے مابین تعارض پایا جائے۔ لیکن یہاں تو تعارض موجود ہی نہیں بلکہ مطلق اور مقید دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کے بارے میں ایک ہی حکم میں ہیں۔ اس لئے بالیقین مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ اسی کے بارے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی اقوال مروی ہیں۔ یہ موقوف روایات ہیں لیکن مرفوع کے حکم میں ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سعد بن عروبہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے قتادہ سے اور انہوں نے حسن سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آدمی کے بارے فرمایا جو پیدل چلنے کی قسم کھاتا ہے کہ اگر وہ پیدل چلنے سے عاجز ہو تو سوار ہو جائے اور ایک بدنہ قربانی کرے۔

عبدالرزاق نے صحیح سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ جس کسی نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی تو اسے چاہئے کہ وہ پیدل چلے اور اگر تھک جائے تو سوار ہو جائے اور ایک اونٹ قربانی کرے۔ اسی طرح کے اقوال حضرت ابن عمر، ابن عباس، قتادہ اور حسن رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

مسئلہ: جس کسی نے یہ کہا کہ بیت اللہ شریف یا کعبہ معظمہ تک پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے اور اس کے ساتھ اس نے حج یا عمرہ کے الفاظ ذکر نہ کئے تو اس پر استحساناً پیدل چل کر حج یا عمرہ کرنا لازم ہے۔ اور قیاساً اس پر کوئی شئی بھی لازم نہیں۔ وجہ استحسان یہ ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ حج یا عمرہ کی عبادت متعارف ہے۔ (یعنی اگر ان الفاظ سے نذر ہی مانی جائے تو عرفاً اس سے مراد حج یا عمرہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر حج یا عمرہ کرنا لازم ہوگا) اور اگر الفاظ یہ کہے کہ حرم پاک کی طرف پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان الفاظ کے ساتھ حج یا عمرہ کا لازم ہونا متعارف نہیں لیکن صاحبین کے نزدیک احتیاطاً اس پر حج یا عمرہ کرنا لازم ہوگا۔

اور اگر الفاظ اس طرح کہے کہ صفا یا مروہ یا عرفہ یا مزدلفہ یا منیٰ یا مقام ابراہیم کی طرف پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے تو بالاتفاق اس پر کوئی شئی واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر اس نے مشی (پیدل چلنے) کی بجائے ذھاب، خروج یا سفر کے الفاظ استعمال کئے، یعنی

مجھ پر بیت اللہ شریف کی طرف جانا یا نکلنا یا سفر کرنا لازم ہے تو اس پر کوئی شئی واجب نہیں ہوگی۔ تو حقیقتاً اس کا دارومدار عرف عام پر ہے، بعض الفاظ سے یہ عبادت لازم ہو جاتی ہے اور بعض سے نہیں۔ اور اگر اس نے اپنے قول علی المشی الی بیت اللہ سے مدینہ طیبہ کی مسجد، مسجد بیت المقدس یا کسی دوسری مسجد کی طرف چلنے کی نیت کی تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا کیونکہ بیت اللہ کا اطلاق مسجد پر کرنا صحیح ہے۔

مسئلہ: جس نے کسی طاعت وعبادت کی نذر مانی تو اس کے سبب اس پر وہ عبادت وطاعت بھی لازم ہوگی اور ساتھ ہی ان تمام شرائط کی پابندی بھی لازم ہوگی جن پر اس عبادت کی صحت موقوف ہے۔ مثلاً کسی نے یہ نذر مانی کہ وہ دو رکعت نماز بغیر وضو کے یا بغیر قرأت کے ادا کرے گا یا ایک رکعت یا تین رکعتیں نماز پڑھنے کی نذر مانی۔ تو اس پر دو رکعتیں وضو اور قرأت کے ساتھ پڑھنی لازم ہونگی اور تین رکعتوں کی نذر کی صورت میں چار رکعتیں پڑھنی لازم ہونگی۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی نذر صحیح نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر کسی نے بغیر وضو کے دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانی (تو یہ نذر صحیح نہیں ہوگی) کیونکہ بغیر وضو کے نماز پڑھنا طاعت وعبادت نہیں۔ ہاں اگر بغیر قرأت کے نماز پڑھنے کی نذر مانی تو یہ بھی طاعت ہوتی ہے مثلاً امی (ناخواندہ) آدمی کا نماز پڑھنا۔ علاوہ ازیں تمام صورتوں میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا موقف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے موافق ہے۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے تین رکعتیں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس پر دو رکعتیں نماز پڑھنا لازم ہوگی۔ علاوہ ازیں صورتوں میں اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ بغیر وضو کے نماز پڑھنا یا بغیر قرأت کئے یا ایک رکعت نماز پڑھنا چاہے یہ منفرد ہو یا اس سے پہلے دو رکعتیں اور ہوں یہ قربت اور عبادت ہی نہیں۔ لہٰذا ان کی نذر جائز نہیں ہوگی۔ ہم کہتے ہیں کہ کوئی بھی شئی اپنے اوپر لازم کر لینے سے لازم ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ تمام چیزیں بھی لازم ہو جاتی ہیں جن کے بغیر اسکی ادائیگی صحیح نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جس کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی پھر اس نے عذر کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہو کر حج کیا اور بدنہ کی قربانی دی تو پھر کیا اس پر کفارہ ادا کرنا بھی واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ مگر جب اس نے قسم کی نیت کی (تو پھر کفارہ قسم واجب ہوگا) اس مسئلہ میں ایسا ہی اختلاف ہے جیسا کہ اہل منذور کے فوت ہونے کی صورت میں اختلاف اس سے قبل گزر چکا ہے

مسئلہ: جس کسی نے مطلق اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر روزہ اور اعتکاف دونوں واجب ہوں گے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر روزہ لازم نہیں ہوگا۔ اس اختلاف کا دارومدار ان کے اس اختلاف پر ہے کہ کیا روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے یا نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط نہیں لہٰذا اعتکاف بغیر روزے کے اور رات کے وقت بھی صحیح ہو جاتا ہے، اس کی کم سے کم مدت ایک ساعت ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حسن نے یہی روایت کی ہے۔ فی الحقیقت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ

واجب اعتکاف کے صحیح ہونے کے لئے روزہ شرط ہے لیکن نفلی اعتکاف کے لئے نہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اعتکاف کے لئے اس کے ساتھ روزہ رکھنا شرط ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے چنانچہ یہ سوید بن عبدالعزیز سے، وہ سفیان بن حسین سے، وہ زہری سے اور وہ عروہ کے واسطہ سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعتکاف نہیں ہوتا مگر روزے کے ساتھ (1)۔ (یعنی روزے کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہوتا) دار قطنی نے کہا ہے کہ سوید سفیان سے نقل کرنے میں منفرد ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے سوید متروک الحدیث ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث محل نظر ہے۔ یحییٰ نے کہا ہے یہ کوئی شئی نہیں اور سفیان کے متعلق یحییٰ نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں۔ اور ابن حبان نے کہا ہے کہ سفیان زہری سے مقلوب حدیثیں نقل کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذہبی نے اس کے بارے کہا ہے کہ وہ صدوق (بہت سچ بولنے والا) اور مشہور راوی ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سند میں زہری کے سوا کسی پر کوئی جرح نہیں۔ مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے الکمال میں ذکر کیا ہے کہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے میں نے سفیان کے بارے ہشیم سے پوچھا تو اس نے اس کے بارے اچھے کلمات کہے۔ نتیجتاً مذکورہ حدیث سوید اور سفیان کی وجہ سے صحیح نہیں کیونکہ یہ زہری کی روایات میں سے ہے اور سفیان زہری سے روایت کرنے میں ضعیف ہے۔ دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن اسحٰق سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے عروہ کے واسطہ سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ معتکف کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت نہ کرے' نماز جنازہ میں حاضر نہ ہو' نہ عورت کو مس کرے اور نہ اس سے مباشرت کرے' اور ایسی حاجات کے سوا جن کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں باہر نہ نکلے' اعتکاف صحیح نہیں ہوتا مگر روزے کے ساتھ اور اعتکاف نہیں ہوتا مگر جامع مسجد میں (2)۔

اگر یہ کہا جائے کہ ابوداؤد نے یہ کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسحٰق کے سوا کسی نے بھی اس حدیث کے لئے سنت کا لفظ استعمال نہیں کیا لہٰذا یہ حدیث موقوف ہے اور دار قطنی نے کہا ہے کہ عبدالرحمٰن ضعیف راوی ہے۔

میری طرف سے جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو مرفوع قرار دینا راوی کی جانب سے زیادتی ہے (اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے) اور عبدالرحمٰن ثقہ راوی ہے البتہ قدریہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح ابوداؤد نے کہا ہے۔ ابن معین نے اسے ثقہ کہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ صالح الحدیث ہے۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کی روایت نقل کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ بالکل ظاہر اور واضح امر ہے کہ لا اعتکاف کے الفاظ "اَلسُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اَنْ لَّا يَعُوْدَ" کے تحت نہیں آسکتے کیونکہ یہ ترتیب کلام میں تبدیلی کا باعث ہے (اور سیاق کلام کے مقتضیٰ کے خلاف ہے) اور اگر ہم حجت تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی اعتکاف میں روزے کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اختلاف روزے کے شرط ہونے میں ہے اور یہ ایسا امر ہے جس کے لئے دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث التحقیق میں دار قطنی کی سند سے نقل کی ہے کہ وہ زہری سے' وہ سعید بن المسیب سے اور وہ عروہ کے واسطہ سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 199 (المحاسن) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 335 (وزارت تعلیم)

اور معتکف کے لئے سنت ہے کہ وہ انسانی حاجت کے بغیر باہر نہ نکلے' نماز جنازہ کے لئے نہ جائے' مریض کی عیادت نہ کرے' عورت کو مس نہ کرے اور نہ اس سے مباشرت کرے۔ اور اعتکاف نہیں ہوتا مگر جامع مسجد میں۔ اور آپ ﷺ اعتکاف کرنے والے کو روزہ رکھنے کا حکم ارشاد فرماتے تھے۔ علامہ ابن جوزی نے اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مجسر ہے۔ ابن عدی نے اس کے بارے کہا ہے کہ اس کی روایات منکر ہیں۔ اور دارقطنی نے کہا ہے کہا جاتا ہے کہ ان السنة للمعتكف کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں۔ بلکہ یہ زہری کا کلام ہے۔ اور جس نے اسے حدیث میں داخل کیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔

اسی باب میں دلیل کے طور پر وہ حدیث بھی ہے جسے ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن بدیل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرو بن دینار سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں کعبہ معظمہ کے پاس ایک دن یا رات اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی پھر انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اعتکاف بھی کرو اور روزہ بھی رکھو(1)۔ اور نسائی کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے آپ کو اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو روایت کرنے میں ابن بدیل منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔ نافع نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں روزے کا ذکر نہیں کیا۔ اور ان کی روایت اصح ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ میں نے ابوبکر نیشاپوری کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے کیونکہ عمرو بن دینار کے شاگردوں میں سے کسی ثقہ نے اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ابن جریج نے ذکر کیا، نہ ابن عیینہ نے اور نہ ہی حماد بن سلمہ وغیرہ نے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابن بدیل ثقہ راوی ہے۔ ابن معین نے کہا یہ صالح فی الحدیث ہے۔ اور ابن حبان نے بھی اس کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ ذہبی نے اس کی توثیق میں کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ اس کے بارے یہ کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ پھر اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے روزے کا حکم ثابت بھی ہو جائے تب بھی ہم اسے اس پر محمول کریں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابتداءً ہی اعتکاف اور روزے دونوں کی اکٹھی نذر مانی ہوگی اور سوال بھی دونوں کے بارے کیا ہوگا۔ پھر روایت بیان کرتے وقت راوی سے سوال کی روایت میں روزے کا ذکر رہ گیا۔ جیسا کہ جواب کی روایت میں اکثر صحیح الاسناد روایت میں صوم کا لفظ رہ گیا۔ (تو ایسا راوی کو مجہول اور نسیان کے سبب ہوا) اور وہ حدیث جو دارقطنی نے اپنی سند سے سعید بن بشیر سے روایت کی ہے کہ وہ عبداللہ بن عمر سے' وہ نافع سے اور وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حالت شرک میں اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کی نذر مانی۔ پھر اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے استفسار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔(2) اگر یہ کہا جائے کہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے کہ عبدالحق کا قول ہے اس حدیث کو روایت کرنے میں سعید بن بشیر منفرد ہے۔ علامہ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ یحییٰ اور ابن نمیر نے اس کے بارے کہا کہ یہ کوئی شئی نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ حافظ نے کہا ہے یہ مختلف فیہ راوی ہے۔ علامہ ذہبی نے کہا ہے کہ سعید بن بشیر قتادہ کے شاگرد ہیں اور انہیں شعبہ نے ثقہ قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کی قوت حفظ میں کلام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا تعلق قدریہ فرقے سے تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ سعید بن بشیر ابن بدیل سے زیادہ ضعیف نہیں تھا۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 335 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 201 (المحاسن)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا معتکف پر روزہ نہیں مگر جبکہ وہ اپنے آپ پر اسے لازم کرلے(1)۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کوئی طعن نہیں کیا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات مسجد حرام میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(2)۔

وجہ استدلال یہ ہے (کہ اس حدیث میں صرف رات کے اعتکاف کا ذکر ہے) اور رات تو روزے کے لئے وقت ہی نہیں۔ اس کے معارض وہ حدیث ہے جو امام مسلم نے شعبہ عن عبیداللہ سے نقل کی ہے اس میں رات کی بجائے دن کا ذکر ہے۔ لہٰذا ابن حبان وغیرہ نے ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق اس طرح کی ہے کہ آپ نے دن اور رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی لہٰذا جنہوں نے لفظ یوم (دن) ذکر کیا ہے ان کی مراد مطلق وقت ہے۔ یعنی دن اور رات دونوں مراد ہیں۔ اسی طرح جنہوں نے لفظ لیلۃ (رات) ذکر کیا ہے ان کی مراد بھی دن اور رات دونوں ہیں۔ میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ جس روایت میں یوما کا لفظ مذکور ہے وہ شاذ ہے۔ یا پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آپ نے دن کے اعتکاف کی نذر مانی اور حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کو روزہ رکھنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط نہیں۔

اس باب میں بطور حجت حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! بیشک میں صحرا میں رہ رہا ہوں اور الحمدللہ وہیں نماز بھی پڑھتا ہوں، آپ میرے لئے ایک رات کی تخصیص فرما دیجئے کہ میں اس رات اس مسجد میں فروکش ہوسکوں تو آپ ﷺ نے فرمایا تیئیسویں کی رات میں رہا کرو۔ بعد ازاں ان کے بیٹے سے پوچھا گیا کہ تمہارے باپ پھر کیا طریقہ کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد مسجد میں داخل ہو جاتے تھے اور پھر صبح کی نماز تک کسی حاجت کے لئے مسجد سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جب صبح کی نماز پڑھ چکتے تو وہ مسجد کے دروازے پر اپنی سواری پاتے۔ اس پر بیٹھتے اور صحرا کی طرف چلے جاتے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور یہ روایت رات کے وقت اعتکاف کرنے کے جواز میں صریح ہے۔ اس کے بارے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم ایک رات کے ٹھہرنے کو اعتکاف کا نام نہیں دے سکتے کیونکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اصطلاح کے ثابت ہو جانے کے بعد ہمارے اختلاف اور جھگڑے کی کوئی گنجائش نہیں۔ (اور اگر اعتکاف کا نام نہ بھی دیا جائے تو اتنا تو ثابت شدہ امر ہے) کہ قربت کی نیت سے مسجد میں ٹھہرنا طاعت وعبادت ہے اور (مستحب) طاعت بھی نذر کے سبب واجب ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: جس نے رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو یہ نذر اس کے ذمہ لازم ہو جائے گی اور رمضان المبارک کی شرط لغو نہیں ہوگی کیونکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ رمضان المبارک میں کی جانے والی طاعت وعبادت کا ثواب دوسرے ایام میں کی جانے والی طاعت وعبادت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے رمضان المبارک میں کوئی عمل خیر بطور نفل

1۔ مستدرک حاکم:1603 (العلمیۃ)　　2۔ صحیح بخاری، جلد1، صفحہ274 (وزارت تعلیم)

اور قربت ادا کیا تو وہ (اجر اور رتبہ کے لحاظ سے) اس آدمی کی طرح ہے جس نے رمضان المبارک کے علاوہ بقیہ دنوں میں کوئی فرض ادا کیا اور جس نے رمضان المبارک میں فرض ادا کیا (تو اس کا اجر و ثواب) بقیہ دنوں میں ستر فرض ادا کرنے والے کی مثل ہے۔ اس نے شعب الایمان میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے[1]۔

اور اگر کسی نے مطلق رمضان میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو اسے اختیار ہے کہ جس رمضان میں چاہے اعتکاف کر لے اور اگر کسی رمضان کو معین کیا تو پھر اس میں اعتکاف کرنا لازم ہوگا۔ اسی طرح علامہ ابن ہمام نے کہا ہے۔ لیکن یہ حکم اس نظریہ کے موافق نہیں کہ ہر وہ شرط جسے طاعت کے اعتبار سے کوئی فضیلت حاصل نہ ہو اس کی پابندی لازم نہیں اور ایک رمضان کو دوسرے رمضان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ پس یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ اگر اس نے اول رمضان معین کر لیا پھر اسے پالیا تو اس پر اسی میں اعتکاف کر لینا لازم ہے کیونکہ طاعت و عبادت میں جلدی کرنا بھی طاعت و عبادت ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں یُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۔ اور اگر کوئی دوسرا رمضان معین کیا پھر اس نے پہلے آنے والے رمضان المبارک میں اسے ادا کیا تو نذر پوری ہو جائے گی بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اس کے ذمہ لازم ہے کہ وہ پہلے آنے والے رمضان میں اسے ادا کرے کیونکہ دوسرے رمضان تک اس کا زندہ رہنا یقینی اور امر غالب نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی نے معینہ رمضان میں اعتکاف کے لئے نذر مانی اور روزے رکھے پھر اعتکاف نہ کیا تو اس کے ذمے لازم ہے کہ وہ دوسرے ایام میں اعتکاف کی قضاء کرے اور ساتھ روزے بھی رکھے۔ یہ مسئلہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ وہ بالکل اس کی قضاء نہ کرے۔ یہی قول امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے کیونکہ رمضان المبارک میں اعتکاف کرنا دیگر ایام میں اعتکاف کرنے کی نسبت افضل ہے لہٰذا دوسرے دنوں میں اعتکاف کرنے سے نذر ادا نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اگر کوئی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے یا مسلسل روزے رکھنے کی نذر مانے پھر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے یا متفرق روزے رکھے تو اس کی نذر ادا نہیں ہوگی۔ اور جب قضاء متعذر ہو تو نذر ساقط ہو جاتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس پر رمضان المبارک میں اعتکاف کرنا لازم تھا۔ جب وہ وقت گزر گیا تو اس کے ذمہ مطلق اعتکاف باقی رہا کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے اور رمضان المبارک گزر جانے کے سبب وقت کی فضیلت ساقط ہوگئی کیونکہ اب اس کا تدارک ممکن نہیں۔ اور دوسرے رمضان تک زندہ رہنا غیر یقینی امر ہے بلکہ اس کا تو گمان بھی نہیں کیونکہ درمیان میں مدت طویل ہے۔ (لہٰذا اس اعتکاف کو دوسرے رمضان تک مؤخر نہیں کیا جا سکتا) یہ مسئلہ اسی طرح ہے جیسے کسی کی نماز اپنے وقت سے یا رمضان المبارک کا روزہ فوت ہو گیا تو اس پر دوسرے وقت میں اصل نماز اور روزہ کی قضاء لازم ہے کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے اور وقت کی فضیلت اس سے ساقط ہو جائیگی کیونکہ اس کا تدارک ممکن نہیں۔ لیکن اگر کسی نے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر مانی پھر بیٹھ کر نماز پڑھی تو اسے دوبارہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم دیا جائیگا کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب ایک رمضان میں اعتکاف ادا نہ ہو سکا تو پھر چاہئے کہ اسے دوسرے رمضان میں اس کی قضاء کے واجب

1۔ شعـ[illegible] 3608 (العلمیہ)

ہونے کا حکم دیا جائے لیکن موت کا احتمال ہونے کے سبب یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ تم نے حکم دیا کہ رمضان المبارک کے بعض مقصود روزوں کے ساتھ اعتکاف کی قضاء واجب ہے۔ پھر جب ایسے آدمی نے رمضان المبارک کے بعد مقصود روزوں کے بعد مقصود روزوں کے ساتھ اعتکاف قضاء کر لی۔ بعد ازاں دوسرا رمضان اپنی زندگی میں پالیا تو چاہئے تھا کہ اس اسے وجوباً دوبارہ اعتکاف کرنے کا حکم دیا جاتا۔ جیسا کہ جس آدمی پر حج واجب ہوا اور وہ خود کسی عذر کے سبب حج کرنے سے عاجز ہو تو وہ اپنی طرف کسی اور آدمی کو حج کرنے کے لئے بھیج دے۔ بعد ازاں وہ خود حج کرنے پر قادر ہو گیا تو اس کا دوسرے کو حج کرانا باطل ہو جاتا ہے اور اس پر بذات خود حج پر جانا لازم ہو جاتا ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اعتکاف کے لئے روزے کا شرط ہونا نص سے ثابت ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ نذر مانا ہوا اعتکاف رمضان المبارک میں بالکل ادا ہی نہ ہو کیونکہ جب اعتکاف نذر کے سبب واجب ہے تو پھر ساتھ روزے بھی واجب ہو گئے کیونکہ یہ اس کے لئے شرط ہیں۔ اور نذر مانے ہوئے مقصود روزے رمضان المبارک میں ادا نہیں ہوتے۔ کیونکہ رمضان المبارک کے روزے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہیں (اور سارا وقت اللہ تعالیٰ کے حق کے ساتھ مشغول ہے) لہٰذا چاہئے کہ اعتکاف بھی ادا نہ ہو۔ لیکن ہم نے وقت کی فضیلت کو پانے کے لئے رمضان المبارک میں بالضرورۃ اعتکاف جائز قرار دیا۔ پس جب رمضان المبارک کے گزر چکنے کے سبب وقت کی فضیلت فوت ہو گئی تو حکم پھر اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا لہٰذا اعتکاف کے لئے بالمقصد روزے رکھنا واجب ہوں گے۔ پھر جب اس نے آئندہ سال دوسرے رمضان المبارک کو پالیا تو اس کے سبب بالقصد واجب کیا جانے والا اعتکاف اور روزے ساقط نہیں ہوں گے تو چونکہ اس نے بالارادہ روزے اپنے ذمے لازم کئے تھے اس لئے وہ اس اعتکاف کو دوسرے رمضان میں بالکل ادا نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم۔

یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے نزدیک ایک رمضان کے اعتکاف کی قضاء دوسرے رمضان میں کرنا جائز نہیں لیکن اگر اس نے رمضان المبارک میں نہ روزے رکھے اور نہ ہی اعتکاف کیا تو پھر قضاء روزوں کے دوران اعتکاف کرنا جائز ہے۔ حالانکہ ہمارے ذکر کردہ قیاس کا تقاضا تو یہی ہے کہ رمضان المبارک کے بعد وقت کی فضیلت فوت ہو جانے کی وجہ سے وہ مقصود روزوں کے بغیر اعتکاف ادا نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

ہم نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو قول ذکر کیا ہے اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ کے نزدیک اعتکاف کے لئے روزہ رکھنا شرط ہے۔ لہٰذا جنہوں نے اعتکاف کے لئے روزے کو شرط قرار نہیں دیا ان کے نزدیک جائز ہے کہ وہ رمضان المبارک کے بعد بغیر روزے کے اعتکاف کی قضاء کرے یا دوسرے رمضان میں اس کی قضاء کرے اگر اسے پالے یا قضاء اور کفارہ وغیرہ کے روزوں کے دوران اس کی قضاء کر لے۔ جب وہ رمضان المبارک کے بعد روزے کے ساتھ یا بغیر روزے کے اعتکاف کی قضاء کر لے گا تو پھر دوسرے رمضان کو پانے کی صورت میں اس پر اس کا اعادہ واجب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اگر کسی کی وقتی نماز فوت ہو جائے حالانکہ اس کے پاس پانی موجود تھا پھر وقت کے بعد اس نے تیمم کے ساتھ اسے قضاء کیا بعد ازاں اس نے پانی پالیا یا پہلے ننگے بدن نماز پڑھ لی اور پھر کپڑا پالیا (تو اس پر نماز کا اعادہ لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس نے حالت کفر میں طاعت کی نذر مانی پھر اسلام قبول کر لیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

اس پر نذر کو پورا کرنا واجب ہے جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ گزر چکا ہے کہ آپ نے دور جاہلیت میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ اس پر نذر کو پورا کرنا واجب نہیں کیونکہ کافر طاعت کے اہل نہیں اور اخلاص نہ ہونے کے سبب اس کی طاعت معصیت ہوتی ہے اور معصیت کی نذر کو پورا کرنا اس پر واجب نہیں۔ اور جب ہم نے ضروریات دین میں سے جان لیا کہ کافر عبادت کے اہل نہیں۔ تو پھر ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو اس معنی پر محمول کریں گے کہ نذر کو پورا کرنا اگرچہ ان پر واجب نہیں تھا لیکن جب اسلام قبول کرنے کے بعد اعتکاف میں ان کی رغبت وافر ہوگئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ابتدائً (نیا) اعتکاف کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ لہٰذا یہ اس اعتکاف کی قضاء کا حکم نہیں تھا جو نذر کے سبب ان کے ذمہ واجب تھا۔

جس نے طاعت کی نذر مانی پھر مرتد ہو گیا (العیاذ باللہ عنہ) بعد ازاں پھر اسلام قبول کر لیا تو جو کچھ نذر کے سبب اس کے ذمہ واجب ہوا تھا اسے پورا کرنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر لازم نہیں کیونکہ قربت اور طاعت کی نذر بھی قربت اور طاعت ہی ہوتی ہے لہٰذا دیگر طاعتوں کی طرح یہ بھی مرتد ہونے کے سبب باطل ہو جائے گی۔ نتیجتاً اس پر حکم مرتب ہی نہیں ہوگا (لہٰذا نذر کے سبب واجب ہونے والی شئی کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس کسی نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی پھر کاروبار معاش میں مشغول ہونے کے سبب روزے نہ رکھ سکا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھے اور ہر روزے کے عوض نصف صاع گندم (کسی فقیر، محتاج) کو دے دے۔ یہ مسئلہ اسی طرح فتاویٰ کبریٰ میں ہے اور علامہ ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ اگر وہ اپنی تنگدستی کے سبب اتنا کھانا دینے پر قادر نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور معافی مانگے۔ فتویٰ اس پر ہے کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی وہ اگر چاہے تو روزہ رکھے اور اگر چاہے تو کفارہ ادا کرے۔ اسی طرح فتاویٰ الحجہ میں ہے۔ یہی اختلاف اس آدمی کے بارے ہے جس نے کوئی بھی ایسی نذر مانی جسے پورا کرنا اس کے لئے انتہائی مشکل ہو اور وہ اس کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ جنہوں نے اس میں کفارہ جائز قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے کسی ایسی شئی کی نذر مانی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے (1)۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: جس کسی نے دس یا سو حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے یہ اختلاف ہے کہ آیا اس پر تمام حج کرنے لازم ہوں گے اور ان کے بارے وصیت کرنی لازم ہوگی یا صرف اتنے حج لازم ہوں گے جہاں تک اس کی زندگی نے وفا کی؟ تو خلاصہ میں ہے کہ اس پر تمام حج لازم ہوں گے۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرا قول مروی ہے اور اسی کو علامہ سرخسی نے بھی اختیار کیا ہے اور اگر اس نے ایک ہی سال میں دس حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے علامہ سرخسی نے کہا ہے کہ اس پر دس سال میں دس حج لازم ہوں گے۔ اور خلاصہ کی روایت میں ہے کہ اس پر ایک ہی سال میں دس حج لازم ہوں گے۔ پس اگر اس نے اپنی طرف سے دس افراد کو حج کرا دیا تو اس کی نذر پوری ہو جائے گی، اگر دس سال گزرنے سے قبل وہ فوت ہو گیا۔ اور اگر وہ اتنے عرصہ تک زندہ رہا اور

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 281 (الفکر)

جب بھی وہ ہر سال حج کا وقت پائے گا تو اس پر بذات خود حج کرنا واجب ہوگا اور اس صورت میں اپنی طرف سے دوسروں کو حج کرانا باطل ہو جائیگا کیونکہ وہ بذات خود حج کرنے پر قادر ہے اس لئے اس کا دوسروں کو حج کرانا صحیح نہیں اور اگر اس نے ہر سال حج کرنے کی طاقت نہ رکھی تو پھر اس صورت میں کفارہ کے جائز ہونے میں سابقہ اختلاف ہی ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا میں حج کروں گا تو اتنا کہنے سے اس پر حج کرنا لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ وعدہ ہے نذر نہیں۔ البتہ وعدہ کو وفا کرنا امر مستحب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفاء عطا فرمائی تو مجھ پر حج کرنا لازم ہے۔ تو اس پر فرض حج کے علاوہ حج نذر لازم ہو جائیگا۔ لہٰذا جب اس نے حج کیا اور کوئی معین نیت نہ کی تو اس پر فرض حج کے علاوہ حج نذر لازم ہو جائے گا۔ لہٰذا جب اس نے حج کیا اور کوئی معین نیت نہ کی تو وہ اسلام کی جانب سے عائد ہونے والا فریضہ حج ادا ہوگا۔ پھر جب دوسرے سال وہ حج ادا کرے گا اور اس نے اس سے کوئی خاص نیت نہ کی تو کہا گیا ہے کہ وہ نفل حج ہوگا کیونکہ نذر مانے ہوئے حج کیلئے نیت کے ساتھ تعیین ضروری ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا کہ مجھ پر حج لازم ہوگا اگر فلاں چاہے تو اگر اس فلاں نے چاہا تو پھر اس پر حج کرنا لازم ہوگا۔ اور اس فلاں کی مشیت فقط اس مجلس تک محدود نہیں ہوگی جس میں اسے اس کی خبر پہنچے۔ (بلکہ مجلس خبر کے بعد بھی وہ اپنی مشیت کا اظہار کر سکتا ہے) بخلاف طلاق کو کسی کی مشیت پر معلق کرنے کے۔ (اس کے بارے مجلس میں خبر میں ہی مشیت کا اظہار ضروری ہوتا ہے) کیونکہ طلاق تملیک کو قبول کرتی ہے اور تملیک مجلس میں ہی جواب کا تقاضا کرتی ہے، جبکہ حج کے مسئلہ میں یہ تعلیق محض ایک شرط ہے۔ (اس لئے جواب مجلس کے ساتھ ہی محصور نہیں)

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کرے گا تو استحساناً اس پر وہ تمام مال صدقہ کرنا واجب ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ بندے کے ایجاب کو اللہ تعالیٰ کے ایجاب پر قیاس کیا جائیگا۔ لہٰذا نذر کے سبب بندے کے واجب کردہ مال کو اس مال کی طرف پھیر دیا جائے گا جس میں شریعت نے صدقہ واجب کیا ہے کیونکہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے فاضل مال کو صدقہ کرنا مقصود ہے اور فاضل مال وہی ہوتا ہے جو نصاب زکوٰۃ ہے۔ بخلاف وصیت کے کہ وہ حالت استغناء میں واقع ہوتی ہے۔ (یعنی وصیت ایسی حالت میں کی جاتی ہے جب موصی کو مال کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اس لئے اس کا حکم بھی مذکورہ بالا حکم کے خلاف ہے) اور جس نے یہ نذر مانی کہ جو کچھ اس کی ملک میں ہے اسے صدقہ کرے گا تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے نزدیک اس پر تمام مال صدقہ کرنا لازم ہوگا۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں تمام مال صدقہ کرنا اس کے ذمے واجب ہوگا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دونوں صورتوں میں اپنے مملوکہ مال کا تیسرا حصہ صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا کیونکہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی میری توبہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں اپنا وہ گھر چھوڑ دوں جس میں مجھ سے گناہ صادر ہوا اور اپنا کل مال صدقہ کر کے اس سے علیحدگی اختیار کر لوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری طرف سے مال کا تیسرا حصہ (صدقہ کرنا) کافی ہے (1)۔ رواہ رزین۔

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 481 (العلمیہ)

ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ آپ نے اپنا تمام مال صدقہ کرنے کی نذر مانی تھی بلکہ آپ نے فقط صدقہ کا ارادہ کیا تھا۔ پس حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کو ایک تہائی مال صدقہ کرنے کا اشارہ دیا تاکہ آپ کے ذمے جو (غریب) لوگوں کے حقوق ہیں وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن مالک کی حدیث میں تہائی کا ذکر نہیں فرمایا۔ اسے شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی میری توبہ میں سے یہ ہے کہ میں اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں اور سب مال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کی خدمت میں پیش کردوں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنا کچھ مال اپنے پاس روک لو، وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا تو میں نے عرض کی میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیبر میں ہے (1)۔

مسئلہ: اگر یہ کہا کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو اس میں وہ مال داخل نہیں ہوگا جو لوگوں کے پاس بطور قرض موجود ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جو مال فی الحال میری ملکیت ہے اور مستقبل میں جس کا مالک بنوں گا وہ سب صدقہ کروں گا تو وہ اتنا سامان اپنے پاس روک سکتا ہے جو اس کی اپنی ذات، بیوی اور دیگر ان افراد کے خرچہ کے لئے ضرورت ہو جن کا نفقہ اس کے ذمے واجب ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانے تو اس پر رمضان المبارک کے روزوں کے بدلے فدیہ دینا لازم نہیں ہوگا کیونکہ وہ ایام رب کریم کے حق کے ساتھ مشغول ہیں۔ لہٰذا رمضان المبارک کے علاوہ دیگر نذر مانے ہوئے ایام کے روزے کسی وجہ سے وہ نہ رکھ سکا تو ان روزوں کا کفارہ اس کے ذمے لازم ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا کہ اللہ کے لئے بکری، گائے یا اونٹ ذبح کرنا مجھ پر لازم ہے یا اس طرح کہا اگر میرا مریض شفایاب ہوا تو ان میں سے کوئی جانور ذبح کرنا مجھ پر لازم ہے تو پہلی صورت میں بالفور نذر پوری کرنے کے لئے جانور کو ذبح کرنا لازم ہے اور دوسری صورت میں شرط پائے جانے پر حکم معلق رہے گا (جب شرط پائی جائے گی تو جانور کو ذبح کرنا لازم ہوگا) دونوں صورتوں میں جہاں چاہے جانور ذبح کر کے گوشت فقراء میں تقسیم کر سکتا ہے۔

نوادر ابن سماعہ میں ہے کہ اگر اس نے کہا اللہ کیلئے مجھ پر ذبح کرنا ہے اور ساتھ صدقہ کے الفاظ نہ کہے تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس نے ان الفاظ کے ذریعے اپنے ذمے ایسا مال لازم کیا ہے جس کی جنس سے واجب موجود ہے۔ اس لئے ذبح کرنے سے مراد جانور ذبح کر کے گوشت فقراء میں تقسیم کرنا ہوگا۔ مگر جب اس نے صرف ذبح کا ارادہ کیا (تو پھر گوشت کی تقسیم لازم نہیں ہوگی اور اس کلام کو نذر پر محمول نہیں کیا جائیگا)

اور اگر یہ کہا کہ اللہ کے لئے مجھ پر ھدی لازم ہے تو اس پر ایسے جانور کو ذبح کرنا واجب ہے جس کی قربانی جائز ہوتی ہے مثلاً بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے۔ مگر جب اس نے اونٹ یا گائے کی نیت کی تو پھر اس پر وہی لازم ہوگا جس کی نیت کی۔ اور ساتھ ہی حرم پاک میں اسے ذبح کرنا لازم ہوگا۔ لہٰذا اگر قربانی کے ایام ہوں تو پھر سنت یہ ہے کہ منیٰ میں ذبح کرے ورنہ مکہ مکرمہ میں ذبح کردے اور حرم پاک کی حدود میں جہاں چاہے اس کے لئے ذبح کرنا جائز ہے۔

اور اگر کہا مجھ پر جزور (اونٹ) کی ھدی لازم ہے تو پھر حرم پاک کی حدود میں اونٹ کی قربانی لازم ہوگی۔ اور اگر کہا مجھ پر جزور

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 81-80 (العلمیہ)

لازم ہے اور ساتھ ھدی کا لفظ ذکر نہ کیا تو پھر حرم پاک سے باہر بھی ذبح کرنا جائز ہوگا۔ اور اگر بدنہ کا لفظ ذکر کیا اور ساتھ ھدی کا لفظ ذکر نہ کیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حرم پاک میں اسے ذبح کرنا لازم ہے کیونکہ بدنہ کا لفظ ھدی کے معنی میں مشہور عام ہے اور ھدی کے لئے حرم پاک کی حدود متعین ہیں لہٰذا بدنہ کو بھی حرم پاک میں ذبح کرنا لازم ہوگا۔

مگر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فقط بدنہ کہنے سے اسے حرم پاک میں ذبح کرنا لازم نہیں آتا۔ ہاں اگر اس نے بدنۃ من شعائر اللہ کہا تو پھر حرم پاک میں اس کو ذبح کرنا لازم ہوگا۔

جب اس نے ھدی کا جانور حرم پاک میں ذبح کیا تو اسے چاہئے کہ وہ اس کا گوشت حرم پاک کے مساکین میں صدقہ کردے اور اگر اس نے بیرونی مساکین پر بھی وہ گوشت صدقہ کیا تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔

اگر کسی نے ھدی کی نذر مانی تو کیا ھدی کی قیمت وہاں کے مساکین میں صدقہ کرنا جائز ہے؟ تو اس کے بارے ابوسلیمان کی روایت یہ ہے کہ ھدی کی قیمت تقسیم کرنا جائز ہے جیسا کہ جانوروں کی زکوٰۃ قیمت کی صورت میں دینا جائز ہے اسی طرح ھدی کی نذر کو قیمت کی صورت میں پورا کرنا بھی جائز ہے۔

اور ابوحفص کی روایت میں ہے کہ قیمت تقسیم کرنا جائز نہیں کیونکہ لفظ ھدی میں ذبح کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس صورت میں طاعت و قربت ذبح سے ہی متعلق ہے۔ جبکہ صرف لفظ شاۃ میں یہ معنی موجود نہیں۔ پھر اس نذر کی صورت میں قیمت تقسیم کرنا ذبح کے تابع آتی ہے۔ بخلاف زکوٰۃ کے کیونکہ اس میں قربت اور طاعت کا تعلق صدقہ کرنے سے ہے چاہے اصل جانور صدقہ کر دیا جائے یا اس کی قیمت صدقہ کردی جائے (اس میں ذبح کا مفہوم نہیں)

مسئلہ: جس نے بکری کی نذر مانی اور پھر اس کی جگہ اونٹ ذبح کر دیا تو یہ اقدام احسن اور بہتر ہے کیونکہ اس میں بکری کی جگہ اونٹ ذبح کیا گیا ہے جو کہ اصل منذور جانور سے اعلیٰ بھی ہے اور ذبح کا عمل بھی پایا گیا ہے اس لئے اس سے نذر ادا ہو جائے گی۔ اس لئے اسے بدل بالقیمۃ قرار نہیں دیا جائیگا۔

اور اگر یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر دو بکریوں کی قربانی لازم ہے پھر اس نے ایک بکری ذبح کی جو کہ قیمت کے اعتبار سے چار بکریوں کے مساوی ہو تو اس سے نذر پوری نہیں ہوگی اور وہ فقط ایک بکری ہی متصور ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر یہ بکری قربان کرنا لازم ہے تو اس پر اسی بکری کی قربانی لازم ہوگی اور اگر وہ چوری ہوگئی یا فوت ہوگئی تو پھر کوئی اور بکری اس کے ذمے لازم نہیں ہوگی۔

اسی طرح اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے یہ دراہم صدقہ کرنا مجھ پر لازم ہے پھر صدقہ کرنے سے قبل وہ ضائع ہوگئے تو ان کے سوا کوئی شئی بھی اس کے ذمے لازم نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ ضائع نہ ہوئے پھر ان کے بدلے انہی کی مثل اور دراہم صدقہ کر دیئے تو یہ جائز ہے۔ اور اگر کسی نے چند روٹیاں صدقہ کرنے کی نذر مانی پھر ان کی قیمت صدقہ کردی تو یہ جائز ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے کپڑا قربان کرنا مجھ پر لازم ہے پھر اس نے وہ کپڑا کعبہ معظمہ کے دربانوں کو دے دیا تو اگر وہ دربان فقراء ہیں تو ایسا کرنا جائز ہے (نذر ادا ہو جائے گی) اور اگر وہ فقراء نہیں تو پھر نذر ادا نہیں ہوگی اور اگر اس نے کپڑے سے کعبہ معظمہ کا غلاف بنا دیا تو اس سے نذر ادا نہیں ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا میں یہ بکری بیت اللہ شریف یا مکہ مکرمہ یا کعبہ معظمہ کی طرف ذبح کے لئے بھیجوں گا تو اس پر نذر کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر اس نے مذکورہ الفاظ کی بجائے حرم شریف یا مسجد حرام کے الفاظ کہے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں۔ جبکہ صاحبین کے نزدیک ہر دو صورت میں نذر ثابت ہو جاتی ہے اور اسے پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر صفا وغیرہ کے الفاظ کہے تو بالاتفاق یہ نذر ثابت نہیں ہوگی۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب صرف لفظ ھدی ذکر کیا جائے تو پھر نذر ثابت ہو جاتی ہے اور حرم پاک میں جانور کو ذبح کرنا لازم ہوتا ہے تو اگر لفظ ھدی کے ساتھ حرم یا صفا کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے تو اس سے وجوب ثابت ہونے کے بعد ختم نہیں ہوگا (یعنی چاہئے کہ اس صورت میں جانور کو وہاں ذبح کرنا بدرجہ اولیٰ لازم ہو) تو اس کے بارے ہم یہ کہتے ہیں کہ جب مطلق لفظ ھدی ذکر کیا جائے تو وہاں بیت یا مکہ مکرمہ کے الفاظ مقدر تصور کئے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ نذر موجب ہوتی ہے (اور اسے پورا کرنا لازم اور ضروری ہوتا ہے) لیکن جب ھدی کے ساتھ مسجد یا حرم وغیرہ کے الفاظ بیان کر دیئے جائیں تو پھر ان الفاظ کو مضمر ماننا متعذر ہوتا ہے، اس لئے یہ نذر موجب نہیں ہوتی۔ (لہٰذا اس کے مطابق عمل کرنا لازم نہیں ہوتا)

مسئلہ: اگر کسی نے کہا میں اپنے اس کپڑے سے بیت اللہ شریف کا غلاف بناؤں گا یا میں یہ کپڑا حطیم کعبہ میں لگاؤں گا تو استحساناً نذر اس کے ذمے لازم ہو جائے گی کیونکہ عرفاً ان الفاظ سے حد یہی مراد لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: جس نے کہا اگر میں نے یہ بکری خریدی (اور ساتھ ہی غیر کی مملوکہ بکری کی طرف اشارہ کیا) تو مجھ پر لازم ہے میں اسے کعبہ معظمہ تک قربانی کے لئے بھیجوں گا۔ اس کے بارے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس نذر کو پورا کرنا اس کے ذمے لازم نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک تعلیق بالشرط حکم کے انعقاد کے مانع ہے، سبب کے مانع نہیں۔ چونکہ انعقاد سبب کے وقت بکری اس کی اپنی ملکیت ہی نہیں (بلکہ غیر کی ملکیت ہے) اس لئے نذر لغو ہو جائے گی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا آدمی جس چیز کا مالک نہ ہو اس کی نذر (صحیح) نہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر لازم ہو جائے گی کیونکہ آپ کے نزدیک تعلیق انعقاد سبب کے مانع ہے اور وجود شرط (شراء (خرید)) کے بعد سبب منعقد ہو جاتا ہے لہٰذا نذر لغو نہیں ہوگی (بلکہ وجود شرط کے بعد اسے پورا کرنا لازم ہوگا)

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے آپ کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے غلام کو ذبح کرنا لازم ہے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک استحساناً اس پر بکری ذبح کرنا لازم ہے اور اگر اس نے اولاد کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو ہر بیٹے اور بیٹی کے بدلے ایک بکری کو ذبح کرنا لازم ہوگا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ صرف بیٹے کے عوض بکری ذبح کرنی لازم ہوگی، غلام اور اپنی ذات کے بدلے ذبح لازم نہیں۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کسی کے بدلے بھی اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا اور یہی قیاس ہے کیونکہ اس کی یہ نذر نذر بالمعصیت ہے۔ وجہ استحسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بدلے مینڈھے کی قربانی واجب قرار دی تھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ذبح کو اپنے اوپر واجب کیا تھا۔ جب کہ اپنے آپ کو یا اپنی اولاد کو قتل کرنا شرعاً ممنوع ہے کیونکہ یہ معصیت ہے اور اس نے نذر کے سبب اپنے اوپر قربانی کو لازم کر لیا تو پھر مجازاً جان کا بدل قربان کرنا اسکے ذمے لازم ہوگا (اور وہ بکری ہے) اسی طرح

محمد بن منتشر سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنے آپ کو قربان کرنے کی نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دشمن سے نجات عطا فرمائی۔ پھر اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا مسروق سے پوچھو۔ چنانچہ اس نے آپ سے جا کر سوال کیا تو انہوں نے فرمایا اپنے آپ کو ذبح نہ کرنا کیونکہ اگر تو مومن ہے تو پھر ایک مومن کو توقتل کرنے والا ہو جائے گا اور اگر تو کافر ہے تو پھر جلدی دوزخ میں پہنچ جائے گا۔ لہٰذا ایک مینڈھا خرید لے اور اسے مساکین کے لئے ذبح کر دے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام تجھ سے بہتر تھے، ان کے بدلے مینڈھا ہی قربان کیا گیا تھا۔ پھر اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس فیصلے سے آگاہ کیا تو آپ نے بھی فرمایا میں بھی تجھے یہی فتویٰ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ رواہ ابن رزین۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جو نفع مجھے تیرے مال سے حاصل ہوگا مجھ پر اسے صدقہ کرنا لازم ہے تو جو منافع بھی اسے اس مال سے حاصل ہوگا اسے صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا۔ مگر وہ کھانا جو کھانے کے لئے اس نے اُسے پیش کیا اسے صدقہ کرنا لازم نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے اس طرح نذر مانی کہ اگر میں اس طرح کروں تو جو میں کھاؤں اسے صدقہ کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو شرط پائے جانے کی صورت میں ہر لقمہ کے بدلے ایک درہم صدقہ کرنا اس پر لازم ہے کیونکہ لقمہ کھانا ہے۔ اور اگر یہ نذر مانی جب بھی میں پیوں تو اس کے بدلے صدقہ لازم ہے تو پھر ہر سانس کے بدلے ایک درہم لازم ہوگا نہ کہ ہر گھونٹ کے بدلے۔ (یعنی پینے کے دوران جب بھی وہ سانس نکالنے کے لئے رکے گا تو اس پر ایک درہم صدقہ کرنا لازم ہو جائے گا، ہر ہر گھونٹ کے بدلے درہم لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس کسی نے یہ کہا کہ جس دن زید آئیگا اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کے لئے مجھ پر روزہ رکھنا لازم ہوگا اور اس نے اس قول سے قسم کا ارادہ کیا۔ پھر رمضان المبارک کے کسی دن وہ آ گیا تو حالف پر قسم کا کفارہ ہوگا اور روزے کی قضا نہیں ہوگی کیونکہ شرط (یعنی شکر کی نیت سے روزہ رکھنا) کا وجود ہی نہیں پایا گیا۔ اور اگر روزے کی نیت سے پہلے زید آ گیا اور اس نے اسی روزے سے شکر کی نیت کر لی اور رمضان کی نیت نہ کی تو وہ اس نیت کے سبب اپنی قسم سے بری ہو جائے گا، رمضان کا روزہ بھی ادا ہو جائے گا اور اس پر قضاء بھی نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے اپنے اس قول سے قسم کا ارادہ نہ کیا تو اس پر کوئی شئی بھی لازم نہیں ہوگی کیونکہ رمضان المبارک تو اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ حق کے ساتھ مشغول ہے لہٰذا اس پر نذر کا روزہ واجب ہی نہیں ہوگا۔ (گویا یہ نذر ہی صحیح نہیں)

مسئلہ: جب مریض نے ایک مہینہ روزے رکھنے کی نذر مانی اور پھر صحت یاب ہونے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: جس کسی نے کسی مہینے یا سال کے معینہ دن کا روزہ رکھنے کی نذر مانی تو جب سال یا مہینے کا وہ معین دن آئے گا تو اس کا روزہ اس پر لازم ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے سوموار یا جمعرات کے دن روزہ رکھنے کی نذر مانی تو اس پر ان ایام میں ایک بار روزہ رکھ لینا کافی ہوگا اور اگر اس کی نیت ہر جمعرات یا پیر کو روزہ رکھنے کی ہو (تو پھر حکم اس کی نیت کے مطابق ہی ہوگا)

مسئلہ: نذر کے الفاظ بغیر ارادے کے جب زبان پر جاری ہو جائیں تو ایسی نذر کو بھی پورا کرنا اسکے ذمے لازم ہوگا کیونکہ یہ انشاء ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں ہیں جنہیں بالارادہ سنجیدگی سے کیا جائے تب بھی ادا ہو جاتی ہیں اور مزاحاً کیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر اس سال کے روزے لازم ہیں تو اس کے بارے بعض نے کہا ہے کہ نذر کے وقت سے لے کر بارہ ماہ تک اس پر روزے رکھنا لازم ہیں۔ فتاویٰ قاضیخان اور خلاصہ میں ہے کہ سال کی ابتداء محرم سے ہوتی ہے اور اس کی انتہاء ذوالحجہ پر ہوتی ہے تو جب اس نے نذر کے الفاظ ادا کرتے وقت موجودہ سال کی طرف اشارہ کیا تو اس پر سال کے بقیہ مہینوں کے ذوالحجہ کے آخر تک روزے رکھنے لازم ہوں گے اور سال کا جو وقت پہلے گزر چکا ہے اس کے بدلے کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی یہ نذر مانے کہ مجھ پر گزشتہ دن کا روزہ رکھنا لازم ہے۔ تو اس کی یہ نذر لغو ہوگئی ہے اور اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔

اسی طرح جس نے یہ نذر مانی کہ مجھ پر اس مہینے کے روزے لازم ہیں تو اسی ماہ کے باقی روزے اس کے ذمے لازم ہوں گے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے آج کا یا آج کل کا روزہ لازم ہے تو اس پر صرف آج کا روزہ لازم ہوگا اور گزشتہ کل کی قضاء لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: جس نے سال بھر روزے رکھنے کی نذر مانی تو اس پر واجب ہے کہ ان دنوں میں روزے نہ رکھے جن میں روزے رکھنا ممنوع ہیں۔ اسی طرح عورت ایام حیض میں روزے نہیں رکھے گی اور پھر انکی قضاء کرے گی۔ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مرد اور عورت دونوں پر دونوں صورتوں میں قضاء لازم نہیں اور اگر ان دنوں میں روزہ رکھا تو روزے دار گنہگار ہوگا لیکن اس سے قضاء ساقط ہو جائے گی۔

مسئلہ: جس عورت نے یہ نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر ایام حیض کے روزے رکھنا لازم ہیں تو اس کی نذر صحیح نہیں ہوگی اور اس پر قضاء واجب نہیں ہوگی کیونکہ اس نے روزے کی نسبت ایسے وقت کی طرف کی ہے جو روزے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے مجھ پر رات کو روزہ رکھنا لازم ہے (تو چونکہ رات روزے کا وقت نہیں اس لئے نذر صحیح نہیں ہوگی)

؎ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ بیت اللہ کو عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر جابر اور ظالم حکمران کی دست درازی اور تخریب کاری سے آزاد کر رکھا ہے اور کبھی بھی کسی جابر کا اس پر قبضہ نہیں ہوا(1)۔ ترمذی نے حضرت ابن زبیر سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیت اللہ کا نام عتیق اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ کوئی جابر حکمران اس پر غالب نہیں آ سکتا(2)۔ لیکن اس کی تردید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ہو جاتی ہے آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کعبہ معظمہ کو چھوٹی پنڈلیوں والا حبشی تباہ کرے گا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا گویا کہ میں اس منظر کو دیکھ رہا ہوں کہ کھلی رانوں والا حبشی کعبہ معظمہ کا ایک ایک پتھر اکھیڑ رہا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(4)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اہل حبشہ کو چھوڑے رکھو جب تک وہ تمہیں چھوڑے رکھیں کیونکہ کعبہ معظمہ کا خزانہ چھوٹی پنڈلیوں والے حبشی کے سوا کوئی نہیں نکال سکے گا(5)۔ اسے ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مستقبل میں کعبہ معظمہ پر جابر مسلط ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ احادیث عتیق کے مذکورہ بالا بیان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 114 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 216 (وزارت تعلیم) 4۔ ایضاً، صفحہ 217 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 236 (وزارت تعلیم)

کیے گئے معنی کے منافی ہیں۔

بعض نے عتیق کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے غرق ہونے سے محفوظ رکھا کیونکہ طوفان نوح کے ایام میں کعبہ معظمہ کو اوپر اٹھالیا گیا تھا(1)۔

ابن زید اور حسن نے کہا ہے کہ بیت اللہ کا نام عتیق اس کے بہت قدیمی اور پرانا ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہی وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لئے بنایا گیا۔ رب کریم فرماتے ہیں اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ۔ کہا جاتا ہے دینار عتیق (پرانا دینار)(2) بعض نے کہا ہے کہ یہاں عتیق بمعنی کریم ہے۔ (معزز، عمدہ اور اعلیٰ) گھوڑے کو عمدہ ہونے کی وجہ سے عتاق الخیل کہا جاتا ہے جب غلام غلامی کی ذلت سے نکل کر آزادی کی عزت میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے عتق الرقیق۔

میرے نزدیک پسندیدہ قول حضرت سفیان بن عینیہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ کعبہ معظمہ کسی انسان کی ملکیت نہیں اس لئے اس کا نام عتیق رکھا گیا ہے۔ صرف کعبہ معظمہ کا ہی کوئی مالک نہیں بلکہ اس کے گردسارے حرم شریف کا کوئی آدمی مالک نہیں چاہے وہ مسافر ہو یا شہر کا رہنے والا۔ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ جاننا چاہئے کہ بیت اللہ شریف کا طواف نماز کی طرح عبادت مقصودہ معقولہ ہے۔ طواف کی مختلف قسمیں ہیں۔ (1) طواف فرض: یہ طواف حج اور عمرہ کا رکن ہے۔ (2) طواف واجب: اس سے مراد طواف قدوم اور طواف وداع ہے۔ ان کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ (3) ان کے علاوہ بقیہ تمام طواف نفل ہیں اور ایسے طواف کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے بنی عبد مناف تم میں سے جس کو لوگوں کے امور میں سے کسی کا والی بنایا جائے تو دن یا رات کی کسی ساعت میں بھی بیت اللہ شریف کا طواف کرنے اور اس میں نماز پڑھنے سے کسی کو بھی نہ روکے(3)۔ اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب سنن، ابن خزیمہ، ابن حبان، دار قطنی اور حاکم نے ابو الزبیر سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے اس حدیث کو عبد اللہ بن باباہ کے واسطہ سے حضرت جبیر بن مطعم سے نقل کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دار قطنی نے اسے دوسری دو سندوں سے نافع بن جبیر عن ابیہ اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے لیکن یہ روایت معلول ہے۔ دار قطنی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ ابو نعیم نے تاریخ اصبہان میں اور خطیب نے التلخیص میں عامر بن عبیدہ عن ابی الزبیر علی بن عبد اللہ بن عباس عن ابیہ سے نقل کیا ہے۔ اور یہ روایت بھی معلول ہے۔ ابن عدی نے اسے سعید بن راشد سے اور انہوں نے عطاء کے واسطہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

مسئلہ: نفلی طواف نذر کے سبب واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز۔ اس آیت میں بالا جماع طواف سے مراد حج کے دوران طواف زیارت کرنا ہے اور یہ طواف بالا جماع حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ طواف زیارت کے علاوہ کوئی طواف بھی رکن نہیں۔

مسئلہ: طواف قدوم امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سنت ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ یہی موقف شوافع میں سے ابو ثور نے بھی اختیار کیا ہے۔ اس کے ترک کرنے سے ایک جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے البتہ اس کے ترک کرنے سے بالا جماع حج فوت نہیں ہوتا۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج ادا فرمایا اور اس کے بارے ام المومنین

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 115 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 106 (فاروقی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مجھے یہ اطلاع دی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ پھر اس کے بعد کوئی عمرہ نہیں کیا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج کیا، آپ نے بھی سب سے پہلے بیت اللہ شریف کا طواف کیا پھر کوئی عمرہ نہیں کیا تھا۔ پھر حضرت عمر اور بعد از اں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اسی طرح کیا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (1)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حج اور عمرہ پر قادر ہوئے تو آپ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلے طواف کیا۔ اسمیں پہلے تین چکر دوڑ کر لگائے اور آخری چار چکر پر سکون چال کیساتھ ادا کئے۔ بعد ازاں دو رکعت نماز نفل ادا کی اور پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ متفق علیہ (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج مفرد ادا کیا اور اسکی دلیل ثُمَّ لَمْ يَكُنْ عُمْرَةً (پھر کوئی عمرہ نہیں کیا گیا) کے الفاظ ہیں۔ آپ نے مذکورہ دونوں حدیثوں سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ طواف قدوم واجب ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر سب سے پہلے طواف قدوم ادا کیا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مناسک حج مجھ سے سیکھو۔ لہٰذا طواف قدوم واجب ہوا کیونکہ بالا جماع طواف قدوم کے بعد صفا اور مروہ کے مابین سعی جائز ہے۔ اور بالا جماع صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب ہے اور بالا جماع سعی کے جائز ہونے کے لئے اس سے پہلے طواف کا ہونا شرط ہے۔ اور واجب نفل کے تابع نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے باسیوں کے لئے طواف زیارت کے بعد ہی صفا اور مروہ کے مابین سعی جائز ہے کیونکہ ان پر طواف قدوم نہیں ہے اور طواف کے بعد بطور نفل سعی جائز نہیں۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ کثیر احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج قران کیا تھا کیونکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کا تلبیہ کہتے خود سنا ہے۔ آپ ﷺ فرمار ہے تھے لَبَّيْكَ عُمْرَةً وَّ حَجًّا۔ متفق علیہ (3)۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں اکٹھے کئے تھے (4)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عمرہ سے حج تک تمتع کیا تھا اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور بھی لائے جن کی قربانی کی تھی۔ متفق علیہ (5)۔ اس جیسی اور احادیث کی بناء پر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بن حنبل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج تمتع کیا تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تمتع سے مراد حج قران ہے۔ کیونکہ عمرہ سے حج تک تمتع کرنے کا لغوی معنی یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں ایک ہی سال میں حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کرنا، چاہے تو دونوں ایک ہی احرام کے ساتھ ادا کئے جائیں یا دو مختلف احراموں کے ساتھ۔ (یعنی دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ احرام باندھا جائے) ارشاد باری تعالیٰ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ سے یہی مراد ہے۔ اور حج تمتع کی حج قران کے مقابلہ میں جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے وہ فقہاء کی جدید اصطلاح ہے اور جو دو حدیثیں ہم نے ذکر کی ہیں وہ اور انکے علاوہ دیگر احادیث صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا احرام باندھا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 219 (وزارت تعلیم)　2۔ ایضاً، صفحہ 218　3۔ صحیح مسلم، جلد 8، صفحہ 176 (العلمیہ)
4۔ ایضاً، صفحہ 168　5۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 79 (الفکر)

تھا۔

پھر لوگوں کا اس بارے اختلاف ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو کیا آپ ﷺ نے ایک طواف کیا یا دو طواف؟ یعنی ایک طواف قدوم اور دوسرا طواف عمرہ۔ تو اس بارے جمہور کا موقف یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ نے صرف ایک ہی طواف ادا فرمایا۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ آپ ﷺ نے دو طواف کئے۔ جمہور نے صحیح بخاری کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے' طواف کیا' صفا و مروہ کے مابین سعی فرمائی اور پھر طواف کے لئے کعبہ معظمہ کے قریب تک نہ گئے یہاں تک کہ عرفہ (عرفات) سے واپس تشریف لے آئے(1)۔

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سال حج کا ارادہ فرمایا جس سال حجاج حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر چڑھائی کئے ہوئے تھا۔ تو آپ سے یہ عرض کی گئی کہ لوگ باہم جنگ و جدال اور جھگڑے فساد میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ آپ کا راستہ روک لیں گے۔ تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (اگر ایسی صورت حال پیش آئی) تو میں وہی کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ بیشک میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ واجب کر لیا ہے۔ پھر آپ چل پڑے یہاں تک کہ جب مقام بیداء کے باہر پہنچے تو فرمایا حج اور عمرہ کی ایک ہی حالت ہوتی ہے' میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ کے ساتھ حج بھی واجب کر لیا اور آپ نے مقام قدید سے ایک قربانی کا جانور خرید کر وہ بھی ساتھ کر لیا(2)۔ اور مکہ مکرمہ میں یوم نحر آنے سے قبل نہ آپ نے قربانی کی' احرام کے سبب ممنوع ہونے والے امور میں سے کسی کا ارتکاب نہیں کیا' سر کا حلق نہیں کرایا اور نہ ہی بال ترشوائے۔ یہاں تک کہ جب یوم نحر آیا تو آپ نے اپنی قربانی کو ذبح کیا اور سر کا حلق کروایا۔ اور یہ خیال فرمایا کہ آپ کا حج اور عمرہ دونوں پہلے ہی طواف کے ساتھ ادا ہو چکے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ متفق علیہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ راوی نے دوسری حدیث میں کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کیا تو اس کے لئے ایک ہی طواف کافی ہے۔ وہ احرام نہ کھولے یہاں تک کہ (دونوں ادا کرنے کے بعد) دونوں کی جانب سے اکٹھا احرام کھول دے۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ جب آپ بیت اللہ شریف پہنچے تو طواف کے سات چکر لگائے اور صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کی اور اس سے زائد کچھ نہ کیا اور یہ خیال کیا کہ یہی کافی ہے۔

احناف نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھا احرام باندھا اور پھر دونوں کے لئے دو طواف کئے اور صفا و مروہ کے مابین دو مرتبہ ہی سعی کی۔ اور پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے(3)۔ دارقطنی اور نسائی نے اسے کئی طرق سے روایت کیا ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے ان کی اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جب تم حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا احرام باندھو تو دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ دو طواف کرو اور دونوں کے لئے صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی دو بار کرو۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 209 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 263 (المحاسن)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حج قران کرنے والا کعبہ معظمہ کا طواف دو بار کرے اور صفا و مروہ کے مابین سعی بھی دو بار کرے (1)۔

حافظ نے کہا ہے کہ جو اقوال حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع نقل کئے گئے ہیں ان کی اسناد ضعیف ہیں لیکن امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر افراد نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو اقوال موقوفاً نقل کئے ہیں ان میں مجموعی طور پر کوئی ضعف نہیں وہ قابل قبول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اگر ثابت بھی ہے تو بھی یہ اس پر دلالت نہیں کرتی کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے منیٰ کی طرف جانے سے قبل دو طواف کئے، ایک طواف عمرہ کے لئے اور ایک طواف قدوم۔ بلکہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے عمرہ کے لئے طواف اور سعی منیٰ کی طرف جانے سے پہلے ادا کئے اور پھر یوم نحر کو حج کے لئے طواف اور سعی ادا کی۔ یہی معنی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے دو بار طواف فرمایا اور دو مرتبہ ہی سعی کی۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے (2)۔

کسی بھی صحیح یا ضعیف حدیث میں آپ ﷺ کے بارے یہ مروی نہیں کہ آپ ﷺ نے عمرہ کے طواف کے بعد طواف قدوم فرمایا ہو۔ مگر مسند ابی حنیفہ میں صبی بن معبد سے یہ مروی ہے کہ میں جزیرہ سے حج قران ادا کرنے کے لئے آیا۔ اس دوران سلیمان بن ربیعہ اور زید بن صوحان کے پاس سے میرا گزر ہوا (اس وقت میں حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا تلبیہ کہہ رہا تھا) چنانچہ انہوں نے مجھ سے یہ الفاظ سنے لبیک بحجۃ و عمرۃ۔ تو ان میں سے ایک نے کہا یہ تو اونٹ سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ دوسرے نے کہا یہ تو فلاں فلاں شئی سے بھی بڑھ کر گمراہ ہے۔ میں چلا گیا یہاں تک کہ میں نے تمام احکام ادا کر دیئے۔ بعد ازاں میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ راوی آگے بیان کرتے کرتے یہ کہتا ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ دریافت کیا کہ پھر تو نے کیا کیا؟ تو میں نے یہ عرض کی میں چلتا گیا اور میں نے اپنے عمرہ کے لئے طواف کیا اور پھر سعی کی۔ پھر میں واپس لوٹا اور پھر اپنے حج کے لئے اسی طرح کیا (یعنی طواف اور سعی ادا کی) پھر میں احرام کی حالت میں ہی باقی رہا اور وہی کچھ کرتا رہا جو دوسرے حاجی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا آخری رکن تک ادا کر دیا تو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تو نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی سنت کی ہدایت کو پالیا۔ مسند امام ابی حنیفہ کی روایات جمع کرنے والے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان کئی ایسے افراد اور رواۃ موجود ہیں جن کے احوال معروف نہیں اس لئے مسند کی احادیث صحیح بخاری کی اس حدیث کے معارض بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ طواف کے لئے کعبہ معظمہ کے قریب تک نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ عرفات سے واپس لوٹ کر آئے (3)۔ واللہ اعلم۔

جب یہ امر ثابت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج قران ادا فرمایا اور اس وقت عمرہ کے طواف کے سوا طواف قدوم نہیں کیا' تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ طواف قدوم حج کے ارکان میں سے ایک رکن نہیں اور نہ ہی یہ مستقل طور پر واجب ہے بلکہ یہ سنت ہے اور تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کی طرح ہے۔ یہ کسی واجب اور دوسری سنت کے ضمن میں ادا ہو جاتا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ جو آدمی مسجد

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 406 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 264 (المحاسن)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 445 (الفکر)

میں داخل ہوا اور آتے ہی وہ فرض یا سنت مؤکدہ ادا کرے تو تحیۃ المسجد کی طرف سے وہی کافی ہو جاتی ہے پس حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ تشریف لائے اور عمرہ کے لئے طواف فرمایا تو یہی طواف طواف قدوم کی جانب سے بھی کافی ہو گیا۔

مسئلہ: بالا جماع طواف صدر (وداع) بھی حج کا رکن نہیں۔ بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حج کے واجبات میں سے ہے۔ پس جس نے طواف وداع کیا اور پھر اسے مکہ مکرمہ میں کچھ وقت کے لئے رکنا پڑا اور پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد مکہ مکرمہ سے نکلنے کا ارادہ بنا تو اس پر طواف وداع کا اعادہ واجب نہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو آدمی مکہ مکرمہ سے باہر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو آخر میں اس پر طواف وداع کرنا واجب ہے۔ گویا مذکورہ صورت میں آپ کے نزدیک اس آدمی پر طواف وداع کا اعادہ واجب ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف وداع سنت ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ اور حیض اور احصار کے عذر کے سبب بالا جماع یہ طواف ساقط ہو جاتا ہے۔

ہماری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے آپ فرماتے ہیں کہ لوگ (حج سے فراغت پانے کے بعد) ہر طرف سے واپس لوٹ آیا کرتے تھے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بھی واپسی کا سفر اختیار نہ کرے یہاں تک کہ اسکی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہو جائے۔ (یعنی بیت اللہ شریف کا طواف کر کے وہاں سے رخصت ہو) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ اور دار قطنی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ لوگ منیٰ سے ہی اپنے اپنے راستوں پر واپس لوٹ آیا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ ان کی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہونی چاہئے اور آپ ﷺ نے حائضہ عورتوں کو رخصت دی۔

اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی (مکہ مکرمہ) واپس نہ لوٹے یہاں تک کہ اس کی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہو جائے۔ اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو سب سے آخر میں بیت اللہ شریف سے ملاقات کا حکم ارشاد فرمایا مگر حیض والی عورتوں کے لئے اس میں تخفیف فرمائی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ جو بیت اللہ شریف کا حج کرے اسے چاہئے کہ وہ تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد آخر میں بیت اللہ شریف کا طواف کرے مگر حیض والی عورتوں کو رسول اللہ ﷺ نے رخصت عطا فرمائی ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے(2)۔

حضرت عبداللہ بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے جو اس بیت کا حج کرے یا عمرہ۔ تو اسے چاہئے کہ وہ آخر میں بھی بیت اللہ شریف سے ملاقات کرے (یعنی آخر میں اس کا طواف کرے) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(3) اور اسی حدیث سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ طواف وداع حج کے واجبات میں سے ہے کیونکہ حضور نبی کریم کے الفاظ من حج البیت او اعتمر اس کے واجبات حج ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ استدلال پر تو پھر اسے واجبات عمرہ میں سے بھی ہونا چاہئے مگر کسی نے بھی ایسا قول نہیں کیا۔ امام احمد رحمۃ

1۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 335 (صادر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 114 (فاروقی) 3۔ ایضاً

اللہ علیہ کے نزدیک حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد لَایَنْفُرُ اَحَدٌ حَتّٰی یَکُوْنَ اٰخِرُ عَھْدِہٖ بِالْبَیْتِ عام ہے (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ طواف صدر مطلقاً واجب ہے) اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول پر مطلق کو مقید پر محمول کرنا لازم نہیں آتا کیونکہ تقیید سبب پر داخل ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ہر آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو۔ اور دوسرا ارشاد گرامی ہے ہر مسلمان آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو۔ (ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی میں من المسلمین کے الفاظ مذکور نہیں، جبکہ دوسری میں مذکور ہیں تو ان میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا، یعنی پہلی حدیث میں بھی مسلمان آزاد اور غلام مراد ہوں گے) مگر طواف صدر کی حدیث میں ایسا نہیں کیونکہ اس میں قید سبب پر داخل ہے۔ لہٰذا مکہ مکرمہ سے مطلقاً نکلنا طواف کا سبب ہے اور حج سے فارغ ہونے کے بعد بھی مکہ مکرمہ سے نکلنا طواف کا سبب ہے ان دونوں میں کوئی تعارض اور منافات موجود نہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل: بیت اللہ شریف کے طواف کے لئے کچھ شرائط، کچھ ارکان، کچھ واجبات وسنن اور کچھ آداب ہیں۔

طواف کی شرائط: طواف کے لئے نیت کا ہونا شرط ہے کیونکہ نصوص اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ ہر عبادت مقصودہ کے لئے نیت شرط ہے لیکن طواف زیارت کے لئے مطلق طواف کی نیت کرنا کافی ہے، اس میں فرض کی نیت کا تعین کرنا شرط نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ وقوف عرفہ کی طرح طواف زیارت بھی حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور وقوف عرفہ کے لئے تو نیت شرط نہیں بلکہ جس نے نیند کی حالت میں یا غشی کی حالت میں وقوف عرفہ کر لیا یا عرفات کی پہاڑی پر وقوف کیا اور وقوف کرنے والا یہ نہ جانتا ہو کہ یہ عرفات کی پہاڑی ہے تب بھی وقوف عرفہ (جو کہ اہم ترین رکن ہے) ادا ہو جاتا ہے۔

حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں بنی طے کے پہاڑ سے آیا ہوں، میں نے اپنی سواری اور اپنے آپ کو بھی سخت تھکا دیا ہے۔ قسم بخدا! میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر میں نے اس پر وقوف کیا ہے' کیا میری جانب سے حج ادا ہو جائے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اس مقام جمع میں ہمارے ساتھ صبح کی نماز کو پالیا اور اس سے قبل دن یا رات کو عرفات میں حاضر ہوا تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور اس کے مناسک حج ادا ہو گئے (1)۔ رواہ ابوداؤد وغیرہ۔ تو پھر طواف اور وقوف کے درمیان وجہ فرق کیا ہے؟

پھر اگر (طواف زیارت کے لئے) نیت شرط ہے تو پھر تمہارے اس قول کا سبب کیا ہے کہ مطلق طواف کی نیت ہی کافی ہو گی، تعیین فرض کی نیت شرط نہیں۔ حالانکہ ہر اس فرض عبادت کے لئے تعیین نیت شرط ہے۔ جس کے لئے وقت ظرف ہے نہ کہ معیار۔ جیسا کہ نماز۔ (وقت کے ظرف ہونے سے مراد یہ ہے کہ فرض ادا ہو جانے کے بعد بھی وقت باقی رہتا ہے اور معیار سے مراد یہ ہے کہ فرض کی ادائیگی کے بعد وقت باقی نہیں رہتا۔ اس کی مثال روزہ ہے)

ہم کہتے ہیں کہ اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ جب احرام باندھتے وقت حج کی نیت کی جاتی ہے تو اس کے ضمن میں تمام مناسک حج کی نیت بھی ہو جاتی ہے پھر جب تک کوئی دوسری نیت مناسک کی نیت کے خلاف نہ ہو تو ہر رکن کی ادائیگی کے وقت سابقہ نیت کا ہی اعتبار کر لیا جائے گا اور نیت کی تجدید شرط نہیں ہو گی جیسا کہ نماز کے افعال میں ہوتا ہے۔ مگر مناسک میں سے جو مستقل عبادات ہیں مثلاً طواف اور طواف کی دو رکعتیں۔ ان میں شروع ہوتے وقت مطلق نیت کی تجدید شرط ہے کیونکہ نماز اور طواف میں سے ہر ایک کی دو

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 269 (وزارت تعلیم)

جہتیں ہیں ایک جہت سے یہ مستقل عبادت ہیں اور ایک جہت سے عبادت کا جزء ہیں۔ لہٰذا اس حیثیت سے کہ یہ مستقل عبادات ہیں ان کے اجزاء میں سے پہلے جزء کے ساتھ نیت کا ملانا شرط ہے اور اس حیثیت سے کہ یہ عبادت کا جزء ہیں ان کے لئے وہ سابقہ نیت ہی کافی ہے جو احرام کے ساتھ مقترن ہے۔ لہٰذا ہم نے ان دونوں حیثیتوں پر عمل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ چونکہ طواف عبادت ہے اس لئے اس میں شروع ہوتے وقت مطلق نیت کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ یہ عبادت کا جزء ہے اس لئے اس میں نیت کی تعیین شرط نہیں۔ اور وہ مناسک جو مستقل عبادت نہیں بلکہ وہ حج کا جزء ہیں مثلاً وقوف عرفہ اور صفا اور مروہ کے مابین سعی کرنا وغیرہ تو ان کے لئے ہم نے کہا ہے کہ انہیں شروع کرتے وقت نیت کرنا شرط نہیں بلکہ وہی سابقہ نیت کافی ہے جو احرام کے ساتھ مقترن ہے۔

مسئلہ: جس کسی نے دوسرے کو اٹھا کر طواف کیا، اس میں اگر اٹھانے والا محرم نہ ہو اور جس کو اٹھایا ہے وہ محرم ہو اور اٹھانے والے نے محمول (جس کو اٹھایا گیا) کے طواف کی نیت کی اور محمول نے بھی اپنے طواف کی نیت کی تو بالا جماع یہ نیت صحیح ہے اور طواف درست ہے۔ اسی طرح اگر صورت اس کے برعکس ہو، یعنی اٹھانے والا محرم ہو اور محمول محرم نہ ہو اور اٹھانے والے نے اپنے طواف کی نیت کی تو یہ طواف بالا جماع درست ہے۔

اور اگر دونوں محرم ہوں اور اٹھانے والے نے صرف محمول کے طواف کی نیت کی تو اس کا طواف درست ہوگا اور اگر اس نے اپنے طواف کی نیت کی تو صرف اس کا اپنا طواف صحیح ہوگا اور اگر اس نے دونوں کے طواف کی نیت کی تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف اٹھانے والے کا طواف درست ہوگا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر اٹھانے والے نے اپنے لئے طواف کی نیت کی یا دونوں کے طواف کی نیت کی اور اس کے ساتھ محمول نے بھی اپنے طواف کی نیت کی تو دونوں جانب سے نیت پائے جانے کے سبب دونوں کا طواف ادا ہو جائے گا کیونکہ ان دونوں کی نیتوں کے درمیان کوئی منافات اور تعارض موجود نہیں۔

مسئلہ: طواف کی شرائط میں سے حدث اکبر اور حدث اصغر سے پاک ہونا بھی ہے۔ اسی طرح بدن، کپڑے اور جگہ کا احداث سے پاک ہونا ضروری ہے اور جمہور کے نزدیک ستر عورۃ (شرمگاہ کو ڈھانپنا) بھی طواف کی شرائط میں سے ہے جیسا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

آپ فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپ نے وضو فرمایا پھر طواف کیا(1) اور اس کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا خُذُوْا عَنِّی مَنَا سِکَکُمْ۔ (مناسک حج مجھ سے سیکھو) صحیحین میں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ میں حائضہ ہونے کی حالت میں مکہ مکرمہ آئی ..... تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا تم ویسے ہی افعال کرو جیسے حاجی کرتے ہیں مگر پاک ہونے تک بیت اللہ شریف کا طواف نہ کر(2)۔ مسلم کی روایت میں ہے (کہ بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرنا) یہاں تک کہ تم غسل کرلو۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ مکہ مکرمہ سے واپسی کی رات صفیہ حائضہ ہو گئیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا یوم نحر کو انہوں نے طواف (زیارت) کرلیا تھا؟ تو عرض کی گئی جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر واپس چلو۔ متفق علیہ (3)۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حجۃ الوداع سے قبل جس حج میں رسول اللہ ﷺ نے

1۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 86 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 223 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً، صفحہ 220

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا اس حج کے دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قربانی کے دن مجھے لوگوں کے پاس یہ اعلان کرنے کے لئے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے (1)۔ (اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر عورۃ لازمی اور ضروری ہے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ۔ الآیۃ۔ (میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کردو) چونکہ اللہ تعالیٰ عبارۃ النص سے صراحۃً مکان کو پاک کرنے کا حکم ارشاد فرماتا ہے تو اس سے دلالۃً بدن اور کپڑوں کی پاکیزگی کا حکم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام قسم کے حدثوں سے پاک ہونے کا حکم بھی بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ اخباث (نجاستوں) کا حکم احداث کی نسبت شرعاً اخف ہے کیونکہ ضرورت کے وقت نجاست کے ہوتے ہوئے نماز جائز ہوتی ہے لیکن کسی بھی صورت میں حدث کے ساتھ نماز جائز نہیں ہوتی۔ (تو جب نجاستوں سے پاکیزگی کا حکم صراحۃً موجود ہے تو احداث سے پاکیزگی کا حکم بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ پس طواف کا ذکر نماز سے پہلے کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طواف نماز کی طرح ہی ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طواف کے دوران بولنے کی اجازت دی ہے پس جو بھی اس دوران گفتگو کرے اسے چاہئے کہ وہ اچھی گفتگو کرے (2)۔ اسے حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اور صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں طبرانی اور بیہقی نے بھی نقل کیا ہے اور ابونعیم نے حلیہ میں صرف مرفوع روایت نقل کی ہے۔

ترمذی، حاکم، دارقطنی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیت اللہ شریف کا طواف کرنا نماز ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طواف کے دوران کلام کو مباح قرار دیا ہے (3)۔ ابن سکن نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نجاستوں سے طہارت حاصل کرنا سنت ہے اور ستر عورۃ اور احداث سے طہارت حاصل کرنا واجب ہے۔ اسے ترک کرنے والا گنہگار ہوگا اور اگر اس نے فرض طواف جنبی حالت میں یا ننگے بدن کیا تو اس پر بدنہ کی قربانی واجب ہوگی۔ اور اگر فرض طواف بے وضو حالت میں کیا یا اس کے علاوہ کوئی عمل جنابت کی حالت میں یا ننگے بدن کیا تو اس پر مطلق دم (جانور کی قربانی) واجب ہوگا۔ اور اگر فرض طواف کے علاوہ کوئی طواف بغیر وضو کے کیا تو اس پر کسی مسکین کو نصف صاع گندم صدقہ کرنا لازم ہوگی۔ ان چیزوں میں سے کوئی بھی آپ کے نزدیک طواف کے لئے شرط نہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ سے مطلق طواف ثابت ہے اور کتاب اللہ پر زیادتی کرنا آپ کے نزدیک اس کے حکم کو منسوخ کرنا ہے اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں۔ لہٰذا آپ نے احادیث پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ تمام چیزوں کو واجب قرار دیا ہے، انہیں شرط نہیں کہا تا کہ کتاب اللہ کا نسخ لازم نہ آئے۔

مسئلہ: طواف زیارت کی شرائط میں سے وقت بھی ہے کہ یہ وقت سے پہلے ادا نہیں کیا جا سکتا اور وقت گزر جانے کے بعد بالاجماع اس کی قضاء کی جائیگی۔ پس اگر کسی نے اپنی کوتاہی اور سستی کے سبب طواف کو وقت سے مؤخر کر دیا تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔ مگر جمہور کا موقف اس کے خلاف ہے اور اگر کسی نے عذر مثلاً احصار اور حیض وغیرہ کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 220 (وزارت تعلیم) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 296 (العلمیۃ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 144 (العلمیۃ)

سبب اسے مؤخر کردیا تو اس پر قربانی واجب نہیں ہوگی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف زیارت کا وقت یوم نحر کی طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یوم نحر کی رات میں نصف رات کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے کیونکہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کی رات مجھے بھیج دیا۔ پس میں نے فجر سے پہلے رمی جمار کیا پھر واپس جاکر طواف زیارت کیا(1)۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی ضحاک بن عثمان ہے جسے قطان نے لین فی الحدیث کہا ہے اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے خلاف بھی ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل میں سے کمزور لوگوں کو پہلے بھیج دیا اور انہیں فرمایا سورج طلوع ہونے تک رمی جمار نہ کرنا(2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے اور اسے ابوداؤد، نسائی، طحاوی اور ابن حبان نے حسن غریب کی سند سے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ ترمذی اور طحاوی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد، نسائی، طحاوی اور ابن حبان کے نزدیک اس کی دوسری اسناد بھی ہیں جن میں سے بعض کی تقویت کا سبب بنتی ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں طواف افاضہ (طواف زیارت) ثم اور فاء کے کلمہ کے ساتھ رمی جمار پر معطوف ہے اور یہ طواف افاضہ کے طلوع فجر سے پہلے کرنے پر دلالت نہیں کرتا۔ (اصل کلمات اس طرح ہیں "قَالَتْ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةَ النَّحْرِ فَرَمَتِ الْجَمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ ثُمَّ مَضَتْ فَاَفَاضَتْ۔ تو ثم چونکہ تعقیب مع التراخی پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس سے طواف افاضہ کا طلوع فجر سے مقدم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف زیارت کا آخری وقت ایام تشریق میں سے دوسرے دن کے غروب آفتاب تک ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طواف زیارت کا وقت صرف یوم نحر ہے۔ ہم نے سورۂ براءت کی آیت وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک طواف زیارت کا وقت فقط یوم النحر ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے اسی مفہوم کو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث سے بھی بیان کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور یہی مفہوم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔

ابن جریج نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد تمام ایام منیٰ ہیں اور ثوری کہا کرتے تھے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد تمام ایام منیٰ ہیں کیونکہ یوم سے مراد مطلق وقت اور مدت بھی ہوتی ہے مثلاً یوم صفین، یوم جمل اور یوم بعاث وغیرہ۔

مسئلہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف کی شرائط میں سے ترتیب بھی ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ طواف کی ابتداء حجر اسود سے ہو۔ اس طرح کہ حجر اسود کے پاس سامنے کی طرف منہ کر کے سیدھا کھڑا ہو، مکمل حجر اسود دائیں جانب ہو اور طواف کرتے وقت بیت اللہ شریف بائیں جانب ہو۔ پس اگر کسی نے بیت اللہ شریف کو دائیں جانب رکھتے ہوئے طواف کیا تو وہ جائز نہیں ہوگا اور اگر حجر اسود کے بغیر کسی جگہ سے شروع کردیا تو اس کا اعتبار بھی نہیں کیا جائے گا۔ پس طواف حجر اسود کے پاس ہی اختتام پذیر ہو اور وہیں سے اس کا آغاز ہو۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ترتیب طواف کے لئے شرط نہیں بلکہ اکثر حنفیہ کے نزدیک ترتیب سنت ہے، اسے ترک کرنا مکروہ ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ امام

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 276 (المحاسن) 2۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 100 (العلمیہ)

اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ترتیب واجب ہے۔ اور اسے ترک کرنے کے سبب ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس پر مواظبت اختیار فرمائی ہے اور یہ ارشاد بھی فرمایا ہے کہ مناسک حج مجھ سے سیکھو۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شرط اس لئے نہیں کہا تا کہ کتاب اللہ پر زیادتی لازم نہ آئے۔

مسئلہ: بالاجماع یہ مسئلہ بھی ہے کہ طواف کے لئے مسجد کے اندر سے ہونا شرط ہے نہ کہ مسجد کے اردگرد۔ خبر مستفیض متواتر اسی طرح منقول ہے۔ اگر کسی نے مسجد کے اردگرد سے طواف کیا تو اسے طواف بیت اللہ نہیں کہا جائیگا بلکہ طواف مسجد کہا جائے گا۔ اس لئے دلالت عرف کا تقاضا یہی ہے کہ طواف فقط مسجد کے اندر سے ہو۔

فصل: طواف کا رکن طواف کے سات چکر ہیں اور اگر کہا جائے کہ امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا (لہٰذا ایک چکر ہی کافی ہے) تو ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا اسی طرح امر تکرار کی نفی بھی نہیں کرتا۔ اور ہمارے پاس اخبار مشہور و مستفیض سے یہ منقول ہے کہ طواف کے چکروں کی تعداد نماز کی رکعتوں کی تعداد کی طرح ہے۔

مسئلہ: جس نے طواف کے چار چکر لگائے اور تین چھوڑ دیئے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ طواف جائز ہے اور طواف زیارت کی صورت میں اس پر جانور کی قربانی واجب ہے اور دوسرے طوافوں کی صورت میں صدقہ لازم ہے کیونکہ اکثر کے لئے کل کا حکم ہوتا ہے اور کمی دم اور صدقہ کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔

لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے نزدیک سات سے کم چکروں والا طواف جائز نہیں ہوتا جیسا کہ اگر ظہر کی ایک رکعت چھوڑ دی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی کیونکہ طواف میں چکروں کی تعداد نماز میں رکعتوں کی تعداد کی مثل ہے۔

مسئلہ: حطیم بیت اللہ شریف کا ہی حصہ ہے اس لئے اس کے باہر سے طواف کرنا واجب ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کیا یہ دیوار بیت اللہ شریف میں سے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! پھر میں نے عرض کی لوگوں کو کیا ہوا کہ انہوں نے اسے بیت اللہ شریف میں داخل نہیں کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری قوم کے پاس اخراجات کم ہو گئے تھے۔ میں نے عرض کی بیت اللہ شریف کا دروازہ اتنا بلند کیوں رکھا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسا تمہاری قوم نے کیا تا کہ جسے چاہیں اندر داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں داخل ہونے سے روک دیں۔ اگر تمہاری قوم کا عہد جاہلیت قریب ہی نہ ہوتا اور مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ان کے دل انکار کر دیں گے تو میں ان دیواروں کو بیت اللہ شریف میں داخل کر دیتا اور دروازے کو زمین کے ساتھ متصل لگا دیتا۔ متفق علیہ (1)۔

ترمذی اور نسائی نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی یہ روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا میں نے کعبہ معظمہ میں نماز پڑھنا پسند کیا تو رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے حجر (حطیم) میں داخل کر دیا اور فرمایا اس میں نماز پڑھ لو کیونکہ یہ بیت اللہ شریف کا ہی حصہ ہے۔ الحدیث (2)۔ ابوداؤد نے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ محققین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حطیم کا بعض حصہ بیت اللہ شریف کا حصہ ہے اور وہ چھ گز سے کچھ زائد ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تیری قوم کا عہد شرک ابھی تازہ نہ ہوتا تو میں کعبہ معظمہ کو گرا دیتا اور اسے زمین سے ملا دیتا۔ پھر اسے از سر نو تعمیر کر کے اس کے دو دروازے رکھتا ایک مشرق کی جانب اور ایک مغرب کی جانب اور حجر (حطیم) میں سے چھ گز

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 431 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 107 (فاروقی)

کا ٹکڑا بھی اس میں شامل کر دیتا(1)۔ اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ کعبہ معظمہ کا جو حصہ انہوں نے (تعمیر سے باہر) چھوڑا میرا خیال ہے کہ وہ تقریباً سات گز ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے جریر بن حازم سے نقل کیا ہے کہ یزید بن رومان کا بیان ہے کہ میں اس وقت حاضر تھا جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ معظمہ کو گرایا اور پھر تعمیر کرایا اور حطیم کو اس میں داخل کیا۔ میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ کعبہ معظمہ کی بنیاد کے پتھر اونٹ کی کوہان کی مثل دیکھے۔ پس انہوں نے اس جگہ کی طرف اشارہ بھی کیا(2)۔ جریر کا بیان ہے کہ میں نے حطیم کی اس جگہ کا اندازہ لگایا وہ تقریباً چھ گز کا ٹکڑا تھا۔

مجاہد کی روایت ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حطیم کی جانب سے چھ گز زمین کا کعبہ معظمہ میں مزید اضافہ کیا تھا اور ایک روایت میں چھ گز اور ایک بالشت کا ذکر ہے۔

مسئلہ: جس نے حطیم کے اندر سے طواف کیا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ طواف ادا ہو جائے گا اور اس پر ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی کیونکہ حطیم کا کعبہ معظمہ کا حصہ ہونا حدیث آحاد سے ثابت ہے اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں۔

جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ طواف ادا نہیں ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک کتاب اللہ پر خبر واحد سے زیادتی جائز ہے۔

میں کہتا ہوں (کہ حطیم کے باہر طواف کرنے کو لازم قرار دینا) کتاب اللہ پر زیادتی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیت عتیق کے طواف کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور البیت العتیق پر الف لام عہدی ہے۔ اور البیت سے مراد وہ کعبہ معظمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ جیسا کہ سیاق آیت اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ قول باری تعالیٰ ہے وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ۔ اور جب دلیل ظنی سے یہ ثابت ہوگیا کہ حطیم بیت اللہ شریف کا حصہ ہے تو جس نے حطیم کے اندر سے طواف کیا تو وہ اس کے ادا ہونے میں شک میں مبتلا ہوگیا حالانکہ اس پر بیت اللہ شریف کا طواف بلاشبہ فرض تھا۔ لہٰذا شک کے سبب وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکے گا۔ یا پھر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ کعبہ معظمہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا وہ اپنی مقدار کے اعتبار سے مجمل ہے اور حدیث طیبہ نے اس اجمال کی تفسیر اور وضاحت کر دی ہے۔

مسئلہ: عذر کے سبب طواف زیارت سوار ہو کر کرنا بالاجماع جائز ہے اور اگر کوئی عذر نہ ہو تو پیدل چل کر طواف کرنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ لہٰذا جس کسی نے بغیر عذر کے سوار ہو کر طواف کیا جب تک وہ مکہ مکرمہ میں ہے اس پر دوبارہ طواف کرنا واجب ہے اور اگر اس نے طواف کا اعادہ نہ کیا تو اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔

جمہور نے کہا ہے کہ طواف میں پیدل چلنا سنت ہے، واجب نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ جب بھی آپ ﷺ رکن کے پاس آئے تو اس شئی سے اشارہ کرتے جو آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھی اور اللہ اکبر کہتے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(3)۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے (اونٹ پر سوار ہو کر) بیت اللہ شریف اور صفا و مروہ کا چکر لگایا تاکہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھ لیں، آپ ان میں نمایاں ہو جائیں اور وہ آپ سے سوالات کریں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی کریم ﷺ نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 430 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 16-215 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 87 (الفکر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 17 (العلمیہ)

اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کعبہ معظمہ کے گرد طواف کیا اور (ہر چکر میں) استلام رکن کیا کیونکہ آپ ﷺ یہ ناپسند کرتے تھے کہ لوگ رکن سے اعراض برتیں (1)۔

احناف کا موقف یہ ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ کا سوار ہونا بیماری کے باعث تھا کیونکہ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو آپ بیماری کا اظہار فرما رہے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے اپنی سواری پر ہی طواف کیا۔ جب بھی آپ ﷺ رکن کے پاس آتے تو اپنے عصا مبارک کے ساتھ رکن کو مس کر لیتے۔ پس جب آپ طواف سے فارغ ہوئے تو اپنے اونٹ کو بٹھایا اور نیچے اتر کر دو رکعت (نماز) ادا کی (2)۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ فقط احتمال کافی نہیں ہوتا اور وہ حدیث جو ابوداؤد نے روایت کی ہے وہ ضعیف ہے کیونکہ وہ حدیث یزید بن ابی زیاد کی روایت میں سے ہے اور وہ قوی اور مضبوط راوی نہیں ہے، اس کی روایت کردہ حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ اس حج کے موقع پر بیمار تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ میں آتے وقت کوئی تکلیف ہوتی تو بالیقین وہ تکلیف طواف قدوم میں بھی پیدل چلنے کے مانع ہوتی۔ جبکہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے آپ ﷺ کی صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے طواف قدوم فرمایا، اس کے تین چکروں میں آپ ﷺ نے رمل کیا اور چار چکر پیدل چل کر مکمل کئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے صفا و مروہ کے مابین سعی فرمائی اور سعی کی تیزی کی وجہ سے آپ کی ازار مبارک گھوم رہی تھی۔ (یعنی اڑ رہی تھی)

مذکورہ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے طواف زیارت اس لئے سوار ہو کر کیا تا کہ ایک تو اس کا جواز ظاہر ہو جائے اور دوسرا لوگوں کو مناسک حج کی تعلیم دی جا سکے۔ (اس سواری کا سبب آپ کی بیماری نہیں تھی) رہا طواف نافلہ کا مسئلہ تو جمہور کے نزدیک بلا کراہت سوار ہو کر نفلی طواف کرنا جائز ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق یہ مکروہ ہے۔ جمہور کی دلیل بخاری شریف کی وہ روایت ہے جو سورۂ فتح میں ہم نے ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جب مکہ مکرمہ فتح کیا اور طواف قدوم کیا تو آپ ﷺ نے وہ طواف اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کیا۔

مسئلہ: طواف کو لگاتار اور تسلسل کے ساتھ کرنا بالاجماع شرط نہیں بلکہ اس میں تسلسل برقرار رکھنا سنت ہے۔ سعید بن منصور نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے وہ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ نماز کے لئے اقامت ہوگئی تو انہوں نے طواف کو چھوڑ کر لوگوں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز ادا کی۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر پہلے طواف کو جاری رکھتے ہوئے باقی طواف کو مکمل کیا۔ اسی طرح عبدالرزاق نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے بھی نقل کیا ہے۔

سعید بن منصور نے حضرت عطاء سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ایسے آدمی کے بارے یہ کہہ رہے تھے جو اپنے طواف کا کچھ حصہ ادا کر چکا ہو پھر کوئی جنازہ حاضر ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ طواف چھوڑ کر نماز جنازہ ادا کرے اور پھر واپس لوٹ کر باقی طواف مکمل کرے۔

نافع نے کہا ہے کہ طواف کے دوران طویل قیام کرنا بدعت ہے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اگر کسی آدمی کے طواف کے دوران نماز کھڑی ہوگئی اور اس نے طواف چھوڑ کر نماز پڑھ لی تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد از سر نو مکمل طواف کرے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 18 (العلمیہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 259 (وزارت تعلیم)

فرض طواف کو منقطع کرنا مکروہ ہے اگرچہ فرض نماز کھڑی بھی ہو جائے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے طواف صدر کیا اور اس وقت حضور نبی کریم ﷺ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔

مسئلہ:۔ نفلی طواف منقطع کرنا جائز ہے اگر فرض نماز کھڑی ہو جائے یا نماز جنازہ وغیرہ فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو مگر نفلی عبادت کے لئے طواف کو منقطع کرنا صحیح نہیں۔ وتر کی نماز کے لئے اسے منقطع کرنا اولیٰ ہے جیسا کہ ہم عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا اثر ذکر کر چکے ہیں۔

مسئلہ:۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک طواف کے سات چکروں کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا واجب ہے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے اور امام شافعی کا ایک قول بھی اسی طرح ہے۔ ان کو چھوڑنے کے سبب ایک جانور کی قربانی لازم آئے گی۔ ہم نے یہ مسئلہ اور اس کے تمام متعلقات تفصیل کے ساتھ سورۃ البقرہ کی آیت میں وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى کی تفسیر میں ذکر کر دیئے ہیں۔

فصل:۔ طواف کے آداب یہ ہیں کہ جب آدمی کی نظر بیت اللہ شریف پر پڑے تو اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کے کلمات کہے اور دعا مانگے۔ طبرانی کی روایت ہے کعبہ معظمہ کو دیکھتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ مستجاب اور مقبول ہوتی ہے۔ پھر حجر اسود کے قریب ہو اور اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کہے اور اگر کسی کو اذیت پہنچائے بغیر ممکن ہو تو اسے دونوں ہونٹوں سے بوسہ دے۔

امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ حجر اسود کو مس کرتے اور بوسہ دیتے تھے(1)۔

امام شافعی نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ طویل وقت تک اپنے ہونٹ مبارک حجر اسود پر رکھے رہتے۔ اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہونٹ مبارک اس پر رکھے اور کافی دیر تک روتے رہے۔ اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ (ا) کیا۔

اور اگر خود حجر اسود تک پہنچنا ممکن نہ ہو کسی شے سے اسے مس کرے اور اس شے کو ہی چوم لے جیسا کہ یہ روایت گزر چکی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اونٹ پر طواف کیا اور اپنے عصا مبارک کے ساتھ رکن کو مس کرتے تھے۔ اور اگر اس سے بھی عاجز ہو (یعنی کسی شے کے ساتھ بھی حجر اسود کو چھونا ممکن نہ ہو) تو صرف اس کی طرف منہ کر کے تھوڑا سا رک کے (اور فقط اشارے سے ہی استلام کر لے) حضرت سعید بن المسیب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ تو ایک طاقتور آدمی ہے۔ حجر اسود کے پاس مزاحمت نہ کرنا کہ کسی کمزور اور ضعیف کو اذیت پہنچاؤ اگر جگہ خالی پاؤ تو استلام کر لینا ورنہ صرف اس کی طرف متوجہ ہو کر تکبیر و تہلیل کہہ دینا۔ اسے احمد نے روایت کیا ہے(2)۔

مسئلہ:۔ جب آدمی طواف کے دوران رکن یمانی کے پاس پہنچے تو اس کا استلام کرے۔ یہ جمہور کا موقف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ رکن یمانی کا استلام مستحب ہے سنت نہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دونوں(3) یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام کرتے دیکھا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 442 (الفکر)　2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 351 (صادر)　3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 442 (الفکر)

(ا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ کیا اور پھر کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

دار قطنی نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ رکن یمانی کو بوسہ دیتے تھے اور اس پر اپنے رخسار مبارک رکھتے تھے (1)۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے مقرر ہیں جو کوئی وہاں یہ دعا مانگتا ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" تو وہ فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں (2)۔

مسئلہ:۔ طواف قدوم میں پہلے تین چکروں میں رمل کرنا چاہئے۔ (رمل سے مراد خوب کندھے ہلا کر سینہ تان کر قدرے تیزی سے چلنا چاہئے) اور ساتھ ہی چادر سے اضطباع کرنا چاہئے۔ (اضطباع سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے احرام کی چادر دائیں کندھے کی بغل کے نیچے سے گزار کر چادر کی دونوں طرفیں بائیں کندھے پر ڈال دے تاکہ دایاں کندھا ننگا ہو جائے) طواف کو حجر اسود سے شروع کر کے حجر اسود پر ختم کرنا سنت ہے۔ صحیح حدیث مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تین چکروں میں حجر اسود سے لے کر حجر اسود تک رمل کیا اور پھر چار چکر پیدل چل کر مکمل کئے۔ اور جب بھی آپ ﷺ نے طواف ختم کیا۔ اسی طرح یہ بھی آپ ﷺ سے صحیح حدیث میں مروی ہے کہ آدمی طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نفل ادا کرے اور ان میں سورۃ قل یا ایھا الکفرون اور سورۃ اخلاص تلاوت کرے۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹ جائے، استلام حجر کرے اور تکبیر و تہلیل کہے۔

امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے مقام ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ شریف کے درمیان رکھا اور دو رکعت نماز ادا کی اور ان دونوں رکعتوں میں قل یا ایھا الکفرون اور قل ھو اللہ احد تلاوت کیں اور پھر لوٹ کر حجر اسود کی طرف تشریف لے گئے اور اس کا بوسہ لیا (3)۔

ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

"ان احکام کو یاد رکھو [1] اور جو شخص تعظیم کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کی تو یہ بہتر ہے اس کے لئے اس کے رب کے ہاں [2]۔ اور حلال کئے گئے تمہارے لئے جانور بجز ان کے جن کی حرمت پڑھی گئی تم پر [3]۔ پس پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے [4] اور بچو جھوٹی بات سے [5] یکسر مائل ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف، نہ شریک ٹھہراتے ہوئے اللہ کے ساتھ [6] اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو اس کی حالت ایسی ہے گویا وہ گرا ہو آسمان سے پس اچک لیا ہو اسے کسی پرندے نے یا پھینک دیا ہو اسے ہوا نے [7] کسی دور جگہ [8]"

[1] ذٰلک مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یا یہ فعل محذوف کا فاعل ہے یا فعل محذوف کے سبب منصوب ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ الامر ذٰلک (حکم یہ ہے) ذالک ثابت واجب الامتثال (یہ ثابت ہے اس کی پیروی واجب ہے) وجب ذالک (یہ واجب ہے) عرفت ذالک (تو نے اسے پہچان لیا) احفظ ذلک (تو اسے یاد کر لے) ذالک کا اشارہ ماقبل

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 290 (المحاسن) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 444 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 412 (وزارت تعلیم)

بیان کئے گئے احکام کی طرف ہے ذلک اوراس جیسے الفاظ دو کلاموں کے مابین فاصلے کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔

۲۔ حرمت اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں اور وہ امور ہیں جنہیں کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان کی تعظیم سے مراد یہ ہے کہ ان گناہوں اور نافرمانیوں کے قریب جانا بھی ان پر شاق گزرتا ہے۔ کیونکہ بندۂ مومن اپنے سے صادر ہونے والے گناہ کو ایسے دیکھتا ہے گویا اس کے سر کے اوپر ایک پہاڑ ہے جس کے گرنے کا خوف اسے ہمہ وقت لاحق رہتا ہے۔ اور منافق اپنے سے صادر ہونے والے گناہ کو ایسے خیال کرتا ہے گویا وہ ناک پر بیٹھنے والی مکھی ہے کہ جونہی اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اڑ جائے گی۔ حدیث طیبہ میں ایسی ہی تشبیہ مذکور ہے۔

لیث نے کہا ہے کہ حرمت اللہ سے مراد وہ حدود اور پابندیاں ہیں جنہیں توڑنا قطعاً حلال نہیں، یعنی ان سے مراد اوامر ونواہی ہیں۔ زجاج نے کہا کہ حرمۃ سے مراد وہ شئی ہے جسے کامل اکمل طریقے سے صحیح صحیح ادا کرنا واجب ہو اور اس میں کسی طرح کی تفریط اور غفلت حرام ہو۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ حرمت اللہ سے مراد مناسک حج ہیں۔

ابن زید نے کہا ہے کہ یہاں حرمات سے مراد بلد حرام (حرمت والا شہر یعنی مکہ مکرمہ) بیت حرام (حرمت والا گھر یعنی کعبہ معظّمہ) اور شہر حرام (حرمت والے مہینے جن میں لڑائی اور جھگڑا حرام ہے) ہے(1)۔

۳۔ تمہارے لئے جانور حلال کئے گئے ہیں بجز ان کے جن کی حرمت آیت حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ الآیۃ میں بیان کی گئی ہے۔ تو پھر تم ان میں سے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی وغیرہ کو کیوں حرام قرار دیتے ہو۔ (اللہ تعالیٰ نے تو ان کی حرمت بیان نہیں کی) ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

۴۔ رجس سے مراد بت ہی ہیں۔ اور بتوں کو رجس (نجاست) اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ عقول اور طبائع سلیم ان سے ایسے ہی نفرت کرتی ہیں جیسے کوئی آدمی نجاستوں اور غلاظتوں سے نفرت کرتا ہے۔ لہٰذا اس میں بتوں کی تعظیم سے روکنے اور ان کی عبادت سے نفرت دلانے میں حد درجہ مبالغہ کا اظہار ہے۔ بعض نے رجس کا معنی رجز کیا ہے اور اس کا معنی عذاب ہے تو چونکہ رجس (بت) عذاب دلانے کا سبب ہیں اس لئے رجس کو ہی عذاب کہہ دیا۔

۵۔ قول الزور سے مراد جھوٹ ہے۔ یہ زور بمعنی انحراف سے مشتق ہے۔ جیسا کہ لفظ افک سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی پھیر دینا، موڑ دینا۔ اور جھوٹ بھی حقیقی واقعہ سے منحرف اور پھرا ہوا ہوتا ہے تو گویا وہ آسمان کی بلندی سے پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر پڑا۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ایسی ذلت میں ڈال دیا کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت ہی نہیں۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی مثل ممکن شئی کی عبادت شروع کر دی بلکہ اپنے سے گھٹیا پتھر اور اس جیسی دیگر چیزوں کی (پوجا کرنے لگا)

فتخطفہ کو نافع نے باب تفعیل سے خاء کو مفتوح اور طاء کو مشدد مبالغہ کے لئے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے خاء کو ساکن اور طاء کو مخفف باب مجرد سے پڑھا ہے۔ اور الطیر استعارہ بالکنایہ ہے اور یہاں طیر سے مراد تباہ و برباد کرنے والی خواہشات ہیں جو کہ انسان کی یکسوئی اور اطمینان قلب کو چھین لیتی ہیں۔ اور اس کے افکار ونظریات کو پریشان کر دیتی ہیں۔ الریح بھی الطیر کی مثل استعارہ بالکنایہ ہے اور اس ھوا سے مراد شیطان ہے کیونکہ شیطان ہی انسان کو ذلت اور گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 115 (الفکر)

۷؎ فی مکان سحیق سے مراد وہ جگہ ہے جو حق سے بہت دور ہو۔ یعنی جس نے شرک کیا اس نے نفس یا شیطان کو اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ آیت طیبہ میں لفظ او منع الخلو کے لئے ہے منع الجمع کے لئے نہیں۔ (یعنی یہ تو ممکن ہے کہ گرنے والے کو پرندے بھی اچک لیں اور ہوا بھی اڑا لے جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان دو میں سے کچھ بھی نہ ہو)۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ لفظ او تنویع اور تقسیم کے لئے ہے کیونکہ مشرکین میں سے بعض وہ ہیں جن کی شرک سے خلاصی اور نجات بالکل نہیں ہوئی۔ گویا انہیں پرندوں نے اچک لیا اور ان کے جسم کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں رہا اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کی شرک سے خلاصی اور نجات توبہ کے سبب ممکن ہوتی ہے (1) تو یہ اس آدمی کی طرح ہیں جسے ہوا نے بہت دور مقام میں اٹھا کر پھینک دیا ہو تو اس کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ پھر وہاں سے اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ آئے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ تشبیہات مرکبہ میں سے ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گا تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جو آسمان سے گرا پڑا ہو۔ کیونکہ وہ کسی حیلہ اور تدبیر سے اپنے نفس کا مالک نہیں ہو سکتا اور وہ بالیقین ہلاک ہو جاتا ہے چاہے اس کی ہلاکت راستے میں ہی پرندوں کے اچک لینے کے سبب ہو یا پھر کسی دور مقام میں گر جانے کے سبب۔

حسن نے کہا ہے کہ کفار کے اعمال کو اس حال کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور وہ ان میں کسی شے پر قادر نہیں ہوں گے (2) (یعنی جس طرح آسمان سے گرنے والے کی ہر تدبیر ناکام ہوتی ہے اسی طرح کفار کے اعمال بھی باطل ہوں گے اور قطعاً کوئی شئی ان کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگی)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس کا بعض حصہ ہم نے سورۂ اعراف کی آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے کافر بندے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ملائکہ اس کی روح کو لے کر بلندیوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ آسمان دنیا کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں پس وہ اس کے لئے آسمان کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے دروازہ نہیں کھولا جاتا پھر رسول اللہ ﷺ نے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الآیۃ تلاوت فرمائی (پھر ارشاد فرمایا) کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اس کی کتاب سب سے نیچے والی زمین میں موجود سجین میں لکھ دو۔ پس اس وقت اس کی روح پھینک دی جاتی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفه الطیر الایہ تلاوت فرمائی۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

"حقیقت یہ ہے اور جو ادب و احترام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا ۱؎ تو یہ (احترام) اسوجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے ۲؎ تمہارے لئے مویشیوں میں طرح طرح کے فائدے ہیں ایک معین مدت تک ۳؎ پھر ان کے ذبح کرنے کا مقام ۴؎ بیت عتیق کے قریب ہے ۵؎"

۱؎ ذلک کی تفسیر حسب سابق ہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا شعائر اللہ سے مراد اونٹ اور قربانی کے دیگر جانور ہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 513 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (الفکر)

شعائر کی اصل میں اشعار سے ماخوذ ہے اور اشعار سے مراد انہیں ایسی نشانی لگا دیتا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں۔ اور ان کی تعظیم کرنے سے مراد انہیں خوب موٹا تازہ کرنا ہے(1)۔

صحیح حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے سو اونٹ قربانی دیئے۔

ابوداؤد نے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک بختی اونٹنی کی قربانی دی۔ آپ سے تین سو دیناروں کے عوض اسے خریدنے کی کوشش کی گئی تھی(2)۔

؎ ان کی تعظیم کرنا ایسے لوگوں کے افعال میں سے ہے جن کے دلوں میں تقویٰ ہے کیونکہ من تقوی القلوب اصل میں من افعال ذوی تقوی القلوب ہے۔ اس سے مضافات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور قلوب کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ دل ہی تقویٰ اور فجور کی منشاء اور مقام ہوتے ہیں۔ اور دل ہی ان دو کا حکم دینے والے ہوتے ہیں۔

؎ تمہارے لئے ان شعائر یعنی اونٹوں اور قربانی کے جانوروں میں طرح طرح کے منافع ہیں۔ یعنی تمہارے لئے جائز ہے کہ تم ان جانوروں سے منافع حاصل کرو مثلاً انہیں کوئی ضرر پہنچائے بغیر ان پر سوار ہونا' ان پر بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا وغیرہ۔ انہیں ذبح کرتے وقت ان سے یہ منافع حاصل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح عطاء بن رباح نے کہا ہے(3)۔ اور امام مالک' امام شافعی' امام احمد اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ کہ قربانی کے جانور پر سوار ہونا' اس پر بوجھ لادنا اور اس کا دودھ پینا اسے کوئی ضرر پہنچائے بغیر جائز ہے۔ اس کی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو قربانی کے لئے اونٹ ہانک کر لاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے عرض کی یہ تو قربانی کے لئے ہے آپ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے عرض کی یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جا تیری ہلاکت ہو آپ ﷺ نے یہ کلمہ دوسری یا تیسری بار فرمایا۔ متفق علیہ (4)۔ بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو اونٹ ہانک کر لاتے دیکھا تو اسے فرمایا اس پر سوار ہو جا تو کسی ایسے راستے پر نہیں چل سکتا جو محمد ﷺ کے راستے کی نسبت زیادہ سیدھا اور ہدایت بخش ہو۔ (یعنی قربانی کے جانور پر سوار ہونا آپ ﷺ کی سنت کے مطابق ہے تو اور راستہ اختیار نہ کر) رواہ الطحاوی(5) امام اعظم ابوحنیفہ نے کہا ہے ضرورت کے بغیر قربانی کے جانور پر سوار ہونا' ان پر بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا جائز نہیں کیونکہ جب آدمی جانور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتا ہے تو اب اس کی کوئی نفع اسے ذاتی منفعت کے لئے استعمال نہیں کرنی چاہئے۔ یہ معنی تو مطلقاً قربانی کے جانور کو استعمال کرنے کے ممنوع ہونے کا تقاضا کرتا ہے چاہے اس کا استعمال ضرورت کے تحت ہو یا بغیر ضرورت کے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ **و من یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب** بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قربانی کے جانور پر سوار ہونا اور اس پر بوجھ لادنا اس کی تعظیم اور اسے موٹا تازہ کرنے کے منافی ہے۔ لیکن چونکہ احادیث طیبہ سے ان پر سوار ہونے کا جواز ثابت ہے لہٰذا ہم نے بھی ضرورت کے تحت سوار ہونا جائز قرار دیا۔ اور مذکورہ بالا احادیث کو اسی حالت پر محمول کیا تا کہ سنت پر ترک عمل لازم نہ آئے۔ اور اس میں حاجت اور ضرورت کی شرط لگانے پر جو حدیث دلالت کرتی ہے وہ امام طحاوی نے دو سندوں سے حمید الطویل کے واسطہ سے حضرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (الفکر) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 244 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (الفکر)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 229 (وزارت تعلیم) 5۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 382 (وزارت تعلیم)

انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اونٹ ہانک کر لاتے دیکھا۔ اور وہ آدمی تھکا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اس پر سوار ہو جا (1) اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اس پر سوار ہو جا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جا اگر چہ یہ قربانی کا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی قربانی کا اونٹ ہانک کر لاتا اور خود تھک جاتا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اسے کہا کرتے تھے اس پر سوار ہو جا تم ایسے راستہ پر چلنے والے نہیں جو محمد ﷺ کے راستے کی نسبت زیادہ سیدھا اور ہدایت بخش ہے۔ مسلم نے حضرت ابو الزبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے قربانی کے اونٹ پر سوار ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تو اس پر سوار ہونے کا حاجتمند ہے تو معروف طریقہ کے مطابق اس پر سوار ہو جا یہاں تک کہ کوئی اور سواری پالے (2)۔ ہمارے نزدیک آیت طیبہ میں منافع سے مراد مجبوری اور حاجت کے وقت اپنی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ مجاہد، قتادہ اور ضحاک نے قول باری تعالیٰ **لکم فیھا منافع الی اجل مسمی** کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان جانوروں سے منافع حاصل کرنا جائز ہیں۔ یہاں تک کہ تم انہیں قربانی کے لئے نامزد کردو اور انہیں معین کردو لیکن جب انہیں قربانی کے لئے معین اور نامزد کردیا جائے تو پھر ان سے منافع کا حصول جائز نہیں (3)۔

4۔ **محلھا** سے مراد جانوروں کو ذبح کرنے کی جگہ ہے (یعنی یہ ظرف مکان ہے) بعض نے کہا ہے کہ اس سے فرد ذبح کرنے کا وقت ہے (یعنی ظرف زماں ہے) ترکیب کلام میں **محلھا منافع** پر معطوف ہے۔ اور ثم حرف عطف تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد تراخی فی الوقت ہو کیونکہ نفع اٹھانے کا وقت ذبح کے وقت سے پہلے ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد تراخی رتبی ہو کیونکہ منافع سے مراد دنیوی منافع ہیں اور انہیں ذبح ثواب کے لئے کیا جاتا ہے اور یہ منافع اخرویہ ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ تمہارے لئے ان میں دنیوی منافع بھی ہیں پھر تمہارے لئے انہیں وقت مقررہ پر ذبح کرنا ہے۔ اور اس کے منافع (ثواب) تمہیں آخرت میں حاصل ہوں گے۔

5۔ **الی البیت العتیق** ترکیب کلام **محلھا** سے حال ہے۔ اور وہ حرف عطف کے واسطہ سے ظرف مستقر کا فاعل ہے، یعنی عبارت اس طرح ہے لَكُمْ مَحِلُّهَا كَائِنًا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ اور یہ ترکیب بھی جائز ہے کہ **محلھا** مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو اور **الی البیت العتیق** ظرف اس سے حال ہو اور یہ ضرب بی نریدا قائماً کے طریقہ پر ہے۔ لہٰذا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ مَحِلُّهَا كَائِنٌ مُنْتَهِيًا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ اور یہ بھی جائز ہے کہ **محلھا** مبتدا ہو اور ظرف اس کی خبر ہو اور پھر جملہ سابقہ جملے پر معطوف ہو۔

البیت العتیق سے مراد مکمل حرم پاک ہے کیونکہ وہ تمام کا تمام بیت کے حکم میں ہے۔ اور اسے عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس پر کسی کی بھی ملکیت نہیں (لہٰذا کوئی بھی اس کی خرید و فروخت نہیں کرسکتا تو چونکہ یہ ہر ایک کی ملکیت سے آزاد ہے اس لئے اس کا نام عتیق ہے) اور یہ حریم البیت ہے۔ عرف عرب میں یہ کہا جاتا ہے **بلغت البلد** یہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی شہر کی فناء میں داخل ہو جائے۔ اس میں تقدیر کلام کا اس طرح ہونا بھی جائز ہے۔ ثُمَّ مَحِلُّهَا الْحَرَمُ مِنْ اَقْصٰى اَطْرَافِهٖ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ کہ جانوروں کی قربان گاہ حرم پاک کے کناروں سے لے کر بیت عتیق تک ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حرم پاک میں جہاں کوئی چاہے اس کے

1۔ [illegible] جلد 4 صفحہ 383 [illegible] 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 426 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 116 (الفکر)

لئے قربانی کرنا جائز ہے۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے کہ حج کرنے والے کے لئے منیٰ کے علاوہ اور عمرہ کرنے والے کے لئے مروہ کے علاوہ کسی جگہ قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ ایسا کرتے تھے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا حج کے دوران منیٰ میں قربانی کرنا کسی اور مقام پر ذبح کرنے کے منافی نہیں، جب کہ وہ کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منیٰ مکمل طور پر قربان گاہ ہے۔ اور مکہ مکرمہ کے تمام پہاڑی راستے قربان گاہ ہیں۔ مکمل عرفات اور مکمل مزدلفہ موقف ہے (1)۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی علامات اور نشانیاں ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تعظیم کرنا اہل تقویٰ کے افعال اور شعار میں سے ہے۔ اس معنی کی بناء پر قول باری تعالیٰ لکم فیھا منافع ارشاد باری تعالیٰ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ سے متصل ہوگا یعنی تمہارے لئے جانوروں میں دنیوی منافع ہیں جو تم مقررہ مدت یعنی موت تک حاصل کر سکتے ہو پھر اس بیت کے پاس ذبح ہو کر اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں یا جہاں اعمال کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد حج کے فرائض اور مکہ مکرمہ میں حاضری کے وہ مقامات ہیں جہاں پہنچ کر تمہارے لئے ایک مقررہ مدت تک بازاروں میں تجارت کے سبب دنیوی منافع ہیں۔ وقت مقررہ سے مراد مکہ مکرمہ سے واپس لوٹنے اور وہاں سے نکلنے کا وقت ہے۔ اور ایک مقررہ مدت تک مناسک حج ادا کرنے کے سبب اجر وثواب کی صورت میں اخروی منافع بھی ہیں۔ یہاں مقررہ مدت سے مراد ایام حج گزرنے تک کی مدت ہے۔ پھر مکہ مکرمہ میں لوگوں کے لئے اپنے احرام کھولنے کا آخری مقام بیت العتیق ہے کہ وہ یوم نحر کو بیت اللہ شریف کا طواف زیارت کریں۔ (اور اس کے بعد مکمل طور پر اپنے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۗ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ہر امت کے لئے ہم نے مقرر فرمائی ہے ایک قربانی [1] تا کہ وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کا اسم (پاک) ان بے زبان جانوروں پر ذبح کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں [2]۔ پس تمہارا خدا خدائے واحد ہے تو اسی کے آگے سر جھکاؤ [3] اور (اے محبوب) مژدہ سنایئے تواضع کرنے والوں کو وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں ان (مصائب وآلام) پر جو پہنچتے ہیں انہیں اور جو صحیح ادا کرنے والے ہیں نماز کو اور ان چیزوں سے جو ہم نے انہیں عطا فرمائی ہیں وہ خرچ کرتے ہیں [4]''

[1] منسکاً کو اسی مقام پر اور سورت کے آخر میں حمزہ اور کسائی نے سین کے کسرہ کے ساتھ منسِکاً پڑھا ہے اس کا معنی ہے عبادت گاہ اور باقیوں نے سین کو مفتوح پڑھا ہے۔ یہ صیغہ اسم ظرف ہے۔ یا پھر یہ مصدر ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا خون بہانا اور قربانیاں ذبح کرنا یا پھر اس سے مراد وہ قربانی ہے جس کے سبب لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 489 (العلمیہ)

؎ تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کا ذکر کریں ان بے زبان جانوروں پر ذبح کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ یعنی کسی اور کا نام ہرگز نہ لیں بلکہ اپنی قربانیاں خالص اللہ کی رضا کے لئے کریں۔ تو گویا یہ اس امر پر تنبیہ ہے کہ قربانیاں کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر ہے لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر لازم اور شرط ہے۔ جانوروں کو بَهِيمَة کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کلام نہیں کر سکتے۔ آیت میں بھیمۃ کو انعام کی قید سے مقید کیا گیا ہے کیونکہ کچھ چوپائے ایسے بھی ہیں جو انعام نہیں مثلاً گھوڑے، خچر اور گدھے وغیرہ۔ ان میں سے کسی کو بھی قربانی کے طور پر ذبح کرنا جائز نہیں۔ بلکہ بالا جماع قربانی کے لئے جانوروں کا انعام اور پالتو ہونا ضروری ہے۔

ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے اور اس میں امت محمدیہ علیہ صاحبہا والسلام کو امم سابقہ کا ذکر کر کے قربانی کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

؎ پس تم اپنے جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کا ہی نام لو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ جملہ اس امر کی علت بیان کر رہا ہے کہ ہم نے ہر امت کے لئے عبادت گاہ بنا دی ہے تا کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک کا ذکر کریں کیونکہ تمام کا معبود تو ایک ہے اگرچہ امتیں مختلف اور متعدد ہیں۔ پس اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرو، یعنی قربانی اور ذکر خالص اسی کے لئے کرو کسی اور کو اس کا شریک مت بناؤ۔

؎ وبشر المخبتين کا عطف قول باری تعالیٰ واذن في الناس بالحج پر ہے اگر یہ خطاب ہمارے نبی مکرم ﷺ کو ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس کا عطف واذا بوانا پر ہے۔ یعنی ہماری جانب سے جگہ مقرر کئے جانے کا وقت یاد کیجئے اور تواضع و انکساری کرنے والوں کو مژدہ سنا دیجئے۔ الخبیت سے مراد ہے حقیر شئی (1) یعنی وہ آدمی جو خشوع و خضوع کرے اور اپنے آپ کو حقیر شمار کرے۔ جب کوئی آدمی انتہائی خشوع اور تواضع اختیار کرے تو کہا جاتا ہے اخبت فلان۔ قاموس میں اسی طرح مذکور ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے مخبتين کا معنی متواضعین (تواضع کرنے والے) کیا ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے اس کا معنی ہے خشوع کرنے والے۔ بعض نے کہا کہ خبت کا معنی ہے زمین کا ہموار حصہ۔ اسی معنی کی بناء پر مجاہد نے کہا ہے کہ مخبتین سے مراد اللہ تعالیٰ کی یاد میں اطمینان پانے والے لوگ ہیں۔ اور نخعی نے کہا ہے کہ اس سے مراد مخلصین ہیں کیونکہ اطمینان اخلاص ہی ہوتا ہے۔ کلبی نے کہا ہے اس سے مراد نرم دل لوگ ہیں۔ عمرو بن اوس نے کہا ہے کہ مخبتین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی پر ظلم نہیں کرتے اور جب ان پر ظلم کیا جائے تو وہ انتقام نہیں لیتے (2)۔ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈرنے لگ جاتے ہیں کیونکہ جب اس کے جلال کی شعاعیں ان کے دلوں پر پڑتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شان عظمت کے انوار ان پر جلوہ فگن ہوتے ہیں تو وہ ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان مصائب و آلام پر جبر کرنے والے لوگ ہیں جو انہیں پہنچتے ہیں۔ اور وہ نمازوں کو ان کے اوقات میں صحیح صحیح ادا کرتے ہیں۔ اور جو چیزیں ہم نے انہیں عطا فرمائی ہیں ان سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ عطف لام موصول کے صلہ پر ہے۔ یعنی بَشِّرِ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُونَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 246 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بیضاوی، جلد 4، صفحہ 118 (الفکر)

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٧﴾

''اور قربانی کے فربہ جانوروں کو[1] ہم نے بنایا ہے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے' تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے پس لو اللہ تعالیٰ کا نام ان پر[2] اس حال میں کہ ان کا ایک پاؤں بندھا ہوا ور تین پر کھڑے ہوں[3] پس جب وہ گر پڑیں کسی پہلو پر تو خود بھی کھاؤ اس سے نیز کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور بھیک مانگنے والے کو[4] اس طرح ہم نے فرمانبردار بنا دیا ان جانوروں کو تمہارے لئے تاکہ تم (اس احسان کا) شکریہ ادا کرو[5] نہیں پہنچتے اللہ تعالیٰ کو ان کے گوشت اور نہ ان کے خون البتہ پہنچتا ہے اس کے حضور تک تقویٰ تمہاری طرف سے[6] یوں اس نے فرمانبردار بنا دیا ہے انہیں تمہارے لئے تاکہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی اس (نعمت) پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی۔ اور (اے حبیب!) خوشخبری دیجئے احسان کرنے والوں کو[7]''

[1] بدن بدنۃ کی جمع ہے جیسے خشب خشبۃ کی جمع ہے۔ جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ بدنہ کا اطلاق اونٹ' اونٹنی اور گائے وغیرہ پر ہوتا ہے۔ ان کے عظیم الجثہ اور موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے انہیں بدنہ کہا جاتا ہے(1) قاموس میں ہے کہ بدنہ سے مراد اونٹ اور گائے وغیرہ ہے(2)۔ امام ابوحنیفہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

عطا اور سدی نے کہا ہے کہ اونٹ اور گائے' بیل وغیرہ کو بدن کہا جاتا ہے، بھیڑ بکریوں کو بدنہ نہیں کہا جاتا(3)۔ امام شافعی نے کہا ہے کہ بدنہ کا لفظ اونٹ کے لئے خالص ہے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اونٹ کو عظیم الجثہ ہونے کی وجہ سے بدنہ کہا جاتا ہے اور یہ بدن بدانۃ (وہ عظیم الجثہ ہو گیا) سے ماخوذ ہے(4)۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ بدنہ کو عظیم الجثہ اور موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے بدنہ کہا جاتا ہے لہٰذا اس سے مراد بڑے جسم والے فربہ اور موٹے اونٹ ہیں۔ جب آدمی کا جسم ضخیم ہو جائے تو کہا جاتا ہے بدن الرجل بدنا وبدانۃ اور جب آدمی عمر رسیدہ ہو جائے اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ جائے تو پھر بدن تبدینا کہا جاتا ہے(5)۔

جنہوں نے یہ کہا ہے کہ بدنہ کا لفظ اونٹ کے لئے خاص ہے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات سات افراد کی جانب سے ایک گائے اور ایک بدنہ (اونٹ) قربانی کیا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے(6)۔

ہم کہتے ہیں کہ مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس طرح حدیث نقل کی ہے کہ ہم مکہ مکرمہ میں آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا جس کے پاس قربانی کا کوئی جانور نہیں وہ اپنا احرام کھول دے اور ہمیں حکم ارشاد فرمایا کہ ہم اونٹ اور گائے میں باہم شریک ہو جائیں۔ ہم میں سے ہر سات افراد ایک بدنہ میں شریک ہوئے۔ (تو اس حدیث میں بدنہ کا اطلاق گائے اور اونٹ پھر دونوں پر ہوا

1۔ النہایۃ، جلد 1، صفحہ 108 (بیروت)
2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1550 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (الفکر)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5176 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (الفکر)
6۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 110 (فاروقی)

ہے) ترکیب کلام میں البدن کا لفظ اس فعل مضمر کا مفعول اول ہے جس کی تفسیر جعلنها لکم بیان کر رہا ہے۔اور یہ مفعول ثانی ہے۔

1 شعائر اللہ سے مراد اللہ کے دین کی وہ علامات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مشروع قرار دیا ہے۔ ترکیب کلام میں مفعول اول سے حال ہے۔ بعض نے شعائر کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لفظ اشعار سے بنایا گیا ہے اور اس کا معنی ہے نشان لگانا۔ تو چونکہ اونٹ کی کوہان پر لوہے سے نشان لگا دیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اس لئے اسے شعائر کہتے ہیں) چونکہ شعائر اللہ میں تمہارے لئے دینی اور دنیوی دونوں طرح کے منافع ہیں۔ پس تم ان پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا اگر قربانی کے لئے بدنہ (اونٹ) ہو تو اسے کھڑا کر کے یہ کہنا چاہئے اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر اللّٰھم منک ولک پھر بسم اللہ پڑھتے ہوئے اس کا نحر کر دینا چاہئے (نحر سے مراد ہنسلی کے قریب زور سے نیزہ مار کر اسے ذبح کر دینا ہے)

ابوداؤد، ابن ماجہ اور حاکم نے مستدرک میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (قربانی کرتے وقت) یہ پڑھا کرتے تھے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَللّٰهُمَّ مِنْکَ وَلَکَ(1) بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ

3 صوآف بمعنی مصفوفة ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ یہ فواعل کے وزن پر بمعنی مفاعل ہے(2)۔ اس کا معنی ہے تین ٹانگوں پر کھڑا ہوا، یعنی ایسا اونٹ جس کی دو ٹانگیں اور دایاں ہاتھ زمین پر لگا ہوا ہو اور اس کا بایاں ہاتھ بندھا ہوا ہو تو اسے صوآف کہا جاتا ہے۔ اور اسے اسی حالت میں نحر کر دیا جاتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے، اسے دیکھا کہ وہ اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا ہے۔ تو آپ نے اسے فرمایا اسے کھڑا کر کے باندھ لو یہی محمد ﷺ کی سنت ہے(3)۔

عبد بن حمید اور ابن ابی الدنیا نے الاضاحی میں، ابن منذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور بیہقی نے اپنی سنن میں ابوظبیان سے یہ نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ فاذکروا اسم اللّٰہ علیھا صوآف کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا جب تو اونٹ کو نحر کرنے کا ارادہ کرے تو اسے تین ٹانگوں پر کھڑا کر کے باندھ لے پھر یہ کہہ بسم اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰھم منک ولک(4) اسے حاکم نے صحیح قرار دیا۔ امام بخاری نے معلق روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صوآف کا معنی قیام کیا ہے(5) سفیان بن عیینہ نے اپنی تفسیر میں عبید اللہ بن یزید سے اسی طرح نقل کیا ہے اور سعید بن منصور نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ صوآف سے مراد یہ ہے کہ جب کسی اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ دی جائے اور وہ تین پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ حضرت ابن مسعود نے اس کی قرأت صوافن کی ہے اور اس سے مراد ایسا اونٹ ہے جس کا ایک ہاتھ باندھ دیا جائے اور نحر کرنے کے لئے اسے تین پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 530 (العلمیہ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1103 (التراث العربی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 231 (وزارت تعلیم)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 651 (العلمیہ)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 231 (وزارت تعلیم)

ابی حسن اور مجاہد نے اسے یاء کے ساتھ صوافی پڑھا ہے، اسکا معنی ہے خالص اللہ کی رضا کے لئے۔

۴ پھر جب وہ کسی پہلو کے بل زمین پر گر پڑیں یعنی مرجائیں تو ان سے خود بھی کھاؤ۔ فکلوا منھا میں امر اباحت کے لئے ہے اور یہ مسئلہ پہلے گزر چکا ہے کہ قربانی کے جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے۔ ترکیب کلام میں فاذا وجبت جملہ شرطیہ فاذکروا پر معطوف ہے، یعنی ترتیب عبارت اس طرح ہے۔ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا فَكُلُوْا مِنْهَا اِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا (پس تم ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لو اور ان سے کھاؤ جب وہ پہلوؤں کے بل گر پڑیں) اور کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور بھیک مانگنے والے کو۔ عکرمہ، ابراہیم اور قتادہ نے کہا ہے کہ قانع سے مراد (ایسا فقیر) ہے جو اپنے گھر میں ہی بیٹھا رہتا ہو، بتکلف پاکدامن بنتا ہو، جو اسے دے دیا جائے اسی پر قناعت کرتا ہو اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتا ہو۔ اور معتر سے مراد بھیک مانگنے اور سوال کرنے والا فقیر ہے۔ عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ قانع وہ ہے جو کسی سے تعرض نہ کرے اور نہ ہی کسی سے سوال کرے اور معتر وہ ہے جو اپنا آپ دکھاتا ہے، تعرض بھی کرتا ہے لیکن سوال نہیں کرتا۔

مذکورہ دونوں صورتوں کے مطابق قانع قناعت سے مشتق ہے جب کوئی دیئے گئے حصے کے اوپر راضی ہو جاتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے قنع قناعة (اس نے قناعت اختیار کی یعنی مزید کا مطالبہ یا سوال نہیں کیا) سعید بن جبیر، حسن اور کلبی نے کہا ہے کہ قانع وہ ہے جو سوال کرتا ہے اور معتر وہ ہے جو اپنے آپ کو پیش تو کرتا ہے لیکن سوال نہیں کرتا۔ لہٰذا اس صورت میں قانع قنع یقنع قنوعا سے مشتق ہوگا اور اس کا معنی ہوتا ہے سوال کرنا۔ حسن نے المعتر کی بجائے المعتری قرأت کی ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ عرہ، اعرہ، عراہ اور اعتراہ جب کوئی واضح طور پر کچھ طلب کرنے کے لئے آئے، چاہے تو وہ سوال کرے یا فقط تعرض پر ہی اکتفاء کرے۔

ابن زید نے کہا ہے کہ قانع مسکین کو کہتے ہیں اور معتر وہ فقیر ہے جو مسکین نہ ہو اور اس کے پاس ذبح کے لئے جانور بھی نہ ہو اور وہ لوگوں کے پاس آتا ہے تاکہ قربانیوں کا گوشت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو ان کے سامنے ظاہر کرے (1)۔

۵ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے فرمانبردار بنا دیا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے تمہیں یہ قدرت دی کہ تم ان اونٹوں کو کھڑا کر کے نحر کر سکتے ہو اسی طرح ہم نے ان کے عظیم الجثہ اور طاقتور ہونے کے باوجود انہیں تمہارا مطیع و فرمانبردار بنا دیا ہے۔ اور تم انہیں تین پاؤں پر کھڑا کر لیتے ہو اور پھر ان کے سینے میں نیزہ گھونپ دیتے ہو۔ تاکہ جو انعامات ہم نے تم پر فرمائے پورے تقرب اور اخلاص کے ساتھ تم ان کے شکر گزار بنو۔

۶ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن منذر نے ابن جریج سے یہ نقل کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ قربانی کے اونٹوں کا گوشت اور خون کعبہ معظمہ میں چھڑک دیتے اور پھینک دیتے تھے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے کہا کہ اس طرح خون چھڑکنا اور گوشت بکھیرنا ہمارا بدرجہ اولیٰ حق ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لن ینال اللّٰه الآیۃ (2)۔

ابن منذر اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ مشرکین جب جانور ذبح کرتے تھے تو وہ ان کا خون لے کر کعبہ معظمہ کے بالکل قریب آ جاتے اور کعبہ معظمہ کی طرف وہ خون چھڑک دیتے۔ پس مسلمانوں نے بھی ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 119 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 654 (العلمیۃ)

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **لن ینال اللہ لحومھا و لا دماؤھا**(1) مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ ہر گز ان کے گوشت اور خون کو اپنی جانب نہیں اٹھاتا(2) بلکہ تمہاری جانب سے وہ اعمال صالحہ جو تقویٰ اور اخلاص پر مرتب ہوتے ہیں وہ اللہ کی جانب بلند ہوتے ہیں۔ تقویٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ یعقوب نے لن تنال قرأت کی ہے، جبکہ باقیوں نے لن ینال پڑھا ہے۔

کذالک سخر ھا لکم نعمت کی یاد دہانی کے لئے دوبارہ ذکر فرمایا اور لتکبر و اللہ کے ارشاد سے اس کی علت بیان فرمائی، یعنی تاکہ تم اس کی اس عظمت و رفعت کو پہچان لو کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے جس پر کوئی غیر قادر نہیں۔ اور اس پر شکر ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی میں واحد جان لو۔ کیونکہ دین کی علامات' مناسک و حج' جانوروں کو مطیع و فرمانبردار کرنے کے طریقے اور ان کے سبب قرب خداوندی کے حصول کی کیفیت پر اسی نے تمہاری راہنمائی فرمائی ہے۔ علیٰ ما ھدکم میں ما، مصدریہ ہے یا ما موصولہ ہے اور علی تکبر کے متعلق ہے کیونکہ وہ شکر کے معنی کو متضمن ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لتکبروا اللہ سے مراد احرام کھولتے اور جانوروں کو ذبح کرتے وقت تکبیر کہنا ہے۔

وبشر المحسنین کے بارے میں حضرت ابن عباس نے فرمایا محسنین (احسان کرنے والے) سے مراد موحدین (توحید کا اقرار کرنے والے) ہیں(3)۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف بشر المخبتین پر ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ حفاظت کرتا ہے اہل ایمان کی (کفار کے مکر و فریب سے) بیشک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی دھوکہ باز احسان فراموش کو 1۔ اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے 2۔ اس بناء پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے 3۔ وہ (مظلوم) جن کو نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے ناحق 4۔ صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے 5۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بچاؤ نہ کرتا لوگوں کا انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر تو (طاقتور کی غارتگری سے) منہدم ہو جائیں خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) سب پر غالب ہے 6۔''

1۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یدافع کی قرأت یدفع کی ہے۔ اور اس کا مفعول محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے مشرکین کے مکر و

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 654 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 120 (الفکر) 3۔ ایضاً

فریب کو دور کر دے گا اور انہیں مومنین (پر زیادتی کرنے) سے روک دے گا۔ باقیوں نے باب مفاعلہ سے اسے یدفع پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی ایسی حفاظت فرمائے گا کہ انہیں (کفار پر) غالب کر دے گا بیشک اللہ تعالیٰ کسی دھوکہ باز احسان فراموش کو دوست نہیں رکھتا۔ کل خوان کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب کرنے والا اور کفور کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرنے والا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کفار مکہ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کی اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہرایا اور انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔

زجاج نے کہا ہے جو کوئی اپنے ذبیحہ کے سبب بتوں کا قرب خیال کرے اور ذبح کرتے وقت ان پر غیر اللہ کا نام لے وہ خوان کفور ہے(1)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ (ان اللہ لا یحب الآیہ) دفع کی علت بیان کرنے کے محل میں ہے۔

۔ امام احمد، ترمذی، سدی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان لوگوں نے اپنے نبی کو شہر سے نکال دیا ہے، انہیں ضرور ہلاک کیا جائے گا(2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ نازل فرمائی (یعنی اُذِنَ للذین یقتلون الآیہ) اسے حاکم نے صحیح کہا ہے۔ نافع، عاصم اور ابوعمرو نے اذن صیغہ مجہول کی صورت میں قرأت کی ہے۔ اور باقیوں نے اذن صیغہ معروف کی صورت میں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاد کی اجازت اور رخصت عطا فرمائی۔

نافع، ابن عامر اور حفص نے یقتلون میں تاء کو مفتوح پڑھا ہے (یعنی ان کی قرأت میں صیغہ مجہول ہے) یعنی ان مومنین کو جہاد کی اجازت دے دی گئی جن سے مشرکین قتال کرتے تھے۔ اور باقیوں نے صیغہ معروف کی صورت میں تاء کو مکسور پڑھا ہے۔ یعنی ان مومنین کو جہاد کرنے اور کفار سے جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کو اذیت پہنچاتے تھے اور وہ مار کھا کر اور زخمی ہو کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تھے اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں اپنے حالات کے بارے شکایت عرض کرتے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ انہیں فرماتے صبر کرو کیونکہ ابھی تک مجھے قتال کا حکم نہیں دیا گیا(3)۔ پھر مدینہ طیبہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن منذر، ابی ابن حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ستر سے کچھ زائد آیات میں جنگ کرنے سے منع کرنے کے بعد جہاد کی اجازت کے بارے یہ آیت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر سے اسے روایت کیا ہے اور عبدالرزاق اور ابن منذر نے زہری سے اسے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا ہے یہ آیت ان مخصوص افراد کے بارے نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرنے کے لئے نکلے تو کفار ان کا راستہ روکتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار اور ہجرت سے روکنے والوں کے خلاف جنگ لڑنے کی اسی آیت میں اجازت عطا فرمائی(4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 120 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 121-120 (الفکر) 4۔ ایضاً، صفحہ 121

ہے یعنی چونکہ کفار کی جانب سے ان پر بہت ظلم وزیادتیاں کی گئیں اس لئے انہیں بھی کفار کے خلاف جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل حرب کی عورتوں کو قتل کرنا جائز نہیں،اس پر تمام کا اجماع ہے۔مگر جبکہ وہ صاحب رائے یا مالدار ہوں اور اپنی رائے یا مال سے مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑنے میں کفار کی معاونت کر رہی ہوں (تو پھر انہیں بھی قتل کرنا جائز ہے) اسی طرح شیخ فانی (پیر فرتوت) راہب، اندھے اور اپاہج لوگوں کو بھی قتل کرنا جائز نہیں۔اس میں امام شافعی کا ایک قول اس حکم کے خلاف ہے۔ہاں اگر ان میں سے کوئی بھی اپنی رائے اور تدبیر سے کفار کی مدد کر رہا ہو تو پھر بالاتفاق انہیں قتل کرنا جائز ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک مرتد عورت کو بھی قتل کرنا جائز نہیں بلکہ اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ وہ مر نہ جائے یا توبہ نہ کر لے۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے کہا ہے کہ مرتد ہونے کی صورت میں مرد اور عورت حکم میں برابر ہیں (یعنی دونوں واجب القتل ہیں) ہماری دلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔یہ حدیث متفق علیہ ہے(1)۔

حضرت رباح بن ربیع روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو کسی شی پر جمع ہوتے دیکھا۔تو آپ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا کہ دیکھ کر آ ؤ یہ لوگ کس شی پر جمع ہیں تو اس نے آ کر بتایا کہ یہ اجتماع ایک مقتولہ عورت پر ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ جنگ میں شریک تو نہ تھی،اس وقت ہراول دستے کے امیر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔چنانچہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو ان کی طرف بھیجا کہ خالد کو جا کر کہہ دو کہ کسی عورت اور کسی مزدور کو قتل نہ کیا جائے۔(بعض نے عسیف کا ترجمہ شیخ فانی اور بعض نے اس کا معنی غلام کیا ہے) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر رہتے ہوئے چلو۔کسی شیخ فانی، چھوٹے بچے اور کسی عورت کو قتل نہ کرو (الحدیث) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(3)۔

مذکورہ احادیث میں مطلق عورت کا ذکر ہے اور لفظ امراۃ نکرہ نفی کے تحت آنے کی وجہ سے عام ہے لہٰذا یہ لفظ کافرہ اور مرتدہ عورت دونوں کو شامل ہے۔اور اسے قتل نہ کرنے کی علت اس کا جنگ میں شامل نہ ہونا ہے۔حنفیہ نے کہا ہے کہ اعمال کی جزاء وسزا میں اصل تو یہ ہے کہ وہ دار آخرت تک کے لئے مؤخر ہے۔یہ دنیا تو دار العمل اور آزمائش کا مقام ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ لا اکراہ فی الدین۔(دین میں کوئی جبر نہیں) اور وہ تمام اعمال جن کی سزا دنیا میں مشروع قرار دی گئی ہے وہ ایسے مصالح اور منافع کے لئے ہے جو اس دنیا میں ہمیں ہی حاصل ہوتے ہیں۔جیسا کہ قصاص، شراب پینے، قذف لگانے، زنا کرنے اور چوری کرنے کے سبب حدود کا نفاذ وغیرہ تو یہ تمام چیزیں ہماری جانوں، عزتوں، عقلوں، انساب اور مالوں کی حفاظت کے لئے نافذ کی گئی ہیں۔لیکن مرتد کو قتل کرنے کا حکم اس لئے ہے تا کہ اس کی جنگ کے شر سے محفوظ رہا جائے۔یہ قتل اسکے کفر کی سزا نہیں کیونکہ اس کے کفر کی سزا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ اور شدید ہے۔لہٰذا قتل کا حکم صرف انہی کے ساتھ مختص ہوگا جو جنگ کر سکتے ہیں اور وہ مرد ہیں۔(اور

1۔مشکوۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 391 (الفکر) 2۔سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 6 (وزارت تعلیم)
3۔کنز العمال، جلد 4، صفحہ 382 (التراث الاسلامی)

عورت چونکہ جنگ نہیں لڑتی اس لئے اس کےقتل کا حکم بھی نہیں ہوگا) اگرقتل اس کے کفر کی سزا ہوتی تو پھر رسول اللہ ﷺ اہل حرب کی عورتوں کوقتل کرنے سے منع نہ فرماتے۔اور اگر یہ ان کے کفر کی سزا ہوتو پھرقتل کے سبب ان کا کفر سے پاک ہونا بھی لازم آتا ہے۔جیسا کہ قصاص اور حدود میں ہے (کہ ان کے سبب آدمی اپنے گناہ سے پاک ہو جاتا ہے لیکن کافر کے لئے ایسا حکم نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ کافر کا قتل اس کے کفر کی سزا نہیں)

جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مرتدہ عورت کوقتل کرنا واجب ہے، انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی عمومیت سے موقف اختیار کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اپنے دین کو بدلا تو تم اسے قتل کردو(1)۔اسے امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔اس بارے میں طبرانی نے معجم الکبیر میں بہز بن حکیم عن امیہ عن جدہ کی سند سے اور الاوسط میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے احادیث نقل کی ہیں۔

حنفیہ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ مذکورہ حدیث میں لفظ من عمومیت پر دلالت کرتا ہے (لیکن عام مطلق نہیں بلکہ عام مخصوص البعض ہے) لہٰذا وہ احادیث جن میں عورتوں کوقتل کرنے سے منع کیا گیا ہے ان کے سبب ہم نے اس عام سے عورتوں کے حکم کی تخصیص کی ہے (کہ عورتیں اس عام حکم میں داخل نہیں) کیونکہ اگر اس عام کو اپنے عموم پر ہی باقی رکھا جائے (اور اس کی تخصیص نہ کی جائے تو پھر اسے بھی قتل کرنا لازم آئے گا) جس نے اپنے دین کو بدلتے ہوئے کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا یا یہودیت کو چھوڑ کر عیسائیت کو قبول کرلیا (حالانکہ حکم اس طرح نہیں تو یہی اس کا قرینہ ہے کہ من بدل و دینهم کے الفاظ اپنے عموم پر باقی نہیں۔ بلکہ دوسری احادیث ان کی مخصص ہیں)

میں کہتا ہوں کہ حدیث کے مذکورہ الفاظ کے بارے میں تو یہ جواب دیا جاسکتا ہے لیکن حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ مسلمانوں میں سے جو اپنا دین بدل لے اسے قتل کردو۔اس حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔ (حدیث کے ان الفاظ میں تو مذکورہ احتمال نہیں آسکتا) تو اس کے بارے حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ یہ حدیث حفص بن عمر العدنی کی سند سے مروی ہے اور یہ راوی مختلف فیہ ہے۔

مرتدہ عورت کےقتل کے جواز کا قول کرنے والوں کی دوسری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک عورت جسے ام مروان کہا جاتا تھا مرتد ہوگئی۔تو حضور نبی کریم ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا کہ اس پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ توبہ کرلے (تو بہتر) ورنہ اسے قتل کردیا جائے۔اسے دار قطنی نے دوسندوں سے روایت کیا ہے۔ان میں سے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا پس اسے قتل کردیا گیا(2)۔حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سندیں ضعیف ہیں۔علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ پہلی سند عمر بن رواحہ کی وجہ سے ضعیف ہے اور دوسری عبداللہ بن اذنیہ کے سبب۔علامہ ابن حبان نے کہا ہے کہ اس حدیث سے استدلال جائز نہیں۔

ایک اور حدیث حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ غزوہ احد کے دن ایک عورت مرتد ہوگئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے توبہ کرنے کو کہا جائے (اگر انکار کردے) تو اسے قتل کردیا جائے(3)۔اس روایت کی سند میں

1۔صحیح بخاری، جلد2، صفحہ 1023 (وزارت تعلیم) 2۔سنن الدارقطنی، جلد3، صفحہ 19-118 (المحاسن) 3۔ایضاً

ایک راوی محمد بن عبدالملک ہے جس کے بارے میں علماء محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیثیں وضع کرتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ یہ احادیث اپنی مثل دوسری احادیث کے معارض بھی ہیں۔ مثلاً دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت جب مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے(1)۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن عیسیٰ جزری ہے جس کے بارے دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ کذاب ہے اور حدیثیں وضع کرتا ہے۔

ابن عدی نے الکامل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت مرتد ہوگئی لیکن آپ ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا(2)۔ یہ حدیث حفص بن سلیمان کے سبب ضعیف ہے۔

طبرانی نے معجم میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا جو آدمی دین اسلام سے پھر جائے تو اسے اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ توبہ کر لے تو اسے قبول کر لینا اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کی گردن مار دینا (یعنی قتل کر دینا) اور جو عورت اسلام سے پھر جائے تو اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اگر توبہ کر لے تو اسے قبول کرنا۔ اور اگر انکار کر دے تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا(3)۔

امام ابو یوسف نے امام اعظم ابو حنیفہ سے، انہوں نے عاصم بن ابی نجود سے اور انہوں نے ابو رزین کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ عورتیں جب دین اسلام میں داخل ہو کر مرتد ہو جائیں تو انہیں قتل نہ کیا جائے۔ بلکہ قید کر دیا جائے اور انہیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلاغات محمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔

عبدالرزاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر بیان کیا ہے کہ ان کے زمانے میں ایک عورت عیسائی ہوگئی تو آپ نے حکم فرمایا کہ اسے ایسی زمین پر لے جا کر فروخت کر دیا جائے جس میں اس پر سخت مشقت اور تکلیف پڑے، ایسی زمین میں فروخت نہ کیا جائے جس میں اس کے ہم مذہب لوگ رہتے ہوں چنانچہ اسے دومۃ الجندل کے علاقہ میں فروخت کر دیا گیا۔

دار قطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عورت سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اسے قتل نہ کیا جائے۔ اس کی سند میں ایک راوی خلاس ہے جس کی وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

مسئلہ:۔ اگر امام وقت کسی مصلحت کے پیش نظر اہل حرب کی عورتوں میں سے بعض کو قتل کرنے کا حکم دے چاہے وہ مرتد ہوں یا کافرہ۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں (انہیں قتل کر دیا جائے گا) ہم نے سورۂ فتح کی تفسیر میں یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن لشکر پر مقرر کردہ مسلمان امراء سے یہ عہد لیا کہ جب وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں تو سوائے ان افراد کے جو ان سے قتال کریں کسی کو بھی قتل نہ کریں مگر آپ ﷺ نے چند افراد نے نام بتائے اور فرمایا کہ انہیں ضرور قتل کر دو اگرچہ انہیں غلاف کعبہ کے نیچے پاؤ۔ ہم نے سورۂ فتح میں ان کے اسماء بھی ذکر کئے ہیں، ان میں چند عورتوں کے نام بھی تھے، ان میں عبداللہ بن خطل کی دو گانے والی باندیاں تھیں ایک قرنہ اور دوسری قرینہ۔ لہٰذا قرینہ کو قتل کر دیا گیا اور قرنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ دونوں مرتدہ تھیں۔ ان میں ایک عمر بن ہاشم کی لونڈی سارہ تھی اور ایک ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی۔ یہ دونوں اصلاً کافرہ تھیں اور فتح مکہ کے دن اسلام لائیں۔ واللہ اعلم

جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کی مدد و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ اس سے قبل کفار کی اذیتوں سے ان کی حفاظت کرنے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 118 (المحاسن) 2۔ ایضاً، صفحہ 117 3۔ الکامل لابن عدی، جلد 3، صفحہ 274 (الفکر)

کا وعدہ فرمایا۔ اجازت جہاد ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں اپنے ان گھروں سے ناحق نکال دیا گیا جو مکہ مکرمہ میں تھے۔ ترکیب کلام میں الذین اخرجوا اسم موصول محلاً مجرور ہے اور یہ اذن للذین یقاتلون میں موجود اسم موصول سے بدل ہے یا وہ محلاً منصوب ہے اور اس سے پہلے اعنی یا امدح فعل مقدر ہے یا پھر محلاً مرفوع ہے اور اس سے پہلے مبتدا مقدر ہے۔ یعنی ھم الذین اخرجوا۔ تمام ترا کیبی صورتوں میں مقصود ایک ہی ہے۔

۵ الا الذین یقولو ربنا اللّٰہ میں ان اپنے صلہ سمیت محل جر میں ہے اور یہ حق سے مستثنیٰ ہونے کی صورت میں بدل ہے اور اس پر لفظ حق کا اطلاق کفار کے زعم باطل کی بناء پر کیا گیا ہے (چونکہ اہل ایمان نے فقط یہ کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اور یہ قطعاً جرم نہیں جس کی بناء پر انہیں گھروں سے نکال کر باہر کر دیا جائے لیکن کفار کے زعم باطل کے مطابق اس سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں، اس لئے انہوں نے حق سمجھ کر انہیں جلاوطن کر دیا۔ تو چونکہ یہ ان کا صریح ظلم تھا) اسی ظلم کو ظاہر کرنے کے لئے یہ انداز اختیار فرمایا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جو عمل ان کے فاسد اور باطل گمان کے مطابق جرم ہے کہ انہوں نے توحید کا اقرار کرنے کے سبب انہیں جلاوطن کرنے کو حق قرار دیا یہ ایسا جرم ہے جس کا جرم نہ ہونا بالکل بدیہی اور واضح ہے۔ یہ تو اس قول کی مثل ہے کہ فلاں شخص میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اس کے کہ جو اس کے ساتھ نیکی اور احسان کرتا ہے یہ اس کی برائی کرتا ہے، یعنی یہ اپنے گمان کے مطابق احسان کرنے والے سے برائی کرنا نیکی خیال کرتا ہے۔ تو اس میں کیسے بھلائی اور نیکی ہوسکتی ہے تو یہ گویا دعویٰ مع الدلیل کے قائم مقام ہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا (تو ہم سے انتقام نہیں لیتا مگر اس بات کا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔

اسی کی مثل شاعر کا قول بھی ہے۔

وَبَلْدَةٍ لَیْسَ بِھَا اَنِیْسٌ اِلَّا الْیَعَافِیْرُ وَاِلَّا الْعِیْسُ

اور ایسا شہر ہے جس میں ہرنوں اور خاکی رنگ کے اونٹوں کے سوا اور کوئی انیس وغمخوار نہیں۔ (تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہرن اور اونٹ آدمی کی وحشت میں اضافے کا سبب ہیں انس آفریں نہیں) بعض نے کہا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے اور الا بمعنی لٰکن ہے معنی یہ ہے لیکن انہیں ان کے اس قول کے سبب نکال دیا گیا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور یہ قول حق ہے لہٰذا انہیں اس قول کے سبب نکالنا ناحق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محذوف کلام سے استثناء ہو (یعنی مستثنیٰ منہ محذوف ہو) تقدیر عبارت اس طرح ہو ما اخرج الشیء الا بان قالوا ربنا اللّٰہ (یعنی انہیں کسی شی کے سبب نہیں نکالا گیا مگر اس کے سبب کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے) حالانکہ یہ قول حق ہے لہٰذا اس قول کے سبب انہیں گھروں سے نکالنا ناحق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جملہ سابقہ کلام کی علت بیان کرنے کے محل میں ہے۔

۶ (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر) ترکیب کلام میں بعضھم، الناس سے بدل ہے تو دفع اللّٰہ کو نافع نے لولا دفاع اللّٰہ پڑھا ہے۔ یہ مدافعۃ کے معنی میں ہے اور یہ اظہار مبالغہ کے لئے ہے، جبکہ باقیوں نے بغیر الف کے دفع اللّٰہ قرأت کی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مومنین کو کفار پر مسلط کر کے لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا تو طاقتور غارتگری سے منہدم ہو جائیں، خانقاہیں، گرجے، کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ نافع اور ابن کثیر نے لھدمت میں دال کو مخفف (یعنی لھومت) پڑھا ہے اور باقیوں نے دال کو مشدد پڑھا ہے اور دوسروں نے ادغام نہیں کیا۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا ہے کہ صوامع سے مراد راہبوں (تارک الدنیا لوگوں) کی خانقاہیں اور عبادت گاہیں ہیں اور قتادہ نے کہا ہے کہ مراد صابیوں کی عبادت گاہیں

ہیں (1)۔ بیع بیعۃ کی جمع ہے اس سے مراد عیسائیوں کے گرجے ہیں اور صلوٰت سے مراد یہودیوں کے عبادت خانے یعنی کلیسے ہیں۔ عبرانی زبان میں انہیں صلوٰۃ کہا جاتا ہے اور مسجد سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے مسلمانوں کی عبادت گاہیں ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا تو ہر نبی کے دور میں اس کی امت کی عبادتگاہیں گرادی جاتیں پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کنیسے گرا دیئے جاتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گرجے اور خانقاہیں گرا دی جاتیں اور حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مساجد گرادی جاتیں۔ ترکیب کلام میں کثیراً محذوف کی صفت ہے یعنی ذکراً کثیراً۔ اور فیھا کی ھا ضمیر کا مرجع یا تو مساجد ہیں یا پھر چاروں نوع کے عبادت خانے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس کے دین کی مدد کرے گا۔ اس میں جواب قسم محذوف ہے اور جملہ معترضہ وعدہ کو ذکر کرنے کے لئے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے کی قوت رکھتا ہے اور سب پر غالب ہے اور اس کے غلبے کو رد کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وعدہ کی تاکید کے لئے ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝۴۱ وَ اِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُۙ۝۴۲ وَ قَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍۙ۝۴۳ وَ اَصْحٰبُ مَدْیَنَۚ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَیْتُ لِلْكٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْۚ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ۝۴۴ فَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِیَ ظَالِمَةٌ فَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِیْدٍ۝۴۵

''وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو) نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہے سارے کاموں کا انجام [1]۔ اور اگر یہ کفار آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کیا تعجب ہے) پس جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے اور عاد و ثمود نے۔ اور قوم ابراہیم نے اور قوم لوط نے اور مدین کے رہنے والوں نے (اپنے اپنے نبیوں کو) [2]۔ اور جھٹلائے گئے موسیٰ بھی [3]۔ تو (کچھ عرصہ) میں نے مہلت دی ان کفار کو (جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑا۔ (خود ہی بتاؤ) کتنا خوفناک تھا میرا عذاب [4]۔ پس کتنی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تہ و بالا کر ڈالا کیونکہ وہ ظالم تھیں تو اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر [5] اور کتنے کنوئیں ہیں جو بیکار ہو چکے ہیں اور کتنے چونے سے بنے ہوئے مضبوط محل ہیں (جو ویران پڑے ہیں) [6]۔''

[1] چونکہ سابقہ آیت میں حفاظت اور مدد و نصرت کا وعدہ بیان ہے اس لئے اس آیت میں ان بمعنیٰ اذا ہے (یعنی یہ جملہ شرطیہ ہے) لیکن حقیقۃً یہ خبر ہے اور مسلمانوں کے لئے قوت و قدرت عطا کرنے کا وعدہ ہے۔

اس آیت طیبہ میں ان لوگوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جنہیں گھروں سے نکال دیا گیا اور ان میں یہ اوصاف (یعنی نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا وغیرہ) ان کے آزمائش و امتحان میں مبتلا ہونے سے قبل پائے جاتے تھے اور یہ آیت خلفاء راشدین کی خلافت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے کیونکہ ان کے علاوہ مہاجرین میں سے کسی کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اور چونکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 121 (الفکر)

افراد میں سے نہیں تھے جنہیں گھروں سے نکال کر باہر کردیا گیا تھا (اس لئے کہ یہ بشارت ان کو شامل نہیں)
بعض نے کہا ہے کہ اسم موصول من، ینصرہ سے بدل ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ضرور مدد فرمائے گا جن میں یہ صفات ہوں گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین کی مدد فرمائی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ حتیٰ کہ انہیں سرداران عرب اور عجم کی قیصر و کسریٰ کے اوپر غلبہ عطا فرمایا۔ اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ کئے گئے وعدہ کے مطابق کفار کی زمینوں، گھروں اور مالوں کا وارث بنا دیا۔ اور سارے کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کیونکہ تمام امور کا مرجع و مرکز اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ ہی ہے۔ یہ جملہ سابقہ وعدہ کی تاکید کے لئے ہے۔

۲ے وان یکذبوک شرط ہے، اس کی جزاء محذوف ہے۔ اور فقد کذبت جزاء محذوف کے لئے تعلیل ہے تقدیر عبارت یہ ہے فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَلَا تَحْزَنْ لِاَنَّهٗ لَيْسَ بِاَمْرٍ مُبْتَدِعٍ فَقَدْ كُذِّبَتْ اے محمد ﷺ! یہ کفار مکہ اگر آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ قطعاً پریشان حال اور غمزدہ نہ ہوں کیونکہ یہ کوئی نیا امر نہیں بلکہ اس سے قبل بھی قوم نوح، عاد و ثمود وغیرہ نے اپنے اپنے انبیاء علیہ السلام کو جھٹلایا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کو اطمینان دلانے اور تسلی دینے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

۳ے وکذب موسیٰ میں انداز کلام تبدیل کر دیا گیا ہے کیونکہ اس سے قبل اقوام نے جھٹلانے کا ذکر کذبت صیغہ معروف سے کیا گیا ہے جبکہ یہاں صیغہ مجہول ذکر کیا گیا ہے تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم بنی اسرائیل نے نہیں جھٹلایا تھا بلکہ آپ کی تکذیب قبطیوں نے کی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ آپ کے معجزات اتنے عظیم اور متنوع قسم کے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ کی تکذیب کرنا انتہائی شنیع اور قبیح فعل ہے۔

۴ے پس میں نے ان کافروں کو کچھ عرصہ کے لئے مہلت دی اور ان کی سزا اور گرفت کو مؤخر کردیا۔ جب وہ باز نہ آئے تو میں نے ان کے معاملات کے انجام میں انہیں پکڑ لیا۔ (اب خود ہی بتاؤ) میرا انکار کرنا ان کے لئے کیسا ثابت ہوا کہ ان کی نعمت مشقت اور مصیبت میں تبدیل ہوگئی۔ حیات ہلاکت میں بدل گئی اور آبادی بربادی میں تبدیل ہوگئی۔ (تو یہ عذاب ان کے لئے کتنا خوفناک تھا) یہ استفہام اظہار تعجب کے لئے ہے یا عذاب کی ہولناکی اور دہشت کو بیان کرنے کے لئے یا پھر اس بات کو مزید پختہ کرنے کے لئے کہ عذاب اپنے وقوع پذیر ہونے کی جگہ پر ہی اترا ہے۔ ترکیب کلام میں فَاَمْلَيْتُ کا عطف کذبت پر ہے۔ اور لفظ نکیر میں ہر مقام پر حالت وصل میں ورش نے یاء کے اثبات کے ساتھ (یعنی نکیری) پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو حذف کرکے نکیر پڑھا ہے۔

۵ے ترکیب کلام میں لفظ کاین یا تو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یا پھر اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل اهلكتها بیان کر رہا ہے۔ ابوعمرو اور یعقوب نے اس فعل کو صیغہ واحد متکلم کی صورت میں اهلكتها پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ جمع متکلم کی صورت میں پڑھا ہے، یعنی پہلے نون مفتوح ہے اور اس کے بعد الف برائے تعظیم ہے۔ معنی یہ ہے کہ کتنی بستیاں تھیں جن کے رہنے والوں کو ہم نے تہ و بالا کر ڈالا۔ یعنی اهلكتها اصل میں اهلكنا اهلها ہے، مضاف کو حذف کرکے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے رہنے والے ظالم تھے (ظلم کا لغوی معنی ہوتا ہے کسی چیز کو بغیر محل کے رکھنا) تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کو غیر محل میں رکھنے والے تھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے اور بتوں پر ایمان رکھتے تھے۔ پس ان بستیوں کی دیواریں اپنی چھتوں پر گر پڑیں، یعنی ان کی عمارتیں تباہ و برباد ہوگئیں کہ پہلے ان کی چھتیں گریں اور پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ ترکیب کلام میں

علی عروشھا ظرف لغو خاویۃ کے متعلق ہے یا پھر خاویہ کا معنی خالیہ ہے۔ اس صورت میں علی عروشھا، کائنۃ کے متعلق ہے۔ یعنی وہ بستیاں اپنی چھتوں کے باقی رہنے اور ان کے سلامت رہنے کے باوجود خالی پڑی ہیں (ان میں کوئی رہنے والا نہیں ہے) اس معنی کے مطابق ترکیب کلام میں ظرف مستقر یا تو حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا پھر ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یا مفہوم ہے کہ ان کی چھتیں گر پڑی ہیں اور دیواریں ابھی تک باقی ہیں جو ان چھتوں کے اوپر جھکی ہوئی ہیں۔ یہ جملہ ترکیب کلام میں اھلکنا پر معطوف ہے۔ وھی ظالمۃ پر نہیں کیونکہ یہ تو حال ہے اور اہلاک (تباہ و برباد کرنا) بستیوں کے گرنے سے خالی نہیں ہوتا۔ اور کاین کو منصوب گمان کرنے کی صورت میں اس جملہ کا ترکیب میں کوئی محل نہیں ہوگا۔

لے اور بستیوں میں کتنے کنوئیں تھے جو اب بیکار پڑے ہیں، ہم نے ان کنوؤں والوں کو ہلاک و برباد کر دیا۔ اب ان کنوؤں سے کوئی پانی نکالنے والا نہیں۔ ترکیب کلام میں بئر کا عطف قریۃ پر ہے، یعنی کم من بئر معطلۃ اور کتنے چونے سے بنے ہوئے مضبوط محل ہیں جن میں سکونت پذیر لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔ یعنی کتنی بستیاں ہیں جن کی عمارتیں ان کی ویرانی کے بعد زمین بوس ہو گئیں اور ان کے مضبوط و عالیشان محلات میں رہنے والوں کو ہم نے ہلاک و برباد کر دیا۔

قتادہ ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ مشید کا معنی ہے انتہائی اونچے اور بلند۔ یہ ماخوذ ہے عربوں کے اس قول سے شاد بناہ' اذا رفعه' یعنی جب کوئی اپنی عمارت کو انتہائی بلندی اور اونچائی پر لے جائے تو وہ کہتے ہیں شاد بناما۔ سعید بن جبیر عطاء اور مجاہد نے کہا ہے کہ مشید الشیئد سے بنا ہے اور اس کا معنی ہے چونا' گچ' یعنی ایسا محل جو چونے سے تعمیر کیا گیا ہو۔ یعنی انتہائی مضبوط (1)۔

ترکیب کلام میں جملہ کاین من قریۃ، فکیف کان نکیر سے بدل ہے۔ اسی وجہ سے حرف عطف فاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ بئر معطلۃ اور قصر مشید یمن میں تھے۔ یہ محل پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور کنواں پہاڑ کے دامن میں تھا۔ یہ دونوں ایسے لوگوں کی ملکیت میں تھے جو دنیوی عیش و عشرت میں گم اور ڈوبے ہوئے تھے پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تباہ و برباد کر دیا اور محل اور کنواں دونوں ویران باقی رہ گئے۔

ابوروق نے ضحاک سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ کنواں حضرموت کے ایک شہر میں تھا جسے حاصورا کہا جاتا ہے۔ اور یہ شہر ان چار ہزار افراد پر مشتمل تھا جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور عذاب الٰہی سے نجات پا گئے تھے۔ اور یہ تمام کے تمام حضرت صالح علیہ السلام کی معیت میں حضرموت آ گئے تھے۔ جب یہ اس شہر میں پہنچے تو حضرت صالح علیہ السلام کو پیغام اجل آ گیا اور ان کا وصال ہو گیا پس اسی سبب سے اس کا نام حضرموت پڑ گیا۔ کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام جونہی اس شہر میں حاضر ہوئے انہیں موت نے آ لیا۔ پھر لوگوں نے اس کے اردگرد ایک فصیل تعمیر کر دی۔ اور اس کنویں کے اوپر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور اپنے اوپر ایک آدمی کو اپنا امیر چن لیا۔ وہ ایک طویل زمانہ تک وہاں رہے، ان کی نسلیں ترقی کرتی رہیں یہاں تک کہ ان کی تعداد کثیر ہو گئی۔ پھر ان کے (ناخلف) اخلاف نے بتوں کی پوجا پاٹ شروع کر دی اور کفر اختیار کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حنظلہ بن صفوان کو نبی مبعوث فرمایا۔ آپ ان میں بوجھ اٹھانے کا کام کرتے تھے (نتیجتاً انہوں نے آپ کی بات نہ سنی) اور سر بازار آپ کو قتل کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تباہ و برباد کر دیا، ان کا کنواں ویران ہو گیا اور ان کے محل کھنڈرات کی صورت اختیار کر گئے (2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 122 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 23-122

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝

''کیاانہوں نے سیر وسیاحت نہیں کی زمین میں تا کہ (ان کھنڈرات کودیکھ کر)ان کے دل ایسے ہوجاتے ہیں جن سے وہ (حق کو) سمجھ سکتے اور کان ایسے ہوجاتے جن سے یہ نصیحت سن سکتے [1] حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جوسینوں میں ہوتے ہیں [2]۔''

[1] افلم یسیروا کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیری عبارت اس طرح ہے الم یخرجوا من بیوتھم فلم یسیروا فی الارض کیا وہ اپنے گھروں سے نہیں نکلے اور انہوں نے زمین کی سیر وسیاحت نہیں کی۔ فتکون اَن مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ اس مصدر پر معطوف ہے جس پر افلم یسیروا کا قول ضمناً دلالت کررہا ہے، یعنی الم یحصل منھم خروجھم من بیوتھم وسیر فی الارض لان تکون کیا انہیں اپنے گھروں سے نکلنے اور زمین میں سیر وسیاحت کرنے کا موقع نہیں ملا کہ ان کے دل ایسے ہوجاتے ہیں جن سے وہ حق کو سمجھ سکتے۔

فتکون میں یا تو کان تامہ ہے اس صورت میں لہم تکون کے فاعل سے حال ہے یا پھر یہ تصیر کے معنی میں ہے، اس صورت میں لھم اس کی خبر ہے اور قلوب اس کا اسم مؤخر ہے۔ یعقلون بھا، قلوب کی صفت ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے ایسے دل ہوتے ہیں جن کے سبب وہ ان امور کو سمجھ سکتے جن کا سمجھنا واجب اور ضروری ہے۔ مثلاً توحید باری تعالیٰ وغیرہ۔ یعنی انہیں ایسی بصیرت اور استدلال مل جاتا جس سے ضروری امور کا ادراک بآسانی کرسکتے۔

او اذان کا عطف قلوب پر ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور انکار سیر وسیاحت کے بعد ان کے دلوں کے عاقل ہونے اور ان کے کانوں کے حق کو سننے والا ہونے کی طرف راجع ہے۔ اور اس میں حق کو سمجھنے اور حق کو سننے پر انگیخت دلائی جارہی ہے (یعنی سیر وسیاحت کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ انہیں ایسے دل نصیب ہوتے جن میں حق کو سمجھنے کی بصیرت ہوتی اور ایسے کان مل جاتے جو حق کی آواز سن سکتے)

[2] فانھا میں ھا ضمیر قصہ ہے یا ضمیر مبہم ہے اور اس کی تفسیر مابعد آنے والا قول الابصار کررہا ہے اور لاتعمی میں فاعل ضمیر ہے اور اس کا مرجع مابعد آنے والا لفظ الابصار ہے۔ جو کہ رتبۃً ضمیر سے مقدم ہے یا پھر اس کا فاعل اسم ظاہر الابصار ہے اور یہی ضمیر کے قائم مقام ہے۔ اور فاء برائے تعلیل ہے، یعنی یہ سیر کے انجام میں دلوں کے عاقل ہونے اور کانوں کے سامع ہونے کی علت بیان کررہی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کی آنکھیں تو اندھی نہیں کہ وہ سیر کے بعد تباہ وبرباد ہونے والی اور کھنڈرات میں تبدیل ہونے والی امتوں کے آثار کا مشاہدہ نہ کرسکیں بلکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ آیات وعلامات ظاہر ہونے اور ان کے آثار کا مشاہدہ کرنے کے باوجود عبرت حاصل نہیں کرتے۔ مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کی آنکھیں اندھی ہیں جو دیکھ نہیں سکتیں اور کان بہرے ہیں جو حق کی آواز نہیں سن سکتے (ایسا ہرگز نہیں) پھر اس جملہ کو ان کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے اور ساتھ ضمیر قصہ یا ضمیر مبہم ذکر کی گئی ہے جس کی تفسیر مابعد بیان کررہا ہے تو گویا اس میں عمی (نابینا پن) کی نفی کرکے سننے والے کوانکار کرنے والے کے قائم مقام کردیا گیا ہے۔ پھر حرف استدراک لکن ذکر فرمایا اور اس کے ذریعے ان سے مطلقاً عمی کی نفی کو دور کردیا اور ان کے بارے تمام تر شبہات کا ازالہ کردیا کہ اس بارے میں عقلاء کی عقلیں حیران ہیں کہ وہ توحید کی علامات دیکھتے تو ہیں مگر توحید کا اعتقاد نہیں رکھتے، حق کے دلائل سنتے تو ہیں مگر ان میں غور وفکر نہیں کرتے تو اس کا سبب یہ

ہے کہ ان کے سینوں میں موجود دل اندھے ہیں۔ آیت طیبہ میں صدور کا ذکر تاکید کے لئے ہے اور مجاز کے احتمال کی نفی کے لئے ہے۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے طَآئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اور اس میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حقیقی اندھا پن وہ نہیں جو متعارف ہے اور صرف آنکھ کے ساتھ مختص ہے۔ (یعنی قوت بصارت کا زائل ہو جانا) بلکہ (حقیقی نابینائی دلوں کا اندھا ہو جانا جو سینوں میں موجود ہے کہ انسان میں بصارت ہونے کے باوجود بصیرت باقی نہیں ہوتی)

قتادہ نے کہا ہے کہ آنکھ کی بصارت ظاہر چیز تک پہنچانے والی اور اس سے متمتع ہونے کا فائدہ دیتی ہے اور دل کی بصیرت حقیقتاً نفع دینے والی ہوتی ہے (1) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے برا اندھا پن دل کا اندھا ہو جانا ہے (2)۔ اسے بیہقی نے دلائل میں، ابن عساکر نے عقبہ بن عامر جہنی سے اور ابوالنصر سنجری نے الابانۃ میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام شافعی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

آیت طیبہ میں دلوں کی نابینائی کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد دلوں کے تمام آلات علم و شعور کا سلب ہو جانا ہے۔ گویا کہ اس طرح فرمایا کہ ان کے وہ دل جو سینوں میں ہیں ان کی آنکھیں اندھی ہیں اور ان کے کان بہرے ہیں۔ علامہ بیضاوی نے فرمایا جب آیت کریمہ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى نازل ہوئی تو حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں دنیا میں نابینا ہوں کیا میں آخرت میں بھی نابینا ہی ہوں گا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (3)۔

میں کہتا ہوں کہ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے بھی اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن زائدہ یعنی ابن مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۴۷ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝۴۸

''یہ لوگ جلدی مانگ رہے ہیں آپ سے عذاب ۱؎ (یہ تسلی رکھیں) اللہ تعالیٰ خلاف ورزی نہیں کرے گا اپنے وعدہ کی ۲؎ اور بیشک ایک دن تیرے رب کے ہاں ایک ہزار سال کی طرح ہوتا ہے جس حساب سے تم گنتی کرتے ہو ۳؎ اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں میں نے (کافی عرصہ) ڈھیل دی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (بھی جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑ لیا اور میری طرف ہی (سب کو) لوٹنا ہے ۴؎''

۱؎ یہ لوگ جلدی مانگ رہے ہیں آپ سے وہ عذاب جس کی انہیں وعید سنائی جا رہی ہے۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ان (کفار) کے دل اندھے ہو چکے ہیں کیونکہ عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ ہی ان کے اندھے پن کی دلیل ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے نازل ہوئی کیونکہ اس نے یہ دعا مانگی تھی: اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش نازل فرما یا ہم پر کوئی دردناک عذاب بھیج دے) (4)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (الفکر) 2۔ موسوعۃ اطراف الحدیث، جلد 5، صفحہ 286 (الفکر)
3۔ [illegible] 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (الفکر)

لے یہ تسلی رکھیں، اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرے گا کیونکہ یہ ممتنع ہے کہ جو خبر وہ دے پھر اس کے خلاف واقع ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں جس عذاب کی وعید سنائی ہے وہ بالیقین ان تک پہنچے گا اگر چہ کچھ وقت کے بعد ہی پہنچے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو صبور ہے (بہت زیادہ صبر کرنے والا ہے) وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ غزوہ بدر کے دن پورا فرما دیا۔

ترکیب کلام میں جملہ ولن یخلف الله وعدہ یا حال ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔ اسی طرح جملہ وان یوما عند ربک حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ گویا کہ یہ کہا ہے لم تستعجلونه وهو لا يجوز فواته (تم اس کے جلدی آنے کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو حالانکہ اس کا ٹل جانا جائز نہیں (یعنی وہ بالیقین آ کر رہے گا) تو یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ جس طرح (ثواب کے) وعدہ میں وعدہ خلافی محال ہے اسی طرح (عذاب کی) وعید میں بھی اس کا خلاف ناممکن ہے۔ لیکن اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ قرآن وحدیث کے نصوص اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ وعید کی آیات صرف ان کے لئے مخصوص ہیں جو کسی طور پر مغفرت کے اہل نہیں ہوں گے (یعنی ان کا خاتمہ کفر وشرک پر ہی ہوا)

سے تعدون کو ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے یعدون پڑھا ہے کیونکہ یہاں آیت کے آغاز میں ویستعجلونک مذکور ہے اور باقیوں نے تعدون تاء کے ساتھ پڑھا ہے، یہ عام ہے کیونکہ یہ خطاب جلدی عذاب طلب کرنے والوں اور مومنین تمام کو شامل ہے۔

حضرت عطاء سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ مہلت دینے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن اور ہزار سال برابر ہیں۔ کیونکہ وہ جب چاہے انہیں پکڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تاخیر اور مہلت کے سبب کوئی چیز اس کے قبضہ اختیار سے باہر نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس کی قدرت میں وہ عذاب جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں اس کا واقع ہونا اور اس کا مؤخر ہونا دونوں برابر ہیں۔ بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ عذاب جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں اس کا ایک دن اپنی تکلیف، طوالت اور شدت میں ان ہزار سالوں کے برابر ہے جنہیں تم شمار کرتے ہو۔ تو وہ کیسے ایسے عذاب کے جلدی آنے کی خواہش کرتے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ غم واندوہ کے دن طویل ہوتے ہیں اور خوشی ومسرت کے دن چھوٹے ہوتے ہیں (1)۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے صبر وحلم کی انتہا کا بیان ہے، یعنی بیشک اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا لیکن اس نے عذاب کو اس دن تک مؤخر کر رکھا ہے جو ایک دن رب کریم کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایام آخرت میں سے ایک دن ہے۔ اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فقراء مہاجرین کے گروہ تمہیں بشارت ہو کہ تم قیامت کے دن کامل نور کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے اور تمہارا داخلہ مالدار لوگوں کی نسبت نصف دن پہلے ہوگا۔ اور تمہارے رب کے نزدیک وہ ایک دن ہزار سال کے برابر ہے (2)۔ اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فقراء اغنیاء کی نسبت پانچ سو سال اور نصف دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (3)۔

سے اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں میں نے کافی عرصہ ڈھیل دی۔ تو اس میں من قریة اصل میں من اهل قرية ہے (یعنی بستیوں والے)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (الفکر)   2۔ ایضاً   3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 58 (فاروقی)

اور پھر مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اعراب میں اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ ضمائر اور احکام کو لوٹانا تعمیم میں اظہار مبالغہ کی خاطر ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف حرف واؤ کے ساتھ ویستعجلونک اورلن یخلف پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ آیت بھی اسی استدلال کے محل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا اور اس میں اس کا بیان ہے کہ جس عذاب سے وعید کی گئی وہ بالیقین واقع ہو کر رہے گا۔ رہا مسئلہ عذاب کو مؤخر کرنے کا۔ تو یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عادت مبارکہ کے عین مطابق ہے کیونکہ کثیر ایسی بستیاں تھیں جنہیں میں نے اسی طرح مہلت دی جیسے میں نے تمہیں مہلت دے رکھی ہے حالانکہ وہ تمہاری مثل ہی ظالم تھیں۔ ترکیب کلام میں وھی ظالمۃ قریۃ سے حال ہے۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌۚ(۴۹) فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ(۵۰) وَ الَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ(۵۱)

’’(اے حبیب!) آپ فرمائیے اے لوگو! بس میں تو تمہیں (عذاب الٰہی سے) کھلا ڈرانے والا ہوں [1] سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے تو ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور باعزت روزی بھی [2] اور جو لوگ کوشش کرتے رہے ہماری آیتوں (کی تردید) میں اس خیال سے کہ وہ ہمیں ہرادیں گے یہی لوگ دوزخی ہیں [3]‘‘

[1] اے محمد ﷺ آپ کفار کو فرمادیجئے میں تو تمہیں عذاب الٰہی سے کھلا ڈرانے والا ہوں، یعنی میں عذاب لانے پر قادر نہیں بلکہ تمہیں واضح انداز میں عذاب کے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ چونکہ آیت میں خطاب ان مشرکین کو ہے جو عذاب جلدی آنے کی تمنا رکھتے ہیں اور مومنین اور ان کے اجر وثواب کا ذکر فقط ان کے غیظ وغضب میں اضافہ کرنے کے لئے ہے اس لئے صرف انذار کے ذکر پر اقتصار کیا (حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ نذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بشیر بھی ہیں)

اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ انذار (ڈرانا) ابشار (خوش کرنا) پر مقدم ہوتا ہے اور یہ دونوں فریقوں کو شامل ہے، جبکہ ابشار تو صرف اطاعت شعاروں اور فرمانبرداروں کے ساتھ مختص ہے اسلئے یہاں صرف انذار پر اکتفاء کیا گیا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اور اس (دین) مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس آدمی کی طرح ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور کہا کہ اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں کے ساتھ ایک لشکر دیکھا ہے (جو تم پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہے) لہٰذا میں تمہیں واضح طور پر اس سے ڈرار ہا ہوں، تم جلدی محفوظ مقام پر چلے جاؤ، یہاں سے محفوظ ہو جاؤ پس اس کی قوم کے ایک گروہ نے اس کی بات تسلیم کر لی اور وہ رات کے وقت ہی چل پڑے اور مہلت کے لمحات سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گئے تو وہ محفوظ ہو گئے اور راہ نجات پا گئے۔ اور ان میں سے ایک گروہ نے اس کی تکذیب کی اور انہوں نے اپنی صبح اسی جگہ پر کی۔ تو صبح لشکر ان پر حملہ آور ہوا اور انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا۔ پس یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے میری اطاعت کی اور میرے لائے ہوئے دین کی اتباع و پیروی اختیار کی اور ان کی جنہوں نے میری نافرمانی کی اور جو دین حق لیکر آیا اس کی تکذیب کی (1)۔

[2] سو وہ لوگ جو میرے لائے ہوئے دین کے ساتھ ایمان لائے اور انہوں نے اس طرح نیک کام کئے جیسے میں نے انہیں حکم دیا تو

1۔ صحیح مسلم، جلد 15 صفحہ 40-39 (العلمیہ)

ان کے لئے گذشتہ گناہوں سے مغفرت بھی ہے اور باعزت روزی یعنی جنت بھی ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اسلام ان گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اسلام سے قبل سرزد ہوئے ہوں (1)۔

سع اور جو لوگ ہماری آیات کو رد اور باطل کرنے کی کوشش کرتے رہے اس خیال سے کہ وہ ہمیں عاجز کر دیں گے وہی لوگ دوزخی ہیں۔

ترکیب کلام میں **معجزین**، سعوا کے فاعل سے حال ہے۔

ابن کثیر اور ابوعمرو نے اسے **معجزین** تشدید کے ساتھ باب تفصیل سے پڑھا ہے۔ اس مقام پر اور سورۂ سبا میں معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان سے باز رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی نسبت عجز کی طرف کرتے ہیں۔ اور باقیوں نے اسے باب مفاعلہ سے الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ سرکشی اختیار کرتے ہوئے مشقت اٹھانے والے ہیں۔

قتادہ نے معجزین کا معنی گمان کرنے والے اور اندازہ لگانے والے کیا ہے، یعنی وہ اپنے خیال کے مطابق ہمیں ہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ نہ کوئی حشر ونشر ہوگا اور نہ کوئی جنت و دوزخ کا کوئی تصور۔ یا پھر یہ معنی ہے کہ وہ ہمارے قبضے سے نکل جائیں گے اور ہم ان پر قادر نہیں ہو سکیں گے (2)۔

بعض نے معاجزین کا معنی مغالبین کیا ہے، یعنی وہ مقابلے میں ہم پر غالب آنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ ہم انہیں پانے اور ان کے ادراک سے عاجز ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کو عاجز بنا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ انہیں جہنم میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ اس میں زور سے گھسے جا رہے ہیں۔ میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی پس جب وہ آگ اپنے گرد و نواح کو خوب روشن کرنے لگے تو پروانے اور وہ کیڑے جو آگ میں گرتے رہتے ہیں وہ اس میں گرنے لگ جاتے ہیں اور وہ آدمی انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس پر غالب آ جاتے ہیں اور اس (آگ) میں واقع ہوتے رہتے ہیں پس میں بھی تمہاری کمروں کو پکڑ کر تمہیں آگ سے دور کر رہا ہوں اور تم اس میں واقع ہو رہے ہو (3) یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کے الفاظ بھی اسی طرح ہیں۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن کعب القرظی وغیرہما مفسرین نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کی قوم آپ سے منہ پھیر رہی ہے تو جب آپ ﷺ نے انہیں اس دین سے بہت دور ہوتے دیکھا جو آپ لیکر آئے تو آپ ﷺ پر یہ انتہائی شاق گزرا اور آپ ﷺ کے دل میں یہ تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی ایسا طریقہ اور اصول مل جائے جس کے سبب آپ کی قوم اور آپ کے مابین قربت پیدا ہو جائے (اور یہ آرزو اور خواہش اس لئے تھی) کہ آپ ﷺ ان کے ایمان لانے کے انتہائی حریص تھے۔ پس آپ ﷺ ایک دن قریش کی مجلس میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر سورۃ النجم نازل فرمائی اور آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت کی۔ جب آپ ﷺ پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ۙ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى تو اس وقت وہ خواہش اور آرزو جو آپ ﷺ کے دل میں پیدا ہوتی رہتی تھی شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر لا دی (اور بلا قصد آپ کی زبان اقدس سے یہ کلمات نکل گئے) تلک الغرانیق العلی و ان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 76 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 41 (العلمیہ)

شفاعتهن لترتجی (یعنی یہ بت وغان بلند پرواز ہیں اوران کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے) توجونہی قریش نے یہ کلمات سنے تو وہ انتہائی مسرور ہوئے اور رسول اللہ ﷺ تو قرأت کرتے رہے حتی کہ مکمل سورت کی قرأت فرمادی اور سورت کے آخر میں سجدہ فرمایا اور مسلمانوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا۔ بلکہ وہاں کعبہ معظمہ میں جتنے مشرکین بھی تھے وہ بھی سجدے میں گر گئے۔ ولید بن مغیرہ اور سعید بن عاص کے سوا کوئی مومن یا کافر ایسا باقی نہیں رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اور ان دونوں نے ایک ایک مٹھی کنکریاں اٹھائیں اور اپنی پیشانی سے لگالیں کہ اتنا سجدہ ہی ہمارے لئے کافی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں انتہائی بوڑھے تھے اور سجدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ آج جب قریش کی مجلس برخاست ہوئی تو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اپنے بتوں کا ذکر سنا تھا، اس پر انتہائی خوش اور مسرور تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے معبودوں کا ذکر کیا، بہت اچھی طرح کیا ہے۔ اور ساتھ یہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ جان لیا ہے کہ موت وحیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ اختیار میں ہے۔ وہی ہر شی کو تخلیق کرتا ہے اور وہی رزق دیتا ہے لیکن ہمارے یہ معبود تو فقط اس کے پاس ہماری شفاعت وسفارش کریں گے۔ لہٰذا جب محمد (ﷺ) نے انہیں ان کا حصہ دے دیا ہے تو اب ہم بھی محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔

پھر جب شام ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل امین حاضر ہوئے اور آکر عرض کی اے محمد ﷺ! آپ نے کیا کیا کہ آپ نے لوگوں پر وہ کلام تلاوت کر دیا جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ پر نازل نہیں ہوا تھا تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ انتہائی غمزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ شدید خوف محسوس کرنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ پر درج ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی [1] مگر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیئے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوک) [2] پس مٹا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جو دخل اندازی شیطان کرتا ہے پھر پختہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے [3]''

[1] اس آیت میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو تسلی عطا فرماتا ہے اور آپ ﷺ کے لئے انتہائی رحیم وکریم تھا۔ ان دنوں رسول اللہ ﷺ کے جو اصحاب حبشہ میں تھے جب ان تک یہ خبر پہنچی تو قریش نے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مل کر سجدہ کیا ہے اور جب انہیں یہ بتایا گیا کہ قریش اسلام لا چکے ہیں اور اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے تو ان صحابہ کرام میں سے اکثر اپنے اپنے قبائل کی طرف لوٹ پڑے او کہنے لگے کہ اہل مکہ ہمارے نزدیک بہت پسندیدہ اور اچھے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ گئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ اہل مکہ کے اسلام لانے کی جو خبر انہوں نے سنی تھی وہ یکسر غلط اور باطل تھی۔ نتیجتاً ان میں سے ہر کوئی کسی کی پناہ لیکر یا چھپ چھپا کر مکہ میں داخل ہوا(1)۔

من رسول میں من زائدہ تعمیم کے لئے ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جس کے پاس جبرائیل امین علیہ السلام ظاہر ہوتے ہیں۔ اور نبی وہ ہوتا ہے جس کی نبوت الہامی یا منامی ہوتی ہے(2) (یعنی نبوت کے بارے یا تو اسے الہام کیا جاتا ہے یا پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 125 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 26

عالم خواب میں اس کی اپنی نبوت کی اطلاع دی جاتی ہے، یعنی اس کے خواب روز روشن کی طرح عیاں اور سچے ہوتے ہیں)

بعض نے کہا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نئی شریعت عطا فرما کر مبعوث فرماتا ہے اور وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور نبی اس کے مقابلے میں عام ہوتا ہے نبی وہ ہوتا ہے۔ جسے سابقہ شریعت کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ مبعوث فرماتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام تھے۔ پس ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء میں سے سب سے پہلا نبی کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ نبی تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں آپ ایسے نبی تھے جن سے کلام کیا گیا تھا۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! رسول کتنے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تین سو دس سے کچھ زائد کا جم غفیر (1)۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء علیہم السلام کی مجموعی تعداد کتنی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ اور ان میں سے تین سو پندرہ کی کثیر تعداد میں رسول ہیں (2)۔ اسے امام احمد اور ابن راہویہ نے اپنی مسانید میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور حاکم نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

ع بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اذا تمنی کا معنی ہے جب اس نے کسی شی کو پسند کیا اور اس کی خواہش کی اور اس نے دل ہی دل میں ایسی بات کی جس کا اسے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ترکیب کلام میں یہ من رسول ولا نبی سے حال ہونے کی بناء پر مستثنیٰ مفرغ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ فِيْ حَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ اِلَّا مُقَدَّرًا فِيْ شَأْنِهٖ اَنَّهٗ اِذَا تَمَنّٰی۔

القی الشیطن کا معنی ہے شیطان نے اس میں وسوسہ اندازی کی' شیطان نے وسوسہ اندازی کے لئے اس تک راستہ پالیا اور اپنی جانب سے مراد نبی میں کچھ ڈال دیا۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی نبی نہیں مگر جب بھی اس نے اپنی قوم کے ایمان لانے کی تمنا اور آرزو کی تو شیطان نے اس میں ایسی بات ڈال دی جو اس کی قوم کے لئے باعث رضا اور خوشی ہو۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ جب پیغمبر اپنی خواہشات کو دل میں مزین اور آراستہ کر لیتا ہے تو اس کی پسندیدہ خواہش میں شیطان ایسی بات ڈال دیتا ہے جو دنیا میں اس کے مشغول ہونے کا موجب ہوتی ہے (3)۔

سے پس اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے جو دخل اندازی شیطان کرتا ہے۔ یعنی اس کے وسوسہ کو باطل قرار دیتا ہے اور اپنے نبی کو اس کی طرف جھکنے اور مائل ہونے سے بچاتے ہوئے اسے زائل کر دیتا ہے اور اپنے نبی کی راہنمائی ایسے طریقے کی جانب فرما دیتا ہے جو شیطانی وسوسہ کو مٹا دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی ان آیتوں کو پختہ کر دیتا ہے جو امور آخرت میں مستغرق رہنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اکثر مفسرین نے الا اذا تمنی کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ جب اس نے کتاب اللہ کو پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں شکوک ڈال دیئے۔ شاعر نے حضرت

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 178 (صادر) 2۔ ایضاً صفحہ 179 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 532 (العلمیۃ)

عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ایک شعر کہا ہے اور اس میں تمنیٰ کا لفظ قرأ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

تَمَنّٰى كِتَابَ اللّٰهِ اَوَّلَ لَيْلَةٍ وَاٰخِرَهَا لَا قٰى حِمَامَ الْمَقَادِرِ

آپ رضی اللہ عنہ نے ابتداء رات میں کتاب اللہ کی تلاوت فرمائی اور آخر رات میں مقدرہ موت سے ملاقات کی۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی طرف تلاوت میں غلطی کی نسبت کرنا کیسے جائز ہے؟ حالانکہ آپ ﷺ تو اصل دین میں غلطی کرنے سے معصوم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (کہ باطل یعنی شیطان آپ کی طرف نہیں آ سکتا نہ سامنے اور نہ ہی پیچھے سے)(1) اور اسی وجہ سے علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس آیت کے شان نزول میں جو واقعہ سورۃ النجم کی قرأت کے دوران شیطان کے کچھ ڈالنے کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ محققین علماء کی نظر میں مردود ہے(2)۔ لیکن شیخ جلال الدین سیوطی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اسے بزار، ابن مردویہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ یعنی انہوں نے یہ واقعہ حضرت سعید بن جبیر کی وساطت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بزار نے کہا ہے کہ یہ واقعہ صرف اسی اسناد سے متصلاً مروی ہے اور اس کی سند کو متصل بنانے والا منفرد راوی امیہ بن خالد ہے اور یہ ثقہ اور مشہور راوی ہے۔

ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن المنذر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر سے اسے مرسل نقل کیا ہے۔ کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں سورۃ والنجم پڑھی، جب آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۙ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیئے۔ تلک الغرانیق العلی ان شفاعتهن لترتجی تو یہ سن کر مشرکین نے کہا کہ آپ ﷺ نے آج سے قبل ہمارے معبودوں کا اتنا اچھا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا تو اس وقت آیت مبارکہ وما ارسلنا من قبلک الآیہ نازل فرمائی(3)۔ نحاس نے اس واقعہ کو متصل سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے مگر اس سند میں ایک راوی واقدی ہے (اور وہ غیر معتبر ہے) ابن مردویہ نے کلبی کی سند سے ابو صالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

ابن اسحاق نے السیرۃ میں محمد بن کعب اور موسیٰ بن عقبہ سے، المغازی میں ابن شہاب سے، ابن جریر نے محمد بن کعب اور محمد بن قیس سے اور ابن ابی حاتم نے سدی سے نقل کیا ہے تمام کی روایات کا مفہوم ایک ہے مگر تمام کی تمام روایات یا ضعیف ہیں یا منقطع ہیں۔ ہاں سب سے پہلی وہ روایت جو سعید بن جبیر کی سند سے بزار، ابن مردویہ اور طبرانی نے ذکر کی ہے وہ متصل اور قوی ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس روایت کی کثیر اسناد اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس واقعہ کی اصل موجود ہے۔ جبکہ اس کے لئے دو صحیح مرسل اسناد بھی موجود ہیں اور ان کے رواۃ صحیحین کی شرائط کے مطابق ہیں۔ ان میں سے ایک کو طبرانی نے اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے من طریق یونس بن یزید عن ابن شہاب الزہری حدثنی ابو بکر بن عبد الرحمن بن الحارث بن ہشام۔ اور دوسری کو بھی آپ نے ہی مقیم بن سلیمان اور حماد بن سلمہ کی سند سے داؤد عن ابی ہند عن ابی العالیہ سے روایت کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ علماء نے اس اشکال کا جواب مختلف انداز میں دیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ نہیں پڑھے اور نہ ہی صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے وہ الفاظ سنے۔ بلکہ شیطان نے آپ ﷺ کی قرأت کے دوران (آپ کی آواز بنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 533 (العلمیہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 661 (العلمیہ)

کر) مشرکین کے کانوں میں وہ الفاظ ڈال دیئے۔ اور مشرکین نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ الفاظ پڑھے ہیں۔

قتادہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر نیند کا غلبہ تھا پس اسی دوران سہواً اور نسیاناً شیطان کے القاء کرنے کے سبب وہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان اقدس سے نکل گئے۔ لیکن پھر فوراً ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر متنبہ فرما دیا(ا)۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شیطان تھا جسے ابیض کہا جاتا تھا اس نے یہ عمل کیا تھا اور یہ بہت بڑی آزمائش اور فتنہ تھا اور اللہ تعالیٰ جیسے چاہتا ہے اپنے بندوں کے امتحان لیتا رہتا ہے(1)۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں یعنی چاہے تو شیطان نے وہ الفاظ کہے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح قرأت کی ہے یا آپ ﷺ پر نیند کا غلبہ ہوا اور اس دوران آپ ﷺ کی زبان سے وہ الفاظ سہواً نکل گئے۔ ہر دو صورت میں قرآن کریم پر اعتماد اور وثوق کمزور ہو جاتا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ کے ساتھ اس اعتماد اور وثوق کی ضمانت فراہم کر دی ہے۔ کہ جو کچھ شیطان القاء کرتا ہے رب کریم اسے مٹا دیتا ہے، زائل کر دیتا ہے اور لوگوں پر اسے بالکل ظاہر کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا ثم يحكم الله ايته کہ اللہ تعالیٰ آیات منزلہ کو ثابت اور مضبوط کر دیتا ہے اور شیطان کی جانب سے ان میں کسی بھی زیادتی سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت (فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ الآیہ) بھی تو مذکورہ احتمال رکھتی ہے (یعنی اس میں بھی القاء شیطان کا شبہ ہو سکتا ہے) تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ جب اس آیت کو اس دلیل عقلی سے ملا دیا جائے جو یہ تقاضا کرتی ہے کہ رسولوں کی رسالت صحیح ہو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (الفکر)

(ا) حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے الشفاء میں ذکر کیا ہے صحیح روایت کرنے والے علماء میں سے کسی نے بھی اس روایت کو بیان نہیں کیا اور نہ کسی ثقہ نے اسے متصل صحیح سند کیساتھ اسے روایت کیا ہے۔ مفسرین اور مورخین مؤلفین ہی ایسی غرابت بھری روایت نقل کرنے کے مشتاق ہوتے ہیں اور وہ ہر صحیح اور غلط واقعہ کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں۔ قاضی بکر بن علا مالکی نے سچ کہا ہے کہ لوگ مبتدع اور خواہش نفس کے تابع مفسرین کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور محدثین ان کی بیان کردہ روایات سے چمٹے رہتے ہیں حالانکہ وہ روایات ضعیف ہوتی ہیں، ان میں اضطراب پایا جاتا ہے، ان کی اسانید میں انقطاع پایا جاتا ہے اور ان کے الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً اسی واقعہ کے بارے میں بعض نے یہ کہا ہے کہ اس وقت آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے وہ الفاظ اپنی قوم کی مجلس میں کہے، جبکہ آپ ﷺ پر سورۃ النجم نازل ہوئی۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اور سہواً آپ کی زبان سے وہ کلمات نکل گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ پر نیند طاری ہو گئی اور اس دوران آپ کی زبان سے یہ کلمات نکلے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ کلمات نکلوا دیئے پھر جب آپ ﷺ نے جبرائیل امین علیہ السلام کے سامنے یہ الفاظ پڑھے تو اس نے کہا میں نے تو اس طرح آپ کو یہ الفاظ نہیں پڑھائے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ شیطان نے مشرکین کو یہ بتا دیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح قرأت کی ہے۔ جب حضور نبی کریم ﷺ کے پاس یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا! اس طرح تو یہ سورت نازل نہیں ہوئی پس اسی طرح کی مختلف روایات ہیں اور جن مفسرین اور تابعین نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے کسی نے بھی اس کی نسبت صحابی کی طرف نہیں کی اور نہ اسے مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر اسناد انتہائی ضعیف اور کمزور ہیں۔ ان میں مرفوع روایت صرف اس ایک سند سے مروی ہے سعید عن ابی البشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ لیکن اس روایت میں بھی شک ہے کہ آیا حضور نبی کریم ﷺ اس وقت مکہ مکرمہ میں تھے (کعبہ میں قوم کی مجلس میں یا منیٰ میں)

ابوبکر بزار نے کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے یہ حضور نبی کریم ﷺ سے ایسی متصل سند کے ساتھ مروی ہو جس کا ذکر جائز ہو مگر ایک سعید بن جبیر والی سند متصل ہے۔ امیہ بن خالد وغیرہ نے اس روایت کو سعید بن جبیر سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ البتہ یہ معروف ہے کہ کلبی نے ابو صالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اور ابوبکر نے نے یہ بیان کیا ہے کہ اس سند کے علاوہ اس روایت کی کوئی ایسی سند معروف نہیں جو قابل ذکر ہو۔ اور اس میں شک واقع ہونے کے سبب ضعف پایا جاتا ہے اور کلبی کی مرویات اتنی ضعیف ہوتی ہیں کہ نہ ان کی روایت جائز ہے اور نہ ان کا ذکر جائز ہے کیونکہ وہ کذاب راوی ہے۔ از مؤلف قدس سرہٗ)۔

اصول دین میں خطاء اور غلطی سے معصوم ہوں تو یہ یقین بدیہی کا فائدہ دیتی ہے کہ یہ آیت (فَیَنۡسَخُ اللّٰہُ الآیہ) اور دیگر وہ تمام آیات اور احکام شریعت جنہیں اللہ تعالیٰ نے محکم قرار دیا ہے وہ تمام تر شکوک وشبہات سے مبرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں محکم قرار دیا ہے تا کہ اہل علم جان لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں۔ اور وہ ان کے ساتھ ایمان لائیں اور ان کے سامنے جھک جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی اہل ایمان کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کے احوال اور ان کی استعداد کو جانتا ہے اور وہ ہر ایک سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، یعنی جو ہدایت کا مستحق ہوتا ہے اسے ہدایت دے دیتا ہے۔ اور جو گمراہی کا مستحق ہوتا ہے اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت کے تحت کرتا ہے لہٰذا کسی کے لئے بھی اس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ جو کچھ نبی مکرم ﷺ کی جانب وحی فرمائی گئی اور جو شیطان نے قصد و ارادہ کیا اللہ تعالیٰ ان تمام حالات سے خوب واقف اور انہیں جاننے والا ہے اور چونکہ رب کریم حکیم ہے اس لئے وہ شیطان کی طرف سے القاء کئے گئے الفاظ کو ظاہر کئے بغیر قطعاً نہیں چھوڑتا بلکہ اسے زائل کر دیتا ہے اور مٹا ڈالتا ہے۔

لِّیَجۡعَلَ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ فِتۡنَۃً لِّلَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡقَاسِیَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَفِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿ۙ۵۳﴾ وَّ لِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَیُؤۡمِنُوۡا بِہٖ فَتُخۡبِتَ لَہٗ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَہَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۴﴾

”یہ سب اس لئے تا کہ اللہ تعالیٰ بنادے جو وسوسہ ڈالتا ہے شیطان ایک آزمائش ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں اور بیشک ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں [1]۔ نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ جان لیں وہ لوگ جنہیں علم بخشا گیا کہ کتاب حق ہے آپ کے رب کی طرف سے [2] تا کہ ایمان لائیں اس کے ساتھ اور جھک جائیں اس (کی سچائی) کے آگے ان کے دل اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے ایمان والوں کو راہ راست کی طرف [3]“

[1] اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسا کرنے کی قدرت اس لئے دی تا کہ وہ اس کے وسوسہ کو ان لوگوں کے لئے آزمائش اور فتنہ بنادے جن کے دلوں میں شک اور نفاق ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں یعنی مشرکین۔ اور بیشک منافقین اور مشرکین حق کی مخالفت کرنے یا رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ وَاِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے تا کہ منافقین و مشرکین کے ظلم وزیادتی کی وضاحت ہو جائے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو قریش نے یہ کہا کہ ہمارے معبودوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے محمد (ﷺ) اس کے ذکر پر نادم ہیں لہٰذا اسے بدل ڈالا۔ اور وہ دو حرف جو شیطان نے آپ ﷺ کی قرأت میں ڈال دیئے تھے وہ ہر مشرک کے منہ پر تھے چنانچہ ان کے شر میں اضافہ ہو گیا اور مسلمانوں پر ان کی شدت اور سختی بڑھ گئی (1)۔

[2] وَّلِیَعۡلَمَ کا عطف لِّیَجۡعَلَ پر ہے اور لام کا تعلق فعل مقدر سے ہے۔ یعنی فَعَلۡنَا تَمۡکِیۡنَ الشَّیۡطَانِ عَلَی الۡاِلۡقَاءِ وَ نَسۡخَ مَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 26-125 (الفکر)

يُلْقِي الشَّيْطَانُ لَا مُرَيْنِ لِنَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ اِلٰى آخره وَلِيَعْلَمَ۔یعنی ہم نے شیطان کوالقاء کرنے کی قدرت دی اور پھر اس کے القاء کئے ہوئے کومٹاڈالا۔ اسکا سبب دوامر ہیں، ایک تو یہ کہ جو کچھ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے ہم اسے آزمائش بنادیں اور دوسرا یہ کہ اہل علم جان لیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ لام قول باری تعالیٰ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ کے متعلق ہو۔ اس صورت میں لِيَجْعَلَ اور لِيَعْلَمَ میں لام عاقبت کے لئے ہوگا (کہ اس فعل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ مشرکین کے لئے باعث فتنہ ہوگا اور اہل ایمان کے لئے ایمان کی مضبوطی کا سبب ہوگا) جیسا کہ اس ارشاد میں لام عاقبت کے لئے فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا۔تا کہ جان لیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کے بارے علم بخشا گیا ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہ تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی جانب سے القاء کردہ چیزوں کو مٹا ڈالتا ہے کہ وہ آیات قرآنیہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے محکم اور مضبوط کردیا ہے وہ حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی نازل ہونے والی ہیں (1) یا معنی یہ ہے کہ شیطان کو القاً کرنے کی قدرت دینا حق ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت سے ہی جنس انسان میں یہی دستور خداوندی جاری رہا ہے۔

۳؎ تا کہ وہ قرآن کریم کے ساتھ ایمان لائیں اور یہ پختہ اعتقاد بنالیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یا معنی ہے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آئیں۔ يُؤْمِنُوْا کا حرف فاَ سے يَعْلَمَ پر عطف اس بات کی دلیل ہے کہ فقط علم کا نام ایمان نہیں بلکہ یہ تو امر وہبی ہے جو کہ دستور کے مطابق اکثر علم کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور تا کہ ان کے دل اطاعت وانقیاد اور خشیت کے سبب جھک جائیں اور انہیں راحت قلبی اور اطمینان حاصل ہو جائے اور جب کبھی اہل ایمان شبہات میں مبتلا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ہی انہیں راہ راست کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔ صراط مستقیم سے مراد صحیح اعتقاد اور سیدھا راستہ ہے اور وہ اسلام ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

"اور ہمیشہ شک میں مبتلا رہیں گے کفار اس کے بارے میں یہاں تک کہ آجائے ان پر قیامت اچانک یا آجائے ان پر عذاب منحوس دن کا ۱؎ حکمرانی اس روز اللہ تعالیٰ کی ہی ہوگی۔ وہی فیصلہ فرمائے گا لوگوں کے درمیان ۲؎ پس جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے تو وہ نعمت (واحسان) کے باغوں میں (قیام پذیر) ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو یہ وہ بدنصیب ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہوگا ۳؎"

۱؎ مِرْيَة کا معنی ہے شک۔ مِنْهُ کی ہ ضمیر سے مراد قرآن کریم ہے یا رسول کریم ہیں یا اہل ایمان ہیں یا پھر اس سے مراد وہ وسوسہ ہے جو شیطان نے آپ کی قرأت کے دوران ڈال دیا۔ معنی یہ ہے کہ کفار ان چیزوں کے سبب ہمیشہ شک میں مبتلا رہیں گے کہ آپ ﷺ کو کیا ہوا کہ آپ نے پہلے تو بتوں کا ذکر بڑے اچھے انداز سے کیا مگر پھر ایسا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر منحوس دن کا عذاب آجائے۔ الساعة سے مراد موت کا وقت ہے اور بغتة سے مراد اچانک آجانا۔

عکرمہ اور ضحاک نے کہا ہے کہ عذاب یوم عقیم سے مراد اس دن کا عذاب ہے جس کی رات نہ ہوا اور وہ قیامت کا دن ہے (2)۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (الفکر) 2۔ایضاً

بعض نے یہ کہا ہے کہ الساعۃ سے مراد قیامت کا دن ہے اور یوم عقیم سے مراد بدر کا دن ہے کیونکہ اس دن کفار کو کوئی بھلائی اور نفع حاصل نہیں ہوا تھا۔ لغت میں عقیم کا معنی ہے روکا ہوا منع کیا ہوا۔ اور اسی سے ہے الریح العقیم۔ یعنی ایسی ہوا جس میں بارش نہ ہو۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ الساعۃ اور یوم عقیم دونوں سے مراد ایک ہی ہو، یعنی دونوں سے مراد یوم قیامت ہو۔ اور اس دن کی دہشت اور ہولناکی کے اظہار کے لئے دوسری جگہ اسم ضمیر کی بجائے اسم ظاہر ذکر کیا گیا ہو۔

ع یعنی جس دن کفار کا شک دور ہوگا اس دن حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہوگی وہی لوگوں کے درمیان جزاء کا فیصلہ فرمائے گا۔ لِلّٰہِ ظرف مستقر ہے۔ اور یَحْكُمُ بَيْنَهُم جملہ مستانفہ ہے یا حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے اور هُمْ ضمیر اہل ایمان اور کفار تمام کو شامل ہے اور اس پر دلیل مابعد آیت طیبہ ہے۔

سے ان دونوں آیتوں میں سے پہلی میں خبر (فی جنات النعیم) بغیر فاء کے ذکر کی گئی ہے اور دوسری میں خبر (فَأُولٰئِكَ لَهُمْ الایۃ) فاء کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ یہ طرز کلام اس پر متنبہ کر رہا ہے کہ مومنین کو بطور ثواب و جزاء جنت کا عطا ہونا محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عنایت ہے اور کفار کے لئے عذاب و عتاب کا سبب ان کے اعمال ہیں۔ اسی وجہ سے فرمایا لَهُمْ عَذَابٌ (ان کے لئے عذاب ہوگا) یہ نہیں فرمایا هُمْ فِي عَذَابٍ (کہ وہ عذاب میں ہوں گے) (جبکہ اہل ایمان کے لئے فرمایا وہ نعمت و احسان کے باغوں میں قیام پذیر ہوں گے) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دلا سکے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی رحمت اور فضل سے مجھے ڈھانپ لے گا(1)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔

دونوں نے صحیحین میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث روایت کی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سیدھے چلتے رہو قربت اختیار کرتے جاؤ اور خوش رہو کیونکہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ وہ مجھے مغفرت و رحمت سے ڈھانپ لے گا(2)۔ اسی طرح کی حدیث مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید کی حدیث اور طبرانی نے ابن ابی موسیٰ، شریک بن طارق، اسامہ بن شریک اور اسد بن کرز کی حدیث نقل کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے سبب جو تم کرتے تھے) (اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کے سبب ہوگا) تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ جنت کے مختلف مراتب اور درجات ہیں، وہ اعمال کے سبب ہی حاصل ہوں گے (یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی جنت میں مرتبہ اور درجہ نصیب ہوگا) لہٰذا اس آیت کو جنت کے مراتب پانے پر محمول کیا جائے گا۔ رہا اصلاً جنت میں داخل ہونا اور اس میں ہمیشہ رہنا تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور فضل کے سبب ہی ہوگا۔

ہناد نے الزہد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے آپ فرماتے ہیں تم اللہ تعالیٰ کی عفو (درگزر) کے ساتھ پل صراط عبور کرو گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے اور اپنے اعمال کے سبب مراتب و درجات حاصل کرو گے۔ ابو نعیم نے عون بن عبد اللہ سے بھی یہ اثر نقل کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 132 (العلمیۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 133

وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَیَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۵۸﴾ لَیُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا یَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ ﴿۵۹﴾ ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْهِ لَیَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

''اور جن لوگوں نے ہجرت کی راہ خدا میں پھر وہ (جہاد میں) قتل کردیئے گئے یا طبعی طور پر فوت ہوئے تو ضرور عطا فرمائیگا انہیں اللہ تعالیٰ بہترین رزق اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے [1] وہ ضرور داخل کرے گا انہیں ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا' بڑا بردبار ہے [2] ان باتوں کو یاد رکھو! [3] اور جس نے بدلا لیا اتنا قدر جتنی تکلیف اسے دی گئی تھی پھر (مزید) زیادتی کی گئی اس پر تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرمائیگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانیوالا بہت بخشنے والا ہے [4]''

[1] جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے وطنوں اور اعزا و اقارب سے مفارقت اور جدائی اختیار کی پھر وہ جہاد میں قتل کردیئے گئے۔ قُتِلُوْا کو ابن عامر نے تکثیر اور مبالغہ کے معنی کا اظہار کرنے کے لئے باب تفعیل سے شد کے ساتھ قُتِّلُوْا پڑھا ہے اور باقیوں نے تخفیف کے ساتھ قُتِلُوْا پڑھا ہے یا وہ طبعی طور پر فوت ہوئے تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور جنت میں ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا جو کبھی ختم نہیں ہونگی اور ان نعمتوں کی کوئی مثل نہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے کیونکہ وہ بغیر حساب کے رزق عطا فرماتا ہے۔

[2] وہ ضرور داخل کرے گا انہیں ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے، یعنی وہ انہیں جنت میں داخل فرمائے گا اور اس میں ہر وہ نعمت ہوگی جس کی چاہت اور خواہش نفوس کریں گے اور آنکھیں ایسی نعمتوں سے لذت آشنا ہوں گی جنہیں کسی آنکھ نے نہ دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں ان کا تصور تک کھٹکا۔

یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے احوال اور ان کے معاندین کے احوال جاننے والا ہے اور بڑا بردبار ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

[3] ذٰلِک ترکیب کلام میں یا تو خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ الامر ہے۔ یعنی الامر ذٰلِک (معاملہ یہ ہے) یا مبتدا اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی ذٰلِک حَقٌ (یہ بات حق ہے) یا محل رفع میں فاعل واقع ہو رہا ہے، یعنی تحقق ذٰلِک (یہ بات ثابت اور محقق ہے) یا پھر محل نصب میں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی عَرَفْتُ ذَالِکَ الَّذِیْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ (تو نے وہ کچھ جان لیا جو ہم نے تجھ پر بیان کیا)

[4] جس کسی نے ظالم سے اتنا ہی انتقام لیا جتنی مقدار اس پر ظلم کیا گیا۔ عقاب سے مراد وہ سزا یا بدلہ ہے جو کسی ظلم یا زیادتی کے عوض اور مقابلہ میں دی جائے مگر یہاں ابتدائی ظلم کو بھی عقاب کا نام دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی ظلم اور اس کا بدلہ دونوں ہمشکل اور ایک جیسے ہیں۔

پھر پہلے مظلوم پر دوبارہ ظلم و زیادتی کی گئی تو بالیقین اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا بہت

بخشنے والا ہے، یعنی پہلے مظلوم نے انتقام لینے میں، جہاں تک خواہش نفس کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡأُمُوۡرِ۔ (یعنی جو صبر کرے اور معاف کردے تو بلاشبہ یہ بڑے عالی حوصلگی کا کام ہے) کے ذریعے جو کچھ اس کے لئے مستحب قرار دیا تھا اور اس نے اس سے اعراض برت کر جرم کا ارتکاب کیا اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمانے والا اور بہت بخشنے والا ہے (یعنی اس جرم پر اس کی گرفت نہیں فرمائے گا) اس آیت میں معاف کردینے کی انگیخت اور ترغیب دلائی گئی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنی کمال قدرت اور علو شان کے باوجود معاف فرما دیتا ہے اور بخش دیتا ہے تو پھر دوسروں کو بدرجہ اولیٰ ایسا کرنا چاہئے اور دوسرا اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے کیونکہ عفو کی صفت سے وہی متصف ہوسکتا ہے جو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حسن نے کہا ہے قول باری تعالیٰ وَمَنۡ عَاقَبَ بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبَ بِهٖ کا معنی یہ ہے کہ جس نے مشرکین سے اسی طرح قتال کیا جیسے انہوں نے اس سے قتال کیا پھر اس پر مزید ظلم کیا گیا کہ اسے اپنے گھر سے باہر نکال دیا گیا۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ایک گروہ کے بارے نازل ہوئی جو کہ مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لئے آیا، جبکہ ابھی محرم الحرام کے دو دن باقی تھے۔ چنانچہ اس مہینے کے احترام میں مسلمانوں نے ان کے ساتھ لڑنا پسند نہ کیا۔ اور ان سے یہ کہا کہ تم اس ماہ محرم کے احترام کی وجہ سے جنگ سے رک جاؤ۔ لیکن مشرکین نے اس بات کو رد کردیا اور مسلمانوں سے لڑنا شروع ہوگئے۔ پس یہ ان کی جانب سے مسلمانوں پر انتہائی ظلم اور زیادتی تھی۔ لیکن مسلمان ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے سبب مسلمان ان پر غالب آگئے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ اس واقعہ کے مطابق آیت طیبہ کے مذکورہ حصہ کا معنی یہ ہوگا کہ بیشک اللہ تعالیٰ مومنین کو معاف فرمانے والا ہے اور ماہ حرام میں ان کے جنگ کرنے کے جرم کو بخشنے والا ہے۔ ابن ابی حاتم نے مقاتل سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِي النَّهَارِ وَيُوۡلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيۡلِ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ ﴿٦١﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡعَلِيُّ الۡكَبِيۡرُ ﴿٦٢﴾ أَلَمۡ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصۡبِحُ الۡأَرۡضُ مُخۡضَرَّةً ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَطِيۡفٌ خَبِيۡرٌ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡأَرۡضِ ۗ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡغَنِيُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿٦٤﴾

''اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی داخل کرتا ہے رات (کے کچھ حصہ) کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن (کے کچھ حصہ) کو رات میں اور اللہ تعالیٰ سب باتیں سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے[1] نیز اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خدائے برحق ہے[2] اور جسے وہ پوجتے ہیں اس کے علاوہ وہ سراسر باطل ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بلند (اور) سب سے بڑا ہے[3] کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی تو ہو جاتی ہے (خشک) زمین سرسبز و شاداب۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہر چیز سے باخبر ہے[4] اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بے پرواہ اور ہر تعریف کا مستحق ہے[5]''

1۔ اس مدد کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے اور اس کی یہ عادت جاری ہے کہ وہ متضاد چیزوں کے درمیان تغیر و تبدل کرتا رہتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (الفکر)

ہے۔ اسی وجہ سے وہ رات اور دن میں سے ایک میں اتنی مقدار کا اضافہ فرما دیتا ہے جتنی مقدار دوسرے میں کمی کرتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ سورج کو غروب کر کے دن کے اجالے اور نور کی جگہ رات کی ظلمت و تاریکی لے آتا ہے اور طلوع آفتاب کے سبب رات کی تاریکی کو دن کے نور میں تبدیل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ انتقام لینے والے اور جس سے انتقام لیا جائے دونوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کی دعا سنتا ہے اور ان کی دعا قبول بھی فرماتا ہے اور وہ دونوں کے افعال کو دیکھنے والا ہے لہٰذا وہ دونوں میں سے کسی کے افعال کو مہمل اور جزاء وسزا کے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

۲؎ نیز وہ کمال علم وقدرت اور کمال سمع بصر سے اس لئے متصف ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خدائے برحق ہے، وہ فی نفسہٖ ثابت اور موجود ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود اور وحدہٗ لاشریک ہے کیونکہ اس کا واجب الوجود ہونا اور وحدہٗ لاشریک ہونا دونوں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے سوا پائی جانے والی ہر شئی کے لئے مبداء اور سرچشمہ وجود ہو وہ ساری کائنات اور اپنی ذات کا عالم بھی ہو۔ اور تمام صفات کمالیہ سے متصف بھی ہو کیونکہ جب اس کا الٰہ ہونا ثابت ہے تو پھر لازم ہے کہ وہ اپنی قدرت اور علم میں کامل ہو اور وہ سمیع وبصیر ہونے میں تام ہو۔

۳؎ نافع، ابن کثیر، ابن عامر اور ابوبکر نے یہاں اور سورۂ لقمان میں دونوں مقامات پر مَایَدْعُونَ کوتا کے ساتھ مَا تَدْعُونَ پڑھا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کو پوجتے ہیں وہ سراسر باطل ہیں۔ معدوم ہیں اور ذاتی اعتبار سے ان کا وجود ممتنع ہے یا معنی یہ ہے کہ ان کا الٰہ ہونا باطل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اس سے بلند وبرتر ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو اور وہ ایسا عظیم ہے کہ اس کی مثل کوئی شئی نہیں۔

۴؎ کیا تو نے نہیں دیکھا یا کیا تو نے جان نہیں لیا۔ یہ استفہام انکاری ہے یعنی تو نے جان لیا ہے اور دیکھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا تو خشک زمین سرسبز وشاداب ہو جاتی ہے، یعنی زمین نباتات کے ساتھ سرسبز وشاداب ہو گئی۔ یہاں ماضی کے لئے مضارع کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ایک تو اس لئے کہ ماضی کی تصویر ذہن میں حاضر رہے اور دوسرا اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ بارش کے اثرات کافی وقت تک باقی رہتے ہیں اور یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال علم پر دوسری دلیل ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہے، یعنی اس کا علم یا اس کی مہربانی ہر چیز تک پہنچنے والی ہے چاہے وہ کتنی دقیق ہو یا کتنی بڑی اور عظیم ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، یعنی تدابیر ظاہرہ سے بھی اور تدابیر باطنہ سے بھی اپنے بندوں کے احوال سے بھی اور رزق میں سے جس جس شئی کے محتاج اور ضرورتمند ہیں رب کریم اس سے باخبر ہے۔

۵؎ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، یعنی ہر شئی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی ملکیت ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنی ذات میں ہر شئی سے مستغنی اور بے پرواہ ہے اور وہی اپنی صفات وافعال کے اعتبار سے مستحق حمد وستائش ہے یا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے خود محمود ہے اگرچہ اس کی ذات کے سوا کوئی حمد وتعریف کرنے والا نہ بھی موجود ہو۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَحْيَاكُمْ ٞ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾

’’اور کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنادیا ہے تمہارے لئے ہر چیز کو جو زمین میں ہے اور کشتی کو بھی کہ چلتی ہے سمندر میں اس کے حکم سے [1] اور اس نے روکا ہوا ہے آسمان کو کہ گر نہ پڑے پر بجز اس کے فرمان کے [2] بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے [3] اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی پھر مارے گا تمہیں پھر زندہ کرے گا تمہیں [4] بیشک انسان بڑا ناشکرا ہے۔ [5]‘‘

[1] کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنادیا ہے تمہارے لئے ہر چیز کو جو زمین میں ہے، یعنی اسے تمہارے لئے مطیع کر دیا ہے اور اسے تمہارے منافع اور فوائد کے لئے تیار کیا ہے۔ ترکیب کلام میں الفلکُ منصوب ہے، اس کا عطف ما پر ہے یا اَنَّ کے اسم پر ہے۔ اور تَجرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ یا تو الفلکُ سے حاصل ہے یا جملہ متانفہ ہے۔ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پائے جانے والے سواری کے جانور تمہارے لئے فرمانبردار بنادیئے ہیں تاکہ تم خشکی میں ان پر سواری کرو اور کشتی کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم سمندر میں اس پر سواری کرو۔

[2] اور اس نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اجسام فلکیہ بھی اجسام ارضیہ کی مثل نیچے کی طرف آنے کا میلان رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے انہیں روک رکھا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ امسکہا (اللہ تعالیٰ نے انہیں روک رکھا ہے) کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی ہیئت اور صورتوں پر بنایا ہے جو کہ بذات خود اوپر رکنے کا تقاضا کرتی ہیں (1)۔

اِلَّا بِاِذْنِہٖ قول باری تعالیٰ یُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ کے مضمون سے استثناء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اجازت کے بغیر کسی حال میں بھی آسمان زمین پر نہیں گرے گا۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ قیامت کا دن ہے (2) (جس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ آسمان زمین پر گر پڑے گا)

میں کہتا ہوں کہ قیامت کے دن بھی آسمان کے زمین پر گرنے کو ہم نہیں جانتے بلکہ اس کے پھٹنے اس میں شگاف ہونے، پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جانے، تیل کی تلچھٹ کی طرح ہونے اور اس کے کاغذ کے لپٹنے کی طرح لپٹ جانے کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ استثناء یہ تقاضا کرتا ہے کہ کلام استثناء کے بعد باقی کے بارے ہے اور یہ مستثنیٰ کے وجود کا تقاضا نہیں کرتا۔ پس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ آسمان اذن خداوندی کے بغیر زمین پر نہیں گرے گا۔ لیکن اس آیت سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کونسا وہ مخصوص وقت ہے جبکہ اسے زمین پر گرنے کی اجازت ہوگی اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے زمین پر گرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

[3] بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کیساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ اس طرح کہ اس نے لوگوں کے لئے (اپنی وحدانیت کی پہچان کے لئے) استدلال کے اسباب پیدا فرمادیئے ہیں، منافع اور فوائد کے دروازے ان پر کھول دیئے ہیں اور ان سے طرح طرح کی مصیبتوں اور تکالیف کو دور فرمادیتا ہے۔

[4] اور وہی ہے جس نے تمہارے جسموں میں ارواح پھونک کر تمہیں زندگی عطا فرمائی حالانکہ اس سے قبل تم جامد حالت میں تھے، عناصر تھے، نطفہ تھے، جما ہوا خون تھے، گوشت کا ایک لوتھڑا تھے اور بغیر روح کے جسم تھے۔ (اللہ تعالیٰ نے تمہیں مذکورہ تمام مراحل سے گزار کر

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 542 (العلمیۃ) 2۔ ایضاً

تمہارے جسموں میں ارواح پھونک کر تمہیں نعمت حیات سے نواز دیا) پھر وہی تمہاری مدت حیات گزرنے کے بعد تمہارے جسموں سے ارواح نکال کر تمہیں موت دے گا اور پھر آخرت میں تمہیں دوبارہ جسم عطا کر کے اور ان میں ارواح پھونک کر تمہیں زندہ کرے گا۔
۵ بیشک انسان (مشرک) ان نعمتوں کے ظاہر ہونے کے بعد ان کا انکار کر کے ناشکری کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ نہ تو اس ابتدائی اور بنیادی نعمت کو پہچانتا ہے جو اسے وجود عطا کرتی ہے اور نہ نعمت موت کا اعتراف کرتا ہے جو اسے اس دوسری زندگی کے قریب کرنے والی ہے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اور نہ دوبارہ زندہ کئے جانے کی نعمت کو تسلیم کرتا ہے جو اسے مقصود اصلی (بقاء دوام) تک پہنچانے والی ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود وحدانیت اور اس کی صفات کاملہ پر قطعی دلائل قائم ہونے کے باوجود بھی مشرک انسان اپنے رب کا انکار کرتا ہے اور اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ ﴿٦٧﴾ وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٦٨﴾ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٦٩﴾

''ہر امت کے لئے ہم نے مقرر کر دیا ہے عبادت کا طریقہ جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں ۱؎ تو انہیں چاہیئے کہ وہ نہ جھگڑا کریں آپ سے اس معاملہ میں ۲؎ آپ بلاتے رہیئے انہیں اپنے رب کی طرف (اے محبوب!) آپ بیشک سیدھی راہ پر (گامزن) ہیں ۳؎ اور اگر وہ (پھر بھی) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ (صرف اتنا) فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن ان امور کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ ۴؎''

۱؎ اس آیت سے قبل عطف کے لئے واؤ ذکر نہیں کی جیسا کہ اس سے قبل حرف عطف ذکر کیا گیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں عبادات سے متعلقہ ایک دوسرے سے مناسبت رکھنے والی کئی آیات ذکر کی گئی تھیں اس لئے وہاں ان کا ایک دوسرے پر عطف کیا گیا ہے لیکن یہ آیت معنوی اعتبار سے بہت دور واقع ہے اس لئے اس کا عطف نہیں کیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ مَنْسَكًا سے مراد وہ شریعت ہے جس کے مطابق سابقہ امتوں کے باسی عمل پیرا تھے۔ آپ کے بارے یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے فرمایا اس سے مراد عید (تہوار) ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد قربان گاہ ہے جہاں لوگ اپنے جانور ذبح کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی محل عبادت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد وہ مانوس مقام ہے جس سے لوگ انس اور محبت رکھتے ہوں (میلہ) کلام عرب میں منسک سے مراد وہ مقام ہے جہاں لوگ اچھے یا برے کام کے لئے عموماً جمع ہوتے ہوں۔ اسی سے مناسک حج بھی ہیں کیونکہ لوگ مقامات حج کی طرف بار بار لوٹ کر آتے ہیں(1)۔ قاموس میں ہے کہ نسک کا معنی عبادت ہے اور اَرِنَا مَنَاسِكَنَا کا معنی ہے ہمیں ہماری عبادت گاہیں دکھا۔ مَنْسَكٌ کا معنی نفس ذبح بھی ہے اور وہ مقام بھی ہے جہاں جانور ذبح کیا جاتا ہے(2)۔ نَسِيكَه کا معنی ذبح ہونے والا جانور ہے۔ نسک سے مراد مقام مالوف (میلہ) ہے اور مَنْسَكٌ بیٹھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں
۲؎ پس تمام ارباب ملل کو چاہیئے کہ وہ دین یا عبادات (یا ذبح کے طریقوں) کے بارے میں آپ سے جھگڑا نہ کریں کیونکہ وہ یا تو جاہل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1265 (التراث العربی)

ہیں یا عناد رکھنے والے ہیں۔ اگر ان کے اہل علم عناد نہ رکھتے ہوتے تو آپ کے ساتھ ان کے جھگڑا کرنے کا کوئی جواز اور سبب نہیں۔ کیونکہ آپ کے دین کا معاملہ اتنا واضح اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی نزاع اور جھگڑے کی قطعاً گنجائش نہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت بدیل بن ورقا، بشر بن سفیان اور یزید بن خنیس کے بارے نازل ہوئی، انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو کہا تھا کہ تم ان جانوروں کو تو کھا لیتے ہو جنہیں اپنے ہاتھوں سے مار دیتے ہو اور جنہیں اللہ تعالیٰ مار دیتا ہے انہیں نہیں کھاتے (بلکہ کہتے ہو کہ یہ مردار ہے)

زجاج نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ لَا يُنَازِعُنَّكَ کا معنی ہے آپ ان سے جھگڑا نہ کیجئے۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے ہے لا يخاصمنك فلان (فلاں کو چاہئے وہ آپ سے جھگڑا نہ کرے) اس کا معنی ہے لا تخاصمه۔ تو اس سے جھگڑا نہ کر۔ یہ معنی لینا صرف ان افعال میں جائز ہوتا ہے جو دو افراد سے صادر ہوں۔ لہٰذا لا يضربنك زَيْدٌ (چاہئے کہ زید تجھے نہ مارے) بول کر لَا تَضْرِبُهُ (تو اسے نہ مار) مراد لینا جائز نہیں۔ البتہ لا يضاربنّك بول کر لاتضربه مراد لینا جائز ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ منازعت اور مخاصمت دو افراد کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا (یعنی جھگڑا کرنے کے لئے کم از کم دو افراد کا ہونا ضروری ہے) اور جب ان میں سے ایک جھگڑا چھوڑ دے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے (1)۔

؂ آپ لوگوں کو اپنے رب کی توحید اور عبادت کی طرف بلاتے رہیے۔ میں تو کہتا ہوں۔ بلکہ آپ اپنے رب کی ذات اور بلا کیف اس کا قرب اختیار کرنے کی طرف دعوت دیتے رہیئے۔ بلا شبہ آپ اس سیدھی راہ پر گامزن ہیں جو حق اور مدارج قرب کی طرف لے جانے والا ہے۔

؂ اگر حق ظاہر ہونے اور حجت قائم ہونے کے بعد بھی وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فقط اتنا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم باطل جھگڑے فساد اور دیگر افعال میں سے کرتے ہو پس وہی تمہیں ان کا بدلہ دے گا۔ اس جملہ میں (مشرکین کو) نرم لہجہ میں وعید کی گئی ہے۔ یہ حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ شرطیہ کا عطف فَلَا يُنَازِعُنَّكَ پر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن اہل ایمان اور کافرین کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ تو اس دن حق باطل سے بالکل ظاہر ہو جائے گا، یعنی قیامت کے دن اہل ایمان کو ثواب اور جزاء دی جائے گی اور کفار کے لئے اعمال کی سزا ہوگی۔ جیسا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دلائل و آیات کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر رکھا ہے۔ امور دینیہ میں سے جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ اختلاف سے مراد وہ جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے خلاف رائے قائم کرنا ہے۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُم بِهِ عِلْمٌ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ۝ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنكَرَ ۖ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (الفکر)

اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

''کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے یہ سب کچھ ایک کتاب میں (لکھا ہوا) ہے۔ بیشک (بلندی اور پستی کی ہر چیز کو جان لینا) اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ۱؎ اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان کو نہیں اتاری جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کوئی سند۔ اور انہیں خود بھی ان کے بارے کوئی علم نہیں۔ اور نہیں ہوگا ظلم وستم کرنے والوں کا کوئی مددگار ۲؎ اور جب تلاوت کی جاتی ہے ان کے سامنے ہماری آیتیں صاف صاف تو آپ پہچان لیتے ہیں کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار۔ یوں پتہ چلتا ہے کہ وہ عنقریب جھپٹ پڑیں گے ان لوگوں پر جو پڑھتے ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں ۳؎ آپ فرمایئے (اے چیں بہ جبیں ہونے والو!) کیا میں آگاہ کر دوں تمہیں اس سے بھی تکلیف دہ چیز پر دوزخ کی آگ! وعدہ کیا ہے اس آگ کا اللہ تعالیٰ نے کفار سے اور دوزخ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۴؎''

۱؎ اَلَمْ تَعْلَمْ میں استفہام تقریری ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے (یعنی آپ یقیناً جانتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ زمین وآسمان میں ہے، یعنی اس پر کوئی شئی مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کتاب سے مراد وہ لوح محفوظ ہے جس میں زمین وآسمان کی تخلیق سے پہلے ماکان اور ما یکون سب کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے۔ (یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے سب کچھ اس میں درج ہے، اس میں ان مشرکین کے تمام معاملات بھی محفوظ ہیں) اس لئے آپ ان کے معاملات اور ان کے کردار کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں کیونکہ ان کی تمام کارستانیاں ہمارے علم میں ہیں اور ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ بیشک ان تمام کا احاطہ کرنا یا انہیں لوح محفوظ میں درج اور ثابت کرنا یا تمہارے درمیان (جزاء وسزا کا) فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ کیونکہ اس کی ذات اس تمام علم کا تقاضا کرتی ہے اور تمام معلومات کی نسبت اس کے علم کی طرف مساوی اور یکساں ہے۔

۲؎ وَيَعْبُدُوْنَ کا عطف سابقہ ان آیات کے مضمون پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں، یعنی کیا تم توحید باری تعالیٰ اور الوہیت خداوندی کے بارے ان واضح دلائل اور براہین قاطعہ کو جانتے ہو؟ اور یہ مشرکین ایسے دلائل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے علاوہ ان کی پرستش کرتے ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی سند اور حجت نازل نہیں فرمائی جو ان کی عبادت وپرستش کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ اور انہیں خود بھی ان کے بارے کوئی علم نہیں جو انہیں قضیۂ عقل سے حاصل ہوا ہو، یا استدلال نظری کا نتیجہ ہو یا اس مخبر صادق کی جانب سے علم کا فائدہ دینے والی صحیح روایت ہو، جس کی صداقت پر دلائل و براہین موجود ہوں یا پھر ایسی خبر متواتر ہو جس کی انتہاء حواس خمسہ میں سے کسی پر ہو۔

اور وہ مشرکین جنہوں نے اس قسم کے ظلم کا ارتکاب کیا ہے ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے گا۔

۳؎ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ الآیۃ مکمل شرط وجزا کا عطف يَعْبُدُوْنَ پر ہے اور جب ان پر قرآن کریم سے ہماری آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونا بالکل بین اور واضح ہے یا عقائد حقہ اور احکام الٰہیہ پر انکی دلالت واضح ہے۔ تو آپ کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار پہچان لیتے ہیں۔ یہاں منکر سے مراد انکار ہے، یعنی ترش روئی اور غیظ وغضب کے سبب انکار

کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ آیت کریمہ میں فِیْ وُجُوْھِھِمْ ضمیر کی جگہ فِیْ وُجُوْہِ الَّذِیْنَ اسم ظاہر ذکر کیا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ انہیں اس انکار پر برانگیختہ کرنے والی شدت کفر کے سوا اور کوئی شئی نہیں۔

یا پھر منکر سے مراد وہ شر ہے جس کا وہ مومنین کے بارے قصد کرتے ہیں۔ یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ ترکیب کلام میں اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے حال ہے۔ یَسْطُوْنَ کا معنی ہے وہ پکڑ لیں گے یا معنی ہے کہ وہ اہل ایمان کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے ان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائیں گے۔ یہ سطا الفرس سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ تب کہا جاتا ہے جب گھوڑا اکڑ وغرور کے سبب یا مادہ پر کودنے کی غرض سے اپنے آگے والے دونوں پاؤں زمین سے اٹھا کر صرف پیچھے والے دو پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ سطا علیہ اور سطا بہ دونوں کا معنی ہے حملہ کرنا یا پکڑنے کے لئے جبر و تشدد کرنا۔ اس کا مصدر سطوًا اور سطوۃ ہے (1)۔

معنی یہ ہے کہ یوں پتہ چلتا ہے وہ عنقریب جھپٹ پڑیں گے ان لوگوں یعنی محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام پر جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔

۲؎ اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرما دیجئے کیا میں تمہیں آگاہ کر دوں اس شئی سے جو تمہارے لئے زیادہ تکلیف دہ اور تمہارے لئے زیادہ ناپسندیدہ ہے اس قرآن سے یا تمہارے اس غصے سے جو تمہیں تلاوت کرنے والوں پر ہے یا تمہارے ان پر حملہ کرنے سے یا اس تنگی اور پریشانی سے جو تمہیں تلاوت قرآن کریم سننے کے سبب لاحق ہوئی اور وہ ہے دوزخ کی آگ۔ ترکیب کلام میں النار خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ ھُوَ ہے۔ گویا کہ النار سائل کے اس سوال کا جواب ہے مَا ھُوَ۔ (وہ کیا ہے تو جواب میں فرمایا النار۔ وہ دوزخ ہے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ النار مبتدا ہو اور اس کی خبر وَعَدَھَا اللّٰہُ الآیۃ۔ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کفار سے اس آگ کا وعدہ کر رکھا ہے اور دوزخ بہت برا ٹھکانا ہے۔ النار کی پہلی ترکیب کی صورت میں وَعَدَ ھَا اللّٰہُ الآیۃ جملہ مستانفہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۝۷۳

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے پس غور سے سنو اسے! ۱؎ بیشک جن معبودوں کو تم پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر یہ تو مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگر چہ وہ سب جمع ہو جائیں اس (معمولی سے) کام کے لئے ۲؎ اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس مکھی سے ۳؎ (آہ!) کتنا بے بس ہے ایسا طالب اور کتنا بے بس ہے ایسا مطلوب۔ ۴؎"

۱؎ اے لوگو! تمہارے لئے ایک عجیب حالت یا عجیب قصہ بیان کیا جارہا ہے پس تم اس مثال کو پورے تدبر اور غور و فکر سے سنو۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے میری مثل (دوسروں کو) بنایا گیا ہے، یعنی کفار نے بتوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مثل ہی مستحق عبادت قرار دیا ہے۔ پس تم ان کا حال توجہ اور غور سے سنیے پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ کیا انہیں اللہ تعالیٰ کی مثل قرار دینا جائز ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس حال کو تفصیل سے بیان فرمایا۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1698 (التراث العربی)

۲؎ تَدْعُوْنَ کو یعقوب نے یا کے ساتھ یَدْعُوْنَ پڑھا ہے۔ اور اس کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔ باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ خطاب کفار کو ہے اور اسم موصول اَلَّذِیْن کی طرف لوٹنے والی ضمیر عائد محذوف ہے۔ اصل عبارت ہے اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَهَاایهاالکفار الهة کائنة۔ اے کفار! جن معبودوں کو الہ سمجھتے ہوئے تم ان کی پرستش کرتے ہو اور انہیں پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت ہیں۔ وہ تو ایک مکھی کو بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اس کے باوجود کہ وہ چھوٹی سی قلیل سی اور انتہائی حقیری شئی ہے۔ لَنْ نفی تاکید کا معنی دیتا ہے اور یہ منفی (جس کی نفی کی جائے) اور منفی عنہ (جس سے نفی کی جائے) کے مابین منافاۃ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔ الذباب۔ الذب سے مشتق ہے، اس کا معنی ہے دفع کرنا اور مکھی اڑانا۔ تو چونکہ مکھی کو بھی ہر آدمی اڑاتا اور دفع کرتا ہے اس لئے اسے ذباب کہا جاتا ہے۔ ذباب کی جمع قلت اذبّة ہے اور جمع کثرت ذِبَّانٌ ہے جیسا کہ غراب کی جمع قلت اغربۃ اور جمع کثرت غیربان آتی ہے۔

اگر چہ مکھی کو بنانے کے لئے تمام کے تمام بت جمع ہو جائیں۔ یہ جملہ حال کے محل میں مقدر جواب کے لئے اظہار مبالغہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی وہ مکھی کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے درآنحالیکہ وہ تمام کے تمام اس کام کے لئے جمع ہو جائیں اور ایک دوسرے سے تعاون کریں تو پھر انفرادی طور پر وہ کیسے قادر ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں واؤ حالیہ ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا معطوف محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے مُسْتَوِحًا لُهُمْ فِيْ عَدْمِ الْقُدْرَةِ عَلَى الْخَلْقِ لَوْ لَمْ يَجْتَمِعُوْا الْخَلْقَةَ وَلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهُ۔ یعنی تخلیق کی قدرت نہ رکھنے میں بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔

۳؎ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ مشرکین اپنے بتوں پر زعفران کا طلاء کرتے اور ان کے سامنے کھانا رکھتے تھے۔ مکھی اس پر بیٹھتی اور اس سے کچھ لے کر اڑ جاتی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ اگر مکھی بھی ان سے کوئی شئی چھین کر اڑ جائے تو وہ بت نہ تو اس شئی کو اس سے چھڑانے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ اس سے مقابلہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں چہ جائیکہ یہ بت مکھی کو بنالیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت طیبہ میں کفار کی حد درجہ جہالت کا ذکر فرمایا ہے اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو کہ تمام ممکنات پر قادر ہے اور تمام کی تمام موجودات کا منفرد موجد ہے، ایسی حقیر ترین چیز کو شریک ٹھہرا دیا ہے جو کہ سب سے کمتر اور ذلیل ترین شئی کو بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ اور وہ اپنی ذات کا دفاع کرنے سے بھی عاجز ہے کہ اگر اس سے کوئی شئی اچک کر لے جائے تو وہ اسے چھڑانے اور بچانے کی قدرت نہیں رکھتی۔

۴؎ طالب اور مطلوب دونوں کتنے بے بس اور کمزور ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ طالب سے مراد مکھی ہے جو بت سے وہ شئی طلب کرتی ہے جسے وہ چھیننا چاہتی ہے اور مطلوب سے مراد بت ہے جس سے مکھی وہ شئی لیجانے کی خواہش رکھتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طالب بھی کمزور ہے اور مطلوب اس سے زیادہ بے بس ہے۔ بعض نے اس کے برعکس کہا ہے کہ طالب سے مراد بت ہے کیونکہ وہ چھینی ہوئی شئی کو تقدیراً اور فرضاً طلب کرنے والا ہے اور مطلوب سے مراد مکھی ہے کہ اس سے وہ شئی طلب کی جاتی ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ طالب سے مراد بت کی پوجا کرنے والا اور مطلوب سے مراد بت ہے(1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 132 (الفکر)

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

''نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسے اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور (اور) سب پر غالب ہے [1] اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے فرشتوں سے بعض پیغام پہنچانے والے اور انسانوں سے بھی بعض کو رسول بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے [2] وہ جانتا ہے جو کچھ انکے آگے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات [3]''

[1] انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسے تعظیم نہیں کی جیسے اس کی تعظیم کرنے کا حق تھا' انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسے نہیں پہچانا جیسے اس کی معرفت کا حق تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایسے اوصاف بیان نہیں کئے جیسے اس کے اوصاف بیان کرنے کا حق تھا۔ اسی لئے انہوں نے ایسی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جو حقیر ترین مخلوق مکھی سے بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتیں اور نہ اس سے انتقام لے سکتے ہیں۔

بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور ہے' یعنی وہ تمام ممکنات کی تخلیق کی قدرت رکھتا ہے اور وہ سب پر غالب ہے لیکن اس پر کوئی شئی غالب نہیں۔ ان کے معبود تو قلیل ترین اور انتہائی ادنیٰ چیز سے بھی دفاع کرنے سے عاجز ہیں اور حقیر اور ذلیل ترین مخلوق سے مغلوب ہیں۔

[2] اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے بعض پیغام پہنچانے والے چن لیتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے مابین وحی پہنچانے کے لئے واسطہ بنتے ہیں اور اسی طرح لوگوں کی روحیں قبض کرنے' ان تک رزق پہنچانے اور ان ہی جیسے دیگر امور سرانجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ ملائکہ حضرت جبرئیل' حضرت میکائیل' حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام وغیرہ ہیں (1)۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے بعض کو رسول چن لیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کو حق کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر نازل کیا جاتا ہے وہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ رسولوں میں سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے یہ کہا ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا (کیا ہم میں سے ان پر قرآن نازل کیا گیا ہے) (انہوں نے تو آپ ﷺ کو حقیر جان کر ایسا کہا) تو رب کریم نے مذکورہ آیت نازل فرما کر انہیں مطلع کیا کہ (اس اہم ترین منصب کے لئے) انتخاب اور چناؤ کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے (2)۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل اپنی وحدانیت کا ذکر فرما دیا اور اپنی الوہیت اور صفات میں کسی غیر کے شریک ہونے کی کلی نفی فرما دی تو پھر ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جنہیں وہ رسالت کے لئے چن لیتا ہے۔ انہی کی بات کو تسلیم کرنے اور انہی کی اقتدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت کیلئے وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر) 2۔ ایضاً

کے سواتمام موجودات کیلئے (انہی کی اتباع و پیروی) سب سے اعلیٰ مرتبہ اور انتہائی بلند درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو ثابت کرنے اور کفار کے اس قول کی تردید کیلئے ہے۔ مَانَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (کہ ہم تو بتوں اور ملائکہ کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیں گے) اور یہ ان کے اس قول کی تردید کے لئے ہے کہ الملائکۃ بنات اللّٰہ (کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں)۔(1)

بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا علم رکھتا ہے چاہے ان کا تعلق مسموعات سے ہو یا مرئیات سے۔

۳ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ سے مراد وہ کچھ ہے جو انہوں نے آگے بھیج دیا اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد وہ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ آئے (یعنی وہ مال یا نیک و بد اعمال جو انہوں نے آگے بھیج دیئے اور وہ مال یا اچھا یا برا راستہ جو انہوں نے پچھلوں کے لئے چھوڑا اللہ تعالیٰ اس سب سے واقف ہے۔)

حسن نے کہا ہے کہ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ سے مراد وہ اعمال ہیں جو انہوں نے کر دیئے ہیں اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ بعد میں کریں گے(2)۔

بعض نے کہا ہے کہ ھم ضمیر کا مرجع رسل کرام ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ رسل عظام علیہم السلام کی خلقت سے قبل کے حالات کو بھی جانتا ہے اور ان کے وصال کے بعد جو کچھ ہوا یا ہوگا اسے بھی خوب جانتا ہے۔

اور تمام معاملات اور امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے کیونکہ وہی بذات تمام امور کا مالک ہے وہ (بندوں میں سے) انتخاب اور چناؤ وغیرہ کا جو عمل کرتا ہے اس کے متعلق قطعاً اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی (اس نے ایسا کیوں کیا) البتہ بندوں سے ایسی باز پرس کی جائے گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾

''اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو۱ اور عبادت کرو اپنے پروردگار کی اور (ہمیشہ) مفید کام کیا کرو تاکہ تم (دین و دنیا میں) کامیاب ہو جاؤ۲۔''

۱ مفہوم کلام یہ ہے کہ اے اہل ایمان! نماز پڑھو۔ یہاں نماز کو رکوع اور سجود کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں نماز کے لازمی رکن ہیں جن سے کبھی بھی نماز جدا نہیں ہو سکتی (یعنی ان کے بغیر نماز کا وجود باقی ہی نہیں رہتا) بخلاف دیگر ارکان کے کہ ان کی نوعیت ایسی نہیں۔ کیونکہ قرأت نماز کے لئے رکن تو ہے مگر گونگے آدمی سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قیام رکن ہے مگر جو قیام کی طاقت نہ رکھتا ہو اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ رہے رکوع و سجود تو یہ دونوں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کبھی بھی ساقط نہیں ہوتے۔ کیونکہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی رکوع اور سجود کے لئے سر کے ساتھ اشارہ کرنے پر قادر نہ ہو تو اس سے نماز مؤخر ہو جائے گی۔ وہ آبرو یا دل کے اشارے کے ساتھ نماز ادا نہیں کر سکتا۔

۲ اور تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو ہر ایسے انداز سے جو اس کی عبادت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور (ہمیشہ) مفید کام کیا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ عمل خیر سے مراد صلہ رحمی کرنا اور مکارم اخلاق کو اپنانا ہے(3)۔ ظاہر معنی یہ ہے کہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 548 (العلمیۃ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر)　　3۔ ایضاً

لفظ خیر تمام نیک افعال کو شامل ہے، یعنی ہر وہ کام کرو جس میں نیکی اور بھلائی ہو اور وہ زیادہ مفید ہو چاہے اسے کرنا مفید ہو یا اسے چھوڑنا مفید ہو۔ (یعنی جو بھی نیکی کی اور نفع بخش صورت ہو وہی اپناؤ) تاکہ تم دین و دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ ترکیب کلام میں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کا جملہ حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی تم تمام نیک کام کرو درآنحالیکہ تم کامیابی کی امید رکھتے ہو۔ مگر اپنے اعمال کے بارے نہ یہ یقین رکھنا اور نہ ان پر یہ اعتماد کرنا (کہ وہ بالیقین تمہیں کامیابی کی نعمت سے سرفراز کریں گے)

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا انبیاء بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی جانب یہ وحی کی گئی کہ اپنی امت میں سے میری طاعت و فرمانبرداری کرنے والے لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اعمال پر توکل اور بھروسہ نہ کریں کیونکہ قیامت کے دن جس بندے کو میں حساب و کتاب کے لئے کھڑا کروں گا اور اسے عذاب دینا چاہوں گا تو اسے ضرور عذاب دوں گا۔ اور اپنی امت میں میری نافرمانی اور گناہ کرنے والوں سے کہہ دو کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں کیونکہ میں بڑے بڑے گناہوں کو بخش دوں گا اور مجھے پرواہ تک نہ ہوگی۔ اسے ابونعیم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بزار نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ہر آدمی کے لئے تین رجسٹر نکال کر لائے جائیں گے ان میں سے ایک میں اس کے اعمال صالحہ ہوں گے، ایک میں اس کے گناہ ہوں گے اور تیسرے میں وہ نعمتیں درج ہوں گی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بندے کو عطا کی گئیں۔ رجسٹر میں درج نعمتوں میں سے سب سے چھوٹی نعمت کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ تو اعمال صالحہ میں سے اپنے مقابلے کا عمل لے لے۔ تو وہ ایک نعمت تمام اعمال صالحہ کو محیط ہو جائے گا۔ اور رب کریم کی بارگاہ میں عرض کناں ہوگی تیری عزت کی قسم! میں نے تو اپنے مقابلہ میں تمام اعمال صالحہ کا احاطہ کر لیا ہے۔ اب گناہ باقی رہ گئے ہیں۔ تمام اعمال صالحہ تو ختم ہو چکے ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اے میرے بندے! میں نے تیرے لئے تیری نیکیاں کئی گنا کر دی ہیں۔ تیرے گناہوں سے درگزر کر لی ہے اور تجھے اپنی نعمت عطا فرما دی ہے(1)۔

مسئلہ: اس آیت طیبہ کی تلاوت کے وقت سجدہ تلاوت کے واجب ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری وغیرہ نے کہا ہے کہ اس مقام پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے کیونکہ اس میں سجود سے مراد نماز کا سجدہ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ سجدہ رکوع کے ساتھ متصل مذکور ہے۔ اور استقراء اور غور و فکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی دونوں کا اس طرح متصل ذکر کیا گیا ہے وہاں سجدے سے مراد نماز کا رکن سجدہ ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۔ (سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ) (تو چونکہ اس میں رکوع کے ساتھ سجدے کا ذکر ہے اس لئے سجدے سے مراد نماز کا سجدہ ہے)

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ تلاوت کرنا ضروری ہے اور یہ حدیث عقبہ بن عامر سے ثابت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کیا سورۂ حج کو اس میں دو سجدے ہونے کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ اور جو یہ دو سجدے نہ کرے اسے چاہئے کہ وہ انہیں نہ پڑھے۔ اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، دار قطنی، بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 98-397 (الفکر)

سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ ابن وہب نے کہا ہے ابن لہیعہ صدوق (سچ بولنے والا) راوی ہے مگر اسے قوت حفظ کے کمزور ہونے کی وجہ سے ضعیف کہا گیا ہے۔ حاکم کا قول ہے کہ عبداللہ بن لہیعہ تو ایک امام ہے۔ وہ آخری عمر میں اختلاط میں مبتلا ہو گیا تھا (یعنی قوت حفظ کمزور ہو گئی تھی) اور اس حدیث کی روایت میں وہ منفرد ہے (اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے)

ابوداؤد نے مراسیل میں حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث روایت کی ہے کہ سورۂ حج کو دو سجدوں کے سبب فضیلت دی گئی ہے(1)۔ بعض نے اسے مسند کہا ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قرآن کریم میں حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے پندرہ آیات سجدہ پڑھائیں ان میں سے تین سجدے مفصلات میں ہیں اور سورۂ حج میں دو سجدے ہیں(2)۔ اسے ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ منذری رحمۃ اللہ علیہ اور نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عبدالحق اور ابن قطان نے اسے ضعیف کہا ہے۔ اس میں ایک راوی عبداللہ بن منین کلابی ہے اور وہ مجہول راوی ہے۔ اور اس سے روایت کرنے والا حارث بن سعید ثقفی مصری ہے اور وہ بھی معروف نہیں۔ ابن ماکولا نے کہا ہے کہ اس حدیث کے علاوہ اس سے کوئی حدیث مروی نہیں۔

حاکم نے عقبہ بن عامر کی حدیث کی تاکید کے لئے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے کیونکہ اس بارے میں حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال بھی صحیح روایت سے موقوفاً مروی ہیں۔ اور علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خالد بن معدان کی مرسل روایت سے المعرفہ میں اس کی تاکید ذکر کی ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی قول مروی ہے۔(3) میں کہتا ہوں کہ اس باب میں موقوف روایت مرفوع کے حکم میں ہے (کیونکہ اس سجدہ کا دارومدار صحابہ کرام کی روایات پر ہے اور اگر صحابہ کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کے بارے نہ سنا ہوتا تو وہ خود اپنی طرف سے اسے بیان نہ کرتے) سجدہ تلاوت کے تفصیلی احکام ہم نے سورۂ انشقاق میں ذکر کئے ہیں۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

"اور (سرتوڑ) کوشش کرو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لے جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے ۲ے اس نے چن لیا ہے تمہیں (حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لئے) ۳ے اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی پیروی کرو ۴ے اپنے باپ

1۔ سنن ابی داؤد، (مراسیل)، جلد 1، صفحہ 7 (وزارت تعلیم)　2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 562 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر)

ابراہیم کے دین کی ۵؎ اسی نے تمہارا نام مسلم (سر اطاعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے ۶؎ تا کہ ہو جائے رسول (کریم) گواہ تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر ۷؎ پس (اے دین حق کے علمبردارو!) صحیح صحیح ادا کیا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑ لو اللہ تعالیٰ (کے دامن رحمت) کو ۸؎ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مددفرمانے والا ہے ۹؎"

۱؎ الجُہد بالضم کا معنی وسعت اور طاقت ہے اور الجہد بالفتح کا معنی مشقت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے بہت زیادہ اور حد درجے کوشش کرنا۔ بعض نے کہا ہے ان دونوں لغتوں کے مطابق اس کا معنی وسعت اور طاقت ہے لیکن جب اس کا معنی مشقت اور سر توڑ کوشش ہو تو پھر اس کا تلفظ اَلْجَهد بالفتح ہی ہوگا۔ جہاد اور مجاہدہ (باب مفاعلہ) اسی سے ماخوذ ہیں۔ (یعنی طرفین سے حد درجہ کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا) کیونکہ باب مفاعلہ کا خاصہ اشتراک ہے۔ اور دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے دوران ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ اس میں دو فریق مشقت اٹھاتے ہیں قول وفعل کے اعتبار سے پوری وسعت اور طاقت خرچ کر دیتے ہیں اور سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ فی اللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں' اس کے دین کی سربلندی اور اس کے احکام کو ادا کرنے کی خاطر۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے۔

۲؎ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ مصدریت کی (مفعول مطلق کی) بناء پر منصوب ہے۔ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو ایسا جہاد جس میں خالص حق ہو۔ یعنی وہ جہاد حق ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہو۔ حق کی اضافت جہاد کی طرف اظہار مبالغہ کے لئے کی گئی ہے جیسے تیرا یہ قول ہے هُوَ حَقُّ عَالِمٍ۔ اور جہاد کی اضافت ضمیر کی طرف اظہار وسعت کے لئے ہے یا یہ منصوب ہے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جہاد کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں پوری طاقت صرف کر دینا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہونا یہی جہاد کا حق ہے(1)۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ حق جہاد کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے لئے عمل کرو جیسے عمل کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جیسے عبادت کرنے کا حق ہے۔

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ حق الجہاد کا معنی ہے نیت کا خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہونا۔ سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ عبداللہ بن مبارک نے کہا ہے کہ نفس اور خواہش نفسانی کے خلاف جہاد کرنا جہاد اکبر ہے اور وہی حق الجہاد ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو فرمایا رجعنامن الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر۔ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جہاد اصغر سے مراد کفار کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور جہاد اکبر سے مراد نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے(2)۔

علامہ بیہقی نے الزہد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نمازیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آ گئے۔ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 35-134

گئی جہاد اکبر کونسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا بندے کا اپنی خواہش نفسانی کے ساتھ جہاد کرنا۔(1) علامہ بیہقی نے کہا ہے اس حدیث کی اسناد میں ضعف ہے۔

میں کہتا ہوں اس آیت طیبہ میں جہاد سے مراد صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنا نہیں کیونکہ سیاق آیت اس کا انکار کرتا ہے کیونکہ آپ کی ترتیب میں ہر عطف کے ساتھ اخص سے اعم کی طرف ارتقاء ہے۔ اس طرح کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا میں نماز کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ نماز تمام عبادات میں اہم ترین عبادت ہے۔ پھر اس پر عطف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ یہ ارشاد نماز اور دیگر تمام عبادات کو بھی شامل ہے۔ پھر ارشاد فرمایا وَافْعَلُوا الْخَيْرَ۔ یہ ارشاد تمام حقوق اللہ مثلاً عبادات' عقوبات اور کفار کے ساتھ جنگ کرنے وغیرہ' تمام حقوق العباد اور مکارم اخلاق وغیرہ اور تمام مستحبات اور سنن ادا کرنے کو بھی شامل ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ لہٰذا اس ارشاد کو صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنے پر محمول کرنے کی کوئی وجہ اور سبب موجود نہیں۔ بلکہ اس سے مراد تمام اقوال و اعمال اور احوال میں اخلاص کا ہونا ہے اور یہ اخلاص نفس کے ساتھ جہاد کرنے اور خواہش نفس کی مخالفت کرنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اخلاص صفاء قلب اور فناء نفس سے حاصل ہوتا ہے او ریہ دونوں چیزیں مشکوٰۃ نبوت سے انوار (وتجلیات) کے حصول کے ساتھ ساتھ برائی پر برانگیختہ کرنے والے نفس امارہ کے ساتھ جہاد کرنے اور خواہش نفس کی مخالفت کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کی اصطلاح میں اسے ہی سلوک اور جذب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور متقدمین مفسرین کے اقوال میں اسی مفہوم کو اخلاص کا نام دیا گیا ہے کیونکہ فناء نفس اور صفاء قلب کے سبب جب صوفی مخلصین میں شمار ہو جاتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور وہ ریاکاری اور حصول شہرت کی نیت کے بغیر خالص اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرتا ہے جیسے اس کی عبادت کا حق ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے اور معصیت و نافرمانی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی جہاد اکبر ہے۔ لیکن جہاد اصغر یعنی کفار کے ساتھ جنگ لڑنا یہ تو فقط جہاد کی ایک صورت ہے یہ اور دیگر عبادات میں سے کوئی بھی جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں وہ بیکار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول مکرم ﷺ کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہی ہے اور جس نے دنیا کے لئے ہجرت کی کہ وہ اسے پالے گا یا کسی عورت کے لئے ہجرت کی کہ وہ اس سے نکاح کرے گا تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔ یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے(2)۔

رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں تمام شرکاء کی نسبت شرک سے زیادہ غنی اور بے نیاز ہوں۔ پس جس کسی نے کوئی (نیک) کام کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک ٹھہرا لیا تو میں اس کے عمل سے بری ہوں (یعنی اس کے عمل کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں) اور اس کا عمل اسی کے لئے ہوگا جس کیلئے اس نے کیا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ تم جہاد اکبر کی طرف آئے ہو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد اکبر یعنی نفس کے خلاف جہاد

1۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 616 (التراث الاسلامی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 13، صفحہ 47

کرنا شیخ کامل ومکمل کی صحبت سے مرید کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ جب کفار کے ساتھ جنگ لڑنے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو انہیں آپ ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی اور ان پر انوار نبوت کی شعاعوں کا عکس پڑا تو اس کی برکت سے ان کے دل صاف اور طیب وطاہر ہوئے اور ساتھ ہی نفس کی نفسانیت فناء ہوگئی۔

آپ ﷺ کا ارشاد کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے ہیں میں رجعنا صیغہ جمع متکلم ہے۔ اور اس کی نسبت آپ ﷺ اور آپ کے ساتھ موجود تمام صحابہ کرام کی طرف ہے کیونکہ وہ تمام کفار کے ساتھ جنگ میں مشغول ہونے کے وقت حالت جہاد میں تھے، وہ اگرچہ حضور ﷺ کے ساتھ آپ کی مصاحبت میں تھے۔ لیکن ان کی تمام ہمتیں اور قوتیں کفار کے ساتھ لڑنے اور ان کی مدافعت میں خرچ ہو رہی تھیں۔ پھر جب وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں مقیم ہوگئے تو پھر ان کی تمام تر ہمتیں انوار نبوت سے فیض یاب ہونے' آپ کے آثار وسنن پر عمل پیرا ہونے اور آپ ﷺ کی جناب خاص سے علوم ظاہرہ اور باطنہ اخذ کرنے میں صرف ہونے لگیں (اور یہی جہاد اکبر ہے)

ﷺ اس نے تمہیں ساری مخلوق سے اپنے نبی مکرم اور حبیب معظم ﷺ کی مصاحبت کے لئے چن لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے (ساری مخلوق سے) مجھے چن لیا ہے اور پھر میرے لئے صحابہ کرام کو چن لیا ہے۔ اور پھر ان میں سے میرے لئے سسرالی رشتہ دار اور انصار و مددگار منتخب فرما دیئے ہیں(1)۔ واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چنا ہے' بنی کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا ہے اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب فرمایا ہے اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا ہے(2)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چن لیا ہے(3)۔

ﷺ اور اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی روا نہیں رکھی۔ حرج سے مراد تنگی اور تکلیف ہے جس کے ساتھ حکم کی تعمیل تم پر سخت اور مشکل ہو جائے گی۔ بعض نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ بندہ مومن کسی گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس سے نکلنے کی راہ اور ذریعہ بنا دیا ہے۔ بعض گناہوں کے لئے توبہ ہے' بعض کے لئے قصاص اور دنیوی سزا ہے اور بعض کے لئے مختلف انواع کے کفارات ہیں۔ المختصر دین اسلام میں کوئی ایسا گناہ اور غلطی نہیں جس کی سزا سے خلاصی اور نجات حاصل کرنے کا بندے کے پاس کوئی راستہ نہ ہو(4)۔ جبکہ سابقہ امتوں میں بعض ایسے گناہ تھے جن کے لئے توبہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے فرائض کی ادائیگی کے اوقات میں تم پر کوئی تنگی اور اشتباہ نہیں رکھا مثلاً رمضان المبارک کے مہینے کا چاند' ہلال عید الفطر اور حج کے اوقات وغیرہ۔ جب تم پر ان کا معاملہ مشتبہ ہو جائے تو تمہارے لئے یقین حاصل ہونے تک وسعت اور گنجائش ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد عند الضرورت حاصل ہونے والی رخصتیں ہیں۔ مثلاً سفر میں نماز کا قصر ہونا' تیمم کی اجازت ہونا حالت سفر اور مرض میں روزہ افطار کرنے کی رخصت' عند الحاجت مردار کھانے کی رخصت' کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے عاجز ہونے کی

1۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 540 (التراث العربی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 245 (قدیمی)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 201 (فاروقی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الفکر)

صورت میں بیٹھ کر یا چت لیٹ کر نماز ادا کرنے کی رخصت وغیرہ۔ یہی کلبی کا قول بھی ہے (1) اور یہی معنی حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا ہے کہ جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو تم اسے بجالاؤ جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول مروی ہے کہ تنگی نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بار اور شدت جو بنی اسرائیل پر تھی اللہ تعالیٰ نے اسے اس امت سے دور فرما دیا (2)۔

میں کہتا ہوں کہ قول باری تعالیٰ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ کا یہ معنی بھی کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام شرعیہ کی تکلیف کو تم سے اٹھا لیا یہاں تک کہ احکام شرعیہ کی پابندی تمہارے نزدیک مرغوبات طبعیہ کی نسبت زیادہ پسندیدہ اور مرغوب فیہ بن گئی۔ اور یہ اجتباء کے لوازم میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے (3)۔ اسے احمد، نسائی، حاکم اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔
مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی علیکم ملة ابیکم ابراھیم۔ تم پر اپنے باپ ابراہیم کے دین کی پیروی لازم ہے۔ یا یہ اختصاص کی بناء پر منصوب ہے یعنی اعنی بالدین ملة ابیکم۔ دین سے میری مراد تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے یا پھر اسے فعل کا مصدر ہونے کی بناء پر جس پر ماقبل جملہ کا مضمون دلالت کرتا ہے اور پھر کلام سے مصدر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے یعنی وسع دینکم توسعة ملة ابیکم۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین کو تمہارے باپ کے دین کی وسعت عطا کر دی ہے)
اِبْرٰهِيْمَ ترکیب کلام میں عطف بیان ہے۔ چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لئے ظاہر مفہوم یہی ہے کہ یہ خطاب قریش میں سے اہل ایمان کو ہے اور دوسرے لوگوں کو قریش کی تبع میں یہ خطاب ہے۔ (کیونکہ کثیر ایسے لوگ تھے جن کے نسبی مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں تھے) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس معاملہ میں لوگ قریش کے تابع ہیں۔ مسلمان قریش میں سے اہل اسلام کے تابع ہیں اور کافر ان میں سے کفار کے تابع ہیں۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے (4)۔ مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب اہل عرب کو ہے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب تمام مسلمانوں کو ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ تھے اور آپ ﷺ اپنی امت کے لئے باپ کی طرح ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت ﷺ ہی لوگوں کے لئے حیات سرمدی اور ان کے لئے ایسے وجود کا سبب ہیں جو آخرت میں قابل اعتبار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ۔ (حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات مومنوں کی مائیں ہیں) حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک میں تمہارے لئے والد کے قائم مقام ہوں۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں کہ جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء میں داخل ہو تو نہ قبلہ شریف کی طرف منہ کرے، نہ پیٹھ اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے نجاست صاف کرے (5)۔ اسے احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔

چونکہ اہل مکہ کے لئے دین ابراہیمی ہی پسندیدہ اور مرغوب فیہ دین تھا چاہے وہ مکہ مکرمہ کے مومنین ہوں یا کفار لہذا کفار اپنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 128 (صادر)
4۔ صحیح بخاری: 1288 (ابن کثیر) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 3 (وزارت تعلیم)

بارے میں یہ گمان کرتے تھے کہ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا کہ دین محمد ﷺ ہی درحقیقت دین ابراہیمی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی دین بھی دین ابراہیمی نہیں (لہٰذا مومنین دین ابراہیمی کے مطابق عمل پیرا ہیں) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (بیشک ابراہیم علیہ السلام سے سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے)

لے اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے، اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔ ھُوَ سے مراد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ اور مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے قرآن کریم نازل ہونے سے قبل نازل ہونے والی سابقہ کتابیں۔ ابن زید نے کہا ہے کہ ھُوَ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دور سے قبل اپنے زمانے میں تمہارا نام مسلم رکھا' جبکہ انہوں نے رب کریم کی بارگاہ میں التجاء کرتے ہوئے یہ عرض کی تھی رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ (اے ہمارے رب! بنادے ہم کو فرمانبردار اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو)(1) یعنی اہل مکہ کو امت مسلمہ بنا دے اگرچہ قرآن کریم میں اہل مکہ کا نام مسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہیں رکھا لیکن چونکہ اس سے قبل آپ نے ہی انہیں مسلمان کہا تھا اسی سبب سے قرآن میں بھی انہیں مسلمان کہا گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے وَفِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ بَيَانُ تَسْمِيَتِهٖ اِيَّاكُمْ مُّسْلِمِيْنَ۔ کہ اس سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مسلم رکھا اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلم رکھنے کا بیان ہے۔ اور ترکیب کلام میں یہ جملہ قول باری تعالیٰ ھُوَ اجْتَبٰىكُمْ کا بیان ہے کیونکہ اسلام حقیقی کی طرف رہنمائی کرنے اور مسلمان نام رکھنے کا انحصار اور دارومدار اسی پر ہے کہ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔

لے لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ۔ ھُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ کے مضمون کے متعلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت اسلام سے نوازا اور تمہیں مسلمان بنایا تاکہ قیامت کے دن رسول کریم تم پر گواہ ہو جائے کہ اس نے تم تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا۔ اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ کہ ان کے رسولوں نے ان تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا(2)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز ہے کہ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ قول باری تعالیٰ ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا اور ان کے معطوفات کے متعلق ہو۔
ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اور میری امت قیامت کے دن بلند جگہ پر قیام پذیر ہوں گے اور ساری مخلوق کو اوپر سے دیکھ رہے ہوں گے اور ہر آدمی کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ ہم میں سے ہو جائے (یعنی ہمارے پاس بلند مقام پر آجائے) اور کوئی ایسا نبی نہیں ہوگا جس کی تکذیب اس کی قوم نے کی ہو اور پھر ہم شہادت دیں گے کہ اس (نبی) نے اپنے رب کا پیغام اپنی امت تک پہنچا دیا تھا۔

ابن مبارک نے الزہد میں ذکر کیا ہے کہ رشد بن سعد نے اپنے چچا کے بیٹے کی جانب سے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ ابوحبلہ نے اپنی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو بلایا جائیگا اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کیا تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں! میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام تک پہنچا دیا تھا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام کو بلایا جائیگا اور ان سے پوچھا جائیگا کیا اسرافیل علیہ السلام نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں! پس اس طرح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الفکر)   2۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 6 (الامیریہ)

حضرت اسرافیل علیہ السلام کو فارغ کردیا جائے گا۔ پھر رب کریم حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمائے گا تو نے میرے پیغام کے بارے کیا کیا؟ تو وہ عرض کریں گے اے میرے پروردگار! میں نے وہ رسل علیہم السلام تک پہنچا دیا تھا۔ پھر رسولوں کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا تم تک جبرئیل علیہ السلام نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ پھر ان سے پوچھا جائیگا تو پھر تم نے اس کے بارے کیا کیا؟ تو وہ عرض کناں ہونگے ہم نے وہ پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ پھر تمام امتوں کو بلایا جائیگا اور ان سے کہا جائیگا کیا رسولوں نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو ان میں سے بعض رسل علیہم السلام کی تکذیب کریں گے اور بعض تصدیق کریں گے۔ پھر رسول عرض کریں گے ہمارے پاس ان کے خلاف گواہ موجود ہیں۔ رب کریم فرمائے گا وہ کون ہیں؟ تو وہ عرض کریں گے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ چنانچہ آپ ﷺ کی امت کو طلب کیا جائیگا اور ان سے کہا جائیگا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ رسل علیہم السلام نے اپنی امم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ تو اس پر سابقہ امتیں یہ عرض کریں گی اے ہمارے رب! وہ لوگ ہمارے خلاف کیسے شہادت دے سکتے ہیں جنہوں نے ہمارا زمانہ پایا ہی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس امت سے ارشاد فرمائے گا تم کیسے ان کے خلاف شہادت دیتے ہو حالانکہ تم نے ان کا زمانہ پایا ہی نہیں؟ تو اس امت کے افراد عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف ایک شان والا رسول مبعوث فرمایا تھا اور ہم پر ایک عظمت والی کتاب (قرآن کریم) نازل فرمائی تھی اور اس کتاب میں تو نے ہمیں اس پر مطلع کیا تھا کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں تک پیغام خداوندی پہنچایا ہے۔ پس اسی شئی کا بیان اس ارشاد گرامی میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا(1)۔ ہم نے اسی آیت طیبہ کی تفسیر میں سورۂ بقرہ میں وہ حدیث طیبہ بھی ذکر کردی ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔

۸۔ پس (اے دین حق کے علمبردارو!) نماز قائم کرو، یعنی اس پر دوام اختیار کرو اور زکوٰۃ دو یعنی مختلف انواع کی طاعتوں اور عبادتوں سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو کیونکہ اس نے تمہیں اس فضل و شرف کے لئے مختص کردیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دامن رحمت کو مضبوط پکڑ لو یعنی اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور اعتماد رکھو اور ہر کام میں اسی سے مدد طلب کرو۔

حسن نے کہا وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے تم اپنے رب سے مانگو تمہیں تمام ناپسندیدہ اور مکروہ چیزوں سے محفوظ رکھے گا۔ بعض نے کہا اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ وہ تمہیں اپنے دین پر ثابت اور استقامت عطا فرمائے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اعتصام باللہ سے مراد کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنا ہے(2) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم نے ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ اور وہ ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں مرسل روایت کیا ہے۔(3)

عصیف بن حارث یمانی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی قوم نے (اپنے دین میں) کسی بدعت (نئی شئی) کا آغاز نہیں کیا مگر اس کی مثل اتنی مقدار سنت اٹھالی گئی۔ (یعنی بدعت پر عمل پیرا ہونے کے سبب سنت پر عمل چھوڑ دیا گیا) پس

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 7 (الامیریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (الفکر) 3۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 899 (التراث العربی بیروت)

سنت پر مضبوطی سے عمل کرنا بدعت پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔ رواہ احمد(1)۔

9۔ وہی تمہارا کارساز ہے اور وہی تمہارا مددگار اور محافظ ہے اور تمہارے تمام تر امور کا والی ہے۔ ھو مولکم کا جملہ واعتصموا باللہ کی علت بیان کر رہا ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مدد فرمانے والا ہے۔ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی میں فا سببیہ ہے۔ یعنی جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا کارساز اور تمہارا مددگار ہے تو وہی سب سے اچھا تمہارا کارساز اور تمہارا مددگار ہے۔ کیونکہ ولایت اور معاونت میں اس کی مثل کوئی نہیں۔ بلکہ فی الحقیقت اس کے سوا کوئی کارساز اور مددگار ہی نہیں۔ واللہ اعلم۔

الحمدللہ سورۂ حج کی تفسیر 15 ذی الحجہ 1203ھ کو ختم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے 16 شعبان المعظم 1421ھ بمطابق 13 نومبر 2000 بروز پیر رات 9 بج کر 40 منٹ پر سورۂ حج کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔ الحمد للہ علی ذالک. وصلی اللہ تعالیٰ علیہ خیر خلقه سیدنا و مولینا محمد واله واصحابه اجمعین۔

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 105 (صادر)

سورة المومنون

آیاتہا ۱۱۸ ۔ سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ ۲۳ ۔ رکوعاتہا ٦

سورۃ المومنون مکی ہے، علماء بصرہ کے نزدیک اس کی آیات 119 اور علماء کوفہ کے نزدیک 118 ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾

"بیشک دونوں جہان میں بامراد ہوگئے ایمان والے ۱؎ وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں ۲؎"

۱؎ حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور شیخین کی شرائط کے مطابق اسے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو اس دوران اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھاتے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں تو پھر آپ ﷺ نے اپنا سر نیچے جھکا لیا(1)۔

ابن مردویہ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ آسمان کی طرف متوجہ ہوتے تب یہ آیات نازل ہوئیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نماز کے دوران اپنی نظریں آسمان کی طرف بلند کر لیتے پھر جب اللہ تعالیٰ نے آیت الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ نازل فرمائی تو انہوں نے اپنی نظروں کو سجدہ گاہوں کی جانب متوجہ کر لیا(2)۔

ابن ابی حاتم نے ابن سیرین سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کرام نماز کے دوران آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

ورش نے اَفْلَحَ کے ہمزہ کی حرکت قَدْ کی دال کو دی ہے اور ہمزہ کو حذف کر دیا ہے، یعنی انہوں نے قَدَ اَفْلَحَ پڑھا ہے، لفظ قَدْ ایسے کام کے اثبات کے لئے آتا ہے جس کا ہونا متوقع ہو۔ جیسا کہ لَمَّا متوقع عمل کی نفی کیلئے آتا ہے۔ لفظ قد جب ماضی پر داخل ہو تو تحقق اور ثبات پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ماضی کو حال کے قریب کر دیتا ہے۔ (مثلاً قَدْ ذَهَبَ وہ ابھی گیا) چونکہ مومنین اللہ تعالیٰ کے فضل سے فلاح و کامرانی کی توقع رکھتے ہیں، اس لئے لفظ قَدْ سے کلام کا آغاز فرما کر انہیں فلاح کی بشارت دے دی گئی۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ فلاح کا معنی (مقصود میں) کامیابی (خوفناک شئی سے) نجات پانا اور عمل خیر میں باقی رہنا ہے(4)۔ اور فلاح دنیوی اور اخروی دونوں جہان کی ہوتی ہے اور یہاں مراد کامل اخروی کامیابی ہے اور فلاح کامل یہ ہے کہ عذاب

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 426 (العلمیة) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر)
3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 4 (العلمیة) 4۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 352 (التراث العربی)

بالکل نہ ہو۔ نہ قبر میں' نہ حساب میں مناقشہ کے سبب' نہ یوم قیامت کی سختیوں کے سبب' نہ جہنم میں دخول کے سبب اور نہ ہی پل صراط سے گزرنے کی صعوبت اور مشکل کے سبب۔ اس کے ساتھ ساتھ جنت میں اعلیٰ مقاصد اور مراتب قرب حاصل ہوں۔ دیدار الٰہی کی سعادت نصیب ہو اور رب کائنات کی رضا اور خوشنودی مقدر بن جائے۔

رہی مطلق کامیابی تو وہ صرف ان لوگوں کے ساتھ مختص نہیں جو ان آیات طیبات میں مذکور صفات سے متصف ہیں۔ بلکہ وہ تو ہر اس آدمی کے لئے ہے جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھ لیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔ (پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا) اور ایمان اور توحید تو تمام اعمال خیر کی اصل اور سرخیل ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا توحید کی تصدیق کرنے والے سعادتمند اور خوش بخت ہیں وہ (ہمیشہ) جنت میں باقی رہیں گے(1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرمایا اور اس میں اس کے درختوں کے پھل لٹکا دیئے اور اس میں نہریں جاری کر دیں پھر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کلام کر تو جنت نے کہا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ رب کریم نے فرمایا مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم تجھ میں کوئی بخیل میرے قریب بھی نہیں آئے گا۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے(2)۔

میں کہتا ہوں کہ شاید یہاں بخیل سے مراد کافر ہے، کیونکہ وہ توحید کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے سے بخل کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہی طبرانی نے ایک روایت اور جید سند کے ساتھ نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرمایا تو اس میں ایسی ایسی نعمتوں کو پیدا فرمایا جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال تک آیا۔ پھر اسے ارشاد فرمایا تو گفتگو کر۔ تو جنت نے کہا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ(3) بزار، طبرانی اور بیہقی نے بھی اسی طرح کی مرفوع روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ اسی طرح ایک روایت بیہقی نے مجاہد اور کعب سے نقل کی ہے اور حاکم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ ابن ابی الدنیا نے جنت کی صفات کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو سفید موتیوں' سرخ یاقوت اور سبز زمرد کی اینٹوں سے بنایا ہے۔ اس کا لیپ کستوری کا ہے۔ اس کی گھاس زعفران ہے' اس کے سنگریزے موتی ہیں اور اس کی مٹی عنبر ہے۔ پھر اسے فرمایا تو بول۔ تو اس نے کہا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ رب کریم نے فرمایا میری عزت کی قسم تجھ میں کوئی بخیل میرے قریب نہیں آئے گا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ فلاح سے مراد مطلقا جنت میں داخل ہونا ہو اگرچہ عذاب دیئے جانے کے بعد ہی ہو۔ اور یہ فلاح تمام اہل ایمان کے لئے ہے جیسا کہ مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں فلاح کے لئے مذکورہ صفات کی قید لگانا احتراز کے لئے نہیں بلکہ مدح اور تعریف کے لئے ہے، کیونکہ بندۂ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اس کے لئے ان صفات سے متصف ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اگر فلاح سے مراد فلاح کامل ہو اور مذکورہ صفات کی قید برائے احتراز ہو تو پھر یہ آیات اس معنی پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کامل فلاح کا وعدہ ان کامل مومنین کے ساتھ کیا ہے جو ان آیات طیبات میں مذکور صفات سے متصف ہیں، لیکن اس معنی پر قطعا دلالت نہیں کرتیں کہ ان کے سوا دیگر اہل ایمان قطعاً فلاح نہیں پاسکیں گے۔ کیونکہ ہم مفہوم مخالف کے قائل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (الفکر) 2۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 12، صفحہ 147 (العلوم والحکم) 3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 184

نہیں چاہے وہ صفت کی قید سے پیدا ہو یا مشروط کے ذکر سے۔ جیسا کہ اصول فقہ میں سے اسے تحقیقاً لکھ دیا گیا ہے کہ شرط یا صفت کی تقیید اس شئی کو مسکوت عنہ کے حکم میں کر دیتی ہے جس میں وہ شرط یا صفت نہ پائی جائے اور احتراز سے یہی مراد ہے۔ نفی حکم کے سبب وہ اسے منطوق کے حکم میں نہیں کرتی۔ (یعنی جس میں وہ شرط اور صفت نہیں پائی جائے گی اس کے بارے مطلقاً خاموشی ہوگی، یعنی نہ تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور نہ اس سے حکم کی نفی ہوگی)۔ اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ اگر مومنین میں سے گناہ کبیرہ کے مرتکب بغیر توبہ کے مر جائیں گے تو بالآخر ان کا انجام بھی جنت ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہوں گے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انہیں عذاب دے دے پھر انہیں جنت میں داخل کر دے۔ اور اگر چاہے تو بغیر عذاب دیئے ان کی مغفرت فرما دے۔

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا خَاشِعُوْن سے مراد عاجزی کرنے والے اور اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور عاجز جاننے والے لوگ ہیں۔ حسن نے کہا ہے خَاشِعُوْن سے مراد ڈرنے والے لوگ ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے اس کا معنی تواضع کرنے والے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے اس سے مراد آنکھوں کو جھکانے اور آواز کو پست کرنے والے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دائیں بائیں متوجہ نہ ہوں۔ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے ایسا آدمی جو اپنے دائیں بائیں کھڑا ہونے والے کی پہچان نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ کے لئے خشوع کے سبب وہ کسی جانب بھی متوجہ نہ ہو(1)۔

حضرت عمرو بن دینار کا قول ہے کہ خشوع سے مراد سکون اور حسن ہیئت ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ خشوع سے مراد یہ ہے کہ تیری آنکھ اپنی سجدہ گاہ سے نہ اٹھے۔ حضرت عطاء نے کہا کہ اس کا معنی ہے تو نماز کے دوران اپنے جسمانی اعضاء میں سے کسی سے نہ کھیلے۔

بعض نے کہا ہے کہ نماز میں خشوع سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام تر ہمت اور توجہ کو نماز میں مرکوز کر دینا اور اس کے سوا ہر شئی سے مکمل اعراض کر لینا اور قرآن کریم کی قرأت اور ذکر الٰہی میں سے جو الفاظ زبان پر ہوں ان میں غور و فکر اور تدبر کرنا(2)۔ اپنی توجہ نماز سے باہر نہ جانے دے، ادھر ادھر متوجہ نہ ہو نہ نماز سے غائب ہو نہ کسی اور جانب مائل ہو۔ نہ اپنی انگلیوں کے چٹخارے نکالے نہ سنگریزوں کو الٹ پلٹ کرے اور نہ ہی نماز میں کسی فعل مکروہ کا ارتکاب کرے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ خشوع کا معنی قول میں اخلاص کا ہونا، تعظیم کے ساتھ کھڑا ہونا، کامل یقین ہونا اور کامل توجہ اور یکسوئی کا ہونا ہے۔

قاموس میں ہے کہ خشوع سے مراد خضوع ہے، یعنی تواضع اور انکساری کرنا۔ یا خشوع معنوی اعتبار سے خضوع کے قریب ہے یا خضوع بدن میں ہوتا ہے اور خشوع آواز اور آنکھ میں ہوتا ہے نیز اس سے مراد سکون اور عاجزی کا اظہار ہے(3)۔

نہایہ میں ہے کہ خشوع کا تعلق آواز اور آنکھ سے ہے جیسا کہ خضوع کا تعلق بدن سے ہوتا ہے(4)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ مسلسل بندے کی طرف متوجہ رہتا ہے جب تک بندہ اپنی نماز میں ادھر ادھر نہیں ہوتا اور جب بندے کی توجہ نماز سے ہٹ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے اعراض فرما لیتا ہے(5)۔ اسے احمد، ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 138 3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 958 (التراث العربی)
4۔ النہایۃ، جلد 2، صفحہ 34 (بیروت) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 131 (وزارت تعلیم)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں التفات کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد جھپٹنا مار کر کسی شئی کو چھین لینا ہے۔ شیطان بندے کی نماز اس طرح چھین لیتا ہے۔ متفق علیہ (1)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا ہے لوگوں کو کہ وہ نماز کے دوران اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا لیتے ہیں؟ آپ ﷺ کا ارشاد اس بارے اتنا شدید اور سخت تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسا کرنے سے رک جائیں یا پھر ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی رواہ البغوی۔ مسلم اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ نماز میں دعا کے وقت اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں یا پھر ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی(2)۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ دوران نماز اپنی نگاہیں آسمان کی طرف نہ اٹھائیں ورنہ ان کی نگاہیں ان کی طرف واپس نہیں لوٹیں گی(3)۔ اسے احمد، مسلم، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا وہ نماز میں اپنی ڈاڑھی سے کھیل رہا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر اس کے دل میں خشوع (ا) ہوتا تو اس کے اعضاء میں بالیقین خشوع ہوتا (ب) اسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے(4)۔

حضرت ابو الاحوص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ کنکریوں کو صاف نہ کرے کیونکہ (اللہ تعالیٰ کی) رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے(5)۔ اسے علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور احمد، ابن عدی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسے روایت کیا ہے۔

فصل: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اے انس! اپنی نگاہ سجدہ کرنے کی جگہ پر رکھا کرو۔ اسے علامہ بیہقی نے سنن کبیری میں نقل کیا ہے(6)۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا اے بیٹے! نماز میں ادھر ادھر توجہ کرنے سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 104 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 4، صفحہ 127 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

4۔ نوادر الاصول، صفحہ 184 (بیروت) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر) 6۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 2، صفحہ 284 (الفکر)

(ا) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم ایسے خشوع سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں جس میں نفاق ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ نفاق والا خشوع کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا بدن میں خشوع ہو اور دل میں نفاق ہو۔ (یعنی اعضاء نماز میں ہوں اور دل کام میں مشغول ہو) حضرت مجاہد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو اسے محسوس ہوتا کہ لکڑی کھڑی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

(ب) حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی والدہ ام رومان بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے دوران نماز ادھر ادھر جھکتے دیکھا تو آپ نے مجھے اتنا سخت جھڑکا کہ قریب تھا میں اپنی نماز توڑ دوں انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں کھڑا ہو تو اس کے اعضاء پرسکون رہنے چاہئیں۔ وہ یہودیوں کی طرح ادھر ادھر نہ جھکے کیونکہ دوران نماز اعضاء میں سکون ہونا نماز کی تکمیل کا ایک جزء ہے ازالۃ الخفاء۔

پرہیز کر کیونکہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنا ہلاکت اور بربادی ہے۔ اگر کہیں مجبوری ہو تو نفل نماز میں (ایسا کیا جاسکتا ہے) فرض نماز میں ہرگز نہیں(1)۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَۙ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَۙ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَۙ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَۚ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَۚ۝

''(اور وہ جو ہر بیہودہ امر سے منہ پھیرے ہوتے ہیں[1] اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں[2] اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے جو ان کے ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بیشک انہیں ملامت نہ کی جائے گی[3] اور جس نے خواہش کی ان دو کے ماسوا تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں[4]''

[1] حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ لغو سے مراد شرک ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ لغو سے مراد معاصی اور گناہ ہیں(2)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ لغو سے مراد ایسا عمل ہے جو آخرت میں نفع بخش نہ ہو۔ چاہے وہ کلام ہو یا کوئی اور فعل۔ اور ایسا قول یا فعل جس پر آدمی کی تعریف نہ کی جائے وہ لغو ہوتا ہے۔ مُعْرِضُوْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا شرک، معاصی اور دیگر ضرر رساں افعال کا ارتکاب کرنا تو درکنار وہ ان کی طرف منہ تک نہیں کرتے۔ (اور مکمل اعراض کئے رہتے ہیں) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ میں انہیں سب وشتم نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا یعنی جب وہ کوئی قبیح اور برا کلام سنتے ہیں تو وہ ذاتی طور پر اپنے آپ کو اس میں شامل کرنے سے محفوظ رکھتے ہیں(3)۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ مُعْرِضُوْنَ کہنا الذین لا یلھون (وہ غافل نہیں ہوتے) کی نسبت زیادہ بلیغ ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ جملہ اسمیہ ہے اور حکم کی بنا ضمیر پر ہے اور اسے اسم سے تعبیر کیا گیا ہے اور پھر معرضون کا صلہ اس سے مقدم کیا گیا ہے اور اس میں ترک (چھوڑنے) کی جگہ اعراض کو لایا گیا ہے تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ وہ مکمل طور پر بیہودہ امور سے دور رہتے ہیں۔ نہ بلاواسطہ کرتے ہیں نہ بالواسطہ نہ ایسے امور کی طرف میلان رکھتے ہیں اور نہ ان میں حاضر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسے غیر مفید کاموں میں حاضر ہوئے بغیر ان سے اعراض کئے رکھتے ہیں دور رہتے ہیں(4)۔

[2] زکوٰۃ کا اطلاق اس واجب مقدار پر ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے والا نصاب میں سے نکالتا ہے۔ او اس کا اطلاق زکوٰۃ دینے والے کے فعل پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہاں مراد مزکی کا فعل ہی ہے کیونکہ فعل فاعل ہی کرتا ہے اور اسکا اطلاق نفس مال پر نہیں ہوتا۔ البتہ عین مال مراد لینا جائز ہے، جبکہ زکوٰۃ سے پہلے مضاف مقدر مان لیا جائے، یعنی لِاَدَاءِ الزکوۃ فاعلون۔ لفظ فاعلون اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے میں مداومت اور ہمیشگی اختیار کرتے ہیں۔ للزکوۃ پر لام اس لئے داخل ہے کہ مفعول مقدم ہے اور اسم فاعل ضعیف اور کمزور عامل ہے۔ اسی طرح یہ کہا جاتا ہے ضارب لزید لیکن ضرب لزید نہیں کہا جاتا (کیونکہ یہ عامل قوی ہے)۔ بعض نے کہا ہے کہ زکوٰۃ سے مراد عمل صالح ہے، یعنی وہ لوگ ہیں جو عمل صالح کرنے والے ہیں(5)۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 297 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر)　　3۔ ایضاً

4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 557 (العلمیہ)　　5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر)

؎ فرج سے مراد شرمگاہ ہے چاہے وہ مرد کی ہو یا عورت کی۔ اور فرج کی حفاظت سے مراد (فعل) حرام سے بچنا اور پاکدامن رہنا ہے۔ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ حافظون کا صلہ ہے (اور حفظ کا صلہ علیٰ اس مقولہ سے ماخوذ ہے) کہ تیرا قول اِحْفَظْ عَلَیَّ عِنَانَ فرسی (میرے گھوڑے کی لگام پکڑے رکھ)، یعنی اسے آزادنہ چھوڑ دینا اور صحیح معنی یہ ہے کہ حفظ کا لفظ نفی بذل کے معنی کو متضمن ہے، یعنی اس کا معنی لا یبذلون الا علی ازواجھم (کہ وہ اپنی شرمگاہوں کو اپنی بیویوں کے سوا استعمال نہیں کرتے)۔ یا پھر یہ صلہ ہے فعل مقدر کا۔ اور وہ ہے لا یُبْذِلُوْنَهَا الا علی ازواجھم اور اس پر قول باری تعالیٰ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ مفرغ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہو۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی حَافِظُوْنَ لِفُرُوْجِهِمْ فِیْ جَمِیْعِ الْاَحْوَالِ اِلَّا قَادِرِیْنَ عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ (وہ تمام حالات میں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اس حال کے کہ وہ اپنی ازواج پر قادر ہوں)۔ مَا مَلَکَتْ سے مراد باندیاں ہیں۔ یعنی وہ اپنی منکوحہ بیویوں یا اپنی مملوکہ کنیزوں کے سوا اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ یہاں ممالیک (لونڈیوں اور غلاموں) کو غیر ذوی العقول کے قائم مقام رکھتے ہوئے ان کے لئے لفظ ما ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں ملکیت اصل اور رائج ہے(1)۔ (علامہ بیضاوی کی اس وضاحت کے مطابق کہ ملکت کا لفظ غلاموں کو بھی شامل ہے اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی عورت اپنا غلام رکھتی ہو تو پھر اس کے لئے اپنے غلام سے جنسی تعلق قائم کرنا جائز ہو، حالانکہ ایسا کرنا جائز نہیں تو اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے مصنف نے کہا ہے) میں کہتا ہوں یہاں مراد فقط کنیزیں ہیں کیونکہ عورتوں کو ناقص العقل ہونے کی بناء پر غیر ذوی العقول سے ملحق کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ذوی العقول کے لئے مونث ضمیریں استعمال کی جاتی ہیں۔ پس یہاں لفظ ما اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد کنیزیں ہیں نہ کہ غلام۔ لہٰذا عورتوں کے لئے اپنے غلاموں کی شرمگاہوں سے استمتاع کرنا جائز نہیں۔

تو بیشک ایسا کرنے میں انہیں ملامت نہیں کی جائے گی۔ فانھم کی ھم ضمیر منصوب حافظون کے لئے ہے۔ (یعنی دونوں سے مراد ایک ہے) اور اس کے لئے ہے جس پر استثناء دلالت کرتا ہے، یعنی اگر وہ اپنی شرمگاہیں اپنی بیویوں یا کنیزوں پر استعمال کرتے ہیں تو اس پر انہیں ملامت نہیں کی جائے گی۔

؎ اور جس نے خواہش کی بیوی اور مملوکہ لونڈی کے ماسوا شرمگاہ استعمال کرنے کی تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں یعنی ظلم وعداوت میں کامل ہیں اور حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں۔ یہ آیت عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت کے لئے ناسخ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں عورتوں سے متعہ جائز تھا جب کوئی آدمی کسی شہر میں آتا اور وہاں اس کی کسی سے جان پہچان نہ ہوتی تو وہ اتنی مدت کے لئے کسی عورت سے شادی کر لیتا جتنی مدت وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا۔ تاکہ وہ اس کے ساز وسامان کی بھی حفاظت کرے اور اس کے لئے کھانا پکانا اور دیگر معاملات بھی سرانجام دے۔ جب آیت طیبہ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ نازل ہوئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ان دو قسم کی عورتوں کے سوا ہر عورت حرام ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 559 (العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 133 (فاروقی)

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عورتیں جن سے متعہ کیا جاتا ہے وہ ازواج (بیویوں) میں سے نہیں ہوتیں اور اس پر تو اجماع ہے کہ ایسے مرد اور عورتیں باہم ایک دوسرے کا وارث نہیں بنتے۔ حتیٰ کہ روافض بھی وارثت کے قائل نہیں حالانکہ زوجین کا ایک دوسرے کا وارث بننا تو نص قرآنی سے ثابت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ (اور تمہارے لئے اپنی ازواج کے ترکے کا نصف ہے) ہم نے متعۃ النساء کا مسئلہ بالتفصیل سورہ نساء کی آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے۔ زیر بحث آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ استمناء بالید (جلق) بھی حرام ہے۔ یہی عام علماء کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ میں نے حضرت عطاء سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہ یہ عمل مکروہ (تحریمی) ہے۔ میں نے یہ سنا ہے کہ ایک قوم کو اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ ان کے ہاتھ حاملہ ہوں گے میرا گمان ہے کہ یہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کو عذاب دیا ہے کہ وہ اپنے عضو تناسل سے کھیلتے ہیں(1)۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾

''نیز وہ (مومن بامراد ہیں) جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں ۱؎ اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں یہی لوگ وارث ہیں ۲؎ جو وارث بنیں گے فردوس (بریں) کے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۳؎''

۱؎ ابن کثیر نے یہاں اور سورہ معارج میں لِاَمٰنَتِهِمْ مفرد پڑھا ہے اور باقیوں نے اَمٰنٰتِهِمْ جمع پڑھا ہے۔ امانتوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کے پاس امانت ہیں اور بندوں سے انہیں بجالانے کا عہد لیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ اور دیگر وہ عبادات جو اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دی ہیں۔ یا عہد سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا وعدہ مخلوق کی جانب سے ہوتا ہے۔ جیسے سامان ودیعت اور سامان تجارت کے معاہدے وغیرہ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ پس ان تمام کو پورا کرنا بندے پر لازم ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس عمل کا آدمی سے حساب لیا جائیگا وہ نماز ہے۔ اگر یہ صحیح ثابت ہوئی تو وہ کامیاب وکامران ہوگا اور اگر وہ فاسد اور خراب نکلی تو آدمی خائب وخاسر ہوگا۔ اور اگر فرض کی ادائیگی میں کوئی نقص اور کمی ظاہر ہوگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا دیکھو! کیا میرے بندے کے کچھ نوافل ہیں؟ تو ان کے ساتھ فرائض کی کمی کو پورا کر دیا جائیگا۔ پھر باقی تمام اعمال کا حال اسی طرح ہوگا(2)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پھر زکوٰۃ کا حال اسی طرح ہوگا پھر تمام اعمال کا حساب اسی طرح ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پھر زکوٰۃ کا حال اسی طرح ہوگا پھر تمام اعمال کا حساب اسی طرح لیا جائے گا۔ اسے ابوداؤد اور احمد نے ایک آدمی سے روایت کیا ہے۔

۲؎ حمزہ اور کسائی نے صَلَاتِهِمْ مفرد صورت میں پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے جمع کی صورت میں صَلَوٰتِهِمْ پڑھا ہے۔ يُحَافِظُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ اپنی نمازوں پر مواظبت اختیار کرتے ہیں اور انہیں اپنے وقت پر ادا کرتے ہیں۔ یہاں لفظ حفظ نماز میں تجدد اور تکرار کے معنی کے اظہار کے لئے ہے۔ (یعنی وہ تمام اوقات کی اپنی نمازیں مقررہ اوقات میں پوری پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ جونہی نماز کا وقت آتا ہے تو وہ اس کی ادائیگی کے لئے تیار ہوتے ہیں)۔ اس سے تکرار وصف لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ابتداء میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 139 (الفکر) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 383 (الفکر)

نمازیں بڑے خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور یہاں بیان فرمایا کہ وہ اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں اور نماز میں خشوع اور نماز کی حفاظت دونوں علیحدہ علیحدہ صفتیں ہیں۔ان لوگوں کے اوصاف کی ابتداء بھی نماز کے ذکر سے کی اور اختتام بھی نماز کے ذکر پر کیا، اس لئے تا کہ نماز کی اہمیت اور عظمت وشان کا اظہار ہو جائے۔ جب وصف خشوع کا ذکر کیا تو ساتھ لفظ صلاۃ مفرد ذکر فرمایا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز جو بھی ہو جنس نماز میں خشوع لازم اور ضروری ہے۔اور جب وصف محافظت کا ذکر فرمایا تو ساتھ لفظ صلاۃ کو جمع کی صورت میں ذکر کیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز کی تمام انواع کی محافظت ضروری ہے چاہے وہ فرائض اور واجبات ہوں یا سنن اور نوافل ہوں۔

پس یہی لوگ جو ان مذکورہ تمام صفات کے جامع ہیں وہی وارث ہیں یعنی وہی یہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں (فردوس) کا وارث کہا جائے۔ نہ کہ ان کے سوا کوئی اور۔ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ مدح کے لئے ہے۔

سے الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ترکیب کلام میں الوارثون کی صفت ہے اور اس میں اس شئی کا بیان ہے جس کے وہ وارث ہوں گے۔ (یعنی جنت الفردوس)، یعنی یہی لوگ فردوس بریں کے وارث بنیں گے۔ پہلے مطلق وارث بننے کا ذکر کیا پھر فردوس کا ذکر فرما کر وراثت کو فردوس سے مقید کر دیا تا کہ وارثت کی عظمت وشان ظاہر ہو اور دوسرا اس سے مقصود تاکید بھی ہے۔یعنی وہ جنت میں ان گھروں کے بھی وارث ہوں گے جو کفار کے لئے تیار کئے گئے ہیں کہ اگر وہ ایمان لاتے تو ان کے حصے میں آتے۔(مگر اب یہ اہل ایمان ہی ان گھروں کے بھی وارث ہوں گے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو گھر ہیں ایک گھر جنت میں ہے اور ایک دوزخ میں۔پس جب کوئی مرتا ہے اور جہنم میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اہل جنت ہی جنت میں اس کے گھر کے وارث بنتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ کا یہی مفہوم ہے(1)۔اسے ابن ماجہ، سعید بن منصور، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی نے البعث میں ذکر کیا ہے۔

عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ وہ اپنے مسکنوں کے بھی وارث ہوں گے اور اپنے ان بھائیوں کے ان گھروں کے بھی جو تیار کئے گئے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے تو وہ ان میں سکونت پذیر ہوتے۔حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے وارث کی میراث سے بھاگے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم کر دے گا(2)۔

بعض نے کہا ہے کہ وارثت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بالآخر جنت کی طرف لوٹ آئیں گے اور اسے پالیں گے۔جیسا کہ بالآخر وارث میراث کی طرف لوٹ کر اسے پالیتا ہے۔فردوس سے مراد جنت اعلیٰ ہے۔اس کا تفصیلی ذکر سورۂ کہف میں گزر چکا ہے۔

ھُمۡ فِیۡھَا میں ھاء ضمیر فردوس کی طرف لوٹ رہی ہے اور چونکہ فردوس جنت کا نام ہے اس لئے ضمیر مونث ذکر کی گئی ہے۔خٰلِدُوۡنَ کا مفہوم یہ ہے کہ نہ تو وہ جنت میں مریں گے اور نہ انہیں اس سے نکالا جائیگا۔(بلکہ وہ اس میں ہمیشہ زندہ رہیں گے) ترکیب کلام میں یہ جملہ مستانفہ ہے۔

امام احمد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر جب وحی

1۔سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 585 (العلمیۃ)　　2۔سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 312 (العلمیۃ)

نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس کے پاس شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی۔ ایک دن آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو ہم اختتام وحی تک آپ ﷺ کے پاس ہی ٹھہرے رہے۔ پس جب وحی اختتام پذیر ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا رخ زیبا قبلہ سمت کیا اور دست مبارک بلند کر کے رب کریم کے حضور یہ التجا کی کہ اَللّٰھُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَکْرِمْنَا وَلَا تُھِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تُحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُوَاثِرْ عَلَیْنَا وَارْضَنَا وَارْضِ عَنَّا: (اے اللہ! ہمیں مزید عطا فرما ہم میں کمی اور نقصان نہ کر، ہمیں عزت واکرام عطا فرما ہمیں رسوا اور ذلیل نہ کر، ہمیں عطا فرما ہمیں محروم نہ کر، ہمیں ترجیح عطا فرما کسی اور کو ہم پر فوقیت نہ دے، ہمیں رضا اور خوشی عطا فرما اور ہم سے راضی ہو جا) پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھ پر دس آیات طیبات نازل کی گئی ہیں جو کوئی ان کے مطابق عمل کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے لیکر دسویں آیت کے اختتام تک تمام آیات تلاوت فرمائیں(1)۔ نسائی نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے لیکن حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ یہ آیت تمام ابواب خیر کو جامع ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں مؤمنین کے اوصاف بیان فرمائے ہیں کہ وہ نماز میں خشوع کرتے ہیں، ہمیشہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ لغو بات سے اعراض کرتے ہیں۔ حرام چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں اور ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں جو خلاف مروت ہوں۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ عبادات بدنیہ اور طاعات مالیہ کے خوگر ہیں اور انہیں (ان اوصاف کے سبب) اس طرح طہارت اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے کہ ان میں تجلیات ذاتیہ اور صفاتیہ کے انوار کو سمیٹنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾

"اور بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے [1]۔ پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں پھر ہم نے بنا دیا نطفہ کو خون کا لوتھڑا پھر ہم نے بنا دیا اس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی۔ پھر ہم نے پیدا کر دیں اس بوٹی سے ہڈیاں، پھر ہم نے پہنا دیا ان ہڈیوں کو گوشت [2]۔ پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا [3]۔ پس بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ [4]"

[1] آیت طیبہ میں الانسان سے مراد جنس انسان ہے یا اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور یہ آیت محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ پر معطوف ہے۔ کیونکہ ان آیات میں ایمان اور عبادت وطاعت کی مختلف اقسام کا ذکر ہے۔ اور اس آیت میں اس چیز کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت وطاعت کا مستحق ہے نیز اس میں وجوب عبادت کا سبب مذکور ہے۔ گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ بندوں پر لازم ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں اور ہماری وحدانیت کا اقرار کریں۔ کیونکہ قسم ہے اپنی ذات کی کہ ہم نے ہی انہیں پیدا کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی)

سُلٰلَۃٌ مٹی کا وہ جوہر اور خلاصہ جو کیچڑ اور مٹی سے نکالا جائے۔ مِنْ سُلٰلَۃٍ میں مِن ابتدائیہ ہے اور مِنْ طِیْنٍ میں مِن بیانیہ ہے۔ ترکیب کلام میں مِنْ طِیْنٍ سُلٰلَۃٍ کی صفت ہے۔ یعنی سُلٰلَۃٌ سے مراد مٹی ہے۔ یعنی مٹی کا وہ جوہر جو روئے زمین سے نکالا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی کے جوہر سے ہوئی اور باقی تمام لوگوں کی پیدائش اس نطفہ سے ہوئی جو غذاؤں سے بنتا ہے۔ اور غذائیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ بھی جائز ہے کہ مِنْ طِیْنٍ ظرف لغو ہو اور سلالۃ بمعنی مسلولۃ کے متعلق ہو اور اس میں مِن ابتدائیہ ہو۔ کلبی نے کہا ہے طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور معنی یہ ہے کہ ہم نے جنس انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے جسے طین سے نکالا گیا ہے۔ اور طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ (1)

عبدالرزاق، ابن جریر، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ عبد بن حمید نے مجاہد سے یہ نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِنْ طِیْنٍ میں طین سے مراد بنی آدم کا نطفہ ہے۔ (2) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سُلٰلَۃٍ سے مراد پانی کا خلاصہ اور جوہر ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو پیٹھ سے نکالا جاتا ہے۔ اور عرب نطفہ کو ہی سلالۃ کہتے ہیں۔ (3)

۲۔ پھر ہم نے اس جوہر کو پانی کی بوند بنا کر رکھا۔ جَعَلْنٰہُ کی وہ مذکر ضمیر کا مرجع سلالۃ ہے اس لئے کہ یہاں سلالۃ بمعنی مسلول (اسم مفعول) ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع انسان ہو اور نُطْفَۃً سے قبل (مِن) حرف جار محذوف ہے اور نطفۃ منصوب ہو۔ پھر اگر انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں تو اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو ہی اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ہم نے جنس انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے یا ہم نے بنی آدمی کو نطفہ سے پیدا کیا ہے۔ جسے ایک محفوظ مقام یعنی رحم میں رکھا ہے۔ مکین فی الحقیقت ٹھہرنے والے کی صفت ہے۔ مگر اظہار مبالغہ کے لئے یہاں محل قرار کی صفت بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ مبالغہ کے لئے ہی محل قرار کو لفظ قرار سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ قرار مصدر ہے۔

پھر ہم نے سفید نطفہ کو سرخ خون کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے اس لوتھڑے کو اتنی مقدار میں گوشت کا ٹکڑا بنا دیا جسے چبایا جا سکتا ہے۔ پھر ہم نے گوشت کے ٹکڑے سے ہڈیاں پیدا کر دیں اس طرح کہ ہم نے اسے سخت بنا دیا۔ پھر گوشت کے ٹکڑے کا وہ حصہ جو ہڈیاں بننے سے باقی بچا وہ ہم نے ان ہڈیوں کو پہنا دیا۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان ہڈیوں پر اتنی مقدار گوشت پیدا کر دیا جو انہیں ڈھانپ سکتا ہے۔ لَحْمًا کا لفظ اپنے سے قبل (با) حرف جار محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے یعنی اصل عبارت ہے کَسَوْنَا الْعِظَامَ بِلَحْمٍ۔ یا پھر لَحْمًا کَسَوْنَا کا دوسرا مفعول ہے اور کَسَوْنَا اَعْطَیْنَا کے معنی کو متضمن ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کَسَوْتُ زَیْدًا حلۃً یعنی اعطیتہ ایاھا۔ (کہ میں نے اسے عطا کیا) جمہور نے عِظَامًا پڑھا ہے۔ چونکہ ہڈیاں اپنی ہیئت اور سختی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں اس لئے دونوں جگہوں پر لفظ عظام جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ ابو بکر اور ابن عامر نے اسے عَظْمًا پڑھا ہے۔ اور اَلْعَظْم لفظ واحد ہے گویا اس صورت میں جمع کی بجائے اسم جنس پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ یعنی لفظ عَظْم بحیثیت اسم جنس مستعمل ہے۔

۳۔ پھر ہم نے (روح ڈال کر) اسے دوسری مخلوق بنا دیا ہے۔ اَنْشَاْنٰہُ کی ضمیر سُلٰلَۃ کی طرف راجع ہے، یا الانسان کی طرف جا ہے الانسان سے مراد جنس انسان ہو یا حضرت آدم علیہ السلام ہو۔ اور یہاں مضاف مقدر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خَلْقًا اٰخَرَ ترکیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر)　2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 10 (العلمیۃ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر)

کلام میں اَنْشَاْنٰهُ کا ہم معنی ہونے کی وجہ سے مصدر مفعول مطلق ہے۔ اور یہ خَلَقْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کے معنی میں ہے۔ یا پھر خَلْقًا اٰخَرَ اَنْشَاْنٰهُ کے معنی میں ہے۔ یا پھر اَنْشَاْنٰهُ صَیَّرْنَا کے معنی میں ہے اور خَلْقًا اٰخَرَ اس کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خَلْقًا اٰخَرَ اَنْشَاْنٰهُ کی ضمیر منصوب سے بدل اشتمال ہو۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے (روح ڈال کر) اس جوہر یا انسان کو (دوسری طرح کی) مخلوق بنا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مجاہد، شعبی، عکرمہ، ضحاک اور ابو العالیہ نے کہا ہے کہ خَلْقًا اٰخَرَ سے مراد اس میں روح پھونکنا ہے(1)۔

میں کہتا ہوں کہ ان کے اقوال میں روح سے مراد روح سفلی ہے جسے روح حیوانی کہا جاتا ہے۔ اور نفس سے مراد روح علوی کی سواری ہے۔ روح علوی کا تعلق عالم ارواح سے ہے اور اس کی قرار گاہ نظر کشف میں عرش کے اوپر ہے۔ اور یہ مکانی شئی نہیں ہے۔ اور نفس سے مراد وہ بخار (بھاپ) ہے جو عناصر سے اٹھتا ہے اور جسم کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہ ایک جسم لطیف ہے جو جسم کثیف میں چلتا ہے۔ اسی بناء پر اَنْشَاْنٰهُ کی ضمیر کو سلالۃ کی طرف لوٹانا صحیح ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ روح سے مراد روح علوی ہو (پھر ضمیر کا مرجع سلالۃ کو بنانا صحیح نہیں ہے)، کیونکہ روح علوی سلالۃ سے ماخوذ نہیں ہے۔ اور لفظ ثُمَّ بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ارواح علویہ کی تخلیق ابدان کی تخلیق سے پہلے ہوئی کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ارواح سے میثاق لیا تو اس وقت بدن موجود نہیں تھے۔

رہا مسئلہ نفخ روح کا؟ تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ روح پھونکنے کا عمل ہڈیاں پیدا کرنے کے بعد ہوتا ہے اور یہ درست ہے (کیونکہ جسم حادث ہے اور روح بذات خود قدیم ہے) اور پھر صفت قدیم کا جسم حادث سے تعلق حادث ہے) اور جسم کی تخلیق صفت قدیم سے مؤخر ہے۔ ہاں اگر انشاء سے مراد نفخ روح (روح پھونکنا) ہو تعلق روح (روح کی پیدائش) مقصود نہ ہو تو پھر اس توجیہ کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صادق و مصدوق نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کے مادہ تخلیق کو چالیس دن تک اپنی ماں کے پیٹ میں نطفہ کی صورت میں جمع رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت کے لئے وہ گوشت کا لوتھڑا بن کر رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا عمل، عمر، رزق اور شقاوت یا سعادت لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ پس مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں تم میں سے ایک آدمی اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل جہنم جیسے عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ (اور انہی اعمال پر اسے موت آ جاتی ہے) اور ایک آدمی اہل جہنم کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم اور اس کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر اس پر لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل جنت جیسے اعمال کرنے لگ جاتا ہے۔ (اور انہی اعمال پر اسے موت آ جاتی ہے) یہ حدیث متفق علیہ ہے(2)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حدیث طیبہ میں انسان کی تخلیق کی مختلف تبدیلیوں کے ذکر کے دوران لفظ ثُمَّ ذکر کیا گیا ہے جو تراخی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ہر تبدیلی طویل عرصہ گزرنے کے بعد وقوع پذیر ہو) اور قرآن کریم میں اس کا ذکر کلمہ فا سے کیا گیا ہے جو تعقیب پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 68-67 (الفکر)

دلالت کرتی ہے (یعنی ہر تبدیلی دوسری کے فوراً بعد وقوع پذیر ہوئی) تو پھر ان دونوں کے مابین تطبیق کیسے کی جائے گی؟

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیل ہونے کے درمیان چالیس دن کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ ایک طویل زمانہ ہے اور لفظ ثُمَّ کے ساتھ عطف کا تقاضا کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے کلمہ فا ذکر فرمایا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ وہ چالیس دن کی طویل مدت اس عظیم تبدیلی کے لئے انتہائی قلیل اور تھوڑی مدت ہے جو تخلیق انسانی کے دوران ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلنے کے دوران ہوتی ہے۔

بعض مقامات پر لفظ ثُمَّ اور بعض مقامات پر لفظ فا مختلف الانواع تبدیلیوں اور تغیرات پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ منی کے جوہر کا نطفہ میں تبدیل ہونا بہت بڑی اور عظیم تبدیلی ہے؟ پھر وہ نطفہ مرد کی پشت اور عورت کے سینے میں طویل زمانہ تک قرار پذیر رہتا ہے۔ پھر وہ عورت کی رحم میں منتقل ہوتا ہے وہاں پہنچ کر مخلوط ہو کر چالیس دن تک وہ نطفہ اپنی صورت میں رحم میں باقی رہتا ہے۔ یہ بھی ایک نادر تبدیلی ہے پھر یہ طویل وقت گزرنے کے بعد وہ علقہ بن جاتا ہے اور یہ بھی انتہائی عظیم الشان تبدیلی ہے۔ لہٰذا یہ تمام تغیرات اور تبدیلیاں عظیم الشان ہونے کے سبب لفظ ثُمَّ سے عطف کا تقاضا کرتی ہیں۔ جبکہ ان کے برعکس دوسری تبدیلیاں، یعنی علقہ سے مضغہ اور پھر مضغہ میں ہڈیوں کا پیدا ہونا اور ان پر گوشت چڑھانا یہ تمام اتنی بڑی اور نادر تبدیلیاں نہیں اس لئے ان کے ذکر کے دوران باہم عطف کے لئے لفظ فاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر وبعد رتبی پر دلالت کرنے کے لئے اور دونوں خلقتوں کے درمیان کمال تفاوت کو ظاہر کرنے کیلئے۔ قول باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ میں لفظ ثُمَّ بطور عطف ذکر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ: یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے انڈا غصب کیا پھر اس کے پاس اس انڈے سے بچہ پیدا ہوا اور پھر وہ بچہ مر گیا یا کسی نے حرم پاک سے انڈا لیا اور اسے مقام حِل کی طرف نکال لایا پھر اس سے بچہ پیدا ہوا تو ایسے آدمی پر صرف انڈے کی ضمانت لازم ہوگی چوزے (بچے) کی نہیں۔ کیونکہ وہ دوسری تخلیق ہے اور اس میں روح سفلی ہے اور وہی روح حیوانی ہے (اور ضمان کا تعلق تخلیق اول سے ہے) واللہ اعلم۔

قتادہ نے کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کا معنی دانتوں کا نکلنا اور بالوں کا اگنا ہے۔

ابن جریج نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد مکمل جوان ہونا ہے اور حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد مذکر (نر) یا مونث (مادہ) ہونا ہے۔

عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے یہ روایت کی ہے کہ اس سے مراد ولادت کے بعد مختلف احوال میں تبدیل ہونا ہے۔ مثلاً پیدا ہونے کے بعد رونا، پھر دودھ پینے کے قابل ہونا، پھر بیٹھنے کی صلاحیت کا آنا، پھر کھڑے ہونے پر قادر ہونا، پھر چلنے کی طاقت آنا، پھر دودھ چھوڑ کر دیگر چیزیں کھانے پینے کے قابل ہونا یہاں تک آدمی بالغ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ شہروں میں گھومنے پھرنے لگتا ہے۔ (1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ سے وہ ولادت ثانیہ ہو جو فقرا اور صوفیاء کو مرتبہ فنا حاصل ہونے کے سبب حاصل ہوتی ہے، کہ اس طرح وہ صفات بہیمیہ، سبعیہ اور بشریہ سے نکل کر صفات فلکیہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر)

صفات فلکیہ سے صفات رحمانیہ کی جانب ترقی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات قدسیہ کے ساتھ مقام بقاء پر فائز ہو جاتے ہیں۔لفظ ثُمَّ کے ساتھ عطف کرنے کی یہی مناسب ترین تاویل ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور عظمت و شان والا ہے، کہ اس کا کوئی شریک بنایا جائے یا اس کے اوامر کی پیروی کرنے اور اس کی مناہی سے رکنے میں کسی بھی طرح کی غفلت اور سستی برتی جائے۔ اس میں فاسیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا صفت تخلیق سے متصف ہے۔ اور پیدا کرنے کی یہی صلاحیت اس کی قدرت کے مکمل ہونے اور حکمت کے تمام ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہی اس کی عظمت و کبریائی کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ اس کی شان انتہائی بلند ہے اور اس کا شریک ہونا محال اور ناممکن ہے۔ وہ سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ ترکیب کلام میں اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ لفظ اللہ سے بدل ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یہ صفت نہیں ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے۔ اگرچہ یہ مضاف ہے کیونکہ اس میں مضاف الیہ من تفضیلیہ کا عوض ہے۔ اور اس میں تمیز محذوف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے احسن الخالقین خلقًا یہاں ضمیر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ لفظ خالقین اس پر دلالت کر رہا ہے۔

معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کہ بندے اپنے افعال اختیاریہ کے خود خالق ہیں۔ تب ہی تو کثیر پیدا کرنے والوں میں اللہ تعالیٰ کی برتری اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ (ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے احسن الخالقین کا مفہوم ثابت نہیں ہو سکتا) حالانکہ دلائل عقلیہ اور ادلہ شرعیہ سے یہ ثابت ہے کہ بندوں کے افعال اختیاریہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے) اور اس لئے بھی کہ ممکن وہ ہوتا ہے جس کی ذات اپنے وجود کا بھی تقاضا کرتی تو پھر اس کی ذات سے کسی اور کے وجود کے تقاضے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ (یعنی ممکن کی اپنی ذات بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے تو پھر ممکن کسی اور کو کیسے پیدا کر سکتا ہے؟) اور اس پر تمام صحابہ کرام اور ان کے بعد علماء امت کا اجماع ہے کہ خالق حقیقی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

معتزلہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ بندے کو اپنے افعال اختیاریہ میں ایک نوع کا ارادہ اور اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہی ارادہ اور اختیار بندے کے مکلف ہونے کی علت ہے' منشاء ثواب و عتاب ہے اور افعال کی نسبت بندوں کی طرف کرنے کا موجب ہے۔ ہم اسے کسب کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن وہ ارادہ اور اختیار معدوم کو وجود عطا کرنے کے لئے بالکل کافی نہیں۔ چاہے وہ جوہر ہو یا عرض۔ بلکہ یہ ایجاد فقط اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے ارادہ و اختیار سے ہی ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت' ارادے اور اختیار کا جو تعلق مخلوق سے ہوتا ہے اسے ہم خلق کہتے ہیں اور ہر معدوم کو وجود میں لانے کے لئے یہ کافی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے (اگرچہ وہ حکمت ہم پر مخفی ہے) کہ وہ بندے کے کسب کو بھی ان کے بعض افعال میں شامل کر دے۔ پس معتزلہ کے ساتھ ہمارا نزاع معنی میں ہے کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بندے کا ارادہ اور قدرت معدوم کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہے۔ اور ہم اس کے قائل نہیں۔ اور بندے کے کسب پر لفظ خلق کے اطلاق کے جائز ہونے میں بھی ہمارا کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ تو نزاع لفظی ہے۔ اور احسن الخالقین اس پر دلالت کرتا ہے کہ لغوی طور پر کسب کے معنی پر لفظ خلق کا اطلاق صحیح ہے۔ اسی وجہ سے مجاہد نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ یَصْنَعُوْنَ وَ یَصْنَعُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الصّٰنِعِیْنَ۔ کہ بندے بھی بناتے ہیں اور اللہ بھی بناتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر)

ہے اور اللہ تعالیٰ سب بنانے والوں میں سے بہتر اور اچھا بنانے والا ہے۔

اسی طرح کہا جاتا ہے رجل خالق تو اس میں خالق بمعنی صانع (بنانے والا) ہوتا ہے(۱)۔ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بطور حکایت نقل کیا ہے کہ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ۔ (ان دونوں ارشادات میں خلق بمعنی صنع استعمال ہوا ہے) بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں خالقین کا لفظ تصویریں بنانے والے یا اندازہ لگانے والے کے معنی میں ہے اور لغت میں خلق کا معنی اندازہ لگانا ہے۔

بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ یہاں لفظ خالقین کا استعمال علی سبیل الفرض ہے اور محال شئی کو فرض کرنا محال نہیں ہوتا۔ یعنی اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ پیدا کرنے والے متعدد ہیں (جیسا کہ اس امت کے مجوسی معتزلہ کی رائے ہے) تو پھر بھی اللہ تعالیٰ ان تمام سے بہتر اور اچھا خالق ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ چار مرتبہ نزول قرآن کے وقت قرآن کریم کے الفاظ میں میری اپنے رب سے موافقت ہوگئی جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ الآیات۔ تو برجستہ میری زبان سے نکلا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔ تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی آخر میں یہی الفاظ نازل ہو گئے الحدیث(۱)

یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک آیت سے کم الفاظ معجزہ نہیں، کیونکہ انسان انہیں کہنے کی قدرت رکھتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے نزول سے قبل وہی الفاظ نکلے۔ (جو بعد میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئے)

بعض نے کہا ہے کہ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن سعد بن ابی سرح حضور نبی کریم ﷺ کے کاتب وحی تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے املاء کرانے سے قبل ان کی زبان سے آیت مذکور کے آخری الفاظ نکلے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اسی طرح لکھ دو یہی الفاظ نازل ہوئے ہیں۔ پھر عبداللہ نے کہا اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں اور ان کی طرف وحی کی جاتی ہے تو میں بھی نبی ہوں۔ میری طرف بھی وحی کی جاتی ہے۔ پس یہ کہہ کر وہ مرتد ہو گیا اور مکہ چلا گیا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو آپ ﷺ نے اور چند افراد کو واجب القتل قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسے بھی واجب القتل قرار دیا۔ اور اس کا خون مباح قرار دیا۔ پھر وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا (اور آپ سے سفارش کی درخواست کی) چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی امان کی درخواست کی۔ تو آپ ﷺ کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا نَعَمْ۔ (جی ہاں اچھا) جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس چلے گئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اس لئے اتنی دیر تک خاموش رہا تا کہ اس دوران تم اسے قتل کر دو۔ (تم نے ایسا کیوں نہ کر دیا) تو ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ہمیں اشارہ کیوں نہ کر دیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کی مرتکب ہو۔ پھر وہ اسی دن اسلام لے آیا اور پھر خوب اچھی طرح اسلام پر کاربند رہا۔

میں کہتا ہوں کہ سبیل الرشاد میں عبداللہ کے مرتد ہونے، نبی کریم ﷺ کی جانب سے اس کا خون مباح ہونے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے سفارش کرنے وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس میں مرتد ہونے کا یہ سبب مذکور نہیں کہ آپ ﷺ کے املاء

۱۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 12 (العلمیۃ)

کرانے سے قبل اس نے اس آیت کے الفاظ کہہ دیئے تھے۔ اور فی الحقیقت بھی اس کے مرتد ہونے کا یہ سبب نہیں بن سکتا کیونکہ وہ مدینہ منورہ میں مرتد ہوئے جبکہ یہ سورۂ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۟ؕ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖۗ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖۗ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ۚ

''پھر یقیناً تم ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مرنے والے ہو ۱۔ پھر بلاشبہ تمہیں روز قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا ۲۔ اور بیشک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنادیئے اور ہم اپنی مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے ۳۔ ہم نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پھر ہم نے ٹھہرا لیا اسے زمین میں اور یقیناً ہم اسے بالکل ناپید کرنے پر پوری طرح قادر ہیں ۴۔''

۱۔ ہم نے تمہارے بارے میں جن مراحل کا ذکر کیا ہے، ان سے گزرنے کے بعد اور اپنی مدت پوری کر لینے کے بعد یقیناً تم تمام مرنے والے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صیغہ صفت کا ذکر کیا گیا ہے جس میں (دوام) اور ثبوت کا معنی پایا جاتا ہے۔ اسم فاعل کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا (کیونکہ وہ معنی ثبوت پر دلالت نہیں کرتا) ترکیب کلام میں یہ جملہ اپنے معطوفات سمیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ والی آیات پر معطوف ہے۔ اور اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ پھر اس جملہ کو اِنَّ اور لام کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ کیونکہ لوگ گناہوں کے ارتکاب پر مصر ہوتے ہیں۔ اور یہی موت اور بعث بعد الموت سے ان کے انکار کی دلیل ہے۔ پس اس طرح وہ ان دونوں کا انکار کرنے والوں کے قائم مقام ہو گئے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میت اور مائت وہ ہوتا ہے جو ابھی تک نہ مرا ہو اور عنقریب مرنے والا ہو۔ اور میت بالتخفیف وہ ہوتا ہے جو مر چکا ہو۔ اسی لئے یہاں اسے تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔(1) قاموس میں ہے کہ مَاتَ يَمُوْتُ (باب نصر ینصر) مَاتَ يَمَاتُ (باب فَتَحَ يَفْتَحُ) اور مَاتَ يَمِيْتُ (باب ضرب یضرب) فھو میت بالتخفیف اور مَيِّتٌ بالتشدید حیّ کی ضد ہے۔ اور مات کا معنی ساکن ہونا اور سو جانا بھی ہے۔ یا پھر میت بالتخفیف کا معنی ہے جو مر چکا ہو اور میت اور مائت سے مراد وہ ہے جو ابھی تک نہ مرا ہو (2)

۲۔ پھر تمہیں قیامت کے دن اپنی قبروں سے حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے اٹھایا جائے گا۔

۳۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور اس کا عطف وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ پر ہے۔ سَبْعَ طَرَآئِقَ سے مراد سات آسمان ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں، اور ہر وہ شئی جس کے اوپر اسی کی مثل شئی ہو تو نیچی والی شئی کو طریقہ کہا جاتا ہے۔ یا پھر آسمانوں کو طرائق اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں ملائکہ یا سیاروں کے چلنے کے راستے ہیں۔ الخلق سے مراد جنس مخلوق ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم جنس مخلوق کے معاملات سے بے خبر اور انہیں مہمل چھوڑنے والے نہ تھے۔ بلکہ ہم ان کے زوال پذیر ہونے اور ان میں خلل پڑنے سے ان کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور ہم اس کے معاملات کی تدبیر کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس حد کمال تک پہنچ جاتا ہے جو ہم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 142 (الفکر)　　2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 258 (التراث العربی)

نے اس کے لئے اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق مقرر کی ہے۔ ہماری مشیت ان معاملات سے متعلق ہے اور وہ آسمانوں کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے۔

ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو خلقنا کے فاعل سے حال ہے یا قول باری تعالیٰ لَقَدْ خَلَقْنَا پر معطوف ہے۔ اور یہ مقام تعلیل میں واقع ہے یعنی ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے ہیں تاکہ ہم تم پر طرح طرح کے رزق اور برکتوں کے دروازے کھول دیں۔ اور تم پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے چمکتے دمکتے رہیں۔ کیونکہ ہم تم سے اور تمہاری مصلحت سے متعلقہ امور سے غافل اور بے خبر نہیں تھے۔

اس میں مآء سے مراد بارش ہے۔ یعنی ہم نے آسمان سے بارش کا پانی اتارا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف خلقنا پر ہے۔ بِقَدَرٍ سے مراد اتنی مقدار ہے جسے ہم نے مخلوق کے لئے نفع بخش اور مصلحت آمیز جانا۔ فَاَسْكَنّٰهُ کا عطف کلام سابق پر ہے۔ یعنی ہم نے پانی کو زمین میں ثابت کر دیا ہے اور ٹھہرا لیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو تالابوں، حوضوں اور گڑھوں میں جمع ہو کر باقی رہتا ہے اور بارش نہ ہونے کے وقت لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جسے زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ وہ پانی اس کے مساموں سے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کے سبب زمین میں چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس بنا پر زمین سے نکلنے والا تمام پانی آسمان سے ہی نازل شدہ ہوتا ہے۔

وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ کا عطف فَاَسْكَنّٰهُ پر ہے۔ یعنی ہم اسے زائل کرنے اور مکمل طور پر ناپید کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چاہے اسے خراب کر دیں یا بھاپ بنا کر اڑا دیں۔ یا پھر زمین میں اتنی گہرائی تک پہنچا دیں کہ تمہارا اس تک پہنچنا ہی متعذر ہو جائے۔ ذَهَابٍ کو نکرہ ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسے زائل کرنے کے راستے کثیر ہیں۔ اور اسے واپس لوٹانے میں اظہار مبالغہ مقصود ہے۔ لَقٰدِرُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ہم پانی کو زائل کرنے کی قدرت اسی طرح رکھتے ہیں جیسے ہم اسے نازل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اگر ہم اس طرح کر دیں تو تم پیاسے مر جاؤ، تمہارے جانور ہلاک ہو جائیں اور تمہاری زمینیں بنجر ہو جائیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حدیث طیبہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار دریا جنت سے اتارے ہیں۔ یعنی سیحان، جیحان، دجلہ اور فرات (1)۔ اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حسن بن سفیان نے عثمان بن سعید سے بالا جازت سعید بن سابق الاسکندرانی سے انہوں نے مسلمہ بن علی سے، انہوں نے مقاتل بن حبان سے، انہوں نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے درجات میں سے نچلے درجہ میں موجود ایک چشمے سے پانچ دریا اتارے ہیں۔ سیحون، جیحون، دجلہ، فرات اور نیل۔ اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے دونوں پروں پر نازل کیا۔ پھر آپ نے انہیں پہاڑوں کے سپرد کیا۔ اور زمین میں جاری کر کے انہیں لوگوں کے لئے نفع بخش بنا دیا۔ اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ پھر جب یاجوج ماجوج کا زمانہ آئے گا تو اللہ تعالیٰ جبرائیل امین کو بھیجے گا۔ اور زمین سے قرآن کریم، تمام علوم، حجر اسود، مقام ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو انہیں موجود چیزوں سمیت اور ان پانچوں دریاؤں کو زمین سے آسمان کی طرف اٹھا لے گا۔ اسی کی جانب اس ارشاد میں اشارہ ہے وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ۔ پس جب یہ تمام چیزیں زمین سے اٹھالی جائیں گی تو زمین کے باسی دین و دنیا کی بھلائی سے محروم ہو جائیں گے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید دنیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 142 (الفکر) 2۔ ایضاً

کے تمام دریا جنت کے چشموں سے ہی جاری ہوئے ہیں۔ اور حدیث طیبہ میں صرف پانچ کا ذکر بطور تمثیل ہے۔ واللہ اعلم۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿٢٠﴾

''پھر ہم نے اگائے تمہارے لئے اس پانی سے باغات کھجوروں اور انگوروں کے' تمہارے لئے ان میں بہت سے پھل ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔ نیز پیدا کیا ایک درخت جو اگتا ہے طور سینا میں وہ اگتا ہے تیل لئے ہوئے اور سالن لئے ہوئے کھانے والوں کے لئے''

1۔ فَاَنْشَاْنَا کا عطف اَنْزَلْنَا پر ہے۔ بہٖ کی ہ ضمیر کا مرجع مآء (پانی) ہے۔ فِيْهَا میں هَا ضمیر کا مرجع جنات ہے۔ اسی طرح مِنْهَا کی ھا ضمیر سے مراد بھی جنات ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے اس پانی سے تمہارے لئے باغات اگائے ہیں۔ جن میں کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ کثیر ایسے پھل پائے جاتے ہیں جن سے تم تفکہ حاصل کرتے ہو اور لطف اندوز ہوتے ہو۔ اور انہی میں سے بعض پھلوں اور دیگر پیداوار کو بطور غذا استعمال کرتے ہو' رزق حاصل کرتے ہو اور اپنا سامان زیست حاصل کرتے ہو۔ اسی معنی میں عربوں کا یہ قول فُلَانٌ يَّاْكُلُ مِنْ حِرْفَتِهٖ (فلاں اپنے حرفہ اور پیشہ سے سامان زندگی حاصل کرتا ہے)

یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع نخیل اور اعناب کے الفاظ ہوں، یعنی تمہارے لئے ان کے پھلوں میں تفکہ اور لطف اندوز ہونے کی طرح طرح کی اقسام ہیں۔ مثلاً تر کھجوریں' (چھوارے) 'انگور' کھجوریں' کشمش' جوس اور رس وغیرہ۔ صرف کھجور اور انگور کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ یہی دونوں پھل عرب میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ترکیب کلام میں مِنْهَا تاکلون کا جملہ ظرف کے فاعل سے حال ہے، یعنی لکم فیھا فواکہ۔ یا پھر اس پر اور جنات یا نخیل پر معطوف ہے۔

2۔ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ الآیۃ کا عطف جنات پر ہے۔ اور شَجَرَةً سے مراد زیتون کا درخت ہے۔

اہل حجاز اور ابو عمرو نے سَيْنَآء کی بجائے سِيْنَآءَ پڑھا ہے۔ جبکہ ابن عامر' یعقوب اور کوفیوں نے اسے سَيْنَآءَ پڑھا ہے۔ علماء نے سیناء اور سینین کے مختلف معنی ذکر کئے ہیں۔ مثلاً مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی برکت ہے، یعنی برکت والے پہاڑ سے ایک درخت اگتا ہے۔ قتادہ' ضحاک اور عکرمہ نے اس کا معنی حسن کیا ہے، یعنی خوبصورت اور حسین پہاڑ۔ ضحاک نے کہا ہے یہ قبطی زبان کا لفظ ہے۔ اور عکرمہ نے اسے حبشی زبان کا لفظ قرار دیا۔ کلبی نے کہا ہے اس کا معنی ہے درختوں والا۔ یعنی گھنے درختوں والا پہاڑ۔ بعض نے کہا ہے یہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ مقاتل کا قول ہے ہر وہ پہاڑ جس پر کثرت سے پھل دار درخت ہوں اسے نبطی زبان میں سیناء اور سینین کہا جاتا ہے(1)۔ مجاہد کا نظریہ یہ ہے کہ سیناء پتھر کی ایک معینہ قسم کا نام ہے۔ چونکہ وہ خاص قسم کا پتھر اس پہاڑ میں پایا جاتا ہے اسی لئے اسی کے نام پر پہاڑ کا نام رکھ دیا گیا۔

عکرمہ نے کہا ہے یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے(2)۔ بعض کا خیال ہے کہ طور سیناء دونوں لفظوں سے مرکب ایک پہاڑ کا نام ہے جو مصر اور ایلہ کے درمیان واقع ہے۔ اور وہیں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی گئی۔ جیسا کہ امرؤ القیس ایک نام ہے۔ ابن زید نے اسی طرح کہا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 143 (الفکر)

2۔ ایضاً

سِیْنَآءَ کے غیر منصرف ہونے کا سبب معرفہ اور عجمہ۔ یا علی تاویل بقعہ تانیث اور عجمہ ہے۔ اس کے غیر منصرف ہونے کا سبب تانیث بالالف نہیں۔ کیونکہ یہ فیعال کے وزن پر ہے۔ جیسے دیماس۔ اور سناء بمعنی رفعت و بلندی سے ماخوذ ہے۔ یا پھر اس میں الف مقصورہ بمعنی نور ہے۔ یا یہ فعلال سے ملحق ہے۔ کیونکہ یہ فعلآء کے وزن پر نہیں جس میں الف تانیث موجود ہے۔ یہ اہل حجاز کی قرأت کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کوفیوں کی قرأت کے مطابق فیعال کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ کَیْسان ہے۔ یا پھر فعلاء کے وزن پر ہے۔ جیسے صحرآء اور اس کا الف تانیث کیلئے ہے۔ فعلال کے وزن پر نہیں۔ کیونکہ یہ وزن ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔

۳۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب نے تَنْبُتُ کو باب افعال سے تا کے ضمہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ تُنْۢبِتُ پڑھا ہے۔ یعنی زیتون کا درخت اگتا ہے، درآنحالیکہ وہ تیل بھی اپنے ساتھ لئے ہوتا ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ باء یہاں حال کے لئے ہے۔ یعنی تیل اسکے ساتھ ہوتا ہے(1)۔ بعض نے کہا ہے کہ بالدُّھن میں باء زائدہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اَنْبَتَ بمعنی نبت ہے۔ اور معنی باقیوں کی قرأت کے مطابق ہی ہے، یعنی یہ لفظ تاء کے فتحہ اور باء کے ضمہ کے ساتھ باب مجرد سے ہی ماخوذ ہے یعنی وہ درخت اگتا ہے درآنحالیکہ اپنے ساتھ تیل لئے ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ باء تعدیہ کے لئے ہو۔ اور اس کا معنی تُنْبِتُ الدُّھْنَ ہو۔ (یعنی وہ درخت تیل پیدا کرتا ہے) اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوتا ہے۔ ترکیب کلام میں "وَصِبْغٍ" الدُّھْنِ پر معطوف ہے۔ لہٰذا اسے وہی کسرہ کا اعراب دیا گیا ہے۔ اس میں ایک شئی کے دو وصفوں میں سے ایک کا دوسرے پر عطف ہے۔ یعنی یہ ایسا درخت اگتا ہے جس میں تیل بھی ہوتا ہے جو مالش کے کام آتا ہے۔ اور اس سے چراغ بھی جلائے جاتے ہیں۔ اور وہ سالن کے کام بھی آتا ہے۔ جس میں روٹی ڈبو کر کھائی جاسکتی ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صبغ اور صباغ سے مراد وہ سالن ہے جس میں روٹی ڈبوئی جاسکتی ہو اور روٹی اس سے رنگین ہو جاتی ہو۔ اور ادام سے مراد ہر وہ سالن ہے جس سے روٹی کھائی جاسکتی ہو۔ چاہے روٹی اس سے رنگی جائے یا نہیں۔(2) مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس درخت میں سالن اور تیل دونوں پیدا کئے ہیں۔ سالن (ادام) زیتون ہے اور دھن (تیل) زیت ہے(3) طور کو زیتون کے لئے خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ سب سے پہلے زیتون کا درخت اسی پر اگا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیتون وہ پہلا درخت ہے جو طوفان نوح کے بعد سب سے پہلے دنیا میں اگا(4)

وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اور بیشک تمہارے لئے جانوروں میں بھی غور و فکر کا مقام ہے ۱؎ ہم پلاتے ہیں تمہیں اس (دودھ) سے جو ان کے شکموں میں ہے اور تمہارے لئے ان میں طرح طرح کے بہت فائدے ہیں اور انہیں کے گوشت سے تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار کیا جاتا ہے ۲؎ اور ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو آپ نے فرمایا اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر۔ کیا تم (بت پرستی کے انجام سے) نہیں

ڈرتے ہیں''

لے عبرت کا معنی علامت' نشانی اور دلیل ہے، یعنی تمہارے لئے جانوروں کی حالت میں ایسی نشانیاں اور علامات موجود ہیں جن سے تم انہیں پیدا کرنے والے کی حکمت اور کمال قدرت پر استدلال کر سکتے ہو۔ چونکہ اکثر لوگ ان کی حالت میں گہری غور وفکر کرنے سے غافل ہوتے ہیں، (ان سے عبرت اور درس حاصل نہیں کرتے) اس لئے انہیں انکار کرنے والوں کی مثل قرار دے کر جملہ مؤکد ذکر کیا گیا ہے۔ (یعنی شروع میں انّ حرف برائے تاکید کے لئے لگایا گیا ہے)۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ پر ہے۔

ے نافع' ابن عامر' ابوبکر اور یعقوب نے نُسْقِيْكُمْ کو باب مجرد سے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون مفتوح کے ساتھ نَسْقِيْكُمْ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب افعال سے صیغہ جمع متکلم بنا کر نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ ہم سورۂ نحل میں ذکر کر چکے ہیں۔ ابو جعفر نے اس مقام پر باب مجرد سے صیغہ واحد مؤنث غائب ہونے کی بناء پر اسے تاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس قرأت کے مطابق ضمیر کا مرجع الانعام ہے۔

مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا سے مراد دودھ ہے یا چارہ۔ کیونکہ دودھ بھی چارے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ مِنْ یا تبعیضیہ ہے یا ابتدائیہ ہے۔ اور ان میں تمہارے لئے طرح طرح کے بہت فائدے ہیں، یعنی ان کی پشتوں' بالوں اور اون وغیرہ میں کثیر فوائد ہیں۔ اور انہیں میں سے بعض کے گوشت تم کھاتے ہو۔ گویا تم ان کی ذاتوں سے منافع اور فوائد حاصل کرتے ہو۔

سے عَلَيْهَا کی ھا ضمیر کا مرجع الانعام ہے۔ اور جانوروں اور کشتیوں پر تمہیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض ایسے جانور ہیں جن پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ مثلاً اونٹ اور بیل وغیرہ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد صرف اونٹ ہے۔ کیونکہ علاقہ عرب میں صرف اسی پر ہی بوجھ لادا جاتا اور سوار ہوا جاتا تھا۔ اور لفظ فلک کیساتھ مناسبت بھی یہی رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ خشکی کا سفینہ کہلاتا ہے۔ ذوالرمہ کا قول ہے سَفِيْنَةُ بَرٍّ تَحْتَ خَدِّيْ زِمَامُهَا۔ (خشکی کے جہاز کی لگام میرے رخسار کے نیچے ہے) اور اس میں ضمیر ایسے ہی ہے جیسے اس ارشاد میں۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ۔

نُسْقِيْكُمْ سے لے کر تا آخر مکمل جملہ عبرۃ کا بیان اور وضاحت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ گوبر اور خون کے درمیان سے پینے والوں کے لئے خالص لذیذ سفید رنگ کا دودھ پیدا فرماتا ہے۔ یہ عبرت اور درس حاصل کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی واضح دلیل ہے۔ اور ان میں مزید عبرت کی علامت اور نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان قوی ہیکل عظیم الجثہ جانوروں کو دودھ دینے کے لئے' اون اور بال کاٹنے کے لئے، سواری اور باربرداری کے لئے نیز ذبح کرنے کے لئے ایک ضعیف اور کمزور انسان کے لیے مطیع اور تابع فرمان بنا دیا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت تامہ کی بہت بڑی دلیل اور نشانی ہے۔

سے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا کا عطف وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ پر ہے۔ سورت کے شروع میں مطیع وفرمانبردار اہل ایمان کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ آیات لائی گئی ہیں جو ایمان وطاعت کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور پھر سرکش کفار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کے انجام کا تذکرہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت اختیار کرو اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی معبود نہیں۔

مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ جملہ مستانفہ ہے اور یہ حکم عبادت کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ کسائی نے غیرہ کو لفظ اِلٰهٍ پر محمول کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اس کے محل پر محمول کرتے ہوئے اسے مرفوع پڑھا ہے۔

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ کا عطف محذوف فعل پر ہے، یعنی اَتُشْرِكُوْنَ بِهٖ فَلَا تَتَّقُوْنَ۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اور اس کے انجام سے نہیں ڈرتے؟ کہ وہ تم سے اپنی نعمتیں چھین لے اور زائل کر دے اور تمہیں اس جرم میں عذاب میں مبتلا کر دے کہ تم عبادت کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو بھی شریک ٹھہراتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہو۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾

''تو کہنے لگے وہ سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا ان کی قوم سے کہ نہیں ہے یہ مگر بشر تمہارے جیسا یہ چاہتا ہے کہ اپنی بزرگی جتلائے تم پر اور اگر اللہ تعالیٰ (رسول بھیجنا) چاہتا تو وہ اتارتا فرشتوں کو ہم نے نہیں سنی یہ بات (جو نوح علیہ السلام کہتا ہے) اپنے پہلے آباء و اجداد میں [1] نہیں ہے یہ مگر ایسا شخص جسے جنون کا مرض ہو گیا ہے سو انتظار کرو اسکے انجام کا کچھ عرصہ [2] آپ نے عرض کی اے رب! (اب) تو ہی میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے [3]''

[1] سرداران قوم نے آپس میں کہا کہ یہ نوح علیہ السلام تمہارے جیسا ہی بشر ہے۔ یہ تمہاری طرح ہی کھاتا پیتا اور سوتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول کیسے ہو سکتا ہے؟

کلام میں (ما اور الا کے سبب) جو قصر کا معنی پیدا ہو رہا ہے وہ قصر قلبی ہے۔ کیونکہ ان کے زعم باطل اور فاسد نظریہ کے مطابق جو رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے گویا وہ اپنے بشر ہونے کا منکر ہوتا ہے۔ اور اپنے فرشتہ ہونے کا مدعی ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے دعویٰ قلب کے مطابق کہا یہ (نوح علیہ السلام) فرشتہ تو نہیں ہے اور نہ ہی یہ بشر کے سوا کوئی اور شئی ہے۔ اور اس قصر کا انحصار ان کے اس نظریہ پر ہے کہ انہوں نے کسی بشر کے اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کا انکار کیا۔ حالانکہ وہ پتھروں کے بارے اللہ تعالیٰ کا شریک ہونے کے دعویدار تھے۔ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ وہ کہنے لگے کہ یہ رسالت کا دعویٰ اس لئے کر رہا ہے کیونکہ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی عظمت اور بزرگی کا اظہار کرے۔ اور تمہارا سردار بن جائے۔ ترکیب کلام میں جملہ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ بشر کی ایک صفت کے بعد ایک اور صفت ہے۔ یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا کہ یہ کہا ہے کہ یہ رسالت کے دعویٰ سے اور کچھ نہیں چاہتا سوائے اپنی برتری کے اظہار کے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے یا وہ کسی کو رسول بنا کر بھیجنا چاہتا تو بالیقین کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا۔ وہ کہنے لگے کہ جن نظریات کا دعویٰ نوح (علیہ السلام) کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہیں۔ (یعنی بشر رسول ہو سکتا ہے) اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کے بارے ہم نے اپنے پہلے آباء و اجداد سے بھی کچھ نہیں سنا۔ ان کے اس قول کی دو وجھیں ہیں۔ یا تو انتہائی عناد اور سرکشی اختیار کرنے کے سبب انہوں نے یہ کہا۔ یا پھر ان کے اور سابقہ کسی نبی کے مبعوث ہونے کے درمیان اتنا طویل عرصہ گزر چکا تھا کہ واقعۃً انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے بھی کسی نبی علیہ السلام کے بارے نہیں سنا۔

ترکیب کلام میں جملہ مَاسَمِعْنَا، بِھٰذَا یُرِیْدُ کے فاعل سے حال ہے اور حال اور اس کے عامل کے درمیان جملہ شرطیہ معترض ہے۔

۲؎ یہ نہیں ہے مگر ایسا شخص جسے جنون کا مرض ہو گیا ہے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ الایۃ جملہ مستانفہ ہے۔ یا نفی رسالت کی تاکید کے لئے ہے۔ کیونکہ مجنون کبھی بھی رسول نہیں ہو سکتا۔ سو تم اسے برداشت کرو اور اس کے انجام کا انتظار کرو۔ شاید اسے جنون سے افاقہ ہو جائے۔ یا پھر یہ مر جائے۔

فَتَرَبَّصُوْا میں فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ اس کا مجنون ہونا ہی انتظار کرنے اور جلدی انتقام نہ لینے کا موجب ہے۔

۳؎ جب حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی یہ بتا دیا گیا کہ آپ کی قوم میں سے سوائے ان افراد کے جو ایمان لا چکے ہیں اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ تو پھر انہوں نے عرض کی اے رب! اب تو ہی میری مدد فرما، یعنی انہیں ہلاک و برباد کر اور جس عذاب سے میں انہیں ڈراتا رہا ہوں اس کا وعدہ پورا فرما دے کیونکہ انہوں نے تو میری تکذیب کر دی ہے اور مجھے جھٹلایا ہے۔ بما میں باء برائے بدل ہے یا سببیہ ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ مستانفہ ہے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٧﴾

"تو ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ بناؤ ایک کشتی ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق۔ پھر جب آ جائے ہمارا عذاب اور (پانی) ابل پڑے تنور سے ۱؎ تو داخل کر لو اس میں ہر جوڑے میں سے دو دو ۲؎ اور اپنے گھر والوں کو بجز ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے ان میں سے، اور گفتگو نہ کرنا میرے ساتھ ان کے متعلق جنہوں نے ظلم کیا، وہ تو ضرور غرق کئے جائیں گے ۳؎"

۱؎ فَاَوْحَيْنَآ کا عطف مقدر عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَاسْتَجَبْنَا دُعَاءَہٗ فَاَوْحَيْنَا۔ پس ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری حفاظت میں ایک کشتی بناؤ کہ اس کے بنانے میں کوئی خطا اور غلطی نہیں ہو گی یا تمہارے اس کام کو کوئی خراب نہیں کر سکے گا۔ اَنِ اصْنَعِ میں اَنْ اَوْحَيْنَا کی تفسیر کے لئے ہے، یعنی یہ اَنْ مفسرہ ہے۔ کیونکہ یہ قول کے معنی میں ہے۔

اور کشتی بناؤ ہمارے حکم اور ہماری تعلیم سے کہ وہ کیسے بنائی جاتی ہے۔ پھر جب کشتی پر سوار ہونے یا عذاب نازل ہونے کے بارے ہمارا حکم آ جائے۔ ترکیب کلام میں فَاِذَا جَآءَ الآیۃ کا عطف اَنِ اصْنَعِ پر ہے۔ اور روٹیاں پکانے کے تنور سے پانی ابل پڑے تو خود بھی کشتی میں سوار ہو جاؤ اور اپنے ساتھ متبعین کو بھی سوار کر لو۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام کے لئے تنور سے پانی ابلنے کو علامت اور نشانی قرار دیا۔ پھر جب تنور سے پانی نکلنا شروع ہو گیا اور آپ کی زوجہ نے آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ کشتی پر سوار ہو گئے۔ آپ کا محل کوفہ کی مسجد میں باب کندہ سے داخل ہوتے وقت دائیں جانب واقع تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ شام کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر رہائش پذیر تھے۔

۲۔ تو اس میں ہر جوڑے میں سے دو دو داخل کر لو۔ سَلَکَ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے سلکت فی کذا، یعنی میں فلاں جگہ داخل ہوا۔ (اس جملہ میں یہ لازم استعمال ہوا ہے) اور ارشاد خداوندی ہے مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ۔ (تمہیں جہنم میں کس نے داخل کیا) (یہاں فعل متعدی استعمال ہوا ہے)

لفظ کُلٍّ کو جمہور نے زوجین کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اس صورت میں اثنین مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ معنی یہ ہے کہ حیوانات کی تمام اقسام میں سے دو دو اس میں داخل کر لو، یعنی ایک مذکر (نر) اور ایک مونث۔ (مادہ) حفص نے کُلٍّ کو مضاف الیہ کے عوض تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اس میں ہر نوع میں سے جوڑا جوڑا داخل کر لو۔ اس صورت میں اثنین زوجین کی تاکید کے لئے ہے۔

اس واقعہ میں یہ بھی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس ہر قسم کے جانور، درندے پرندے اور دیگر جانور جمع کروائے۔ آپ اپنے دونوں ہاتھ ان میں سے ہر قسم پر رکھتے تو آپ کا دایاں ہاتھ مذکر (نر) پر پڑتا اور بایاں ہاتھ مؤنث (مادہ) پر پڑتا۔ پس اس طرح آپ انہیں کشتی میں سوار کر لیتے تھے۔

۳۔ اپنے اہل کو اس میں سوار کر لیجئے اہل سے مراد یا تو آپ کے اہل خانہ ہیں یا وہ تمام لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ ایمان لائے۔ مگر اہل میں وہ افراد داخل نہیں جنہیں حالت کفر میں ہلاک کئے جانے کا فیصلہ ازل سے ہی کیا جا چکا تھا آپ کے اہل میں سے ان افراد میں آپ کی بیوی اور بیٹا کنعان تھے۔

سَبَقَ کا صلہ علیہ ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ازلی فیصلہ ان کے لئے ضرر رساں تھا۔ اور علیٰ کا لفظ اسی معنی پر دلالت کرتا ہے اس لئے یہاں صلہ علیٰ ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ لام انتفاع کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى۔ چونکہ اس میں ازلی فیصلہ نفع بخش ہے اس لئے صلہ لَهُمْ ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَا تُخَاطِبْنِیْ کا عطف اِصْنَعِ یا فَاسْلُکْ پر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا انہیں بچانے کے لئے ان کے حق میں مجھ سے دعا نہ کرنا۔ کیونکہ وہ تو شرک کرنے کے سبب اپنے ظلم کی وجہ سے بالیقین غرق کیے جائیں گے۔ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ قول باری تعالیٰ لَا تُخَاطِبْنِیْ کے لئے جملہ معللہ ہے۔

فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ﴿۳۰﴾

"پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں نجات دی ظالم قوم (کے جور و ستم) سے۔ اور یہ بھی عرض کرنا کہ اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر[۱] اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔[۲] بیشک اس قصہ میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اور ہم ضرور (اپنے بندوں کو) آزمانیوالے ہیں۔[۳]"

۱۔ پھر جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر اچھی طرح بیٹھ جائیں۔ اور برے پڑوسیوں کی مصاحبت اور سنگت سے نجات پا جائیں، تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ظالم قوم کے جور و ستم سے نجات دی۔ اور یہ کہنا اے میرے رب! سوار

ہونے کے بعد کشتی میں یا کشتی سے نکلنے کے بعد زمین میں مجھے بابرکت منزل پر اتار۔
ابوبکر نے عاصم سے مُنْزَلًا کی قرات مَنْزِلًا یعنی میم مفتوح اور زاء مکسور کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس کا معنی ہے اترنے کی جگہ۔ باقیوں نے میم کو مضموم اور زاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور یہ بمعنی انزال اتارنا ہے۔
مُبٰرَكًا بابرکت۔ اس سے مراد وہ شئی ہے جو دارین میں خیر اور بھلائی میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اب کشتی میں برکت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی مصاحبت اور سنگت سے نجات اور عبادت الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے فارغ ہونا۔ اور کشتی سے نکلنے کے بعد زمین میں برکت سے مراد یہ ہے کہ نسل میں اضافہ اور رزق میں کثرت کا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہونا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ شرطیہ فَاسْلُكْ پر معطوف ہے۔
۲ے اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔ ترکیب کلام میں وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ کا جملہ اَنْزِلْنِيْ کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس میں تعریف آپ کی دعا کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت نوح علیہ السلام کو دعا کا حکم ارشاد فرمایا کہ اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے مساوی، ایک جیسی دعا مانگیں۔ تو اس میں آپ علیہ السلام کی فضیلت کا اظہار ہے۔ اور ساتھ ہی یہ احساس دلایا گیا ہے کہ آپ کی دعا ہی آپکے ساتھیوں کے لئے بھی کافی ہے۔ (انہیں مزید دعا کی ضرورت نہیں)
۳ے بیشک اس قصہ میں، یعنی جو کچھ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کے ساتھ کیا۔ اس میں ایسی نشانیاں ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کامل اور تام ہے۔ وہ مسلمانوں اور مطیع وفرمانبردار لوگوں کے ساتھ انتہائی راحت ورحمت کا سلوک کرتا ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کے لئے اس کا غضب انتہائی شدید اور سخت ہے۔ اہل بصیرت ان علامات سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔
وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ میں انْ مخففہ عن المثقلہ ہے۔ یہ اصل میں انّ تھا۔ اور لمبتلین پر لام فارقہ ہے۔ (یعنی ان مخففہ اور ان نافیہ میں فرق کرنے کے لئے ہے) یعنی ہم حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو انتہائی شدید اور عظیم مصائب میں مبتلا کرنے والے تھے۔ یا ہم اپنے بندوں کی آزمائش کرنے والے ہیں۔
بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ اِنْ نافیہ ہے اور لام بمعنی الاّ ہے، یعنی نوح علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث کرنے اور ان کے وعظ ونصیحت کرنے سے اس کے سوا کوئی مقصد نہ تھا کہ ان کی قوم کو آزمائیں۔ اور انہیں امتحان میں ڈالیں تاکہ ہم دیکھیں کہ وہ عذاب نازل ہونے سے قبل کیا عمل کرتے ہیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾

''پھر ہم نے پیدا فرمادی ان کے (غرق ہونے کے) بعد ایک دوسری جماعت لے پھر ہم نے بھیجا ان میں ایک رسول ان میں سے (اس نے انہیں کہا) کہ عبادت کرو اللہ کی، نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے سوا، کیا تم (شرک کے انجام سے) نہیں ڈرتے ہو ۲ے تو بولے انکی قوم کے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا اور جنہوں نے جھٹلایا تھا قیامت کی حاضری کو اور ہم

نے خوشحال بنا دیا تھا انہیں دنیوی زندگی میں۔ (اے لوگو!) نہیں ہے یہ مگر ایک بشر تمہاری مانند یہ کھاتا ہے وہی خوراک جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے اس سے جو تم پیتے ہو ''

1 ثُمَّ اَنْشَاْنَا کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فَاَغْرَقْنَا هُمْ ثُمَّ اَنْشَاْنَا۔ (پس ہم نے انہیں غرق کر دیا پھر ان کے بعد ہم نے ایک دوسری جماعت پیدا فرمادی) قَرْنًا اٰخَرِیْنَ سے مراد قوم عاد یا قوم ثمود ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قوم عاد مراد لینا زیادہ اظہر اور مناسب ہے(1)۔

ابو جعفر، ابن کثیر اور ابو عمرو نے تَتْرًا کو وصل کلام میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حالت وقف میں تنوین کی بجائے الف کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اسی لئے ابو عمرو اس میں امالہ نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس کے آخر میں الف اسی طرح ہے جیسے حالت نصبی میں زیدًا کا الف ہوتا ہے۔ تَتْرًا مصدر ہے۔ اور تواتر اور مواترۃ کے معنی میں ہے۔ اور اس سے مراد چیزوں کا فرداً فرداً ایک دوسرے کے پیچھے ہونا ہے۔ جبکہ یہ آپس میں جمع نہ ہوں۔ قاموس میں ہے کہ تواتر کا معنی تتابع ہے۔ یعنی چیزوں کا پے در پے ہونا، مسلسل ہونا (بغیر کسی انقطاع کے) یا انقطاع کے ساتھ۔ اور واتر مواترۃ اور وتارًا کا معنی ہوتا ہے تابع۔ وہ مسلسل یکے بعد دیگرے لے آئے۔ کیونکہ چیزوں کے مابین تب تک مواترت ثابت ہی نہیں ہوتی جب تک ان کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ واقع نہ ہو۔ یعنی بعض لوگوں نے تواتر کے معنی میں چیزوں کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ ہونے کا اعتبار کیا ہے۔ (یعنی تواتر کے اثبات کے لئے ان کے مابین اتصال اور التصاق نہیں ہونا چاہئے)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے'' لا بأس بقضاء رمضان تترى''، یعنی رمضان المبارک کے قضا روزے متفرق طور پر بغیر تسلسل کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح نہایہ میں ہے۔

اصمعی نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے واترت الخبر۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب خبریں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد موصول ہوں۔ اور یا دو خبروں کے درمیان کچھ وقفہ ہو۔

میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر میں یہ شرط ہے کہ وہ ایسی مختلف اور متفرق اسناد اور ایسے راویوں سے مروی ہو جو آپس میں جمع نہ ہوں۔ اس طرح کہ ان کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کا احتمال نہ ہو۔

اکثر قراء نے تترىٰ بروزن سکریٰ تانیث بالالف المقصورہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ یہ غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اس میں ایک سبب تانیث اور ایک تانیث کا اسے لازم ہونا ہے۔ تانیث کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ رُسُلُ سے مراد جماعت ہے۔ ترکیب کلام میں ثُمَّ اَرْسَلْنَا قول باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنَا پر معطوف ہے۔ اس میں جمع کا مقابلہ جمع سے کیا گیا ہے۔ مگر اس سے مراد جمع کی ایک اکائی کو دوسری جمع کی ایک اکائی کے مقابل لانا ہے۔ پھر ثم برائے تراخی کا ذکر صحیح ہوگا۔ گویا یہ فرمایا کہ پھر ہم نے ایک قوم کو پیدا کیا اور اس کی راہنمائی کے لئے ایک رسول بھیجا۔ پھر ایک دوسری قوم کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے لئے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پس مکمل ترتیب اس طرح ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کے بعد یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا کہ پہلے ہم نے بہت سی امتوں کو پیدا کیا۔ اور ان تمام قوموں کے بعد ہم نے رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ (یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے)

4۔ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ جب رسول کو بھیجنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل (بھیجنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 146 (الفکر)

والے) کی طرف ہوتی ہے۔ اور جب رسول کے آنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل الیھم (جن کی طرف رسول کو بھیجا جاتا ہے) کی طرف ہوتی ہے۔ کیونکہ رسول کے بارے میں اسے بھیجنا مبداء اور بنیاد ہے۔ (اس لئے اسے بھیجنے کی نسبت بھیجنے والے کی طرف ہی ہونی چاہئے)اور اس کا آنا اور پہنچنا اس کے معاملہ کے لئے منتہاء ہے۔ (لہٰذا اس کی نسبت مرسل الیھم کی طرف ہی ہونی چاہئے)

۲؎ پھر انہی کے درمیان سے ان میں ایک رسول بھیجا جس کی صداقت وعدالت وانصاف کو وہ خوب پہچانتے تھے۔ اگر وہ قوم عاد تھی تو اس کی طرف آنے والے رسول حضرت ہود علیہ السلام تھے۔ اور اگر وہ قوم ثمود تھی تو اس کے رسول حضرت صالح علیہ السلام تھے۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ میں اَنْ اَرْسَلْنَا کی تفسیر کے لئے ہے۔ یعنی یہ اَن مفسرہ ہے اور قول کے معنی میں ہے۔ یعنی ہم نے انہیں اپنے رسول علیہ السلام کی زبان سے کہا کہ تم اللہ کی عبادت کرو۔ اسکے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ کیا تم شرک کے انجام سے نہیں ڈرتے ہو۔؟

۳؎ اس آیت کے شروع میں واؤ ذکر کی گئی ہے۔ کیونکہ سرداران قوم کا کلام رسول علیہ السلام کے کلام سے متصل نہیں تھا۔ بخلاف قوم نوح کے کلام کے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے استیناف کی صورت میں بغیر واؤ کے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف اور سورہ ہود میں قوم ہود کا کلام بھی بغیر واؤ کے استیناف کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہاں جو واؤ ذکر کی گئی ہے یہ اس کی علامت ہے کہ یہ کلام ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے(کہ جب اللہ تعالیٰ کے رسول نے کہا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) تو اس کے جواب میں انہوں نے کیا کہا؟ تو یہاں واؤ ذکر کر کے ان کے کلام کو رسول کے کلام پر معطوف کر دیا۔ لہٰذا بظاہر معنی یہ ہے کہ یہ حق اس باطل کے ساتھ جمع ہے۔ حالانکہ انکا جواب نبی علیہ السلام کے کلام کے ساتھ متصل نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کو فاء کے ساتھ ذکر کیا کیونکہ ان کا جواب آپ کے کلام کے متصل بعد تھا۔

كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ کا معنی ہے کہ انہوں نے آخرت میں حاصل ہونے والے ثواب وعتاب کو جھٹلایا۔ یا انہوں نے حیات اخرویہ کی جانب اپنے لوٹنے کو جھٹلا دیا۔ اور ہم نے انہیں دنیوی زندگی میں کثرت مال واولاد کی نعمت سے نوازا اور خوشحال بنا دیا تھا۔ انہوں نے کہا اے لوگو! یہ جو نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے یہ اپنی صفات واحوال میں تمہارے جیسا ہی بشر ہے۔ یہ وہی خوراک کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو۔ اور اسی سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ میں ما موصولہ ہے۔ اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر منصوب محذوف ہے۔ یا وہ ضمیر مجرور ہے اور حرف جار سمیت محذوف ہے۔ اور اس پر اس سے قبل موجود منہ دلالت کر رہا ہے۔

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

''اور اگر تم پیروی کرنے لگے اپنے جیسے بشر کی تو تم تب نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے ۱؎۔ کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تمہیں (پھر قبروں سے) نکالا جائے گا ۲؎۔ یہ بات عقل سے بعید ہے بالکل بعید جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے ۳؎۔ نہیں ہے کوئی اور زندگی سوائے ہماری اس دنیوی زندگی کے یہی ہمارا مرنا ہے اور یہی ہمارا جینا۔ اور ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا ۴؎۔''

۱؎ وَلَئِنْ میں لام محذوف قسم کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَاللّٰہِ لَئِنْ اَطَعْتُمْ (قسم بخدا اگر تم پیروی کرنے لگے)

اپنے جیسے بشر کی تو تم تب نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے) اس طرح کہ تم اپنے ہم مثل کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنے کے سبب اپنے آپ کو ذلیل اور حقیر بنالو گے۔ وہ بھی عجیب قسم کے احمق' بیوقوف اور جاہل لوگ تھے کہ انہوں نے اپنے ہم مثل کی اتباع و پیروی اختیار کرنے سے تو انکار کیا لیکن ان سے بڑھ کر عاجز ترین پتھروں کی پوجا اور عبادت کرتے تھے۔ (اور اس طرح اپنی ذلت اور حقارت کا اظہار کرتے تھے)۔

ع اَيَعِدُكُمْ میں استفہام انکاری ہے یا استفہام تقریری ہے، یعنی وہ یقیناً تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مرجاؤ گے اور گوشت اور اعصاب سے خالی ہو کر مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تمہیں پھر قبروں سے زندہ کر کے نکالا جائے گا۔

نافع' حمزہ' کسائی اور حفص نے مَاتَ يَمَاتُ سے ماخوذ کر کے مِتُّم میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مَاتَ يَمُوتُ سے بنا کر میم کو ضمہ کے ساتھ مُتُّم پڑھا ہے۔

اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ میں اَنَّكُمْ پہلے اَنَّكُمْ کی تاکید کیلئے مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ پہلے اَنَّكُمْ اور اس کی خبر کے درمیان طویل فاصلہ پایا جارہا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی طرح قرأت کی ہے۔ ترکیب میں یہ بھی جائز ہے کہ اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ مبتدا مؤخر ہو اور ظرف مقدم اس کی خبر ہو۔ یا پھر اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ فعل مقدر کا فاعل ہے اور جواب شرط ہے۔ پھر مکمل جملہ پہلے اَنَّكُمْ کی خبر ہے۔ ان دونوں ترکیبوں میں تقدیر کلام اس طرح ہے اَنَّكُمْ اِخْرَاجُكُمْ وَاقِعٌ اِذَا مِتُّمْ یا اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَقَعَ اِخْرَاجُكُمْ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ پہلے اَنَّكُمْ کی خبر محذوف ہو کیونکہ دوسرے کی خبر اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور اَيَعِدُكُمْ کا جملہ نبوت کے بارے سابقہ طعن اور طنز کو مزید پختہ کرنے کے لئے انہوں نے کہا۔ یا پھر یہ جملہ ان کے سابقہ قول کی علت بیان کر رہا ہے کہ انہوں نے پہلے یہ کہا کہ اگر تم اپنی مثل اس بشر کی اطاعت وفرمانبرداری کرو گے تو بالیقین نقصان اٹھاؤ گے۔ (اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تو وقوع قیامت کا اعتقاد رکھتا ہے جس سے زندگی کی عیش وطرب ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجتاً خسارہ اور نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہے)۔

ع هَيْهَاتَ اسم فعل ہے۔ اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو وعدہ یہ تم سے کر رہا ہے اس کا وقوع پذیر ہونا بعید از عقل وتصور ہے۔ یا اس وعدہ کی تصدیق کرنا اور اس پر ایمان لانا انتہائی بعید ہے۔ دوسرا هَيْهَاتَ پہلے کی تاکید کے لئے ہے۔ ترکیب کلام میں لِمَا تُوْعَدُوْنَ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی یہ بعد اور دوری اس چیز کی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے کلمہ استبعاد (هَيْهَاتَ) زبان سے کہا تو ان (سرداروں) سے یہ پوچھا گیا یہ بعد اور دوری کس شئی کے لئے ہے؟ (یعنی کونسی شئی بعید از عقل و تصور ہے) تو انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہا لِمَا تُوْعَدُوْن۔ (یعنی وہ شئی بعید از عقل ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لِمَا تُوْعَدُوْن میں لام زائدہ بیانیہ ہو۔ اور ما موصول اپنے صلہ سمیت هَيْهَاتَ کا فاعل ہو۔ جیسا کہ هَيْتَ لَكَ میں لام زائدہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ هيهات مصدر بمعنی بُعد مبتدا ہے۔ اور لِمَا تُوْعَدُوْن اس کی خبر ہے۔ یعنی دوری ہے اس بات کے لئے جو تم سے کہی جارہی ہے۔

جمہور نے هَيْهَاتَ میں تاء کو مبنی برفتحہ پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے تاء کو کسرہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ اور تنوین کے ساتھ بھی مکسور پڑھا گیا ہے۔ اور تاء کو تنوین کے ساتھ مضموم بھی۔ اس بناء پر کہ یہ هيهة کی جمع ہے۔ اور اسے قَبْلُ اور بَعْدُ کے مشابہ قرار دے کر تنوین

کے بغیر پڑھا گیا ہے۔ اور اس کی ایک قرأت سکون کے ساتھ بھی ہے۔ اس لئے کہ اس پر وقف کیا گیا ہے۔ اور تا کو ھاء وقف کے ساتھ بدل دیا گیا ہے۔ اکثر قرأ نے اس میں تاء کے ساتھ ہی وقف کیا ہے۔ اور هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْن جملہ معترضہ ہے۔

۶؎ اِن ھیَ میں اِنْ نافیہ ہے۔ اور ھیَ ضمیر سے مراد جنس حیات ہے۔ یعنی وہ دنیوی زندگی جس میں ہم ہیں اور جو ہمارے قریب ہے اس کے سوا ہمارے لئے کوئی زندگی نہیں۔ پہلی بار حیٰوۃ کے قائم مقام ھیَ ضمیر کو رکھا گیا ہے۔ کیونکہ دوسری بار حَیَاتُنَا الدُّنْیَا کا مذکور لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور یہ اس لئے ہے تا کہ لفظ کا تکرار لازم نہ آئے۔ اور اس بات پر مطلع کرنے کے لئے ہے کہ اس کی تعیین کے سبب اسے صراحۃً ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ ھیَ ضمیر الحیٰوۃ کے معنی میں ہے اور یہ جنس پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے اس سے قبل اِنْ نافیہ لانفی جنس کی طرح جنس کی نفی کے لئے ہے۔

نَمُوْتُ وَ نَحْیَا کا معنی ہے کہ ہم میں سے بعض مرتے ہیں اور بعض زندہ ہوتے ہیں۔ (یعنی پیدا ہوتے ہیں) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ وہ لوگ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے تھے۔ (اس لئے یہ معنی نہیں ہو سکتا کہ ہم مرتے ہیں اور ہم زندہ ہوں گے) لہٰذا کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی نَحْیٰی وَ نَمُوْتُ کہ ہم زندہ ہوتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں(1)۔ اس قول کا دار و مدار اس بات پر ہے جبکہ جمع متکلم کی ضمیر سے مراد تمام لوگ ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر جمع متکلم کی ضمیر سے مراد تمام لوگ بھی لئے جائیں تب بھی یہاں تقدیم و تاخیر کا قول کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ واؤ مطلق جمع کے لئے آتی ہے نہ کہ ترتیب کے لئے۔ پس معنی یہ بنتا ہے کہ دنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے لئے موت و حیات ثابت ہے۔ اور ان کے لئے اس دنیوی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں۔ اور ہمیں موت کے بعد دوبارہ نہیں اٹھایا جائیگا۔ ترکیب کلام میں وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْن یا حال بن رہا ہے یا معطوف ہے۔ (یعنی واؤ یا حالیہ ہے یا عاطفہ ہے)

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ٰافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾

"وہ نہیں مگر ایسا شخص جس نے بہتان لگایا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اور ہم تو قطعاً اس پر ایمان نہیں لائیں گے [1] اس پیغمبر نے کہا میرے رب! اب تو میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے [2] اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب ہی یہ لوگ اپنے کئے پر نادم ہو جائیں گے [3] تو آ پکڑا انہیں حقیقی چنگھاڑ نے تو ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا تو برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے [4]"

[1] وہ شخص جو یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہوں اور ساتھ ہی موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا وعدہ کر رہا ہے وہ اپنے قول میں جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بہتان لگا رہا ہے۔ لہٰذا ہم تو قطعاً اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔ یہ جملہ ان کے قول مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ کی تاکید کے لئے ہے۔

[2] اس پیغمبر نے اپنے رب کی بارگاہ میں التجاء کی۔ اے پروردگار! انہوں نے میری تکذیب کر دی ہے انہوں نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 147 (الفکر)

ان کے خلاف میری مدد فرما۔ اوران سے مجھے جھٹلانے کا انتقام لے۔(یعنی ان پرعذاب نازل فرما)

۲؎ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب جونہی یہ خواب دیکھیں گے تو یہ اپنے عمل (تکذیب کرنے) پر نادم ہو جائیں گے۔ عَمَّا قَلِيلٍ میں ما زائدہ، یعنی قلت کی تاکید کے لئے ہے۔ یا مانکرہ موصوفہ بمعنی شئی ہے۔ اور قلیل اس کی صفت ہے۔ مقصود قلیل زمانہ ہے۔

۳؎ بعض نے کہا ہے کہ صیحۃ سے مراد ہلاکت ہے۔ قاموس میں ہے کہ صیحۃ اور صیاح سے مراد پوری قوت اور طاقت کے ساتھ آواز کو بلند کرنا ہے۔ یعنی چیخ مارنا ہے۔ صِيحَ بِهِمْ کا معنی ہے انہیں پریشان کردیا گیا۔ انہیں گھبرا دیا گیا۔ اور صِيحَ فِيهِمْ کا معنی ہے وہ ہلاک و برباد ہوگئے (۱)۔ اور الصیحۃ کا معنی عذاب بھی ہے۔ اگر یہ قصہ قوم عاد کا ہے تو یہاں صیحۃ سے مراد عذاب ہے۔ اور اگر قوم ثمود کا واقعہ ہے تو پھر صیحۃ سے مراد چیخ ہے۔ ہم نے ان کا قصہ سورہ اعراف میں ذکر کیا ہے۔ کہ ان پر آسمان سے ایک چیخ آئی اس میں بادلوں کی کڑک بھی تھی اور زمین میں موجود ہر شئی کی آواز بھی تھی۔ پس اس کے سبب ان کے دل پھٹ گئے۔

بِالْحَقِّ سے مراد یہ ہے کہ وہ چیخ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا دفاع یا انکار ممکن نہیں۔ یا معنی ہے کہ وہ چیخ عین عدل وانصاف کے مطابق تھی۔ جیسے تیرا یہ قول فلان يقضي بالحق۔ (فلاں عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے) یا مفہوم یہ ہے کہ وہ چیخ سچے وعدہ کے مطابق تھی۔

فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً کا معنی ہے تو ہم نے انہیں خس وخاشاک بنادیا۔ ہم نے انہیں اس طرح ہلاک کردیا گویا کہ وہ سیلاب کے ساتھ بہہ کر آنے والے خس وخاشاک کی مثل ہوگئے۔ جو شخص ہلاک ہو جائے تو اس کے لئے عرب بولتے ہیں سال به الوادی۔ (وادی کا سیلاب اسے بہالے گیا)

یہ جملہ خبریہ بننے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ (کہ ظالمین کی قوم ہلاک ہوگئی) اور جملہ دعائیہ بننے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ یعنی برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے۔ اس میں بُعْدًا بَعُدَ بمعنی هَلَكَ کا مصدر ہے۔ اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کے فعل کو استعمال میں مضمر کرنا واجب ہوتا ہے۔ اور یہ افعال کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ اور لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ اس مصدر کا فاعل ہے جو فعل کے قائم مقام ہے۔ اس میں لام زائدہ ہے۔ یا پھر مصدر کے عمل کو تقویت پہنچانے کے لئے ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے اعجبنی جلوس لزید و قیام لعمرو۔ نیز علت بیان کرنے کیلئے ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر الظّٰلِمِيْنَ ذکر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

'' پھر ہم نے پیدا فرمائیں ان (کی بربادی) کے بعد کئی قومیں ۱؎ آگے نہیں بڑھ سکتی کوئی قوم اپنی مقررہ معیاد سے اور نہ وہ لوگ پیچھے رہ سکتے ہیں ۲؎ پھر ہم بھیجتے رہے اپنے رسول یکے بعد دیگرے ۳؎ جب بھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا ۴؎ پس ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو ہلاک کرتے گئے اور ہم نے (ان جابر) قوموں کو افسانے بنادیا' پس خدا کی پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لائی ۵؎ ''

۱؎ ترکیب کلام میں ثُمَّ اَنْشَاْنَا کا عطف جَعَلْنَا هُمْ غُثَآءً پر ہے۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے مراد ہے قوم عاد کے بعد۔ اور قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ سے

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 347 (التراث العربی)

مراد حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی اقوام ہیں۔

۲۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ میں مِن زائدہ استغراق کے لئے ہے اور اُمَّةٍ فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ اَجَلَهَا سے مراد ان قوموں کی ہلاکت اور بربادی کا مقررہ وقت ہے۔ یعنی کسی قوم کی تباہی اور ہلاکت کے لئے جو وقت مقرر کیا گیا ہے اس سے قبل کوئی قوم ہلاک نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ اپنے مقررہ وقت سے پیچھے رہ سکتی ہے، یعنی وہ ہلاکت کے مقررہ وقت کے بعد زندہ باقی نہیں رہ سکتی۔ معنی کے اعتبار سے تانیث کے بعد ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

۳۔ پھر ہم یکے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجتے رہے۔ تَتْرًا اصل میں وَتْرٰی ہے۔ اور یہ الوتر (طاق) سے ماخوذ ہے جو کہ شفع (جفت) کی ضد ہے۔ پھر واؤ کو تاء سے تبدیل کر دیا گیا۔ جیسا کہ تراث اور تقویٰ میں کیا گیا۔ ترکیب کلام میں تَتْرَا اَرْسَلْنَا کے مفعول سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

ابوجعفر، ابن کثیر اور ابوعمرو نے تَتْرًا کو وصل کلام میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حالت وقف میں تنوین کی بجائے الف کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اسی لئے ابوعمرو اس میں امالہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک اس کے آخر میں الف اسی طرح ہے جیسے حالت نصبی میں زیدًا کا الف ہوتا ہے تَتْرًا مصدر ہے اور تواتر اور مواترۃ کے معنی میں ہے اور اس سے مراد چیزوں کا فرداً فرداً ایک دوسرے کے پیچھے ہونا ہے۔ جبکہ یہ آپس میں جمع نہ ہوں۔ قاموس میں ہے کہ تواتر کا معنی تتابع ہے یعنی چیزوں کا پے در پے ہونا، مسلسل ہونا۔ (بغیر کسی انقطاع کے) یا انقطاع کے ساتھ۔ اور وَاترٌ مواترۃ اور وِتارًا کا معنی ہوتا ہے تابع۔ وہ مسلسل یکے بعد دیگرے آئے۔ کیونکہ چیزوں کے مابین تب تک مواترت ثابت ہی نہیں ہوتی جب تک ان کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ واقع نہ ہو۔(1) یعنی بعض لوگوں نے تواتر کے معنی میں چیزوں کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ ہونے کا اعتبار کیا ہے۔ (یعنی تواتر کے اثبات کے لئے ان کے مابین اتصال اور التصاق نہیں ہونا چاہئے) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے "لَا بَأْسَ بِقَضَاءِ رَمَضَانَ تَتْرٰی" یعنی رمضان المبارک کے قضا روزے متفرق طور پر بغیر تسلسل کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح نہایہ میں ہے۔(2)

اصمعی نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے واترت الخبر۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب خبریں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد موصول ہوں اور ہر دو خبروں کے درمیان کچھ وقفہ ہو۔(3)

میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر میں یہ شرط ہے کہ وہ ایسی مختلف اور متفرق اسناد اور ایسے راویوں سے مروی ہو جو آپس میں جمع نہ ہوں۔ اس طرح کہ ان کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کا احتمال نہ ہو۔

اکثر قراء نے تترٰی بروزن سکریٰ تانیث بالالف المقصورہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں ایک سبب تانیث اور دوسرا تانیث کا اسے لازم ہونا ہے۔ تانیث کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ رُسُلُ سے مراد جماعت ہے۔ ترکیب کلام میں ثُمَّ اَرْسَلْنَا قول باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنَا پر معطوف ہے۔ اس میں جمع کا مقابلہ جمع سے کیا گیا ہے۔ مگر اس سے مراد جمع کی ایک اکائی کو دوسری جمع کی ایک اکائی کے مقابل لانا ہے۔ پھر ثم برائے تراخی کا ذکر صحیح ہوگا۔ گویا یہ فرمایا کہ پھر ہم نے ایک قوم کو پیدا کیا اور اس کی راہنمائی کے لئے ایک رسول بھیجا۔ پھر ایک دوسری قوم کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے لئے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پس مکمل

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 679 (التراث العربی)　2۔ النہایۃ، جلد 1، صفحہ 181 (العلمیۃ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 148 (الفکر)

ترتیب اسی طرح ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کے بعد یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا کہ پہلے ہم نے بہت سی امتوں کو پیدا کیا اور ان تمام قوموں کے بعد ہم نے رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ (یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے)

۴؎ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ جب رسول کو بھیجنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل (بھیجنے والے) کی طرف ہوتی ہے۔ اور جب رسول کے آنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل الیھم (جن کی طرف رسول کو بھیجا جاتا ہے) کی طرف ہوتی ہے۔ کیونکہ رسول کے بارے میں اسے بھیجنا مبداء اور بنیاد ہے۔ (اس لئے اسے بھیجنے کی نسبت بھیجنے والے کی طرف ہی ہونی چاہئے) اور اس کا آنا اور پہنچنا اس کے معاملہ کے لئے منتہاء ہے۔ (لہٰذا اس کی نسبت مرسل الیھم کی طرف ہی ہونی چاہئے)
چونکہ ان میں سے اکثر نے رسول کی تکذیب کی۔ اس لئے جھٹلانے کی نسبت تمام کی طرف کر دی۔ کیونکہ اکثر کے لئے کل کا حکم ہی ہوتا ہے۔ (اگرچہ ان میں سے بعض ایمان بھی لے آئے تھے) یہ جملہ مستانفہ ہے۔

۵؎ پس ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو اسی طرح ہلاک کرتے گئے جیسے ہم نے انہیں یکے بعد دیگرے پیدا کیا۔ اور پھر فرداً فرداً مسلسل ان کی طرف رسول مبعوث فرمائے۔ فَاَتْبَعْنَا کا عطف کَذَّبُوْهُ پر ہے۔

اور ہم نے ان قوموں کو افسانے بنا دیا۔ یعنی ہم نے سوائے حکایات اور کہانیوں کے ان کا کوئی اثر باقی نہ رہنے دیا۔ وہ فقط افسانے بن گئے جنہیں لوگ بطور قصہ بیان کرتے ہیں۔ اور عبرت پکڑنے والے لوگ ان سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اَحَادِیْث احدوثہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ افسانہ اور کہانی ہوتی ہے جسے لوگ بطور لہو ولعب اور تعجب کے بیان کرتے ہیں۔

اخفش نے کہا ہے کہ احدوثہ اور احادیث کا کلمہ شر کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ خیر کے محل میں یہ نہیں کہا جاتا جعلتھم احادیث واحدوثۃ۔ (میں نے انہیں افسانے اور داستان بنا دیا ہے) بلکہ اس طرح کہا جاتا ہے صار فلان حدیثا۔ (کہ فلاں آدمی (ایک یادگار) واقعہ ہو گیا)(1)۔

بعض نے کہا ہے کہ احادیث حدیث کی اسم جمع ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے احادیث النبی ﷺ

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ خدا کی پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو رسولوں کے ساتھ ایمان نہیں لائی اور نہ ان کی تصدیق کی۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ ﴿۴۶﴾ۚ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ۚ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِیْنَ ﴿۴۸﴾

"پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر ۱؎ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے بھی غرور و تکبر کیا اور وہ لوگ بڑے سرکش تھے ۲؎ تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں ان دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں، حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی برباد ہونے والوں میں شامل ہو گئے ۳؎"

۱؎ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى کا عطف ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا پر ہے۔ هٰرُوْنَ اَخَاهُ سے بدل ہے۔ بِاٰیٰتِنَا سے مراد نو نشانیاں ہیں اور سُلْطٰنٍ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 148 (الفکر)

مُّبِیْن سے مراد واضح دلیل ہے جو خصم، یعنی مدمقابل کو خاموش ہونے پر مجبور کردے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا مبارک ہو۔ اور اسے انفرادی طور پر علیحدہ اس لئے ذکر کیا گیا کیونکہ سب سے پہلا معجزہ یہی تھا۔ اور دیگر مختلف معجزات اس سے متعلق تھے۔ مثلاً یہ اژدھا کی صورت میں تبدیل ہوا' جادوگروں نے جن رسیوں کو سانپ بنا کر پھینکا تھا اس نے انہیں نگل لیا' سمندر پر لگا تو وہ پھٹ گیا (اور اس سے راستے بن گئے)' پتھر پر لگا تو اس سے چشمے جاری ہوگئے' کسی مقام پر پڑاؤ کے وقت یہ محافظ کا کام بھی کرتا تھا' رات کی تاریکی میں شمع کی مثل روشنی دیتا' پھلدار درخت بھی بنا اور پانی نکالنے کے لئے یہ رسی اور ڈول کا کام بھی دیتا۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ سے مراد معجزات ہوں۔ اور آیات سے مراد دلائل ہوں۔ اور دونوں سے بھی مراد معجزات لئے جاسکتے ہیں کیونکہ معجزات نبوت کی علامات اور نشانیاں ہوتے ہیں۔ اور نبی جو دعویٰ کررہا ہوتا ہے معجزہ اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہے۔

۲۔ فَاسْتَكْبَرُوْا کا معنی ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے ایمان لانے اور رسول مکرم کی متابعت اور پیروی اختیار کرنے سے غرور وتکبر کیا۔ اور وہ لوگ بڑے سرکش تھے۔ لوگوں پر غرور وتکبر کے سبب اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے۔ اور ان پر طرح طرح کے ظلم وستم اور جبر کیا کرتے تھے۔

۳۔ تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں ان دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں؟ اَنُؤْمِنُ میں استفہام انکاری ہے۔ یعنی ہم ان کی نبوت وفضیلت کا نہ اعتراف کرتے ہیں نہ اسکی تصدیق کرتے ہیں۔

لِبَشَرَیْنِ کہا۔ کیونکہ لفظ بشر کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ اسی طرح اس کا اطلاق جمع پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے یہ ارشاد ہے فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا۔

مِثْلِنَا لفظ مثل کو تثنیہ ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ مصدر کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور لفظ مثل اور غیر کے ساتھ واحد' تثنیہ' جمع' مذکر اور مؤنث تمام کی صفت لگائی جاسکتی ہے۔

وَقَوْمُهُمَا سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اور لَنَا عٰبِدُوْنَ سے مراد اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے اور غلامی اور خدمت کرنے والے لوگ ہیں۔ جو کوئی کسی کا مطیع وفرمانبردار اور خدمتگار ہوتا عرب اس کے لئے کہتے انه عابد له۔ (یہ تو اس کا غلام ہے) ترکیب کلام میں وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ کا جملہ نُؤْمِنُ کے فاعل سے حال ہے۔ یا لِبَشَرَیْنِ سے یا لَهُمَا (یعنی موسیٰ و ہارون) سے حال ہے۔

فَكَذَّبُوْهُمَا کا عطف اَرْسَلْنَا پر ہے۔

فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِیْنَ کا مفہوم ہے کہ وہ بھی غرق ہوکر برباد ہونے والوں میں شامل ہوگئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۞ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۞

''اور بیشک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تا کہ (ان کی قوم) ہدایت یافتہ ہوجائے ۱۔ اور ہم نے بنادیا مریم کے فرزند اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کی) نشانی ۲۔ اور انہیں بسایا ایک بلند مقام پر جو رہائش کے قابل تھا اور جہاں چشمے جاری تھے۔ ۳۔''

۱۔ اور بیشک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی۔ یہاں کتاب سے مراد تورات ہے۔ تا کہ ان کی قوم معارف واحکام سیکھ کر ہدایت

یافتہ ہو جائے۔ لَعَلَّهُمْ میں ھم ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کی قوم کی طرف راجع ہے۔ (یعنی اس کا مرجع قَوْمُهُمَا ہے) فرعون اور اس کی قوم کی طرف اس ضمیر کا لوٹنا جائز نہیں۔ کیونکہ توریت انہیں غرق کئے جانے کے بعد نازل ہوئی تھی۔

۲ے اور ہم نے مریم کے فرزند اور اس کی ماں (مریم) کو اپنی قدرت کی نشانی بنا دیا۔ اس طرح کہ حضرت مریم نے اپنے فرزند کو کسی مرد کے چھونے اور قربت اختیار کرنے کے بغیر جنم دیا۔ چونکہ یہ نشانی یعنی ولادت امر واحد ہے اس لئے لفظ اٰیۃ واحد ذکر کیا۔ اور اس کی نسبت دونوں کی طرف کر دی۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ اٰیۃً اِبْنَ مَرْیَمَ کے بعد مقدر ہے۔ یعنی ہم نے مریم علیہا السلام کے فرزند کو اپنی قدرت کی نشانی بنا دیا، اس طرح کہ اس نے پنگھوڑے میں گفتگو کی اور علاوہ ازیں اس سے کئی معجزات ظاہر ہوئے۔ اور اس کی ماں مریم کو بھی نشانی بنایا، اس طرح کہ اس نے مرد کی قربت اختیار کئے بغیر اپنے بچے کو جنم دیا۔ پھر پہلے اٰیۃ کو حذف کر دیا۔ کیونکہ دوسرا اس پر دلالت کر رہا ہے۔

رَبْوَہ کا معنی ہے زمین کا بلند مقام۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ یہ مقام دمشق ہے حضرت سعید بن المسیب اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد غوطہ (۱) دمشق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے اس سے مراد رملہ ہے۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیت المقدس نقل کیا ہے۔ یہی قول قتادہ اور کعب کا بھی ہے۔ کعب نے کہا کہ رَبْوَہ کا حصہ دوسری زمین کی نسبت اٹھارہ میل آسمان کے زیادہ قریب ہے۔ ابن زید نے کہا ہے اس سے مراد مصر ہے۔ اور سدی نے کہا ہے اس سے مراد سرزمین فلسطین ہے (1)۔ ذَاتِ قَرَارٍ سے مراد ہموار اور وسیع زمین ہے جس پر رہائش اختیار کرنے والے قرار حاصل کر سکیں۔ بعض نے کہا اس سے مراد پھلوں اور اناج کی زمین ہے جن کے سبب لوگ وہاں رہائش پذیر ہوتے ہوں۔ اور مَعِیْنٍ سے مراد ہے ظاہراً جاری پانی۔ یہ فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے اور معن الماء سے ماخوذ ہے۔ جب پانی جاری ہو جائے تو کہا جاتا ہے مَعَنَ المعاد۔

یا پھر یہ ماعون سے بنایا گیا ہے اور اس کا معنی ہے منفعت اور فائدہ۔ اور پانی بھی انتہائی نفع بخش چیز ہے اس لئے اسے معین کیا گیا ہے۔ یا یہ عان سے اسم مفعول ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھ سے کسی شئی کا مشاہدہ کرنا۔ چونکہ (سرزمین) ربوہ بھی اپنے بلند اور ظاہر ہونے کے سبب آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے اس لئے اسے معین کیا گیا۔

يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾

"اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ ۱ے اور اچھے کام کرو بیشک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں ۲ے اور یہی تمہارا دین ہے (اور) وہ ایک ہی ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں سو تم ڈرا کرو مجھ سے ۳ے"

۱ے الطَّيِّبٰتِ سے مراد حلال چیزیں ہیں۔ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ کا امر وجوب کے لئے ہے، کیونکہ یہ درحقیقت حرام کردہ چیزوں کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر)

(۱) غوطہ کا معنی ہے زمین کا انتہائی گہرا اور نشیبی حصہ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ غوطہ دمشق کے قریب ایک شہر کا نام ہے۔ مجمع البحار کے مؤلف نے بھی یہ کہا ہے کہ غوطہ دمشق کے قریب باغات اور چشموں کا نام تھا۔

کھانے سے منع کرنے کے معنی میں ہے۔ یا پھر یہ مباح اشیاء میں سے لذیذ اور راحت بخش چیزیں تناول کرنے کے بارے میں ہے اور اس صورت میں یہ امر استحباب کے معنی میں ہوگا۔ اور حلال اور پاکیزہ چیزیں چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرنے کی تردید کے لئے ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ طیبات سے مراد حلال' صاف اور قوام اشیاء ہیں۔ حلال تو حرام کی ضد ہے۔ مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ لازم نہ آئے۔ صافی سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو اللہ تعالیٰ کی یاد بھلا نہ دیں۔ یہ ان چیزوں کی ضد ہے جو انسان کو غافل کر دیتی ہیں۔ اور شہوات نفسانیہ میں مستغرق کر دیتی ہیں۔ اور قوام سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو خواہش نفس (کے غلبہ) کو روکتی ہیں' عقل اور دیگر قویٰ کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ پیٹ بھرنے سے زائد مقدار ہونے کی ضد ہے۔ (یعنی انسان اتنا نہ کھائے کہ پیٹ بھرنے سے بھی اس کی مقدار بڑھ جائے۔ کیونکہ اتنی زائد مقدار عقل اور دیگر اعضائے بدنیہ کے لئے نفع کی بجائے نقصان دہ ہوتی ہے)

1۔ اعمال صالحہ سے مراد ایسے اعمال ہیں جو خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اس کے حکم کے عین مطابق کئے جائیں۔ اور ان میں شرک جلی اور خفی کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی ضد اعمال فاسدہ ہیں، یعنی ایسا قول یا فعل جسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہو۔ (اس کے حکم کے مطابق نہ ہو وہ عمل فاسد ہوگا)

کلام کے شروع میں قول مقدر ہے، یعنی قلنا لھم یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ الایۃ ۔ یہ درحقیقت اس خطاب کا خلاصہ اور بیان ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے اپنے زمانے میں انفرادی طور پر فرمایا گیا۔ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یہ خطاب ایک ہی بار اجتماعی طور پر فرما دیا گیا۔

حسن' مجاہد' قتادہ' سدی' کلبی اور علماء کی ایک پوری جماعت کا یہ موقف ہے کہ یہ خطاب صرف حضور نبی کریم محمد ﷺ کو ہے اور عرب کے طریقہ کے مطابق ایک ذات کو لفظ جمع کے ساتھ خطاب فرمایا گیا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا سبب آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر کا اظہار کرنا ہے اور اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آپ اپنی فضیلت و شان میں پوری جماعت کے قائم مقام ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کو تمام لوگوں کی جانب رسول بنا کر بھیجا گیا۔

اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس خطاب میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی امت کے علماء بھی شامل ہوں۔ کیونکہ علماء رسول معظم ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان ایک برزخی تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ رسول معظم ﷺ اللہ تعالیٰ اور علماء امت کے مابین برزخی تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ (2)۔ علماء انبیاء علیہم السلام کے (علوم کے) وارث ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا۔ جبکہ وہ اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ ربوۃ میں سکونت پذیر ہوئے۔ تو ان دونوں کو وہی خطاب فرمایا گیا جو ان سے قبل انبیاء علیہم السلام کو ہر زمانے میں علیحدہ علیحدہ خطاب کیا گیا۔ تاکہ یہ دونوں بھی رزق کے حصول اور کھانے کے تناول کرنے میں ان انبیاء و رسل علیہم السلام کی اقتداء و پیروی کریں۔ قصہ کا سیاق و سباق یہی تقاضا کرتا ہے کہ یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ محترمہ کو بھی ہو۔

اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ کا معنی ہے کہ میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں۔ لہٰذا میں ان کے مطابق ہی تمہیں جزا دوں گا۔ یہ جملہ محل تعلیل میں واقع ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 50-149 (الفکر)   2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 93 (وزارت تعلیم)

سے بیشک حلال اور طیب چیزیں کھانا اور اعمال صالحہ کرنا ہی تمہارا وہ دین اور شریعت ہے جس پر تم سب قائم ہو۔ کوفیوں نے اِنَّ کے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ جملہ کُلُوْا فعل کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں واقع ہے۔ یا پھر یہ سابقہ جملہ پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی مقدر قُلْنَا کا مقولہ ہے۔ اور باقیوں نے اَنَّ کے ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ترکیب کلام میں یا تو اس کا عطف مَا تَعْمَلُوْنَ پر ہے یا پھر اس سے پہلے لام مقدر ہے یعنی اصل عبارت اس طرح ہے وَلِاَنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ۔ یا پھر اس سے پہلے اِعْلَمُوْا فعل مقدر ہے اور یہ اس کے سبب منصوب ہے۔ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً یہی تمہارا دین ہے (اور) وہ ایک ہی ہے۔ یعنی دین اسلام، عقائد اور اصول شریعت میں بنیادی طور پر متحد اور ایک ہے۔ اور فروعات میں عمل ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوا اور ان میں سے منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل ضروری ہے۔ ترکیب کلام میں امة و احدة امتكم کے لئے حال مؤکدہ ہے۔ جیسے اس جملہ میں ہے زید ابوک عطوفا۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ میں فاسببیہ ہے۔ یعنی تم مجھ سے ڈرا کرو کیونکہ میں تمہارا پروردگار ہوں۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾

”لیکن کاٹ کر بنا دیا انہوں نے اپنی دینی وحدت کو باہمی اختلاف سے پارہ پارہ۔ ہر گروہ اپنے نظریات پر مسرور ہے [1]

پس (اے محبوب!) رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں کچھ وقت تک [2]“

[1] یعنی وہ لوگ جن کے پاس انبیاء و رسل علیہم السلام کے سبب امور دینیہ ارسال کئے گئے۔ انہوں نے اس دین کو پارہ پارہ کر کے باہم تفرقہ ڈال لیا اور انہوں نے بنیادی اصول دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف ادیان بنا لئے۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے جو تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے۔ ہر دور میں یہی لوگ اہل حق تھے۔ بعض ایسے تھے جو بعض پر ایمان لائے اور بعض کو چھوڑ دیا۔ جیسے یہودی، عیسائی اور صابی وغیرہ۔ اور بعض ایسے تھے جنہوں نے تمام انبیاء اور ان کے لائے ہوئے دین کا انکار کر دیا مثلاً مجوسی (آتش پرست) اور بت پرست (مشرکین)۔

تَقَطَّعُوْٓا باب تفعل تفعیل کے معنی میں ہے۔ یعنی قَطَّعُوْٓا کے معنی میں ہے۔ (انہوں نے کاٹ دیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا) یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں متفرق ہو گئے اور گروہ گروہ بن گئے۔ اور انہوں نے ایک دین کے کئی ادیان بنا لئے۔ یہ تب ہو سکتا ہے جب کہ اَمْرَهُمْ سے پہلے فی حرف جار محذوف ہو۔ لہٰذا اَمْرَهُمْ حرف جار کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ یا پھر یہ ان کی طرف تفرقہ کی نسبت ہونے کے سبب تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور تَقَطَّعُوْٓا کی ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جن کی طرف انبیاء و رسل کو بھیجا گیا تھا اور ان کا ذکر مذکورہ قصص میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ۔ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا۔ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا۔ وغیر ذالک ترکیب کلام میں یہ جملہ اَرْسَلْنَا پر معطوف ہے۔

زُبُرًا کا معنی ہے پارہ پارہ، گروہ گروہ اور ٹکڑے ٹکڑے۔ یہ زبور کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے گروہ اور فرقہ۔ اسی سے زُبُرَ الحديد ہے (لوہے کے ٹکڑے) ترکیب کلام میں یہ مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یہ لفظوں میں فعل سے مختلف ہے۔ (یعنی یہ ہم معنی فعل ہونے کی بناء پر مفعول مطلق ہے [illegible] یا اَمْرَهُمْ سے حال ہے۔ یا تَقَطَّعُوْٓا کے فاعل سے حال ہے۔ یا پھر تَقَطَّعُوْٓا

جعل کے معنی کو متضمن ہے اور زبرًا اس کا مفعول ثانی ہے۔ یعنی انہوں نے اپنی دینی وحدت کو کاٹ دیا اور اسے پارہ پارہ بنا دیا۔
بعض نے کہا ہے کہ زُبُرًا کا معنی کتابیں ہیں یہ زَبَرْتُ الکتاب سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی کتاب جلی اور موٹے حروف میں لکھی جائے۔ ہر وہ کتاب جو جلی اور موٹے حروف میں لکھی جائے اسے زبور کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ایک کتاب کی صورت میں تھا۔ انہوں نے اپنے دین میں تحریف کر کے اس کی کئی کتابیں بنا ڈالیں۔ پس اس صورت میں تَقَطَّعُوْا کا مفعول ثانی ہوگا۔ یا اَمْرَهُم سے حال ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا در آنحالیکہ وہ آسمان سے نازل شدہ کتابوں کی شکل میں تھا۔ اور وہ دین کے بنیادی اصولوں میں متفق تھیں۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں۔ تو انہوں نے یہ کہا کہ ہم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔
حسن سے یہ معنی منقول ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس میں طرح طرح کی تحریف کر دی(1) ان میں سے ہر گروہ اپنے دینی نظریات یا خواہشات نفسانی پر ہی مسرور اور اترانے والا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہی حق پر ہے۔ ترکیب کلام میں كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ جملہ متانفہ ہے۔

2۔ پس اے محمد ﷺ! رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غَمْرَتِهِمْ کا معنی کفرهم وضلالتهم کیا ہے۔ یعنی انہیں اپنے کفر اور گمراہی میں رہنے دیجئے(2) بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے انہیں اپنی غفلت اور جہالت مرکبہ میں ہی رہنے دیجئے۔ (جہالت مرکبہ سے مراد ہے کسی چیز کو نہ جاننے کے باوجود جاننے کا دعویٰ کرنا) یہاں ان کی غفلت کو اس پانی سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں آدمی پوری قد و قامت کے ساتھ ڈوب جاتا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر اسے اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔
حَتّٰى حِيْنٍ سے مراد ان کے مرنے کے زمانے تک یا اس وقت تک کہ ہم آپ کو انہیں قتل کرنے کا حکم دیں، اس وقت تک انہیں اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ یعنی آپ ان کے فرقوں میں تقسیم ہونے اور کفر اختیار کرنے کے سبب غمزدہ نہ ہوں۔ کیونکہ ہم انہیں ضرور پکڑیں گے۔ یا تو اپنی جانب سے عذاب نازل کر کے یا پھر تمہیں ان کے خلاف قتال کی اجازت دے کر تمہارے ہاتھوں انہیں برباد کریں گے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾

''کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد کی کثرت سے تو ہم جلدی کر رہے ہیں انہیں بھلائیاں پہنچانے میں (یوں نہیں) بلکہ وہ (حقیقت حال سے) بے خبر ہیں 1۔ بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈر رہے ہیں 2۔ اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں 3۔''

1۔ جو لوگ اپنی ضلالت و گمراہی پر اظہار فرحت و مسرت کر رہے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی اتباع و پیروی نہیں کرتے بلکہ ان کی تکذیب کرتے ہیں اور جو کثیر مال و اولاد انہیں عطا فرما کر ہم ان کے لئے معاون و مددگار بنا رہے ہیں۔
نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ترکیب کلام میں اَنَّ کی خبر ہے۔ اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ اور پھر اَنَّ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ ملکر

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 20 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر)

یَحْسَبُوْنَ کے دومفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یہ استفہام توبیخ اور ان کے وہم وگمان کے رد کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کیا وہ یہ گمان کررہے ہیں کہ جو مال واولاد کثرت سے ہم انہیں دنیا میں عطا کر کے ان کے لئے مددگار بنارہے ہیں تو اس سے ہم انہیں خیر و برکت اور عزت واکرام عطا کررہے ہیں؟ یہ ان کے اعمال کا اجروثواب ہے اور یہ ان کے عقائد ونظریات کے ساتھ ہماری رضامندی اور خوشنودی کی علامت ہے اور یہی گمان ان کی فرحت ومسرت کا باعث ہے؟ (تو انہیں جان لینا چاہئے) کہ فی الحقیقت معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو حقیقت حال سے بے خبر ہیں (۱)۔ وہ چوپاؤں کی مانند ہیں ان میں نہ تو عقل ہے نہ شعور کہ وہ غوروفکر کرسکیں۔ انہیں یہ جاننا چاہئے کہ ان کے یہ اعمال اور عقائد نہ مستوجب ثواب ہیں اور نہ باعث رضا۔ بیشک یہ امداد تو ان کے خلاف ایک تدبیر ہے نہ کہ ان کے لئے منافع اور فوائد میں جلدی ہے۔ یہ آیت معتزلہ کے اس قول کے خلاف حجت ہے اَلْاَصْلَحُ لِلْعِبَادِ فِی الدِّیْنَ عَلَی اللّٰہِ وَاجِبٌ۔ (دین کے معاملہ میں بندوں کے لئے نفع بخش چیز عطا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے)

۲؎ بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈررہے ہیں، یعنی وہ ایسے اعمال سے بچتے ہیں جو عذاب الٰہی کا سبب بنتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ جو خشیت الٰہی سے متصف ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ کی سزا اور گرفت سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور یہ کہنا ممکن ہے کہ خشیت سے مراد ایسا عمل ہے جس کے سبب خشیت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کے عذاب سے ڈررہے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مومن نیکی اور خشیت کو جمع کرتا ہے، یعنی نیکی بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے رب سے ڈرتا بھی ہے اور منافق برائی اور امن کو جمع کرتا ہے یعنی برائی کرتا ہے اور ساتھ بے فکر بھی رہتا ہے(1)

۳؎ اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ آیات سے مراد قرآن کریم میں نازل ہونے والی آیات ہیں۔ یا آیات سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یؤمنون سے مراد ہے کہ وہ آیات اور علامات جن چیزوں پر دلالت کرتی ہیں وہ ان مدلولات پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں بناتے ۱؎ اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل ڈررہے ہیں (اس خیال سے) کہ وہ (ایک دن) اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں ۲؎ یہی لوگ جلدی کرتے ہیں بھلائیاں کرنے میں اور وہ بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں ۳؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر)

(۱) حسن بصری سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس کسریٰ بن ہرمز سے حاصل ہونے والا مال غنیمت لایا گیا اور آپ کے سامنے رکھ دیا گیا۔ آپ کے پاس حضرت سراقہ بن مالک موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسریٰ کے دو کنگن اٹھائے اور سراقہ کی طرف پھینک دیئے۔ سراقہ نے انہیں اٹھایا اور اپنے ہاتھوں میں پہن لیا۔ اور وہ آپ کے کندھوں تک پہنچ گئے۔ پس آپ نے کہا الحمد للہ کسریٰ بن ہرمز کے کنگن سراقہ بن مالک بن جعشم کے ہاتھوں میں ہیں جو بنی مدلج کا اعرابی ہے۔ پھر کہا اے اللہ! میں جانتا ہوں کہ تیرا رسول مال حاصل کرنے اور اسے تیرے راستے اور تیرے بندوں پر خرچ کرنے کا حریص تھا۔ میں نے بھی اسی لئے یہ اکٹھا کیا ہے۔ اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ یہ مال تیری جانب سے عمر کے لئے کوئی مکر ہو۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ

1۔ اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی غیر کو عبادت میں شریک نہیں بناتے۔ نہ وہ شرک جلی کرتے ہیں اور نہ شرک خفی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس آیت کا ماقبل آیت سے تکرار لازم نہیں آتا۔ کیونکہ (اس میں ایمان لانے کا ذکر ہے) اور اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کے ساتھ ایمان لانا عبادت میں کسی غیر کو اس کے ساتھ شریک کرنے کے منافی نہیں۔

2۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا کا معنی ہے کہ وہ صدقات وخیرات میں سے جو کچھ بھی دیتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ آپ یہ آیت کریمہ تلاوت فرماتیں يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا تو فرماتیں وہ جو نیک اعمال میں سے جو عمل کرتے ہیں(1)۔ (گویا آپ کے نزدیک اس سے مراد خیر اور نیکی کا ہر کام ہے) اس حال میں کہ ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں۔ (اس طرح کہ وہ یہ گمان کر رہے ہوتے ہیں ممکن ہے) ان کی جانب سے یہ صدقات و اعمال قبول نہ ہوں۔ یا یہ اس طرح وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں جیسے رب کریم کی بارگاہ کے لائق اور مناسب ہے۔ پس اسی کے سبب ان کا مؤاخذہ ہو جائے۔ یا خطاؤں کے کثیر ہونے اور عبادات و طاعات کے کم ہونے کی وجہ سے یہ انہیں عذاب الٰہی سے نجات دلانے کا سبب نہ بن سکیں۔

اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ حقیقۃً ماقبل کلام کی علت ہے یہ اصل میں لِاَنَّهُمْ تھا یعنی ڈرنے کی علت اور سبب یہ ہے کہ انہیں یہ خیال رہتا ہے کہ وہ ایک دن اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یا پھر اَنَّهُمْ سے قبل مِنْ محذوف ہے معنی یہ ہے کہ ان کے دل اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹ کر جانا ہے۔ اور وہ ان کے مخفی اور پوشیدہ اعمال سے بھی واقف و آگاہ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے طاعت وعبادات کے اعمال کرتے ہیں اور خوب کوشش یعنی عجز وانکساری سے بجالاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے اعمال کو مردود قرار دے کر واپس ہی نہ لوٹا دیا جائے۔(2)

حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔ کے بارے دریافت کیا۔ کیا یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں۔ اے صدیق کی لخت جگر! بلکہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو روزے رکھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، صدقات وخیرات کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ ڈر رہے ہوتے ہیں کہ کہیں یہ اعمال رد نہ کر دیئے جائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیاں کرنے میں تیزی کرتے ہیں۔ اسے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(3)۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس طرح روایت کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کہ آیت وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ کیا اس آدمی کے بارے میں ہے جو زنا کرتا ہے، شراب پیتا ہے؟ اور چوری کرتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اے صدیق کی لخت جگر! بلکہ یہ تو اس آدمی کے لئے ہے جو (رات کو) قیام کرتا ہے اور صدقات وخیرات کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کے قبول نہ ہونے کے بارے میں ڈرتا بھی رہتا ہے(4)۔

ترکیب کلام میں تمام موصولات ایک دوسرے پر معطوف ہو کر اِنَّ کا اسم ہیں۔ اسم موصول کو مکرر ذکر کیا گیا ہے لیکن صلات کو آپس میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم) 4۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 477 (العلمیہ)

ایک دوسرے پر عطف نہیں کیا گیا۔ تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ مذکورہ صفات میں ہر ایک بھلائی اور خیر کے ثبوت کے لئے مستقل ہے۔ اور اِنَّ کی خبر اُولٰٓئِکَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ طاعت وعبادت میں سود رجہ رغبت رکھتے ہیں۔ اور وہ اسے ادا کرنے میں انتہائی جلدی کرتے ہیں۔ تاکہ ان سے کوئی طاعت وعبادت ادا ہونے سے رہ نہ جائے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اخروی نعمتوں کو حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ جن کا وعدہ طاعات وعبادات جلدی بجالانے کی بنا پر کیا گیا ہے۔ یا وہ دنیوی نعمتوں کو حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں، جن کا وعدہ اعمال صالحہ تیزی سے کرنے کی بناء پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا یَرُدُّ الْبَلَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ(1)۔ یعنی مصیبت اور آزمائش دعا کے بغیر رد نہیں ہوتی اور عمر میں نیکی کے بغیر اضافہ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یہ آیت اس ارشاد گرامی کی طرح ہے فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ۔ پس ان کے لئے ایسے انعامات خداوندی ہوں گے جو ان کے متضاد اور مخالف افراد کو حاصل نہیں ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید خیرات سے مراد وہ بھلائیاں ہیں جنہیں دنیا میں حاصل کرنے کے لئے اہل ایمان تیزی کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرنا' اس کی یاد سے لطف اندوز ہونا' بقدر حاجت کھانے سے سیر ہو جانا' دنیوی نعمتوں کے زائل ہونے کا خوف نہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا اور نہ کوئی امید وابستہ رکھنا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بذریعہ الہام یا خواب ان پر مبشرات کا ورود بھی ہوتا رہتا ہے۔

ﷺ اور وہی بھلائیوں کی طرف سبقت لیجانے والے ہیں۔ یعنی وہ نیکیوں اور بھلائیوں کے سبب جنتوں کی طرف دوسرے لوگوں کی نسبت سبقت لے جانے والے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ طاعتوں کی طرف یا ثواب کے حصول کی طرف یا جنت کی طرف بڑھنے والے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں اور نعمتوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں جنہیں وہ آخرت سے قبل دنیا میں پاسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ انہیں جلدی عطا کر دی جاتی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لَهَا میں لام بمعنی الی ہے، یعنی وہ بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے لما نهوا عنه میں الی مانهوا عنه کے معنی میں ہے۔

کلبی نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ وہ تمام امتوں میں سے بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں(2) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سعادت وخوش بختی پہلے ہی (تقدیر میں) لکھی جا چکی ہے(3)۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَیْنَا كِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِیْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ یَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْیَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اور ہم تکلیف نہیں دیتے کسی شخص کو مگر جتنی اس کی طاقت ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ بولتی ہے اور ان

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 36 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 152 (الفکر) 3۔ ایضاً

پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا[1]۔ بلکہ ان کے دل مدہوش ہیں اس (خوفناک حقیقت) سے اور ان کے اعمال مومنوں کے اعمال سے مختلف ہیں۔ یہ (نابکار) ان برے کاموں کو ہی کرنے والے ہیں[2]۔ یہاں تک کہ جب ہم پکڑیں گے ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب سے اس وقت وہ چلائیں گے۔ (ظالمو!) آج نہ چلاؤ تمہاری ہماری طرف سے اب کوئی مدد نہ کی جائے گی[3]"

[1] لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا کا جملہ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں واقع ہے۔ معنی یہ ہے کہ بھلائیوں کے حصول کے لئے سرعت رفتار سے ان کا جدوجہد کرنا اپنے نفسوں کی پسند اور خوشدلی سے ہے۔ (جتنی زیادہ مشقت برداشت کرتے ہیں) اتنا زیادہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ہم ان کی طاقت سے بڑھ کر قطعاً انہیں تکلیف نہیں دیتے۔

وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ میں کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ یا وہ صحائف ہیں جن میں اعمال درج ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ بولتی ہے، یعنی وہ کہتی ہے جو فی الحقیقت ثابت اور متحقق ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کے اعمال ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ہم ان میں سے کسی شئی کو ضائع نہیں ہونے دیتے بلکہ ہر عمل پر اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یعنی ان کی نیکیوں میں کسی شئی کی کمی نہیں کی جائے گی اور ان کے گناہوں اور برائیوں میں کسی شئی کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ترکیب کلام میں قول باری تعالیٰ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ حال ثانی پہلے کے مرادف ہے۔ اور قول خداوندی اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ سے لے کر آخر تک کفار کے ذکر کے دوران اہل ایمان کے احوال بیان کرنے کے لئے جملہ معترضہ ہے۔

[2] بل قُلُوْبُهُمْ ارشاد باری تعالیٰ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ کے ساتھ متصل ہے۔ یعنی ان کفار کے دل جن میں کوئی عقل و شعور نہیں مدہوش ہیں۔ یعنی چھا جانے والی غفلت میں ہیں۔

مِنْ هٰذَا سے اشارہ اس طرف ہے کہ وہ اپنے عدم شعور کے سبب جس طرح شعور نہیں رکھتے اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں عقل و شعور نہیں ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ نفس شعور سے غافل ہیں۔ پس وہ جس طرح زمانہ حال میں شعور نہیں رکھتے اسی طرح مستقبل میں بھی وہ شعور سے عاری رہیں گے۔ کیونکہ ان میں اس انتہائی غفلت کے سبب شعور کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اس سے غافل ہیں کہ انہوں نے اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین کو چھوڑ دیا ہے اور اپنی خواہشات کے تقاضوں کے مطابق اسے ڈھال لیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ معنی ہے وہ اس قرآن سے غافل ہیں۔ لہٰذا ان کے اعمال برے ہیں۔ ناپسندیدہ ہیں جو یہ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ ان اعمال سے مختلف ہیں جن سے اہل ایمان متصف ہوتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر ان کے برے اعمال اس سے زائد ہیں۔

هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ یہ برے اعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ اعمال کی صفت ہے۔

[3] مُتْرَفِيْهِمْ کا معنی ہے خوشحال لوگ، آرام پسند لوگ۔ یعنی یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب سے پکڑیں گے، اس وقت وہ چلائیں گے۔ ابن جریر نے ابن جریج کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ اس عذاب سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا قتل ہونا ہے(1)۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ بھوک اور قحط ہے جس کی دعا ان کے لئے رسول اللہ

1۔ الدر المنثور، جلد 15، صفحہ 23 (العلمیہ)

ﷺ نے فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی تھی اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت سخت کر دے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قحط کی طرح ان پر قحط مسلط کر دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں قحط میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ کتے، مردار اور جلی ہوئی ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے (1)۔ ان کے خلاف یہ دعا صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

جئَر کا معنی ہے مدد طلب کرنے کے لئے آواز بلند کرنا 'چیخنا' چلانا۔ ترکیب کلام میں اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ جواب شرط ہے۔ یہ اذا مفاجاتیہ ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ پر قائم مقام جزائیہ کے ہے۔ آیت کے شروع میں حتیٰ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حتیٰ کا ماقبل اسکے مابعد کیلئے سبب ہے۔ اور یہاں بھی ان کی غفلت ان کے ہلاک ہونے اور مدد کے لئے چیخنے چلانے کا سبب ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ماقبل مابعد کے لئے سبب ہے۔ مَرِضَ فُلَانٌ حَتّٰى لَا يَرْجُوْنَهٗ (فلاں بیمار ہوا یہاں تک کہ انہیں اس کے (زندہ بچنے کی) امید تک نہ رہی۔)

ترکیب کے اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ اِذَا اَخَذْنَا سے بدل ہے۔ اور جواب شرط قول باری تعالیٰ لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ ہے۔ کیونکہ اس سے قبل قول مقدر ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے قِيْلَ لَهُمْ لَا تَجْئَرُوْا (ان سے کہا جائے گا ظالمو!) آج نہ چلاؤ۔ پہلی تاویل کے مطابق یہ جملہ مستانفہ ہے۔

اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ نہی کی علت ہے۔ یعنی تم نہ چلاؤ، کیونکہ چلانا تمہارے لئے نفع بخش نہیں ہوگا اور نہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد اور معاونت حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دفاع ممکن نہیں ہوتا۔ مگر اس کے لئے جس کی مدد اور نصرت ہماری جانب سے کی جائے۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾

"(وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں اور تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جایا کرتے تھے[1] غرور و تکبر کرتے ہوئے (پھر صحن حرم میں) تم داستان سرائی کیا کرتے تھے اور قرآن کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے[2]۔ کیا انہوں نے کبھی تدبر نہ کیا قرآن میں[3]۔ یا آئی تھی ان کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی ان کے پہلے آباؤ اجداد کے پاس[4]"

[1] اٰيٰتِيْ سے مراد قرآن کریم میں نازل شدہ آیات طیبات ہیں۔ النکوص کا معنی ہے الٹے پاؤں واپس لوٹنا۔ معنی یہ ہے (کہ وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں واپس لوٹ جایا کرتے تھے۔ یعنی انہیں سننے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے پیٹھ پھیر کر اعراض کر لیا کرتے تھے۔ یہ جملہ قول باری تعالیٰ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ کی علت بیان کر رہا ہے۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ کا معنی ہے کہ تم حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع کرنے اور آپ ﷺ پر ایمان لانے سے غرور و تکبر کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو دوسرے تمام لوگوں سے برتر اور اعلیٰ خیال کرتے تھے۔ بہٖ ضمیر کا مرجع کلام میں مذکور نہیں اور وہ ہے الحرم۔ یعنی تم یہ کہہ کر اظہار فخر و تکبر کرتے تھے کہ ہم حرم کے باسی ہیں اور بیت اللہ کے جوار میں رہنے والے ہیں۔ کوئی بھی ہمارے اوپر غالب نہیں آ سکتا اور نہ ہم کسی سے خوفزدہ ہوتے ہیں (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' مجاہد اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔

چونکہ بیت اللہ شریف کے سبب ان کا فخر و تکبر کا اظہار کرنا بہت زیادہ مشہور تھا، اس لئے مرجع کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ ضمیر کا مرجع اٰیٰتِیْ ہے۔ (آیات تو جمع بالالف والتا مونث ہے اور اس کی طرف لوٹنے والی ہ ضمیر واحد مذکر ہے۔ پھر اس کی طرف یہ ضمیر کیسے لوٹ سکتی ہے؟) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے آیات بمعنی کتاب ہے اور چونکہ مستکبرین مُکَذِّبِیْنَ کے معنی کو متضمن ہے۔ اس لئے باء مستکبرین کے متعلق ہے۔ یا اس لئے کہ مسلمانوں پر ان کا اظہار تکبر و غرور کرنا سماعت قرآن کے سبب ہی پیدا ہوا تھا۔ اور ترکیب کلام میں مستکبرین تنکصون کے فاعل سے حال ہے۔ اسی طرح سٰمِرًا بھی اسی فاعل سے حال ہے یا مستکبرین کے فاعل سے حال ہے، یعنی حال کو اتنکم تَسْمِرُوْنَ۔ یعنی تم رات کے وقت بیت اللہ شریف کے ارد گرد اپنی مجالس جما کر قصے کہانیاں بیان کرتے رہتے ہو۔

۲؎ سمر کا معنی ہے رات کے وقت قصے کہانیاں سنانا۔ اور سامر اس سے اسم جمع ہے۔ جیسے باقر بقر کے لئے اور جامل جمل کے لئے اسم جمع ہے۔ کہا جاتا ہے سمر القوم (قوم نے داستان سرائی کی) یسمرون فھم سمار وسامر۔ نہایہ میں اسی طرح ہے (1)۔ اسی طرح حدیث قیلہ میں ہے اذجآء زوجھا من السامر۔ یعنی جب اس کا خاوند اس قوم سے آیا جو قصے اور داستانیں بیان کر رہے تھے۔

قاموس میں ہے سَمَرَ سَمْرًا وسمورا۔ وہ نہ سویا یعنی بیدار رہا۔ وھم السمار والسامرۃ۔ اور سامر اسم جمع ہے۔ اور السمر کا معنی ہے رات، رات کی داستانیں، چاند کی چاندنی اور ظلمت و تاریکی (2)

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ السامر فی الحقیقت مصدر ہے جو فاعل کے وزن پر ہے جیسے عافیۃ۔ (3)

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ مفرد ہے اور محل جمع میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا۔ اس میں طفلاً بمعنی اطفالا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ سامر کا معنی تاریک رات ہے۔ اس تاویل کے مطابق سامرًا ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہوگا۔ یعنی تم اعراض کرتے ہو اور رات کے وقت داستان سرائی کرتے ہوئے قرآن کریم سننے سے غرور و تکبر کا اظہار کرتے ہو۔

تَهْجُرُوْنَ کو نافع نے تاء کے ضمہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ اور اس کا مصدر اہجار ہے۔ اور اس کا معنی ہے فحش گوئی کرنا، یعنی تم حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے بارے فحش زبان استعمال کرتے ہو اور انہیں برا بھلا کہتے ہو۔ باقیوں نے اسے تاء کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ هَجَرَ یهجر هُجْرًا سے مشتق ہے اس کا معنی بھی ہے فحش گوئی کرنا اور برا اور قبیح قول کہنا۔ لہٰذا دونوں قرأتوں کے مطابق معنی ایک ہی ہے اور اگر مصدر هَجْرًا ہو یعنی ھاء مفتوح ہو تو اس کا معنی ہے کٹ جانا اور اعراض کرنا۔ یا اس کا معنی ہے بکواس کرنا۔ یعنی تم قرآن کریم سے اعراض کرتے ہو یا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں یا قرآن کریم کے بارے میں بکواسات بکتے ہو۔ اور وہ کچھ کہتے ہو جو تم جانتے نہیں۔

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ قریش کعبہ معظمہ کے ارد گرد بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے تھے اور بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے تھے اور غرور و تکبر کا اظہار کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ (4)

۳؎ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ میں استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔ اور فَلَمْ پر فا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَلَمْ يَسْمَعُوْا فَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ۔ القرآن۔ یعنی کیا انہوں نے قرآن نہیں سنا اور اس میں کبھی تدبر نہیں کیا؟

1۔ النہایۃ، جلد 2، صفحہ 400 (العلمیۃ)　　2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 576 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 591 (العلمیہ)　　4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 24 (العلمیۃ)

القول پر الف لام عہدی ہے۔یعنی قول سے مراد وہ قرآن کریم ہے جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر تشریف لائے۔مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے قرآن سنا اور اسوقت اسمیں خوب غور وفکر کیا جب انہوں نے اس کا معارض لانے کا ارادہ کیا۔لیکن وہ اس کی مثل ایک چھوٹی سی سورۃ بھی لانے پر قادر نہ ہو سکے۔تو اس کے اعجاز اخبار اور قصص سے یہ ظاہر ہو گیا کہ قرآن کریم کسی بشر کا کلام نہیں۔

۵؎ اَمْ جَآءَهُمْ میں اَمْ منقطعہ بمعنی بل ہے اور ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے۔معنی یہ ہے یا آئی تھی ان کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی ان کے پہلے آباءواجداد کے پاس۔یعنی بلکہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں آئی جو ان کے پہلے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آئی۔بلکہ ان کے پاس وہی چیز (کتاب) آئی جو انکے پہلے بزرگوں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کے پیچھے آنے والے رسل علیہم السلام کے پاس آئی۔اور قریش حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی نبوت اور ان کی فضیلت کے معترف تھے اور محمد ﷺ بھی انہی دو کی مثل نبی ہیں۔اور اس میں کوئی شئی بھی محال نہیں۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾

”یا انہوں نے اپنے رسول (مکرم) کو نہ پہچانا تھا اس لئے وہ اس کے منکر بنے رہے ۱؎ یا کہتے ہیں کہ اسے سودا کا مرض ہے ۲؎ (یوں نہیں) بلکہ وہ تشریف لایا ان کے پاس حق کے ساتھ اور بہت سے لوگ ان میں سے حق کو ناپسند کرتے ہیں۔ ۳؎ اور اگر پیروی کرتا حق ان کی خواہشات (نفسانی) کی تو درہم برہم ہو جاتے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے ۴؎ بلکہ ہم ان کے پاس لے آئے ان کی نصیحت تو وہ اپنی نصیحت سے ہی روگردانی کرنے والے ہیں۔ ۵؎“

۱؎ یا انہوں نے اپنے رسول مکرم محمد مصطفی علیہ اطیب التحیۃ والثناء ﷺ کو نہیں پہچانا تھا۔یعنی وہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام مراحل (بچپن، لڑکپن اور جوانی وغیرہ) کو پہچانتے تھے۔آپ کے حسب ونسب، امانت وصداقت، حسن اخلاق، عہد کی پاسداری اور کسی انسان سے تعلیم حاصل کئے بغیر آپ ﷺ کے کمال علم وادب اور دیگر اوصاف سے واقف وآگاہ تھے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے اس طرح مروی ہے۔

فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ میں فاء سببیہ ہے۔اور یہ لَمْ يَعْرِفُوْا پر معطوف ہے اور جن پر لَمْ يَعْرِفُوْا کا عطف ہے۔یعنی مذکورہ اسباب میں سے ہی کسی کے سبب انکار ممکن ہے اور ان میں سے تو کوئی شئی بھی موجود نہیں بلکہ ان کی اضداد ثابت ہیں۔(نتیجۃ ان کا انکار کسی اعتبار سے بھی درست اور جائز نہیں)

۲؎ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ میں بھی اَمْ منقطعہ ہے اور اس کے ضمن میں آنے والا ہمزہ ردع اور توبیخ کے لئے ہے۔مفہوم یہ ہے کہ بلکہ کیا یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو مجنون کہتے ہیں؟ حالانکہ آپ ﷺ عقل ودانش کے اعتبار سے ان تمام سے اعلی اور فکر ونظر کے اعتبار سے تمام سے پختہ اور مضبوط ہیں۔آپ ﷺ کی مثل آدمی کی جانب جنون اور دیوانگی کی نسبت وہی کر سکتا ہے جو انتہائی سرکش اور بغض رکھنے والا ہو۔یا پھر وہ خود دیوانہ اور مجنون ہو۔یہ بھی ممکن ہیں کہ تمام مواقع پر اَمْ متصلہ ہو اور مفہوم مراد کی نفی کے لئے اس عبارت پر ہو جس پر ہمزہ استفہام داخل ہے،یعنی اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوْا۔اور جملہ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوْا مستانفہ ہو۔گویا کہ جب سامع نے یہ ارشاد خداوندی سنا قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ

تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۙ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ تو سامع نے کہا اس الٹے پاؤں واپس لوٹنے، غرور و نخوت کا اظہار کرنے اور بکواسات کرنے کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کا سبب مذکورہ بالا امور میں سے کوئی شئی ہے؟ یعنی ان کا قرآن کریم میں غور و فکر اور تدبر نہ کرنا یا اپنے سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کے آنے کا علم نہ ہونا، یا رسول اللہ ﷺ کی امانت و صداقت وغیرہ کو نہ پہچاننا یا پھر ان کا آپ ﷺ کے بارے یہ گمان کرنا کہ آپ ﷺ تو مجنون ہیں؟ (نعوذ باللہ من ذالک) تو اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا نہیں۔ ان اسباب میں سے کوئی شئی بھی موجود نہ تھی۔

بلکہ اس جھگڑے فساد اور بغض و عناد کا سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ تو ان کے پاس حق لے کر تشریف لائے ہیں۔ حق سے مراد ایسا قول ثابت ہے جو محقق ہو، عقلاً نقلاً اس کی صداقت اور سچائی بالکل ظاہر ہو اور واضح ہو اور کسی عقل و دانش رکھنے والے پر اس کی صحت اور حسن مخفی نہ ہو۔

ترکیب کلام میں جملہ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی آپ ﷺ ان کے پاس حق لے کر آئے۔ درآنحالیکہ وہ بغض و عناد اور ظلم و زیادتی کرتے ہوئے اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حکومت و ریاست کے طلبگار اور چاہنے والے ہیں، شہوات نفسانیہ کے پیروکار ہیں، جاہلوں کی تقلید کے خواہش مند ہیں اور عادات اور رسوم و رواج کے پابند ہیں۔ ان کا یہ انکار اور ناپسندیدگی کا اظہار ان کی عقل و دانش یا فہم و فراست کا نتیجہ نہیں ہے۔

اس حکم میں اکثر کی قید ذکر کی گئی ہے، کیونکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی قوم کی جھڑکیوں اور زجر و توبیخ کے سبب ایمان چھوڑ دیا تھا۔ یا اپنی ذہانت و فطانت کے کم ہونے کے سبب یا پھر غور و فکر کرنے کے سبب ایسا کیا تھا۔ نہ کہ اس لئے کہ وہ حق کو ناپسند کرتے تھے اور اسکے خلاف بغض و عناد رکھتے تھے۔

اور اگر حق ان کی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا، اس طرح کہ فی الواقع متعدد معبود ہوتے تو آسمان، زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ اور کوئی چیز عدم کے پردے سے معرض وجود میں نہ آتی۔ جیسا کہ ہم اسکا تفصیلی بیان سورۂ حج کی آیت لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں۔

ابن جریج، مقاتل، سدی اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ حق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے(1) لیکن فراء اور زجاج نے کہا ہے کہ حق سے مراد قرآن کریم ہے(2)۔ معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کی خواہشات اور مقصود کی پیروی کرتا اور اپنے لئے کئی شریک بنالیتا، یا اپنی اولاد پیدا کرتا اور قرآن کریم ان کی خواہشات اور پسند کے مطابق نازل فرماتا تو پھر قرآن شرک اور دیگر قباحتوں کا درس دیتا اور اللہ تعالیٰ الٰہ ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ الوہیت شرکت کا احتمال نہیں رکھتی اور اللہ تعالیٰ فاشی کا حکم نہیں دیتا کیونکہ فحشاء کا حکم ایک رذیل امر ہے سخت عیب اور برائی ہے۔ اور الوہیت ہر قسم کے رذائل سے منزہ ہونے اور پاک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ الٰہ ہی نہ ہوتا تو بالیقین تمام تر ممکنات کا وجود درہم برہم ہو کر رہ جاتا، نام و نشان تک نہ ہوتا۔

بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا اور باطل سے بدل جاتا تو وہ شئی ختم ہو جاتی جس کے ساتھ عالم قائم ہے۔ لہٰذا اسکے لئے قوام باقی نہ رہتا۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اگر وہ حق جو حضور نبی کریم ﷺ دین کی صورت میں لے کر تشریف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 155 (الفکر) 2۔ ایضاً

لائے۔ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا اور وہ شرک بن جاتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دیتا اور پورے عالم کو اپنی شدت غضب سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ کا عطف قول باری تعالیٰ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ الخ پر ہے۔ جملہ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترضہ ہے جو کہ ان کی خواہشات کے بطلان کے بیان کے لئے ہے۔

ﻫ بِذِكْرِهِمْ سے مراد وہ کتاب (قرآن مجید) ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے۔ یا ان کے لئے نصیحت ہے۔ یا اس سے مراد وہی ذکر ہے جس کی تمنا انہوں نے اس قول میں کی لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ۔ (اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی جانب سے کوئی یادداشت ہوتی تو ہم اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہوتے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ذکر سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں ان کے لئے فخر و شرف موجود ہے۔ یعنی قرآن کریم اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارے لئے عزت و شرف ہے۔ مزید فرمایا وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ۔ (بلاشبہ یہ آپ کے لئے باعث شرف ہے)(1) وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم لغت قریش کے مطابق نازل ہوا (اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو قریش کا تابع بنا دیا اور امامت انہی میں محصور ہوگئی۔ لیکن وہ خود ایسی کتاب کی طرف توجہ نہیں کرتے (جو ان کے لئے باعث شرف ہے) اور نہ وہ خود عزت و شرف کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝

"کیا آپ طلب کرتے ہیں ان سے کچھ معاوضہ؟ (آپ کے لئے) تو آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے 1 اور بیشک آپ تو انہیں بلاتے ہیں سیدھی راہ کی طرف 2 بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے آخرت پر وہ راہ راست سے منحرف ہونے والے ہیں 3۔"

1 اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ کا عطف اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ پر ہے۔ اور اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے اور یہاں بھی استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی مفہوم یہ ہے کہ آپ ان سے کسی اجر کا مطالبہ تو نہیں کرتے کہ وہ اس تاوان کے خوف سے آپ پر ایمان نہ لائیں۔ پس آپ کے لئے تو آپ کے رب کا وہ اجر و ثواب جو آپ کو آخرت میں عطا فرمائے گا وہ بہتر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے خَرَاجًا اور فَخَرْجُ رَبِّكَ دونوں مقامات پر الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے دونوں مقام پر بغیر الف کے پڑھا ہے۔ لیکن دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور وہ ہے کسی کام کا معاوضہ اور اجرت' تاوان۔ قاموس میں ہے کہ خرج خراج کی مثل ہے۔ اس کا معنی تاوان اور ٹیکس ہے(2)۔ باقیوں نے اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا بغیر الف کے اور فَخَرَاجُ رَبِّكَ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے خرج (خرچ) دخل (آمدن) کے مقابل آتا ہے۔ اور خرج کا معنی وہ شئی ہے جو تو اپنے پاس سے کسی دوسرے کو دیتا ہے۔ اور خراج کا غالب اطلاق اس ٹیکس پر ہوتا ہے جو سلطانِ وقت کی جانب سے زمین پر لگایا جاتا ہے(3) پس اس قرأت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف خراج کی نسبت یہ احساس دلانے کے لئے ہے کہ رب کریم کی عطا کثیر بھی ہے اور لازم بھی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 155 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 290 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 595 (العلمیۃ)

اور وہی اپنی وسعت اور دانائی ہونے کے سبب بہت بہتر ہے۔ پس اپنے رب کریم کی جانب سے اس تیار اور فراخ عطا کے سبب ان سے اجر کے مطالبے سے آپ مستغنی ہیں۔ یہ جملہ نفی سوال کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے) ترکیب کلام میں اس کا عطف خَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ پر ہے۔ یا پھر رَبِّكَ سے حال ہے۔

۲۔ بیشک اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو انہیں سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہیں۔ جس کے سیدھا ہونے اور اس میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہ ہونے کی شہادت تمام عقول سلیمہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات طیبات میں اس چیز کی وضاحت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے انکار کا سبب حق کو ناپسند کرنے اور قلت فہم کے سوا اور کوئی نہیں۔ ایمان کی طرف دعوت دینے والے کا ذکر فرمایا۔ اور فرمایا کہ وہ جس کی طرف دعوت دیتا ہے وہ صراط مستقیم ہے۔ تمام اہل عقل و دانش کے نزدیک پسندیدہ اور مرغوب فیہ ہے اور وہ ان کے لئے باعث شرف ہے۔ کیونکہ وہ بالخصوص قریش کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ (پس اس کے باوجود ان کا اسلام قبول نہ کرنا) اس بات پر دلیل ہے کہ ان کے انکار کا موجب فقط حق کو ناپسند کرنا تھا اور اس کا سبب ان کا عناد اور بغض تھا یا فہم و فراست کی کمی تھی۔ اور اس کا دارومدار اس شقاوت و بدبختی پر ہے جو ازل سے ہی ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔ کیونکہ وہ عقلمند تو تھے۔ دنیوی منافع جیسے چاہتے حاصل کر لیتے۔ لہٰذا انہیں جلدی یا دیر سے ملنے والے دائمی منافع جو کہ ہر قسم کے نجس کی آمیزش سے خالص اور پاک ہے انہیں ان کا ادراک نہ ہونا ان کی ازلی شقاوت و بدبختی کے باعث ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی جانب راہنمائی فرما دیتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

۳۔ الصِّرَاطِ سے مراد صراط مستقیم ہے۔ کیونکہ الصراط پر الف لام عہدی ہے۔ معنی یہ ہے کہ بلاشبہ وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ راہ راست سے منحرف ہونے والے ہیں۔ ان میں استعداد اور صلاحیت ہی موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی تخلیق ہی اسم مضل کے پرتو سے ہوئی ہے۔ اس لئے ان کا صراط مستقیم کی طرف راہنمائی پانا ممکن ہی نہیں اور وہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد اسے ناپسند کرتے ہیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝

''اور اگر ہم ان پر مہربانی بھی فرمائیں اور دور بھی کر دیں اس مصیبت کو جس میں مبتلا ہیں پھر بھی وہ بڑھتے جائیں گے اپنی سرکشی میں اندھے بنے ہوئے ۱؎ اور ہم نے پکڑ لیا انہیں عذاب سے پھر بھی وہ نہ جھکے اپنے رب کی بارگاہ میں اور نہ وہ اب گڑگڑا کر (توبہ کرتے) ہیں ۲؎ یہاں تک کہ جب ہم کھول دیں گے ان پر دروازہ سخت عذاب والا وہ اس وقت بالکل مایوس ہو جائیں گے۔ ۳؎''

۱؎ اور اگر ہم ان پر مہربانی بھی فرمائیں اور ان سے وہ عذاب دور کر دیں جس کے ساتھ ہم نے ان کے خوشحال لوگوں کو پکڑا ہے۔ چاہے عذاب سے مراد ان کا میدان بدر میں قتل ہونا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے یا عذاب سے مراد بھوک اور قحط سالی ہو۔ جیسا کہ ضحاک نے ذکر کیا ہے(۱) ہم نے یہ دونوں قول اس سے قبل بیان کر دیئے ہیں۔ پھر بھی وہ اپنی سرکشی میں اندھے

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 26 (العلمیۃ)

بنے ہوئے بڑھتے جائیں گے۔ اللجاج کا معنی ہے عناد و مخالفت میں بڑھتے چلے جانا اور جس فعل سے روکا جائے اس کا ارتکاب کرنا۔ (اَللَّجَاجُ التَّمَادِیْ فِی الْعِنَادِ وَتَعَاطِی الْفِعْلِ الْمَزْجُوْرِ عَنْهُ فِیْ طُغْیَانِهِمْ) کا معنی ہے کہ وہ حق سے تکبر اور غرور اختیار کرنے میں' کفر میں غلو اور افراط اختیار کرنے میں اور رسول اللہ ﷺ سے عداوت اختیار کرنے میں (بڑھتے ہی جائیں گے)۔ یَعْمَهُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ ہدایت سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ لَجُّوْا کے فاعل سے حال ہے اور یہ جملہ شرطیہ لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ پر معطوف ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے قیل لھم لَا تَجْئَرُوا الخ۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ بیشک ہم نے ان پر مہربانی نہیں کی۔ اور اگر ہم ان پر مہربانی کر بھی دیتے پھر بھی وہ اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے جاتے اور توبہ نہ کرتے۔ گویا یہ جملہ ان پر مہربانی نہ کئے جانے کی علت بیان کر رہا۔ نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابو سفیان رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی اے محمد! ﷺ میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور قرابتداری کا واسطہ دیتا ہوں کہ اب تو ہم اون اور خون کھانے لگے ہیں(1) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲۔ تحقیق ہم نے انہیں عذاب کے ساتھ پکڑ لیا۔ عذاب سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا قتل ہونا۔ یا پھر قحط کا مسلط ہونا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے رب کی بارگاہ میں نہ جھکے۔ یعنی انہوں نے (اپنے کفر و عناد) سے توبہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف رجوع نہیں کیا۔ بلکہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور اپنی سرکشی اور عناد پر ہی چلتے رہے۔ اِسْتَكَانُوْا یا تو باب استفعال ہے اور اس کا مادہ الکون ہے۔ کیونکہ محتاج ایک کون سے دوسرے کون، یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یا پھر یہ باب افتعال ہے اور اس کا مادہ السکون ہے۔ اور کاف کے بعد الف اشباع فتحہ کا ہے۔ شکیب۔

وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ (اور نہ وہ اب گڑگڑا کر توبہ کرتے ہیں)۔ یعنی عاجزی' زاری اور خشوع ان کی عادت ہی نہیں۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں بیان کیا ہے کہ ابن اثال حنفی جب قید ہو کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے اسے رہا کر دیا۔ چنانچہ وہ دولت اسلام سے مشرف ہوا اور مکہ مکرمہ چلا گیا۔ پھر وہاں سے واپس لوٹ کر آیا اور مکہ مکرمہ اور یمامہ کے علاقے میرہ کے درمیان ڈیرہ لگا لیا۔ اور یمامہ سے جو بھی سامان رسد مکہ کی جانب آتا تو وہ اسے راستے میں روک لیتا، یہاں تک کہ قریش بھوک سے مرنے لگے اور جانوروں کی اون کھانے تک مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ابوسفیان حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ اسی طرح ہے۔ تو پھر اس نے کہا (یہ کیا ہے؟) کہ آپ نے اپنے آباء کو تو تلوار کے ساتھ قتل کر دیا اور بیٹوں کو بھوک سے قتل کر رہے ہیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ اس آیت میں اس بات پر استشہاد موجود ہے کہ جب عذاب میں گرفتار ہونے کے باوجود انہوں نے عاجزی اور زاری نہیں کی تو اگر ہم ان پر مہربانی فرما دیتے اور ان سے دوسرے عذاب کو دور بھی کر دیتے تو پھر بھی بطریق اولیٰ وہ عجز کا اظہار نہ کرتے اور ان سے تضرع اور زاری کا مظاہرہ نہ ہوتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آیت کی تفسیر میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ عذاب دور نہیں کیا جس کے ساتھ ان میں سے خوشحال لوگوں کو پکڑا' حالانکہ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قریش کے

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 428 (العلمیۃ)　　2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 4، صفحہ 81 (العلمیۃ)

[illegible] ان پر قحط چھا گیا۔ تو پھر ابوسفیان حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی میں آپکو اللہ تعالیٰ اور قرابتداری کا واسطہ دیتا ہوں کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کیوں نہیں۔ (یہ درست ہے)۔ تو اس نے کہا کہ آپ نے آباء کو تلوار کے ساتھ قتل کر دیا ہے اور بیٹوں کو بھوک، یعنی قحط کے ساتھ قتل کر رہے ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کیجئے کہ وہ ہم سے اس قحط کو دور فرما دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی تو ان سے قحط دور ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان سے قحط سالی کا عذاب دور فرمایا۔ پس ان میں وجہ تطبیق کیا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ آیت صرف اس معنی پر دلالت کرتی ہے کہ زمانہ ماضی میں ان پر مہربانی نہیں ہوئی اور ان سے عذاب دور نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ جانتا تھا کہ اس عذاب اور مصیبت کو ان سے دور کرنے کے باوجود وہ اپنی سرکشی پر قائم رہیں گے۔ لیکن آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ زمانہ مستقبل میں بھی ان سے عذاب دور نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ حضور نبی رحمت ﷺ نے رب کریم کی بارگاہ میں ان سے اس مصیبت کو دور کرنے کی التجاء کی۔ رب کریم نے اسے شرف قبول عطا فرمایا اور ان سے عذاب دور فرما دیا۔ (قحط سالی ختم ہو گئی) لیکن اس کے باوجود انہوں نے عجز وانکساری نہ کی بلکہ اندھے بن کر اپنی سرکشی اور بغض وعناد پر مصر رہے۔ اور اپنے رب کی جانب توبہ کرتے ہوئے رجوع نہ کیا۔

۲۔ اس آیت میں حتی ابتدائیہ ہے۔ اور عذاب سے مراد بھوک اور قحط سالی کا عذاب ہے۔ بشرطیکہ ارشاد باری تعالیٰ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ میں عذاب سے مراد غزوہ بدر میں انہیں قتل کرنا اور قیدی بنانا ہو۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہے۔ کیونکہ قحط سالی قید اور قتل کی نسبت زیادہ شدید ہے۔ معنی یہ ہوگا یہاں تک کہ جب ہم ان پر قحط کے عذاب کا دروازہ کھول دیں گے۔ وہ اس وقت بالکل مایوس ہو جائیں گے۔

مُبْلِسُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ ہر بھلائی سے حیرت اور مایوسی کا شکار ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان میں سب سے زیادہ سرکش اور بغض رکھنے والا انسان آپ کے پاس حاضر ہوا اور مہربانی اور دعائے رحمت کی آرزو کرنے لگا۔

اور اگر سابقہ ارشاد میں عذاب سے مراد بھوک اور قحط کا عذاب ہو جیسا کہ ضحاک کا قول ہے تو پھر یہاں عذاب شدید سے مراد موت اور عذاب قبر ہوگا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا قائم ہونا اور جہنم کا عذاب ہے۔

آیت طیبہ میں فَتَحْنَا مستقبل کا معنی ادا کرنے کے لئے ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ تا کہ اس کے وقوع پذیر ہونے کا یقین حاصل ہو جائے۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں ہے۔ معنی اسطرح ہے کہ بیشک ہم نے ہر قسم کی آزمائش اور تکلیف کے ساتھ انہیں آزمایا۔ انہیں قتل اور قید سے دوچار کیا اور انہیں قحط سالی میں جکڑا۔ لیکن انہوں نے توبہ نہ کی اور نہ انہوں نے عاجزی وزاری کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ جب انہیں جہنم کا عذاب دیا جائے گا تو اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے۔ یہی مفہوم اس ارشاد میں بھی ہے یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـٕدَةَؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸ وَ هُوَ الَّذِیْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56-155 (الفکر)

ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ لَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾

"اور وہ وہی ہے جس نے بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل لیکن (ان عظیم نعمتوں پر بھی) تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ۱؎ اور وہ وہی ہے جس نے پھیلا دیا تمہیں زمین (کے اطراف) میں اور (انجام کار) اسی کی جناب میں اکٹھے کئے جاؤ گے ۲؎ اور وہ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے گردش لیل ونہار۔ کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھتے۔ ۳؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے کان اور آنکھیں بنائیں تاکہ تم ان سے اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ علامات اور نشانیوں کو جان سکو اور محسوس کر سکو۔ اور دل بنایا تاکہ تم ان نشانیوں میں گہری غور و فکر کر سکو اور اس سے دیگر منافع دینیہ و دنیویہ پر مزید راہنمائی پا سکو۔

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ میں ما زائدہ تاکید کے لئے ہے۔ اور قلیلاً مصدریت (مفعول مطلق ہونے) یا ظرفیت (مفعول فیہ ہونے) کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی تشکرون شکرا قلیلا (تم بہت کم شکر ادا کرتے ہوں) یا تشکرون فی زمان قلیل (تم بہت تھوڑا وقت شکر ادا کرتے ہو) کیونکہ عمدہ اور اعلیٰ نوع کا شکر یہ ہے کہ ان کا استعمال اسی کام میں کیا جائے جن کے لئے یہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور کسی اور کو شریک ٹھہرائے بغیر انکے عطا کرنے والے پر یقین رکھا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ عرف کے مطابق اس عبارت کا معنی یہ ہے کہ تم بالکل شکر ادا نہیں کرتے۔

۲؎ اور اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں پیدا فرمایا ہے اور پھر توالد و تناسل کے سبب تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے۔ اور تمہارے بکھر جانے اور پھیل جانے کے بعد انجام کار قیامت کے دن تمہیں پھر اکٹھا کر دیا جائیگا۔

۳؎ اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اور رات دن میں تاریکی اور سفیدی اور دیگر منافع کے اعتبار سے اختلاف یا موسم سرما اور گرما کے دنوں اور راتوں میں طویل اور چھوٹا ہونے کے اعتبار سے اختلاف اسی کے حکم اور فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ کیا غور و فکر اور تامل کے سبب تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ کہ یہ سب ہماری جانب سے ہے اور ہماری قدرت تمام ممکنات کو محیط ہے۔ اور انہی ممکنات میں سے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا بھی ہے۔ (یعنی ہم اس پر بھی قادر ہیں) ارشاد باری تعالیٰ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ سے لے کر یہاں تک جملہ معترضہ ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے اور ان مجسم نعمتوں کے بعد ان کے کفر پر ڈٹے رہنے پر اظہار شکایت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾

"بلکہ انہوں نے بھی وہی بات کہی جو پہلے (کفار) کہا کرتے تھے۔ ۱؎ انہوں نے کہا کیا جب ہم مر جائیں گے اور بن جائیں گے خاک اور ہڈیاں تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا؟ ۲؎ بلاشبہ یہ وعدہ کیا گیا ہم سے اور ہمارے باپ دادا کے

ساتھ بھی آج سے پہلے (لیکن آج تک پورا نہ ہوا) نہیں ہیں یہ باتیں مگر من گھڑت افسانے پہلے لوگوں کے ۳ ''

۱ بَلْ قَالُوْا الخ کا عطف بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ پر ہے۔ یعنی بلکہ کفار مکہ نے اسی طرح کہا جیسے سابقہ امتوں کے پہلے کفار کہا کرتے تھے۔

۲ قَالُوْا پہلے مذکور قَالُوْا سے بدل ہے۔ ءَ اِذَا مِتْنَا استفہام انکاری ہے۔ انہوں نے انکار کیا اور اسے بعید از عقل سمجھا۔ لیکن انہوں نے اپنی تخلیق کی ابتداء میں غور وفکر نہیں کیا کہ وہ اس سے قبل مٹی تھے اور اس مٹی سے پہلے بالکل کچھ بھی نہ تھے۔ اور بغیر کسی سابقہ مادہ کے وہ پیدا کر دیئے گئے۔

۳ یعنی بعث بعد الموت کا وعدہ تو آج سے پہلے ہمارے باپ دادا سے وہ لوگ کرتے آئے ہیں، جن کے بارے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ مِنْ قَبْلُ اس فعل کی ظرف ہے جس پر حرف عطف دلالت کر رہا ہے، یعنی وُعِدَ بِهٰذَا اٰبَاؤُنَا مِنْ قَبْلِ هٰذَا الزَّمَانِ وَلَمْ يَقَعْ اِلَى الْاٰنَ مَعَ تَطَاوُلِ الزَّمَانِ۔ (اس کا وعدہ تو اس زمانے سے قبل ہمارے آباؤ اجداد سے بھی کیا گیا لیکن اتنا طویل زمانہ گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ پورا نہیں ہوا۔ لہٰذا نہیں ہے یہ وعدہ مگر پہلے لوگوں کے من گھڑت افسانے۔ سطر کا معنی ہے کتاب کی لکھی ہوئی ایک سطر زمین میں لگائے گئے درختوں کی ایک قطار لائن۔ کھڑے ہوئے آدمیوں کی ایک لائن۔ یہاں مراد پہلا معنی ہے۔ کہا جاتا ہے سطر فلان کذا اس نے ایک سطر لکھی۔ اس کی جمع اسطر، سطور اور اسطار ہے۔ اور پھر اسطار کی جمع اساطیر ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والا نہیں بلکہ یہ تو پہلے لوگوں کے لکھے ہوئے جھوٹ ہیں۔ مبرد نے کہا ہے کہ اساطیر اسطوره کی جمع ہے (۱) جیسے ارجوحۃ کی جمع اراجیح' احدوثہ کی جمع احادیث' اعجوبۃ کی جمع اعاجیب اور اضحوکۃ کی جمع اضاحیک ہے۔ اور اس کا استعمال ایسے جھوٹوں کے لئے ہوتا ہے جو دل بہلانے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین نے اس کا معنی اکاذیب کیا ہے۔ قول باری تعالیٰ لَقَدْ وُعِدْنَا سے تا آخر مذکورہ انکار کے لئے تعلیل وتقریر ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾

'' (اے حبیب! ﷺ) آپ پوچھئے کس کی ملکیت ہے یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو ۱ وہ کہیں گے (یہ سب) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ آپ فرمایئے پھر کیا تم غور نہیں کرتے ۲ پوچھئے کون ہے مالک سات آسمانوں کا اور (کون ہے) مالک عرش عظیم کا؟ وہ کہیں گے (یہ سب) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے ۳ آپ فرمایئے تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے ۴ ''

۱ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ الخ جملہ مستانفہ ہے گویا کہ یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے جواب میں کہا گیا کہ جب آپ نے کہا کہ میں انہیں کیا کہوں جبکہ وہ بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ استفہام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو اقرار پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ (تاکہ اس کے لئے سوائے اقرار کے اور کوئی چارہ نہ رہے)

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اِنْ كُنْتُمْ مِنْ اَهْلِ

1۔ روح المعانی، جلد 18، صفحہ 57 (التراث العربی)

الْعِلْمِ اَوْ مِنَ الْعَالَمِيْنَ بِذٰلِكَ فَاَجِيْبُوْا۔ یعنی اگر تم اہل علم میں سے ہو یا تم اس کے بارے جانتے ہوتو پھر جواب دو۔ اور اس سوال میں ان کی تحقیر اور اہانت بھی مقصود ہے۔ اور ان کی انتہائی جہالت کا اثبات ہے۔ کیونکہ ان کی حالت اور گفتگو اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ واضح اور ظاہر شئی کے بارے بالکل جاہل ہیں۔ جسے بچے اور مجنون بھی جانتے ہیں۔ اور اس سوال کے ذریعے انہیں ایسی شئی کا الزام دینا ہے (یعنی ان پر ایسی شئی لازم کرنا ہے) جس کا انکار معمولی سی عقل وفہم رکھنے والے آدمی کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اسی لئے ان کے جواب دینے سے قبل ہی ان کے جواب سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (کہ وہ کہیں گے زمین وآسمان میں موجود تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں) کیونکہ عقل صریح اور نقل صحیح اور تمام لوگوں کا اعتراف اس پر شاہد ہے۔ لہٰذا وہ بھی یہ جواب دینے پر مجبور ہیں۔

۲؎ ان کے اس اعتراف اور اقرار کے بعد پھر انہیں فرمائیے کیا تم پھر غور وفکر نہیں کرتے؟ حمزہ، علی اور حفص نے تَذَكَّرُوْنَ میں سے ایک تاء کو تخفیف کے لئے حذف کر کے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اسے تشدید اور ادغام کیساتھ پڑھا ہے۔ یعنی تَذَكَّرُوْنَ بیشک وہ ذات جو زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کو ابتداءً پیدا کرنے کی قدرت رکھتی ہے وہ دوسری بار بھی انہیں زندہ کرنے پر قادر ہے۔ پھر اس کے انکار کی کیا وجہ ہے؟

۳؎ آپ ان سے پوچھئے ان سات آسمانوں کا مالک کون ہے؟ اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ کیونکہ زمین کی نسبت آسمان عظیم ہے۔ ایک الزام کو ثابت کرنے کے بعد دوسرے الزام کی تلقین کے لئے یہ دوسرا جملہ متاقبہ ہے۔ تو وہ اس سوال کے جواب میں کہیں گیا ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ لِلّٰهِ کو عام قراء نے اس مقام پر اور اس کے بعد لام اور جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ پس معنوی طور پر یہ بھی سوال کا جواب ہے۔ جیسا کہ کوئی یہ کہے من مولاک؟ تو جواب میں کہا جائے لفلان تو اسکا مطلب یہ ہے اَنَا لِفُلَانٍ فَهُوَ مَوْلَايَ۔ (میں فلاں کا ہوں پس وہی میرا آقا ہے) مگر اہل بصرہ نے دونوں مقامات پر اللہُ اللہُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ سوال اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ اہل بصرہ کے مصحف میں اسی طرح اور تمام مصاحف میں پہلے مقام کی طرح ان مقامات پر بھی بغیر الف کے لکھا ہوا ہے۔

۴؎ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (آپ فرمائیے تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے؟) یعنی جب تم یہ اقرار اور اعتراف کرتے ہو کہ آسمانوں اور عرش کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی نہیں تو پھر تم اسکے عذاب سے ڈرتے نہیں؟ کہ تم مخلوق میں سے بعض کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اور بعض ممکنات میں تم اس کی قدرت کا انکار کرتے ہو۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾

'' آپ پوچھئے وہ کون ہے جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی کامل ملکیت ہے اور وہ پناہ دیتا ہے (جسے چاہے) اور پناہ نہیں دی جاسکتی اس کی مرضی کے خلاف (بتاؤ) اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ وہ کہیں گے یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے فرمائیے

پھر کیسے تم دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہو؟¹ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے پہنچا دیا انہیں حق اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔² نہیں بنایا اللہ نے کسی کو (اپنا) بیٹا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ ورنہ لے جاتا ہر خدا ہر اس چیز کو جو اس نے پیدا کی ہوتی اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے وہ خدا ایک دوسرے پر۔ پاک ہے اللہ تعالیٰ ان تمام (نازیبا) باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔³"

¹ مَلَكُوت سے مراد ملکیت اور حکومت ہے، یعنی عزت اور غلبہ ہے اس میں واؤ اور تاء مبالغہ کے لئے ہیں یعنی وہ کامل ملکیت اور انتہائی غلبہ جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے لئے مختص ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ملکوت سے مراد اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔

وَّهُوَ يُجِيْرُ کا معنی ہے وہ حفاظت کرتا ہے۔ اور برائی سے محفوظ رکھتا ہے اور پناہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ یا پھر يُجِيْرُ کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ خوفزدہ کرنا چاہے اسے پناہ نہیں دی جا سکتی اور جسے اللہ تعالیٰ تکلیف اور مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمالے اسے مصیبت سے بچایا نہیں جا سکتا۔ یا معنی یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو ضرر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کہ اس کی مرضی کے خلاف پناہ دی جا سکتی ہو۔ چونکہ یہ لفظ نصرہ کے معنی کو متضمن ہے اس لئے اسے صلہ علیٰ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔

² قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ کا معنی ہے کہ جب تم یہ اعتراف کرتے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے) تو پھر کیسے تم دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہو؟ اور رشد و ہدایت سے اعراض کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہو؟۔ یا معنی یہ ہے کہ جب تم اس کا اقرار اور اعتراف کرتے ہو تو پھر تم کیسے حق کو باطل خیال کرنے لگ جاتے ہو؟۔

³ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں حق پہنچا دیا ہے۔ حق سے مراد توحید اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے (قیامت) کا وعدہ ہے۔ ترکیب کلام میں بَلْ اَتَيْنٰهُمْ کا عطف بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ پر ہے۔ یہ اس سے اضراب ہے اور ان دونوں کے درمیان جملے معترضے ہیں۔

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ اس کا (توحید اور قیامت کا) انکار کرنے میں یقیناً جھوٹے ہیں۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ یا پھر اَتَيْنٰهُمْ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔

⁴ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔ (کیونکہ اولاد اپنے والدین کی ہم جنس ہوتی ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر کسی کی مماثلت اور اور اس کے ہم جنس ہونے سے پاک اور منزہ ہے۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ میں مِنْ زائدہ نفی کی تاکید کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ کی علت بیان کرنے کے محل میں ہے۔

اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے جو اس کی الوہیت میں شریک ہو۔ اِذًا شرک کرنے والے کے جواب میں واقع ہے۔ اور شرط کی جزا محذوف ہے۔ اس پر قول باری تعالیٰ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔

لَوْ كَانَ مَعَهٗ اٰلِهَةٌ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ (اگر اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہوتا تو ہر خدا ہر اس چیز کو لے جاتا جو اس نے پیدا کی ہوتی اور اس کو اپنے ساتھ مختص کر لیتا۔ اپنے سوا دوسرے کو اس میں تصرف کرنے سے روک دیتا اور اپنی ملکیت کو دوسرے کی ملکیت

سے علیحدہ اور ممتاز کر لیتا۔ اور پھر وہ خدا ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے۔ نتیجتاً ان کے مابین جنگ چھڑ جاتی۔ جیسا کہ دنیوی بادشاہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا متعدد ہوں تو ایسا ہونا ممکن ہے اور مغلوب الٰہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مغلوب ہونا عاجز اور حادث ہونے کی نشانی اور دلیل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دو میں سے کوئی بھی دوسرے پر غالب نہ آئے تو اس سے دونوں کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ شان الوہیت کے منافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان تمام نازیبا باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے اور اسکی الوہیت میں اور بھی شریک ہیں۔ (اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام سے مبرہ اور منزہ ہے) اور اس کے فساد کی دلیل پہلے بیان کی جاچکی ہے۔

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ اِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾

''وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو پس وہ بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں[1] آپ یہ دعا مانگئے اے میرے پروردگار! اگر تو ضرور مجھے دکھانا چاہتا ہے وہ (عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو میرے رب! (ازراہ عنایت) مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا[2] اور ہم اس بات پر کہ دکھادیں تجھے وہ عذاب جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے' قادر ہیں[3] دور کر دو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے برائی کو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو باتیں وہ بیان کرتے ہیں[4]''

[1] اہل مدینہ اور حفص کے سوا اہل کوفہ نے عالم کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لئے کہ وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور باقیوں نے لفظ اللہ کی صفت ہونے کی بناء پر اسے مجرور پڑھا ہے۔ اور یہ شریک کی نفی پر دوسری دلیل ہے۔ (کیونکہ اگر کسی موصوف کی کوئی خاص صفت بیان کی جائے تو وہ صفت ہی اس کے حکم کی علت ہوتی ہے مثلاً احسن بزیدٍ صدیقک القدیم۔ اپنے پرانے دوست زید کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی علت اس کی قدیمی دوستی ہے۔ اور یہ موصوف کی صفت ہے۔ اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہ ہونے کی اس طرح دلیل ہے کہ وہی پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی ایسا علم رکھنے والا نہیں۔ لہٰذا اس کا کوئی شریک بھی نہیں) کیونکہ اس پر تو مشرکین کا بھی اتفاق تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کا علم رکھنے میں منفرد اور یکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد کلام فاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کہ پس وہ بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں بلند اور عظیم ہے کہ اسے اولاد یا شریک کے ساتھ متصف کیا جائے۔

[2] اِمَّا تُرِيَنِّيْ اصل میں اِنْ مَّا تُرِيَنَّنِيْ ہے۔ پہلے نون کو میم میں مدغم کیا گیا تو امّا بنا۔ اور پھر تین نونوں کے اجتماع کے مکروہ ہونے کی وجہ سے نون وقایہ کو حذف کر دیا۔ تو تُرِيَنِّيْ بن گیا۔ ترکیب کلام میں یہ شرط ہے۔ جسے ما زائدہ اور نون کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے اگر یہ ضروری ہے کہ تو مجھے (وہ عذاب) دکھائے جس کا وعدہ دنیا اور آخرت کے عذاب میں سے کفار کے ساتھ کیا گیا ہے تو میرے رب (ازراہ عنایت) مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا۔ یعنی عذاب میں ان کا ساتھی نہ بنانا۔ یہ دعا کی تلقین کے لئے جملہ معترضہ ہے۔ ندا (اے میرے پروردگار! (رب)) کو مکرر لانا اور شرط اور جزا میں سے ہر ایک کو لانا تضرع اور عاجزی کے اظہار میں زیادتی اور اضافہ کے لئے ہے۔ اور دعا کی تلقین میں اس طرح اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت [illegible]

فرمانبردار بنانا واجب ہے۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ظلم کی نحوست ظلم نہ کرنے والے کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً۔ (اس فتنے سے بچو جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی نہیں پہنچے گا)

۳؎ اور بیشک ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم آپ کو وہ عذاب دکھا دیں، جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ لیکن ہم تباہ و برباد کرنے والے اور کلی طور پر ختم کر دینے والا عذاب نہیں دیں گے۔ کیونکہ ان کے درمیان آپ تشریف فرما ہیں۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض یا ان کی اولادوں میں سے بعض ایمان لے آئیں گے۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو کہ ان کے قیامت اور اس عذاب کا انکار کرنے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے یا استہزاءً جلدی عذاب آنے کی طلب کرنے کو رد کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

۴؎ برائی کو دور کرو اس چیز اور خصلت سے جو بہت بہتر اور اچھی ہے۔ اچھی اور بہتر خصلتیں یہ ہیں، درگزر کرنا، اعراض کرنا صبر کرنا اور احسان کرنا وغیرہ۔ السَّيِّئَةَ ترکیب کلام میں اِدْفَعْ کا مفعول ہے۔ یعنی آپ ان کی برائی کا ازالہ اپنی نیکی اور احسان سے کیجئے۔ پس اس بناء پر یہ ان کی اذیت رسانی پر صبر کرنے کا حکم ہے اور ان سے جنگ کرنے سے رکنے کا حکم ہے۔ یہ آیت حکم جہاد والی آیت سے منسوخ متصور ہوگی۔ بعض نے کہا ہے حسنہ سے مراد کلمہ توحید اور سیئۃ سے مراد کلمہ شرک ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ سیئۃ سے مراد منکر، یعنی برائی اور گناہ ہے اور حسنہ سے مراد اس سے روکنا ہے۔

یہ آیت اِدْفَعْ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ اس میں صیغہ اسم تفضیل کے ساتھ نیکی کی برتری اور فضیلت کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ کا معنی ہے کہ جو باتیں وہ آپ کے بارے کرتے ہیں ہم انہیں خوب جانتے ہیں یا معنی یہ ہے کہ آپ کے حال کے خلاف جو کچھ وہ بیان کرتے رہتے ہیں ہم اسے خوب جانتے ہیں۔ اور ہم انہیں سزا دینے کی پوری قوت رکھتے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنا معاملہ ہمارے سپرد کر دیجئے اور بذات خود ان سے انتقام لینے کا قصد نہ کیجئے۔

یہ جملہ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ کی علت بیان کرنے کے مقام میں واقع ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''اور کہئے میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری شیطانوں کے وسوسوں سے اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں میرے رب اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں ۱؎ یہاں تک کہ جب آئے گی ان میں سے کسی کو موت تو وہ (بصد حسرت) کہے گا میرے مالک! مجھے (دنیا میں) واپس بھیج دے ۲؎ شاید میں اچھے کام کروں اس دنیا میں دوبارہ جا کر جسے میں ایک بار چھوڑ آیا ہوں ۳؎ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک (لغو) بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور ان کے آگے ایک آڑ ہے اس دن تک جب وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ ۴؎''

۱؎ آپ کہئے اے میرے رب! میں تیری حفاظت اور پناہ میں آتا ہوں۔ ھمز کا معنی ہے شدت اور قوت کے ساتھ دھکا دینا، یعنی

شیاطین کا مکروفریب اور وساوس کے سبب گناہوں کی طرف لے جانے سے میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔ اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میری نماز اور دیگر امور میں سے کسی میں حاضر ہوں۔ کیونکہ جب وہ حاضر ہوگا تو وسوسہ اندازی کرے گا۔ یعقوب نے اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ کو حالت وصل اور وقف دونوں میں یَّحۡضُرُوۡنِی یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ ترکیب کلام میں جملہ وَقُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُبِکَ قول باری تعالیٰ اِمَّا تُرِیَنِّیۡ پر معطوف ہے۔

؎ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ الخ میں حتی ابتدائیہ ہے۔ اور ارشاد خداوندی یَصِفُوۡنَ یا کَذِبُوۡنَ سے متعلق ہے۔ یعنی جب موت آنے کے وقت وہ جنت میں اپنا ٹھکانہ دیکھے گا کہ اگر وہ ایمان لاتا (تو وہ اس کا ٹھکانا ہوتا) اور پھر وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھے گا اور اسے کہہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے کفر کے سبب تیرے لئے جنت کے ٹھکانے کو جہنم کے اس ٹھکانے سے بدل دیا ہے۔ تو وہ اس وقت بصد حسرت کہے گا، میرے مالک! مجھے دنیا میں واپس بھیج دے۔ اِرۡجِعُوۡنِ کو یعقوب نے حالت وصل اور وقف دونوں میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ اس میں جمع کی ضمیر (رب کریم کی) عظمت و تعظیم کیلئے ذکر کی گئی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ جمع کی ضمیر فعل کے تکرار کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یہ اصل میں تھا ارجعنی ارجعنی (تو مجھے ضرور لوٹا دے) جیسا کہ قفا رو اطرقا میں کہا گیا ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ یہ خطاب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان ملائکہ کو بھی ہے جو اس کی روح قبض کرنے آتے ہیں۔ ابتداءً یہ خطاب اللہ تعالیٰ کو ہے کیونکہ اولاً فریاد اور مدد کی التجاء اللہ تعالیٰ سے ہی ہے۔ اور پھر ملائکہ سے دنیا کی طرف لوٹانے کی درخواست کی۔

؎ اَعۡمَلُ صَالِحًا میں صَالِحًا یا تو مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا پھر مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے۔ اور اصل میں اعمل عملاً صالحاً ہے۔ فِیۡمَا تَرَکۡتُ سے مراد وہ ایمان ہے جسے قبول کرنے سے میں نے ایک بار چھوڑ دیا ہے۔ معنی یہ ہوگا شاید میں ایمان لے آؤں اور اس میں اچھے اعمال کروں۔

بعض نے کہا ہے کہ فِیۡمَا تَرَکۡتُ سے مراد ہے مال میں سے جو میں نے چھوڑا ہے یا دنیا میں جو کچھ میں نے چھوڑا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق فِیۡمَا تَرَکۡتُ کا ظرف ہونا بالکل ظاہر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ مَا تَرَکۡتُ مفعول بہ ہے۔ اور فی زائدہ ہے، یعنی شاید میں وہ عمل کروں جو میں نے اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ صالح ہے۔ مثلاً ایمان وغیرہ۔ یا شاید میں وہ عمل کروں جو عمل میں نے چھوڑا ہے اور وہ عمل بغیر کسی فساد کے صالح ہے۔ ابن جریر نے ابن جریج کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب بندہ مومن (موت کے) فرشتوں کو دیکھتا ہے تو وہ اسے کہتے ہیں کیا ہم تجھے دنیا کی طرف لوٹا دیں؟ تو وہ کہتا ہے کیا غموں اور پریشانیوں کے گھر کی طرف؟ (ایسا ہرگز نہیں) بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا چاہتا ہوں(1) لیکن کافر (اس حالت میں) یہ کہتا ہے رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ۔ (اے میرے پروردگار مجھے واپس دنیا کی طرف لوٹا دے)

صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات پسند کرتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا ازواج مطہرات میں سے کسی اور نے کہا بیشک ہم تو موت کو ناپسند

1۔ تفسیر طبری، جلد 18، صفحہ 40 (الامیریہ)

کرتے ہیں۔ (کون اسکی خواہش کرتا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا مطلب اس طرح نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ بندۂ مومن کے پاس جب موت حاضر ہوتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوشنودی اور عزت افزائی کی بشارت دی جاتی ہے۔ پس اس وقت اس کے نزدیک سامنے موجود شئی سے پسندیدہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ سے مل جانا پسند کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے۔ لیکن کافر کے پاس جب موت آتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور سزا کی خبر دی جاتی ہے۔ اور اس وقت اس کے نزدیک سامنے موجود شئی سے بڑھ کر ناپسندیدہ کوئی شئی نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے(1)۔

كَلَّا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ اسے واپس لوٹنے کی طلب پر جھڑکا جا رہا ہے، کہ اب اس کی دنیا کی طرف مراجعت نہیں ہوسکتی۔ اِنَّهَا كَلِمَةٌ سے مراد رَبِّ ارْجِعُوْنِ سے آخر تک اس کا قول ہے۔ خبر کی مجانست کے لئے اِنَّها میں ھا ضمیر مونث ذکر کی گئی ہے۔ كَلِمَةٌ سے مراد کلام کا وہ طائفہ ہے جس کے الفاظ آپس میں ایک دوسرے سے منظم ہوں۔ اور اس کا اطلاق جملہ مرکبہ مفیدہ پر ہوتا ہے۔ لیکن اصطلاح نحو میں کلمہ کا اطلاق لفظ مفرد پر ہوتا ہے۔

هُوَ قَائِلُهَا سے مراد ہے (کہ یہ ایک لغو بات ہے جو کافر کہہ رہا ہے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اس پر یاس وحسرت چھا رہی ہوتی ہے اور عذاب کا خوف دامنگیر ہوتا ہے۔ (اس لئے وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی آرزو کرتا ہے ورنہ ایسا ممکن نہیں)

مِنْ وَّرَآءِ هِمْ سے مراد ہے ان کے سامنے اور اس میں جمع کی ضمیر جماعت کفار کے لئے ہے۔

بَرْزَخٌ کے بارے مجاہد نے کہا کہ اس کا معنی حجاب (پردہ) ہے۔ یعنی ان کے اور واپس لوٹنے کے درمیان ایک حجاب ہے(2) ترکیب کلام میں مِنْ وَّرَآءِ هِمْ بَرْزَخٌ کا جملہ كَلَّا کے مضمون پر معطوف ہے۔ یعنی لا یکون ما یطلبون مِنْ وَّرَآءِ هِمْ بَرْزَخٌ۔ (جو وہ مطالبہ کررہے ہیں ایسا نہیں ہوسکتا اور ان کے آگے ایک آڑ ہے)

قتادہ نے کہا ہے کہ بَرْزَخٌ سے مراد دنیا کی عمر کا باقی رہنے والا حصہ ہے(3)۔ کیونکہ اس وقت تک زندگی کی طرف رجوع ممکن نہیں جب تک دنیا کی عمر ختم نہیں ہوجاتی۔ ضحاک نے کہا ہے کہ برزخ سے مراد موت سے لے کر قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے کی مدت ہے(4)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ برزخ سے مراد قبر ہے اور وہ دوبارہ زندہ کئے جانے کے دن تک قبر میں ہی رہیں گے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

”تو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے [1]۔ البتہ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی لوگ کامیاب و کامران ہوں گے [2]۔“

[1] (جب قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ آیت میں اس نفخ سے مراد نفخہ اولی ہے، یعنی جس کے سبب زمین وآسمان میں موجود ہر شئی بیہوش ہو کر گر پڑے گی اس دن ان کے درمیان رشتہ داریاں نہیں رہیں گی۔ اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (الفکر) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ " اور پھونکا جائے گا صور، پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ "فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ" تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔ "ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ" پھر دوبارہ (جب) اس میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو کر (حیرت سے) دیکھنے لگ جائیں گے۔ "وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ" اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے"(1) لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ آیت میں نفخہ سے مراد نفخۂ ثانیہ ہے۔ جس کے بعد سب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن کسی بندے یا بندی کا ہاتھ پکڑ کر اولین و آخرین سب لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔ پھر ندا دینے والا یہ ندا دے گا یہ فلاں بن فلاں ہے۔ پس جس کسی کا اس کے ذمے کوئی حق ہو وہ اپنا حق لینے کے لئے آ جائے پس جس کسی آدمی کا حق اپنے باپ' بیٹے' بیوی یا بھائی کے ذمے ہو گا وہ خوش ہو جائے گا اور وہ اپنا حق وصول کرے گا(2) پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ۔ (کہ اس دن ان کے درمیان رشتہ داریاں باقی نہیں رہیں گی اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے) اسی طرح کا قول حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی روایت کیا ہے، کہ اس سے مراد نفخۂ ثانیہ ہے۔ اور فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ اس دن حسب و نسب کے سبب آپس میں اظہار تفاخر نہیں کر سکیں گے۔ جیسا کہ وہ دنیا میں نسبی عظمت و شرف کے سبب باہم فخر کا اظہار کیا کرتے تھے(3) یا معنی یہ ہے کہ اس دن آپس کی رشتہ داریاں کوئی نفع اور فائدہ نہیں پہنچائیں گی۔ کیونکہ انتہائی دہشت زدہ اور حیرت میں مبتلا ہونے کے سبب باہمی رأفت و رحمت اور ایک دوسرے پر مہربانی کرنے کے جذبات ناپید ہو چکے ہوں گے۔ اس طرح کہ آدمی اپنے بھائی' ماں' باپ' بیوی اور اپنے بچوں سے بھی بھاگے گا۔ (قرآن کریم نے ارشاد فرمایا) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ۔

آیت میں مذکور بَيْنَهُمْ کی ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ اس سے قبل انہی کا ذکر ہے۔ مومنین کی طرف نہیں بلکہ مومنین کے بارے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ (کہ ہم ان کے ساتھ ان کی اولادوں کو بھی ملا دیں گے)

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہو گا تو اس دن مسلمانوں کے بچے اپنے ہاتھوں میں شراب طہور (کے جام لئے) نکلیں گے۔ تو لوگ انہیں کہیں گے ہمیں پلا دو۔ تو وہ جواب میں کہیں گے ابوینا۔ ابوینا۔ کہ ہم تو اپنے ماں باپ کو پلائیں گے۔ اپنے والدین کو پلائیں گے۔ حتیٰ کہ ساقط ہونے والا بچہ بھی جنت کے دروازے میں کھڑا ہو کر کہے گا میں جنت میں داخل نہیں ہوں گا یہاں تک کہ میرے والدین داخل ہو جائیں۔ اسے ابن ابی الدنیا نے عبداللہ بن عمر لیثی سے روایت کیا ہے اور اسی کے ہم معنی روایت حضرت ابو ذر راہ سے بھی مروی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث طیبہ میں موجود ہے قیامت کے دن میرے نسبی اور سسرالی رشتے کے سوا تمام نسبی اور سسرالی رشتے ختم ہو جائیں گے(4)۔ اسے ابن عساکر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مومنین کے نسب حضور نبی کریم ﷺ کے نسب میں داخل ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ مومنین کے باپ اور آپ کی ازواج

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مطہرات مومنین کی مائیں ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حدیث کا معنی ہے کہ قیامت کے دن حضور نبی کریم ﷺ کے نسب اور سبب (یعنی آپ کے ساتھ تعلق) کے سوا کوئی نسب اور سبب نفع مند ثابت نہیں ہوگا اور آپ ﷺ کے ساتھ تعلق اور سبب سے مراد قرآن اور ایمان ہے(1)۔
اور قول باری تعالیٰ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے رشتے اور تعلق کے بارے سوال نہیں کریں گے۔ جیسے دنیا میں کہا کرتے تھے کہ تو کون ہے اور تو کون سے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟ وغیرہ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ کہ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر آپس میں سوال کریں گے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے احوال تو پوچھیں گے؟) تو اس کے بارے ہمارا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا بیشک قیامت کے مختلف احوال اور مختلف مقامات ہوں گے۔ بعض مقامات پر ان پر شدید خوف طاری ہو جائے گا۔ اور اس کی شدت اور سختی انہیں باہم ایک دوسرے سے سوال کرنے سے مشغول کر دے گی۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کو نہیں پوچھیں گے۔ اور بعض مقامات میں وہ ذرا افاقہ اور سکون محسوس کریں گے تو اس وقت وہ ایک دوسرے کے احوال دریافت کرلیں گے(2)۔

ﷺ موازین موزون کی جمع ہے، یعنی اس کے وہ عقائد اور اعمال جن کا وزن کیا گیا۔ ان سے مراد اعمال صالحہ ہیں۔ (یعنی جن کے اعمال صالحہ کے پلڑے بھاری ہوں گے) بھاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ اعمال صالحہ زیادہ ہوں گے۔ اس کی نیکیاں، برائیوں کے مقابلہ میں ترجیح پا جائیں گی۔ (یا موازین میزان کی جمع ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس کے میزان میں نیکیوں کا پلڑہ جھک جائے گا۔ میزان کو صیغہ جمع موازین کی صورت میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یا تو ہر انسان کا علیحدہ علیحدہ میزان ہوگا۔ یا پھر اس لئے کہ میزان کا متعدد ہونا وزن کے متعدد ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اور ترکیب کلام میں مَنْ موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے۔ اور اس کی خبر فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ہے۔ اس کا معنی ہے۔ کہ وہی لوگ نجات پانے اور درجات حاصل کرنے کے سبب کامیاب ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اس جملے کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ یعنی فوضع المیزان فَمَنْ ثَقُلَتْ الخ۔

علمائے اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ میزان کا قائم ہونا اور اس کے ساتھ اعمال کا وزن کیا جانا برحق ہے' لیکن معتزلہ' روافض' خوارج اور اکثر اہل بدعت نے اس کا انکار کیا ہے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے البعث میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث جبرائیل نقل کی ہے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے حضور نبی کریم ﷺ سے ایمان کے بارے سوال کرتے ہوئے کہا اے محمد! ﷺ ایمان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ' اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کو ماننا اور تسلیم کرنا ہے۔ (علاوہ ازیں) جنت' دوزخ اور میزان کو تسلیم کرنا' موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو ماننا اور اچھی اور بری تقدیر کو تسلیم کرنا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا جب میں ایسا کرلوں تو میں مومن ہو جاؤں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا آپ نے سچ فرمایا(3)
حاکم نے مستدرک میں حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اسے مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (الفکر)　2۔ ایضاً، صفحہ 161　3۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 257 (العلمیۃ)

ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میزان رکھا جائے گا۔ اگر اس میں زمین وآسمان بھی رکھ دیئے جائیں تو اس میں (ان کے سما جانے کی بھی) وسعت ہوگی الحدیث(1)۔

ابن مبارک نے الزہد میں اور اجدی نے الشریعہ میں حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف قول نقل کیا ہے اور ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے(2)۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی الدنیا نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن صاحب میزان حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہوں گے(3)۔ میزان سے متعلقہ احادیث تواتر معنوی کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔

فصل: وزن کی کیفیت کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بندے کا اپنے اعمال سمیت وزن کیا جائے گا۔ پس بندہ مومن کا وزن اپنی نیکیوں کی مقدار کے مطابق ہوگا اور کافر کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن عظیم الجثہ موٹا تازہ آدمی آئے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر برابر بھی اس کا وزن نہیں ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ یہ حدیث متفق علیہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے(4)۔

پس مذکورہ تفسیر کے مطابق مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (جن کا پلڑہ ہلکا ہوگا) سے مراد کفار ہیں اور کوئی نہیں۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ میزان میں نیکیوں اور برائیوں کے صحائف (اعمال نامے) کا وزن کیا جائے گا۔

ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی سب کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر کی لمبائی حد نگاہ تک ہوگی، پھر رب کریم اسے فرمائے گا۔ کیا ان میں سے کسی شئی سے تو انکار کرتا ہے کہ میری طرف سے اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہو؟ وہ آدمی عرض کرے گا۔ نہیں۔ اے میرے پروردگار! تو پھر رب کریم فرمائے گا کیوں نہیں۔ بیشک تیری ایک نیکی ہمارے پاس ہے۔ آج کے دن تجھ پر ظلم نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک پرچہ نکالا جائے گا، جس پر یہ لکھا ہوگا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ تو اسے دیکھ کر وہ آدمی عرض کرے گا اے میرے رب! اس پرچے کی ان رجسٹروں کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا بیشک تیرے ساتھ کوئی ظلم اور زیادتی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ ترازو کے ایک پلڑے میں وہ رجسٹر رکھ دیئے جائیں گے۔ اور دوسرے میں وہ پرچہ رکھ دیا جائے گا۔ نتیجتاً وہ رجسٹر ہلکے ہو جائیں گے (ان کا پلڑہ اوپر اٹھ جائے گا) اور یہ پرچہ بھاری ہو جائے گا۔ (یعنی وزن کے سبب اس کا پلڑا جھک جائیگا) اور کوئی شئی بھی اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی سے بھاری اور وزنی نہیں ہوتی(5)۔ اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسن صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔

بعض نے یہ مؤقف اپنایا ہے کہ اعمال کو جسمانی وجود عطا کر کے ان کا وزن کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 629 (العلمیہ) 2۔ تفسیر ابی السعود، جلد 6، صفحہ 464 (العلمیہ) 3۔ تفسیر طبری، جلد 18، صفحہ 37 (الامیریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 370 (قدیمی) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 328 (وزارت تعلیم)

میں میری جان ہے کہ اگر تمام آسمان اور زمین جو کچھ ان میں ہے جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ ان کے نیچے ہے، اگر وہ سب لاکر ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں لا الٰہ الا اللّٰہ کی شہادت رکھ دی جائے تو ان کے مقابلہ میں شہادت والا پلڑا بھاری ہوکر جھک جائیگا۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے(1)۔

ابن عبدالرزاق نے علم کی فضیلت کے بیان میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابراہیم نخعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کے عمل لائے جائیں گے اور انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ تو وہ ہلکے اور خفیف ہونگے۔ پھر بادلوں کی مثل کوئی شئی لاکر ترازو کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی، تو وہ پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ پھر اسے کہا جائیگا کیا تو جانتا ہے یہ کیا ہے؟ تو وہ آدمی عرض کرے گا نہیں۔ تو اسے بتایا جائے گا یہ اس علم کی فضیلت ہے جس کی تعلیم تو لوگوں کو دیا کرتا تھا۔(2)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی فضیلت کے بیان میں حضرت عمران بن حصین سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہداء کے خون کے مابین موازنہ کیا جائے گا تو علماء کی روشنائی شہداء کے خون کے مقابلہ میں بھاری ہو جائے گی(3)۔

میں کہتا ہوں کہ بندے کو اپنی مجسم نیکیوں سمیت یا نیکیوں کے صحائف سمیت میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ (اب چاہے نیکیوں کی مجسم صورت ہو یا نیکیوں کے صحائف ہوں) دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ صحائف کا بوجھ نیکیوں کے بوجھ کے سبب ہوگا۔ اور اس کی مجسم برائیوں یا وہ صحائف جو گناہوں کے بوجھ کے سبب بھاری ہوں گے، انہیں ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ تو کافر کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ یعنی اس کی میزان میں اس کا کوئی وزن اور بوجھ نہیں ہوگا۔

لیکن بندہ مومن کا ترازو وزن سے خالی نہیں ہوگا، اگرچہ وہ لا الٰہ الا اللّٰہ کی شہادت کے سبب ہی ہو۔ اور اسی لئے کنایۃً ارشاد فرمایا فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ (جن کے پلڑے بھاری ہوں گے) مگر بندہ مومن کے وزن اور ثقل کے کئی مراتب اور درجات ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض ایسے ہوں گے جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے گناہوں کو دور کر دیا۔ (یعنی انہیں مٹا ڈالا) تو ان کے میزانوں کے پلڑے سب سے زیادہ وزنی اور بھاری ہوں گے، ان کے گناہوں کا پلڑا خالی اور فارغ ہونے کے سبب بالکل اٹھ جائیگا۔

اور کچھ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے اعمال صالحہ بھی کیے ہوں گے اور اعمال سیئہ بھی۔ (یعنی ان میں دونوں قسم کے اعمال پائے جائیں گے) یہی لوگ ہیں جن کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں سے حساب لیا جائیگا۔ پس جس کی ایک نیکی بھی گناہوں کی نسبت زیادہ ہوگی وہ جنت میں داخل ہو جائیگا۔ اور جس کے گناہ نیکیوں سے بڑھ جائیں گے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ تاکہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جائے۔ جیسا کہ لوہا آگ میں پڑکر میل کچیل اور دیگر آمیزشوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ پس وہ آدمی پھر جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا بیشک میزان ایک حبہ (دانق) کے وزن کے سبب بھی ہلکا اور بھاری ہو جاتا ہے۔

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 12، صفحہ 254 (التراث الاسلامی)

2۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 11، صفحہ 253 (المکتب الاسلامی)

3۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 173 (التراث الاسلامی)

اور وہ آدمی جس کی نیکیاں اور گناہ برابر اور مساوی ہو جائیں گے، وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوگا۔ (اور یہ لوگ اسی مقام پر رہیں گے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے جنت میں داخل ہونے کا حکم ارشاد فرما دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے اور اس میں کفار کا حال مذکور نہیں، اس لئے کہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی نیکی بھی نہیں ہوگی۔ اور قرآن کریم میں نیک اور صالح مومنین اور کفار کے حال کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غالباً گنہگار مومنین کے ذکر سے خاموش ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں تمام مومنین عادل تھے۔ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے اجتناب کرنے والے تھے یا پھر توبہ کرنے والے تھے اور گناہ سے توبہ کرنے والا اس کی طرح ہوتا ہے جس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ (اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تھے)

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ﴿١٠٤﴾

"اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے [1]۔ بری طرح جھلس دے گی ان کے چہروں کو آگ اور وہ اس میں دانت نکالے ہوں گے [2]۔"

[1] اور جن کے نیک اعمال ہلکے ہوں گے یا نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا اس طرح کہ اس کا بالکل وزن ہی نہیں ہوگا تو وہ بالیقین کافر ہی ہوگا۔

بزار اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ابن آدم کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور میزان کے دو پلڑوں کے درمیان اسے کھڑا کر دیا جائیگا اور میزان پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جائے گا۔ پس اگر اس کے پلڑے بھاری رہے تو وہ فرشتہ اتنی بلند آواز سے نداء دے گا کہ وہ ساری مخلوق کو سنائی دے گی اور کہے گا فلاں سعادت منداور خوش بخت ہو گیا اس کے بعد کبھی شقی اور بد بخت نہیں ہوگا۔ اور اگر اس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہ فرشتہ اتنی بلند آواز سے پکارے گا کہ وہ ساری مخلوق کو سنائی دے گی اور کہے گا فلاں شقی اور بد بخت ہو گیا۔ اس کے بعد کبھی بھی سعادت منداور خوش بخت نہیں ہوگا(1)۔

اس حدیث میں بھی پلڑا ہلکا ہونے سے مراد وہی ہے جس کا بالکل کوئی وزن نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں شاید گنہگار مومنین کے اعمال کا وزن دو بار کیا جائے گا۔ اگر ان کی نیکیوں کا پلڑا کچھ ہلکا ہوگا تو انہیں جہنم میں داخل کر دیا جائے گا یہاں تک کہ (وہ گناہوں کی آلودگی سے) پاک صاف ہو جائیں۔ اس طہارت اور پاکیزگی کے حصول کے بعد ان کے اعمال کا دوبارہ وزن کیا جائے گا، تو پھر اس کے پلڑے وزنی اور بھاری ہو جائیں گے اور اس وقت وہ فرشتہ نداء دے گا فلاں اس طرح سعادتمند اور خوش بخت ہو گیا کہ اس کے بعد کبھی بھی شقی اور بد بخت نہیں ہوگا۔ اس بارے میں کچھ تحقیقات ہم نے سورۃ القارعہ میں ذکر کی ہیں۔ اس بات پر دلیل کہ اس آیت سے مراد صرف کفار ہیں۔ گنہگار مومنین ان میں شامل نہیں۔ آگے آنے والا ارشاد باری تعالیٰ ہے جو کہ ترکیب کلام میں مَنْ موصول کی خبر ہے، یعنی فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا اور نقصان پہنچایا۔ اور اپنے نفس کو کامل بنانے کا زمانہ ضائع کر دیا۔ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ صلہ سے بدل ہے یا أُولَٰئِكَ کی دوسری خبر ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 635 (الفکر)

۲ (آگ ان کے چہروں کو بری طرح جھلس دے گی)، یعنی آگ ان کے چہروں کو جلا دے گی قاموس میں اسی طرح ہے (1)۔ لیکن مومنین کے چہروں کو آگ نہیں جلائے گی۔ جیسا کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس امت کے کچھ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے تو ان کے چہرے کے دائرہ کے سوا آگ انہیں جلا دے گی۔ پھر کچھ وقت کے بعد انہیں جہنم سے نکال لیا جائے گا (2)۔

ابن مردویہ اور ضیاء نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ کے بارے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آگ انہیں ایک ہی بار اتنا جلا دے گی کہ ان کے گوشت بہہ کر ایڑیوں پر جا پہنچیں گے (3)۔

طبرانی نے الاوسط میں اور ابو نعیم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اہل جہنم کو جب ہانک کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہ انہیں ایک بار میں اتنا جلا دے گی کہ وہ ہڈیوں پر گوشت باقی نہیں چھوڑے گی مگر اسے ان کی ایڑیوں پر پھینک دے گی (4)۔

وَهُمْ فِيهَا كَالِحُوْنَ کا جملہ ضمیر مجرور مضاف الیہ (یعنی وُجُوْهَهُمْ کی ضمیر سے) حال ہے۔ كَلُوْحٌ کا معنی ہے دانتوں کے اوپر سے دونوں ہونٹوں کا سکڑ جانا۔

ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قول باری تعالیٰ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُوْنَ کے بارے فرمایا کہ آگ اسے اس طرح بھون دے گی کہ اس کا اوپر والا ہونٹ اوپر کی جانب اتنا سکڑ جائے گا کہ وہ اس کے سر کے وسط تک جا پہنچے گا اور نیچے والا ہونٹ اتنا لٹک جائے گا کہ وہ اس کی ناف سے جا لگے گا۔ (5)

ہناد نے حضرت ابو مسعود سے وَهُمْ فِيهَا كَالِحُوْنَ کے بارے یہ نقل کیا ہے کہ وہ اس میں پکے ہوئے سر کی مثل ہو جائیں گے کہ ان کے دانت ظاہر (باہر نکلے ہوئے) ہوں گے اور ہونٹ سکڑے ہوئے ہوں گے (6)۔

أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿١٠٥﴾ قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ﴿١٠٧﴾ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴿١٠٨﴾

"(اب منہ کیوں بسورتے ہو؟) کیا ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں تمہارے سامنے اور تم انہیں جھٹلایا کرتے تھے (معذرت کرتے ہوئے) کہیں گے اے ہمارے رب! غالب آ گئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے ۱۔ اے ہمارے مالک! (ایک بار) ہمیں نکال اس سے۔ پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے ۲۔ جواب ملے گا پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ ۳"

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 359 (التراث العربی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 107 (قدیمی)
3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 31 (العلمیہ)
4۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 711 (الفکر)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم)
6۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 31 (العلمیہ)

1؎ جمہور نے شِقْوَتُنَا کو شین کے کسرہ اور قاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ حمزہ اور کسائی نے اسے شِقَاوَتُنَا، یعنی شین اور قاف کے فتحہ اور اس کے بعد الف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ہماری شقاوت اور بدبختی ہم پر قابض ہوگئی۔ ہم پر غالب آ گئی یہاں تک کہ ہمارے احوال اس برے اور اذیت ناک انجام تک پہنچانے والے ہو گئے۔ اور ہم حق سے بھٹکے ہوئے لوگ تھے۔

2؎ اے ہمارے رب! ایک بار ہمیں اس آگ سے نکال۔ پھر اگر ہم نافرمانی اور تکذیب کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم اپنے نفسوں کے ساتھ ظلم کرنے والے ہوں گے، تو اس وقت کے بعد ہمیں عذاب سے نجات اور خلاصی عطا نہ کرنا۔

3؎ تو اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرمائے گا پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں۔ یعنی ذلت و رسوائی کے ساتھ خاموش رہو کیونکہ یہ التجاء اور دعا کا مقام نہیں اور دور ہو جاؤ۔ قاموس میں ہے خَسَأَ الْكَلْبَ یہ باب مَنَعَ يَمْنَعُ ہے۔ (اس نے کتے کو دھتکار کر نکال دیا) مصدر خساءً اور خسوءً ہے۔ اور خَسَأَ الْكَلْبُ (کتا دور ہو گیا) جیسا کہ اِنْخَسَأَ باب انفعال کا یہی معنی ہے(1) گویا یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

وَلَا تُكَلِّمُوْنِ کو وصل اور وقف دونوں حالتوں میں یعقوب نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے بغیر یا کے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے۔ اور تم مجھ سے عذاب اٹھانے کے بارے بات تک مت کرو۔ کیونکہ میں تم سے عذاب نہیں اٹھاؤں گا۔ اس وقت وہ ہر قسم کی امید اور گنجائش سے مایوس ہو جائیں گے۔ یا معنی یہ ہے تم میرے ساتھ مت بولو۔ (یعنی مطلق خاموش رہنے کا حکم ہے) حسن نے کہا ہے کہ یہ آخری کلام ہے جو اہل دوزخ کریں گے پھر اس کے بعد کوئی کلام نہیں کریں گے۔ مگر یہ کہ وہ گدھوں کی آواز کی مثل آوازیں نکالیں گے اور کتوں کے بھونکنے کی مثل وہ بھونکیں گے نہ خود بات سمجھیں گے اور نہ اپنی بات سمجھا سکیں گے(2)۔

علامہ قرطبی نے کہا ہے جب انہیں یہ کہا جائیگا اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ تو ان کی امیدیں ختم ہو جائیں گی اور وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگ جائیں گے۔ اور اس وقت ان پر دوزخ بند کر دی جائے گی(3)۔

ہناد، طبرانی، ابن ابی حاتم، حاکم، بیہقی اور عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت نقل کی ہے کہ بیشک اہل نار مالک (داروغہ جہنم) کو پکار کر کہیں گے اے مالک! تیرے رب کو ہمارا فیصلہ کر دینا چاہئے تو مالک چالیس سال تک انہیں ویسے چھوڑے رکھیں گے، کوئی جواب نہیں دیں گے پھر جواب دیں گے تو کہیں گے اِنَّكُمْ مَّاكِثُوْنَ۔ (بیشک تم (ہمیشہ کے لئے) یہیں ٹھہرنے والے ہو) پھر وہ اپنے رب کو پکاریں گے۔ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔ (اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں اس سے نکال پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے) پس اللہ تعالیٰ بھی انہیں دنیا کی مدت سے دوگنا مدت تک ویسے ہی چھوڑے رکھے گا انہیں کوئی جواب نہیں دے گا۔ پھر انہیں جواب دیتے ہوئے فرمائے گا اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۔ (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور میرے ساتھ مت بولو) فرمایا اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے اور اس کے بعد کوئی کلام نہیں کر سکیں گے، مگر گدھوں کی آواز کی مثل آوازیں نکالیں گے اور اسی میں پڑے رہیں گے(4) اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اہل دوزخ پانچ مرتبہ پکاریں گے۔ چار بار کی پکار کا تو اللہ تعالیٰ انہیں

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 102 (التراث العربی)
2۔ تفسیر ابی سعود، جلد 4، صفحہ 433 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 162 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 32 (العلمیۃ)

جواب دے گا اور جب پانچویں بار پکاریں گے تو اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے کلام نہیں کر سکیں گے۔ وہ کہیں گے رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ اَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ۔ (اے ہمارے رب! تو نے دو مرتبہ ہمیں موت دی اور دو بار ہمیں زندگی عطا کی۔ اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ ہے؟) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ۔ (تمہاری یہ حالت اس وجہ سے ہے کہ جب ایک خدا کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بنایا جاتا تھا تو تم یقین کر لیتے تھے پس (آج) فیصلہ اسی اللہ کے ہاتھ میں ہے جو سب سے بالا اور بزرگ ہے) پھر وہ کہیں گے رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔ (اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا اب ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ ہم نیک کام کریں بلاشبہ ہم یقین رکھتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے سو اس کا مزہ چکھو بیشک ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے اور تم اپنے کرتوتوں کے بدلے دائمی عذاب کا مزہ چکھو) پھر وہ کہیں گے رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ۔ (اے ہمارے رب! تھوڑی مدت تک ہمیں مہلت دے دے تاکہ ہم تیری دعوت کو قبول کر لیں اور پیغمبروں کی اتباع کریں) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ۔ (کیا تم نے اس (قیامت کے برپا ہونے) سے پہلے (اپنی زندگی میں) قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم کو زوال نہ ہوگا) پھر وہ عرض کریں گے رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ۔ (اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں جو ان کے خلاف ہوں جو پہلے ہم نے کئے) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِیْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ۔ (کیا ہم نے تم کو اتنی زندگی نہیں دی کہ جو اس میں نصیحت حاصل کرنا چاہے وہ نصیحت حاصل کر لے اور (کیا) تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا تھا اب مزہ چکھو (آج) کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے) پھر وہ کہیں گے قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔ (اے ہمارے رب ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے اے ہمارے مالک! (ایک بار) ہمیں اس سے نکال۔ پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ (پھٹکارے ہوئے اس میں پڑے رہو اور میرے ساتھ مت بولو) تو اس کے بعد ان کے چہرے گوشت کا ٹکڑا ہو جائیں گے جس میں نہ منہ ہوگا نہ ناک۔ سانس ان کے پیٹوں میں ہی گردش کرنے لگے گا (1)۔ اور ان پر جہنم کے سانپ اور بچھو ٹوٹ پڑیں گے۔ اگر ان میں سے کوئی سانپ مشرق میں پھونک مارے تو اس سے مغرب میں رہنے والے جل جائیں اور اگر ان میں سے کوئی بچھو اہل دنیا کو ڈس دے تو (اس کے زہر سے) وہ سب جل جائیں۔ بیشک یہ سانپ اور بچھو ان پر حملہ آور رہیں گے اور ان کے گوشت اور جلدوں میں گھس جائیں گے۔ اور وہاں ان کی ایسی آوازیں سنائی دیں گی جیسے جنگلوں میں وحشی جانوروں کی آوازیں ہوتی ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْ عِبَادِیْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِیًّا حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِیْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 32 (العلمیۃ)

تَضْحَكُوْنَ ۝ اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىٕزُوْنَ ۝

(تمہیں یاد ہے) ایک گروہ میرے بندوں میں سے ایسا تھا جو عرض کیا کرتا تھا اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں' سو تو بخش دے ہمیں اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ تم نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا' حتیٰ کہ اس مشغلہ نے غافل کر دیا تمہیں میری یاد سے اور تم ان پر قہقہے لگایا کرتے تھے ۱؎ میں نے بدلہ دے دیا انہیں آج ان کے صبر کا (ذرا دیکھو) وہی یہیں مراد کو پانے والے ۲؎''

۱؎ سِخْرِیًّا کو اہل مدینہ' حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورہ صاد میں سین کے ضمہ کے ساتھ سُخْرِیًّا پڑھا اور باقیوں نے سین کے کسرہ کے ساتھ سِخْرِیًّا پڑھا ہے۔ جبکہ سورہ زخرف میں سین کے ضمہ پر تمام نے اتفاق کیا ہے۔ کسائی اور فراء نے کہا ہے سین کے کسرہ کے ساتھ لفظ سِخر کا معنی کسی سے بالقول' یعنی زبان سے استہزاء اور تمسخر کرنا ہے اور سین کے ضمہ کے ساتھ لفظ سُخر کا معنی ہے کسی کو بالفعل تابع بنالینا اور غلام بنالینا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ زخرف میں سین کے ضمہ پر تمام کا اتفاق ہے۔ کیونکہ وہاں صرف تابع اور غلام بنا لینے کا مفہوم ہے اس کے علاوہ کسی اور معنی کا وہ احتمال ہی نہیں رکھتا۔

خلیل کا موقف ہے کہ دونوں لغتوں کے اعتبار سے یہ لفظ مترادف اور ہم معنی ہے۔ جیسا کہ بحر لُجّی اور بَحر لِجّی۔ کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ اور کَوْکَبٌ دِرِّیٌّ میں لام اور دال مضموم بھی ہیں اور مکسور بھی۔ اور یہ مترادف ہیں (1)

قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے سخروا منه و به۔ (انہوں نے استہزاء کیا) جیسا کہ استسخر کا معنی ہے اس نے مذاق کیا' ٹھٹھا کیا۔ اور السُّخْرِیَّةُ اور السِّخْرِیُّ اسم ہیں۔ سین مضموم بھی ہے اور مکسور بھی اور سَخَرَةٌ جیسا کہ مَنَعَةٌ ہے۔ (یعنی باب مَنَعَ یَمْنَعُ) مصدر سِخْرِیًّا اور سُخْرِیًّا اس کا معنی ہے ایسا کام کرنے کا پابند کر دینا جسے وہ نہ کرنا چاہتا ہو (بیگار لینا) اور مغلوب کر دینا' مجبور کر دینا (2) نہایہ میں اسی طرح ہے۔

بہر حال ہر معنی اور تقدیر کے مطابق سخریٌ مصدر ہے اور اس میں مبالغہ کے لئے یا نسبت کا اضافہ کیا گیا ہے اور معنوی لحاظ سے یہاں استہزاء اور تمسخر مراد ہے۔ اور اس پر قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے حَتّٰۤی اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِیْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ۔ کیونکہ ضحک (ہنسنا) استہزاء پر ہی مرتب ہوتا ہے نہ کہ تابع اور غلام بنانے پر۔ (یعنی جب استہزاء کیا جاتا ہے تو پھر ہنسی بھی آتی ہے فقط کسی کو اپنا تابع یا غلام بنانے پر ہنسی نہیں آتی لہٰذا یہاں لفظ تضحکون اس پر دلالت کرتا ہے کہ سخر سے مراد استہزاء ہے)

اس میں حتیٰ ابتدائیہ ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے مرض فُلَانٌ حَتّٰی لَا یَرْجُوْنَهٗ۔ یعنی تمہارے ان کے ساتھ استہزاء کرنے اور ان پر قہقہے لگانے میں مشغول ہونے نے میری یاد سے تمہیں غافل کر دیا ہے۔ یہاں بھلانے اور غافل کر دینے کی نسبت مومنین کی طرف مجازاً کی گئی ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار' صہیب اور سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر فقراء صحابہ کرام کے بارے نازل ہوئی ہے کیونکہ کفار قریش ان کے ساتھ استہزاء کرتے تھے (3)

۲؎ ان مومنین نے تمہاری اذیت رسانی اور استہزاء کرنے پر جس صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا میں نے آج انہیں اس کا بدلہ دے دیا۔ (ذرا دیکھو) وہی مراد کو پانے والے ہیں۔ نہ کہ تم۔ حمزہ اور کسائی نے استیناف کی بنا پر اَنَّهُمْ کے ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے ہمزہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 162 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 571 (التراث العربی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 162 (الفکر)

کو مفتوح پڑھا ہے اس لئے کہ یہ جَزَیْتُهُمْ کا مفعول ثانی ہے۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا (ذرا بتاؤ) کتنے سال تم زمین میں ٹھہرے رہے [1] کہیں گے ہم ٹھہرے بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ آپ پوچھ لیں سال گننے والوں سے [2] ارشاد ہوگا تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ [3] کاش! تم اس (حقیقت) کو (پہلے ہی) جان لیتے ہو''

[1] قَالَ کی جگہ بعض نے قُلْ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قیامت کے دن فرشتے کو حکم ہوگا یا اہل نار کے روساء میں سے کسی کو کہ تمام اہل دوزخ سے یہ سوال کریں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ خطاب اہل دوزخ میں سے ہر ایک کو ہے کہ اس سوال کا جواب دو (قُلْ جواب هذا)

باقیوں نے اسے الف کے ساتھ قَالَ پڑھا ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا۔ ذرا بتاؤ کتنے سال تم زمین میں ٹھہرے رہے، یعنی زندگی کی حالت میں اور مرنے کے بعد قبروں میں۔ ترکیب کلام میں عَدَدَ سِنِيْنَ كَمْ کی تمیز ہے۔

[2] تو جواب میں کفار زمین میں اپنے ٹھہرنے کی مدت کو انتہائی کم اور قلیل قرار دیتے ہوئے کہیں گے، ہم ٹھہرے تھے بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ (اب انہوں نے اس مدت کو انتہائی کم بیان کیا اسکی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں) مثلاً وہ آدمی جسے عذاب دیا جا رہا ہو وہ اپنی تکلیف اور مصیبت کے ایام کو انتہائی طویل خیال کرتا ہے اور اس سے پہلے کے معاملات کو انتہائی قلیل اور چھوٹا گمان کرتا ہے۔ یا اس لئے کہ زمین پر ٹھہرنے کی مدت گزر چکی تھی اور جو چیز گزر جائے وہ معدول کے حکم میں ہو جاتی ہے (یعنی اسے حقیر سمجھ کر اس سے رخ پھیر لیا جاتا ہے) یا اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ حیات اخروی کی مدت ختم ہونے والی نہیں، اس لئے اس کی نسبت حیات دنیوی اور قبر میں رہنے کی مدت انتہائی قلیل اور کم ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے ایام ان کے لئے خوشی اور مسرت کے ایام تھے اور خوشی کے دن چھوٹے متصور ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وجہ تب بیان کی جا سکتی ہے جبکہ سوال کا تعلق فقط دنیوی حیات کی مدت سے ہو۔ قبر میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے سوال نہ ہو۔ کیونکہ ان کے لئے ایام قبر خوشی اور مسرت کے دن نہیں، کیونکہ نصوص قطعیہ اور اجماع سے (بالخصوص کفار کے لئے) عذاب قبر ثابت ہے۔

فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ۔ (آپ پوچھ لیں سال گننے والوں سے) یہاں عَادِّيْن یعنی گننے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال محفوظ رکھتے ہیں اور انہیں شمار کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے پاس ہمارے ٹھہرنے کی مدت بدرجہ اولیٰ محفوظ ہوگی۔ یا عادین سے مراد وہ انسان ہیں جو ان ایام کو شمار کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یعنی اگر آپ اس مدت کی تحقیق کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر ان گننے والوں سے اس کے بارے پوچھ لیں۔ کیونکہ ہم تو عذاب میں گھرے ہوئے ہیں جو ہمیں اس مدت کی یاد دلانے سے مانع ہے۔

[3] قَالَ کو حمزہ اور کسائی نے بغیر الف کے صیغہ امر کی صورت میں قُلْ پڑھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امر ہے۔ اور باقیوں نے اسے بصورت حکایت الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قَالَ اللّٰه تعالىٰ (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اِنْ لَّبِثْتُمْ میں اِنْ نافیہ ہے یعنی تم دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا زمانہ یا بہت کم۔ یعنی تقدیر عبارت ہے زَمَانًا قَلِيْلًا یالبثا قليلا۔ (پہلی صورت میں مفعول فیہ ہے اور دوسری میں

مفعول مطلق۔ معنی یہ ہے کہ پیش آنے والے عذاب کی مدت کی نسبت تم بہت کم یا قلیل وقت دنیا میں ٹھہرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم بخدا! آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال اسطرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں رکھے اور پھر اسے باہر نکال کر دیکھے کہ وہ سمندر کے پانی میں سے کتنی مقدار ساتھ لے کر باہر آئی۔ (یعنی دنیا کی مدت حیات کو آخرت کی مدت سے وہی نسبت ہے جو انگلی سے لگنے والے پانی کو سمندر کے پانی سے ہے) اسے احمد، مسلم اور ابن ماجہ نے مستورد سے روایت کیا ہے (1)

لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (کاش تم اس (حقیقت) کو (پہلے ہی) جان لیتے) تقدیر عبارت اس طرح ہے لَوْثَبَتَ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ذٰلِكَ۔ اس میں کلمہ لو تمنی اور توبیخ کے لئے ہے، یعنی کاش تم جان لیتے کہ دنیا میں تمہارا قیام اور ٹھہرنا قلیل ہے۔ تو پھر تم اس مدت کو لہو ولعب اور خواہش پرستی میں ضائع نہ کرتے اور نہ تم اس دن کی ملاقات کو بھولتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر ہو۔ اسے بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔ امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ تو اپنے آپ کو اہل قبور میں سے شمار کر (2)

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

''کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے [1]۔ پس بہت بلند ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے (بے مقصد تخلیق سے) نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ مالک ہے عزت والے عرش کا [2]۔ اور جو پوجتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو، جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ بلاشبہ نہیں کامیاب ہوں گے حق کا انکار کرنے والے۔ اور (اے محبوب!) آپ (یوں) عرض کرو میرے رب! بخش دے (میری گنہگار امت کو) اور رحم فرما (ہم سب پر) اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ [3]''

1۔ اَفَحَسِبْتُمْ میں فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے اور ہمزہ استفہام انکاری اور توبیخ کے لئے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَتَوَهَّمْتُمْ فَحَسِبْتُمْ۔ یعنی کیا تمہیں وہم ہوا اور تم نے یہ گمان کر رکھا تھا؟

اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا میں اَنَّ کے بعد ما کافہ ہے جو اسے عمل سے روک رہا ہے۔ لہٰذا یہ جملہ فعلیہ پر داخل ہے۔ اور پھر یہ اپنے جملہ سمیت حَسِبْتُمْ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور عَبَثًا مفعول لہ ہے۔ یا خَلَقْنٰكُمْ فعل کے فاعل سے حال ہے۔ یا مفعول سے حال ہے۔ یا پھر حرف جر کے محذوف ہونے کے سبب یہ منصوب ہے۔ یعنی ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا نہیں کیا، بغیر حکمت کے پیدا نہیں کیا یا تمہیں محض لہو ولعب کے لئے پیدا نہیں کیا۔ یا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا درآنحالیکہ تمہاری تخلیق سے کسی حکمت اور مقصد کا ارادہ نہ ہوا یا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا درآنحالیکہ تمہیں طاعت، معرفت اور جزاء سے مکلف کرنا مقصود نہ ہو یا ہم نے تمہیں اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تم کھیلتے رہو اور بیکار زندگی بسر کرو۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کی معرفت حاصل کرو، اس کی عبادت میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 384 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 57 (وزارت تعلیم)

مصروف رہو اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے رہو۔ مذکورہ بالا تراکیب کے مطابق تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہے۔ ''اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا اَیْ لَمْ نَخْلُقْكُمْ خَلْقًا عَبَثًا لِتَلْعَبُوْا اَوْ لِلتَّلَهِّیْ بِكُمْ اَوْ عَابِثِیْنَ اَوْ حَالَ كَوْنِكُمْ مَبْعُوْثِیْنَ اَوْ لِتَلْعَبُوْا وَتَعْبَثُوْا''۔

وَّ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ میں حمزہ اور کسائی نے باب مجرد سے صیغہ معروف کی صورت میں تا کو فتحہ اور جیم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی تَرْجِعُوْنَ۔ اور باقیوں نے باب افعال سے صیغہ مجہول کی صورت میں تاء کو ضمہ اور جیم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تُرْجَعُوْن۔ یہ اِرْجَاع سے بنایا گیا ہے۔ اور ترکیب کلام میں اَنَّ اپنے جملے کے ساتھ مل کر اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم جزاء کے لئے ہماری طرف لوٹنے والے نہیں ہو۔

لے پس بہت بلند ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے، یعنی وہی بادشاہی اور حکومت کا حق رکھتا ہے کیونکہ اس کے سوا تمام بالذات مملوک ہیں اور بالعرض مالک ہیں، کبھی ان کی حکومت ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ (لیکن اللہ تعالیٰ بالذات مالک ہے اور اس کی حکومت او بادشاہی ہمہ وقت ہر شئی پر قائم ہے) فَتَعٰلَی میں فاء تعلیل کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ انکار کی علت بیان کرنے کے محل میں واقع ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند اور پاک ہے کہ اس کا کوئی فعل بے مقصد ہو۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ عزت والے عرش کا مالک ہے۔ یہاں عرش کی صفت کریم ذکر کی گئی ہے، کیونکہ بالخصوص عرش ہی ان تجلیات کریمہ کا مہبط ہے جن کا نزول اکرم الاکرمین رب کی جانب سے ہوتا ہے۔

ع اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پوجتا ہے، یعنی غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ترکیب کلام میں لَا بُرْهَانَ لَهٗ اِلٰهًا کی دوسری صفت ہے اور یہ صفت اسے لازم ہے، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت باطل ہے۔ اور باطل کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ صفت تاکید کے لئے ذکر کی گئی ہے۔ یا حکم توحید کی بنا اسی پر ہے۔ اسمیں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ایسا دین اپنانا جس پر کوئی دلیل نہ ہو وہ ممنوع ہے چہ جائیکہ (ایسا دین اختیار کیا جائے) جس کے باطل ہونے پر دلائل موجود ہوں۔ یا یہ شرط و جزا کے درمیان جملہ معترضہ ہے کیونکہ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ جملہ مَنْ شرطیہ کی جزا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اتنی مقدار اسے سزا دے گا جتنا وہ حق رکھتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ یہ ان کی جزا کا بیان اور وضاحت ہے۔ یعنی انہیں جہنم کے عذاب سے نجات حاصل نہیں ہوگی اور جنت میں داخل ہونے کے لئے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ کی ابتداء میں مومنین کے لئے فلاح وکامرانی کا ذکر کیا تھا اور سورۃ کا اختتام اس پر کیا کہ کفار کبھی بھی فلاح وکامرانی نہیں پا سکیں گے۔ پھر اپنے رسول معظم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ استغفار کریں اور رحم طلب کریں، تاکہ آپ کی امت کے اہل ایمان بھی آپ کی پیروی کریں اور وہ فلاح وکامرانی کے مدارج کو پانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ اس میں جملہ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ اِرْحَمْ فعل کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے مفعول محذوف ہے۔ یعنی جسے بخش دیا جائے اور جس پر رحم کیا جائے۔ اس لئے تاکہ دعا میں عمومیت پیدا ہو جائے کہ وہ مغفرت کے سبب تمام ضرر رساں اور تکلیف دینے والی چیزوں کی نفی کی ضامن ہو اور رحمت کے سبب تمام نفع بخش اشیاء کو لانے کا سبب ہو۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اخنش سے یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک مجنون آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لایا گیا، تو آپ نے اس کے دونوں کانوں میں اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا اختتام سورۃ پڑھ کر دم کر دیا تو وہ صحت یاب ہو گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے آپ سے پوچھا تم نے اس کے کان میں کیا پڑھ کر دم کیا ہے تو انہوں نے سب کچھ آپ ﷺ کو عرض کر دیا۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ اَنَّ رَجُلًا مُوْقِنًا قَرَأَهَا عَلٰی جَبَلٍ لَزَالَ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر کوئی شخص پورے ایقان کے ساتھ یہ پڑھ کر پہاڑ پر بھی دم کر دے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے۔(1)

الحمد للہ سورۃ المؤمنون کی تفسیر 15 صفر 1204ھ کو ختم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے سورۃ المؤمنون کا ترجمہ 9 رمضان المبارک 1421ھ بمطابق 6 دسمبر 2000ء بروز بدھ صبح آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰالِکَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا وَمُوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 164 (الفکر)

سورۃ النور

ایاتھا ۶۴　سُوْرَۃُ النُّوْرِ مَدَنِیَّۃٌ ۲۴　رکوعاتھا ۹

سورۂ نور مدنیہ ہے اس میں 9 رکوع اور 64 آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

یہ ”(ایک عظیم الشان) سورۃ ہے [1] جو ہم نے نازل فرمائی ہے اور ہم نے فرض کیا ہے اس (کے احکام) کو [2] اور ہم نے اتاری ہیں اس میں روشن آیتیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ [3]“

[1] سورۃ کا لفظ یا تو مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر عبارت ھذہ سورۃ ہوگی اور دوسری صورت میں فیما او حینا الیک سورۃ ہوگی۔

[2] انزلناھا' سورۃ کی صفت ہے۔ یعنی اس سورت کو ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے احکام پر عمل کرنا بھی ہم نے لازم کیا ہے' بعض علماء نے فرضناھا کا معنی قدرناھا کیا ہے، یعنی ہم نے اس میں حدود کو مقدر فرمایا ہے۔ جمہور قراء نے فرضناھا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ ابن کثیر اور ابوعمرو نے کثرت کے معنی پر دلالت کرنے کے لئے باب تفعیل سے شد کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اس میں فرائض کثیر ہیں یا جن پر یہ احکام فرض ہیں وہ زیادہ ہیں۔ یعنی تم پر اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں پر اس کے احکام فرض کئے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرضنا کا معنی فصلنا اور بینا ہے، یعنی ہم نے وضاحت کے ساتھ اس کے احکام کو بیان فرمایا ہے۔

[3] اور اس سورہ پاک کی آیات بڑی واضح ہیں۔ ان کے مراد و مقصود میں کچھ ابہام و اشتباہ نہیں ہے اور اس سورت کے احکام کے نزول کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو یا محارم الہیہ سے اجتناب کرو۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ②

”جو عورت بدکار ہو اور جو مرد بدکار ہو [1] تو لگاؤ ہر ایک کو [2] ان دونوں میں سے سو (سو) درے [3] اور نہ آئے تمہیں ان دونوں پر (ذرا) رحم اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملہ میں [4] اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ پر اور روز آخرت پر [5] اور چاہئے کہ مشاہدہ کرے دونوں کی سزا کو اہل ایمان کا ایک گروہ [6]“

[1] اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ مبتدا ہے اور اس کی خبر سیبویہ کے نزدیک سنذکر حکمھما محذوف ہے اور فاجلدوا ان کے حکم کا بیان اور تفصیل ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اِذَا ثَبَتَ زِنَاھُمَا فَاجْلِدُوْا۔ یعنی جب دونوں کا زنا ثابت ہو جائے تو انہیں کوڑے لگاؤ۔

مبرد کہتے ہیں اس کی خبر فاجلدوا کا جملہ ہے(1)۔اور خبر پر اس لئے آئی ہے کیونکہ مبتداء کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔کیونکہ الزانیہ پر الف لام الذی کے معنی میں ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہوگی اَلَّذِیْ زَنٰی وَالَّتِیْ زَنَتْ فَیُقَالُ فِیْ شَاْنِھِمَا اجْلِدُوْا۔یعنی جو مرد بدکاری کرے اور جو عورت بدکاری کرے اس کے بارے کہا جائے گا کہ انہیں کوڑے مارو۔

؎ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا پر نصب مفعول ہونے کی بنا پر ہے جب کوئی کسی کے جسم پر کوڑے لگائے تو عرب کہتے ہیں ضرب جلدہ اور جب کوئی کسی کو سر اور پیٹ پر ضرب مارے تو کہتے ہیں ضرب راسہ و بطنہ۔یہاں لفظ جلد ذکر فرمایا ہے تاکہ اس طرح اسے کوڑے نہ لگائے جائیں کہ چمڑی ادھیڑ کر گوشت تک پہنچ جائے۔اسی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں زانی اور زانیہ کو ایسے کوڑے کے ساتھ سزا دی جائے گی جس کی گرہیں نہ ہوں اور متوسط طریقہ پر ضرب لگائی جائے گی۔ابن ابی شیبہ نے،عیسٰی بن یونس عن حنظلہ السدوسی عن انس بن مالک کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ ایسا درہ مارنے کا حکم دیا جاتا تھا جس کی گرہیں ختم کردی گئی ہوں اور پھر اسے دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کوٹا گیا ہو۔پھر اس کے ساتھ مجرم کو سزا دی جائے۔(2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا یہ عمل کس کے زمانہ میں کیا جاتا۔تھا فرمایا ''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایسا کیا جاتا تھا''

عبدالرزاق نے یحیٰی بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایسا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد لازم ہوتی ہے،مجھ پر آپ حد قائم فرمائیں۔آپ ﷺ نے کوڑا منگوایا،تو آپ کو سخت درہ دیا گیا جس کی گرہیں تھیں۔آپ ﷺ نے وہ واپس کرتے ہوئے فرمایا کوئی اور کوڑا لاؤ جس کی گرہیں نہ ہوں۔پھر آپ ﷺ کو ٹوٹا ہوا بالکل نرم درہ دیا گیا۔آپ ﷺ نے فرمایا ایسا درہ لاؤ جو اس سے تھوڑا سخت ہو،تیسری مرتبہ آپ کو ایسا درہ پیش کیا گیا جو مذکورہ دونوں دروں سے متوسط تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا ہاں یہ ٹھیک ہے ایسے ہی درے کے ساتھ سزا دینے کا حکم ہے۔پھر اس شخص کو کوڑے لگائے گئے(3)۔ ابن ابی شیبہ نے زید بن اسلم سے اسی طرح حدیث روایت کی ہے اور امام مالک نے مؤطا میں بھی اسی طرح روایت کی ہے۔

؎ مِائَةَ جَلْدَةٍ پر نصب مصدریت کی بنا پر ہے۔اس آیت کریمہ میں زانی پر زانیہ کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ زنا عمومی طور پر اس وقت ہوتا ہے جب عورت اپنے آپ کو مرد پر پیش کرتی ہے اور چوری کی سزا میں مرد کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ عام طور پر چوری مردوں کی طرف سے پائی جاتی ہے۔اسلئے مرد کا ذکر پہلے اور عورت کا ذکر بعد میں فرمایا۔ارشاد ہے وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا۔(اور چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی (کی سزا یہ ہے) کہ کاٹو ان کے ہاتھ۔

مسئلہ: علماء امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب بدکاری کرنے والا جوڑا اگر آزاد،بالغ،عاقل اور غیر شادی شدہ ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو (ثبوت کے بعد) سو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سزا پر کچھ اضافہ نہیں کیا جائے گا۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سزا کے علاوہ قصر کی مسافت یا اس سے زیادہ دور ایک سال کے لئے جلاوطن کرنا بھی واجب ہے بشرطیکہ راستہ مامون ہو۔اور عورت کو بغیر محرم کے جلاوطن کرنے کے متعلق دو قول ہیں۔المنہاج میں ہے،اصح قول کے مطابق عورت کو اکیلے جلاوطن نہیں کیا جائے گا بلکہ خاوند یا محرم شخص کے ساتھ اسے جلاوطن کیا جائے گا۔اگرچہ انہیں اجرت بھی دینی پڑے اور ایک قول کے مطابق اجرت،عورت پر ہوگی اور دوسرے قول کے

1۔الجامع الاحکام القرآن،جلد 6،صفحہ 160 (الازہریۃ) 2۔مصنف ابن ابی شیبہ،جلد 5،صفحہ 530 (دارالتاج)
3۔مصنف عبدالرزاق،جلد 7،صفحہ 369 (المکتب الاسلامی)

مطابق اجرت بیت المال سے ادا کی جائے گی اور اگر وہ مجرم اجرت کی ادائیگی کے باوجود بھی انکار کرے تو ایک قول کے مطابق حاکم اسے ساتھ جانے پر مجبور کرے گا۔ اور المنہاج میں ہے کہ صحیح قول کے مطابق حاکم محرم شخص کو عورت کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کرے گا۔ امام مالک فرماتے ہیں بدکار مرد کو جلاوطن کرنا واجب ہے، بدکار عورت کو جلاوطن کرنا واجب نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قول کی صحت پر دلیل عبادہ بن الصامت کی حدیث کو بنایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بدکارہ عورتوں کا حکم سن لو بدکارہ عورتوں کے متعلق حکم سن لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک حکم بیان فرمادیا ہے۔ غیر شادی شدہ کو سو کوڑے اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے اور شادی شدہ کو سو کوڑے اور رجم کیا جائے(1)۔ یہ حدیث پاک سورہ نساء میں فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔ امام شافعی دوسری دلیل میں زید بن خالد کی حدیث پیش کرتے ہیں زید بن خالد فرماتے ہیں میں نے غیر شادی شدہ زانی شخص کے متعلق حضور ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔

صحیحین میں زید بن خالد اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث مروی ہے کہ دو شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ایک جھگڑا لے کر آئے۔ ایک نے عرض کی حضور ﷺ! آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور مجھے مسئلہ کی نوعیت عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم جھگڑے کی نوعیت بیان کرو۔ اس شخص نے عرض کی حضور میرا لڑکا اس شخص کے ہاں ملازم تھا' اس نے اس شخص کی بیوی سے بدکاری کی ہے۔ علماء نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے پر رجم (سنگسار کرنا) ہے۔ پھر میں نے بطور فدیہ سو بکریاں اور ایک لونڈی دی۔ پھر جب میں نے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور رجم اس کی عورت پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ تمہاری بکریاں اور تمہاری لونڈی تمہیں واپس کی جائیں گی اور تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ اور فرمایا اے انیس تم اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ جرم کا اعتراف کرے تو اسے رجم کر دو۔ اس عورت سے جب پوچھا گیا تو اس نے اعتراف جرم کر لیا تو اس نے اسے رجم کر دیا(3)۔ امام مالک فرماتے ہیں حضور ﷺ کا ارشاد "اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَّتَغْرِيْبُ عَامٍ" (غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ہر ایک پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے) عورتوں کو شامل نہیں ہے۔ اس لئے جلاوطنی کا حکم عورتوں کے لئے ثابت نہ ہوگا لیکن امام مالک کا یہ کہنا درست نہیں، کیونکہ حدیث کا سیاق بالکل واضح دلالت کر رہا ہے کہ یہ حکم عورتوں کے متعلق ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ خُذُوْا عَنِّي قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا۔ اس حدیث میں هن ضمیر صراحۃً عورتوں کے لئے ہے۔ اور بکر کے لفظ میں عورت کیسے شامل نہیں ہو سکتی جبکہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو عورت کے لئے استعمال فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اَلْبِكْرُ تُسْتَاْذَنُ' غیر شادی شدہ (کنواری) عورت سے نکاح کی اجازت طلب کی جائے گی۔ حضرت زید کی حدیث میں مَنْ زَنٰى (جس نے بھی بدکاری کی) کا لفظ عام ہے مذکر مونث دونوں کو شامل ہے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی صحیح دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ عورت محرم شخص کے بغیر سفر نہ کرے(4)۔ اس حدیث کو امام بخاری' مسلم' امام احمد اور ابو داؤد نے ابن عمر

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1010 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 434 (قدیمی)

سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں اور امام احمد نے ابن عباس سے بھی روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے المستدرک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے، اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جلاوطنی کا حکم مردوں کے ساتھ خاص کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں عورت کیلئے جلاوطنی کا حکم نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جلاوطنی کے لئے محرم شخص کے ساتھ ہونے کو شرط قرار دیتے ہیں۔

امام طحاوی فرماتے ہیں جب بغیر محرم کے سفر کرنے کی نہی کی وجہ سے عورتوں سے جلاوطنی کی سزا باطل ہوگئی تو مردوں سے بھی یہ سزا منتفی ہوگئی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حد میں جلاوطنی کی سزا کے نہ ہونے پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی لونڈی بدکاری کی مرتکب ہو اور اس کی بدکاری ثابت ہو جائے تو اسے بطور حد کوڑے لگائے اور مزید اس پر زجر و توبیخ نہ کرے۔ پھر اگر دوبارہ زنا کا ارتکاب کرے تو دوبارہ اسے کوڑے لگائے اور اس پر مزید زجر و توبیخ نہ کرے۔ پھر اگر وہ تیسری مرتبہ بے حیائی کا ارتکاب کرے اور اس کی بے حیائی ثابت ہو جائے تو مالک اسے بیچ دے خواہ بالوں سے بنی ہوئی رسی کے بدلے بیچ دے (1) یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے بدکاری کے ارتکاب کے بعد بیچنے کا حکم فرمایا ہے اور یہ محال ہے کہ آپ ﷺ اس چیز کے بیچنے کا حکم فرمائیں جس کو مشتری بائع سے حاصل کرنے پر قادر ہی نہ ہو۔ پس لونڈیوں کی جلاوطنی کا حکم زنا کے ارتکاب کے بعد ثابت نہ ہوا۔ اور جب لونڈیوں کی جلاوطنی کا حکم باطل ہو گیا تو آزاد عورتوں کی جلاوطنی کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ (تو ان پر سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے) سے باطل ہو گیا۔ پھر جب آزاد عورتوں کی جلاوطنی کا حکم باطل ہو گیا تو مردوں کی جلاوطنی کا حکم بھی باطل ہو گیا۔ لیکن یہ قول صحت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ مطلقاً عورتوں کی جلاوطنی کی نفی سے یا لونڈیوں کے متعلق نصوص میں تعارض کی وجہ سے جلاوطنی کی نفی سے، مردوں کے حق میں اس حکم کا ساقط ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ مردوں کے متعلق نصوص میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

بعض حنفی فقہاء فرماتے ہیں جلاوطنی والی حدیث پر اس لئے عمل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس سے کتاب اللہ پر زیادتی لازم آتی ہے اور زیادتی نسخ کے حکم میں ہوتی ہے اور خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں ہے، لیکن بعض فقہاء حنفیہ کا یہ استدلال مردود ہے کیونکہ کتاب اللہ پر وہ زیادتی نسخ کے حکم میں ہوتی ہے جو رکن، یا شرط یا مامور بہ میں وصف کی زیادتی ہو۔ حتیٰ کہ اس کے بغیر وہ مامور بہ پایا ہی نہ جائے۔ جیسے ارکان نماز میں فاتحہ کی تعیین، کفارہ کے غلام میں صفت ایمان، روزہ میں تتابع اور طواف میں طہارت ہے۔ اس قسم کی زیادتی کتاب اللہ پر ممنوع ہے لیکن مطلقاً زیادتی ممنوع نہیں ہے۔ اگر مطلقاً زیادتی ممنوع ہوتو پھر اکثر احادیث طیبہ بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ مثلاً جس عورت کا خاوند فوت ہو چکا ہو اس کی عدت نص قرآنی سے ثابت ہے جبکہ اس کا سوگ منانا'' زیب و زینت نہ کرنا حدیث پاک سے ثابت ہے اور عدت میں سوگ منانا شرط نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ چار ماہ دس دن عدت گزارتی ہے اور زیب و زینت کو ترک نہیں کرتی اور سوگ نہیں مناتی تو وہ واجب کے ترک کی وجہ سے گنہگار ہوگی لیکن اس کی عدت گزر جائے گی اور اس کے ساتھ اس مدت کے بعد نکاح کرنا حلال ہوگا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سورہ فاتحہ کی تعیین، سورۃ کا ملانا وغیرہما نماز کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 70 (قدیمی)

واجبات میں سے ہیں۔ امام صاحب ان کے متعلق وجوب کا قول فرماتے ہیں۔ انکو نماز کا رکن نہیں کہتے اور حد میں جلاوطنی کی زیادتی سو کوڑوں کی سزا کے لئے رکن نہیں ہے جسکے بغیر وہ حد پائی ہی نہ جائے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب فرماتے ہیں آیت کریمہ جلاوطنی کے حکم کے متعلق خاموش ہے آیت کریمہ میں کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ہے جو جلاوطنی کے حکم کے منافی ہوتا کہ ان میں ایک دوسرے کے لئے نسخ مقبول(ا) یا نسخ مردود ہو جائے۔ احناف میں سے محققین علماء فرماتے ہیں فاجلدوا کا ارشاد سیبویہ کے قول کے مطابق الزانیہ و الزانی کے ارشاد میں جو حکم ہے اس کا بیان ہے اور مذکور حکم مکمل ہے ورنہ اس سے جہالت ثابت ہوگی کیونکہ اس سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ حکم مکمل ہے لیکن حقیقت میں مفہوم مکمل نہیں ہے۔ پس ایسے بیان سے تو ترک بیان بہتر ہے، کیونکہ یہ جہل مرکب میں ڈالتا ہے اور مبرد کے قول کے مطابق فاجلدوا شرط کی جزاء ہے جس کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ صرف یہی حکم مرتب ہے۔ اگر کوئی دوسری چیز بھی اس کے ساتھ ثابت ہو تو وہ پہلے حکم کے معارض ہوگی نہ کہ اس چیز کو ثابت کرنے والی ہوگی جس کا پہلے حکم میں کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ زیادتی ممنوع ہے۔ اس پر ایک اعتراض یہ وارد کیا گیا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے جسے علماء امت نے قبول کیا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ کتاب اللہ کا نسخ جائز ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر تلقی بالقبول سے مراد اس حدیث پر عمل کرنے پر علماء کا اجماع ہے تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف علماء ظاہر ہے اور اگر تلقی بالقبول سے مراد اس حدیث کی سند کی صحت پر علماء کا اجماع ہے تو اس طرح پھر بہت سی اخبار احاد کی صحت پر اجماع ہے۔ علماء کا ان کی اسناد پر صحت کے لیے اجماع کرنا بھی انہیں اخبار احاد ہونے سے خارج نہیں کرتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آیت کریمہ قطعی السند ہے لیکن ظنی الدلالۃ ہے کیونکہ آیت کریمہ کا حکم عام ہے اور پھر اس سے بعض افراد کو خاص کیا گیا ہے اور مخصوص افراد مراد ہونے پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ کوڑوں کی سزا کا حکم آزاد مردوں اور آزاد عورتوں کے ساتھ خاص ہے غلام اور لونڈیاں اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔ نیز اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم شادی شدہ آزاد مسلمان کے ساتھ مختص ہے۔ اسی طرح صرف کوڑوں کی سزا کے حکم پر آیت کی دلالت ظنی ہے اور اجتہاد سے مستنبط ہے حتیٰ کہ اکثر فقہاء اور اہل عرب نے اس حکم کو مستنبط نہیں کیا۔ اور حدیث ظنی السند اور قطعی الدلالۃ ہے پس آیت اور حدیث حکم میں مساوی ہوگئیں۔ پس خبر واحد کا کتاب کے حکم کے لئے ناسخ ہونا جائز ہے پس ایسی خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی کرنا جائز بلکہ اولیٰ ہے۔

ہم اس اعتراض کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اگر آیت اور حدیث کو مساوی تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی حضرت عبادہ کی حدیث کا سیاق دلالت کرتا ہے کہ یہ پہلا حکم ہے جو حضور ﷺ نے بدکار کنوارے مردوں اور کنواری عورتوں کے متعلق ارشاد فرمایا تھا، کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خُذُوْا عَنِّیْ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِائَۃٍ وَّتَغْرِیْبُ عَامٍ وَالثَّیِّبُ بِالثَّیِّبِ جَلْدُ مِائَۃٍ وَّالرَّجْمُ۔ (مجھ سے یہ حکم لے لو اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے متعلق حکم فرما دیا ہے غیر شادی شدہ مرد عورت بدکاری کریں تو ہر ایک کو سو سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد عورت بدکاری کریں تو سو کوڑے اور رجم ہے(1)۔

پس آیت کریمہ حدیث کے متعارض ہونے کی وجہ سے ناسخ ہوگی منسوخ نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ثیبہ (شادی شدہ عورت) کے حق میں کوڑوں کی سزا منسوخ ہے۔ پس اس آیت کریمہ کی وجہ سے باکرہ کے حق میں بھی جلاوطنی کے منسوخ ہونے

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ)

(ا) نسخ مقبول وہ ہوتا ہے جب کتاب کا نسخ سنت متواترہ سے ہو اور نسخ مردود ہوتا ہے جو کتاب کا نسخ اخبار آحاد کے ساتھ ہو۔

میں کوئی مانع نہیں ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ذخیرہ احادیث میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ جلاوطنی کے وجوب کا حکم حد کے طریق پر واجب ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِائَۃٍ وَّتَغْرِیْبُ عَامٍ کا قول دلالت کر رہا ہے۔ اور وہ واجب کا واجب پر عطف ہے اور یہ اس بات کا مقتضی نہیں ہے بلکہ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر محصن زانی کے متعلق جلاوطنی اور حد کے قیام کا فیصلہ فرمایا تو یہ قول صراحتاً دلالت کر رہا ہے کہ جلاوطنی حد میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ حد پر معطوف کی گئی ہے۔ پس حد کے مسمی کے جز میں جلاوطنی کا مستعمل ہونا اور پھر دوسرے جز پر اس کا معطوف ہونا دلیل کا موجب نہیں ہے۔ اور جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں وہ جلاوطنی کے حد ہونے کے لئے مفید نہیں ہیں۔ پس ہوسکتا ہے کہ یہ جلاوطنی کسی مصلحت کے لئے ہو۔

فائدہ: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین جلاوطنی کو ثابت کرنے والی حدیث کو عقلی اعتبار سے بھی ترجیح دیتے ہیں وہ کہتے ہیں جلاوطنی، زنا کا جڑ سے خاتمہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ دوسرے علاقہ میں انسان کی جان پہچان کم ہوتی ہے تو بدکاری کے مواقع بھی میسر نہیں آتے۔ احناف اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ جلاوطنی سے بدکاری کا دروازہ کھل جاتا ہے کیونکہ جلاوطن شخص اپنے خاندان اور معاشرہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور جن لوگوں سے اسے حیاء محسوس ہوتی ہے ان سے دور ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے حالات میں عورت کو شہوت زیادہ ہو تو وہ معیشت کی حاجت کی خاطر بدکاری کا ارتکاب زیادہ کرے گی۔ احناف کے مسلک کی تائید عبدالرزاق اور محمد بن الحسن کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ہمیں امام ابوحنیفہ نے حماد عن ابراہیم النخعی کے سلسلہ سے بتایا کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ان میں سے ہر ایک کو کوڑے لگائے جائیں اور دونوں کو ایک سال کیلئے جلاوطن کر دیا جائے، اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان دونوں کو جلاوطن کرنا انکے فتنہ میں مبتلا ہونے کے لئے کافی ہے(1) اسی طرح امام محمد نے امام ابوحنیفہ عن حماد عن ابراہیم کے سلسلہ سند سے روایت کیا ہے کہ جلاوطنی فتنہ کے لئے کافی ہے۔ حضرت عبدالرزاق نے زہری سے اور انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شراب پینے کی وجہ سے خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا تھا، تو وہ ہرقل کے ساتھ مل گیا اور نصرانی ہو گیا۔ حضرت عمر کو پتہ چلا تو فرمایا آئندہ کبھی کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا(2)

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کوڑوں کی حد کے ساتھ امام وقت اگر جلاوطنی میں مصلحت دیکھے تو اس کے لئے جلاوطن کرنا جائز ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جو جلاوطنی مروی ہے وہ بھی اسی مصلحت کے تحت تھی۔ نسائی، ترمذی حاکم اور دارقطنی نے ابن عمر کی حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کوڑے لگائے اور جلاوطن کیا۔ ابوبکر نے کوڑے مارے اور جلاوطن کیا۔ حضرت عمر نے سزا دی اور جلاوطن کیا(3)۔ ابن القطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور دارقطنی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ایسی سند کے ساتھ روایت کی ہے جس میں ایک مجہول راوی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدکاری کی وجہ سے ایک عورت کو کوڑے لگائے اور پھر اسے خیبر کی طرف بھیج دیا اور پھر اسے جلاوطن کر دیا(4)۔ تو جلاوطنی صرف زنا کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر برائی اور فساد کے لئے جلاوطن کرنا امام کے لئے جائز ہے جبکہ امام جلاوطنی

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 312 (المکتب الاسلامی) 2۔ ایضاً صفحہ 312
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 173 (وزارت تعلیم) 4۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 42-541 (دار التاج)

میں مصلحت دیکھے۔ امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو عمداً قتل کر دیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو سو کوڑے لگائے اور ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا اور اس کو جو مسلمانوں کے طرف سے وظیفہ ملتا تھا وہ بھی آپ نے ختم کر دیا اور اسے ایک غلام آزاد کرنے کا بھی حکم دیا(1)۔ سعید بن منصور نے روایت کیا ہے کہ عمر بن الخطاب کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے رمضان شریف میں شراب پی تھی، آپ نے اسے سو کوڑے لگوائے اور پھر شام کی طرف اسے جلاوطن کر دیا(2)۔ امام بغوی نے الجعدیات میں اسی روایت کو نقل کیا ہے اور یہ زائد روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی شخص پر ناراض ہوتے تو اسے شام کی طرف بھیج دیتے۔ مذ امام نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ بصرہ کی طرف جلاوطن کرتے تھے۔ عبدالرزاق نے معمر عن ایوب عن نافع کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فدک کی طرف جلاوطن فرماتے تھے(3) اسی وجہ سے صوفیاء کرام اپنے مریدوں کو دوسرے دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیتے تھے جن میں نفس کی قوت زیادہ دیکھتے تھے تاکہ خواہشات نفس ختم ہو جائیں اور نفس نرم ہو جائے۔

میں کہتا ہوں جب قاضی کسی مسلمان کو دیکھے کہ وہ غلبہ شہوت کی وجہ سے گناہوں میں ملوث ہے جبکہ ساتھ ساتھ وہ اپنے افعال بد پر شرمندہ بھی ہے تو قاضی اسے وہاں سے نکل جانے اور سفر کرنے کا حکم دے۔ اور جو اپنے افعال بد پر شرمندہ بھی نہیں ہوتا تو اسے قید کر دے حتیٰ کہ وہ توبہ کر لے۔

مسئلہ: اگر زانی اور زانیہ شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا اور یہ حکم صحابہ کرام اور بعد کے علماء حقہ کے اجماع سے ثابت ہے لیکن خارجی لوگ رجم (سنگساری) کی سزا کے منکر ہیں۔ کیونکہ وہ صحابہ کرام کے اجماع اور اخبار احاد کی حجیت کے انکاری ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رجم کی سزا قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ کی سنت متواترہ سے ثابت نہیں ہے۔ صرف اخبار احاد سے یہ سزا ثابت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رجم، نبی کریم ﷺ سے اخبار متواترہ بالمعنی کے ساتھ ثابت ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ثابت ہے جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت وشجاعت اور حاتم کی سخاوت ثابت ہے، اگر چہ ان کی تفاصیل صورۃً اخبار احاد سے ثابت ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب نازل فرمائی اور جو ان پر نازل فرمایا اس میں آیت رجم بھی ہے، رسول اللہ ﷺ نے رجم فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ رجم، کتاب اللہ میں اس شخص پر ثابت ہے جو زنا کا ارتکاب کرے، بشرطیکہ وہ شادی شدہ مرد ہو یا عورت ہو جبکہ اس پر شہادت مکمل ہو جائے، یا حمل ہو یا اعتراف جرم پایا جائے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(4)۔ امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اس میں آیت رجم بھی تھی۔ ہم نے اسے پڑھا اور یاد بھی کیا۔ اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ اور رسول اللہ ﷺ نے رجم فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا(5)۔ (اس حدیث کے آخر میں ہے) اگر مجھے لوگوں کی اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں زیادتی کی ہے تو میں اس آیت رجم کو

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ) 2۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 382 (المکتب الاسلامی) 3۔ ایضاً، صفحہ 315
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 65 (قدیمی) 5۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 211 (الفکر)

مصحف کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔ حضرت ابوداؤد نے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خطبہ نقل کیا ہے۔ اس میں ہے کہ مجھے لوگوں پر طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے یہ خوف ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ کہتا پھرے کہ ہم تو اللہ کی کتاب میں آیت رجم کو نہیں دیکھتے(1)۔ ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے اگر مجھے کتاب اللہ میں زیادتی کرنا ناپسند نہ ہوتا تو میں اس آیت رجم کو مصحف میں لکھ دیتا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ بھی آئیں گے جو کتاب اللہ میں اس آیت رجم کو نہ پائیں گے تو وہ اس کا انکار کر دیں گے(2)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خطبہ صحابہ کرام کی موجودگی میں تھا اور کسی نے بھی آپ پر اعتراض نہیں کیا۔ حضرت ابی امامہ بن سہل اپنی خالہ العجماء سے ان الفاظ میں یہ آیت رجم روایت کرتے ہیں "اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا بِمَا قَضَیَا مِنَ اللَّذَّۃِ" اس حدیث کو حاکم، طبرانی نے روایت کیا ہے(3) اور ابن حبان کی صحیح میں حدیث ہے کہ سورہ احزاب، سورہ بقرہ کی طرح تھی اور اس میں آیت رجم الشیخ والشیخة الخ بھی تھی۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان مرد کا خون (بہانا) حلال نہیں ہے جو لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دیتا ہو۔ مگر تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت پائی جائے تو پھر مسلمان کا خون بہانا حلال ہوتا ہے۔ 1۔ اگر کوئی انسان دوسرے انسان کو قتل کر دے۔ 2۔ شادی شدہ زنا کار۔ 3۔ دین سے نکل جانے والا جماعت کو چھوڑنے والا۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے(4)

حضرت ابی امامہ بن سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے محاصرہ کے دن لوگوں سے فرمایا، قسم بخدا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کا خون (بہانا) حلال نہیں ہے مگر تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے پائے جانے کے وقت مسلمان کا خون بہانا حلال ہوتا ہے۔

1۔ شادی شدہ مسلمان زنا کا ارتکاب کرے۔ 2۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے۔ 3۔ بغیر حق شرع کے جو کسی کو قتل کر دے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا؟ قسم بخدا میں نے نہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں زنا کیا ہے اور جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کے دست اقدس پر بیعت کی ہے کبھی مرتد نہیں ہوا اور نہ میں نے کسی ایسے نفس کو قتل کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے (جب میرا خون بہانے کی کوئی بھی وجہ جواز نہیں ہے) تو تم مجھے کیوں قتل کرتے ہو(5)۔ اس حدیث کو ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو امام شافعی نے اپنی مسند میں اور بزار اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے حاکم فرماتے ہیں یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ بیہقی اور ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے۔ بخاری نے ابوقلابہ کے قول کے ذریعے حضور ﷺ کا فعل روایت کیا ہے حضرت ابوقلابہ کہتے ہیں قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص کو کبھی قتل نہیں کیا۔ مگر تین وجوہات کی بناء پر آپ نے قتل کیا۔ 1۔ اس شخص کو جس نے کسی کو قتل کیا اسے قتل کیا گیا۔ 2۔ وہ شخص جس نے شادی کرنے کے بعد زنی کیا۔ 3۔ وہ شخص جس نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور اسلام سے مرتد ہو گیا(6)۔

حضور نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ماعز بن مالک کو رجم کیا جب انہوں نے زنا کا اعتراف کیا تھا۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، امام ترمذی، ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 256 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)
3۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 24، صفحہ 350 (التراث الاسلامی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1016 (وزارت تعلیم)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 38 (وزارت تعلیم)
6۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1019 (وزارت تعلیم)

روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ابو ہریرہ، ابن عباس، جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ایک مجہول راوی سے مروی ہے۔ مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کی ہے۔ راوی فرماتے ہیں ماعز بن مالک، نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھے پاک فرمائیے(1)
رسول اللہ ﷺ نے غامدیہ عورت کو رجم کیا تھا اس نے عرض کی تھی یا رسول اللہ ﷺ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں زنا سے حاملہ ہوں تو آپ ﷺ نے وضع حمل کے بعد رجم (سنگسار) فرمایا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اسے اس وقت رجم فرمایا جب اس کا بچہ خوراک کھانے لگ گیا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جہینہ کی ایک عورت کو رجم کیا تھا جب اس نے زنا کا اعتراف کیا تھا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔

فقہاء اور محدثین فرماتے ہیں رجم کے متعلق خلفاء راشدین کا عمل حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔

مسئلہ: اگر زنا کرنے والوں میں سے ایک محصن اور دوسرا غیر محصن ہو تو محصن (شادی شدہ) کو رجم کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگائے جائیں گے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے متعلق فیصلہ فرمایا تھا جو دوسرے شخص کے پاس ملازم تھا اور اس کی بیوی سے زنا کیا تھا۔ یہ حدیث گزر چکی ہے۔

مسئلہ: کیا شادی شدہ زانی کو رجم سے پہلے کوڑے لگائے جائیں گے یا نہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں آیت کے حکم کے مطابق پہلے اسے کوڑے لگائے جائیں گے پھر اسے رجم کیا جائے گا۔ امام احمد کے نزدیک آیت کریمہ غیر محصن کے ساتھ خاص بھی نہیں ہے اور منسوخ بھی نہیں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کوڑوں کی سزا مکمل حد نہیں بلکہ حد کا ایک جزء ہے۔ امام احمد غیر محصن شخص کے لئے کوڑوں کی سزا کے ساتھ حدیث نبویہ کے ذریعے ایک سال کی جلاوطنی کو ملاتے ہیں۔ اور محصن (شادی شدہ) میں رجم کو ساتھ ملاتے ہیں۔ جس طرح جلاوطنی کی حدیث آیت کریمہ کے مزاحم نہیں ہے اسی طرح رجم کی حدیث بھی آیت کے مزاحم نہیں ہے۔ حدیث اگر متواتر ہے تو دونوں پر عمل کرنا واجب ہے اور ہمارے قول کی تائید عبادہ بن الصامت کی حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غیر شادی شدہ مرد کا غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرنے کی صورت میں ہر ایک کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ہر ایک کو ایک سال جلاوطن کیا جائے گا اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ہر ایک کو سو کوڑے اور رجم کیا جائے گا(2)۔

حضرت سلمہ بن المحبق سے بھی اسی طرح حدیث مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے (بدکاری کرنے والی عورتوں کے متعلق احکام) لے لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک حکم مقرر فرمایا ہے۔ غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ سے بدکاری کرے تو ہر ایک پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو سو کوڑے اور رجم ہے(3)۔

اس مسلک کی تائید علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب کے اثر سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمد، حاکم اور نسائی نے امام شعبی سے روایت فرمایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراحۃ الہمدانیہ کو کوفہ میں کوڑے لگائے اور پھر اسے رجم کیا۔ جمعرات کو اسے کوڑے لگائے اور جمعہ کے روز اسے رجم کیا اور فرمایا میں کتاب کے مطابق اسے کوڑے لگاتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق اسے رجم کرتا ہوں۔ اس اثر کی اصل بخاری میں ہے لیکن وہاں عورت کا نام ذکر نہیں ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 67 (قدیمی) 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 76

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ۔غیر شادی شدہ شخص کے ساتھ خاص ہے یا شادی شدہ کے حق میں منسوخ ہے۔اسی طرح عبادہ بن الصامت اور سلمہ بن المحبق کی حدیث کا بھی یہی حکم ہے اور اس آیت کریمہ کے محصن شخص کے حق میں منسوخ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ماعز، غامدیہ اور الجہنیہ کو رجم فرمایا تھا اور یہ واقعات مختلف اور کثیر طرق واسانید سے مروی ہیں اور کسی طریق سے یہ ثابت نہیں ہے کہ پہلے آپ ﷺ نے کوڑے مارے ہوں اور پھر رجم فرمایا ہو۔ زید اور خالد کی حدیث گزر چکی ہے جس میں دو آدمیوں کا واقعہ ذکر ہے کہ وہ دونوں جھگڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک کا بیٹا دوسرے شخص کے پاس ملازم تھا اس ملازم نے دوسرے شخص (مستاجر) کی بیوی سے بدکاری کی تو رسول اللہ ﷺ نے ملازم لڑکے پر کوڑوں اور جلاوطنی کا فیصلہ فرمایا اور ارشاد فرمایا اے انیس اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف جرم کرے تو اسے رجم کرو۔آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلے اسکو کوڑے لگاؤ اور پھر رجم کرو۔

ناسخ یا تو وحی غیر متلو ہے یا ایسی وحی ہے جو منسوخ التلاوۃ ہے۔یعنی اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا۔ یہ آیت منسوخ التلاوۃ ہے اور اس کا ناسخ ہونا متصور نہیں ہوسکتا۔مگر اسی صورت میں جس کو حنفی محققین نے ثابت کیا ہے۔یعنی اس آیت میں مذکور حکم تمام کا تمام واجب ہے اور الزانية و الزاني فاجلدوا کا ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوڑے بھی واجب ہیں اور الشيخ و الشيخة اذا زنيا والی آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رجم بھی واجب ہے' پس دونوں آیات کا حکم متعارض ہو گیا' ایک ان میں سے دوسرے کے لئے ضرور ناسخ ہوگی۔اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ دونوں آیتوں کا پورا حکم مذکور واجب ہے تو نہ تعارض ہوگا اور نہ نسخ بلکہ رجم اور کوڑوں کو جمع کرنا واجب ہوگا جیسا کہ امام احمد کا قول ہے۔

رہا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر کا معاملہ تو اس کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے۔پس یہ اجتہادی امر ہے جیسا کہ امام احمد کا قول ہے۔امام طحاوی نے اپنی سند سے ابی واقد اللیثی سے روایت کیا ہے کہ ایک صحابی رسول فرماتے ہیں ہم جابیہ کے مقام پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا اے امیر المومنین میری بیوی نے بدکاری کی ہے اور وہ اس اپنے جرم کا اعتراف بھی کرتی ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے اس عورت کی طرف ایک گروہ کے ساتھ بھیجا۔ہم نے اس سے اس فعل کے متعلق پوچھا اور میں نے اسے اس کے خاوند کی رپورٹ کے متعلق بتایا تو اس نے اپنے خاوند کی تصدیق کی۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب ہم نے واپس آکر اس کی تصدیق کی شہادت دی تو حضرت عمر نے اسے رجم کرنے کا حکم فرمایا(1) (جبکہ صحابہ کرام بھی موجود تھے) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رجم سے پہلے اسے کوڑے نہیں مارے۔میں کہتا ہوں شاید حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراحہ ہمدانیہ کو اس وقت کوڑے لگائے تھے جب اس کے محصنہ ہونے کا ثبوت نہیں ہوا تھا پھر محصنہ ہونے کے ثبوت کے بعد آپ نے اسے سنگسار کرایا تھا۔حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد اِجْلِدُهَا لِكِتَابِ اللّٰهِ وَارْجُمْهَا بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ کوڑے غیر محصن کے حق میں قرآن سے ثابت ہیں اور رجم محصن کے حق میں سنت نبوی (صلی اللہ علی صاحبہا) سے ثابت ہے۔ جب اس کا محصن ہونا ثابت ہو گیا تو میں نے اسے رجم کر دیا۔حضور نبی کریم ﷺ سے اسی طرح مروی ہے۔

امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے زنا کیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا پھر جب پتہ چلا کہ یہ محصن ہے تو آپ ﷺ نے اسکو سنگسار کرنے کا حکم دیا(2)۔

1۔شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 80 (امدادیہ) 2۔ایضاً، صفحہ 78

فائدہ: احصان کا لفظ قرآن میں کئی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ 1۔ آزادی۔ 2۔ نکاح کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَامَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ۔ یہاں محصنات سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ اس ارشاد میں احصن سے مراد شادی شدہ اور محصنات سے مراد آزاد عورتیں ہیں۔ اسی طرح احصان کا معنی عفت بھی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ اسی طرح ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ۔ آخری دونوں آیات میں احصان کا معنی عفت اور پاکدامنی ہے۔ اور زانیہ اور زانی کی سزا رجم کے لئے جو احصان شرط ہے اس سے مراد نکاح صحیح کے ساتھ دخول ہے' کیونکہ نکاح کا ثمرہ یہی ہے۔ اس حکم میں احصان کا یہی معنی مراد ہونے پر نبی کریم ﷺ کے الفاظ بھی دلیل ہیں کہ محصن سے مراد شادی شدہ ہے اور غیر محصن سے مراد غیر شادی شدہ ہے۔

علماء کرام نے رجم کی سزا کے لئے احصان کی شرائط بیان کی ہیں۔ 1۔ آزاد ہونا۔ 2۔ عقلمند ہونا۔ 3۔ بالغ ہونا۔ 4۔ نکاح صحیح کا کیا ہوا ہونا۔ 5۔ بیوی کے ساتھ دخول کیا ہونا۔ یہ پانچ شرائط رجم کی سزا کے لئے متفق علیہا ہیں۔ لیکن عاقل اور بالغ ہونا سزا کی اہلیت کے لئے شرط ہیں بلکہ مطلقاً خطاب کی اہلیت کے لئے شرط ہیں۔ اس لئے رجم کے احصان میں ان کے ذکر کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ آزاد ہونا مطلقاً حد کے تکمیل کے لئے شرط ہے۔ خاص رجم کے لئے شرط نہیں ہے۔ حتیٰ کہ غلام کو سو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ پس صرف نکاح صحیح کے ساتھ دخول کا اعتبار باقی رہ جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام محمد نے احصان الرجم میں اسلام کی بھی شرط لگائی ہے جبکہ امام شافعی' امام ابو یوسف اور امام احمد کا قول اس کے خلاف ہے۔ احناف نے اسلام کی جو شرط لگائی ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے مَنْ اَشْرَكَ بِاللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُحْصَنٍ۔ (کہ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ محصن نہیں ہے) (1) اس حدیث کو اسحق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ثنا عبد العزیز بن محمد ثنا عبد عن نافع عن ابن عمر۔ حضرت اسحٰق فرماتے ہیں ابن عمر نے اس حدیث کو ایک مرتبہ مرفوع اور ایک مرتبہ موقوف بیان کیا ہے۔ ابن الجوزی لکھتے ہیں اسحٰق کے علاوہ اس حدیث کو کسی نے مرفوع روایت نہیں کیا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسحٰق نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور درست موقوف ہی ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں اس قسم کی حدیث پر سند کی صحت کے بعد مرفوع کا حکم لگایا جاتا ہے کیونکہ راوی اسی کے مطابق فتویٰ دیتا ہے جیسے فعل واقع ہو چکا ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں جب اسحٰق نے مرفوع کے قول سے رجوع کر لیا اور اپنی خطا کا اعتراف کر لیا اور کسی دوسرے محدث نے اس کو مرفوع روایت ہی نہیں کیا تو پھر اس پر مرفوع کا حکم کیسے لگایا جائے گا۔ اگر ہم اس حدیث کا مرفوع ہونا تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی حدیث خاص رجم کے احصان پر دلالت نہیں کرتی۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ احصان کا لفظ قرآن میں کئی معانی کے لئے مستعمل ہوا ہے۔ ان معانی میں ایک معنی عفت و پاکدامنی بھی ہے۔ شاید حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس نے شرک کیا وہ پاکدامن نہیں ہے۔ اس لئے اس پر تہمت لگانے والے پر حد قذف نہ ہوگی۔ پس اس حدیث سے رجم کے لئے اسلام کی شرط ثابت نہیں ہوتی' جبکہ الثیب بالثیب کے الفاظ کا عموم اور مومن و کافر دونوں کو شامل ہے۔

شیخان نے صحیحین میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ یہودی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ ہمارے ایک مرد

1۔ موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی ﷺ، جلد 8، صفحہ 90 (الفکر)

اور ایک عورت نے زنا کیا ہے (ان کا کیا حکم ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم تورات میں رجم کے متعلق کیا پڑھتے ہو انہوں نے کہا ہم ایسے مجرموں کو رسوا کریں اور کوڑے لگائیں۔ عبداللہ بن سلام نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا ہے۔ تورات میں ایسے افراد کا حکم رجم ہے' وہ تورات لے کر آئے' اسے کھولا پھر ان میں سے ایک نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس آیت کا ماقبل اور مابعد پڑھا۔ عبداللہ بن سلام نے فرمایا تو اپنا ہاتھ اٹھا۔ ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیت رجم لکھی تھی۔ تمام نے اقرار کیا کہ اے محمد ﷺ آپ نے سچ کہا اس میں آیت رجم ہے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں بدکاروں کو رجم کرنے کا حکم فرمایا(1)۔ یہ حدیث امام شافعی' امام احمد کی حجت ہے اور صاحب ہدایہ نے اس حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم تورات کا تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا۔

میں کہتا ہوں شریعت محمدیہ سے پہلے کی تمام شرائع پر عمل واجب ہے امام ابوحنیفہ کی اصل پر جبکہ ان کا ہماری شریعت میں منسوخ ہونا ظاہر نہ ہو۔ خصوصاً جبکہ اس فعل پر نبی کریم ﷺ نے خود عمل کیا ہو کیونکہ آپ ﷺ کا اس پر عمل کرنا واضح دلیل ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی باقی ہے۔ اس لئے یہ محال ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی نازل شدہ شریعت کے خلاف منسوخ شدہ حکم کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں۔ آیات اور احادیث میں سے کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس حکم کے منسوخ ہونے پر دلالت کرے کیونکہ الزانی والزانیۃ اور الشیخ والشیخۃ ' والثیب والبکر کے الفاظ مومن و کافر دونوں کو شامل ہیں۔ اور من اشرک فلیس بمحصن والی حدیث رجم میں اسلام کی شرط پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ قذف کے احصان پر محمول ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے رجم کے احصان کی شرائط میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں مرد اور عورت نکاح صحیح کے ساتھ دخول کے وقت آزاد' مسلمان' عاقل اور بالغ ہوں۔ اسی طرح امام احمد نے اسلام کے سوا باقی تمام شرائط کا قول کیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آزاد مسلمان عاقل' بالغ' لونڈی' بچی' پاگل یا کتابیہ عورت سے نکاح کرتا ہے اور اس کے ساتھ دخول بھی کرتا ہے تو وہ اس دخول کی وجہ سے محصن نہیں ہو گا۔ اگر اس دخول کے بعد وہ زنا کا مرتکب ہو گا تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر آزاد' بالغہ عاقلہ عورت کسی غلام' مجنون یا بچہ سے نکاح کرتی ہے اور وہ اس کے ساتھ دخول کرتا ہے تو وہ عورت محصنہ شمار نہ ہو گی۔ ایسے دخول کے بعد اگر وہ بدکاری کرتی ہے تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔ اگر مسلمان کسی ذمیہ عورت سے نکاح کرتا ہے' پھر وہ دخول کے بعد مسلمان ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمان خاوند نے اس کے ساتھ دخول نہیں کیا تھا کہ اس عورت نے بدکاری کی تو اسے بھی رجم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ایسی لونڈی دخول کے بعد آزاد ہو گئی جو کسی آزاد' مسلمان' عاقل بالغ کے نکاح میں تھی' اس کے آزاد ہونے کے بعد مسلمان خاوند نے اس کے ساتھ آزاد ہونے کے بعد دخول نہیں کیا تھا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔

احناف کی دلیل دارقطنی کی روایت ہے جو اس سند سے مروی ہے' ابن عدی نے بھی روایت کی ہے۔ عن ابی بکر بن عبداللہ بن ابی مریم عن علی بن ابی طلحۃ عن کعب بن مالک۔ حضرت کعب بن مالک نے ایک یہودیہ عورت یا نصرانیہ عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا' تو نبی کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت فرمایا۔ آپ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا یہ تمہیں محصن نہیں بنائے گی(2)۔ دارقطنی کہتے ہیں ابو بکر بن ابی مریم' انتہائی ضعیف راوی ہے اور علی بن ابی طلحہ نے کعب سے ملاقات نہیں کی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس حدیث کو ذیل کی سند سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ بقیۃ بن الولید عن عتبۃ بن تمیم عن علی بن ابی طلحۃ عن

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1011 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 148 (المحاسن)

کعب۔ اور یہ سند منقطع ہے۔ میں کہتا ہوں بقیۃ بن الولید بھی ضعیف اور مدلس راوی ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں انقطاع ہمارے نزدیک ارسال میں داخل ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک راویوں کی عدالت کے بعد حجت ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث صحیحین کی حدیث کے مقابل نہیں ہے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہودی اور یہودیہ کو رجم کیا تھا۔ پس صحیحین کی حدیث کے ہوتے ہوئے اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ حدیث امام احمد کے لئے بھی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ انہوں نے احصان کے لئے اسلام کی شرط لگائی ہے۔

امام بیہقی نے ابی وہب عن یونس عن ابن شہاب کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ابن شہاب نے عبدالملک سے سنا کہ انہوں نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے لونڈی کے متعلق پوچھا کہ کیا یہ آزاد کو محصن بناتی ہے انہوں نے فرمایا ہاں۔ پھر انہوں نے پوچھا یہ کس نے کہا ہے؟ عبیداللہ نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو یہی فتویٰ دیتے ہوئے پایا ہے(1) امام بیہقی فرماتے ہیں مجھے محمد بن یحییٰ کے ذریعے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے اوزاعی سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

بیہقی نے عبدالرزاق عن عمر عن الزہری عن عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کے طریق سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔

مسئلہ: بدکاری کرنے والے مرد اور عورت میں سے ایک محصن اور دوسرا غیر محصن ہو تو ان میں سے جو محصن ہوگا اسے رجم کیا جائے گا اور جو غیر محصن ہوگا اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور اس پر اجماع ہے کیونکہ زید بن خالد اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ملازم شخص نے جب اپنے مستاجر کی بیوی سے بدکاری کی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزا ہے۔ اور اے انیس تم عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف جرم کر لے تو اسے رجم کر دو۔ عورت نے اعتراف جرم کر لیا تو اسے رجم کیا گیا۔ (متفق علیہ)

مسئلہ: اگر بدکاری کرنے والوں میں سے ایک مجنون (پاگل) اور دوسرا عقلمند ہو تو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک عاقل پر حد واجب ہوگی۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اگر مرد عاقل ہو اور عورت پاگل ہو تو صرف مرد پر حد واجب ہوگی۔ لیکن اگر عورت عاقلہ ہو اور مرد مجنون ہو تو عورت پر حد واجب نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں زنا کا فعل مردوں کی طرف سے متحقق ہوتا ہے۔ عورت تو صرف محل زنا ہے اسے زانیہ سے تعبیر کرنا مجازاً ہے۔ پس اس کے حق میں حدِ زنا کے فعل پر قدرت دینے کی وجہ سے متحقق ہوتی ہے اور یہ اس کا فعل ہے جو اس فعل کی نہی کا مخاطب ہے۔ جمہور علما فرماتے ہیں عورت کی جانب سے عذر مرد کی جانب سے حد کو بالا جماع ساقط نہیں کرتا۔ اسی طرح مرد کی جانب سے عذر عورت کی حد کو ساقط نہیں کرتا۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ زانیہ پر زنا کا اطلاق مجازاً ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں تو اس کا مجازی معنی زنا پر قدرت دینا بھی اس کے حق میں حد کا موجب ہے اور بچہ اور مجنون کے فعل کا زنا نہ ہونے کا قول بھی درست نہیں ہے؟ بلکہ اس کا فعل بھی لغۃً اور شرعاً زنا ہے اور اس پر گناہ کا نہ ہونا اس کے غیر مکلّف ہونے کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: شرعاً اور لغۃً زنا کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت سے قُبل میں بغیر ملکیت کے وطی کرے۔ دُبر میں وطی خواہ مفعول یہ مرد ہو یا عورت ہو لغۃً اور شرعاً زنا نہیں ہے۔ ہم نے سورۂ نساء کی آیت وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا کی تفسیر میں لواطت کی حد کے متعلق علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ پس جس نے اپنی بیوی حائضہ، روزہ دار، احرام باندھنے والی یا لونڈی سے استبراء رحم سے پہلے وطی کی یا مشترکہ

1۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 216 (الفکر)

لونڈی یا غیر کی منکوحہ لونڈی یا رضاع کی وجہ سے حرام لونڈی سے وطی کی تو یہ زنا نہ ہوگا اور ملک کے پائے جانے کی وجہ سے حد واجب نہ ہوگی لیکن گناہگار رہوگا۔ شبہ ملک' شرعاً ملک کے ساتھ ملحق ہے۔ پس شبہ ملک کی وجہ سے بھی ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کے نزدیک حد ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن ظاہر یہ علماء اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اِدْرَءُ وُا اَلْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ۔ (یعنی شبہات کی وجہ سے حدود کو دور کرو)(1) مسند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں مقسم عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ادروء الحدود بالشبہات سے حدود کو شبہات کی وجہ سے دور کرو۔

امام ترمذی' حاکم اور بیہقی نے زہری عن عروہ عن عائشہ کی سند سے اس طرح روایت کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حدود کو دور کرو۔ جب کسی مسلمان کا حد سے بچنے کا کوئی راستہ ہو تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ امام کا معافی دینے میں خطا کرنا' سزا دینے میں خطا کرنے سے بہتر ہے(2) اس حدیث کی سند میں یزید بن زیاد دمشقی ہے جو ضعیف راوی ہے۔ بخاری نے اسے منکر الحدیث اور امام نسائی نے متروک لکھا ہے۔ وکیع نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے اور یہی اصح ہے۔ امام ترمذی نے بھی موقوف کو اصح کہا ہے فرماتے ہیں یہ حدیث کئی صحابہ سے مروی ہے وہ بھی یہی فرماتے تھے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں وکیع کی روایت صواب کے زیادہ قریب ہے اور فرماتے ہیں اس حدیث کو رشدین نے عقیل سے اور انہوں نے زہری سے روایت کیا ہے۔ لیکن رشدین بھی ضعیف راوی ہے۔ ہم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے حدود کو شبہات کی وجہ سے دور کرو اور امام کے لئے حدود کو معطل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس حدیث کی سند میں المختار بن نافع ہے جو منکر الحدیث ہے۔ بخاری نے یہی لکھا ہے اس باب میں اصح ترین حدیث یہ ہے سفیان الثوری عن عاصم عن ابی وائل عن عبداللہ بن مسعود قَالَ اِدْرَءُ وَالْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ اِدْفَعُوا الْقَتْلَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ یعنی حدود کو شبہات کی بنا پر دور کرو اور مسلمانوں سے جہاں تک ممکن ہو قتل کو دور کرو(3)۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ اور عقبہ بن عامر اور معاذ سے یہ حدیث موقوفاً بھی مروی ہے اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر سے منقطع اور موقوف روایت کی ہے۔ ابن حزم نے کتاب الایصال میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت کی ہے۔

ابن ابی شیبہ نے ابراہیم النخعی عن عمر کے سلسلہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ شبہات کی وجہ سے حدود کو قائم نہ کرنا میرے نزدیک شبہات کی بنا پر حدود قائم کرنے سے بہتر ہے(4)۔

ظاہر یہ کہتے ہیں حد کے ثبوت کے بعد کسی شبہ کی وجہ سے اسے دور کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ بلکہ صحابہ کرام سے کسی صحیح سند کے ساتھ حد کو دور کرنے کے متعلق کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ وہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث کی ارسال کے ساتھ علت بیان کرتے ہیں اور عبدالرزاق نے جو عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے' وہ ابن ابی شیبہ کی روایت کے علاوہ ہے لیکن وہ اسحق بن ابی فروہ راوی کی وجہ سے معلول ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس حدیث کو علماء امت نے قبولیت کے ساتھ لیا ہے اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ وہ بار بار سوال کرتے تھے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے ماعز کو کہا تھا شاید تو نے بوسہ لیا ہو' شاید تو نے صرف مس کیا

1۔ کنز العمال، جلد 5، صفحہ 309 (التراث الاسلامی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 171 (وزارت تعلیم)
3۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 511 (دار التاج)
4۔ ایضاً

ہو' شاید تو نے صرف اشارہ کیا ہو۔ آپ ﷺ بار بار اسے اقرار کے بعد رجوع کی تلقین کرتے رہے اور اس کا فائدہ صرف یہ تھا کہ اگر وہ ہاں کہہ دیں تو انہیں چھوڑ دیں گے۔ (اور سنگسار نہیں کریں گے) اسی طرح چور کو پکڑ کر لایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے خیال میں اس نے چوری نہیں کی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے غامدیہ سے کہا تھا۔ ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراحہ سے کہا تھا شاید وہ تجھ پر واقع ہوا ہو جب تو سوئی ہوئی تھی۔ شاید اس نے تجھے مجبور کیا ہو۔ شاید تیرا مولا تیرا خاوند ہو اور تو اسے چھپا رہی ہو(1)۔ آپ ہر شخص سے اسی کی مثل بار بار سوال کرتے تھے جو کلام کی طوالت کا موجب بنتا تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حد کو دور کرنے کا حیلہ ضرور کرنا چاہئے۔ پس اس مفہوم پر حدیث اور آثار قطعی الدلالۃ ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: شبہ کی دو قسمیں ہیں (1) شبہ اشتباہ۔ یہ ایسی صورت ہوتی ہے جس میں اس فعل کی حلت کی کوئی دلیل نہیں ہوتی لیکن اس فعل کو کرنے والا غیر دلیل کو دلیل گمان کر کے اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ جیسے کوئی اپنے باپ' ماں اور بیوی کی لونڈی سے وطی کر دے۔ اس گمان پر کہ والدین اور بیٹے کی ملکیت متصل ہوتی ہے' اور بیوی کی لونڈی سے وطی کرے اس گمان سے کہ اس کے مال اور میرے مال میں کیا فرق ہے نیز میرا ان کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ہے کہ ان کے حق میں میری گواہی بھی قبول نہیں ہے۔ یا کوئی تین طلاقیں دینے کے بعد بیوی سے وطی کرتا ہے حقوق نکاح کے باقی ہونے کی وجہ سے۔ مثلاً وجوب نفقہ اور غیر سے عدت میں اس کا نکاح کرنا منع ہے یا اسی طرح کوئی مال پر طلاق دینے کے بعد وطی کرتا ہے اور ام ولد جسے آقا نے آزاد کر دیا جبکہ ابھی وہ عدت میں ہے اس کے ساتھ کسی شبہ کی بنا پر وطی کرتا ہے اور آقا کی لونڈی سے غلام وطی کرتا ہے یا رہن رکھی ہوئی لونڈی سے مرتہن وطی کرتا ہے اس گمان سے کہ مجھے ملکیت کا قبضہ حاصل ہے۔ ایسے شخص کو حد نہیں لگائی جائے گی۔ اور اگر اسے ان عورتوں کے حرام ہونے کا علم تھا اور پھر اس نے یہ فعل کیا تو اسے حد لگائی جائے گی، کیونکہ حلت کی کوئی دلیل موجود نہیں تھی 2۔ شبہۃ الملک۔ یہ ایسی صورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی دلیل پائی جاتی ہے جو اس فعل کی حلت کا موجب ہوتی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کی لونڈی سے وطی کر لے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کو دیکھتے ہوئے کہ اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ (تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے) اس حدیث کو ابن ماجہ نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے(2) یہ ارشاد حضور ﷺ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا تھا جس نے یہ کہا تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرا مال بھی ہے اور میری اولاد بھی ہے جبکہ میرا باپ میرا مال لینا چاہتا ہے۔

ابن القطان اور المنذری نے لکھا ہے کہ اسکی سند صحیح ہے۔ طبرانی نے الاصغر میں اور بیہقی نے الدلائل میں روایت کی ہے۔ اسی طرح الفاظ کنایہ کے ساتھ جس عورت کو طلاق دی گئی اور پھر اس کا خاوند اس سے وطی کرے (تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی) کیونکہ صحابہ کرام کا اختلاف ہے کہ اس عورت سے رجوع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح فروخت شدہ لونڈی اور جس کو مہر دیا گیا ہو وہ بھی بائع اور خاوند کے حق میں شبہ بالملک ہے' کیونکہ وہ اس کی ضمان میں ہے۔ اسی طرح ہر ایسی صورت جسے کسی عالم (مفتی) نے مباح قرار دیا ہو جیسے بغیر گواہوں کے نکاح وغیرہ' ان تمام صورتوں میں وطی کرنے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی اگرچہ وطی کرنے والا اس عورت کی حرمت کا اعتقاد بھی رکھتا ہو۔ اسی طرح پہلی رات کسی کے پاس اپنی بیوی کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھیج دی گئی اور عورتوں نے اسے کہا کہ یہی تیری بیوی ہے (اس نے اس سے جماع کر دیا) تو اس شخص پر بالا جماع حد نہیں ہے۔ اور اس پر مہر واجب ہوگا اور عدت بھی ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ اس شخص کو حد اس لئے نہ ہوگی کیونکہ اس نے دلیل پر اعتماد کیا تھا۔ اور وہ

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 326 (المکتب الاسلامی)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 90 (العلمیہ)

دلیل اشتباہ کے موقع پر کسی کا خبر دینا ہے کیونکہ انسان پہلی مرتبہ اپنی بیوی اور دوسری عورت کے درمیان تمیز نہیں کرسکتا۔ لیکن جسکے بستر پر کوئی عورت لیٹی ہوئی ہو اور وہ اس سے وطی کر دے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر حد واجب ہے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد واجب نہیں ہے وہ اسے پہلی رات بھیجی جانے والی عورت پر قیاس کرتے ہیں جس کے ساتھ مرد حلت کے گمان سے جماع کرتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ شادی کو جب زیادہ وقت گزر جائے تو پھر اپنی بیوی اور دوسری عورتوں کے درمیان کوئی اشتباہ نہیں رہتا۔ (بیوی کو مس کرنے' اس کے سانس اور اس کی خوشبو سے پتہ چل جاتا ہے) پس ایسے شخص کا ظن کسی دلیل پر قائم نہ ہوگا۔ اسی طرح جب اندھا شخص جسے صرف نام پتہ پوچھنے سے اپنی بیوی کی تمیز ہوتی ہے وہ اپنی بیوی کو بلاتا ہے اور کوئی غیر عورت اسے جواب دیتی ہے اور کہتی ہے میں تیری بیوی ہوں وہ اس سے جماع کر لیتا ہے تو اس پر حد جاری نہ ہوگی کیونکہ خبر اس کے لئے دلیل ہے اور آواز کا دوسری آواز کے مشابہ ہونا ممکن ہے خصوصاً جبکہ شادی کو زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو تو اشتباہ ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ' زفر' سفیان الثوری کے نزدیک ایک شبہ عقد بھی ہے، مثلاً جس نے کسی ایسی عورت سے نکاح کیا جس کے ساتھ اس کا نکاح حلال نہیں تھا تو اس شخص پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک حد واجب نہیں ہے لیکن سخت سزا اس پر واجب ہوگی۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بہتر ہے کہ اسے بطور حد قتل کیا جائے۔ تاکہ حدیث کی اتباع ہو جائے۔

امام مالک' شافعی' احمد' ابو یوسف اور محمد کے نزدیک اگر وہ شخص حرمت کو جانتا تھا اور پھر اس نے ایسی عورت سے نکاح کیا تھا تو اس پر زنا کی حد واجب ہوگی کیونکہ اس نے بغیر ملکیت اور بغیر شبہ ملک کے ایسی شرمگاہ میں وطی کی ہے جس کی تحریم پر اجماع ہے۔ اور تحریم کو جانتے ہوئے وطی کرنے والا حد کا مستحق ہے۔ پس ایسے شخص پر حد واجب ہوگی، جیسا کہ اگر عقد نکاح نہ پایا جائے اور کوئی وطی کرے تو اس پر حد واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ عقد کسی شبہ کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ اس نے محل نکاح میں نکاح نہیں کیا اور یہ فی نفسہ ایسی خیانت ہے جو سزا کا موجب ہے جو زنا کے ساتھ مل گئی ہے' پس کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ جیسا کہ اگر کوئی عورت کو بدکاری پر مجبور کرتا اور اسے سزا دیتا اور پھر اس کے ساتھ زنا کرتا۔ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ عقد شبہ ہے اور وطی بالشبہ زنا نہیں ہوتی' پس یہ وطی زنا سے بھی زیادہ قبیح جرم ہے' اسلئے جو سزا زنا کی ہے اس جرم پر وہ سزا اور زیادہ مناسب ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اس شخص نے مطلق نکاح کے محل میں عقد نکاح کیا ہے کیونکہ وہ عورت بنی آدم سے ایک مونث ہے۔ اگرچہ نکاح مخصوص کا وہ عورت محل نہ تھی' اس وجہ سے نکاح باطل ہوگیا لیکن شبہ کا موجب ہے کیونکہ شبہ وہ ہوتا ہے جو کسی ثابت شدہ کے مشابہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ثابت کا مشابہ' ثابت نہیں ہوتا۔ پس شبہ کسی اعتبار سے بھی حلت کے ثبوت کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور جب اسمیں شبہۃ الملک ثابت ہوگیا تو زنا کا مفہوم نہ رہا اور اس فعل کا زنا سے زیادہ اغلظ ہونا حد کے وجوب کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ حدود کا معاملہ توقیفی ہے۔ مثلاً دیکھو اگر کوئی شخص کسی پاکدامن پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو اس پر حد قذف اسی کوڑے واجب ہوتی ہے اور جو اس پاکدامن پر کفر کی تہمت لگائے تو قاذف پر حد قذف واجب نہیں ہوتی حالانکہ کفر' زنا سے اغلظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غیبت زنا سے بھی زیادہ اشد اور سخت (گناہ) ہے' اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوسعید اور جابر سے روایت کیا ہے(1) اور شبہات کی تعریف میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کرے جسکے ساتھ

1۔ شعب الایمان، جلد5، صفحہ 306 (العلمیۃ)

نکاح حلال نہیں ہے۔اس سے مراد باتفاق علماء یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس عورت سے نکاح حلال نہیں ہے جیسے نسب' رضاع یا صہریت کی وجہ سے حرام ہونے والی عورتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوتی ہیں ,لیکن وہ نکاح جومختلف فیہ ہو جیسے بغیر ولی کے نکاح اور بغیر شہود کے نکاح تو یہ نکاح بالاتفاق حد کو ساقط کردیتا ہے کیونکہ تمام علماء کے نزدیک شبہ ممکن ہے۔

اگر نکاح بالاتفاق حرام ہو لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام نہ ہو جیسا کہ کوئی شخص آزاد بیوی کے ہوتے ہوئے کسی لونڈی سے نکاح کر لے یا لونڈی سے نکاح کر لے اس کے آقا کی اجازت کے بغیر یا غلام نکاح کرے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر یا غیر کی منکوحہ سے نکاح کرے یا غیر کی معتدہ سے نکاح کرے یا مطلقہ ثلاث سے نکاح کرے یا پانچویں عورت سے نکاح کرے یا اپنی بیوی کی بہن سے نکاح کرے یا اس کی عدت میں نکاح کرے ان تمام صورتوں میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک حد واجب نہ ہوگی۔صاحبین سے ایک روایت ہے کہ اسے حد لگائی جائے گی اور دوسری روایت ہے کہ اس کو حد نہ لگائی جائے گی۔امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام طحاوی نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے اس کی عدت کے اندر نکاح کیا' اس کا مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے اسے سزا دی اور عورت کے لئے مہر کا حکم فرمایا اور ان دونوں کے درمیان جدائی کردی پھر فرمایا یہ دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔راوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر تو یہ کرلیں اور اصلاح کرلیں (1)۔

محارم کے مسئلہ میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ جو کسی محرم عورت سے نکاح کرے گا تو اس کو قتل کیا جائے گا۔اسی طرح امام احمد' اسحٰق اور اہل ظواہر سے منقول ہے۔ابن حزم نے حد کو اپنے مورد پر رکھتے ہوئے اس شخص کے قتل کا فتویٰ دیا ہے جو اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرے۔امام احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس شخص کو قتل کیا جائے گا اور اسکا مال بیت المال میں جمع کرایا جائے گا۔کیونکہ حدیث براء بن عازب میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں اپنے خالو سے ملا،جبکہ ان کے ساتھ ایک لشکر تھا۔میں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟انہوں نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے شخص کو قتل کرنے اور اس کا مال لینے کے لئے بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرلیا ہے (2)۔اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔امام طحاوی نے یہ حدیث بعض طرق سے نقل کی ہے لیکن ان میں مال لینے کا ذکر نہیں ہے اور بعض طرق میں مال لینے کا ذکر ہے۔ابن ماجہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنی محرمہ عورت سے بدکاری کرے اسے قتل کر دو (3)۔معاویہ بن قرہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے دادا معاویہ کو اس شخص کو قتل کرنے اور اس کے مال کا خمس لینے کے لئے بھیجا جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا (4)۔

علماء احناف (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں ان احادیث میں اس شخص کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ حد کے وجوب میں کوڑے اور رجم دونوں ہیں کیونکہ ان احادیث میں کوڑوں اور رجم کا ذکر نہیں ہے۔نیز حدیث میں محرمہ عورت کے ساتھ دخول کا ذکر نہیں بلکہ محرمہ کے ساتھ صرف نکاح کا ذکر ہے اور نفس نکاح بالاجماع حد کا موجب نہیں ہے۔پس ضروری ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے ایسے شخص کو قتل کرنے اور اس کا مال لینے کا حکم یا تو سیاستہً فرمایا ہے یا اس لئے کہ اس فعل کو اس شخص نے حلال سمجھتے ہوئے کیا تھا جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔پس وہ مرتد ہو گیا تھا اور شاید وہ محارب ہو گیا ہو۔اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اس کے قتل

1۔شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 85 (امدادیہ)
2۔سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 190 (وزارت تعلیم)
3۔سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 187 (وزارت تعلیم)
4۔شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 85 (امدادیہ)

کرنے اور اس کا مال لینے اور خمس لینے کا حکم فرمایا تھا۔

مسئلہ: شبہ عقد میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو زنا کے لئے اجرت پر لیتا ہے پھر اس کے ساتھ زنا کرتا ہے تو ایسے شخص پر امام صاحب کے نزدیک حد نہیں ہے بلکہ اسے تعزیر لگائی جائے گی۔ امام ابو یوسف، محمد، مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہم اور احمد فرماتے ہیں ایسے شخص کو حد لگائی جائے گی کیونکہ عقد اجارہ کی وجہ سے بضع مباح نہیں ہوتا جس طرح اگر کوئی شخص کسی عورت کو کھانا پکانے یا گھر کے دوسرے کام کاج کے لئے لے آئے اور پھر اس سے زنا کرے تو اسے بالاتفاق حد لگائی جائے گی۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ زنا سے مقصود منفعت ہے اور منفعت اجارہ میں معقود علیہ ہوتی ہے لیکن وہ عین چیز کے حکم میں ہوتی ہے۔ چونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ عقد اجارہ کا محل ہے۔ پس یہ شبہ کا موجب ہے لیکن کھانا پکانے کے لئے اجرت پر لانے کی صورت میں مذکورہ صورت سے مختلف ہے کیونکہ اس میں عقد وطی پر نہیں ہوئی اور عقد جو کسی محل کی طرف منسوب ہو وہ اس میں شبہ کا موجب بنتا ہے کسی دوسرے محل میں شبہ کا موجب نہیں بنتا۔

مسئلہ: علماء کا اتفاق ہے کہ زنا کا ثبوت چار مردوں کی گواہی سے ہوتا ہے۔ اس سے کم شہادت پر زنا کا ثبوت نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں عورتوں کی شہادت قبول ہے کیونکہ ارشاد ہے فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (تو گواہ طلب کرو تہمت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ (اگر وہ سچے تھے تو) تو کیوں نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ؟

مسئلہ: اگر چار متفرق گواہ گواہی دیں تو بھی زنا ثابت ہو جائے گا اور امام شافعی کے نزدیک نصاب کے مکمل ہونے کی وجہ سے حد واجب ہو گی۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ان گواہوں کو حد قذف لگائی جائے گی کیونکہ پہلی مرتبہ نصاب مکمل نہ تھا۔ پس ان کی گواہی رد کی جائے گی۔ ایک مرتبہ گواہی کے رد ہونے کے بعد پھر ان کی گواہی مقبول نہ ہو گی۔ اگر وہ گواہ علیحدہ علیحدہ آئے پھر اکٹھے ہو گئے اور پھر مل کر گواہی دی تو امام احمد کے نزدیک ان کی گواہی قبول ہو گی۔ امام مالک اور ابوحنیفہ کے نزدیک چاروں گواہوں کا مل کر آنا اور مل کر گواہی ادا کرنا شرط ہے۔

مسئلہ: کیا اقرار میں تعداد شرط ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام احمد اور اکثر علماء فرماتے ہیں اقرار سے زنا اس وقت ثابت ہو گا جب عاقل، بالغ شخص اپنے اوپر چار مرتبہ اقرار کرے گا۔ اور پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ چار مرتبہ اقرار چار مجالس میں ہو گا یا ایک ہی مجلس میں چار مرتبہ اقرار کافی ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں چار مختلف مجالس میں اقرار کرنا ضروری ہے کیونکہ مجلس متفرقات کی جامع ہوتی ہے اور باب الزنا باب الاحتیاط ہے۔ امام احمد اور ابو لیلیٰ فرماتے ہیں ایک مجلس میں چار مرتبہ اقرار کافی ہے، کیونکہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا جبکہ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرما لیا۔ پھر وہ آپ ﷺ کے سامنے آیا اور عرض کی میں نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے پھر اس کی طرف سے چہرۂ انور پھیر لیا، پھر جب اس نے چار مرتبہ یہ اقرار کیا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا کیا تو پاگل ہے؟ اس نے عرض کی نہیں۔ پھر پوچھا کیا تو محصن (شادی شدہ) ہے؟ عرض کی جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسے لے جاؤ اور رجم کر دو(1) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے حجت پکڑی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1008 (وزارت تعلیم)

ہے جو مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کی ہے کہ ماعز نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس لوٹا دیا پھر وہ دوسرے دن دوبارہ آئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس لوٹا دیا پھر آپ ﷺ نے ان کی قوم سے پوچھنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کی عقل میں کچھ خرابی تو نہیں' ان کی قوم والوں نے کہا ہم تو اسے عقلمندوں سے جانتے ہیں پھر وہ تیسری مرتبہ آئے۔ آپ ﷺ نے ان کی قوم سے ان کے متعلق پوچھنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا تو اس نے جب ان کی قوم سے ان کی ذہنی کیفیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کو کوئی تکلیف نہیں ہے اور نہ ان کی عقل میں کوئی خلل ہے۔ پھر جب ماعز چوتھی مرتبہ آئے تو ان کے لئے ایک گڑھا کھودا گیا اور پھر انہیں رجم کیا گیا(1)۔

امام احمد' اسحٰق بن راہویہ اور ابن ابی شیبہ نے المصنف میں حضرت ابی بکر سے روایت کیا ہے کہ ماعز بن مالک نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور زنا کا اعتراف کیا۔ راوی فرماتے ہیں میں آپ کے پاس موجود تھا۔ آپ ﷺ نے اسے واپس لوٹا دیا۔ پھر دوبارہ وہ آیا اور اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے پھر بھی اسے واپس لوٹا دیا۔ پھر وہ تیسری مرتبہ حاضر ہوا اور اعتراف جرم کیا۔ آپ نے پھر لوٹا دیا۔ میں نے ماعز کو کہا اگر تو نے چوتھی مرتبہ اعتراف جرم کیا تو آپ ﷺ تمہیں رجم کر دیں گے۔ راوی فرماتے ہیں چوتھی مرتبہ بھی ماعز نے اعتراف جرم کر لیا' آپ ﷺ نے اس مرتبہ اسے روک لیا اور ان کے متعلق (لوگوں سے) سے پوچھا تو بتایا کہ ہم تو ان کے متعلق خیر ہی جانتے ہیں۔ پس انہیں رجم کیا گیا(2) یہ حدیث متعدد مرتبہ آنے پر صراحۃً دلالت کرتی ہے اور ہر مرتبہ اس کا مجلس سے غائب ہونے کو مستلزم ہے۔ اسی وجہ سے احناف رحمہم اللہ فرماتے ہیں جب وہ ایک مرتبہ مجلس سے غائب ہو جائے اور پھر لوٹ آئے تو وہ دوسری مجلس شمار ہوگی۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ماعز بن مالک نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی خیر و بھلائی سے دور شخص نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے ہلاکت ہو تجھے پتہ ہے زنا کیا ہے؟ آپ ﷺ نے انہیں مجلس سے بھگانے اور نکالنے کا حکم دیا۔ وہ نکل گئے۔ پھر وہ دوسری مرتبہ آئے اور پہلے کی طرح اقرار کیا؟ آپ ﷺ نے پھر انہیں مجلس سے نکالنے کا حکم دیا۔ وہ چلے گئے تو تیسری مرتبہ پھر وہ واپس لوٹ آئے اور پہلے کی طرح اعتراف جرم کیا؟ آپ ﷺ نے اس مرتبہ بھی نکالنے کا حکم دیا پھر وہ چوتھی مرتبہ آئے اور زنا کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے ماعز سے پوچھا کیا تو نے داخل کیا اور نکالا؟ تو ماعز نے کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث طیبہ اور دوسری احادیث تعدد مجالس پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں پس پہلی حدیث کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔

پہلی حدیث میں یہ ارشاد کہ آپ ﷺ نے چہرۂ اقدس پھیر لیا تھا پہلے قول کے ساتھ ایک اقرار شمار ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک مجلس میں تھا اور یہ ارشاد کہ جب انہوں نے چار مرتبہ اقرار کر لیا اس سے مراد چار مجالس میں اقرار کرنا ہے کیونکہ یہ اس کے منافی نہیں ہے۔

امام مالک' الشافعی' ابوثور' الحسن' حماد بن ابی سلیمان فرماتے ہیں ایک مرتبہ اقرار سے بھی زنا ثابت ہو جاتا ہے' کیونکہ زید بن خالد اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں ملازم شخص کے واقعہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ اے انیس اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو رجم کر دو۔ وہ اس عورت کے پاس گئے تو اس نے اعتراف کر لیا پھر انہوں نے اس کو رجم کر دیا(3)۔ اسی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 68 (وزارت تعلیم) 2۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 8 (صادر) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)

طرح امام مالک' شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ فرماتے ہیں کہ غامدیہ عورت کے واقعہ میں بھی ایک مرتبہ اقرار کا ذکر ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ارشاد "اگر اعتراف کرے تو اسے رجم کردو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا اعتراف کرے جو زنا کے حد میں مقبول ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے صرف "ان اعترفت" کے الفاظ پر اکتفا فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ صحابہ کرام ماعز وغیرہ کے واقعہ سے جانتے ہیں کہ زنا میں معتبر اقرار' چار مختلف مجالس میں چار مرتبہ اقرار کرنا ہے' اور امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کا کہنا کہ غامدیہ کے واقعہ میں ایک مرتبہ اقرار کا ذکر ہے۔ تو یہ درست نہیں ہے بلکہ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام آپس میں یہ گفتگو کرتے تھے کہ غامدیہ اور ماعز بن مالک اگر اعتراف کے بعد رجوع کر لیتے تو آپ دوبارہ ان سے مطالبہ نہ کرتے۔ آپ ﷺ نے چوتھی مرتبہ اعتراف کے بعد رجم فرمایا تھا(1)۔ یہ چار مرتبہ اقرار پر نص صریح ہے اور اس کے متعلق غایت یہ ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل احادیث میں منقول نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بزار نے اپنی مسند میں زکریا بن سلیم ثنا شیخ من قریش عن عبدالرحمن بن ابی بکرہ عن ابیہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ غامدیہ عورت نے چار مرتبہ اقرار کیا تھا اور آپ ﷺ اسے ہر مرتبہ لوٹاتے رہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم چلی جاؤ حتیٰ کہ بچہ جن دے۔ اس حدیث کی سند میں ایک مجہول راوی ہے جس کی جہالت ابوداؤد اور نسائی کی حدیث سے دور ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: امام کے لئے مستحب ہے کہ وہ اقرار سے رجوع کی اسے تلقین کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز بن مالک کو فرمایا تھا "شاید تو نے بوسہ لیا ہو یا تو نے چھوا ہو"

مسئلہ: اگر مجرم چار مرتبہ زنا کا اقرار کرنے کے بعد حد لگنے سے پہلے یا حد کے درمیان رجوع کر لے تو اس کا رجوع قبول ہوگا اور اس سے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حد ساقط ہو جائے گی۔ امام مالک سے دو روایتیں مروی ہیں۔

اس مسئلہ میں ہماری دلیل یہ ہے کہ رجوع ایک خبر ہے جو صدق کا احتمال رکھتی ہے۔ جیسا کہ اقرار ہے' اور کوئی شخص اس کی اس بات کی تکذیب کرنے والا بھی نہیں ہے۔ تو اقرار میں شبہ متحقق ہوگیا اور حدود شبہات کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ بخلاف اس صورت کے جس میں بندے کا حق ہو اور وہ قصاص اور حد قذف (کی صورت ہے) کیونکہ ان صورتوں میں اس کے رجوع کو جھٹلانے والا موجود ہوتا ہے۔ ماعز کا واقعہ ہماری اس دلیل کی تائید کرتا ہے' ابوداؤد نے یزید بن نعیم سے ماعز کا قصہ روایت کیا ہے۔ اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب انہیں رجم کیا گیا جب انہیں پتھر لگے تو وہ چلانے لگے اور دوڑ پڑے' راستہ میں انہیں عبداللہ بن انیس ملے' جبکہ صحابہ کرام حضرت ماعز کو پکڑنے سے عاجز آ چکے تھے۔ عبداللہ ابن انیس نے انہیں اونٹ کا پاؤں نکال کر مارا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر جب عبداللہ بن انیس حضور ﷺ کے پاس آئے اور سارا ماجرا بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا تھا شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتے(2) ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

مسئلہ: جب مریض زنا کرے اور اس کی حد رجم ہو تو اسے اسی حالت میں رجم کیا جائے گا کیونکہ اتلاف ثابت ہو چکا ہے پس مرض کے سبب اسے روکا نہیں جائے گا۔ اور اگر مریض کی حد کوڑے ہو تو اسے درست ہونے سے پہلے کوڑے نہ لگائے جائیں گے تاکہ کہیں ہلاک نہ ہو جائے اور اگر وہ ایسا مریض ہو کہ اس کے درست ہونے کی امید ہی نہ ہو جیسے گردوں کا مریض ہے' یا انتہائی ضعیف الخلقت

1۔ [illegible] جلد 2 صفحہ 253 ([illegible] تعلیم) 2۔ سنن ابوداؤد جلد 2 صفحہ 250 (وزارت تعلیم)

ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اسے ایسے کھجور کے خوشہ کے ساتھ مارا جائے گا جس کی سو شاخیں ہوں اور اسے ایک ہی مرتبہ وہ خوشہ مارا جائیگا لیکن اس طرح مارا جائے کہ ہر شاخ اس کے جسم کو لگ جائے۔ جیسا کہ امام بغوی نے شرح السنہ میں اور ابن ماجہ نے ابی امامہ بن سہل بن حنیف عن سعید بن سعد بن عبادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہماری لونڈیوں میں ایک انتہائی کمزور آدمی تھا' ایک روز وہ گھر کی لونڈی سے بدکاری کر رہا تھا حضرت سعید بن عبادہ نے اس کا مسئلہ بارگاہ رسالت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے سو کوڑے لگاؤ۔ حضرت سعد نے عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! وہ تو انتہائی کمزور ہے اگر ہم اسے سو کوڑے ماریں گے تو وہ مر جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کے لئے ایک خوشہ لے لو جس میں سو شاخیں ہوں اس کے ساتھ اسے یکبارگی مار دو اور اسے چھوڑ دو (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے ابی امامہ بن سہل عن رجل من الانصار کی سند سے روایت کیا ہے اور نسائی نے عن ابی امامہ بن سہل عن ابیہ کے سلسلہ سے اور طبرانی نے عن ابی امامہ بن سہل عن ابی سعید الخدری کے طریق سے روایت کی ہے۔ الحافظ ابن حجر فرماتے ہیں اگر اس کے تمام طرق محفوظ ہیں تو ابوامامہ نے اسے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو بیہقی نے ابی امامہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

مسئلہ: اگر حاملہ عورت زنا کرے تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی حتیٰ کہ وضع حمل ہو جائے، تا کہ اس کے پیٹ میں جو نفس محترمہ ہے وہ ہلاک نہ ہو جائے اور اگر اسکی حد کوڑے ہوں تو کوڑے نہ مارے جائیں حتیٰ کہ نفاس سے پاک ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا اے لوگو! اپنے غلاموں پر بھی حد قائم کرو خواہ وہ محصن ہوں یا محصن نہ ہوں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی لونڈی نے زنا کیا تو آپ ﷺ نے مجھے اسے کوڑے لگانے کا حکم فرمایا جبکہ وہ ابھی تک نفاس کی حالت میں تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اگر میں نے اسے کوڑے لگائے تو قتل ہو جائے گی۔ میں نے اس کی کیفیت نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کی تو آپ ﷺ نے (مجھے اس تاخیر پر) فرمایا تو نے اچھا کیا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ ابوداؤد کی روایت میں ہے فرمایا اسے چھوڑ دو حتیٰ کہ اس کا خون (نفاس) ختم ہو جائے پھر اس کو حد لگاؤ اور (فرمایا) اپنے غلاموں اور لونڈیوں پر یہ حدود قائم کرو۔ اگر نفاس والی عورتوں کی حد رجم ہو تو ان کے بچے ان سے دور ہونے کے بعد اور ان کے ہلاکت کے استحقاق کے وقت انہیں رجم کیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ اس کی حد کو مؤخر کیا جائے حتیٰ کہ بچہ ماں سے مستغنی ہو جائے، جبکہ بچہ کی تربیت کرنے والا کوئی نہ ہو تا کہ بچہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مسلم نے بریدہ سے غامدیہ کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے رجم کو مؤخر کیا حتیٰ کہ اس نے بچہ جن دیا۔ ایک انصاری اس کا کفیل تھا حتیٰ کہ اس نے بچہ جن دیا۔ راوی فرماتے ہیں غامدیہ نے بچہ جنا تو فرمایا اس کو رجم نہ کرو تا کہ چھوٹا بچہ چھوڑ کر مر نہ جائے جبکہ اس کو دودھ پلانے والا کوئی نہ ہو۔ ایک انصاری اٹھا اور کہا اے اللہ کے نبی (ﷺ) میں اس کی رضاعت کا ضامن ہوں تو آپ ﷺ نے اسے رجم کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے غامدیہ کو کہا تو چلی جا حتیٰ کہ تیرا بچہ پیدا ہو جائے۔ جب اس نے بچہ کو جنم دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اسے دودھ پلاؤ حتیٰ کہ تو اس کا دودھ چھڑا دے۔ جب اس نے بچہ کا دودھ چھڑا دیا تو پھر وہ بچہ لے کر آئی جبکہ بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! یہ بچہ ہے میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اور کھانا کھانے لگ گیا ہے۔ وہ بچہ ایک مسلمان آدمی کے سپرد کیا گیا اور پھر عورت کے لئے سینہ تک گڑھا کھودا گیا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 188 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 71 (قدیمی)

پھر لوگوں کو اسے رجم کرنے کا حکم دیا گیا اور لوگوں نے اسے رجم کر دیا(1)

مسئلہ: فاجلدوا کا خطاب وقت کے حکام کو ہے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حاکم (امام) کی اجازت کے بغیر آقا کو اپنے غلاموں پر حدود قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ امام مالک، الشافعی اور احمد فرماتے ہیں حاکم کی اجازت کے بغیر بھی آقا اپنے غلاموں پر حد قائم کر سکتا ہے۔ امام مالک سے ایک یہ روایت بھی ہے کہ آقا حد قائم کر سکتا ہے لیکن اپنی بیاہی ہوئی لونڈی پر حد قائم نہیں کر سکتا۔ امام شافعی نے آقا سے ذمی، مکاتب اور عورت کی استثناء فرمائی ہے۔

کیا یہ مطلق حکم ہے کہ ہر صورت میں آقا حد قائم کر سکتا ہے؟ غلام کو مرتد ہونے یا ڈاکہ ڈالنے یا چوری کرنے پر حد قائم کر سکتا ہے؟ تو اس کے متعلق بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں خبر کے اطلاق کی وجہ سے یہ ہر حد کو عام ہے اور اصح منصوص ہی ہے۔ تہذیب میں اصح قول یہ لکھا ہے کہ قتل اور قطع ید کی حد امام قائم کرے گا۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب اس لونڈی کے متعلق پوچھا گیا جو بدکاری کرے اور محصنہ نہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ پھر اگر زنا کرے تو پھر اسے کوڑے لگاؤ پھر اگر زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ۔ پھر اگر زنا کرے تو اسے بیچ دو اگرچہ بالوں کی رسی کے بدلے ہی(2)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے غلاموں پر حدود قائم کرو(3)۔ اس حدیث کو نسائی اور بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ پر موقوف ہے۔ امام شافعی نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالی عنہا نے اپنی اس لونڈی کو کوڑے لگائے جس نے زنا کیا تھا(4)۔

ابن وہب نے ابن جریج عن عمرو بن دینار کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ اپنی لونڈی کو پچاس کوڑے لگاتی تھیں جب وہ بدکاری کا ارتکاب کرتی تھی۔

حضرت امام شافعی نے عن مالک عن نافع کے سلسلہ سے یہ روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر کے ایک غلام نے چوری کی تھی عبداللہ نے اسے حضرت سعید بن العاص کی طرف بھیجا جو مدینہ کے امیر تھے تاکہ وہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ حضرت سعید امیر مدینہ نے اس غلام کا ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور فرمایا غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا جب وہ چوری کرے۔ حضرت ابن عمر نے اسے فرمایا تم نے یہ حکم کس کتاب میں پڑھا ہے۔ پھر ابن عمر نے اسکا خود حکم دیا اور اسکا ہاتھ کاٹا گیا(5)۔ اس حدیث کو عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں عن معمر عن ایوب عن نافع کی سند سے اسطرح روایت کیا ہے کہ ابن عمر نے خود اپنے غلام کا ہاتھ کاٹا تھا جس نے چوری کی تھی اور اس غلام کو کوڑے لگائے تھے جس نے زنا کیا تھا اور انہیں والی کی طرف نہیں بھیجا تھا(6) اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کا واقعہ ہے۔ سعید بن منصور نے عن ھشیم عن ابن ابی لیلیٰ عن نافع کے طریق سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ موطا میں امام مالک نے اور امام شافعی نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا مکہ جارہی تھیں اور آپ کے ساتھ بنی عبداللہ بن ابی بکر الصدیق کا ایک غلام تھا۔ اس نے چوری کی اور پھر اعتراف جرم بھی کر لیا تو حضرت عائشہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 68 (قدیمی) 2۔ ایضاً، صفحہ 70
3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 245 (الفکر) 4۔ موسوعۃ الامام الشافعی، جلد 8، صفحہ 28 (التراث العربی)
5۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 833 (التراث العربی) 6۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 10، صفحہ 239 (المکتب الاسلامیہ)

رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا(1) امام مالک نے موطا میں یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی اس لونڈی کو قتل کیا تھا جس نے جادو کیا تھا(2) اس اثر کو عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور انہوں نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کے اس فعل کو ناپسند کیا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا آپ ام المومنین کے اس فعل پر کیوں معترض ہیں جبکہ انہوں نے ایسی عورت کو قتل کیا ہے جس نے جادو کیا تھا اور اعتراف بھی کر لیا تھا۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل وہ حدیث ہے جسے اصحاب سنن نے اپنی اپنی کتب میں ابن مسعودؓ ابن عباس اور ابن زبیر سے موقوفاً اور مرفوعاً روایت کیا ہے کہ چار چیزیں والیوں (حکام) کے سپرد ہیں۔1۔حدود 2۔صدقات 3۔جمعات 4۔فئی۔

لے ابن کثیر نے رافۃ کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۃ الحدید میں ہمزہ ساکن ہے، کیونکہ ورحمۃ کی مجاورت میں ہے اور سورۂ حدید کے ہمزہ کے سکون میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔دین اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔یعنی حدود کو اس طرح معطل نہ کرو کہ تم لوگوں پر رحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں قائم نہ کرو۔مجاہد، عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر، نخعی، شعبی نے یہی معنی بیان کیا ہے (3) شیخین نے صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ قریش کے لئے مخزومیہ عورت جس نے چوری کی تھی ایک پریشان کن مسئلہ بن گئی۔انہوں نے مشورہ کیا کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کون سفارش کرے گا۔تو سب نے کہا یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب اسامہ بن زید ہی حل کر سکتے ہیں۔حضرت اسامہ نے آپ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے متعلق سفارش کرتے ہو۔پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان کا کوئی امیر آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی غریب آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔قسم بخدا! اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا(4)

بعض علماء نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تمہیں زانی اور زانیہ پر اس طرح رحم نہ آئے کہ تم ان کو آہستہ آہستہ مارو بلکہ انہیں سخت اذیت پہنچاؤ۔ یہ معنی سعید بن مسیب اور حسن بصری نے بیان فرمایا ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں سب سے سخت کوڑے حد زنا میں لگائے جائیں۔پھر اس سے آہستہ حد شرب میں اور حد قذف میں اس سے بھی آہستہ لگائے جائیں کیونکہ اس کا سبب محتمل ہے اسلیے کہ ہوسکتا ہے قاذف سچا ہو، جبکہ حد شرب کا سبب یقینی ہے اور زنا کی جنایت شراب پینے سے زیادہ گھناؤنی ہے(5)۔قتادہ فرماتے ہیں حد شرب اور حد قذف آہستہ اور حد زنا سخت لگائی جائے(6) زہری فرماتے ہیں حد زنا اور حد قذف سخت لگائی جائے کیونکہ ان کا ثبوت کتاب اللہ سے ہے اور حد شرب آہستہ لگائی جائے کیونکہ اس کا ثبوت سنت سے ہے(7)۔امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اپنی لونڈی کو کوڑے لگائے جس نے زنا کیا تھا اور آپ نے جلاد کو حکم دیا اس کی پیٹھ اور اس کے پاؤں پر مارو۔آپ کے بیٹے نے آپکو کہا لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ۔تو عبداللہ بن عمر نے فرمایا بیٹا! اللہ نے مجھے اس کے قتل کرنے کا تو حکم نہیں دیا ہے۔میں نے اسے مارا بھی ہے اور سخت تکلیف بھی پہنچائی ہے(8)۔

لے یہ شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جزا سے مستغنی ہے یعنی اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم الٰہی کو بجالانے میں جلدی کرو

1۔موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 833 (التراث العربی) 2۔ایضاً، صفحہ 871 3۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (الفکر)
4۔صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 64 (قدیمی) 5۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (الفکر)
6۔ایضاً 7۔ایضاً 8۔ایضاً

اور حدود کے قائم کرنے میں کوشش کرو کیونکہ ایمان اسی بات کا مقتضی ہے۔

۲؎ مجرم کی رسوائی اور دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے فرمایا بدکاروں کی سزا کے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہونا چاہئے کیونکہ تعذیب کی بنسبت رسوائی انسان کو برائی سے زیادہ روکتی ہے۔ طائفہ کا معنی گروہ اور فرقہ ہے کسی شے کے اردگرد گھیراؤ بھی اس کا معنی ہوسکتا ہے اس معنی کے اعتبار سے یہ طوف سے مشتق ہوگا۔ فرقہ سے مراد بعض علماء فرماتے ہیں چار ہیں کیونکہ اطراف چار ہیں۔ بعض فرماتے ہیں تین افراد ہیں کیونکہ یہ جمع کا ادنیٰ فرد ہے اور یہ طائف کی جمع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں طائفہ کا اطلاق ایک اور دو افراد پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا۔ اس آیت میں طائفہ سے مراد ایک فرد ہے۔ قاموس میں ہے اس کا معنی کسی چیز کا ٹکڑا یا ایک فرد اور زیادہ افراد بھی مراد ہوتے ہیں۔ ہزار تک افراد ہوسکتے ہیں۔ کم از کم دو افراد یا ایک فرد بھی مراد ہوتا ہے اس وقت یہ نفس کے معنی میں ہوتا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں طائفہ کا جمع ہونا بھی صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ واحد سے کنایہ ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ زاویہ اور علامۃ کی طرح ہو نخعی اور مجاہد کہتے ہیں کم از کم اس کا فرد ایک اور اس سے اوپر ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہی مروی ہے۔ امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ عطاء، عکرمہ اور اسحٰق فرماتے ہیں طائفہ سے دو اور دو سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ زہری اور قتادہ فرماتے ہیں تین اور تین سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ مالک اور ابن زید فرماتے ہیں زنا میں چار گواہ ہوتے ہیں اس لئے ان کی تعداد کے مطابق اس سزا کو دیکھنے والے بھی چار ہونے چاہئیں (2) حسن بصری فرماتے ہیں دس اور اس سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ قول بہتر ہے کیونکہ آیت سے مقصود تشہیر کرنا ہے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

”زانی شادی نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ نہیں نکاح کرتا اس کے ساتھ مگر زانی یا مشرک اور حرام کردیا گیا ہے یہ اہل ایمان پر ۱؎“

۱؎ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ ایک شخص جس کا نام مرثد تھا وہ مکہ سے مسلمان قیدیوں کو نکال کر مدینہ طیبہ پہنچاتے تھے۔ (ایک دفعہ وہ مکہ گئے) تو ایک عناق نامی عورت (سے ملاقات ہو گئی) جس کے مرثد کے ساتھ (زمانہ جاہلیت) میں تعلقات تھے۔ مرثد نے نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ میں اس عورت سے نکاح کرلوں۔ آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے مرثد الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ (الآیۃ) کا ارشاد نازل ہوا ہے اس لیے تو اس سے نکاح نہ کر (3)

نسائی نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ام مہزول ایک بدکارہ عورت تھی، ایک صحابی نے اس سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (4)۔ سعید بن منصور نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام قرار دیا تو بدکارہ عورتیں چونکہ خوبصورت اور حسن و جمال رکھتی تھیں اس لئے لوگ کہنے لگے ہم ان سے نکاح کرلیں گے تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا (5)۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 110 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 116 (الفکر)
3۔ [illegible]، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم) 4۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 246 (ابن حزم) 5۔ الدر المنثور، 5، صفحہ 39 (العلمیۃ)

امام بغوی لکھتے ہیں مہاجرین جب مدینہ طیبہ پہنچے تو بعض ان میں سے نادار تھے جن کے پاس مال و مویشی نہ تھے اور مدینہ طیبہ میں کچھ ایسی عورتیں تھی جو بدکاری کا پیشہ اپنائے ہوئے تھیں اور وہ اس وقت آسودہ حال تھیں تو بعض فقراء مہاجرین نے ان سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ اپنے مال سے ان پر خرچ کریں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ سے مشورہ طلب کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ بدکارہ عورتوں سے نکاح کریں کیونکہ وہ مشرکات ہیں۔ یہ قول عطاء بن ابی رباح، مجاہد، قتادہ، زہری اور الشعبی کا ہے۔ العوفی کی روایت میں ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے(1)۔

میں کہتا ہوں ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں سعید بن جبیر کی مراسیل سے یہ شان نزول نقل کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں عکرمہ نے فرمایا یہ آیت مکہ اور مدینہ کی عورتوں کے متعلق نازل ہوئی۔ ان عورتوں میں سے سات عورتیں ایسی تھیں جن کے مکانوں کے اوپر جھنڈے گاڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ ان کی پہچان ہوتی تھی۔ ان عورتوں میں ایک ام مہزول تھی جو السائب بن ابی السائب المخزومی کی لونڈی تھی۔ زمانہ جاہلیت میں مرد ایک زانیہ عورت سے شادی کر لیتا تھا اور پھر اس کی کمائی سے کھاتا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اس نسبت سے ان عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی، جبکہ ام مہزول نے اس مسلمان پر خرچ کرنے کی شرط بھی قبول کر لی تھی۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(2)۔ ان آیات اور مذکورہ احادیث کی وجہ سے امام احمد نے حجت پکڑی ہے کہ زانی اور زانیہ کا نکاح جائز نہیں ہے حتیٰ کہ دونوں توبہ کر لیں۔ جب توبہ کر لیں گے تو پھر انہیں زانی اور زانیہ کے ناموں سے نہیں پکارا جائے گا۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک زانیہ اور زانی کا نکاح صحیح ہے اور اس آیت کی تفسیر میں بعض یہ فرماتے ہیں۔ اس کا معنی خبر ہے جیسا کہ آیت کے صیغوں سے ظاہر ہے اور مطلب یہ ہے کہ زانی اپنے فسق کی بنا پر نیک صالحہ عورت سے نکاح کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتا اسی طرح زانیہ عورت سے نیک مرد نکاح کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ طبیعتوں کی مناسبت الفت و محبت کا موجب ہوتی ہے اور طبیعتوں میں مخالفت اور تضاد نفرت و افتراق کا سبب ہوتا ہے۔

کلام میں چونکہ مقابلہ ہے اس لئے حق تو یہ تھا کہ کلام اس طرح ہوتی اَلزَّانِیَۃُ لَا تَنْکِحُ اِلَّا مِنْ زَانٍ اَوْ مُشْرِکٍ۔ لیکن مقصود چونکہ ایسی عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت کے احوال بیان کرنا ہے اس لئے اسلوب بیان بدل دیا گیا۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ مومنین مردوں کے زانیہ عورتوں سے نکاح کرنے کے متعلق اجازت طلب کرنے کے وقت نازل ہوئی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کی تحریم اکثر علماء کے نزدیک تنزیہی ہے۔ اور مبالغہ کے لئے اس کو تحریم سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی مومنین ایسا نہیں کرتے اور وہ ایسی عورتوں سے نکاح کرنے سے اجتناب کرتے ہیں تا کہ فاسق لوگوں کی تشبیہ، برے ساتھی اور بری سنگت سے بچ جائیں اور نسب میں طعن سے بھی محفوظ رہیں۔

امام مالک فرماتے ہیں ایسا نکاح مکروہ تحریمی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں چند علماء کا خیال ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے(3) آیت کا معنی یہ ہے کہ زانی زنا نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ زنا نہیں کرتی مگر زانی یا مشرک سے۔ یہ سعید بن جبیر، ضحاک بن مزاحم کا قول ہے اور ابن عباس سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے۔ زید بن ہارون اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں زانی اگر حلال سمجھ کر نکاح کرے گا تو وہ مشرک ہوگا اور اگر حرام سمجھ کر نکاح کرے گا تو وہ زانی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 167 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ہوگا(1)۔اس تاویل کی بناء پر بھی کلام کا مبنیٰ اخبار ہوگا۔بعض علماء فرماتے ہیں یہاں نفی بمعنی نہی ہے۔نہی کے صیغہ کے ساتھ پڑھا بھی گیا ہے اور حرمت اپنے ظاہر پر ہے لیکن تحریم ان مہاجرین کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے بدکار عورتوں سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔یہ تحریم تمام لوگوں کیلئے نہیں ہے۔یہ قول بہت بعید ہے کیونکہ آیت میں ابتداءً منع زانی کا نیک عورتوں سے نکاح کرنا ہے نہ کہ بدکار عورتوں سے نکاح کرنا منع کیا گیا ہے۔اگر ایسی بات ہوتی تو کلام اس طرح ہوتی اَلْمُؤْمِنُ لَایَنْکِحُ اِلَّا مُؤْمِنَةً صَالِحَةً۔اسی طرح وَحُرِّمَ ذَالِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کا عموم بھی مخصوص مردوں کے ساتھ حکم کی تخصیص کے منافی ہے۔حضرت ابن مسعود زانیہ کے نکاح کو حرام کہتے تھے فرماتے جب زانی' زانیہ سے نکاح کرے تو وہ ہمیشہ زنا کرتے رہیں گے(2) الحسن فرماتے ہیں وہ زانی جسے کوڑے لگائے گئے ہوں وہ اس زانیہ سے نکاح کرے گا جسے کوڑے لگائے گئے ہوں۔اور زانیہ مجلودہ بھی صرف زانی مجلود (جسے کوڑے لگائے گئے ہوں) سے نکاح کر سکتی ہے(3)۔

ابوداؤد نے اپنی سند سے عمرو بن شعیب عن ابی سعید المقبری عن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زانی مجلود نکاح نہ کرے مگر اپنے جیسی مجلودہ عورت سے(4)۔ان دونوں قولوں کا مبنی یہ ہے کہ تحریم عام ہے اور آیت منسوخ نہیں ہے۔ حضرت سعید بن المسیب اور علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت کا حکم منسوخ ہے اور زانیہ کا نکاح اس آیت کی وجہ سے حرام تھا۔ پھر یہ حکم وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ کے ارشاد سے منسوخ ہوگیا۔اور زانیہ بھی ایامیٰ میں داخل ہے(5) اس لئے یہ ارشاد زانیہ کے نکاح کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ بغوی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میری بیوی کسی چھونے والے ہاتھ کو دور نہیں کرتی آپ ﷺ نے فرمایا اسے طلاق دے دے۔اس نے عرض کی حضور ﷺ! میں اس سے محبت کرتا ہوں وہ بہت خوبصورت ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا پھر تو اس سے متمتع ہوتا رہ۔ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا پھر تو اسے روک لے(6)۔اس طرح طبرانی اور بیہقی نے عبید اللہ بن عمر عن عبد الکریم بن مالک عن ابی الزبیر عن جابر کے طریق سے روایت کی ہے ابن ابی جابر فرماتے ہیں میں نے اس حدیث کے متعلق اپنے والد گرامی سے پوچھا تو انہوں نے اس طرح سند بیان فرمائی۔حدثنا محمد بن کثیر عن معتمر عن عبد الکریم حدثنی ابو الزبیر عن مولی لبنی ہاشم اور پھر حدیث کے الفاظ ذکر فرمائے۔اسی حدیث کو الثوری نے روایت کیا ہے۔انہوں نے الرجل کا نام ہشام مولی لبنی ہشام ذکر کیا ہے۔اسی حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے عبد اللہ بن عبید اللہ بن عمیر عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔نسائی فرماتے ہیں ایک راوی نے ابن عباس تک مرفوع ذکر کی ہے اور ایک راوی نے مرفوع ذکر نہیں کی۔فرماتے ہیں یہ حدیث متصل ثابت نہیں ہے اور مرسل صواب کے قریب تر ہے۔اس حدیث کو امام شافعی نے مرسلاً روایت کیا ہے۔نسائی اور ابوداؤد نے عکرمہ عن ابن عباس سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔الحافظ فرماتے ہیں اس کی اسناد صحیح ہے۔امام نووی نے بھی اس پر صحت کا اطلاق کیا ہے۔ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں نقل کیا ہے حالانکہ اسناد صحیح کے ساتھ ذکر کی ہے۔احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے کہ اس کے متعلق کوئی چیز ثابت نہیں ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

الحافظ فرماتے ہیں علماء کا حدیث کے الفاظ کا معنی بیان کرنے میں اختلاف ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں "لا ترفع ید لا مس" کا

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 167 (الفکر) 2۔ایضاً۔ 3۔ایضاً۔ 4۔ایضاً۔ 5۔ایضاً۔ 6۔ایضاً۔صفحہ 168

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس سے بدکاری کا ارادہ کرتا ہے وہ اسے منع نہیں کرتی۔ ابوعبیدہ، نسائی، ابن الاعرابی خطابی، فریابی، نووی نے بھی یہی معنی بیان کیا ہے اس مسئلہ میں بغوی اور رافعی وغیرہما کے استدلال کا مقتضیٰ بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فضول خرچ ہے جو اس سے خاوند کا کوئی مال طلب کرتا ہے وہ کسی کو منع نہیں کرتی۔ یہ معنی امام احمد، اصمعی اور محمد بن نصر نے کیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے زانیہ کے نکاح کے مسئلہ میں استدلال کرنا ممکن نہ ہوگا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ عمر بن خطاب نے ایک مرد اور عورت کو زنا کی سزا دی اور پھر ان دونوں کو جمع کرنے کا ارادہ کیا تو مرد نے انکار کر دیا (1)۔ طبرانی اور دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث نقل کی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے زنا کیا تھا اور پھر اس نے اسی عورت سے نکاح کا ارادہ کیا تھا۔ فرمایا حرام فعل حلال فعل کو حرام نہیں کرتا۔ (2) مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے بدکاری کی پھر اس نے اس سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اس کا پہلا فعل بدکاری ہے اور دوسرا نکاح ہے (3)۔

وَ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ﴿۴﴾

"اور وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں [1] پاکدامن عورتوں پر [2] پھر وہ نہ پیش کرسکیں چار گواہ [3] تو لگاؤ ان (تہمت لگانے والوں) کو اسی درے اور نہ قبول کرنا ان کی کوئی گواہی ہمیشہ کے لئے [4] اور وہی لوگ فاسق ہیں [5]"

[1] یرمون کا معنی تہمت لگانا ہے لیکن یہاں صریح الفاظ کے ساتھ زنا کی تہمت لگانا مراد ہے اور اس قید پر علماء تفسیر اور فقہ کا اجماع ہے اور اس مخصوص معنی کا قرینہ چار گواہوں کا ہونا ہے۔ جو شخص کسی دوسرے گناہ کی تہمت لگائے تو اس پر حد قذف بالاجماع نہ ہوگی لیکن حاکم جتنی سزا مناسب سمجھے دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے اشارۃً زنا کی تہمت لگائی مثلاً یہ کہا میں زانی نہیں تو اس پر حد قائم نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ، الشافعی، احمد، سفیان، ابن سیرین اور حسن بن صالح کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں اشارۃً تہمت زنا لگانے سے بھی حد قائم ہوگی۔ امام احمد سے بھی ایک یہی روایت مروی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت ابن عمر کی حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارۃً زنا کی تہمت لگانے سے بھی حد لگاتے تھے۔ اس حدیث کی سند اس طرح ہے زہری عن سالم عن ابن عمر۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے بھی تعریض کی بنا پر ایک شخص کو کوڑے لگائے تھے کیونکہ جب مراد معلوم ہو جائے تو وہ کلام صریح ہو جائے گا۔ ہم کہتے ہیں اشارہ (تعریض) تصریح کی مانند نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ عدۃ کے اندر تعریضاً نکاح کا پیغام دینا عورت کو جائز ہے لیکن صراحۃً نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ۔

[2] المحصنات سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں لیکن پاکدامن مرد بھی اس حکم میں داخل ہیں کیونکہ نص کا مقصود اس عار اور شرمندگی کو دور کرنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (الفکر)
2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 268
3۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 202 (المکتب الاسلامی)

ہے جوان کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کا سمجھنا مجتہد پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ پاکدامن مرد پر تہمت لگانے والے پر سزا کا حکم اجماع امت سے ثابت ہے اور یہاں صرف پاکدامن عورتوں کا ذکر کیا تو اس لئے فرمایا کیونکہ خاص ان کا واقعہ ذکر ہو رہا تھا یا عورتوں پر تہمت لگانا زیادہ ہوتا ہے۔ اور زیادہ برا ہوتا ہے اور احصان کا معنی یہ ہے کہ وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی ہے وہ آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان، پاکدامن ہو اور اس پر پہلے کبھی زنا کی تہمت نہ لگائی گئی ہو۔

جمہور علماء کے نزدیک حضور ﷺ کے ارشاد "مَنْ اَشْرَكَ بِاللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُحْصِنٍ" کا یہی محمل ہے جیسا کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے۔ پس جس نے اپنی عمر میں ایک مرتبہ زنا کیا پھر توبہ کی اور اپنی حالت کو نیک بنالیا پھر طویل عمر بسر کی اس کے بعد کسی نے اس پر زنا کی تہمت لگائی تو تہمت لگانے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی۔ کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہوجاتا ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔ اسی طرح غلام، بچہ اور پاگل پر تہمت لگانے والے کو بھی حد نہیں لگائی جائے گی کیونکہ تہمت لگانے والا سچا ہے لیکن تہمت لگانے والے کو تعزیر لگائی جائے۔ داؤد سے حکایت ہے کہ غلام پر تہمت لگانے والے کو حد لگائی جائے گی۔

سو اگر وہ شخص جس پر الزام ہے وہ انکار کردے اور پھر یہ تہمت لگانے والے چار گواہ پیش نہ کرسکیں تو انہیں اسی (80) درے لگاؤ۔ اور اگر وہ شخص جس پر الزام ہے وہ خود اپنے اوپر زنا کا اقرار کرلے یا تہمت لگانے والے چار گواہ پیش کردیں تو تہمت لگانے والے سے حد ساقط ہوجائے گی۔ اگر چار افراد متفرق طور پر زنا پر گواہی دیں تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہے) پر حد واجب نہ ہوگی جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا ہے لیکن نصاب شہادت کے پائے جانے کی وجہ سے قاذف (تہمت لگانے والے) سے حد قذف ساقط ہوجائے گی۔ حد زنا کو دور کرنے کے لئے احتیاطاً اکٹھی گواہی دینا شرط قرار دیا گیا ہے۔ حد قذف کے وجوب کے لئے ایسا نہیں کیا گیا بلکہ حد غنا کو دور کرنے کے لئے یہ شرط اجتماع رکھی گئی ہے۔ اسی طرح اگر مقذوف ایک مرتبہ اقرار کرے تو اس پر حد واجب نہ ہوگی اور نہ ہی قاذف پر حد واجب ہوگی۔ اس آیت کریمہ میں شہداء سے مراد وہ لوگ ہیں جو شہادت کے اہل ہوں۔ اگر چار مرد کسی مرد کے خلاف زنا کی گواہی دیں جبکہ وہ اندھے ہوں یا محدود فی القذف ہوں یا ان میں سے ایک غلام ہو یا ایک ان میں سے محدود فی القذف ہو تو نہ گواہوں پر حد قذف ہوگی اور نہ مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی ہوئی ہے) پر کیونکہ وہ اداء شہادت کے اہل نہیں ہے پس ان کا ہونا نہ ہونے کی طرح ہے اور غلام عدم ولایت کی وجہ سے تحمل شہادت اور اداء شہادت دونوں کا اہل نہیں ہے۔ پس زنا کا شبہ ثابت نہ ہوا کیونکہ زنا اداء شہادت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ اگر گواہ گواہی دیں اور وہ فاسق وفاجر ہوں تو پھر نہ گواہوں پر حد قذف ہوگی اور نہ مقذوف پر کیونکہ فاسق اداء شہادت اور تحمل شہادت کے اہل تھے لیکن ان کی ادائیگی میں فسق کی وجہ سے قصور اور کمی ہے۔ پس ان کی شہادت سے زنا کا شبہ ثابت ہوجائے گا۔ پس گواہوں پر حد قذف نہ ہوگی اور مقذوف پر حد زنا نہ ہوگی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فاسق گواہوں کو حد قذف لگائی جائے گی کیونکہ وہ غلاموں کی طرح اہل شہادت سے نہیں ہیں۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر گواہ چار سے کم ہوں تو انہیں حد قذف لگائی جائے گی، کیونکہ انہوں نے الزام لگایا ہے۔ چار گواہوں سے تعداد کم ہونے کی صورت میں انہیں معلوم ہے کہ زنا کی گواہی دینے کے ہم قابل نہیں ہیں تو ایسی حالت میں گواہی دینا کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں ہے۔ حاکم نے المستدرک میں، بیہقی اور ابونعیم نے المعرفہ میں اور ابوموسیٰ نے الدلائل میں کئی طرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے خلاف ابوبکرہ، نافع اور شبل بن معبد نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں زنا کی گواہی دی

جبکہ چوتھے گواہ زیادہ واضح گواہی نہ دے سکے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں تینوں گواہوں کو کوڑے لگائے اور کسی صحابی نے انکار نہ کیا۔ اسی حدیث کو عبدالرزاق نے عن الثوری عن سلیمان التیمی عن ابی النہدی کے سلسلہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ جب زیاد نے انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ شخص صرف حق کی گواہی دیتا ہے پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گواہوں کو کوڑے لگائے(1)۔

ہے مقذوف کے مطالبہ کے بعد تہمت لگانے والوں کو کوڑے لگائے جائیں گے۔ اس پر اجماع ہے کیونکہ اس میں بندے کا حق ہے اگرچہ وہ مغلوب ہے۔ اگر تہمت لگانے والے آزاد ہیں تو انہیں اسی درے لگائے جائیں گے اور اگر غلام ہیں تو ہر ایک کو چالیس درے لگائے جائیں گے۔ اس پر بھی فقہاء کا اجماع ہے۔ اور اجماع کی سند حد زنا پر قیاس ہے جس کا غلاموں کے حق میں نصف ہونا نص سے ثابت ہے ارشاد ہے فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ (تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے) امام بیہقی نے اپنی سند سے عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے ابوبکر، عثمان اور بعد کے خلفاء کو پایا ہے لیکن میں نے کسی کو نہیں دیکھا مگر انہوں نے تہمت لگانے والے غلام کو چالیس درے لگائے(2)۔ امام مالک نے بھی یہی روایت ذکر کی ہے لیکن اس میں ابوبکر کا ذکر نہیں ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں غلام کی حد قذف آزاد آدمی کی حد کی مثل ہے(3)۔

ے اس کا عطف فاجلدوا پر ہے اور مبتدا میں شرط کا معنی پائے جانے کی وجہ سے یہ جزا ہے اور یہ حکم احناف کے نزدیک حد کا تتمہ ہے، کیونکہ کوڑوں اور شہادت کے قبول نہ کرنے کے دونوں حکم طلب کے صیغہ کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں اور حکم اللہ کی طرف منسوب ہیں۔ جبکہ اولئک ھم الفاسقون مستقل کلام ہے اور جملہ اسمیہ ہے اسے خبر کے طریق پر ذکر کیا گیا ہے جس کی طلب کے فعل کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے، بلکہ یہ اس حد کے لئے قذف کے سبب ہونے کو استبعاد کے شبہ کو دور کرنے کے لئے ہے جو حد شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ (یعنی حد تو کسی شبہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہے تو یہاں حد لگانے کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کیونکہ قذف خبر ہے جو صدق و کذب کا احتمال رکھتی ہے اور کبھی قاذف ثواب کی نیت سے شہادت دیتا ہے۔ تو ہم کے رفع کا بیان یہ ہے کہ وہ فاسق ہیں بغیر کسی وجہ کے عفت کی رداء کو تار تار کر کے نافرمانی کرنے والے ہیں۔ پھر جب وہ چار گواہ پیش کرنے سے عاجز آ گئے تو عقوبت کے مستحق بن گئے۔

امام شافعی فرماتے ہیں لاتقبلوا بھی علیحدہ کلام ہے اور حد میں شامل نہیں ہے کیونکہ یہ حد کے مناسب نہیں ہے کیونکہ حد ایسا فعل ہے جس کا قیام امام پر لازم ہوتا ہے نہ کہ فعل کو حرام کرنا ہوتا ہے اور و اولئک ھم الفاسقون شہادت کے رد کے لئے مقام تعلیل میں ہے۔ ہم کہتے ہیں بلکہ لا تقبلوا حد کے مناسب ہے کیونکہ حد کا مقصود زجر و توبیخ ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گواہی کے رد میں جو زجر و توبیخ ہے وہ سزا سے زیادہ ہے اس پر ابداً کا قول بھی دلیل ہے کیونکہ فسق ہمیشہ شہادت کے رد کا سبب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ فسق اس وقت تک رد شہادت کا باعث ہے جب تک وہ فاسق ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ لا تقبلوا الخ سے مراد یہ ہے کہ وہ جب تک قذف پر مصر ہے اس وقت تک اس کی شہادت قبول نہ ہوگی پھر جب وہ توبہ کر لے گا تو اس کی شہادت قبول ہوگی جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ کافر کی شہادت ہمیشہ کے لئے مقبول نہیں ہے اور اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ کافر ہے اس کی شہادت قبول نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کافر کی شہادت

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 385 (المکتب الاسلامی)
2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 251 (الفکر)
3۔ الجامع الاحکام القرآن، جلد 6، صفحہ 174 (الازہریۃ)

کا قبول نہ ہونا جب تک کہ وہ کافر ہے یہ لاتقبل شہادۃ الکافر کے قول سے سمجھا جاتا ہے، اس میں ابدًا کے قول کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ اسم مشتق کی طرف حکم کو منسوب کرنا ماخذ کے علت ہونے کی دلیل ہوتا ہے اور شہادت کے عدم قبولیت کے لئے کفر کا علت ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ جب تک کفر ہے شہادت قبول نہ ہوگی۔ پس اس مثال (لا تقبل شہادۃ الکافر ابدًا) میں ابدًا لغو ہے یہ احتمال نہیں رکھتا کہ کلام الٰہی اس کی نظیر ہو۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

”مگر (ان میں سے) وہ لوگ جو توبہ کر لیں ایسا بہتان لگانے کے بعد اور اپنی اصلاح کر لیں تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ [1]“

[1] امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ استثناء اخری، جملہ کی طرف راجع ہے اور اس کا محل نصب ہے کیونکہ احناف کا اصول ہے کہ استثناء جب معطوف کلام کے بعد ہو تو وہ استثناء آخری جملہ کی طرف لوٹتی ہے؟ بشرطیکہ کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جو استثناء کو تمام جملوں کی طرف لوٹانے کا موجب ہو کیونکہ آخری جملہ استثناء سے متصل ہوتا ہے اور یہاں آخری جملہ (اولئک ہم الفاسقون) اپنے اسلوب کے اعتبار سے پہلے جملوں سے منقطع ہے اگرچہ ضمیر یا اسم اشارہ کے اعتبار سے متصل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آخری جملہ سابقہ کلام سے انقطاع کے سبب مستثنیٰ اور پہلے دو جملوں کے درمیان حائل ہے۔ پس اتصال متحقق ہی نہیں ہے جو کہ استثناء کی شرط ہوتا ہے' استثناء کو ماقبل کلام کی طرف لوٹایا جاتا ہے کیونکہ وہ مستقل کلام نہیں ہوتا۔ اور ایک جملہ کی طرف لوٹانے سے یہاں ضرورت پوری ہوگئی۔ جب آخری جملہ کی طرف بالاتفاق لوٹ رہا ہے تو مزید ماقبل کی طرف لوٹانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جب کلام میں استثناء وارد ہو تو ابتدائی کلام کا اس پر موقوف ہونا لازم ہوتا ہے۔ اور ضرورت ایک جملہ کے موقوف ہونے کے ساتھ جب پوری ہو جاتی ہے تو مزید جملوں کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔ اور یہ بھی نہ کہا جائے کہ واؤ عطف اور تشریک کے لئے ہے اس لئے استثناء میں جملوں کے اشتراک کا فائدہ دے رہی ہے کیونکہ عطف حکم میں جملہ تامہ کی شرکت کو مفید نہیں ہے، باوجود یکہ حرف عطف اعراب اور حکم میں شرکت کے لئے لایا جاتا ہے۔ پس استثناء میں شرکت کے لئے مفید نہیں ہے کیونکہ استثناء سے کلام کا حکم تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس ہر جملے کی شرکت استثناء میں نہ ہوگی۔

امام شعبی فرماتے ہیں استثناء مکمل کلام کی طرف راجع ہے اور اس کا محل نصب ہے۔ پس ان کے نزدیک حد قذف بھی توبہ کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے (1) جمہور علماء کے نزدیک حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں استثناء آخری دو جملوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور استثناء کا محل مجرور ہے۔ ان دونوں قولوں کی بنیاد وہ اصل ہے جو امام شافعی وغیرہ کے اصول میں درج ہے۔ کہ عدم قرینہ کی صورت میں استثناء تمام معطوفہ جملوں کی طرف لوٹتی ہے۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں لاتقبلوا کا جملہ سابقہ کلام سے منقطع ہے حد میں داخل نہیں ہے۔ پس اسکے منقطع ہونے کی وجہ سے پہلے جملہ کی طرف استثناء راجع نہ ہوگی اور دوسرے دو جملوں کی طرف راجع ہوگی۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں استثناء تمام جملوں کی طرف راجع ہے (2) اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ توبہ کی وجہ سے حد بھی ساقط ہو جائے۔

[illegible] (لفاً) ... 2۔ تفسیر ... جلد 7 صفحہ 16 (العلمیہ)

گی، جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے کیونکہ مکمل توبہ حد کو قبول کرنا یا مقذوف سے اس الزام کو حلال کروانا ہے۔
میں کہتا ہوں توبہ سے مراد ندامت اور استغفار ہے اگر اس سے حد کا سقوط فرض کیا جائے تو قاذف پر استسلام (تسلیم کرنا) واجب نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تہمت لگانے والے کی شہادت' نفس قذف کی وجہ سے رد کی جائے گی اگر چہ مقذوف حد کا مطالبہ نہ بھی کرے۔ کیونکہ اس کا فسق ظاہر ہو چکا ہے۔ پھر جب وہ توبہ کرے گا اور اپنے قول پر شرمندہ ہوگا اور اپنی حالت درست کر لے گا تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی خواہ حد کے قیام کے بعد توبہ کر لے یا حد سے پہلے توبہ کر لے۔ توبہ کے بعد اس کی شہادت قبول ہوگی اور فسق کا اسم اس سے زائل ہو جائے گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہی مسلک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے اور سعید بن جبیر' مجاہد' عطاء' طاؤس' سعید بن المسیب سلیمان بن یسار' الشعبی عکرمہ' عمر بن عبد العزیز اور زہری کا بھی یہی قول ہے(1)۔ امام بغوی لکھتے ہیں امام شافعی فرماتے ہیں قاذف حد لگنے سے پہلے زیادہ برا تھا بنسبت اس وقت کے جب اسے حد لگائی گئی کیونکہ حدود کفارات ہیں پھر بہتر حالت میں ہونے کے وقت اس کی شہادت کیوں رد ہوگی۔ اور بری حالت میں اس کی گواہی کیسے قبول ہوگی(2) ہم کہتے ہیں قاذف کی شہادت نفس قذف کی وجہ سے رد ہو جائے گی کیونکہ اس کا فسق ظاہر ہو گیا ہے۔ اگر مقذوف حد کا مطالبہ نہ کرے تو نہ اس کو حد لگائی جائے گی اور جب تک توبہ نہ کرے اس کی شہادت بھی قبول نہ ہوگی۔
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ الاالذین تابوا و اصلحوا کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا توبہ کرنا ان کا اپنے نفسوں کو جھٹلانا ہے۔ اگر وہ اپنے نفسوں کو جھٹلا دیں (یعنی توبہ کر لیں) تو ان کی شہادت قبول ہوگی۔ یہ حدیث اگر صحیح ہے تو امام شافعی کے لئے حجت ہے لیکن میں کہتا ہوں اخبار احاد نص قرآنی کے معارض ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں، یعنی نص قرآنی ہے **لا تقبلوا لهم شهادة ابدا**۔ اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے فسق کے زوال کی وجہ سے ان کی شہادت قبول ہوگی۔ اگر مقذوف حد کا مطالبہ کرے تو قاذف کو حد لگائی جائے گی اور اسے اسی (80) کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کی شہادت کبھی قبول نہ ہوگی خواہ وہ توبہ کرے یا نہ کرے، کیونکہ شہادت کا مردود ہونا حق عبد کی وجہ سے ہے اور حق العبد توبہ سے ساقط نہیں ہوتا۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہم پر لازم نہیں آتا کہ ''بہتر حالت میں اس کی شہادت مردود ہوگی اور بری حالت میں اس کی شہادت مقبول ہوگی۔''
اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حد قذف میں دو حق جمع ہوتے ہیں۔ 1۔ حق اللہ 2۔ حق العبد۔ کیونکہ یہ حد مقذوف سے عار کو دور کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے اور مقذوف خاص طور پر اس سے منتفع ہوتا ہے اس لئے یہ حق العبد ہے۔ پھر یہ گناہ سے روکنے اور زجر و توبیخ کے لئے شروع کی گئی ہے اس لئے اسکو حد کہا جاتا ہے۔ اور زواج کی مشروعیت سے مقصود عالم دنیا کو فساد سے خالی کرنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق کی علامت ہے اس کے حق عبد ہونے کی بنا پر مقذوف کا مطالبہ شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور تاخیر کی وجہ سے شہادت باطل نہیں ہوتی اور یہ حد مستامن پر بھی واجب ہوتی ہے۔ قاضی اپنے علم سے اس حد کو قائم کر سکتا ہے۔ جب ایام قضاء میں اسے اس کا علم ہو لیکن جب ولایت سے پہلے اسے اس حد کا علم ہو تو حد قائم نہ کرے حتیٰ کہ اس کے سامنے گواہی قائم ہو۔ اور حد قذف کو مقدم کیا جائے گا حد زنا اور حد سرقہ (چوری) پر جب یہ حدود جمع ہو جائیں۔ قذف کا اقرار کرنے کے بعد رجوع صحیح نہیں ہے۔ اور اس حد کے حق اللہ ہونے کی وجہ سے مقذوف کو خود قائم کرنا جائز نہیں ہے بلکہ امام کے لئے اس کا قائم کرنا ضروری ہے' اور شبہات کی وجہ سے یہ حد دور ہو جاتی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 169 (الفکر) 2۔ ایضاً

اور یہ حد ساقط ہونے کے بعد مال (جرمانہ) میں تبدیل نہیں ہوتی اور قاذف سے اس پر قسم بھی نہیں لی جائے گی اور باقی تمام عقوبات کی طرح جو حقوق اللہ ہیں غلامی کی وجہ سے یہ بھی نصف (آدھی) ہو جائے گی۔ بخلاف حق العبد کے کہ اس کا انداز ہ تلف شدہ چیز کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ تلف کرنے والے کے مختلف ہونے سے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ تمام فروع اس پر متفق ہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ حق اللہ اور حق العبد میں غلبہ کس کو دیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان اس طرف ہے کہ بندہ محتاج ہے اس لئے اس کے حق کو غلبہ دیا جائے گا، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی و مستغنی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ حق اللہ کو غلبہ ہونا چاہئے کیونکہ بندہ جس کا مالک ہوتا ہے اس کا مالک بھی اسکا مولی (آقا) ہوتا ہے۔ پس بندہ کے حق کی رعایت بھی اس کے آقا کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس کا برعکس اس طرح نہیں ہے کیونکہ بندہ کو حقوق اللہ وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے مگر نائب الٰہی ہونے کی حیثیت سے اسے یہ اختیار ہے۔ اس اصول میں اختلاف کی بنا پر دوسری فروع میں بھی اختلاف ہے۔ مثلاً میراث' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد قذف میں میراث جاری ہوگی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک میراث جاری نہ ہوگی کیونکہ حقوق اللہ میں میراث جاری نہیں ہوتی اور حقوق العباد میں میراث جاری ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ مال ہو یا مال کے حکم میں ہو۔ جیسے کفالت ہے یا وہ حق جو مال کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے قصاص ہے۔ اور حد ایسی چیزوں میں سے نہیں ہے اس لئے مقذوف کے مرنے کے ساتھ یہ حد قذف باطل ہو جاتی ہے کیونکہ کسی دلیل شرعی کے ساتھ شریعت کا وارث کو خلیفہ بنانا ثابت نہیں ہے، جس کو مطالبہ کا حق ہو جو حق کے ظہور کیلئے شرط ہے۔

پس جو کسی پر الزام لگائے اور پھر حد کے قائم کرنے سے پہلے مقذوف مر جائے یا بعض حد کے قائم کرنے کے بعد مر جائے تو ہمارے نزدیک باقی حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ساقط نہ ہوگی۔ اسی طرح عفو ہے' اگر کوئی شخص حد کے ثبوت کے بعد قاذف کو معاف کر دے تو پھر بھی ہمارے نزدیک حد ساقط نہ ہوگی جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسف کے نزدیک حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقذوف کہے کہ اس نے مجھ پر الزام و بہتان نہیں لگایا میرے گواہوں نے جھوٹ بولا ہے تو اس وقت بالاتفاق حد ساقط ہو جائے گی، کیونکہ جب ظاہر ہو گیا کہ قذف پایا ہی نہیں گیا تو حد بھی واجب نہ ہوگی اس کا یہ مطلب نہیں کہ حد واجب ہوئی اور پھر ساقط ہو گئی۔ بخلاف قصاص کے کہ وہ وجوب کے بعد معاف کرنے کے ساتھ ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ قصاص میں حق العبد غالب ہے۔ اسی طرح حد قذف میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عوض جائز نہیں ہے۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک عوض جائز ہے۔ اسی طرح حد قذف میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک تداخل جاری ہوتا ہے' یعنی اگر کسی نے کسی شخص پر بار بار الزام لگایا یا ایک جماعت پر الزام لگایا تو اس پر ایک حد جاری ہوگی بشرطیکہ دونوں قذفوں کے درمیان حد قائم نہ کی گئی ہو۔ اگر کسی نے دعویٰ کیا کہ فلاں نے مجھ پر تہمت لگائی ہے اسے حد لگائی جا رہی تھی کہ کسی دوسرے نے بھی دعویٰ کر دیا تو وہ وہی حد مکمل کی جائے گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد قذف میں تداخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں جب یہ ثابت ہے کہ حد قذف میں حق اللہ اور حق العبد جمع ہیں، جیسا کہ مسائل متفقہ اس پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ حدود شبہات کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں تو یہ کہنا بہتر ہے کہ جب دونوں حقوق میں سے ایک حد کے وجوب کا تقاضا کرے اور دوسرا سقوط کا تقاضا کرے تو سقوط کا فتویٰ دینا ضروری ہے، کیونکہ عفو میں خطا' عقوبت میں خطا سے بہتر ہے۔ پس ارث کے جاری ہونے کا قول نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اور مقذوف کے معاف کرنے کے ساتھ اس مطالبہ کے

سقوط کی وجہ سے حد کے سقوط کا قول کیا جائے گا جو استیفاء حد کے لئے شرط ہے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اور اس میں تداخل جاری ہوگا جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اگر قاذف اور مقذوف حد کو ساقط کرنے کے لئے عوض پر صلح کر لیں تو مقذوف سے رضا حاصل ہو جائے گی لیکن اس حد کے حق اللہ ہونے کے احتمال کی وجہ سے قاذف پر مال واجب نہ ہوگا۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہلال بن امیہ نے اپنی عورت پر زنا کی تہمت لگائی۔ نبی کریم ﷺ کے پاس شریک بن سحما بھی موجود تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، دلیل قائم کرو یا تیری پیٹھ پر حد لگے گی۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب ہم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس کسی دوسرے مرد کو پائے تو وہ بینہ (دلیل) تلاش کرنے لگے۔ نبی کریم ﷺ یہی فرماتے تھے' دلیل قائم کرو ورنہ تیری پیٹھ پر حد جاری ہوگی۔ ہلال نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ بیشک میں سچا ہوں یقیناً اللہ تعالیٰ ایسا کلام نازل فرمائے گا جس کی وجہ سے مجھے حد نہیں لگے گی۔ پس اسی وقت جبرائیل تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

"اور وہ (خاوند) جو تہمت لگاتے ہیں اپنی بیویوں پر[1] اور نہ ہوں ان کے پاس کوئی گواہ بجز اپنے[2] تو ان کی شہادت کا یہ طریقہ ہے کہ وہ خاوند چار مرتبہ گواہی دے کہ بخدا وہ (یہ تہمت لگانے میں) سچا ہے۔[3]"

[1] جب یہ آیت پڑھی تو ہلال آئے اور لعان کیا (یعنی پانچ مرتبہ گواہی دی) اور اس وقت نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے بیشک اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے۔ پھر عورت کھڑی ہوئی اور اس نے گواہیاں دیں۔ جب پانچویں مرتبہ گواہی دینے لگی تو لوگوں نے اسے روکا اور کہا کہ یہ پانچویں گواہی حکم کو ثابت کر دے گی (1)۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں وہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ ہم نے سوچا کہ وہ رجوع کر لے گی پھر اس عورت نے کہا میں اپنی قوم کو رسوا نہیں کرتی پھر اس نے پانچویں مرتبہ بھی قسم اٹھادی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم دیکھو اگر یہ عورت سرگیں آنکھوں والا' بڑی سرین والا اور بڑی بڑی پنڈلیوں والا بچہ جنے تو وہ شریک بن سحما کا ہوگا۔ حضور ﷺ نے جو نشانیاں بیان فرمائی تھیں بالکل ویسا بچہ اس نے جنم دیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کتاب اللہ کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو میرا اور اس عورت کا معاملہ کچھ اور ہوتا (2)۔

صحیحین میں سہل بن سعد الساعدی سے مروی ہے فرماتے ہیں عویمر العجلانی نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ) آپ کا کیا ارشاد ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی دوسرے شخص کو دیکھے تو کیا وہ خود اسے قتل کر دے (اور اگر وہ ایسا کرے) تو تم اسے قتل کر دو گے یا پھر وہ کیا کرے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بیوی کے متعلق حکم نازل فرمایا ہے جاؤ' بیوی کو لے آؤ۔ سہل فرماتے ہیں ان دونوں میاں بیوی نے مسجد میں لعان کیا جبکہ میں بھی لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ جب وہ دونوں فارغ ہوئے تو عویمر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اب اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں تو پھر میں جھوٹا ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا دیکھو اگر یہ عورت سیاہ رنگ' سیاہ آنکھوں والا' بڑی سرین والا اور موٹی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 695 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 695 (وزارت تعلیم)

پنڈلیوں والا بچہ جنے تو پھر میرے گمان کے مطابق عویمر سچا ہے اور اگر وہ سرخ بچہ جنے تو میرے گمان کے مطابق عویمر جھوٹا ہوگا۔ عورت نے بالکل اس صفت پر بچہ جنا جس کی تصدیق عویمر کے حق میں تھی اس کے بعد وہ بچہ ماں کی طرف منسوب کیا جاتا تھا(1)۔

امام احمد نے حضرت عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جب والذین یرمون المحصنات الخ کی آیت نازل ہوئی تو سعد بن عبادہ جو انصار کے سردار تھے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اے انصار! سنتے ہو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟ انصار نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ان کو ملامت نہ فرمایئے یہ غیور آدمی ہے۔ قسم بخدا اس نے ہمیشہ باکرہ (کنواری) عورت سے شادی کی ہے اور اس نے کسی عورت کو طلاق نہیں دی ہے تاکہ کوئی دوسرا اس عورت سے نکاح نہ کرے۔ اور یہ سب کچھ اس کی شدت غیرت کی وجہ سے ہے۔ حضرت سعد نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔ قسم بخدا میں جانتا ہوں یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا ہے، لیکن مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ میں کسی بدبخت کو دیکھوں کہ وہ میری بیوی پر سوار ہے اور مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں اسے برا بھلا کہوں اور نہ اس کے خلاف زبان ہلاؤں حتیٰ کہ چار گواہ لے آؤں۔ قسم بخدا میں چار گواہ لاؤں گا تو وہ اپنی خواہش پوری کر چکا ہوگا۔ راوی فرماتے ہیں تھوڑی دیر گزری تو ہلال بن امیہ آئے (یہ ان تین میں سے ایک ہیں جن کی توبہ قبول ہوئی تھی) وہ عشاء کے وقت اپنی زمین سے واپس آئے تو اپنی بیوی کے پاس ایک شخص کو پایا۔ انہوں نے سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا لیکن اسے کچھ نہ کہا۔ جب صبح ہوئی تو بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں عشاء کے وقت اپنے گھر آیا تو اپنی بیوی کے پاس ایک مرد کو پایا اور سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات کو ناپسند فرمایا اور آپ ﷺ کو یہ سن کر انتہائی کوفت ہوئی۔ انصار جمع ہوئے اور کہنے لگے جو کچھ سعد بن عبادہ نے کہا ہے اس کی وجہ سے ہم آزمائش میں ڈالے گئے ہیں۔ ابھی رسول اللہ ﷺ ہلال بن امیہ کو سزا دیں گے اور اس کی گواہی بھی مردود ہو جائے گی۔ ہلال نے کہا قسم بخدا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میری خلاصی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے اسے سزا دینے کے حکم کا ارادہ فرمایا ہی تھا کہ وحی نازل ہوئی۔ صحابہ کرام سب ٹھہر گئے حتیٰ کہ جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو یہ ارشاد پڑھ کر سنایا والذین یرمون ازواجھم الآیۃ۔ ابو یعلیٰ نے اس کی مثل حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ امام بغوی نے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اے ہلال مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تیری خلاصی کی صورت پیدا فرما دی ہے۔ ہلال نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ سے یہی توقع اور امید تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کو بلاؤ وہ آئی اور دونوں آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تو عورت کو لعان کرنے کو کہا گیا۔ اس نے خاوند کو جھٹلا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے۔ ہلال نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ قربان ہوں میں سچا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سچ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کے درمیان لعان کرو۔ حضرت ہلال کو کہا گیا گواہی دو تو انہوں نے چار گواہیاں دیں کہ اللہ کی قسم میں سچا ہوں پانچویں مرتبہ شہادت دینے سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت ہلال سے فرمایا اے ہلال اللہ سے ڈرو دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے آسان ہے اور اللہ کا عذاب لوگوں کے عذاب سے زیادہ شدید ہے اور یہ پانچویں گواہی تجھ پر عذاب کا موجب بنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 170 (الفکر)

گی۔ ہلال نے عرض کی حضور ﷺ! قسم بخدا اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہیں دے گا جیسے رسول اللہ ﷺ مجھے کوڑے نہیں لگائیں گے' پھر ہلال نے پانچویں مرتبہ گواہی دی اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ۔ پھر آپ ﷺ نے عورت سے کہا تو گواہی دے اس نے چار گواہیاں دیں باللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ۔ پانچویں مرتبہ گواہی دینے سے پہلے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرو' پانچویں مرتبہ گواہی حکم اور سزا کو واجب کر دے گی۔ اللہ کا عذاب' لوگوں کے عذاب سے بہت سخت ہے' وہ ایک لمحہ کے لئے رکی اور اعتراف جرم کا ارادہ کیا اور پھر کہا قسم بخدا میں اپنی قوم کو رسوا نہیں کروں گی' پھر اس نے پانچویں مرتبہ یہ کہہ دیا اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان گواہوں کے بعد ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی اور فرمایا بچہ ماں کا ہوگا' باپ کی طرف اس کی نسبت نہ ہوگی اور نہ بچہ پر کوئی طعن کیا جائے گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر یہ عورت ایسا ایسا بچہ جنے تو وہ اس کے خاوند کا ہوگا اور اگر ایسا جنے تو اس کا ہوگا جس کے متعلق اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ عورت نے بچہ جنا گویا وہ بدصورت خاکستری اونٹ ہے وہ بعد میں مصر کا والی بنا تھا اور یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا باپ کون ہے(1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور مقاتل فرماتے ہیں جب آیت کریمہ۔ والذین یرمون المحصنات نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے منبر پر اسے تلاوت فرمایا۔ عاصم بن عدی الانصاری اٹھے اور کہا اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کرے اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ دوسرے شخص کو دیکھے پھر اسے چالیس کوڑوں کی سزا سنائی جائے اور مسلمان اسے فاسق کہیں اور اسکی گواہی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبول نہ ہو تو پھر ہم گواہ کہاں سے تلاش کریں؟ جب ہم گواہ تلاش کرنے جائیں گے تو وہ مرد اپنی خواہش پوری کر کے جا چکا ہوگا۔ عاصم کے چچا کی بیٹی عویمر کی بیوی تھی جس کا نام خولہ بنت قیس بن محصن تھا۔ عویمر عاصم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے شریک بن سحماء کو اپنی بیوی خولہ کے اوپر دیکھا ہے۔ عاصم نے اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور جمعہ کے موقع پر حضور ﷺ کے پاس آئے۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے جو پچھلے جمعہ پر سوال کیا تھا اس کی وجہ سے میں اپنے گھر والوں کی مصیبت میں مبتلا کیا گیا ہوں' عویمر' خولہ اور شریک یہ تمام لوگ عاصم کے چچا کی اولاد سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سب کو بلایا اور عویمر کو کہا اپنی بیوی اور چچا کی بیٹی کے متعلق اللہ سے ڈرو اور ان پر جھوٹا بہتان نہ لگاؤ۔ عویمر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے شریک کو اپنی بیوی کے بطن پر دیکھا ہے اور میں چار ماہ سے اس کے قریب نہیں گیا اور وہ کسی غیر سے حاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خولہ کو کہا اللہ سے ڈرو اور مجھے سچ سچ بتاؤ' خولہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ عویمر ایک غیرت مند آدمی ہے۔ اس نے مجھے اور شریک کو دیر تک باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو غیرت کی بنا پر انہوں نے یہ بیان دے دیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے شریک سے پوچھا تو انہوں نے عورت والا بیان دہرا دیا اس وقت اللہ تعالیٰ نے والذین یرمون ازواجھم الایہ کا ارشاد نازل فرمایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے عصر کی اذان دینے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد آپ ﷺ نے نماز عصر پڑھائی اور پھر عویمر سے فرمایا اٹھو' وہ اٹھے تو فرمایا یہ کہو میں گواہی دیتا ہوں اللہ کی قسم خولہ زانیہ ہے اور میں سچے لوگوں میں سے ہوں۔ پھر دوسری مرتبہ کہا میں گواہی دیتا ہوں میں نے شریک کو خولہ کے بطن پر دیکھا ہے اور میں سچوں میں سے ہوں۔ پھر تیسری مرتبہ کہا میں گواہی دیتا ہوں یہ میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کی حاملہ ہے اور میں راستباز لوگوں سے ہوں۔ چوتھی مرتبہ کہا قسم بخدا میں چار ماہ سے اس کے قریب نہیں گیا اور میں سچے لوگوں سے ہوں۔ پھر پانچویں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 172 (الفکر)

مرتبہ کہا عویمر پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے' پھر آپ ﷺ نے عویمر کو بیٹھنے کا حکم دیا اور خولہ سے فرمایا تم اٹھو۔ وہ کھڑی ہوئی تو اس نے کہا میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ میں زانیہ نہیں ہوں اور عویمر جھوٹوں میں سے ہے۔ دوسری مرتبہ کہا اشھد باللہ اس نے شریک کو میرے پیٹ پر نہیں دیکھا وہ جھوٹوں میں سے ہے' تیسری مرتبہ کہا اللہ کی قسم میں عویمر سے ہی حاملہ ہوں' وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ چوتھی مرتبہ کہا اس نے مجھے کبھی برائی میں مبتلا نہیں دیکھا وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ پانچویں مرتبہ کہا خولہ پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ سچوں میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق (جدائی) فرمادی اور فرمایا اگر یہ قسمیں نہ ہوتیں تو اس کے متعلق کوئی اور فیصلہ ہوتا۔ پھر فرمایا اس کے بچہ پیدا ہونے کی تاڑ رکھو اگر اشقر سیاہی مائل بچہ جنے تو وہ شریک بن السحماء کا ہوگا اور اگر گھنگریالے بالوں والا بڑے بڑے اعضاء والا بچہ جنے تو وہ کسی دوسرے کا ہوگا (1)۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اس نے ایسا بچہ جنا جو شریک کی صورت کے مشابہ تھا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس مقام پر ائمہ کا اختلاف ہے' بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت عویمر کے بارے میں نازل ہوئی' بعض فرماتے ہیں ہلال کے بارے نازل ہوئی (2)۔ امام قرطبی نے اس آیت کے دو مرتبہ نازل ہونے کے جواز پر میلان ظاہر کیا ہے (3)۔ بعض علماء نے اس طرح تطبیق کی ہے کہ پہلے ہلال کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا پھر اسی دوران عویمر بھی آئے۔ تو آیت کریمہ دونوں کے بارے نازل ہوئی (4)۔ علامہ نووی اور خطیب کا یہی نظریہ ہے۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہلال کے سبب آیت نازل ہوئی ہو پھر جب عویمر آئے تو انہیں چونکہ ہلال کے واقعہ کا علم نہ تھا تو حضور ﷺ نے عویمر کو وہ حکم بتادیا۔ اسی وجہ سے ہلال کے واقعہ میں فرمایا جبرئیل نازل ہوئے (5) اور عویمر کے واقعہ میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے متعلق حکم نازل فرمایا ہے، یعنی جو واقعہ تیرے ساتھ پیش آیا ہے اس کی مثل پہلے ایک واقعہ ہو چکا ہے اور اس کے متعلق حکم بھی نازل ہو چکا ہے۔ ابن الصباغ نے الشامل میں یہی جواب لکھا ہے۔

مسئلہ: الذین یرمون ازواجھم کے عموم کی وجہ سے امام مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد فرماتے ہیں ہر خاوند جسکی طلاق صحیح ہے اس کا لعان بھی صحیح ہے خواہ میاں بیوی دونوں آزاد ہوں یا غلام ہوں' عادل ہوں یا فاسق ہوں' یا ایک آزاد اور دوسرا غلام یا فاسق ہو۔ اسی طرح دونوں مسلمان ہوں یا کافر ہوں یا ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہو لیکن امام مالک اس میں اختلاف فرماتے ہیں، کیونکہ آپ کے نزدیک کفار کے نکاح فاسد ہیں' نہ ان کی طلاق صحیح ہے اور نہ ان کا لعان صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب تک خاوند شہادت کا اہل نہ ہو۔ یعنی آزاد، عاقل، بالغ مسلمان نہ ہو لعان جائز نہیں ہے اور بیوی بھی ایسی پاکدامن ہو جس پر الزام لگانے والے کو حد لگائی جاتی ہو۔ یعنی وہ بھی آزاد عاقلہ بالغہ مسلمان اور متہم بالزنا نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک لعان جاری نہ ہوگا اگر خاوند غلام یا کافر یا محدود فی القذف ہو بلکہ اگر ایسی عورتوں میں سے ہے جس کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے تو مرد پر حد قذف جاری ہوگی ورنہ اگر امام بہتر سمجھے تو اسے تعزیر لگادے۔ لیکن اگر خاوند اندھا یا فاسق ہو تو لعان جائز ہوگا کیونکہ قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ فاسق کی گواہی قبول کرلے اگرچہ اس کی گواہی قبول کرنا واجب نہیں ہے اور اندھا چونکہ مشہود لہ اور مشہود علیہ کے درمیان تمیز نہیں کرسکتا اس لئے اس کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اور یہاں اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان تمیز کرسکتا ہے' پس بقیہ شہادتوں کے علاوہ اس شہادت کا وہ اہل ہوگا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74-173 (الفکر) 2۔ فتح الباری شرح بخاری، جلد 18، صفحہ 54 (الکلیات الازہریۃ)
3۔ [illegible] جلد 18، صفحہ 54 (الکلیات الازہریۃ) 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

ابن المبارک نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ اندھے کا لعان نہ ہوگا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس وقت بھی لعان نہ ہوگا جب عورت لونڈی، یا کافرہ یا بچی یا مجنونہ ہو یا نکاح فاسد کیا ہوا اور اس میں اس کے ساتھ دخول ہوا ہو یا اس کا بچہ اور اس کا باپ معروف نہ ہو یا عمر میں کسی وقت زنا کیا ہوا گرچہ ایک ہی مرتبہ کیا ہو پھر اس نے توبہ کی ہو یا کسی شبہ کی وجہ سے وطی حرام کی ہو اگرچہ ایک ہی مرتبہ ہو۔ ایسی صورتوں میں نہ حد ہوگی اور نہ لعان ہوگا بلکہ قاضی بہتر سمجھے تو اسے تعزیر لگائے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ، جس میں آپ نے عورت کے لئے شرط قرار دیا ہے کہ وہ ایسی عورتوں میں سے ہو جس کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے، یہ ہے کہ لعان خاوند سے حد قذف دور کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہے جیسا کہ آیت کے شان نزول کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے ہلال مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے کشادگی پیدا فرمادی ہے، پس یہ لعان خاوند کے حق میں حد قذف کا بدل ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو کیونکہ دنیا کا عذاب (یعنی حد) عذاب آخرت سے آسان ہے۔ جب مبدل منہ متصور نہیں ہوگا تو بدل بھی متصور نہ ہوگا۔

۲۔ مرد کیلئے اہل شہادت میں سے ہونے کی شرط، دلیل یہ ارشاد ولم یکن لھم شھداء الا انفسھم ہے کیونکہ یہاں خاوندوں کو گواہ فرمایا ہے کیونکہ نفی سے استثناء کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر شہداء کو مجازاً حالفین (قسم اٹھانے والے) بنایا جائے جیسا کہ دوسرے علماء فرماتے ہیں تو معنی یہ ہوگا قسم اٹھانے والے نہ ہوں مگر وہ خود تو یہ معنی درست نہیں ہے کیونکہ اس کا مفاد یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی عورتوں پر تہمت لگائیں اور ان کے لئے حلف اٹھانے والا اور کوئی نہ ہو تو وہ خود اپنی صفائی کیلئے قسم اٹھائیں۔ یہ غیر کے لئے قسم اٹھانے کے تصور کی فرع ہے جبکہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اگر شہادت کے لفظ کا حقیقی معنی قسم ہوتا تو پھر بھی یہ معنی اسے مجاز کی طرف پھیرنے کا تقاضا کرتا ہے شہادت کا حقیقی معنی جب حلف نہیں ہے بلکہ شہادت سے مجازاً قسم مراد لی جاتی ہے تو یہاں بدرجہ اتم شہادت سے مراد قسم نہیں بلکہ گواہی ہوگی۔
مرد میں شہادت کی اہلیت کے شرط ہونے اور عورت کے پاکدامن ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ابن ماجہ اور دار قطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے نقل فرمایا ہے۔ دار قطنی نے اپنی سند کے ساتھ عثمان بن عبدالرحمن سے اس طرح روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چار آدمیوں میں لعان نہیں ہے، آزاد مرد اور لونڈی میں، غلام مرد اور آزاد عورت میں۔ مسلمان مرد اور یہودیہ عورت میں، مسلمان مرد اور نصرانی عورت میں (1)
یحییٰ، بخاری، ابو حاتم الرازی اور ابوداؤد فرماتے ہیں عثمان بن عبدالرحمٰن لیس بشیء۔ یحییٰ نے فرمایا وہ جھوٹ بولتا تھا۔ ابن حبان فرماتے ہیں وہ ثقہ لوگوں سے موضوع احادیث روایت کرتا تھا، ایسے شخص سے حجت پکڑنا جائز نہیں ہے، نسائی اور دار قطنی فرماتے ہیں وہ متروک الحدیث ہے۔
دار قطنی اور ابن ماجہ نے عن عثمان بن عطاء الخراسانی سے بھی یہی حدیث روایت کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار عورتیں ایسی ہیں جن کے لئے لعان نہیں ہے، نصرانیہ جو مسلمان کے عقد نکاح میں ہو۔ یہودیہ جو مسلمان کے تحت ہو۔ لونڈی جو آزاد کے نکاح میں ہو۔ آزاد جو غلام کے عقد میں ہو۔ عثمان بن عطاء کو بھی یحییٰ اور دار قطنی نے ضعیف لکھا ہے۔ ابو حاتم الرازی اور ابن حبان فرماتے ہیں اس سے احتجاج جائز نہیں ہے۔ علی بن جنید فرماتے ہیں عثمان بن عطاء متروک ہے۔ اس حدیث کی متابع یزید بن زریع عن

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 163 (المحاسن)

عطاء کی حدیث ہے لیکن وہ بھی ضعیف ہے۔ دار قطنی نے عماد بن مطر سے اس طرح بھی روایت کی ہے حد ثنا حماد بن عمر عن زید بن رفیع عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ ﷺ بعث عتاب بناسید کہ رسول اللہ ﷺ نے عتاب بن اسید کو بھیجا' آگے اسی طرح حدیث ہے جیسا کہ پہلے گزر چکی ہے۔ ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں عماد بن مطر جھوٹ بولتا تھا' ابن عدی فرماتے ہیں عماد کی احادیث باطل ہیں اور وہ متروک الحدیث ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں حماد بن عمر جھوٹ بولتا تھا اور حدیث کو وضع کرتا تھا۔ الساجی کہتے ہیں علماء حدیث کا اجماع ہے کہ حماد متروک الحدیث ہے' نسائی دار قطنی اور زید بن رفیع نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن الجوزی کہتے ہیں اس حدیث کو اوزاعی اور ابن جریج نے روایت کیا ہے جبکہ یہ دونوں حدیث کے امام ہیں ان کی سند یہ ہے عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ اس سند کے ساتھ یہ حدیث مرفوع نہیں موقوف ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ضعیف حدیث کے جب طرق متعدد ہوں تو وہ حجت بن جاتی ہے' یہ حدیث بھی اپنے طرق کی کثرت کی وجہ سے حجت ہے' جبکہ اس حدیث کو دو اماموں کی موقوف روایت کے ساتھ تائید بھی حاصل ہے۔

سے امام شافعی فرماتے ہیں یہ قول دلالت کرتا ہے کہ یہ شہادتیں قسمیں ہیں' شہادتیں نہیں ہیں کیونکہ باللہ کا کلمہ قسم کے لئے متعین ہے اور شہادت کا کلمہ قسم کا احتمال بھی رکھتا ہے جیسا کہ اگر کوئی کہے اشہد اور اس سے اسکی مراد قسم ہو تو یہ قسم ہوگا۔ پس ہم محتمل کو محکم پر محمول کریں گے اور شہادت کو یہاں حقیقت پر محمول کرنا متعذر و مشکل ہے، کیونکہ یہ شرعاً ثابت ہے کہ انسان کی اپنے حق میں شہادت قبول نہیں ہے' جبکہ قسم اپنے حق میں قبول ہوتی ہے اسی طرح شرعاً معہود ہے کہ ایک مقام پر شہادت کا تکرار نہیں ہوتا' جبکہ قسم کا تکرار ہوتا ہے' کیونکہ قسامت کے باب سے قسموں کا تکرار ثابت ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شہادت کا محل اثبات (کسی چیز کو ثابت کرنا) ہے جبکہ قسم کا محل نفی ہے۔ پس ان کی حقیقت کا تعلق ایک امر کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ پس ایک کیلئے حقیقۃً اور دوسرے کے لئے مجاز اُعمل ہوگا۔ پس لفظ شہادت مجاز ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی دو وجوہ ذکر کی ہیں۔ جب شہادت بمعنی یمین ہوگی تو شہادت کی اہلیت لعان کے لئے شرط نہ ہوگی۔ ہم کہتے ہیں جس طرح اپنے لئے شہادت دینا اور بار بار شہادت دینا شرعاً معہود نہیں ہے اسی طرح غیر کے لئے قسم اٹھانا اور حکم کے ثبوت کے لئے قسم اٹھانا بھی شریعت میں معہود نہیں ہے بلکہ قسم حکم کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ پس جس کو پیدا کرنے' معدوم کرنے اور راور حکم کرنے کا اختیار ہے' جیسا چاہے حکم دے۔ جب اس کو ابتداءً ایک محل میں دونوں امور کا حکم دینا جائز ہے تو اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اس کو ابتداءً مشروع کردے۔ اپنے لئے گواہی دینا قرآن سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ موذن کی اذان سنتے وقت کہتے اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان محمد رسول الله وانا اشهد وانا اشهد۔ پس آپ ﷺ کا رسالت کا گواہی دینا اپنی شہادت ہے' اور اس مقام پر شہادت کا تکرار اس لئے شروع ہے کیونکہ زانی کے گواہ پیش کرنے سے عجز ظاہر ہو چکا ہے اور تہمت کے وقت اپنے حق میں گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے گواہوں کے نہ ہونے کے وقت بڑا ثبوت مطلوب ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اپنی شہادت اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کو ذکر کیا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ اپنے لئے شہادت مشروع ہو اور قسم کے ساتھ مئوکد ہو اور جھوٹا ہونے کے اندیشہ سے لعنت کے الزام اور غضب کے ساتھ مئوکد ہو۔ ولم یکن لهم شهداء کا جملہ یا تو صلہ پر معطوف ہے یا یرمون کے فاعل سے حال ہے اور الا انفسهم' الشہداء سے بدل ہے یا صفت ہے جبکہ الا بمعنی غیر ہو۔ اور موصول مع صلہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ حفص' حمزہ اور

کسائی نے اربع شہادات کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ شہادۃ احدھم کی خبر ہے اور باقی قراء نے مصدر کی تعداد کے بیان کے لئے منصوب پڑھا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قالوا اجبُ شَهَادَةَ اَحَدِهِمْ۔ یا فَعَلَيْهِمْ شَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ۔ بعض علماء فرماتے ہیں شہادۃ احدھم مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ تَرْفَعُ عَنْهُ حَدَّ الْقَذْفِ۔ اور باللہ شہادات کے متعلق ہے کیونکہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ بعض فرماتے ہیں شہادۃ کے متعلق ہے کیونکہ وہ مقدم ہے۔ انه لمن الصادقین اصل میں علی انه من الصادقین ہے۔ حرف جر کو حذف کیا گیا ہے اور انّ کو کسرہ دیا گیا ہے اور تاکید لام کے ساتھ عامل کو معلق کیا گیا ہے' بعض علماء فرماتے ہیں یہ محذوف قسم کا جواب ہے اور جملہ قسمیہ' شہادت کا بیان ہے۔

وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

''اور پانچویں بار[1] یہ کہے اس پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہو[2] اگر وہ کذب بیانی کرنے والوں میں سے ہو[3]''

[1] الخامسۃ کے مرفوع ہونے پر علماء کا اتفاق ہے اور یہ حفص' حمزہ اور کسائی کی قرأت کے مطابق اربع شہادات پر معطوف ہے اور باقی قراء کی قرأت کے مطابق شہادۃ احدھم پر معطوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی فالواجبُ شَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ وَالْوَاجِبُ الشَّهَادَةُ الْخَامِسَةُ اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ الخامسۃ مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو پھر جملہ اسمیہ حال ہو۔

[2] نافع اور یعقوب نے اِنْ مخففہ من مثقلہ پڑھا ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے اور لعنۃ پر رفع مبتدا ہونے کی وجہ سے ہے۔ جبکہ باقی قراء نے ان کو مشددہ پڑھا ہے اور لعنۃ پر نصب ان کے اسم ہونے کی وجہ سے ہے اور انّ اپنے اسم خبر سے ملکر بتقدیر حرف جر شہادت کے متعلق ہے، یعنی اَلشَّهَادَةُ الْخَامِسَةُ بِاَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔

[3] ان کان من الکاذبین شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے یا اس کے بچہ کی نفی کرے اور وہ دونوں میاں بیوی لعان کے اہل ہوں اور عورت قذف کی سزا کا مطالبہ کرے تو لعان کرنا مرد پر واجب ہوگا۔ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک حاکم اسے قید کردے حتیٰ کہ وہ لعان کرے یا اپنے آپ کو جھوٹا کہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو جھوٹا کہے تو اسے حد قذف لگائی جائے گی۔

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر وہ لعان سے انکار کرے تو اسے حد قذف لگائی جائے گی اور اسے قید نہ کیا جائے گا کیونکہ قذف کا موجب حد ہے اور لعان اس کی صداقت کی دلیل ہے اور قاذف جب حجت قائم کرنے سے عاجز ہوتا ہے تو اسے حد لگائی جاتی ہے قید نہیں کیا جاتا۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب وہ قسم سے انکار کرے گا تو وہ فاسق ہو جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ فاسق نہیں ہوگا۔ امام صاحب کا قول ہے کہ قسم سے انکار اقرار کی دلیل ہے لیکن اس میں شبہ ہے اور حد شبہ کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی، اس لئے اسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ یا تو لعان کرے یا اپنی تکذیب کرے کیونکہ یہ اس پر حق ہے اور اس کے پورا کرنے پر وہ قادر بھی ہے اس لئے اسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ادائیگی کرے اس چیز کی جو اس پر واجب ہے۔ جب مرد لعان کرے گا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت پر لعان کرنا واجب ہوگا۔ اگر وہ انکار کرے گی تو اسے بھی حاکم قید کردے گا یہاں تک کہ وہ لعان کرے یا خاوند کی بات کی تصدیق کرے اور اس پر یہ حق ہے اور اس کے ایفاء پر بھی وہ قادر ہے اس لئے اس حق کی وجہ سے

اسے قید کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب مرد لعان کرے گا تو میاں بیوی کے درمیان فرقت (جدائی) واقع ہو جائے گی اور عورت، مرد پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی اور بچہ کے نسب کی اس مرد سے نفی ہو جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اَلْمُتَلَاعِنَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ اَبَدًا۔ لعان کرنے والے دونوں آپس میں کبھی جمع نہیں ہو سکتے(1)۔ ہم کہتے ہیں لعان عورت کے لعان کرنے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ پس جدائی واقع نہ ہوگی اور نہ تفریق جائز ہوگی جب تک کہ دونوں لعان نہیں کر لیتے۔ امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک مرد کے لعان کرنے کے ساتھ عورت پر زنا کی حد واجب ہو جاتی ہے اور جب عورت لعان کرتی ہے تو امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک زنا کی حد ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ آئندہ آیت اسی بات پر دلیل ہے۔

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۙ﴿۸﴾

''اور ٹل سکتی ہے اس عورت سے حد کہ وہ گواہی دے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہ وہ (خاوند) جھوٹا ہے۔''

العذاب سے مراد حد زنا ہے، جیسا کہ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ میں عذاب حد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے ارشاد وَاِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ اَشَدُّ مِنْ عَذَابِ النَّاسِ۔ میں بھی عذاب بمعنی حد استعمال ہوا ہے(2) اربع کا کلمہ بالا جماع مصدریت کی بنا پر منصوب ہے۔ انہ میں ہ ضمیر کا مرجع خاوند ہے یعنی عورت چار مرتبہ گواہی دے کہ جو اس خاوند نے مجھ پر زنا کا الزام لگایا ہے یا بچہ کی نفی کی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے۔

وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۹﴾

''اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ خدا کا غضب ہو اس پر اگر وہ (خاوند) سچا ہو۔ 1''

1. جمہور قراء نے الخامسة کو ابتداء کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ یا ان تشهد پر معطوف ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ حفص نے اربع شهادات کو عطف کی بنا پر منصوب پڑھا ہے۔ انّ کو نافع اور یعقوب نے مخفف پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ مصدریہ ہے اور باقی قراء نے مشددہ پڑھا ہے غضب کو نافع اور یعقوب نے باب علم سے فعل ماضی کا صیغہ ہونے کی بنا پر ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسم جلالت (اللہ) کو فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے غضب کو انّ کے اسم کی بناء پر ضاد کے فتح کے ساتھ منصوب پڑھا ہے اور اسم جلالت کو مضاف الیہ کی بنا پر مجرور پڑھا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عورت کے لعان سے ایک حکم (یعنی حد زنا کا سقوط) متعلق ہوتا ہے۔ اگر خاوند عورت کے زنا پر بینہ (دلیل) قائم کر دے تو لعان کے ساتھ بھی عورت سے حد ساقط نہ ہوگی۔ اگر عورت لعان سے انکار کرے گی تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اسے حد لگائی جائے گی۔ جبکہ امام ابو حنیفہ کا مسلک مختلف ہے وہ فرماتے ہیں عورت لعان سے انکار کرے گی تو اسے قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ لعان کرے یا مرد کی تصدیق کرے۔ اگر عورت مرد کے قول کی تصدیق کرے گی تو لعان کے وجوب کا سبب ختم ہو جائے گا اس لئے لعان نہ ہوگا۔ اور حد بھی نہ ہوگی کیونکہ تصدیق کرنا بالذات اقرار نہیں ہے۔ اس لئے حد کے وجوب میں تصدیق معتبر نہیں بلکہ حد کو دور کرنے میں معتبر ہوگا۔ پس لعان بھی نہ ہوگا اور حد بھی واجب نہ ہوگی اگر اقرار بھی ہو تب بھی حد واجب نہ ہوگی کیونکہ ایک مرتبہ اقرار

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 276 (المحاسن)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 172 (الفکر)

کرنے سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک زنا کی حد ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے اور عذاب سے مراد حد ہونا متعین نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد قید ہو اور حدود شبہات کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: اگر عورت مرد کے بچہ کی نفی میں تصدیق کردے تو پھر بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد نہ ہوگی اور نہ لعان ہوگا' اور وہ بچہ ان دونوں کا ہوگا کیونکہ نسب حکماً لعان کی وجہ سے منقطع ہوتا ہے اور یہاں لعان نہیں پایا گیا اور نسب بچہ کا حق ہے پس اس کے حق کے ابطال میں میاں بیوی کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں امام شافعی اور ان کے ہم نواؤں پر تعجب ہے کہ لعان ان کے نزدیک قسم ہے اسی وجہ سے وہ مرد میں اہلیت شہادت کو شرط قرار نہیں دیتے اور غلام' کافر اور محدود فی القذف کی طرف سے بھی لعان کو جائز قرار دیتے ہیں اور قسم مال کے ثبوت کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تو پھر عورت کے لعان سے انکار کے وقت مرد کا لعان اس پر رجم کو کیسے ثابت کرتا ہے حالانکہ رجم حدود میں سے سخت ترین حد ہے۔

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر بھی تعجب ہے کہ وہ فرماتے ہیں لعان' شہادتیں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ مرد میں شہادت کی اہلیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں اس مقام پر شہادتوں کا تکرار اس وجہ سے مشروع کیا گیا ہے کہ مرد زنا کے چار گواہ پیش کرنے سے عاجز تھا۔ شارع نے چار شہادتوں کو لعنت کے التزام اور قسم کے ساتھ تاکید کے واسطہ سے چار مردوں کی گواہی کے قائم مقام بنایا اور امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ لعان مرد کے حق میں حد قذف کے قائم مقام ہے اور عورت کے حق میں حد زنا کے قائم مقام ہے۔ پھر امام صاحب چار گواہیوں کے پائے جانے کے وقت عورت پر حد زنا کے وجوب کا قول کیوں نہیں فرماتے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ویدرا عنها العذاب۔ (اور ٹل سکتی ہے عورت سے حد) اور درء کا لفظ سقوط کے معنی میں خاص اور صریح ہے اور سقوط اس بات کا مقتضی ہے کہ سقوط کا موجب نہ ہو تو حد واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد عذاب اللّٰه اشد من عذاب الناس میں بھی عذاب سے مراد حد ہے(1) (تو امام صاحب حد کو واجب کیوں نہ کرتے) عورت کے حق میں لعان کے حد زنا کے قائم مقام ہونے کا کوئی معنی نہیں رہتا مگر جب وہ لعان کرے گی تو حد ساقط ہو جائے گی۔ اگر وہ لعان سے انکار کرے گی تو اس پر حد واجب ہوگی اور یہ نہ کہا جائے کی مرد کی شہادت اکیلی ہے۔ اگرچہ وہ چار مردوں کی شہادت کے قائم مقام ہے لیکن اس کے ساتھ زنا کا تحقق قطعی طور پر نہ ہوگا اور مرد کی شہادت کو چار مردوں کی شہادت کے قائم مقام کرنے میں شبہ ہے۔ اس لئے شبہ کی وجہ سے حد قذف ٹل جائیگی اور شبہ کی وجہ سے حد زنا بھی ثابت نہ ہوگی۔ کیونکہ حدود شبہات کی وجہ سے ٹل جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں مرد کی گواہیوں کو چار مردوں کی گواہیوں کے قائم مقام رکھنے میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اور زنا کا قطعی طور پر تحقق جس طرح مرد کی چار گواہیوں سے حاصل نہیں ہوتا اسی طرح چار مردوں کی گواہیوں سے بھی قطعی طور پر زنا متحقق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ چاروں گواہ جھوٹ پر متفق ہو گئے ہوں۔ اور خبر اس وقت تک قطعی نہیں ہوتی جب تک کہ وہ حد تواتر کو نہ پہنچے۔ یا مخبر (خبر دینے والا) معصوم ہو۔ اور دو مردوں یا چار مردوں کی گواہی کے بعد حکم لگانا امر تعبدی ہے اس کی بنیاد قطعیت پر نہیں بلکہ غلبہ ظن پر ہے اور یہاں غلبہ ظن چار مردوں کی گواہی میں جو غلبہ ظن ہوتا ہے اس سے بلند ہے کیونکہ مرد کی شہادت کو یہاں قسم کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ لعنت کا التزام بھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ مرد جائز الشہادات اور عادل بھی ہے۔ نیز عورت بھی لعان سے انکار کر رہی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ عقلاً چار آدمیوں کا جھوٹ پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 172 (الفکر)

متنفی ہونا بر تقدیر کذب زوج سے عورت کے امتناع سے زیادہ قریب ہے کیونکہ عورت کو یقین ہے کہ لعان سے رجم ساقط ہو جائیگا اور عذاب بھی دور ہو جائے گا۔ اور جس شبہ کی وجہ سے حد ساقط کی جاتی ہے وہ ایسا شبہ ہے کہ اس شبہ کا شریعت اعتبار نہیں کرتی مثلاً چاروں گواہوں کے کذب کا احتمال لعان کے باوجود خاوند کے کذب کا احتمال اور لعان سے عورت کا انکار۔ (وغیرہ) پس میرے نزدیک امام صاحب کا قول راجح ہے کہ خاوند شہادت کی اہلیت رکھتا ہو اور عورت ایسی عورتوں سے ہو جن کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے اور لعان سے عورت کے امتناع کے بعد حد زنا کے وجوب میں میرے نزدیک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نواؤں کا قول راجح ہے۔

مسئلہ: پیچھے گزر چکا ہے کہ صرف مرد کے لعان کرنے کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک میاں بیوی کے درمیان فرقت واقع ہو جائے گی۔ یہ ایسا حکم ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام زفر، امام مالک کا قول ہے کہ قضاء قاضی کے بغیر میاں بیوی کے لعان سے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام ابوحنیفہ، امام احمد اور صاحبین فرماتے ہیں لعان سے فرقت واقع نہ ہو گی حتیٰ کہ حاکم ان کے درمیان تفریق کرے اور ان کی تفریق حاکم پر واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ اور محمد کے نزدیک یہ فرقت طلاق بائنہ ہے۔ امام ابو یوسف، زفر، مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک یہ فرقت فسخ ہے، ان تمام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ لعان کے ساتھ حرمت ابدی ثابت ہو جاتی ہے جس طرح رضاع سے حرمت ابدی ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے لعان کرنے والوں کو فرمایا تم دونوں کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے تم میں سے ایک جھوٹا ہے اور تیرے لئے اس عورت کے ساتھ رہنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ لعان کرنے والے مرد نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرا مال؟ (جو میں نے عورت کو دیا تھا) فرمایا اگر تو نے عورت کے متعلق سچ کہا ہے تو تجھے مال نہیں ملے گا، وہ اس کا بدل ہو گا جو تو اس کے نفس سے متمتع ہوا ہے۔ اور اگر تو نے اس پر جھوٹ بولا ہے تو مال کا مطالبہ بہت بعید ہے(1)۔ سہل بن سعد کی حدیث جو ابوداؤد نے روایت کی ہے اس میں ہے کہ لعان کرنے والوں میں سنت قائم ہو چکی ہے کہ ان کے درمیان تفریق کی جائے گی اور پھر کبھی جمع نہ ہوں گے(2)۔ دار قطنی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن مسعود سے اسی طرح روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں حضرت علی، عمر اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مصنف عبدالرزاق ابن ابی شیبہ میں روایات موجود ہیں۔ ابو داؤد نے ابن عباس کی حدیث میں ہلال بن امیہ کے واقعہ کے آخر میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے میاں، بیوی کے درمیان تفریق کر دی اور فیصلہ فرمایا کہ عورت پر آئندہ تہمت نہ لگائی جائے اور نہ بچہ پر کوئی طعن کیا جائے(3) صحیحین میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں اپنی بیوی سے لعان کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق فرما دی اور بچہ کو ماں کے ساتھ لاحق کر دیا(4)۔

جمہور علماء کے قول (کہ فرقت، طلاق کی فرقت نہیں ہے) پر صریح دلیل ابوداؤد کی روایت کردہ حدیث ہے، جو ہلال بن امیہ کے واقعہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ اب عورت کے لئے مرد پر نہ خوراک ہے اور نہ رہائش کیونکہ وہ دونوں بغیر طلاق کے جدا ہوئے ہیں۔ اور نہ ایسی صورت ہے کہ خاوند فوت ہو گیا ہو اور بیوی پیچھے رہ گئی ہو۔ جمہور علماء فرماتے ہیں جب لعان کے بعد حرمت ابدی ثابت ہو جاتی ہے تو پھر قاضی کی تفریق کی ضرورت نہیں ہے، نیز حرمت ابدی نکاح کے منافی ہے، جیسے حرمت رضاع نکاح کے منافی ہوتی ہے، پس یہ جدائی فسخ ہو گی۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حرمت کا ثبوت نکاح

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 490 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 306 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 490 (قدیمی)

کے فسخ کا مقتضی نہیں ہے۔ مثلاً ظہار سے حرمت ثابت ہوتی لیکن نکاح فسخ نہیں ہوتا۔ مگر جب حرمت مرد کے امساک بالمعروف سے عاجزی کی صورت میں ثابت ہوتو تسریح باحسان مرد پر لازم ہوتا ہے اور جب مرد ایسی صورت میں بیوی کو نہ چھوڑے تو ظلم کو دور کرنے کے لئے قاضی اس کے قائم مقام ہو جائے گا اور تفریق کر دے گا۔ اس نظریہ پر شیخین کی حدیث دلالت کرتی ہے جو سہل بن سعد سے مروی ہے کہ عویمر نے لعان کے بعد کہا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں اسے اب اپنے پاس ٹھہراؤں تو میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا۔ پھر عویمر نے بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور نبی کریم ﷺ نے اس کے طلاق دینے پر کوئی انکار نہیں فرمایا(1)۔

دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عمر کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لعان کرنے والے جب جدا ہو جائیں گے تو پھر کبھی جمع نہ ہوں گے(2)۔ شیخ ابوبکر الرازی نے اس حدیث کے رسول اللہ ﷺ سے مروی ہونے کے ثبوت پر طعن کیا ہے لیکن صاحب التنقیح فرماتے ہیں اس کی سند جید ہے اور اس کی شرط کا مفہوم اس بات کو مستلزم ہے کہ صرف لعان سے جدا نہیں ہوں گے۔ یہ حدیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے خلاف حجت ہے اور جو حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب عورت کا مرد پر نہ نفقہ اور نہ رہائش ہے کیونکہ یہ بغیر طلاق کے جدا ہوئے ہیں یہ ابن عباس کا اپنا زعم اور خیال ہے۔ مرفوع حدیث میں صرف عدم نفقہ اور عدم سکنی کا فیصلہ ہے۔

میں کہتا ہوں لعان کے بعد حرمت بالاجماع ثابت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام زفر اور ان کے ہم خیال علماء کے نزدیک تو یہ ظاہر ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہی ہے کیونکہ اگر حرمت نہ ثابت ہوتی تو نبی کریم ﷺ کے تفریق کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی اور امام ابوحنیفہ کے قول ثم یفرق القاضی (پھر قاضی تفریق کرے) کا بھی کوئی موجب نہ ہوتا۔ یہ حرمت ظہار کی حرمت کی طرح نہیں ہے، کیونکہ ظہار کی حرمت کفارہ ادا کرنے پر ختم ہو جاتی ہے لیکن لعان کی حرمت ابدی ہوتی ہے جیسے رضاع کی حرمت ابدی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حرمت ابدی نکاح کے منافی ہے، بخلاف حرمت موقتہ کے۔ پس وہ فسخ ہوگا اور قضاء قاضی کی ضرورت نہ ہوگی۔ ابن ہمام کی عبارت بھی اس پر دلالت کرتی ہے وہ فرماتے ہیں ابو یوسف کے قول پر یہ لازم آتا ہے کہ جدائی قاضی کی تفریق پر موقوف نہیں ہے کیونکہ حرمت تو بالاتفاق لعان سے ثابت ہے اور یہ قول کہ مرد معروف طریقہ پر ٹھہرانے سے انکار کرے تو چھوڑنے میں قاضی اس کے قائم مقام ہو جائے یہ (قول) اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لعان کے بعد قاضی خاوند کو طلاق دینے کا حکم دے۔ پھر اگر وہ خاوند طلاق دینے سے انکار کرے تو ان کے درمیان قاضی تفریق کر دے۔ یہ قول کسی نے بھی نہیں کیا اور نہ نبی کریم ﷺ سے طلاق دینے کا حکم مروی ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ سے واقف تھے۔ رہا عویمر کا قول تو وہ اس بات پر محمول ہے کہ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ لعان سے فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ شرط کا مفہوم اگرچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حجت ہے لیکن اس پر عمل چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ حرمت ابدی کے ثبوت پر قطعی حکم مل گیا ہے۔ یا حضور ﷺ کے ارشاد "دو لعان کرنے والے جب جدا ہو جائیں گے تو کبھی جمع نہ ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ جب لعان سے فارغ ہو جائیں گے جیسا کہ امام ابوحنیفہ حضور ﷺ کے ارشاد اَلْمُتَبَایِعَانِ بِالْخِیَارِ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ تفریق سے مراد اقوال کا تفرق (جدا ہونا) ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 800 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 276 (المحاسن)

مسئلہ: جب لعان کے بعد مرد اپنے آپ کو جھوٹا کہے تو کیا اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہے (یا نہیں)؟ امام شافعیؒ، مالک اور احمد فرماتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو جھوٹا کہے گا تو جو چیزیں اور احکام اس کے خلاف ہوں گے ان میں تو اس کا یہ اپنے آپ کو جھٹلانا قبول ہوگا اور جن احکام میں اس کا نفع ہوگا ان میں اس کی تکذیب قبول نہ ہوگی۔ اس لئے حد قذف اس پر لازم ہوگی بچہ اس کے ساتھ لاحق ہو جائے گا لیکن ابدی تحریم ختم نہ ہوگی اور اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ (اور ایک روایت امام احمد سے بھی یہی ہے) فرماتے ہیں اپنے آپ کو جب مرد جھٹلائے گا تو اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہوگا، کیونکہ جب اس کو حد لگی تو وہ لعان کے اہل نہیں رہا۔ پس لعان پر جو حکم مرتب تھا وہ بھی اٹھ گیا۔ اسی طرح اس مرد نے اگر کسی دوسری عورت پر تہمت لگائی اور اسے حد لگائی گئی تو پھر مرد کے لئے یہی حکم ہوگا۔ اسی طرح جب عورت نے بدکاری کی اور اسے حد لگائی گئی تو چونکہ عورت سے لعان کی اہلیت ختم ہوگئی اس لئے لعان پر مرتب ہونے والا حکم اٹھ جائے گا اور ابدی حرمت ختم ہو جائے گی۔

ہم کہتے ہیں لعان کی اہلیت کا زوال اصل سے لعان کی نفی کا مقتضی نہیں ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں؟ کہ جو کسی دوسرے پر تہمت لگاتا ہے پھر اسے حد قذف لگائی جاتی ہے پھر مقذوف زنا کرتا ہے اور اسے حد زنا لگائی جاتی ہے تو مقذوف سے اہلیت لعان کے زوال کے باوجود اس کے قاذف کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔

احناف فرماتے ہیں حضور ﷺ کے ارشاد اَلْمُتَلَاعِنَانِ لَایَجْتَمِعَانِ اَبَدًا کا مطلب یہ ہے کہ جب تک لعان کرنے والے ہیں جمع نہ ہوں گے جیسا کہ قضیہ عرفیت کا مفہوم ہے ہم کہتے ہیں قضیہ عرفیہ کا مفہوم متصور نہیں ہوتا مگر جب عنوان (موضوع) کا وصف استمراری ہو اور لعان کا وصف غیر استمراری ہو اس لئے وصف کی شرط کے ساتھ حکم ممکن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ دو افراد ہیں جن سے کسی وقت لعان صادر ہو وہ اس کے بعد کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اور یہ قول کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ جمع نہیں ہوں گے جب تک وہ ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں اور جب کوئی اپنے آپ کو جھوٹا مان لے گا تو پھر نکاح جائز ہوگا۔

مسئلہ: اگر قذف بچے کی نفی کے ساتھ ہو تو قاضی بچے کے نسب کی اس مرد سے نفی کر دے گا اور اسے ماں کے ساتھ ملا دے گا اور جن کے نزدیک قضاء قاضی شرط ہے۔ تفریق کی قضاء بھی اس کے ضمن میں ہوگی۔ مرد لعان میں کہے گا اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اِنِّیْ لَمِنَ الصَّادِقِیْنَ فِیْمَا رَمَیْتُکِ بِهٖ مِنْ نَّفْسِ الْوَلَدِ۔

یعنی میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ جو میں نے تجھ سے بچہ کی نفی کی ہے اس میں سچا ہوں اسی طرح عورت بھی کہے گی۔ اگر مرد نے عورت پر زنا کا الزام لگایا اور بچے کی بھی نفی کی تو لعان میں دونوں چیزوں کا ذکر کرے گا۔ پھر قاضی بچے کے نسب کی نفی کر دے گا اور اسے ماں کے ساتھ ملا دے گا، کیونکہ ابن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خاوند اور بیوی کے درمیان لعان کرایا تو پھر آپ ﷺ نے مرد سے بچہ کی نفی کر دی پھر ان کے درمیان تفریق کر دی اور بچہ کو عورت کے ساتھ لاحق کر دیا۔ (متفق علیہ)(1)

مسئلہ: اگر خاوند بیوی سے کہے کہ تیرا حمل مجھ سے نہیں ہے تو امام ابوحنیفہؒ امام زفر اور امام احمد کے نزدیک لعان نہ ہوگا کیونکہ خاوند کی نفی کے وقت حمل کا یقین نہیں ہے، پس وہ تہمت لگانے والا نہ ہوگا۔ امام مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہما حمل کی نفی کی وجہ سے لعان کرتے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 801 (وزارت تعلیم)

ہیں۔ امام ابو یوسف اور محمد فرماتے ہیں جب وہ چھ ماہ سے کم میں بچہ جنے گی تو لعان واجب ہوگا۔ اس قول کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے تک معاملہ کو مؤخر کیا جائے گا اگر وہ چھ ماہ سے کم میں بچہ جن دے گی تو لعان واجب ہوگا ورنہ لعان واجب نہ ہوگا۔ بعض طرق میں ہلال کا قصہ اس طرح وارد ہے کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ لعان ولادت کے بعد ہوا تھا۔ شیخین نے ابن عباس سے ہلال کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے عرض کی اے اللہ! معاملہ واضح فرمادے تو عورت نے اس مرد کی شکل کا بچہ جنم دیا تھا جس کے متعلق خاوند نے الزام لگایا تھا کہ اس شخص کو اپنے اہل کے پاس پایا پھر رسول اللہ ﷺ نے لعان کرایا تھا(1)۔

امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہلال اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کی تھی اور فیصلہ فرمایا تھا کہ بچہ کو باپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے اور نہ عورت پر آئندہ طعن کیا جائے اور نہ بچہ پر کوئی زبان دراز کی جائے' جو عورت یا بچہ پر تہمت لگائے گا اس پر حد ہوگی۔ عکرمہ فرماتے ہیں اس عورت کا وہ بچہ مصر کا امیر بنا تھا اور باپ کی طرف منسوب نہیں ہوتا تھا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ کا ترجمہ ہے' اکثر طرق میں ہے کہ ہلال کی بیوی حاملہ تھی جب اس نے لعان کیا تھا۔ نسائی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے العجلانی اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کرایا تھا جبکہ اس کی بیوی حاملہ تھی(2)۔ عبدالرزاق نے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ خاوند نے کہا میں اس عورت کے پاس عفار النخل کے وقت سے نہیں گیا۔ (عفار النخل کا مفہوم یہ ہے کہ تأ بیر کے بعد دو مہینے ان کھجوروں کو پانی نہیں دیا جاتا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی اے اللہ، معاملہ واضح فرمادے تو عورت نے بڑا مکروہ چہرے والا بچہ جنا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمل کی نفی سے لعان جائز ہے' اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ لعان ثابت اس لئے ہوا تھا کیونکہ ہلال نے عورت پر زنا کی تہمت لگائی تھی۔ نفی حمل کی وجہ سے لعان ثابت نہیں ہوا تھا۔ اور امام احمد کے ہاں جو وکیع کی روایت ہے کہ ہلال نے حمل کی وجہ سے لعان کیا تھا' خود امام احمد نے اس کا انکار کیا ہے۔ فرماتے ہیں وکیع نے یہ کہنے میں خطا کی ہے کہ حمل کی وجہ سے لعان کیا تھا۔ آپ ﷺ نے لعان کرایا تھا جب اس نے چار مرتبہ زنا کی گواہی دی تھی' حمل کی وجہ سے لعان نہیں کرایا تھا۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ ہلال نے بیوی پر دونوں قسم کے الزام لگائے تھے (یعنی زنا اور حمل کی نفی دونوں کا ذکر کیا تھا) جیسا کہ وہ روایت دلالت کرتی ہے جو علامہ بغوی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور قتادہ سے نقل کی ہے۔ اگر زنا کی تہمت لگائی ہوتی تو یہی کافی تھا آپ ﷺ اس بچہ کی نفی نہ فرماتے کیونکہ احتمال تھا کہ یہ بچہ ہلال کی دوسری وطی کے علوق سے ہو' زانی کی وطی سے نہ ہو۔ پس ہلال کی حدیث سے صرف حمل کی نفی سے لعان کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول کہ ''عجلانی اور اسکی بیوی کے درمیان لعان کیا تھا جبکہ وہ حاملہ تھی'' اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ تہمت صرف نفی حمل کی تھی بلکہ ابن سعد نے طبقات میں عویمر کے ترجمہ میں عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے عویمر بن الحارث العجلانی کو دیکھا جب اس نے اپنی بیوی پر شریک بن سحما کے ساتھ بدکاری کرنے کا الزام لگایا اور اس کے حمل کا انکار کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان لعان کرایا جبکہ وہ حاملہ تھی۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا کہ وہ دونوں منبر کے پاس کھڑے ہو کر لعان کر رہے تھے۔ پھر عورت نے بچہ جنا تو وہ بچہ عورت کے ساتھ لاحق فرمایا اور عورت نے شریک بن سحماء کی شکل سے ملتا جلتا بچہ جنا۔ پہلے قوم نے عویمر کو اس الزام پر ملامت کی اور کہا کہ ہم تو اس عورت کے متعلق خیر ہی جانتے ہیں لیکن جب اس نے شریک کے مشابہ بچہ جنا تو لوگوں نے عویمر سے معذرت کی۔ وہ بچہ دو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 490 (قدیمی) 2۔ سنن نسائی، جلد 6، صفحہ 171 (الریان)

سال زندہ رہا تھا پھر فوت ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کے مرنے کے بعد تھوڑا عرصہ زندہ رہی تھی اور شریک کا وقار اور عزت لوگوں کی نظروں میں بالکل گر گیا تھا۔ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ اس نے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی تھی اور حمل کا بھی انکار کیا تھا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے حمل کی نفی کی اور چھ ماہ سے کم میں اس نے بچہ جن دیا تو الزام کے وقت حمل کا وجود ظاہر تھا۔ پس قذف ثابت ہو گیا اس لئے اس پر لعان ہو گا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب قذف فی الحال نہ ہو تو وہ شرط کے ساتھ معلق کی طرح ہو گا۔ گویا اس نے اس طرح کہا اگر تو حاملہ ہے تو تیرا حمل مجھ سے نہیں ہے اور قذف کو شرط کے ساتھ معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے عورت سے کہا تو نے زنا کیا ہے اور تیرا حمل زنا کا ہے' تو بالا جماع لعان ہو گا کیونکہ قذف پایا گیا ہے' کیونکہ صراحۃً اس نے زنا کا ذکر کیا ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی حمل کی نفی نہیں کرے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قاضی حمل کی نفی کرے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہلال سے بچے کی نفی کی تھی جبکہ اس نے اس پر حاملہ ہونے کی حالت میں تہمت لگائی تھی۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں احکام ولادت کے بعد مرتب ہوتے ہیں اس (ولادت) سے پہلے احتمال ممکن ہے' اور حدیث اس بات پر محمول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وحی کے ذریعے حمل کا وجود جان لیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ قول انتہائی بعید ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ ظاہر امر پر حکم لگاتے تھے تا کہ آپ کی اقتداء کی جائے' آپ ﷺ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے حکم کے ساتھ حکم نہیں لگاتے تھے ورنہ آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے' آپ وحی کے ذریعے ایک معین فرد کی تکذیب کا حکم لگاتے تھے۔

مسئلہ: جب مرد' عورت کے بچہ کی نفی اس کی ولادت کے بعد کرے (تو کیا حکم ہے؟) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر بچے کی خبر سنتے ہی بچہ کی نفی کرے تو اس کا نفی کرنا صحیح ہو گا اور لعان ہو گا۔ اگر وہ اس وقت خاموش رہا بعد میں نفی کی تو لعان ہو گا اور نسب بھی ثابت ہو جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس وقت تک خاوند کے لئے نفی کرنا صحیح ہے جب تک کہ لوگ مبارک دے رہے ہوں۔ ظاہر روایت میں مبارک کی مدت متعین نہیں فرمائی ہے۔ ابواللیث نے امام ابوحنیفہ سے تین دن کی مدت روایت کی ہے۔ حضرت الحسن نے امام ابوحنیفہ سے سات دن کی مدت روایت کی ہے۔ امام ابو یوسف اور محمد کے نزدیک مدت نفاس تک بچہ کی نفی کرنا صحیح ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ فوراً نفی کرنا صحیح ہو کیونکہ سکوت (خاموشی) رضا کی دلیل ہے لیکن ہم نے استحساناً کچھ مدت تاخیر کو جائز قرار دیا ہے تا کہ غور وفکر پورا ہو جائے تا کہ خاوند سے بچہ کی نفی نہ واقع ہو جائے یا غیر کا بچہ اس کے ساتھ ملحق نہ ہو جائے کیونکہ یہ دونوں امر حرام ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ (جب آیۃ الملاعنہ نازل ہوئی تھی) جس عورت نے کسی قوم پر ایسے شخص کو داخل کیا جو اس قوم سے نہیں ہے (یعنی بدکاری سے بچہ جنا) تو وہ اللہ کی طرف سے کسی مذہب پر نہیں ہے اور اسے اللہ تعالیٰ اپنی جنت میں ہرگز داخل نہیں فرمائے گا۔ اور جس مرد نے اپنے بچہ کا انکار کیا در اں حالیکہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایسے شخص سے پردہ فرمالے گا اور اسے اولین و آخرین کے سامنے رسوا فرمائے گا(1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد' نسائی' شافعی' ابن حبان' حاکم اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔

صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابوبکرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اسلام میں اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے باپ ہونے کا دعویٰ کیا جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا باپ اور شخص ہے تو اس پر جنت حرام ہے(2)۔

1۔ سنن ابوداؤد، جلد 1، 308 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1001 (وزارت تعلیم)

مسئلہ: اگر خاوند ولادت کے وقت غائب ہو تو اس کے آنے کے بعد اس مدت کا اعتبار کیا جائے گا جو ہم نے امام صاحب اور صاحبین سے نقل کی ہے پس صاحبین کے نزدیک نفاس کی مدت کی مقدار اور امام صاحب کے نزدیک تہنیت قبول کرنے کی مدت کی مقدار ہے۔

مسئلہ: مرد کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی پر تہمت لگائے جب اسے اس کے زنا کا علم ہو یا ظن مؤکد۔ ہو جیسے مشہور ہے کہ اس عورت نے زید کے ساتھ زنا کیا ہے نیز قرینہ بھی ہو کہ اس نے خود ان دونوں کو خلوت میں دیکھا ہو۔ اگر وہ بچہ جنے اور اسے معلوم ہو کہ اس کا نہیں کیونکہ اس نے اس سے وطی نہیں کی تھی یا وہ چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ جنے جبکہ اس کی وطی کو چھ ماہ نہیں گزرے یا دو سال کے بعد بچہ جنے اور اگر ان دونوں مدتوں کے درمیان بچہ جنے اور حیض کے ساتھ اس کا استبراء نہیں ہوا تو بچہ کی نفی کرنا حرام ہے اور اگر استبراء رحم کے چھ ماہ بعد بچہ جنے تو بچے کی نفی کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے وطی کی اور عزل کیا یا اسے اس کے زنا کا علم ہوا اور اسے بچہ کے اپنے نطفہ یا زنا سے ہونے کا احتمال ہے تو نفی ولد حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

''اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی (تو تم بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے) اور بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا بڑا دانا ہے۔ [1]''

[1] اے امت محمدیہ، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ تمہیں رسوا کرتا اور تمہارے گناہوں پر فوری مؤاخذہ فرماتا لیکن وہ نظر رحمت فرمانے والا ہے ہر اس شخص پر جو اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہاتا ہے اور استغفار کر کے اپنے نامہ اعمال کی سیاہی کو دور کرتا ہے۔ لولا کی جزا محذوف ہے اور اس کی وجہ اس کی بڑائی کا اظہار ہے اللہ تعالیٰ تواب بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ اس نے جو تم پر حدود اور احکام جاری فرمائے ہیں ان میں سے ہر ایک میں بے شمار حکمتیں مضمر ہیں۔

شیخان نے زہری سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مجھے عروہ بن الزبیر، سعید بن المسیب، علقمہ بن وقاص اور عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المومنین سے روایت کر کے بتایا جب جھوٹا بہتان لگانے والوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بہتان لگایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس الزام سے حضرت عائشہ کو بری فرمایا (زہری فرماتے ہیں مجھے مذکورہ افراد میں سے ہر ایک نے اس بات کا کچھ حصہ بیان کیا، اور ان کی حدیثیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اگرچہ بعض بعض سے زیادہ محفوظ ہیں) جو مجھے عروہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے، جس کا نام نکلتا اسے سفر پر ساتھ لے جاتے، آپ ﷺ نے ایک غزوہ (بنی مصطلق) میں ہمارے درمیان قرعہ اندازی فرمائی تو میرا نام نکلا، میں آپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی۔ یہ واقعہ حجاب کے نزول کے بعد کا ہے۔ میں اپنے ہودج میں سوار ہوتی تھی اور میرا ہودج اونٹ پر رکھ دیا جاتا تھا۔ ہم چلتے رہے حتیٰ کہ جب رسول اللہ ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہوئے تو واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ہم نے مدینہ طیبہ کے قریب پڑاؤ کیا ہوا تھا کہ رات کو چلنے کا اعلان ہوا میں اٹھی اور قضائے حاجت کے لئے لشکر سے دور چلی گئی جب میں فارغ ہوئی تو اپنے کجاوہ کی طرف آئی پھر جب میں نے اپنے سینہ کو مس کیا تو میرا عقیق یمنی سے بنا ہوا ہار ٹوٹ کر گر چکا تھا، میں واپس لوٹی اپنے ہار کو تلاش کیا، تو اس کی تلاش میں مجھے دیر لگ گئی وہ لوگ آئے جنہوں نے

مجھے لے کر جاتا تھا' انہوں نے میرا ہودج اٹھایا اور میرے اونٹ پر رکھ دیا جس پر میں نے سوار ہونا تھا' انہوں نے یہ گمان کیا کہ میں اس ہودج کے اندر ہوں۔ اس زمانہ میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں ان پر زیادہ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ عورتیں کھانا تھوڑا کھاتی تھیں' لوگوں کو ہودج کا ہلکا ہونا محسوس نہ ہوا انہوں نے اسے اٹھایا اور اونٹ پر باندھ دیا میں اس وقت کم عمر تھی۔ وہ اونٹ کو پکڑ کر چل دیئے۔ لشکر کے چلے جانے کے بعد مجھے ہار ملا' میں جب واپس لشکر کی جگہ آئی تو وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ میں اسی جگہ ٹھہر گئی اور میں نے یہ گمان کیا کہ لوگ جب مجھے مفقود پائیں گے تو واپس میری طرف آ میں گے۔ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ مجھ پر نیند طاری ہوگئی' تو میں سوگئی۔ صفوان بن المعطل اسلمی ثم الذکوانی نے لشکر کے پیچھے پڑاؤ کیا تھا وہ رات کے آخر میں چلے' جب وہ میری جگہ پہنچے تو انہیں سوئے ہوئے انسان کی سیاہی نظر آئی انہوں نے جب مجھے دیکھا تو وہ مجھے پہچان گئے انہوں نے مجھے حجاب سے پہلے دیکھا تھا۔ ان کے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھنے سے میں بیدار ہوگئی جب انہوں نے مجھے پہچانا تو میں نے اپنی اوڑھنی کے ساتھ اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ قسم بخدا انہوں نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی اور انا للّٰہ وانا الیہ راجعون کے علاوہ میں نے ان سے کوئی کلمہ نہیں سنا' انہوں نے اپنی سواری کو بٹھایا اور اس کے گھٹنے پر اپنا پاؤں رکھا میں اٹھی اور اس پر سوار ہوگئی وہ مجھے لے کر چلے حتیٰ کہ دوپہر کے وقت لشکر کے نزول کے بعد ہم پہنچے' میرے بارے لوگ باتیں بنانے لگے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے شرانگیز پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ میں مدینہ طیبہ پہنچی تو ایک مہینہ بیمار پڑی رہی۔ لوگوں میں اس بات کا خوب چرچا ہوتا رہا لیکن مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ میری علالت کے وقت جو شفقت و مہربانی رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے وہ اب مفقود تھی' رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لاتے تو سلام کرتے اور فرماتے تمہارا کیا حال ہے؟ پھر واپس تشریف لے جاتے۔ مجھے اس انداز سے شک گزرتا لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں بیماری کے بعد بہت نقاہت محسوس کرنے لگی۔ ایک رات میں ام مسطح کے ساتھ قضائے حاجت کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر گئی کیونکہ اس وقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا اور ہم عرب کے دستور کے مطابق جنگل میں ہی جایا کرتی تھیں۔ ام مسطح ابوبکر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ ہم جب قضائے حاجت سے فارغ ہو کر واپس آرہی تھیں تو ام مسطح کا پاؤں چادر سے الجھا اور وہ گر پڑیں اور بے ساختہ کہا مسطح ہلاک ہو جائے۔ میں نے کہا تم نے بہت برا کلمہ کہا ہے' کہا تم ایک بدری صحابی کو بددعا دے رہی ہو۔ اس نے کہا بیٹی تم نے نہیں سنا جو کچھ اس نے طوفان برپا کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے انہوں نے مجھے پورا واقعہ سنایا۔ یہ پریشان کن خبر سن کر میری مرض میں اضافہ ہو گیا۔ جب میں اپنے گھر پہنچی اور میرے حجرے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام فرمایا اور پوچھا تم کیسی ہو؟ تو میں نے عرض کی کیا آپ مجھے اپنے والدین کے پاس جانے کی اجازت فرمائیں گے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ والدین سے خبر کی تفصیل پتہ کروں' آپ ﷺ نے اجازت فرمائی اور میں اپنے والدین کے گھر آگئی۔ میں نے والدہ محترمہ سے پوچھا لوگ کیا کہہ رہے ہیں انہوں نے کہا بیٹی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب کوئی عورت پاکیزہ صورت ہو اور اس کا شوہر اس سے محبت کرتا ہو اور اسکی سوکنیں بھی ہوں تو اس قسم کے پراپیگنڈے ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ لوگ میرے بارے ایسی باتیں کر رہے ہیں میں صبح تک روتی رہی' صبح بھی آنسو رواں تھے پل بھر نیند نہیں آئی۔ صبح بھی روتی رہی۔

جب وحی کے نزول میں تاخیر ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اسامہ بن زید کو بلایا اور دونوں سے اپنے اہل سے جدائی کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ حضرت اسامہ نے تو آپ ﷺ کے اہل کے متعلق براءت کا اظہار کیا۔ ایک روایت

میں ہے کہ ان کے دل میں جو حضور ﷺ کے اہل کے متعلق محبت تھی اس کو ظاہر کیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ آپ کی زوجہ محترمہ ہے میں تو ان کے متعلق خیر ہی جانتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا آپ تنگ دل نہ ہوں اس کے علاوہ عورتوں کی کیا کمی ہے؟ عورتیں بہت ہیں اگر آپ تصدیق کرنا چاہتے ہیں بریرہ لونڈی سے پوچھ لیجئے۔ آپ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور پوچھا اے بریرہ کیا تو نے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جس سے تمہیں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے کوئی شک ہو۔ بریرہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اس کے سوا میں نے عائشہ میں کوئی عیب نہیں دیکھا کہ آٹا گوندھا ہوا رکھا ہوتا ہے یہ اپنی کم عمری کی وجہ سے سو جاتی ہیں اور بکری آٹا کھا جاتی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا اے مسلمانوں کے گروہ اس شخص کے بارے مجھے کون معذور رکھتا ہے جس کی اذیت رسانی میرے اہل خانہ کے بارے مجھ تک پہنچی ہے' قسم بخدا میں اپنے اہل کے متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ انہوں نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جس کے متعلق میں خیر ہی جانتا ہوں اور وہ میرے گھر والوں پر میرے ساتھ داخل ہوتا تھا' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضرت سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کو معذور سمجھتا ہوں اگر وہ شخص اوس قبیلہ سے ہے تو ہم اس کی گردن اڑا دیں گے اور اگر وہ بنی خزرج سے ہے تو آپ ﷺ ہمیں حکم فرمائیں ارشاد کے مطابق عمل ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں پھر خزرج کے سردار سعد بن عبادہ اٹھے جو ایک نیک اور صالح شخص تھے، لیکن سعد بن معاذ کا جملہ سنا تو ان کی قبائلی عصبیت بیدار ہوگئی۔ کہنے لگے قسم بخدا تم نے جھوٹ بولا ہے ایسا ہرگز نہ ہوگا اگر وہ شخص تمہارے قبیلہ کا ہوتا تو تم کبھی اسے قتل نہ کرتے۔ اسید بن حضیر اٹھے جو سعد کے چچازاد تھے انہوں نے سعد بن عبادہ کو مخاطب کر کے کہا قسم بخدا تم نے جھوٹ بولا ہے ہم اسے قتل کریں گے تو منافق ہے' منافقین کا دفاع کرتا ہے' اوس و خزرج کے جذبات بھڑک اٹھے حتیٰ کہ جنگ چھڑنے لگی' حضور ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ ان کے جوش کو ٹھنڈا کرتے رہے حتیٰ کہ وہ سب خاموش ہو گئے اور آپ ﷺ بھی خاموش ہو گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میرے دن رات رونے میں بسر ہوتے ایک لحہ بھی نیند نہیں آتی تھی۔ میرے والدین کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اس طرح رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ ایک دن میں رو رہی تھی میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک انصاری عورت میرے پاس آئی اور میرے پاس بیٹھ کر رونے لگ گئی پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے سلام فرمایا اور بیٹھ گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں اس سے پہلے آپ میرے پاس (اس حادثہ کے دوران) کبھی نہ بیٹھے تھے' ایک مہینہ گزر گیا لیکن میرے متعلق کوئی وحی نازل نہ ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ حضور ﷺ نے کلمہ شہادت پڑھا پھر فرمایا اے عائشہ مجھے تیرے متعلق ایسی ایسی بات پہنچی ہے' اگر تو بری ہے تو اللہ تعالیٰ تیری برأت کر دے گا اگر تجھ سے کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر اور توبہ کر۔ کیونکہ جب انسان اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم فرمائی تو میرے آنسو خشک ہو گئے میں نے والد گرامی سے عرض کی' حضور کو آپ جواب دیں' ابا حضور نے کہا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا میں نے والدہ محترمہ سے عرض کیا آپ رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں انہوں نے کہا مجھے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ میں کیا کہوں؟ (میں کم عمر تھی اور قرآن بھی زیادہ پڑھا ہوا نہ تھا) لیکن میں نے کہا قسم بخدا میں جان گئی ہوں کہ تم نے ایک بات سنی ہے جو تمہارے دلوں میں جم گئی ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں بے قصور ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں' تم میری تصدیق

نہیں کرو گے اگر میں ایسی بات کا اعتراف کروں جسے اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ میری بات مان جائیں گے۔ اب میرے لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ میں وہ بات کہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد محترم نے کہی تھی فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔ پھر میں منہ پھیر کر بستر پر لیٹ گئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں جانتی تھی کہ میں بری ہوں اور اللہ تعالیٰ میری براءت کا اظہار فرمائے گا لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ میرے متعلق آیات قرآنی نازل ہوں گی۔ میں اپنے آپ کو اس اہل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے متعلق قرآن نازل ہوگا لیکن مجھے امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں اللہ تعالیٰ میری براءت دکھا دے گا۔ قسم بخدا رسول اللہ ﷺ ابھی اپنی مجلس سے اٹھے نہ تھے اور نہ کوئی دوسرا ابھی گھر سے باہر نکلا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر وحی کا نزول فرمایا۔ حضور ﷺ پر وحی کے آثار ظاہر ہونے لگے سردی کے موسم میں وحی کے بوجھ کی وجہ سے پسینے کے قطرے آپ کی جبین اقدس پر موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ ﷺ مسکرا رہے تھے۔ پہلی بات جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی وہ یہ تھی اے عائشہ، خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے تیری براءت فرما دی ہے۔ میری والدہ نے مجھے کہا اے عائشہ اٹھ اور حضور ﷺ کا شکریہ ادا کر۔ میں نے کہا بخدا میں نہیں اٹھوں گی اور نہ کسی کا شکریہ ادا کروں گی صرف اللہ کا شکر ادا کروں گی جس نے میری براءت فرمائی (1) اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱﴾

”بیشک جنہوں نے جھوٹی تہمت لگائی ہے وہ ایک گروہ ہے تم میں سے[1] تم اسے اپنے لئے برا خیال نہ کرو بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے لئے[2] ہر شخص کے لئے اس گروہ میں سے اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا[3] اور جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا ان میں سے (تو) اس کے لئے عذاب عظیم ہوگا[4]“

[1] کذب اور جھوٹ کی انتہا کو افک کہا جاتا ہے۔ اس کا اصل معنی پھیرنا اور الٹ پلٹ کرنا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واقعی اس ثنا اور تعریف کی مستحق تھیں کیونکہ آپ کی ذات تو سراپا عفت و شرافت تھی۔ نیز آپ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہزادی، رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ اور مومنین کی ماں تھیں۔ آپ کا احترام واکرام ہر شخص پر واجب ہے۔ جس نے آپ کی طرف کوئی غلط بات کی یقیناً اس نے حقیقت کو تبدیل کیا ہے۔ عصبۃ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں دس سے چالیس تک افراد ہوں لفظاً اس کا واحد نہیں ہے، منکم سے مراد مومنین ہیں۔ امام بخاری وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی تھیں زینب بنت جحش اللہ تعالیٰ نے انکی انکے دین کے ساتھ حفاظت فرمائی۔ انہوں نے میرے متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن ان کی بہن حمنہ میرے متعلق غلط پراپیگنڈا کرنے والوں میں ہلاک ہوگئی۔ ان کے علاوہ جو اس غوغا آرائی کی لپیٹ میں آئے ان میں مسطح حسان بن ثابت اور عبداللہ بن ابی تھے سب سے زیادہ اس مسئلہ کو ہوا دینے والا بد بخت عبداللہ بن ابی تھا (2)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عروہ نے فرمایا کہ اس جھوٹی تہمت لگانے والوں میں مسلمانوں میں سے حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 697 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 700

حمنہ بنت جحش کا دوسرے لوگوں کے ساتھ نام لیا جاتا ہے لیکن ان کا مجھے علم نہیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے، صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک گروہ تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں عصبۃ کا لفظ دلالت کر رہا ہے' حضرت عروہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حضرت حسان کے متعلق برا بھلا کہا جائے۔ آپ فرماتی تھیں کہ حضرت حسان وہ ہیں جنہوں نے شان رسالت میں یہ کہا تھا۔

فَاِنَّ اَبِیْ وَ اُمِّیْ وَ اَوْلَادِیْ وَ عِرْضِیْ　لِعِرْضِ　مُحَمَّدٍ　مِّنْکُمْ　وِقَاءٌ

(بیشک) میرا باپ' میری ماں' میری اولاد اور میری عزت محمد ﷺ کی عزت کو تم سے بچانے کے لئے ہے)(1)۔

ﷺ لاتحسبوہ کا خطاب نبی کریم ﷺ اور مذکورہ گروہ کے علاوہ مومنین کو ہے، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر طعن' نبی کریم ﷺ پر طعن کرنا ہے' کیونکہ یہ طعن و تشنیع کے تیر آپ ﷺ کے لئے پریشانی اور تکلیف کا باعث تھے اور تمام مومنین کے لئے حزن وملال کا سبب تھے کیونکہ آپ ﷺ مومنین کے باپ تھے، یعنی اے نبی مکرم (ﷺ) اور اے میرے نبی کے جاں نثارو! اس بہتان تراشی کو اپنے لئے برا خیال نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو تم اس اضطراب و پریشانی پر صبر کرو گے تو بارگاہ الٰہی میں تمہاری عزت و کرامت میں اضافہ ہوگا' وہ رب کریم اپنے رسول ﷺ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت کیلئے قرآن نازل فرمائے گا اور ان کی عزت وعظمت کو مزید چار چاند لگا دے گا اور جنہوں نے اس کذب بیان اور بہتان تراشی میں حصہ لیا ان کے متعلق سخت عذاب کی وعید نازل فرمائے گا۔ جسے قیامت تک مسجدوں کے محرابوں اور عبادت گاہوں کے (میناروں) پر پڑھا جاتا رہے گا۔
لاتحسبوہ کا جملہ مستانفہ ہے گویا یہ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ بہتان تراشی کیا ہے؟ یا یہ جملہ نبی کریم ﷺ اور مومنین کے پریشان دلوں کو تسلی دینے کے لئے معترضہ ہے۔

ﷺ اس گروہ میں سے جتنا جس نے اس بہتان تراشی اور کذب بیانی میں حصہ لیا ہر ایک کو اس کے جرم کے مطابق سزا ملے گی۔ کیونکہ بعض نے یہ جھوٹا الزام گھڑا تھا' بعض یہ پسند کرتے تھے کہ اس کو مزید ہوا ملے۔ لوگوں میں یہ پھیل جائے اور بعض نے یہ واقعہ سننے کے بعد دوسروں کو بتایا' بعض اس پر ہنسنے لگے لیکن آگے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ بعض نے اس الزام کو رد تو نہ کیا لیکن سن کر خاموش ہو گئے اسم موصول (ما) ظرف کا فاعل ہے یا مبتدا ہے اور خبر ظرف مقدم ہے اور یہ جملہ عصبۃ کی صفت ہے اور پھر انّ کی دوسری خبر ہے۔
علامہ بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو حد لگانے کا حکم لگایا جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جھوٹی تہمت لگائی تھی' ان تمام کو 80,80 کوڑے لگائے گئے(2)۔
میں کہتا ہوں دنیا میں ان کے لئے رسوا کن حد تھی اور آخرت میں ان کی جزاء وہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

ﷺ یعقوب نے کبرہ کو کاف کے ضمہ کے ساتھ اور عام قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ یعنی جس شخص نے اس معاملہ کا آغاز کیا اور پھر نبی کریم ﷺ کی عداوت اور مومنین کو شرمندہ کرنے کے لئے اس مسئلہ کی تشہیر کی۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ زہری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ یہ جھوٹ گھڑنے والا اور اس کی تشہیر کرنے والا عبداللہ بن سلول ہے' اور عذاب عظیم سے مراد آخرت میں آگ کا عذاب ہے(3)۔
ابن ابی ملیکہ نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث افک میں روایت کیا ہے۔ کہ آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 177 (الفکر)　2۔ ایضاً، صفحہ 182　3۔ ایضاً، صفحہ 181

فرماتی ہیں۔ میں سوار ہوئی تو صفوان نے اونٹ کی نکیل پکڑلی پھر ہم منافقین کے ایک گروہ کے پاس سے گزرے۔ یہ بدبختوں کی عادت تھی کہ علیحدہ ڈیرہ لگاتے تھے' عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا اس نے پوچھا یہ عورت کون ہے؟ تو اس کے حواریوں نے کہا عائشہ ہے' بدبخت کہنے لگا قسم بخدا نہ اس نے اس سے نجات پائی ہے اور نہ صفوان اس سے بچا ہے' مزید کہا تمہارے نبی کی بیوی ہے اس نے ایک مرد کے ساتھ رات گزاری ہے۔ پھر صبح کو وہ مرد اسے اونٹ پر بٹھا کر لے آیا ہے (1) بعض علماء فرماتے ہیں الذی تولیٰ کبرہ سے مراد عبداللہ بن ابی بن سلول' حسان مسطح اور حمنہ ہیں۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اگر یہ تمام مراد ہوتے تو قرآن میں صیغے واحد کے نہ ہوتے بلکہ جمع ہوتے اور کلام اس طرح ہوتی وَالَّذِیْنَ تَوَلَّوْا کِبْرَہٗ۔

مسطح اور حسان بدری صحابہ میں سے ہیں جن کے اللہ نے اگلے' پچھلے گناہ معاف فرمادیے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل بدر کو فرمایا تھا عملوا ما شئتم فاِنّ اللہ قدغفر لکم۔ جو چاہو کرو اللہ تعالیٰ نے تمہاری مغفرت فرمادی ہے (2) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کی شان میں فرمایا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (تمام کے ساتھ اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے) یہ آیت کریمہ عذاب کے منافی نہیں ہے کیونکہ دخول جنت تعذیب کے بعد بھی ہوسکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الذی تولی سے مراد حسان بن ثابت ہے' امام بخاری نے مسروق سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں، میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حاضر ہوا اس وقت آپ کے پاس حسان بن ثابت یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تزنُّ بریبَۃٍ و تُصبِحُ عرثٰی مِنْ لُحُوْمِ الغَوَافِلِ

ترجمہ: وہ پاکدامن اور وقار و سکون والی عورت ہے کسی شک کی بناء پر اسے مہتم نہیں کیا جاتا وہ صبح کرتی ہے جبکہ اس کا پیٹ پاکدامن عورتوں کے گوشت سے خالی ہوتا ہے۔ (یعنی وہ کسی کی غیبت بھی نہیں کرتی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت حسان کو فرمایا لیکن تم تو ایسے نہیں ہو۔ مسروق فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا تم ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت کیوں دیتی ہو؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا والذی تولی کبرہ منھم لہ عذاب عظیم۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اس سے کونسا عذاب سخت ہے۔ حضرت حسان حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہیں 3) یعنی جب مشرکین رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتے تھے تو حضرت حسان مشرکین کی ہجو کرتے تھے۔ اس صورت میں عذاب عظیم سے مراد دنیا کا عذاب ہوگا پہلا قول زیادہ درست ہے۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾

"ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنوں کے بارے میں نیک گمان اور کہہ دیا ہوتا کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے۔ لے"

لے اے ایمان والو! تم نے جب یہ بہتان سنا تھا تو تم نے فوراً اس کی تردید کیوں نہ کر دی؟ اس آیت میں اہل دین کو اپنی ذوات (انفسھم) سے تعبیر فرمایا جبکہ دوسری آیات میں بھی اہل دین کو اپنی ذوات انفس سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 181 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 1095 (العلمیہ) 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 699 (وزارت تعلیم)

(نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر) لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (نہ ہلاک کرواپنے آپ کو) لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے) فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (تو سلامتی کی دعا دو اپنوں کو) مومنین اور ہر دین والے آپس میں ایک نفس کی مانند ہیں۔ کلام اس طرح ہونا چاہئے تھا لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَنْتُمْ بِاَنْفُسِكُمْ خَيْرًا۔ لیکن توبیخ میں مبالغہ کے لئے خطاب سے غائب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ نیز یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ ایمان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مومنین کے متعلق حسن ظن رکھو اور ان پر طعن کرنے سے باز آجاؤ اور مومنین کا طعن کرنے والوں سے اس طرح دفاع کرو جس طرح اپنی ذاتوں کا دفاع اور بچاؤ کرتے ہو۔ لولا اور اس کے فعل کے درمیان ظرف سے فاصلہ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی ظرف اس چیز کے قائم مقام ہوتی ہے کیونکہ ظرف اس چیز سے جدا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے جو وسعت ظرف میں ہوتی ہے دوسری چیزوں میں نہیں ہوتی' یہاں ظرف کو اس لئے مقدم فرمایا ہے کیونکہ ظرف کا ذکر اہم ہے' یعنی انہیں تنبیہ کی جارہی ہے کہ جونہی انہوں نے سنا تھا انہیں فوراً کہنا چاہئے تھا کہ یہ بہتان عظیم ہے جس طرح کہ حالات سے باخبر شخص کہتا ہے۔ کیونکہ ایمان مدح اور تعظیم کا سبب ہے اور جو طعن کرے یا برا بھلا کہے اس نے جھوٹ بکا اور حقیقت کو بدل دیا اور وہ افتراء یا غیبت کی وجہ سے عاصی اور فاسق ہو گیا اور فاسق کی گواہی مقبول نہیں ہے۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنین کے متعلق حسن ظن رکھنا واجب ہے' اور اس کو چھوڑنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل شرعی ظاہر نہیں ہو جاتی۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝

''(اگر وہ سچے تھے تو) کیوں نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ پس جب وہ پیش نہیں کر سکے گواہ تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں [1]''

[1] جو شخص کسی پر برائی کی تہمت لگائے اور پھر اس پر چار گواہ لے آئے تاکہ مقذوف کو حد لگائی جائے۔ (یہ بھی احتمال ہے کہ رمی سے مراد معاصی سے روکنا ہو) اگر وہ چار گواہ نہ لائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان پر حد شرعی کے قائم کرنے کے علاوہ برائی کی تشہیر کرنا چاہتا ہے' اور وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم اور اس کی شریعت میں جھوٹے ہیں ان پر حد قذف واجب ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے ظرف اولئک هم الكاذبون کے مضمون ومفہوم کے متعلق ہوگی اور معنی یہ ہوگا جب وہ چار گواہ نہ لے آئیں تو ان پر حد قائم کی جائے۔ کیونکہ وہ حکماً جھوٹے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے چار افراد عبد اللہ بن ابی' حسان بن ثابت' مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش کو حد لگائی (1)۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِىْ مَاۤ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''اور اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو پہنچتا تمہیں اس سخن سازی کی وجہ سے سخت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 183 (الفکر)

عذاب ۱۔"

۱۔ یعنی اے میرے نبی پر ایمان لانے والو" اگر تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل واحسان نہ ہوتا" اور اس فضل ورحمت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی' اور نبی کریم ﷺ کی صحبت سے نوازا جو عذاب کے نزول سے مانع ہے نیز اس نے تمہیں مہلت عطا فرمائی اور توبہ کی توفیق بخشی' اسی طرح اگر آخرت میں بھی اس کا فضل اور رحمت نہ ہوتی جیسا کہ اس نے عفو' مغفرت اور جنت کا تم سے خود وعدہ فرمایا ہے' تو تمہیں دنیا وآخرت میں عذاب کی چکی میں پیس دیا جاتا۔ کیونکہ تم نے میرے نبی کی زوجہ کے متعلق غلط بیانی کی ہے اور تہمت لگائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں افاضہ کا معنی اشاعت اور پھیلانا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں خبر مستفیض' یعنی ایسی خبر جو مشہور ہے۔

یعنی یہ فضل الٰہی ہے کہ تم پر عذاب کا کوڑا نہیں برسایا ورنہ جو تم نے بے پرکی اڑانے کی کوشش کی ہے اس کی پاداش میں تم پر عذاب نازل ہو جاتا جیسا کہ قوم عاد' ثمود' لوط اور مؤتفکات کے باشندوں پر عذاب نازل ہوا تھا جس نے دنیا میں ان کا نام ونشان مٹا دیا اور آخرت میں تو ایسا عذاب ہوگا جو بالکل ختم ہی نہ ہوگا اور نہ اس عذاب سے زیادہ تکلیف دہ کوئی عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں مومنین جو اس واقعہ میں ملوث تھے ان کی شان کا ذکر ہے۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ **والذی تولی کبرہ منھم** سے مراد خالص منافق ہیں اور وہ عبداللہ بن ابی اور اس کے دوسرے منافق ہم نوا تھے مثلاً زید بن رفاعہ وغیرہ۔ **لولا** کا لفظ کسی شی کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری شی کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔ پس یہ آیت کریمہ فضل اور رحمت کے پائے جانے کی وجہ سے عذاب کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتی ہے اور **والذی تولی کبرہ** منافقین کے لئے عذاب کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾

"(جب تم ایک دوسرے سے) نقل کرتے تھے اس (بہتان) کو اپنی زبانوں سے ۱۔ اور کہا کرتے تھے اپنے مونہوں سے ایسی بات جس کا تمہیں کوئی علم ہی نہ تھا ۲۔ نیز تم خیال کرتے کہ یہ معمولی بات ہے حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی تھی۔ ۳۔"

۱۔ **اذ** لمسکم یا افضتم کی ظرف ہے' تلقونہ اصل میں تتلقونہ تھا ایک تا کو حذف کیا گیا ہے' تلقونہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ کلبی کہتے ہیں ان میں سے ایک شخص دوسرے شخص تک بات پہنچاتا تھا پھر وہ کہتا مجھے ایسی ایسی بات پہنچی ہے' یعنی اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ ایک دوسرے کو اس طرح بات پہنچاتے تھے (1)۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اس کو روایت کرتے تھے (2)' زجاج کہتے ہیں بعض' دوسروں سے بات نقل کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کو لام کے کسرہ اور قاف کی تخفیف کے ساتھ ولق یلق سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی جھوٹ بولنا ہے (3)۔

۲۔ وہ ایسی بات کرتے ہیں جس کا تعلق صرف ان کی چرب زبانوں سے ہے' خارج میں اس کا کوئی مصداق نہیں ہے' اور اس کا تمہیں بھی کوئی علم نہیں ہے' کیونکہ خارج میں وجود کی فرع علم ہے۔ جب خارج میں اس کا وجود ہی نہیں ہے تو تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 183 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 60 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 183 (الفکر)

۳؎ تم اس اتہام کی تشہیر اور اس میں مداخلت کو معمولی اور آسان بات سمجھتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے اور جو زبانوں سے ابہام وغیرہ صادر ہوتا ہے اس پر عام عذاب ہوتا ہے۔ لیکن ایسا معاملہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی ہتک عزت ہو وہ تو زیادہ عذاب کا مستحق ہے۔

حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں لے جائے اور دوزخ سے دور کردے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے بہت بڑی بات پوچھی ہے۔ یہ کام آسان ہے جس پر اللہ تعالیٰ آسان فرمادے (وہ یہ کام ہے) اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ' نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو' رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ شریف کا حج کرو؟ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہاری نیکی کے ابواب پر راہنمائی نہ کروں؟ (فرمایا) روزہ ڈھال ہے اور صدقہ خطا کو اس طرح ختم کردیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے' اور رات کے جوف میں انسان کا نماز پڑھنا' (یعنی نماز تہجد پڑھنا) پھر آپ ﷺ نے تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ۔۔۔ یَعْمَلُوْنَ ۝ کی آیت تلاوت فرمائی، پھر فرمایا میں تمہاری معاملہ کی اصل، اسکے ستون اور اسکی کوہان کی چوٹی کی طرف راہنمائی نہ کروں میں نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ضرور کرم فرمایئے۔ فرمایا معاملہ کی اصل اسلام ہے' اسکا ستون نماز ہے اور اسکی کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر فرمایا میں تمہیں اس معاملہ کے مدار کے متعلق نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کی حضور ضرور بندہ نوازی فرمایئے۔ آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا اور فرمایا اسکی حفاظت تجھ پر لازم ہے۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم جو کلام کرتے ہیں اس پر بھی ہمارا مؤاخذہ ہوگا۔ فرمایا اے معاذ، تجھ پر تیری ماں روئے' پہلے لوگ اپنے مونہوں کے بل اور اپنے نتھنوں کے بل آگ میں صرف اپنی زبانوں کے کاٹے کیوجہ سے گرے۔ اس حدیث کو امام احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (1)۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝

"اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو تم نے کہہ دیا ہوتا ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم گفتگو کریں اس کے متعلق ۱؎ اے اللہ! تو پاک ہے ۲؎ یہ بہت بڑا بہتان ہے ۳؎"

۱؎ اے مومنو! جب تم نے یہ جھوٹا اور باطل الزام سنا تو تم نے ان کا رد کرتے ہوئے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارے لئے ایسی بات کرنا مناسب اور صحیح نہیں ہے، لو لا اور اس کے فعل کے درمیان ظرف کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے، کیونکہ ظرف میں جو وسعت ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ہوتی اور ظرف کو مقدم کرنے سے مقصود یہ ہے کہ جھوٹی بات سننے کے وقت فوراً تم پر یہ کہنا واجب ہے۔ چونکہ وقت کا ذکر اہم تھا اس لئے اس کو مقدم فرمایا ہے۔ ان نتکلم هذا۔ میں هذا کا اشارہ مخصوص واقعہ کی طرف بھی ہوسکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس کی نوع کی طرف اشارہ ہو۔ حرم رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تعرض نفوس سلیمہ پر بہت سخت اور تکلیف دہ تھا۔ کیونکہ شرعاً کسی بھی محصن عورت پر تہمت لگانا فسق' کوڑوں اور شہادت کے مردود ہوجانے کا موجب ہے۔

۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے اس سے کہ اس کے نبی کی زوجہ (بیوی) فاجرہ ہو' کیونکہ بیوی کا فجور' خاوند کی طرف سب وشتم کو لوٹاتا ہے' اور نبی

1۔ جامع ترمذی مع عارضة الاحوذی، جلد 10، صفحہ 64 (العلمیہ)

کفار کی طرف مبعوث اس لئے کیا گیا ہوتا ہے کہ وہ انہیں دعوت حق دے پس ضروری ہے کہ وہ ایسے عیوب سے پاک ہو جو لوگوں کی نفرت کا سبب بنتے ہوں۔ یہ تو جائز ہے کہ نبی کی بیوی کافرہ ہو جیسا کہ نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویاں کافرہ تھیں۔ لیکن نبی کی بیوی کا فاجرہ ہونا جائز نہیں (کیونکہ یہ چیز لوگوں کی نفرت کا باعث ہوتی ہے) یہ جملہ ماقبل کلام کی تقریر اور ثبوت ہے اور مابعد کی تمہید ہے۔

۳؎ یہ ایسا جھوٹ ہے کہ سننے والا مبہوت ہو جاتا ہے۔ مبہوت علیہ کی عظمت کی وجہ سے یہ بہت بڑا بہتان ہے' کیونکہ جنایات کی حقارت اور جنایات کی بڑائی' اس کے اعتبار سے ہوتی ہے جس پر جنایہ کی گئی ہو۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾

''نصیحت کرتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کہ دوبارہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرنا۱؎ اگر تم ایماندار ہو۔۲؎''

۱؎ وعظ ایسی زجر کو کہتے ہیں جو ڈرانے سے مقترن ہو۔ خلیل کہتے ہیں' بھلائی اور نیکی کی اس طرح نصیحت کرنا کہ اس سے دل پسیج جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں اپنا عذاب یاد دلاتا ہے نیز تمہیں دوبارہ اس قسم کی قبیح بات کرنے اور سننے سے ڈراتا ہے جب تک تم زندہ ہو۔ یا یہ معنی کہ اس قسم کی بات دوبارہ کرنے کو ناپسند کرنے کی وجہ سے تمہیں اس جیسے قول سے منع کرتا ہے اور تمہیں ڈراتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اللہ تمہیں ہمیشہ اس قسم کی بات دوبارہ کرنے سے روکتا ہے (۱)۔ **یعظکم** کا جملہ بہتان عظیم کی صفت ہے یا جملہ معترضہ ہے۔

۲؎ یہ شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے' یعنی اگر تم ایماندار ہو تو نصیحت حاصل کرو اور آئندہ کبھی اس قسم کی بات نہ کرو کیونکہ ایمان ایسی باتوں سے روکتا ہے' جنہوں نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق زبان درازی کی وہ روافض (شیعہ) تھے' مومنین نہیں تھے۔

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾

''اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔۱؎''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ شریعت مطہرہ پر دلالت کرنے والی آیات بڑے کھلے انداز میں بیان فرماتا ہے' یعنی اوامر' نواہی' آداب واخلاق سب بڑے واضح انداز میں بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمام محاسن کو جانتا ہے اس لئے وہ محاسن کا حکم دیتا ہے۔ اور قبائح سے منع فرماتا ہے یا یہ معنی کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت اور اس کی پاکدامنی کو خوب جانتا ہے اور تہمت لگانے والوں کے معاملہ اور ان کے کذب کو بھی خوب جانتا ہے۔ اس کی تدابیر میں حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اپنے نبی کی طرف برائی کی نسبت کو جائز قرار نہیں دیتا اور نہ برائی پرا سے قائم رکھتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

''بیشک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ پھیلے بے حیائی ان لوگوں میں جو ایمان لائے ہیں (تو) ان کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ تعالیٰ (حقیقت کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔۱؎''

1۔ تفسیر بغوی' جلد 4' صفحہ 184 (الفکر)

۱؎ فاحشہ اس برائی کو کہتے ہیں جو انتہائی قبیح ہو۔ فرمایا اے لوگو! اللہ تمہارے نہاں خانہ دل میں اٹھنے والے اسرار کو جانتا ہے حقیقت کو تم نہیں جانتے۔ اس لئے تم پر ظاہر امر کی پیروی کرنا لازم ہے۔ جو تہمت لگائے اور اس کے پاس چار گواہ ہوں تو اس کے متعلق حسن ظن رکھو اور جان لو کہ اس نے زانی کے معاملہ کو حد قائم کرنے کے لئے ظاہر کیا ہے اور دنیا کو شر اور برائی سے پاک کرنے کی نیت سے برائی کا اظہار کیا ہے اور جو تہمت لگائے لیکن اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو جان لو کہ یہ شخص برائی کو ہوا دینا چاہتا ہے، کیونکہ اس کے لئے مقذوف پر حد قائم کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے ایسے شخص کو حد قذف لگاؤ اور وہ اللہ کے نزدیک جھوٹوں میں سے ہے۔ اس پر تہمت لگانے والوں کی حد واجب ہوگی اگرچہ حقیقتاً وہ سچا بھی ہو۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

"اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اسکی رحمت اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان (اور) رحیم ہے۔ (تو تم بھی نہ بچ سکتے)۱؎"

۱؎ اے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے معاملہ میں غور و خوض اور مداخلت کرنے والے مومنو! اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ دنیا میں تمہیں ایسا عذاب دیتا کہ تمہارا نام و نشان تک نہ رہتا اور آخرت میں ابدی آگ کے عذاب میں مبتلا کرتا۔ لیکن اس نے اپنے نبی کی صحبت کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمادی۔ لولا کا جواب حذف کیا گیا ہے کیونکہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے، لیکن تخویف اور امتنان کا ذکر دوبارہ فرمایا تاکہ جرم کی بڑائی اور شدت پر دلالت ہو جائے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ان الذین یحبون الفاحشۃ سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے دوسرے منافق ساتھی ہیں۔ دنیا میں عذاب سے مراد حد قذف ہے اور آخرت کے عذاب سے مراد دائمی عذاب ہے اور ولولا فضل اللہ علیکم سے مراد مسطح، حسان اور حمنہ ہیں (1)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

"اے ایمان والو! نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر اور جو چلتا ہے شیطان کے نقش قدم پر تو وہ حکم دیتا ہے (اپنے پیروؤں کو) بے حیائی کا اور ہر برے کام کا۔ اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تو نہ بچ سکتا تم میں سے کوئی بھی ہرگز ہاں اللہ تعالیٰ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔۱؎"

۱؎ نافع، البزی، ابوعمرو، ابوبکر اور حمزہ نے خطوات کو طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے طاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے طاء کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی برائی کی تشہیر کرنے میں شیطان کے آثار پر نہ چلو۔

فحشاء اس برائی کو کہتے ہیں جو عقلاً اور نقلاً انتہائی قبیح ہو۔ المنکر وہ برائی جسے شرع ناپسند کرے۔ فانہ یامر بالفحشاء۔ کا جملہ شیطان کی اتباع کی نہی کی علت ہے۔ اے مومنو! اگر وہ تمہیں توبہ کی توفیق عطا نہ فرماتا جو گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حدود جو کفارہ گناہ ہوتی ہیں ان کو مشروع فرما کر تم پر فضل نہ فرماتا تو تم میں سے کوئی بھی اس جھوٹے الزام کی معصیت سے پاک نہ ہوتا۔ من احد سے پہلے من زائدہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 184 (الفکر)

ہے اور محل رفع میں ہے۔ لہذا اسے مراد آخر الدہر ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ پر برانگیختہ فرماتا ہے اور توبہ کو قبول فرماتا ہے' وہ ان کے اقوال و مقال کو خوب سننے والا ہے اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

شیخین وغیرہما نے حدیث افک میں روایت کیا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسطح بن اثاثہ پر رشتہ قرابت اور ان کی مفلسی کی وجہ سے ان کی مالی اعانت فرمایا کرتے تھے جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر غلط الزام کا پروپیگنڈا کیا تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں اب کبھی مسطح پر کچھ خرچ نہ کروں گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۲﴾

''اور نہ قسم کھائیں جو برگزیدہ ہیں تم میں سے اور خوشحال ہیں اس بات پر کہ وہ نہ دیں گے رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو[1] اور چاہئے کہ (یہ لوگ) معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہیں اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔[2]''

[1] ولا یاتل باب افتعال ہے اور یہ الالیہ سے مشتق ہے جس کا معنی قسم اٹھانا ہے۔ یالا یاتل کا معنی لاتقصر ہے۔ اس وقت یہ الا لو سے مشتق ہوگا جس کا معنی کم کرنا ہے۔ یہاں قسم والا معنی بہتر ہے کیونکہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قسم اٹھائی تھی اور اسی معنی کی تائید ابو جعفر کی قراءت ولا یتأل بھی کرتی ہے جس میں تا مقدم ہے اور ہمزہ موخر ہے اور باب تفعل کا صیغہ ہے۔ اولوالفضل سے مراد دین میں بزرگی کے حامل لوگ ہیں اور دین میں بزرگی رکھنے والوں کو ہی یہ نہی فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ ان کا مرتبہ اور فضیلت بہت بلند ہے اس لئے انہیں عالی ظرفی اور بلند اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ ورنہ اتنی بڑی اذیت رسانی کے مقابلہ میں مالی اعانت بند کر دینا کوئی غلط کام نہیں تھا۔ اگر ابوالفضل کا معنی دولتمند کیا جائے تو السعتہ سے تکرار لازم آئے گا، کیونکہ السعتہ کا معنی بھی دولتمندی اور خوشحالی ہے۔ منکم کی ضمیر مخاطب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان جیسے دوسرے بلند اخلاق سے مزین افراد ہیں۔ اس آیت کریمہ میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت وشرف پر بڑی واضح دلیل ہے یا یہ معنی کہ تم میں سے صاحب فضل لوگ غریبوں' مسکینوں کی معاونت ترک نہ کریں۔ ان یوتوا سے پہلے علی یا فی محذوف ہے۔ اولی القربیٰ والمساکین والمهاجرین۔ سے مراد مسطح اور ان جیسے دوسرے نادار لوگ ہیں۔ یہ تینوں صفات ایک موصوف کی ہیں، یعنی ایسے لوگ جو ان صفات کے جامع ہیں' یا مختلف موصوفوں کی صفات ہیں' موصوفوں کو حذف کر کے صفات کو ان کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پس یہ مقصود کی علت بیان کرنے کے لئے زیادہ بلیغ اسلوب ہے کیونکہ مسطح مسکین' مہاجر' بدری اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خالہ زاد تھا۔

[2] جو اُن سے فروگذاشت ہوئی ہے اس کو معاف کر دیں اور صرف نظر فرمائیں۔ اے صاحب فضل اور کشادہ دست لوگو! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری فروگزاشتوں کو معاف فرما دے، اس لئے کہ تم دوسروں کو معاف کرتے اور دوسروں پر سے درگزر کرتے ہو اور ان سے احسان کرتے ہو جو تم سے برا سلوک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اتنے حقوق اور نعمتوں کے باوجود اور انتقام پر کامل قدرت رکھنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 366 (قدیمی)

کے باوجود بہت زیادہ پردہ پوشی فرمانے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔ اس لئے تم بھی اخلاق الٰہی سے اپنے آپ کو مزین کرو۔ امام بخاری اور مسلم وغیرہ نے اس واقعہ میں روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا قسم بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے پس آپ نے دوبارہ مسطح پر وہ مالی معاونت جاری فرمادی جو پہلے کیا کرتے تھے اور کہا قسم بخدا میں کبھی اس کی مالی معاونت سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا(1)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واصل وہ نہیں جو بدلے میں رشتہ قائم رکھنے والا ہو بلکہ واصل وہ ہے کہ جب اس سے قطع تعلق کیا جائے تو وہ تعلقات کو بحال رکھے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ ابن عباس اور ضحاک فرماتے ہیں صحابہ کرام میں سے کچھ لوگوں نے قسم اٹھائی تھی، جن میں ابوبکر صدیق بھی تھے کہ وہ کسی ایسے شخص پر صدقہ نہیں کریں گے جس نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق کوئی نازیبا بات کی ہے اور نہ ایسے لوگوں کو کوئی منفعت پہنچائیں گے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾

"جو لوگ تہمت لگاتے ہیں پاکدامن عورتوں پر جو انجان ہیں، ایمان والیاں ہیں، ان پر پھٹکار ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔ ل"

ل غافلات سے مراد ایسی پاک طینت عورتیں ہیں جو طبعاً اتنی صالح اور نیک ہوتی ہیں کہ ان کے دلوں میں برائی کے تصور کا بھی گزر نہیں ہوتا۔ فرمایا جو پاکدامن، برائی کے تصور سے بھی ناواقف اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والی عورتوں پر تہمت لگائیں گے دنیا و آخرت میں ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور انہیں دردناک عذاب، یعنی جہنم کی آگ میں مبتلا کیا جائیگا۔ یہ حکم ہر اس تہمت لگانے والے کیلئے ہے جو ایسی عورت پر تہمت لگائے جو پاکدامن ہو، مومنہ ہو اور غافلہ ہو۔ اور اس سے پہلا ارشاد وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ الآیۃ ہر اس تہمت لگانے والے کا حکم ہے جو کسی محصنہ پر تہمت لگائے خواہ وہ غافلہ ہو یا نہ ہو، پس کوڑے شہادت کی عدم قبولیت پر قاذف کے لئے ہے خواہ وہ اپنے الزام میں سچا ہو یا جھوٹا ہو جبکہ اس کے پاس گواہ نہ ہوں اور لعنت اس قاذف کے ساتھ مختص ہے جو جھوٹا ہو کیونکہ مقذوفہ اس افتراء سے بھی غافل ہے، اس لئے ایسی عورت پر تہمت لگانے والے کا جرم بہت بڑا ہے۔ لیکن یہ کفر کو مستلزم نہیں ہے کیونکہ لعنت کا مستحق تو بعض گناہ کبیرہ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں لیکن ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جاتا جیسے جان بوجھ کر قتل کرنے پر لعنت تو ہے لیکن کافر نہیں ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں یہ حکم عبداللہ بن ابی کے ساتھ خاص ہے اور اس کا مطمع نظر یہ ہے کہ لعنت کفار کے ساتھ مختص ہے(4)۔

طبرانی نے حضرت خصیف سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے سعید بن جبیر سے عرض کی زنا اور قذف میں سے کون سا جرم سخت ہے؟ انہوں نے فرمایا زنا۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا یہ ارشاد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ خاص ہے(5)۔ اس اثر کی سند میں یحییٰ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 698 (وزارت تعلیم)   2۔ ایضاً، صفحہ 886   3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 186 (الفکر)
4۔ ایضاً   5۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 23، صفحہ 151 (التراث الاسلامی)

الحمانی ضعیف راوی ہے امام بغوی نے بھی اسی طرح نصیف سے نقل کیا ہے۔ عوام بن حوشب عن شیخ من بنی کاھل عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے۔ اس آیت میں توبہ کا ذکر نہیں ہے اور جس نے کسی دوسری مومنہ عورت پر تہمت لگائی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے پھر یہ آیت پڑھی وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ...... اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا۔ ان لوگوں کے لئے توبہ کا موقع ہے۔ لیکن ازواج مطہرات پر تہمت لگانے والے کیلئے توبہ کا کوئی موقع نہیں ہے(1)۔

طبرانی نے ضحاک بن مزاحم سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے(2)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی پھر یہ حکم جاری رہا حتیٰ کہ اس سورت کی پہلی آیت وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ...... فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ نازل ہوئی پس اللہ تعالیٰ نے کوڑوں اور توبہ کا حکم بعد میں نازل فرمایا۔

میں کہتا ہوں ان اقوال کی بنیاد دو امور پر ہے۔ 1۔ اس آیت کے نزول کا سبب قصہ افک تھا۔ 2۔ کفر کے علاوہ کسی گناہ پر لعنت نہیں کی جاتی لیکن سبب کا خصوص آیت کے عموم کی تخصیص کا متقضی نہیں ہے اور اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے۔ اور لعنت بعض گناہ کبیرہ پر بھی وارد ہے۔ جیسے عمداً کسی کو قتل کرنا۔ اور اس آیت میں توبہ اور مغفرت کا ذکر نہ ہونا مطلقاً عدم مغفرت اور توجہ کی عدم مقبولیت کا متقضی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔

پس آیت کے عموم کو خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے واللہ اعلم۔

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

''وہ یاد کریں اس دن کو جب گواہی دیں گی ان کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان اعمال پر جو وہ کیا کرتے تھے۔ 1''

1۔ حمزہ اور کسائی نے یشھد، یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ فعل مقدم ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ظرف 'لھم' میں جو استقرار کا معنی ہے اس کے متعلق ہے عذاب کے متعلق نہیں ہے کیونکہ وہ موصوف ہے (جبکہ مصدر موصوف عمل نہیں کرتا)

ابن جریر، ابن ابی حاتم نے موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز مومن کو حساب کے لئے بلایا جائے گا' اس کا رب بندے پر اس کے اعمال پیش فرمائے گا، بندہ ہر عمل کا اعتراف کرے گا اور کہے گا اے میرے رب میں نے یہ عمل بھی کیا یہ عمل بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرمادیں گے اور اس کے گناہوں پر پردہ فرمائیں گے فرمایا سطح زمین پر کوئی مخلوق ان گناہوں میں سے کچھ بھی نہ دیکھے گی۔ پھر اس کی نیکیاں ظاہر ہوں گی۔ ان کو تمام لوگ دیکھیں گے۔ کافر اور منافق کو حساب کے لئے بلایا جائے گا۔ اس پر اس کا رب اعمال پیش کرے گا تو وہ انکار کرے گا اور کہے گا اے رب، تیری عزت کی قسم اس فرشتہ نے یہ عمل مجھ پر ویسے لکھ دیا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 186 (الفکر) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 23، صفحہ 152 (التراث الاسلامی)

میں نے یہ عمل (گناہ) ہرگز نہیں کیا۔ فرشتہ کہے گا کیا تو نے یہ کام (گناہ) فلاں دن' فلاں جگہ نہیں کیا تھا؟ وہ کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے بالکل نہیں کیا۔ جب وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا ابو موسیٰ فرماتے ہیں میرا گمان ہے کہ سب سے پہلے دائیں ران بولے گی پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ الآیۃ(1)۔

ابو یعلیٰ اور حاکم نے ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضور ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ احمد نے جید سند کے ساتھ اور طبرانی نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس دن مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اس دن سب سے پہلے جو انسان کی ہڈی بولے گی وہ بائیں ٹانگ کی ران ہوگی(2)۔

احمد' نسائی' حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن جیدہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ قیامت کے دن آئیں گے تو ان کے منہ بند ہوں گے' اور سب سے پہلے انسان کی ران اور ہتھیلی بات کرے گی(3)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے جو کتاب الزہد میں ہے' اس حدیث میں ہے کہ انسان کی ران' اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے عمل کے متعلق بولیں گی کہ یہ وہ منافق ہے جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا تشہد علیہم السنتھم۔ (یعنی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ (جس دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگائیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے گفتگو کریں گے) ان دونوں ارشاد میں تطبیق کیا ہے؟ جو کہتے ہیں نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے نہیں بول سکیں گے اور یہ زبانوں کی بغیر اختیار کے ان کے خلاف شہادت دینے کے منافی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں اعضاء اس شخص کے خلاف گواہی دیں گے جو اپنے نامہ اعمال کو پڑھے گا لیکن اس میں درج گناہوں کا اعتراف نہیں کرے گا بلکہ صاف انکاری ہو جائے گا اور اپنی صفائی میں جھگڑے گا' پس اس کے ظاہری اعضاء اس کے گناہوں کی گواہی دیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ سابقہ آیت عبد اللہ بن ابی کے متعلق اتری ہے جیسا کہ قتادہ کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ وَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ ﴿۲۵﴾

"اس روز پورا پورا دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ جس کے وہ حقدار ہیں 1؎ اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہر بات واضح کرنے والا ہے۔ 2؎"

1؎ دین سے مراد وہ جزاء ہے جو ان کی بد اعمالیوں کے باعث ان پر واجب ہو چکی ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں' دین سے مراد ان کا عادلانہ حساب ہے۔

2؎ اللہ تعالیٰ بذات خود موجود ہے' تمام جواہر و اعراض کا موجد ہے۔ تمام حقائق کو قائم فرمانے والا ہے' گویا تمام موجودات اس کے وجود کے ظلال ہیں وہ جو قائم ہے اور اسکی الوہیت ظاہر ہے۔ اس صفت الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس کے علاوہ کوئی ثواب عطا کرنے اور عتاب دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ اس کا عدل ظاہر ہے۔ یا یہ معنی کہ جس کا اس نے دنیا میں ان سے وعدہ فرمایا ہے اس کو ظاہر فرمانے والا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں عبد اللہ بن ابی دین میں شک کرتا تھا' پس وہ قیامت کے روز جان

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 503 (العلمیۃ) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 151 (صادر) 3۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 375 (التراث الاسلامی)

لے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک فیصلہ فرمانے والا ہے اور ہر بات واضح کرنے والا ہے(1)۔
میں کہتا ہوں شاید ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کی یہ مراد ہو کہ لوگ، خصوصاً کفار یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ کا موہوم وجود ہے۔ اسی وجہ سے وہ حوادث کو زمانہ یا ستاروں یا اس جیسی دوسری چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور وہ نفع اور نقصان بندوں کی طرف سے تصور کرتے ہیں اور وہ دنیا کے بادشاہوں سے جس طرح ڈرتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو جس کا وہ تصور نہیں کرتے وہ بھی ان کے لئے ظاہر ہو جائے گا اور وہ یہ بھی جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی الحق المبین ہے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

''ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے ہیں اور پاک (دامن) عورتیں پاک (دامن) مردوں کے لئے اور پاک (دامن) مرد پاک (دامن) عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ مبرا ہیں ان (تہمتوں) سے جو وہ (ناپاک) لگاتے ہیں لے ان کے لئے ہی (اللہ کی) بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔ لے''

لے اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ الخبیثات سے مراد ایسی عورتیں ہیں جو کلمات مذمت، تحقیر اور سب وشتم کی اہل ہیں، ایسی عورتوں کے مستحق مردوں میں سے خبیث مرد ہیں اور الخبیثون سے مراد ایسے مرد ہیں جو مذمت وتحقیر کے لائق ہیں۔ اور طیبات سے مراد ایسی پاک باز عورتیں ہیں جو کلمات مدح وثنا اور دعا کی مستحق ہیں۔ ان نیک بیبیوں کے مستحق پاک باز مرد ہیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ثنا، صلوۃ وسلام اور دعا کی مستحق ہیں جو ان پر کذب بیانی اور الزام تراشی کی گئی ان کی شان رفیع کے مناسب قطعاً نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان جیسی اور پاکدامن عورتیں مبرا اور منزہ ہیں ان جھوٹی تہمتوں سے جو وہ ناپاک لوگ لگاتے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں الخبیثات سے مراد کلمہ کفر، کذب، سب صحابہ اور سب اہل بیت اور محصنات پر قذف اور اس جیسے دوسرے غلط کلمات کی عادی عورتیں ہیں، ایسی عورتیں مردوں میں سے خبیث مردوں کے لئے ہیں۔ جیسے عبداللہ بن ابی وغیرہ۔ طیبون، ایسے کلمات سے پاک ہوتے ہیں اور الخبیثون ان خبیث کلمات کے لئے پیدا کئے گئے ہوتے ہیں۔ الطیبات من الکلمات سے مراد ذکر الٰہی تلاوت قرآن نبی کریم ﷺ پر اہل بیت اطہار پر درود وسلام، مومنین کے لئے دعا ومغفرت کرنے والی عورتیں ہیں اور ایسی عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں، پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی پاکیزہ لوگ ان تہمتوں سے مبرا ہیں جو کاذب اور جھوٹے لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ تہمت لگانے والوں کے لئے مذمت ہے اور ان لوگوں کی مدح ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بری فرمایا ہے۔

ابن زید فرماتے ہیں غالب طور پر خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔ یعنی یہ اغلب اصول ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا طیبہ طاہرہ تھیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاک اور طاہر نبی ﷺ کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا طیبہ طاہرہ، عفیفہ نہ ہوتیں تو نبی کریم ﷺ کی مصاحبت کے لئے یقیناً ان کا انتخاب نہ ہوتا گویا یہ آیت کریمہ غلط بیانی کرنے والوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر)

کے جھوٹ پر ایک دلیل کے قائم مقام ہے۔

ہند بن ابی ہالہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میرے لئے صرف اہل جنت سے ازدواج کو پسند فرماتے ہیں باقی سب کا انکار فرماتے ہیں(1)۔اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہ اور ان جیسی اور پاکیزہ ہستیوں کے لئے گناہوں کی بخشش اور جنت ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا چند چیزوں پر فخر ومباہات فرماتی تھیں جو ان کے علاوہ کسی اور عورت کو نہیں ملی تھیں۔1۔ جبرئیل امین ان کی صورت ایک ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر لے آئے اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یہ جناب کی زوجہ محترمہ ہے(2)۔ میں کہتا ہوں ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے اور روایت ہے کہ جبرئیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صورت اپنے ہاتھ میں لائے تھے۔2۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ کسی باکرہ عورت سے نکاح نہیں فرمایا تھا۔3۔ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں تھا۔4۔ حضور ﷺ آپ کے حجرہ میں مدفون ہیں۔5۔ آپ ﷺ پر وحی کا نزول ہوتا جبکہ آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ لحاف میں ہوتے تھے۔6۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت آسمان سے نازل ہوئی۔7۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کی صاحبزادی تھیں۔8۔ آپ صدیقہ طیبہ تھیں۔9۔ آپ کے لئے مغفرۃ اور رزق کریم تیار کیا گیا ہے۔ حضرت مسروق جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے تو اس طرح کہتے مجھے صدیقہ، صدیق کی صاحبزادی، رسول کریم ﷺ کی محبوبہ، جن کی براءت آسمان سے نازل ہوئی انہوں نے مجھے بیان کیا(3)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر تم قرآن کی وعیدات کی تفتیش کرو تو جتنی سخت وعید حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق کذب پر نازل ہوئی ہے، ایسی سخت وعید اور کہیں نہیں ہے(4)۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ مجھے تو تین راتیں خواب میں دکھائی گئی، فرشتہ تمہیں ایک قیمتی ریشم میں لے کر آیا اور کہا یہ آپ کی زوجہ محترمہ ہے میں نے تیرے چہرہ سے کپڑا اٹھایا تو، تو سامنے تھی۔ میں نے کہا اگر یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا کرے گا(5) اور صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہی مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ یہ جبرئیل ہے آپ کو سلام کہتا ہے میں نے کہا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ۔ فرمایا آپ وہ دیکھتے جو میں نہیں دیکھتی تھی(6)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں لوگ اس دن تحفے اور ہدایا پیش کرنے کی کوشش کرتے جس دن حضور ﷺ نے میرے پاس رات گزارنی ہوتی اور اس سے ان کا مقصود رسول اللہ ﷺ کی رضا حاصل کرنا ہوتا تھا۔ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات جو دو گروپوں میں تھیں ایک گروپ میں حضرت عائشہ، حفصہ، صفیہ اور سودہ تھیں اور دوسرے گروپ میں ام سلمہ اور دوسری ازواج مطہرات تھیں۔ حضرت ام سلمہ کے گروپ نے حضرت ام سلمہ سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے عرض کرو کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ جس نے ہدیہ دینا ہو وہ وہاں ہی پہنچا دیا کرے جہاں آپ ﷺ موجود ہوں۔ حضرت ام سلمہ نے یہی بات جب حضور ﷺ سے عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم مجھے (حضرت) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے

1۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 413 (التراث الاسلامی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر) 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 31 (الفکر) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 285 (قدیمی) 6۔ ایضاً، صفحہ 287

متعلق تکلیف نہ دو کیونکہ میرے پاس کسی بیوی کے لحاف میں وحی نہیں آتی سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لحاف کے۔ام سلمہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں نے جو آپ کو تکلیف دی ہے اس کی میں اللہ کی جناب میں توبہ کرتی ہوں۔پھر حضرت ام سلمہ کے گروہ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بلایا اور انہیں حضور ﷺ کے پاس بھیجا' حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب یہ بات عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے میری بیٹی! کیا تو اس سے محبت نہیں کرتی جس سے میں محبت کرتا ہوں؟۔ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا پھر اس (عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے محبت کر۔(متفق علیہ)(1)۔صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دوسری عورتوں پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح ثرید کی کھانے پر فضیلت ہے۔ابوموسیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں جب بھی ہم حضور ﷺ کے صحابہ کو کوئی حدیث میں مشکل پیش آئی تو ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا' آپ کو اس کا علم ہوتا تھا۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔حضرت موسیٰ بن طلحہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے کبھی کسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ فصیح نہیں دیکھا۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(3)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے چار افراد کی چار چیزوں سے براءت فرمائی۔حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت اہل زلیخا سے ایک شیرخوار بچے کے ذریعے۔2۔موسیٰ علیہ السلام کی یہودیوں کے الزام سے براءت فرمائی ایک پتھر کے ذریعے جو آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا۔اور حضرت مریم کی براءت فرمائی ان کے صاحبزادے کے ذریعے۔اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت فرمائی ان آیات کے ذریعے جن میں حد درجہ مبالغہ ہے۔اور سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے منصب رفیع کے اظہار اور آپ کے مقام کی بلندی کے بیان کے لئے فرمایا(4)۔میں کہتا ہوں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں مقام و مرتبہ تھا اس کے اظہار کے لئے اتنی آیات نازل فرمائیں۔واللہ اعلم۔

الفریابی اور ابن جریر نے عدی بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ ایک انصاری عورت حاضر ہوئی اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں اپنے گھر میں ایسی حالت میں ہوتی ہوں کہ میں پسند نہیں کرتی کہ مجھے کوئی اس حالت میں دیکھے' میرے گھر والوں میں کوئی شخص آ جاتا ہے جبکہ میں اس حالت میں ہوتی ہوں۔تو میں کیا کروں؟ اسوقت درج ذیل آیت نازل ہوئی۔(5)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو (دوسروں کے) گھروں میں اپنے گھروں کے سوا' جب تک تم اجازت نہ لے لو [1] اور سلام نہ کرلو ان گھروں میں رہنے والوں پر [2]۔ یہی بہتر ہے تمہارے لئے شاید تم (اس کی حکمتوں میں) غور و فکر کرو [3]''

[1] بیوتکم میں اضافت ملک کیلئے نہیں ہے کیونکہ اجرت پر مکان دینے والا اور عاریۃً مکان دینے والا بھی رہائشی کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔تستانسوا کا معنی تستاذنوا ہے' اسکی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قرأت سے ہوتی ہے کہ وہ حتی

1۔صحیح مسلم،جلد2،صفحہ 287 (قدیمی) 2۔جامع ترمذی،جلد2،صفحہ 228 (وزارت تعلیم) 3۔ایضاً
4۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب،جلد7،صفحہ 34 (الفکر) 5۔تفسیر طبری،جلد18،صفحہ 87

تستاذنوا پڑھتے تھے۔ اسی طرح ابی بن کعب بھی تستاذنوا پڑھتے تھے(1)۔ انس کا لغوی معنی وحشت کی ضد، دیکھنا، محسوس کرنا اور جاننا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت سورہ بن اخی ابی ایوب سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! یہ تو سلام ہے استیناس کیا ہے فرمایا، انسان سبحان اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ کہے اور کھنگھارے تا کہ گھر والے مطلع ہو جائیں(2)۔ قاموس میں ان کے وہ تمام معنی لکھے ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں(3)۔ الخلیل کہتے ہیں الا ستیناس کا معنی استبصار ہے، اسی سے انست نارا ہے، یعنی میں نے آگ دیکھی(4) یہاں استیذان کو استیناس سے تعبیر فرمایا کیونکہ مستاذن (اجازت طلب کرنے والا) خوفزدہ ہوتا ہے کہ شاید اجازت نہ ملے۔ لیکن جب اجازت مل جاتی ہے تو وہ مانوس ہو جاتا ہے، کیونکہ مستاذن (اجازت طلب کرنے والا) حالت معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہ پتہ لگانا چاہتا ہے کہ اس کو داخلہ کی اجازت ہے یا نہیں۔ یا الانس سے استفعال ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا اندر کوئی انسان ہے یا نہیں۔

2۔ گھر والوں پر سلام کرو یعنی السلام علیکم کہو۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بیٹے، جب تو اپنے گھر والوں کے پاس جائے تو سلام کر (اس عمل سے) تجھ پر اور تیرے گھر والوں پر برکت ہو گی اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(5)۔

علماء کا اختلاف ہے کہ پہلے اجازت طلب کرے یا پہلے سلام کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلے اجازت طلب کرے کیونکہ آیت میں یہ مقدم ہے لیکن مقدم ہونا یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ واؤ مطلق جمع کے لئے آتی ہے اس میں ترتیب کا لحاظ نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں حتی تسلموا علی اھلھا و استاذنوا ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ سلام کو مقدم کرے کیونکہ کلدہ بن حنبل فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو میں نے نہ سلام کیا اور نہ اجازت طلب کی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا واپس جاؤ اور کہو السلام علیکم کیا میں اندر آ جاؤں۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے(6)۔

حضرت جابر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو پہلے سلام نہ کرے اسے اجازت نہ دو۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے(7) علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے اجازت طلب کی اور کہا کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔ ابن عمر نے فرمایا نہیں۔ آنے والے کو کسی نے کہا سلام کرو اس نے سلام کیا تو اسے اجازت مل گئی۔

بعض علماء فرماتے ہیں اگر انسان پر نظر پڑ جائے تو سلام پہلے کرے ورنہ اجازت پہلے طلب کرے اور پھر سلام کرے(8)۔ ابوموسیٰ اشعری اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی محارم عورتوں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کرتے تھے(9) حضرت حسن حضرت عطاء بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کروں؟ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا میں گھر میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان سے بھی اجازت طلب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 69 (العلمیۃ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 730 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (الفکر)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 95 (وزارت تعلیم)
6۔ ایضاً، 96
7۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 188 (الفکر)
8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (الفکر)
9۔ ایضاً

کر۔ اس آدمی نے کہا میں اپنی والدہ کا خادم ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اس کے پاس جاتے وقت اجازت طلب کر۔ کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اسے برہنہ دیکھے؟ اس آدمی نے عرض کی نہیں۔ فرمایا پھر اس سے اجازت طلب کر۔ امام مالک نے اس حدیث کو مرسلاً روایت کیا ہے (1)۔

مسئلہ: جب کسی شخص کو بلایا جائے اور وہ بلانے والے کے ساتھ آئے تو اسے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو بلایا جائے اور وہ بلانے والے کے ساتھ آئے تو یہی اس کے لئے اذن ہے۔ (دوبارہ اذن طلب کرنے کی ضرورت نہیں) اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

لے اجازت طلب کرنا اور سلام کرنا، اچانک داخل ہونے اور زمانہ جاہلیت کے سلام سے بہتر ہے، عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم زمانہ جاہلیت میں یہ کہتے تھے انعم اللہ بک عیناً وانعم صباحاً جب اسلام کا سنہری دور آیا تو ہمیں اس سے منع کر دیا گیا۔ اس روایت کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے (3)۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى یُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ قِیْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۲۸﴾

”پھر اگر نہ پاؤ ان گھروں میں کسی کو (جو تمہیں اجازت دے) تو نہ داخل ہو ان میں یہاں تک کہ اجازت دی جائے تمہیں۔ لے اور اگر کہا جائے تمہیں کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جاؤ۔ یہ (طرز معاشرت) بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔ ۲ے“

لے فیہا کی ضمیر کا مرجع البیوت ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسروں کے گھر میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمہیں اندر آنے کی اجازت نہ مل جائے۔ دخول سے مانع صرف شرمگاہ اور مستورات پر اطلاع نہیں ہے بلکہ ایسے امور بھی ہو سکتے ہیں جو انسان دوسروں سے چھپاتا ہے، بغیر اجازت کسی کی ملکیت میں تصرف ممنوع ہے۔ لیکن چند حالات مستثنیٰ ہیں مثلاً کسی کے گھر آگ لگ جائے یا سیلاب آ جائے یا کوئی دوسری آفت ومصیبت آ جائے۔

۲ے اگر تم کو اجازت نہیں ملی اور یہ کہا گیا کہ واپس لوٹ جاؤ تو داخل ہونے پر اصرار نہ کرو، تمہارا واپس چلے جانا تمہارے داخلہ پر اصرار سے بہتر ہے۔ دروازے پر کھڑے رہنے سے بھی واپس لوٹ جانا بہتر اور مناسب ہے، کیونکہ کسی کے دروازے پر کھڑا ہونا مکروہ ہے اور مروت کے خلاف ہے۔ تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد اگر گھر کا مالک اجازت نہ دے تو واپس لوٹ جانا حدیث نبوی ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری فرماتے ہیں، ایک دفعہ ابوموسیٰ ہمارے پاس آئے اور کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے بلا بھیجا، میں ان کے دروازہ پر پہنچا تین مرتبہ سلام کیا لیکن مجھے سلام کا جواب نہ ملا میں واپس لوٹ گیا۔ حضرت عمر نے کہا تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے؟ میں نے کہا میں آیا تھا اور تمہارے دروازہ پر تین مرتبہ سلام کیا تھا لیکن جواب نہیں ملا تو میں واپس لوٹ گیا تھا کیونکہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب تم میں کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو اسے (کبیدہ خاطر اور پریشان) ہوئے بغیر واپس لوٹ جانا چاہئے، حضرت عمر نے فرمایا اس حدیث پر دلیل پیش کرو، ابوسعید فرماتے ہیں میں اٹھا اور

1۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 936 (التراث العربی)　2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 349 (وزارت تعلیم)　3۔ ایضاً، صفحہ 353

ان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور اس حدیث کی گواہی دی۔ متفق علیہ (1) حضرت ابوایوب الانصاری سے مرفوعاً مروی ہے کہ تسلیم یہ ہے کہ آنے والا کہے السلام علیکم۔ کیا میں داخل ہوسکتا ہوں؟ یہ تین مرتبہ کہے، پھر اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جائے ورنہ واپس لوٹ آئے (2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں بشر بن سعید نے ابوسعید الخدری سے یہی حدیث روایت کی ہے، جس میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو وہ واپس لوٹ جائے۔ (3) حضرت حسن فرماتے ہیں پہلی مرتبہ اجازت طلب کرنا اعلام (آگاہ کرنا) ہے، دوسری مرتبہ مشاورت ہے اور تیسری مرتبہ واپس جانے کی اجازت طلب کرنا ہے (4) حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز سعد بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور اجازت طلب کرنے کے لئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ، سعد نے کہا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ، لیکن حضرت نبی کریم ﷺ نے ان کی آواز نہ سنی حتیٰ کہ تین مرتبہ حضور نے سلام کیا انہوں نے تین مرتبہ جواب دیا لیکن اتنی مدہم آواز میں جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے ان کی آواز نہ سنی، آپ ﷺ واپس تشریف لے جانے لگے تو سعد دوڑتے ہوئے پیچھے سے آئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بابی انت و امی، آپ نے جتنی مرتبہ سلام کیا میں نے سن لیا تھا اور میں نے جواب بھی دیا تھا لیکن میں آہستہ جواب دیتا رہا تا کہ آپ مجھ پر کثرت سے سلام اور برکت بھیجتے رہیں، پھر گھر میں داخل ہوئے، تو حضرت سعد نے زبیب پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ پھر جب آپ ﷺ کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا تمہارے کھانے کو نیکوکار کھائیں اور فرشتے تم پر صلوٰۃ پڑھیں اور روزہ دار تمہارے پاس افطار کریں۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے (5)۔

مسئلہ: جب کوئی شخص کسی دوسرے کے دروازے پر آئے اور اجازت طلب نہ کرے بلکہ دروازے پر منتظر بیٹھا رہے تا کہ خود ہی گھر کا مالک باہر آئے اور اپنی حاجت پیش کروں تو ایسا کرنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک انصاری کے دروازے پر طلب حدیث کے لئے تشریف لاتے تو دروازہ پر بیٹھ جاتے تا کہ وہ خود بھی باہر تشریف لائے، اجازت طلب نہ کرتے تھے۔ وہ انصاری باہر نکلتے تو کہتے اے اللہ کے رسول کے چچا کے صاحبزادے کاش آپ مجھے بتادیتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہمیں اسی طرح ادب سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس عمل پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ تشریف لاتے انکے پاس تو ان (کے بہت بہتر ہوتا)

مسئلہ: کوئی شخص کسی کے دروازہ پر اجازت طلب کرنے کے لئے کھڑا ہو تو بالکل دروازہ کے سامنے کھڑا نہ ہو، جبکہ دروازہ پر کوئی پردہ لٹکا ہوا نہ ہو۔ اور نہ ہی دروازہ کی درازوں میں جھانکے جبکہ وہ بند ہو۔ کیونکہ عبداللہ بن بسر کی حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی قوم کے دروازہ پر تشریف لاتے تو دروازہ کے سامنے کھڑا نہ ہوتے بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور کہتے السلام علیکم السلام علیکم۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دروازوں پر پردے نہیں ہوتے تھے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت سہل بن سعد الساعدی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو حجرہ کے پردہ سے جھانک کر دیکھا اور نبی کریم ﷺ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 210 (قدیمی)　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 36 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 189 (الفکر)　4۔ ایضاً
5۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 2486 (ابن حزم)　6۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 349 (وزارت تعلیم)

کے ہاتھ میں لوہے یا لکڑی کی دندانے دار کنگھی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو میں کنگھی اس کی آنکھوں میں چبھو دیتا۔ جھانکنے سے روکنے کے لئے تو اجازت طلب کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص بغیر اجازت تم پر جھانکے اور تو کسی کنکری سے آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور بخاری مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان سے روایت کیا ہے کہ جب گھروں میں جانے سے پہلے اجازت طلب کرنے کی آیت نازل ہوئی تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قریش کے تجار جو مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور شام کے درمیان آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کی رہائش راستوں پر بنے ہوئے مہمان خانوں میں ہے تو پھر وہ کیسے اجازت طلب کریں اور سلام کریں؟ جبکہ ان گھروں میں کوئی رہنے والا نہیں ہوتا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا(3)۔

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

"کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم داخل ہوا یسے گھروں میں جن میں کوئی آباد نہیں۔ جن میں تمہارا سامان رکھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔"

۱۔ ان تدخلوا سے پہلے فی محذوف ہے اور جناح کے متعلق ہے کیونکہ اس کے ضمن میں مواخذہ کا معنی ہے، یا یہ علیکم کے متعلق ہے۔ لکم بیوتاً سے حال ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں ان بیوت (گھروں) کے متعلق اختلاف ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد سرائیں اور وہ مہمان خانے اور ہوٹل ہیں جو مسافروں کے لئے بنائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان میں ٹھہریں اور اپنا سامان وغیرہ رکھیں۔ ایسے مکانوں میں بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے اور ان میں منفعت سے مراد ان میں ٹھہرنا، سامان رکھنا، سردی گرمی سے بچاؤ کرنا وغیرہ ہے(4)۔ ابن زید کہتے ہیں ان بیوت سے مراد تاجروں کے گھر اور دکانیں ہیں جو بازاروں میں ہوتی ہیں۔ لوگ ان میں خرید و فروخت کے لئے آتے جاتے ہیں اور یہی منفعت مراد ہے۔(5) ابراہیم النخعی فرماتے ہیں بازار کی دکانوں میں جاتے وقت اجازت طلب کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ابن سیرین جب بازار میں کسی دکان پر آتے تو کہتے السلام علیکم ءادخل؟ (کیا اندر آسکتا ہوں) پھر داخل ہوئے(6) عطاء فرماتے ہیں۔ اس آیت میں بیوت سے مراد غیر آباد مکان ہیں اور ان میں منفعت سے مراد قضاء حاجت کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ تمام گھر مراد ہیں جہاں کوئی نہیں رہتا کیونکہ اجازت طلب کرنے کا حکم اس لئے ہے تاکہ کسی کی نگاہ کسی دوسرے کی شرمگاہ پر نہ پڑے پس جب یہ خوف اور اندیشہ نہ ہو تو بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے(7)۔

۲۔ یہ ارشاد اس شخص کے لئے وعید ہے جو فساد کی خاطر یا لوگوں کی پوشیدہ چیزوں پر آگاہی کے لئے داخل ہوتا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ۝۳۰

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 190 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 212 (قدیمی) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 72 (العلمیۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 190 (الفکر) 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً، صفحہ 191

"آپ حکم دیجئے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی نگاہیں ۱؎ اور حفاظت کریں اپنی شرمگاہوں کی ۲؎ یہ (طریقہ) بہت پاکیزہ ہے ان کے لئے ۳؎ بیشک اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے ان کاموں پر جو وہ کیا کرتے ہیں ۴؎"

۱؎ اس کی طرف سے آنکھ بند کرو جس کی طرف تمہارا آنکھ بھر کر دیکھنا حلال نہیں ہے۔ حضرت حسن سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے دیکھنے والے اور جس کی طرف دیکھا گیا ہے' دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (یعنی غیر محرم عورت کی طرف شہوت کے ساتھ دیکھنے والے اور جو اس انداز میں بے پردہ نکلی کہ اس کی طرف نظر کی گئی ہے تو دونوں پر اللہ کی پھٹکار ہے)

اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے(1)۔

یغضوا 'لام کے حذف کے ساتھ امر کا صیغہ ہے' اور اخفش کے قول کے مطابق من زائدہ ہے۔ کیونکہ اخفش کے نزدیک موجب کلام میں من کا زائدہ ہونا جائز ہے اور سیبویہ کے نزدیک من تبعیضیہ ہے کیونکہ مومنین کو مطلقاً آنکھیں بند کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس چیز سے آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی طرف نظر بھر کر دیکھنا حلال نہیں ہے بلکہ دوسری نظر منع ہے جو بالارادہ ہو' پہلی نظر جو بالارادہ نہ ہو وہ منع نہیں ہے کیونکہ حدیث بریدہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا اے علی! یکے بعد دیگرے کسی غیر محرم کو نہ دیکھو (کیونکہ اچانک کسی نامحرم پر نظر پڑ جائے تو معاف ہے لیکن اگر دوبارہ دانستہ اس کی طرف دیکھے گا تو گنہگار ہوگا) پہلی نظر تیرے لئے معاف ہے لیکن دوسری معاف نہیں۔ اس حدیث کو امام احمد' ترمذی' ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت جریر بن عبداللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے غیر محرم پر اچانک پڑ جانے والی نظر کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ اپنی نظر کو پھیر لو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا(3)۔ حضرت ابی امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جو مسلمان کسی عورت کے محاسن کو پہلی مرتبہ دیکھے پھر ان کو نیچی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے عبادت پیدا فرمائے گا وہ شخص اس کی حلاوت محسوس کرے گا۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے(4)۔

۲؎ اس آیت کریمہ میں مومنین کے لئے دوسرا حکم یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن اپنی بیوی اور لونڈی کے پاس جاتے وقت شرمگاہ کھولنے کی اجازت ہے۔ استثناء بالضرورۃ عقلاً او نقلاً معلوم تھا۔ اس لئے لفظاً حذف کیا گیا۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں قرآن حکیم میں جہاں بھی حفظ فروج کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد زنا اور حرام سے بچنا ہے لیکن یہاں اس سے مراد ستر پوشی ہے تا کہ ان پر نظر نہ پڑے(5) بہز بن حکیم بن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کر مگر اپنی زوجہ اور اپنی لونڈی کے پاس جاتے وقت کھولنے کی اجازت ہے۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! جب انسان اکیلا ہو تو اس کے متعلق کیا حکم ہے تو فرمایا اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ (یعنی تنہا بھی ستر بلا ضرورت نہیں کھولنا چاہئے) اس حدیث کو ترمذی' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(6)۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا برہنہ ہونے سے بچو کیونکہ سوائے پائخانہ اور بیوی سے صحبت کے وقت کے ہر وقت تمہارے ساتھ دو (فرشتے) ہوتے ہیں جو

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 162 (العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 101 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 212 (قدیمی)
4۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 264 (صادر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (الفکر) 6۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 103 (و۔ت)

کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے۔ ان سے حیا کرو اور ان کا احترام کرو۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔

۳۔ آنکھ کا جھکانا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنا تمہارے لئے نفع بخش ہے یا تمہیں پاکیزہ رکھنے کا طریقہ ہے کیونکہ اس سے انسان زنا کے فعل شنیع سے دور رہتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو آنکھوں کے گھمانے، حواس کو استعمال کرنے اور جوارح کو حرکت دینے کو جانتی ہے اور ان احساسات و خیالات کو بھی جانتی ہے جو دل میں انگڑائیاں لیتے ہیں اور ذہن کے اندر ابھرتے ہیں۔ پس تم نظر بازی اور بدکاری کی طرف لے جانے والے ہر راستہ سے اجتناب کرو۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جابر بن عبداللہ نے بیان کیا کہ اسماء بنت مرشد اپنے کھجوروں کے باغ میں رہتی تھیں۔ عورتیں ان کے پاس پورا ازار پہن کر نہیں آتی تھیں، ان کے پاؤں کے (پازیب وغیرہ) نظر آتے تھے اور ان کے سینے اور مینڈھیاں ظاہر ہوتی تھیں، آپ نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر کہا مَا اَقْبَحَ هٰذَا۔ یہ کتنا برا لباس ہے تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

"اور آپ حکم دیجئے ایماندار عورتوں کو کہ وہ نیچی رکھا کریں اپنی نگاہیں۔ ۱۔ اور حفاظت کیا کریں اپنی عصمتوں کی اور نہ ظاہر کیا کریں اپنی آرائش کو مگر جتنا خود بخود نمایاں ہو اس سے ۲۔ اور ڈالے رہیں اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ۳۔ اور نہ ظاہر ہونے دیں اپنی آرائش کو مگر اپنے شوہروں کے لئے ۴۔ یا اپنے باپوں کے لئے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لئے یا اپنے بیٹوں کے لئے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کے لئے یا اپنے بھائیوں کے لئے یا اپنے بھتیجوں کے لئے، اور اپنے بھانجوں کے لئے ۵۔ یا اپنی ہم مذہب عورتوں پر ۶۔ یا اپنی باندیوں پر ۷۔ یا اپنے ایسے نوکروں پر جو (عورت) کے خواہشمند نہ ہوں ۸۔ یا ان بچوں پر جو (ابھی تک) آگاہ نہیں عورتوں کی شرم والی چیزوں پر ۹۔ اور نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں (زمین پر) تاکہ معلوم ہو جاوے وہ بناؤ سنگار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں ۱۰۔ اور رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو! تاکہ تم (دونوں جہانوں میں) بامراد ہو جاؤ۔ ۱۲۔"

1۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 103 (وزارت تعلیم)　2۔ الدر المنثور، جلد5، صفحہ 74 (العلمیۃ)

۱؎ مومن عورتوں کو حکم فرمائیے کہ وہ اس چیز سے آنکھیں جھکالیں جس کی طرف دیکھنا ان کے لئے حلال نہیں ہے۔ یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ عورت کے لئے مطلقاً اجنبی مرد کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی نظریہ ہے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب عورت کو شہوت سے امن ہو تو اس کے لئے مرد کے اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے جو مرد دوسرے مرد کا دیکھ سکتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ ام سلمہ اور میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں کہ عبداللہ بن ام مکتوم آگئے وہ حضور ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا ان سے پردہ کرلو۔ (یہ واقعہ حجاب کے حکم کے بعد کا ہے) ام سلمہ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیا وہ نابینا نہیں ہیں؟ وہ تو ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم بھی نابینا ہو؟ کیا تم اسے دیکھ نہیں رہی ہو؟ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل ابن عباس کی حدیث ہے ایک عورت حجۃ الوداع کے موقع پر حاضر ہوئی جس کا تعلق خثعم قبیلہ سے تھا۔ عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک فریضہ حج ہے، میرا والد بوڑھا ہے جو سواری پر بیٹھنے کی سکت نہیں رکھتا اگر میں ان کی طرف سے حج ادا کروں تو ان کی طرف سے ادا ہو جائے گا آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ ابن عباس فرماتے ہیں الفضل اس عورت کی طرف تکنے لگے اور وہ عورت فضل کو دیکھنے لگی، آپ ﷺ نے فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ امام ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی حدیث روایت کی ہے جس میں یہ زائد ہے کہ حضرت عباس نے فرمایا۔ آپ نے اپنے چچا کے بیٹے کا منہ پھیر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے نوجوان مرد اور نوجوان عورت کو ایک دوسرے کی طرف تکتے ہوئے دیکھا تو مجھے ان پر شیطان کے حملہ کا اندیشہ ہوا۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے (3)۔ ابن القطان نے اس حدیث سے فتنہ سے امن کے وقت دیکھنے کے جواز پر دلیل اخذ کی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اس عورت کو چہرہ ڈھانپنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر حضرت عباس نظر کو جائز نہ سمجھتے تو سوال نہ کرتے اگر وہ جائز نہ ہوتا جو انہوں نے سمجھا تو آپ اس مفہوم پر انہیں برقرار نہ رکھتے۔ احناف کی ایک دلیل فاطمہ بنت قیس کی حدیث ہے کہ ان کے خاوند نے انہیں طلاق بائنہ دے دی تو انہیں نبی کریم ﷺ نے ابن ام مکتوم کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ عورت کا نابینا شخص کو دیکھنا جائز ہے لیکن اس وقت جب شہوت سے امن ہو اور جذبات پر قابو ہو۔

مسئلہ: عورت کے لئے عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا جائز نہیں، یعنی ناف کے نیچے سے گھٹنا تک دیکھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مرد کے لئے مرد کی شرمگاہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ ابوسعید کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد دوسرے مرد کی شرمگاہ کو نہ دیکھے اور عورت، دوسری عورت کی شرمگاہ کو نہ دیکھے اور ایک مرد دوسرے مرد کو ایک کپڑے میں نہ ملے اور عورت، عورت کو ایک کپڑے میں نہ ملے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔

۲؎ مومن عورتیں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیب و زینت کی اشیاء مثلاً زیورات، اور رنگ وغیرہ ظاہر نہ کریں۔ چہ جائیکہ زیورات اور لباس کے مقامات ظاہر ہوں۔ لیکن جو چیزیں خود بخود ظاہر ہوں جیسے لباس اور انگوٹھی وغیرہ کیونکہ ان چیزوں کا پردہ کرنے میں انتہائی حرج اور مشقت واقع ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زینت سے مراد زینت کے مقام ہیں اور زینتھن سے پہلے مضاف ''مواضع'' محذوف ہے یا زینت سے مراد تمام محاسن خلقیہ اور تزئینیہ ہیں، لیکن اس سے مستثنیٰ امام ابوحنیفہ، مالک، احمد اور امام شافعی کے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 101 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 250 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 108 (وزارت تعلیم
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 154 (قدیمی)

نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، کیونکہ ترمذی نے عبداللہ بن مسلم بن ہرمز عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عباس نے فرمایا ما ظھر منھا سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ عطاء عن عائشہ کی سند سے بھی اسی طرح مروی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ما ظھر سے مراد چہرہ، ہتھیلیاں اور پاؤں ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مشہور ہے کہ صرف چہرہ مستثنیٰ ہے کیونکہ طبرانی نے مسلم الاعور عن سعید بن جبیر کے سلسلہ سے ابن عباس سے روایت کیا ہے اس سے مراد سرمہ ہے خصیف عن عکرمہ کے سلسلہ سے ابن عباس سے امام بیہقی نے بھی روایت کی ہے پس چہرہ ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق مستثنیٰ ہے اور ہتھیلیاں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مستثنیٰ ہیں۔

ایک روایت میں امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک بھی ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں، لیکن مختلفات قاضی خان میں ہے کہ ہاتھ کا ظاہر و باطن کلائی تک عورت نہیں ہے اور ظاہر روایت میں ہے کہ اس کا ظاہر عورت ہے، ابن ہمام نے اسی طرح لکھا ہے۔ پاؤں عورت ہیں لیکن امام صاحب سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ عورت نہیں ہیں اور پاؤں کے عورت ہونے پر دلیل حضرت ام سلمہ کی حدیث ہے کہ آپ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا عورت اوپر قمیص اور دوپٹہ میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ جبکہ اس کا ازار نہ ہو آپ ﷺ نے فرمایا جب قمیص اتنی لمبی ہو کہ اس کے پاؤں کے ظاہر کو ڈھانپ لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے(1)، عبدالحق نے اس کی علت بیان کی ہے کہ امام مالک وغیرہ نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے اور اصح بھی یہی ہے۔ علامہ ابن الجوزی کہتے ہیں اس حدیث کے مرفوع ہونے پر اعتراض ہے کیونکہ یہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ کی روایت ہے اور ان کو یحییٰ نے ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قابل حجت نہیں ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن۔ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پازیب، زینت باطنہ میں سے ہے، اور اس کا مقام یعنی پاؤں، عورت ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اظہر یہ ہے کہ پاؤں نماز میں عورت ہے لیکن دیکھنے میں عورت نہیں، آزاد عورت کا پورا بدن عورت (ستر) ہے، خاوند اور محرم کے علاوہ کسی کے لئے اس کے جسم کے کسی حصہ کو دیکھنا حلال نہیں ہے لیکن اگر ضرورت ہو تو جائز ہے، جیسے علاج معالجہ اور گواہی دینے کے لئے عورت کو دیکھنا جائز ہے(2)۔ کتب حنفیہ میں آزاد عورت کے چہرہ کا ستر میں داخل نہ ہونا جو لکھا ہے، وہ نماز کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے لَا یَجُوْزُ اَنْ یَّنْظُرَ الرَّجُلُ اِلَی الْاَجْنَبِیَّۃِ اِلَّا وَجْھَھَا وَ کَفَّیْھَا۔ یعنی مرد کے لئے اجنبیہ عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا بدن کے کسی حصہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا۔ ہاتھ اور چہرہ کے ظاہر کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ جیسے جب مردوں کو کوئی چیز لینے دینے کا معاملہ ہو۔ اگر مرد کو شہوت سے امن نہ ہو تو عورت کے چہرہ کو بھی دیکھنا مباح نہیں ہے۔ لیکن ضرورت کے وقت ایسا کرنا جائز ہے جیسے فیصلہ کرنے کے وقت قاضی کے لئے اور اداء شہادت اور تحمل شہادت کے وقت گواہوں کے لئے عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز ہے، خواہ شہوت کا امن نہ بھی ہو۔ جب یقین ہو یا غالب گمان ہو کہ اسے دیکھنے سے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے گا تو عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے مرسلاً روایت کی ہے۔ جو بچی بالغہ ہو

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 3، صفحہ 173 (الرشد)　　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 40 (العلمیۃ)

جائے اس کے چہرہ اور اس کے ہاتھوں کو کلائی تک کے علاوہ جسم کو دیکھنا جائز نہیں(1)۔ میں کہتا ہوں ایسے لوگ جو عورت کے خواہشمند نہ ہوں ان کے سامنے عورت کا اپنی خفیہ زینت ظاہر کرنا اجماعاً جائز ہے اور نص کتاب سے ثابت ہے کیونکہ یہاں فتنہ کا اندیشہ نہیں ہے ایسے لوگوں کے سامنے عورت کے لئے ظاہری زینت کا ظاہر کرنا بدرجہ اولی جائز ہے۔ مرد کو اگر اشتہاء کا اندیشہ ہو تو اجنبی عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے ابن ہمام لکھتے ہیں جب شہوت کا شک ہو تو عورت اور مرد لڑکے کے چہرے کو دیکھنا حرام ہے اس حکم سے یہ لازم آتا ہے کہ عورت اجنبی شخص کے سامنے اپنا چہرہ نہ کھولے جب اس سے شہوت کا اندیشہ ہو ورنہ عورت خود اپنے آپ کو فساد کے لئے پیش کرنے والی ہوگی اور عورتوں کی خواہش رکھنے والے اجنبی مرد کے جذبات کا اجنبی عورت کو دیکھ کر نہ مچلنا غیر متصور ہے اسی وجہ سے ہم نے لازم قرار دیا ہے کہ آزاد عورت خاوند اور محرم کے علاوہ کسی مرد کے سامنے چہرہ نہ کھولے کیونکہ محاسن تو ہوتے ہی چہرہ میں ہیں چہرہ کو دیکھنے سے فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ باقی اعضاء کو دیکھنے سے فتنہ کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت ستر (چھپانے کی چیز) ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے اس حدیث کو ترمذی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے(2)۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ عورت کا پورا بدن ستر ہے لیکن ضرورات اس سے بالاجماع مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً ضرورت یہ ہے کہ عورت کے لئے کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو اس کے لئے بازار سے ضروریات زندگی خرید کر لائے۔ ایسی ضرورت کے وقت وہ برقعہ میں ملبوس ہو کر نکلے اور ایک آنکھ کھولے جس سے راستہ کو دیکھے اگر جسم پورا لپیٹنے کے لئے اس کے پاس کپڑا نہ ہو تو پھر بھی ممکن حد تک اپنے آپ کو ڈھانپ کر نکلے۔ اسی طرح کبھی ڈاکٹر اور کبھی گواہوں اور قاضی کے پاس جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آیت میں زینت سے مراد اگر نفس زینت ہو جیسا کہ ہم نے قاضی بیضاوی کی اتباع میں لکھا ہے تو زیور کپڑے اور رنگ وغیرہ مراد ہوں گے(3)۔ اور معنی کے اعتبار سے مواضع زینت کو ظاہر کرنے کی حرمت دلالۃ النص کے ذریعے بدرجہ اولی ثابت ہوگی۔ پس اس معنی کی صورت میں استثناء کی تاویل میں کوئی خفا نہ ہوگا۔ الا ما ظھر منھا سے مراد ظاہری کپڑے ہوں گے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ ابن مسعود نے زینت سے مراد کپڑے لئے ہیں اور بطور دلیل یہ آیت پیش کی ہے خذوا زینتکم عند کل مسجد۔ اس آیت میں زینت سے مراد کپڑے ہیں(4)۔ اگر آیت میں زینت سے مراد مواضع زینت ہو تو الا ما ظھر منھا کی استثناء کا مطلب ضرورت کے وقت زینت کے مقامات کا ظہور ہوگا۔ مثلاً قضاء حوائج کیلئے نکلنے کی ضرورت، گواہ بنانے کی ضرورت وغیرہ یعنی بغیر قصد و ارادہ کے اس کا ظہور ہو۔ پس آزاد عورت کی ہتھیلیوں اور چہرہ کی استثناء نماز کے لئے ہوگی۔ اسی طرح عورت کے چہرہ کو ظاہر کرنے کے عدم جواز پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے، یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ الآیۃ۔ (اے نبی مکرم ﷺ! آپ فرمایئے اپنی ازواج مطہرات کو اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو۔ ابن عباس اور ابوعبیدہ فرماتے ہیں مومنین کی عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سر اور اپنے چہروں کو چادروں سے ڈھانپ کر رکھیں صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ آزاد عورتیں ہیں(5)۔ اور پیچھے جو ہم نے خثعم قبیلہ کی ایک عورت کا ذکر کیا ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے سال حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھنے آئی تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے حج کر سکتی ہے تو اس عورت کا نکلنا مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پر محمول ہے اور جو یہ ذکر تھا کہ حضرت فضل اس

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 18 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 140 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 40 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (الفکر)
5۔ ایضاً، صفحہ 488

عورت کو دیکھنے لگے اور وہ حضرت فضل کو دیکھنے لگی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیا تھا یہ صراحتہً دلیل ہے کہ اجنبیہ عورت کے چہرہ کو دیکھنا منع ہے کیونکہ ناظر اور منظور الیہا پر شیطان کے حملہ سے امن نہیں ہوتا۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ کا حکم بالا جماع آزاد عورتوں کے ساتھ مختص ہے اور لونڈیاں خواہ مکاتبہ ہوں' مدبرۃ ہوں یا امہات اولاد ہوں ان کے لئے سر' چہرہ' پنڈلیاں اور بازو کھولنا جائز ہے۔ کیونکہ امام مالک' شافعی اور امام احمد کے نزدیک لونڈی کا ستر مرد کے ستر کی طرح ناف سے گھٹنے تک ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے لونڈی کے پیٹ اور پیٹھ کو بھی ستر میں شمار کیا ہے اصحاب شافعی کہتے ہیں لونڈی کے مواضع تقلیب کے علاوہ پورا بدن ستر ہے۔ اور مواضع تقلیب سے مراد سر' بازو اور پنڈلیاں ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں صفیہ کے واقعہ میں لکھا ہے" اگر وہ اس کو چھپائے تو بیوی ہے اگر نہ چھپائے تو ام ولد ہے"۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اعضاء کے ظہور میں لونڈی' آزاد کے مخالف ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب سے ایک لونڈی پردہ کر کے گزری تو آپ نے درہ اٹھایا اور فرمایا اے لٹیمہ کو تو آزاد عورتوں کی مشابہت کرتی ہے' پردہ پھینک دے(1)۔

اسی طرح درج ذیل ارشاد بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لونڈی کا حکم آزاد عورت کے حکم سے مختلف ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ ۔ (اے نبی مکرم! آپ فرمایئے اپنی ازواج مطہرات کو' اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر چادروں کے پلو اسطرح وہ بآسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت کا حکم لونڈیوں کو بھی شامل ہو اور سر' بازو اور پنڈلیوں کا ظاہر کرنا استثناء کی وجہ سے جائز ہو کیونکہ اسے آقا کی خدمت کے لئے بار بار نکلنا ہوتا ہے اس کے خدمت والے کپڑے چھوٹے ہوتے ہیں' پس غالب طور پر یہ اعضاء بالضرورۃ ظاہر ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

؎ وہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں تاکہ ان کے بال سینے' گردنیں اور بالیاں نظر نہ آئیں۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اللہ تعالیٰ پہلی مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے۔ جب **وليضربن بخمرهن على جيوبهن** کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے اپنی چادریں پھاڑیں اور ان کو اوڑھنیاں بنالیا(2)۔

نافع' عاصم اور ہشام نے **جيوبهن** کو جیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے' جبکہ دوسرے قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

؎ **زينتهن** میں اضافت عہد کے لئے ہے' یعنی وہ زینت مراد ہے جس کا ظہور مستثنیٰ ہے دوبارہ ذکر فرمایا تاکہ واضح ہوجائے کہ کن کے سامنے اس ظاہری زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے اور کن کے سامنے جائز نہیں ہے۔ اپنے شوہروں کے لئے زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے بلکہ عورت کی زینت تو ہوتی ہی اپنے مرد کے لئے ہے اور شوہر اپنی عورت کے تمام بدن کو دیکھ سکتا ہے حتیٰ کہ اس کے لئے عورت کی شرمگاہ کو بھی دیکھنا جائز ہے لیکن شرمگاہ کی طرف دیکھنا مکروہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو پردہ کر لے اونٹوں کی طرح بالکل لباس اتار نہ دے(3)۔ اس حدیث کو امام شافعی' طبرانی اور بیہقی نے ابن مسعود عن عتبہ عن عنبر کے سلسلہ سے روایت کی ہے' نسائی نے عبداللہ بن سرجس سے روایت کی ہے نیز طبرانی نے ابوامامہ سے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 488 (الفکر)　　2۔ ایضاً، صفحہ 193　　3۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 348 (التراث الاسلامی)

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی شرمگاہ کو نہیں دیکھا (1)۔

5 اسی طرح اپنے باپوں کے لئے ظاہر کرسکتی ہیں' دادا' نانا بھی دلالۃ النص اور اجماع کے ذریعے اس میں شامل ہیں اگرچہ وہ بہت اوپر کے ہوں' اپنے شوہروں کے باپوں کیلئے اور اپنے بیٹوں کے لئے بھی ظاہر کرسکتی ہے۔ دلالۃ النص اور اجماع کے ساتھ بیٹوں میں پوتے اور نواسے بھی شامل ہیں۔ اپنے شوہروں کے بیٹوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے بھتیجوں اور بھانجوں کے لئے ظاہر کرسکتی ہیں' اپنے بھتیجوں میں' بھتیجوں اور بھتیجیوں کے بیٹے بھی شامل ہیں۔

مندرجہ بالا رشتہ داروں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنے محاسن ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے کیونکہ ان کی آمدورفت کثرت سے ہوتی ہے اور ان کی مداخلت کی احتیاج بھی ہوتی ہے' اور یہ ایسے رشتہ دار ہیں جن سے فتنہ کا اندیشہ بہت کم ہے کیونکہ فطرۃ اتنے قریبی رشتہ سے مماست و ملابست سے نفرت ہوتی ہے اور طبیعت ان کے برائی کی طرف منسوب ہونے پر غیرت و حمیت محسوس کرتی ہے۔ ان رشتہ داروں کیلئے جائز ہے کہ وہ خدمت و محنت کیوقت جو حصہ عورت کا ظاہر ہو دیکھ لیں اور ظاہر ہونے والے حصہ میں چہرہ' سر' سینہ' پنڈلیاں اور بازو شامل ہیں لیکن ان کی پیٹھوں' پیٹوں اور ناف سے گھٹنا تک کا حصہ دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ عادۃ یہ اعضاء نہیں کھلتے اور ان کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہ حکم ان تمام رشتہ داروں کے لئے ہے جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہوتا ہے خواہ وہ نسب کی وجہ سے حرمت ہو یا رضاعت و مصاہرت کی بناپر ہو۔ آیت کریمہ میں چچوں اور خالوؤں کا ذکر نہیں ہے کیونکہ دلالۃ النص اور اجماع کے ذریعے یہ لوگ بھتیجوں اور بھانجوں کے ضمن میں موجود ہیں۔ کیونکہ جب پھوپھی کے لئے اپنے بھتیجے کے سامنے زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے تو مساوات کے اصول پر بھتیجی کے لئے بھی جائز ہوگا کہ وہ اپنے چچا کے لئے اپنی زینت ظاہر کرے۔ خالہ کے لئے جب جائز ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھانجے کے لئے زینت ظاہر کرے تو بھانجی کے لئے بھی جائز ہوگا کہ وہ اپنے خالو کے سامنے زینت ظاہر کرے۔ چچوں اور خالوؤں کے ذکر نہ کرنے میں یہ اشارہ ہوسکتا ہے کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سے پردہ کریں تاکہ وہ ان کے بیٹوں کے عقد نکاح میں آسکیں۔

مسئلہ: مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ جس محرمہ عورت کے جس حصہ کو دیکھ سکتا ہے اسے چھو بھی سکتا ہے کیونکہ سفر وغیرہ میں اسکی حاجت ہوتی ہے' نیز حرمت ابدی کی وجہ سے شہوت بہت کم ہوتی ہے لیکن اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو نہ دیکھے اور نہ مس کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا (نظر بازی) ہے ہاتھ زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا پکڑنا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنکھیں اور ہاتھ زنا کرتے ہیں۔ پاؤں زنا کرتے ہیں اور فرج زنا کرتی ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے ابن مسعود سے مرفوع روایت کیا ہے (2)۔ زنا کی حرمت' محرمہ عورت سے نہایت غلیظ ہے۔ پس اجتناب چاہئے۔

6 مومنہ عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی زینت مومنہ عورت یا کافرہ عورت کے سامنے ظاہر کرے۔ خواہ کافرہ آزاد ہو یا لونڈی ہو، لیکن ناف سے گھٹنے تک کا حصہ کھولنا جائز نہیں ہے۔ اس حصہ کے علاوہ بقیہ جسم کو عورت کے لئے دیکھنا جائز ہے کیونکہ وہ باہم جنس ہوتی ہیں اور شہوت بھی نہیں ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ عورت کو عورت کی طرف دیکھنا اتنی مقدار میں جائز ہے جتنا مرد اپنی محارم کو دیکھ سکتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نسائهن سے مراد مومنات ہیں۔ پس مسلمان عورت کو کافرہ عورت کے سامنے اپنی زینت ظاہر

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 360 (العلمیہ)
2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 10، صفحہ 156 (التراث الاسلامی)

کرنی جائز نہیں ہے کیونکہ کافرہ عورتیں' ہماری عورتوں مِنّ سے نہیں ہیں کیونکہ وہ دین میں اجنبی ہیں۔ چونکہ کافرہ عورتیں مردوں کے سامنے ان کے وصف بیان کرنے سے اجتناب نہیں کریں گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسی عورت کے ساتھ عورت مباشرت نہ کرے جو اپنے مرد کے سامنے اس طرح وصف بیان کرے گویا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے (متفق علیہ)(1) علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب نے ابوعبیدہ بن الجراح کی طرف خط لکھا کہ اہل کتاب کی عورتوں کو مسلمان عورتوں کے ساتھ داخل ہونے سے منع کر دیں(2)۔

یہ ابن جریج سے مروی ہے کہ نسائھن سے مراد آزاد مومن عورتیں ہیں اور ما ملکت ایمانھن سے مراد لونڈیاں ہیں غلام نہیں ہیں۔ پس کسی مسلمہ عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ مشرکہ عورت کے سامنے لباس اتارے لیکن جب مشرکہ اس کی لونڈی ہو تو اس کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز ہے اس تاویل پر عورت کے لئے اپنے غلام کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز نہ ہوگا۔ غلام کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مالکن کی طرف دیکھے لیکن عورت کے جس حصہ کو اجنبی دیکھ سکتا ہے غلام کے لئے بھی اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ بعض شوافع کا بھی یہی قول ہے۔ شیخ ابوحامد شافعی فرماتے ہیں ہمارے اصحاب کے نزدیک غلام اپنی مالکن کے لئے محرم نہیں ہوتا۔

علامہ نووی فرماتے ہیں یہی قول صواب ہے۔ اسمیں اختلاف ہونا بھی نہیں چاہئے بلکہ اسکا غیر محرم ہونا قطعی ہے اور یہ قول کہ غلام مالکن کا محرم ہے' اسکی کوئی دلیل نہیں ہے' آیت میں ماملکت سے مراد لونڈیاں ہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک غلام نہ محرم ہے اور نہ خاوند ہے' اور جواز نکاح کی وجہ سے شہوت بھی متحقق ہے' یعنی ملکیت کے زوال کے بعد اس کا اپنی مالکن سے نکاح ہو سکتا ہے۔ غلام سے بے پردہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ گھر سے باہر کام کرتا ہے' اور اس آیت میں ما ملکت ایمانھن سے مراد لونڈیاں ہیں۔

سعید بن المسیب اور حسن وغیرہما فرماتے ہیں سورۂ نور تمہیں دھوکا میں نہ ڈالے کیونکہ یہ عورتوں کے متعلق ہے مردوں کے متعلق نہیں ہے(3)۔ یہ تاویل صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ نسائھن سے مراد مسلمان آزاد عورتیں ہوں۔ تمام عورتیں مراد نہ ہوں۔ ورنہ تکرار لازم آئے گا۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق مسلمان عورت کے لئے کافرہ عورت کے سامنے لباس کھولنا جائز نہیں ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں ما ملکت ایمانھن میں غلام اور لونڈیاں سب شامل ہیں۔ اور مالکن کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے غلام کے سامنے وہ اعضاء ظاہر نہ کرے جو محرم مردوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہے اور غلام کے لئے مالکن کے اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے جو وہ اپنی محرم عورتوں کا دیکھ سکتا ہے' امام شافعی نے بھی اسی قول پر نص قائم کی ہے۔ اور امام شافعی کے جمہور اصحاب کا اصح قول یہی ہے کیونکہ بغیر اجازت اپنی مالکن کے پاس آنے کی حاجت متحقق ہے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ یہی چیز حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی اسی مذہب کی تائید کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس غلام کے ساتھ حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لائے جو آپ ﷺ نے انہیں ہبہ کیا تھا۔ حضرت فاطمہ کے اوپر ایک کپڑا تھا جب آپ اسے سر پر ڈالتی تھیں تو پاؤں نہیں ڈھانپتا تھے جب آپ پاؤں ڈھانپتی تھی تو سر نہیں ڈھانپتا تھا' جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی پریشانی دیکھی تو فرمایا' اے فاطمہ اتنے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے تیرا باپ اور تیرا غلام تیرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2007 (العلمیۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (الفکر)　3۔ روح المعانی، جلد 18، صفحہ 144 (التراث الاسلامی)

روایت کیا ہے(1) لیکن اس حدیث میں کوئی وضاحت نہیں۔ ممکن ہے وہ غلام چھوٹا ہو جیسا کہ لفظ الغلام کا اطلاق دلالت کر رہا ہے۔ ہمارے اس امکان کی دلیل ام سلمہ کی حدیث ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے مکاتب غلام کے پاس ہو تو اسے پردہ کرنا چاہئے۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(2)، لیکن اس سے استدلال مفہوم مخالف کے ذریعے ہے۔

۵ ایسے مرد جو عورتوں کی خواہش نہ رکھتے ہوں ان کے سامنے بھی عورت کے لئے اپنی ظاہری آرائش ظاہر کرنا جائز ہے اور ایسے مردوں سے مراد بوڑھے فرتوت ہیں۔ ان کو قرآن نے تابعین کے لفظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ لوگ کسب پر قادر نہیں ہوتے اور قوم کی اتباع کرتے ہیں تا کہ قوم کا بچا کھچا مال انہیں مل جائے۔ حسن فرماتے ہیں تابعین سے مراد ایسے مرد ہیں جن کا ذکر منتشر نہ ہوتا ہو اور عورت پر چھانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور عورتوں کی خواہش بھی نہ رکھتے ہوں(3)۔ ابن عباس نے ان سے مراد عنین (نامرد) لئے ہیں(4) سعید بن جبیر نے اس سے مراد نیم پاگل لئے ہیں(5)، عکرمہ نے اس سے مراد مجبوب (جن کا ذکر کٹا ہوا ہو) لئے ہیں(6)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد مخنث (خنثیٰ) ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں اس سے مراد بوڑھا، نامرد، خصی اور ذکر کٹا شخص ہے(7)۔ صحیح یہ ہے کہ خصی اور مجبوب اجنبی عورت کو دیکھنے میں مرد کی طرح ہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ خصی نر ہے جو مجامعت کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح مجبوب کا حکم ہے، کیونکہ وہ شرمگاہ کو رگڑتا ہے اور اسے انزال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مخنث شخص کا حکم ہے کیونکہ وہ بھی ایک فاسق مرد ہوتا ہے۔ یہ تمام لوگ اس حکم میں اس لئے شامل ہیں کیونکہ قرآن میں قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِہِمْ فرمایا ہے۔ یہ حکم محکم ہے اس میں مجبوب، خصی اور مخنث سب شامل ہیں اور التابعین غیر اولی الاربۃ کے ارشاد میں یہ افراد قطعیت کے ساتھ شامل نہیں ہیں، پس ان کے لئے بھی آنکھیں جھکانے کا حکم ضروری ہے۔

کفایہ میں ہے کہ صاحب ہدایہ نے المخنث کے ساتھ الردی من الافعال کی قید لگائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ مخنث شامل نہیں ہے جس کے اعضاء میں قدرتی نرمی ہوتی ہے اور ان کی زبان میں انکسار ہوتا ہے وہ خلقۃً عورتوں کی شہوت نہیں رکھتا۔ یہ برے افعال والا مخنث نہیں ہوتا۔ کیونکہ خلقۃً جو مخنث ہوتا ہے (یعنی ہیجڑا) اس کے عورتوں میں موجود ہونے کی بعض مشائخ نے رخصت دی ہے۔ کیونکہ یہ ان افراد میں سے ہوتا ہے جنہیں عورتوں کی خواہش نہیں ہوتی۔ میں کہتا ہوں خنثیٰ اصلی، یعنی وہ شخص جس کا ذکر اور فرج دونوں ہوں اگر اس میں عورتوں کی علامت ظاہر ہوں مثلاً اس کے پستان ہوں جیسے عورت کے پستان ہوتے ہیں یا اس کی چھاتی میں دودھ اتر آئے یا اسے حیض آئے یا اسے حمل ٹھہر جائے یا اس کے ساتھ فرج میں جماع ممکن ہو تو اس کا حکم عورت والا ہے، اگر عورتوں والی علامات نہ ہوں تو اس کا حکم مرد کا ہے جبکہ حکم مرد کا ہے اس کے سامنے عورت کے لئے انکشاف جائز نہیں ہے، اور نہ ایسے خنثیٰ کے لئے عورتوں کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ اگر خنثیٰ مشکل ہو جس میں مردوں اور عورتوں کی تمام علامات ہوتی ہیں تو اس میں بھی احتیاط یہ ہے کہ وہ نہ تو مردوں کے سامنے انکشاف کرے اور نہ عورتیں اس کے پاس اپنی زینت و آرائش کو ظاہر کریں۔

شیخین نے صحیحین میں ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تھے اور گھر میں ایک ہیجڑا تھا، اس مخنث نے عبداللہ بن ابی امیہ سے کہا (جو ام سلمہ کا بھائی تھا) اے عبداللہ! اگر اللہ تعالیٰ کل تمہیں الطائف کی فتح عطا فرمائے تو میں تمہیں غیلان کی بیٹی کے متعلق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 192 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر) 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

بتاؤں گا وہ چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ لوٹتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ لوگ (مخنث) تمہارے پاس ہرگز نہ آئیں(1)۔ بعض علماء نے اس حدیث سے مخنث لوگوں کو عورتوں کے پاس جانے سے منع کرنے پر حجت پکڑی ہے لیکن اس احتجاج میں نظر ہے۔ بلکہ اس حدیث سے تو عورتوں کے پاس مخنث افراد کے دخول کے جواز پر حجت پکڑنا ممکن ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس مخنث کو گھر سے باہر نہیں نکالا تھا اور اس کو منع بھی نہ فرمایا جب تک کہ اس نے غیلان کی بیٹی کی یہ صفت بیان نہ کی کہ وہ چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ لوٹتی ہے۔ اور یہ منع کرنا ایک دوسری وجہ سے ہے اسی وجہ سے تو نبی کریم ﷺ نے عورت کو عورت کے پاس داخل ہونے سے بھی منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ ابن مسعود کی حدیث میں گزر چکا ہے (تو کیا حضور ﷺ کے عورت کو مخصوص وجہ سے عورت کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ سے مطلقاً عورت کا عورت کے پاس داخل ہونے سے منع کیا جائے گا؟)

ابوبکر، ابن عامر اور ابو جعفر نے غیر اولی الاربۃ کو حال ہونے یا غیر بمعنی الا ہونے کی بنا پر منصوب پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی زینت تابعین کے لئے ظاہر کرسکتی ہے لیکن جن مردوں کو عورتوں کی خواہش ہو ان کے سامنے نہیں۔ جو عورتوں کے خواہشمند ہوں ان کے سامنے اپنی زینت و آرائش ظاہر نہیں کرسکتیں۔ باقی قراء نے جر کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ تابعین کی صفت ہے۔

۹۔ الطفل اسم جنس ہے جو وصف کی دلالت کی وجہ سے جمع کی جگہ استعمال ہوا ہے یعنی وہ افراد جو ابھی بالغ نہیں ہوئے۔ یا یہ معنی کہ جو وطی پر قادر نہیں ہیں۔ یہ من ظهر علی فلان سے مشتق ہوگا جس کا معنی قوت رکھنا اور قادر ہونا ہے۔ یا یہ معنی کہ جنھوں نے جماع کے لئے عورتوں کی شرمگاہوں پر غلبہ نہیں پایا اس وقت یہ ظہور بمعنی غلبہ سے مشتق ہوگا۔ اسی وجہ سے اسے علی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے یا یہ الظہور بمعنی الاطلاع سے مشتق ہے کیونکہ کشف (کھولنا) اطلاع کو مستلزم ہے اور عدم ظہور اور عدم کشف سے عدم صلاحیت مراد ہے حاصل یہ ہے کہ جو بچے ابھی حد شہوت کو نہیں پہنچے۔ مجاہد نے یہ معنی لکھا ہے کہ جو بچے اپنی صغرسنی اور بے سمجھی کی وجہ سے شرمگاہ کا شعور و تصور نہیں رکھتے(2) ان اقوال میں سے پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے۔ بچہ اگر سمجھدار ہو لیکن حد شہوت کو نہ پہنچا ہو تو عورتوں کے لئے اس کی موجودگی میں ناف سے گھٹنے تک کے حصہ کے علاوہ انکشاف اعضاء جائز ہے اور ناف کے نیچے کا حصہ کھولنا اس کی موجودگی میں جائز نہیں ہے جیسا کہ یہ ارشاد دلالت کرتا ہے۔ لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثلاث مرات (اذن طلب کیا کریں تم سے (گھروں میں داخل ہوتے وقت) تمہارے غلام اور وہ (لڑکے) جو ابھی جوانی کو نہیں پہنچے تم میں سے تین مرتبہ) اگر بچہ بالکل ناسمجھ ہو تو وہ جمادات اور جانوروں کے حکم میں ہے اگر عورت ایسے بچہ کی موجودگی میں تحت الازار حصہ بھی کھول دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بچہ مراہق ہے یعنی قریب البلوغ ہے جس میں اشتہاء ہے تو اس کا حکم مردوں والا ہے کیونکہ ایسا بچہ عورتوں کی شرمگاہوں پر غلبہ اور اطلاع کی استعداد رکھتا ہے۔

۱۰۔ ابن جریر نے حضرمی سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے دو پازیبیں بنوائیں اور ان میں گھنگھرو لگائے پھر مردوں کے پاس سے گزری اور پاؤں زمین پر مارے اس طرح گھنگھرو پازیب سے ٹکرائے تو آواز پیدا ہوئی۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں (زمین پر) الخ(3) علامہ بغوی فرماتے ہیں وہ عورت جب چلتی تو زور سے اپنا پاؤں زمین پر مارتی تاکہ اس کی پازیب کی جھنکار سنی جائے تو اس حرکت سے اسے منع کیا گیا کیونکہ یہ مردوں کی توجہ اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 218 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 79 (العلمیۃ)

میلان کا سبب بنتی ہے(1)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ ارشاد صراحۃً زینت کے اظہار سے نہی اور آواز بلند کرنے سے منع کرنے کی نسبت یہ اسلوب زیادہ بلیغ ہے۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی نے النوازل میں صراحت سے لکھا ہے کہ عورت کا نغمہ (آواز) ستر ہے(2)۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا مردوں کے لئے تسبیح اور عورتوں کے لئے تصفیق (ہاتھ پاؤں مارنا) ہے یہ حدیث سہل بن سعد سے مروی ہے اور بخاری، مسلم میں ہے(3)۔ مرد کے لئے اجنبی عورت کی آواز سننا اچھا نہیں ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے امام کی بھول پر اسے آگاہ کرنے کے لئے عورت کو آواز کے ساتھ تسبیح کرنے کے بجائے تصفیق کا حکم دیا ہے۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ عورت کا پاؤں بھی ستر ہے۔

۱۱؎ چونکہ تم میں سے کوئی شخص اوامر ونواہی میں کوتاہی سے پاک نہیں ہے اسلئے اے مومنو! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر شخص خطا کرنیوالا ہے اور بہتر خطا کرنے والے وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے(4)، بعض علماء فرماتے ہیں توبوا الی اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سورہ پاک میں جو آداب معاشرت سکھائے گئے ہیں انکی اطاعت کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو گناہ تم کرتے تھے اس سے توبہ کرو اگرچہ اسلام کی برکت سے تمہارے سب گناہ معاف ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی ان پر ندامت اور آئندہ ایسے افعال بد نہ کرنے کا عزم کرنا واجب ہے۔

ابن عامر نے یہاں اور سورۂ زخرف میں اور سورۃ الرحمٰن میں ایہ کو ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جب وصل کیا ہے لیکن وقف کی صورت میں تو بغیر الف کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اصل ضو ھا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو اور کسائی نے الف کے ساتھ وقف کیا ہے، یعنی ایھا پڑھا ہے، اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔

۱۲؎ توبہ کرو کیونکہ اس میں تمہارے لئے سعادت دارین ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مبارک ہو اسے جس کے نامہ اعمال میں استغفار زیادہ ہے(5)۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اے لوگو! اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو میں ہر روز اپنے رب کی بارگاہ میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں(6)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم میں اللہ کی بارگاہ میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ مرتبہ توبہ واستغفار کرتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے(7)۔ اعرابی سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے دل پر کثافت آتی ہے اور میں دن میں سو مرتبہ توبہ واستغفار کرتا ہوں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(8)۔ ابن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم مجلس میں رسول اللہ ﷺ کا استغفار سو مرتبہ شمار کرتے تھے۔ آپ اس طرح استغفار کرتے تھے رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(9)۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىٕكُمْ ؕ اِنْ یَّكُوْنُوْا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 43 (العلمیہ)
3۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 476 (التراث الاسلامی) 4۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 569 (العلمیہ)
5۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 440 (العلمیہ) 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی) 7۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 933 (وزارت تعلیم)
8۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی) 9۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 279 (وزارت تعلیم)

فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

”اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے اور جو نیک ہیں تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے ۔لے اگر وہ تنگ دست ہوں (تو فکر نہ کرو) غنی کر دے گا انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ۔اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہمہ دان ہے ۔ سے“

لے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے منع فرمایا جو بدکاری کا سبب بن سکتی تھیں اب نکاح کا حکم فرمایا، کیونکہ نکاح کرنا نظر کو جھکا دیتا ہے اور بدکاری سے بچاتا ہے ۔فرمایا اے مردوں اور عورتوں کے سرپرستو! اے غلاموں کے مالکو! اپنے متعلقین اور غلاموں کا نکاح کرو۔ ایامی جمع ہے ایّم کی اور یہ ایایم سے مقلوب ہے جیسے یتامی اصل میں یتایم تھا۔ ایم ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا دوسرا رفیق حیات نہ ہو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو۔ اس آیت میں انکحوا کا امر استحباب کے لئے ہے۔ اور صالحین کی تخصیص احترازی نہیں ہے بلکہ یہ اس لئے ہے کہ صالح غلاموں اور کنیزوں کے دین کو بچانا اور ان کا خصوصی خیال رکھنا زیادہ اہم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الصالحین سے مراد وہ غلام اور لونڈی ہیں جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی استعداد کے حامل ہوں۔

مسئلہ: جب انسان کو حرام میں وقوع کا خوف ہو اور غلبہ شہوت ہو تو نکاح کرنا واجب ہے۔ نہایہ میں ہے کہ اگر انسان کو زنا میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو اور اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو نکاح کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اگر ایسا قوی اندیشہ ہو کہ نکاح نہ کرے گا تو ضبط نفس نہ کر سکے گا اور حرام میں مبتلا ہو جائے گا تو نکاح فرض ہے اور اگر غلبہ شہوت اس حد تک نہ ہو بلکہ شہوت آمیز جذبات کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہونے کا خوف ہو تو نکاح واجب ہے لیکن یہ وجوب اس وقت ہے جب حقوق نکاح ادا کرنے کا یقین ہو۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ظلم کے خوف کی تفصیل ہونی چاہیئے جس طرح زنا کے خوف کی تفصیل ہے۔ اگر وہ ظلم کی اس انتہا کو پہنچا ہوا ہو جس انتہا پر پہنچنے کی وجہ سے نکاح فرض ہوتا ہے تو اس کا نکاح کرنا حرام ہے اور اگر ظلم کی اس انتہا تک پہنچا ہوا نہیں ہے تو نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہوگا۔

بدائع میں ہے کہ غلبہ شہوت کے وقت نکاح کی فرضیت مہر اور نفقہ کی ملکیت کے ساتھ مقید ہے' جو شخص غلبہ شہوت کی وجہ سے عورتوں سے بچ نہیں سکتا جبکہ اس کے پاس مہر ادا کرنے اور نفقہ (خرچہ) دینے کی استعداد بھی رکھتا ہے' ایسی حالت میں اگر وہ شادی نہیں کرتا تو گنہگار ہے۔

حالت اعتدال میں داؤد ظاہری اور اس کے ہم خیال دوسرے علماء کہتے ہیں کہ اگر انسان وطی اور انفاق (خرچ) پر قادر ہو تو زندگی میں ایک مرتبہ نکاح کرنا' مرد اور عورت پر فرض عین ہے کیونکہ امر کے صیغہ کے ساتھ فرمایا فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ۔ اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے) (اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم سے) اسی طرح حضرت سمرہ کی حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے تبتل (ہر کسی سے کٹ کر زندگی بسر کرنا) سے منع فرمایا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(1)۔ اصحاب ظواہر بطور دلیل یہ ارشاد نبوی بھی پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے عکاف کو فرمایا کیا تیری زوجہ ہے انہوں نے عرض کی نہیں' پھر پوچھا لونڈی ہے عرض کی نہیں۔ فرمایا تو خوشحال ہے عرض کی میں خوشحال ہوں فرمایا تو شیطانوں کے بھائیوں کا کان ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہماری سنت نکاح کرنا ہے تم میں سے برے لوگ تمہارے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (وزارت تعلیم)

غیر شادی شدہ افراد ہیں اور جو مجرد ہونے کی حالت میں مر گئے وہ رذیل مردے ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت انس کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نکاح کرنے کا حکم فرماتے تھے اور تبتل سے سخت منع فرماتے تھے اور فرماتے ایسی عورت سے شادی کرو جو بہت زیادہ محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے جننے والی ہو میں قیامت کے روز تمہارے متقی لوگوں کی کثرت پر فخر کروں گا اس حدیث کو امام احمد ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے(2)' سورہ نساء میں فان خفتم الا تعدلوا کے ارشاد کی تفسیر میں اسی طرح روایت کیا ہے۔

بعض احناف فرماتے ہیں کہ نکاح کا وجوب کفایہ پر ہے اور وجوب کے دلائل اس حکم کے کفایہ ہونے کے منافی نہیں ہیں، کیونکہ بعض کے نکاح کرنے سے دوسروں سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ نکاح کی مشروعیت کا سبب مسلمانوں کی بقاء اور ان کے عدم انقطاع کے لئے ہے اور یہ بقاء امت مسلمہ میں سے بعض کے نکاح کرنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ نکاح کے فرض عین نہ ہونے پر اجماع ہے' ابوداؤد ظاہری اور اس جیسے دوسرے علماء کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نکاح کرنے کا امر وجوب کفایہ ہے کیونکہ فانکحوا ما طاب لکم کا ارشاد ازواج کی تعداد بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت میں خطاب اولیاء کو ہے اور انہیں منع کیا جا رہا ہے کہ اگر غیر شادی شدہ مرد یا عورت' آزاد یا غلام شادی کرنا چاہیں تو تم انہیں نہ روکو۔ اخبار احاد سے فرض ثابت نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ جب وطی اور انفاق پر قادر ہو تو نکاح کرنا مستحب ہے۔ نیز اسے ظلم کا بھی اندیشہ نہ ہو۔ اگر ظلم کرنے کا خوف ہو تو حرام ہے یا مکروہ ہے اور نکاح کے سنت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود نکاح کیا تھا۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد بھی ہے اے جوانوں کے گروہ، جو تم میں سے طاقت رکھتا ہو وہ ضرور شادی کرے کیونکہ شادی کرنا اس کی نظر کو پاک کر دے گا اور اس کو گناہ سے بچا لے گا اور جو شادی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ شہوت کو کم کرتا ہے' اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے ابن مسعود کی حدیث سے روایت کیا ہے(3)۔ اور ابن ماجہ نے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث روایت کی ہے کہ" نکاح میری سنت ہے جو میری سنت پر عمل نہیں کرے گا وہ مجھ سے نہیں' شادی کرو میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر کثرت کا اظہار کروں گا جسے طاقت ہو وہ نکاح کرے اور جسے طاقت نہ ہو اسے روزہ رکھنا چاہئے(4)۔ اس حدیث کی سند میں عیسیٰ بن میمون ضعیف راوی ہے۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں' عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں' جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے(5)۔

امام ترمذی نے حضرت ابوایوب سے روایت کیا ہے کہ چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں 1۔ حیاء 2۔ خوشبو لگانا 3۔ مسواک کرنا 4۔ نکاح کرنا(6)۔ ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو ارادہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طاہر و مطہر ہو کر ملاقات کرے تو اسے چاہئے کہ وہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے(7) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ سب مسلک احناف کے مطابق تھا۔

امام شافعی فرماتے ہیں اگر انسان وطی کرنے اور نفقہ ادا کرنے پر قادر ہو اور ظلم و تعدی کا خوف نہ ہو تو نکاح کرنا مستحب ہے لیکن عبادت و

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 163 (صادر) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 280 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 758 (و۔ت)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 134 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 449 (قدیمی) 6۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (و۔ت)
7۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

ریاضت کی خاطر اس کو ترک کرنا افضل ہے۔ اگر وطی کرنے یا نفقہ دینے پر قادر نہ ہو اور ظلم کا بھی خوف ہو تو نکاح کرنا حرام یا مکروہ ہے۔ غلبہ شہوت اور حرام میں وقوع کا اندیشہ ہو تو نکاح کرنا مؤکد ہو جاتا ہے اور اس صورت میں نفلی نماز، روزہ، جہاد اور حج سے افضل ہو جاتا ہے۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ دونوں فریقوں کی کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے اندیشہ ہو کہ وہ نکاح کے حقوق ادا نہیں کر سکے گا یا نکاح کی وجہ سے کسی حرام کام کا مرتکب ہوگا تو ایسے شخص کے لئے نکاح کرنا مکروہ یا حرام ہے۔ اور جسے غلبہ شہوت ہو اور اسے زنا میں ملوث ہونے کا خوف ہو، یعنی اگر نکاح نہ کیا تو زنا کا ارتکاب کر بیٹھے گا' جبکہ وہ نکاح کے حقوق ادا کرنے پر بھی قادر ہے تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا مؤکد ہے۔ میں کہتا ہوں حرام کی ضد واجب ہے' پس زنا کے خوف کے وقت نکاح کے وجوب کا قول کرنا ضروری ہے۔

لیکن وہ شخص جو حالت اعتدال پر ہو'اسے زنا کے ارتکاب کا اندیشہ بھی نہ ہو اگر چہ وہ نکاح نہ بھی کرے۔ اور اسے ظلم و زیادتی کرنے کا خوف بھی نہ ہو' نکاح کے حقوق ادا کرنے پر بھی قادر ہو تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا سنت اور مستحب ہے۔ لیکن عبادت میں مشغول رہنے کے لئے نکاح کا ترک افضل ہے یا نکاح کرنا افضل ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نکاح کرنا' عبادت میں مشغول رہنے سے افضل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عبادت میں مشغول رہنا افضل ہے۔ امام شافعی کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی مدح فرمائی ہے کہ وہ قدرت کے باوجود عورتوں کے پاس نہیں جاتے۔ فرمایا سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا۔ حصور کا معنی قدرت کے باوجود نکاح نہ کرنا ہے۔ ابن ہمام (حنفی) اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام کی یہ کیفیت پہلے انبیاء کی شریعت میں افضل تھی لیکن ہماری شریعت میں رہبانیت منسوخ ہو گئی ہے۔ جب یحییٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی حالت آپس میں مختلف ہے تو نبی کریم ﷺ کی حالت کو مقدم کرنا واجب ہے۔ نبی کریم ﷺ وصال تک نکاح کی حالت میں تھے اور یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افضل ترین نبی کو پوری زندگی ایسے کام پر قائم رکھے جو افضل نہ ہو۔

شیخین نے صحیحین میں روایت فرمایا ہے کہ چند صحابہ نے آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے سرکار کی ازدواجی زندگی کے متعلق پوچھا۔ پھر کسی نے کہا میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا کسی نے کہا میں گوشت نہیں کھاؤں گا کسی نے کہا میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔ جب ان کی یہ باتیں نبی کریم ﷺ تک پہنچیں تو آپ ﷺ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء فرمائی پھر فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے یہ یہ کہا ہے' لیکن میں نوافل بھی پڑھتا ہوں' سوتا بھی ہوں' روزہ بھی رکھتا ہوں' افطار بھی کرتا اور حقوق زوجیت بھی ادا کرتا ہوں جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے (1)۔

بخاری نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا نکاح کرو کیونکہ اس امت کا بہترین فرد وہ ہے جس کی ازواج سب سے زیادہ ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ (2)۔ اس سے قبل نبی کریم ﷺ سے تبتل کے متعلق سخت نہی گزر چکی ہے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ نکاح اور اہل و عیال کثرت ذکر اور توجہ الی اللہ سے اس کے لئے مانع نہیں ہیں تو اس کے حق میں نکاح کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور اکثر انبیاء و صلحاء اسی کیفیت سے مزین تھے۔ نکاح کرنا واقعی افضل ہے کیونکہ نکاح کا مجاہدہ اور مشقت' کنوارا رہنے کی مشقت سے زیادہ ہے، کیونکہ موانع کے ہوتے ہوئے عبادت پر قائم رہنا زیادہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 449 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 758 (وزارت تعلیم)

ثواب اور جزا کا موجب ہے۔ اسی وجہ سے خواص بشر' خواص ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور عوام البشر' عوام ملائکہ سے افضل ہیں۔

جو شخص اپنے نفس میں ضعف اور کمزوری دیکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ نکاح اور اس کے متعلق امور اور اہل وعیال کثرت ذکر میں حائل ہوں گے نیز اسے یہ بھی یقین ہو کہ زنا میں ملوث نہ ہوگا تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کو ترک کرنا افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کردیں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے۔ ایک اور جگہ فرمایا قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ (اے حبیب!) آپ فرمایئے اگر میں تمہارے باپ اور تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار اندیشہ کرتے ہو جس کے مندے کا اور مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ پیارے ہیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے اور اسکے رسول علیہ السلام سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم) ایک اور مقام پر فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۔ (اے ایمان والو! تمہاری کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے تمہارے دشمن ہیں پس ہوشیار رہو ان سے۔

عبادت الٰہی میں مشغول ہونے سے نکاح کیسے افضل ہوسکتا ہے؟ جبکہ نکاح فی نفسہ ایک مباح امر ہے' وضعا عبادت نہیں ہے اور اس کا استحباب ان مصالح کی وجہ سے ہے جو اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو اس کی ادائیگی کے لئے اسلام شرط ہوتا جس طرح کہ دوسری عبادات کی ادائیگی کے لئے اسلام شرط ہے۔ حالانکہ رسول اللہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہوتی ہے جس کو وہ حاصل کرتا ہے یا عورت کے لئے ہوتی ہے جس سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اسکی ہجرت اس چیز کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (1)۔

اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو نکاح کی غرض سے کی جانے والی ہجرت' ہجرت اسلام شمار ہوتی۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ دنیا میں سے میرے لئے تین چیزیں مرغوب بنائی گئی ہیں۔ 1۔ نساء (عورتیں) 2۔ خوشبو 3۔ نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے (2)۔ اسی طرح طبرانی نے بھی روایت کی ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ یہ حدیث صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ نکاح امور دنیویہ مباحہ میں سے ہے جیسا کہ خوشبو امور دنیویہ میں سے ہے۔ نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں نکاح اور خوشبو لگانا۔ اس ارشاد میں جو نکاح کو سنت کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سنت زائدہ ہے اور سنن عادیہ میں سے ہے' سنن ہدیٰ سے نہیں ہے۔ سنت ہدیٰ وہ ہوتی ہے جس پر رسول اللہ علیہ السلام نے عبادت کے طور پر مواظبت اختیار فرمائی ہو۔ یہ بھی نہ کہا جائے کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ دلیل ہے کہ نکاح سنن ہدیٰ سے ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ ارشاد نکاح کے سنن ہدیٰ میں ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ فعل جس کو نبی کریم علیہ السلام نے کیا ہو اور اسے اچھا بھی سمجھا ہو تو ایسے فعل سے اعراض واقعی قبیح ہے اور موجب انکار وعتاب ہے لیکن اس کو چھوڑ دینا عتاب کا موجب نہیں ہے جیسا کہ سنت ہدیٰ کا ترک

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (وزارت تعلیم) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 123 (الفکر)

سے جب ثواب ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حدیث میں ہے حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا ثَلَاثٌ اَلطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ۔ اس حدیث میں نماز کو بھی امور دنیویہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ثلاث کا لفظ متصل طرق میں نہیں پایا جاتا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے دنیا متاع ہے اور بہتر متاع نیک عورت ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے عمرو بن العاص سے مرفوع روایت کیا ہے۔ یہ حدیث نکاح کے امور دنیویہ میں سے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ پس ہر امر کا صیغہ جو نکاح کے متعلق قرآن کریم اور حدیث نبوی ﷺ میں ہے وہ اباحت یا استحباب پر محمول ہے۔ رہی وہ حدیث جس میں آپ ﷺ نے عکاف کو فرمایا تو شیطانوں کے بھائیوں میں سے ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے جو غلبہ شہوت اور فتنہ کے خوف کی حالت پر محمول ہے۔

نکاح حسن نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتا ہے یعنی نکاح سے یہ نیت ہو کہ اہل اسلام کی کثرت ہوگی' آنکھ میں حیا آجائے گا وغیرہ۔ یہ چیز نکاح کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ کھانے' پینے' خرید وفروخت' اجارہ دوسرے تمام مباح معاملات میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ افعال بھی حسن نیت سے عبادات بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرائض کی ادائیگی کے بعد حلال مال کی تلاش فرض ہے۔ اس حدیث کو طبرانی اور بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے(1)۔ طبرانی نے انس بن مالک سے اس طرح روایت کی ہے کہ ہر مسلمان پر حلال مال کا طلب کرنا واجب ہے۔

جس طرح نکاح' نسل کی بقاء کے لئے فرض کفایہ ہے اسی طرح اتنی مقدار میں کھانا فرض کفایہ ہے جس سے زندگی کی بقاء ضروری ہے۔ تجارت اور دوسرے تمام پیشے بھی اسی طرح فرض کفایہ ہیں۔ اگر تمام لوگ ان پیشوں کو چھوڑ دیں تو معاش و معاد کے معاملات میں خلل واقع ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچا (اور) امانت دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو انہوں نے حسن بھی لکھا ہے(2)۔ ابن ماجہ نے ابن عمر سے روایت کی ہے' بغوی نے شرح السنہ میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ان تمام دنیوی امور کا حسن غیر کے واسطہ سے ہے لیکن ذکر الٰہی' اور توجہ الی اللہ میں حسن ذاتی ہے۔ اس لئے امور دنیویہ' ذکر الٰہی' کے مقابل کیسے ہو سکتے ہیں۔؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کیا ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(3)۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ بندہ نکاح کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے یا کھانے' پینے سے میرے قریب ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف یہ وحی نہیں کی گئی ہے کہ میں مال جمع کروں اور تاجر بنوں لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ میں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کروں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے سورہ الحجر کی تفسیر میں روایت کیا ہے(4)۔

ابن ہمام نے جو یحییٰ علیہ السلام کی حالت کے متعلق لکھا ہے ان کی شریعت میں نکاح نہ کرنا افضل تھا اور ہماری شریعت میں رہبانیت

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 420 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 145 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 416 (الفکر)

منسوخ ہوگئی ہے۔ یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ نکاح کرنا ہر دین میں کنوارے رہنے سے افضل تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں۔ ان چار چیزوں میں نکاح کو بھی شمار کیا ہے۔ حضرت آدم، نوح، ابراہیم، اسماعیل، اسحق، یعقوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، ایوب، داؤد، سلیمان اور زکریا علیہم السلام سب شادی شدہ تھے اور یحییٰ علیہ السلام سے افضل تھے۔ شاید یحییٰ علیہ السلام نے اپنے حق میں بعض امور کی وجہ سے نکاح کو مخل سمجھا ہو جو نکاح سے افضل ہوں۔ دین عیسیٰ اور یحییٰ میں رہبانیت مشروع تھی اور ہمارے دین میں وہ منسوخ ہے۔ یہ قول بھی غلط ہے بلکہ وہ رہبانیت جو نصاریٰ اختیار کرتے تھے وہ بدعت تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا۔ (اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا) احادیث میں جو تبتل (تنہا رہنے) سے اور رہبانیت سے روکا گیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ حضور ﷺ ذکر الٰہی کے لئے خلوت اختیار کرنے اور مخلوق سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے منع فرمارہے ہیں۔ یہ مفہوم کیسے ہوسکتا ہے جبکہ قرآن حکیم میں ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہیں جن کے پیچھے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلا جاتا ہے اور اپنے دین کو فتنوں سے بچالے جاتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

نبی کریم ﷺ نے ان امور مباحہ کو چھوڑنے سے منع فرمایا جن کو چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ثواب نہیں ہے جیسے نکاح، بستر پر سونا، گوشت کھانا اور لوگوں سے کلام کرنے کو ترک کرنا ہے، جیسا کہ نصرانیوں کے راہب کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ ممنوع اور ناجائز وہ رہبانیت ہے جو نصرانیوں نے خود اختیار کی تھی، رہبانیت مشروعہ ممنوع نہیں ہے۔ حدیث شریف میں صحابہ کی مدح اس طرح فرمائی ہے انهم رهبان بالليل ليوث بالنهار وہ رات کو راہب ہیں اور دن کو شیر ہیں۔

فائدہ: علامہ بغوی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید میں لکھا ہے کہ آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ غیر شادی شدہ عورتوں کا نکاح کرنا اولیاء کی اجازت پر منحصر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خطاب اولیاء کو فرمایا ہے، جس طرح کہ غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کرنا ان کے مالکوں کے سپرد ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے، وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ(2) امام بغوی کی مراد یہ ہے کہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عاقلہ، بالغہ، آزاد عورت کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، ہم نے یہ مسئلہ تفصیل سے سورہ بقرہ کی آیت فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ کی تفسیر میں بیان کردیا ہے۔ اس آیت سے اس مسئلہ کا استدلال درست نہیں ہے کیونکہ ایم کا لفظ مرد، عورت چھوٹے ہوں یا بڑے، کنوارے ہوں یا پہلے شادی شدہ ہوں تمام کو شامل ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ بالغ مردوں کا نکاح ولی کی اجازت پر منحصر نہیں ہے۔ اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ باکرہ چھوٹی بچی کا نکاح ولی کی اجازت پر منحصر ہے۔ پس اس آیت کو عورتوں کے ساتھ خاص کرنا، چھوٹے بچوں اور بچیوں کے ساتھ خاص کرنے سے زیادہ اولیٰ نہیں ہے۔ یہ احتمال ہے کہ لفظ نکاح میں مجازی معنی مراد ہو۔ شاید نکاح کرنے کے حکم سے مراد ان کو نکاح کرنے سے منع نہ کرنا اور ان کی تائید کرنا مراد ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اگر غلام، آقا سے نکاح کرنا طلب کرے تو آقا پر واجب ہے کہ اس کا نکاح کردے۔ اسی طرح بالغہ عورت جب ولی سے نکاح کرانے کا مطالبہ کرے تو ولی پر اس کا نکاح کرنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان علماء کی اصل پر ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے عورت کے نکاح کو جائز

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 15 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (الفکر)

قرار نہیں دیتے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی اصل پر وجوب کا مفہوم یہ ہے کہ ولی پر حرام ہے کہ وہ عورت کو نکاح کرنے سے منع کرے۔ یہ آیت کریمہ اس مسئلہ میں فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ کی مثل ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اپنی (بچی، بہن) میں سے جس کا اس نے رشتہ مانگا ہے اس کا نکاح کر دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فساد برپا ہوگا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت عمر بن خطاب اور انس بن مالک نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تورات میں لکھا ہے کہ جس کی بچی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی اور باپ نے اس کی شادی نہیں کی تو جو بچی گناہ کا ارتکاب کرے گی اس کا گناہ باپ پر ہوگا(2)۔ ابوسعید اور ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا بچہ پیدا ہوا اسے چاہیئے کہ وہ بچے کا اچھا نام رکھے اور اس کی خوب تربیت کرے، پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اسکا نکاح کرے۔ اگر وہ بالغ ہو گیا اور باپ نے اس کی شادی نہ کی پھر اس سے گناہ سرزد ہوا تو اس کا گناہ باپ کے ذمہ ہوگا۔ یہ دونوں حدیثیں امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہیں(3)۔

۲۔ یعنی غربت وافلاس تمہیں نکاح سے نہ روکے کیونکہ بندوں کو رزق بہم پہنچانے کا کفیل اللہ تعالیٰ ہے، یہ مال ومتاع آنے جانے والی چیز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں غنیٰ سے مراد قناعت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں غنیٰ سے مراد خاوند اور بیوی کے رزق کا اجتماع ہے لیکن پہلا قول اصح ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ نکاح کرنے والے کو غنی فرما دے گا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تعجب ہے اس شخص پر جو بغیر نکاح کے غنی کا متمنی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنْ یَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ ایک اور مقام پر فرمایا اِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔ (اور اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو غنی کر دے گا اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے)(4) بزار، خطیب اور دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں سے نکاح کرو کیونکہ یہ مال لاتی ہیں(5)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے مراسیل میں عروہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ثعلبی اور دیلمی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نکاح کے ذریعے رزق تلاش کرو(6)۔ میں کہتا ہوں شاید یہ وعدہ ہے اس شخص کے لئے جو نکاح کے ذریعے پاکدامن رہنا چاہتا ہے اور رزق کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔ اس پر دلیل آئندہ آیت کریمہ ہے۔

وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى یُغْنِیَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا ۖۗ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَیٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَمَنْ یُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۳۳

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (وزارت تعلیم) 2۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 402 (العلمیۃ) 3۔ ایضاً، صفحہ 401
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (الفکر) 5۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 275 (التراث الاسلامی) 6۔ ایضاً، صفحہ 276

''اور چاہیے کہ پاکدامن بنے رہیں وہ لوگ جونہیں پاتے شادی کرنے کی قدرت یہاں تک کہ غنی کردے انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ۱؎ اور جو مکاتب بننا چاہیں تمہارے غلاموں سے تو مکاتب بنا لو انہیں ۲؎ اگر تم جانو ان میں کوئی بھلائی ۳؎ اور (زرِ مکاتبت ادا کرنے میں) مدد کرو انکی اللہ تعالیٰ کے مال سے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے ۴؎ اور نہ مجبور کرو اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر ۵؎ اگر وہ پاکدامن رہنا چاہیں ۶؎ تا کہ تم حاصل کرو (اس بدکاری سے) دنیوی زندگی کا کچھ سامان ۷؎ اور جو (کمینہ خصلت) مجبور کرتا ہے انہیں (عصمت فروشی پر) تو بیشک اللہ تعالیٰ انکے مجبور کیے جانے کے بعد (ان کی لغزشوں کو) بخشنے والا (اور ان پر) رحم فرمانیوالا ہے۔ ۸؎''

۱؎ یعنی جو اسباب نکاح اور وہ چیزیں جو نکاح کے لئے ضروری ہیں، مثلاً مہر معجل اور دوسرے اخراجات وغیرہ نہ رکھتا ہو، اس کا فقر اس کو نکاح کرنے سے روکے ہوئے ہو اور اس کو ظلم کرنے کا بھی اندیشہ ہو نیز نکاح کے حقوق کے فوت ہونے کا بھی خوف ہو تو ایسے شخص کو عفت کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہئے اور روزہ اور کم خوراک کے ذریعے شہوت کو کنٹرول کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ شہوت کو کم کرتا ہے۔

۲؎ ابن السکن نے معرفۃ الصحابہ میں عبد اللہ بن صبیح عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ صبیح فرماتے ہیں میں حویطب بن عبد العزی کا غلام تھا۔ میں نے اس سے مکاتب بنانے کا سوال کیا تو اس نے مجھے مکاتب بنانے سے انکار کر دیا۔ تو اس پر یہ ارشاد نازل ہوا کہ جو تمہارے غلام مکاتب بنانے کا تم سے سوال کریں تو انہیں مکاتب بنا دو۔ الذین اسم موصول اپنے صلہ سے ملکر مبتدا ہے اور **فکاتبوھم** اس کی خبر ہے اور خبر پر فاء اس لیے آتی ہے کیونکہ مبتدا کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ یا اسم موصول مضمر فعل کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر **فکاتبوھم** کا فعل کر رہا ہے اور فاء زائدہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو حویطب نے اپنے غلام کو سو دینار پر مکاتب بنایا اور اس نے اسے بیس دینار ہبہ کر دیئے تھے۔ غلام نے اسے یہ زرِ مکاتبت ادا کیا تھا۔ اور حنین کی جنگ میں قتل ہوا تھا (1)۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ **کاتبوھم** کا امر استحباب کے لئے ہے، حتیٰ کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا یہ امر وجوب کے لئے نہیں ہے اور اس پر فقہاء کا اجماع ہے۔ اور یہی صحیح ہے یعنی امر کے اباحت کے لئے ہونے کا قول جیسا کہ ہمارے بعض مشائخ نے کہا ہے، صحیح نہیں ہے کیونکہ اباحت پر حمل کرنے میں شرط لغو ہو جائے گی' کیونکہ مباح تو شرط کے بغیر بھی تھا۔ رہا استحباب تو وہ شرط کے ساتھ معلق ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ شرط عادی ہے کیونکہ آقا عادۃً اپنے غلام کو مکاتب نہیں بناتا مگر جب اس میں خیر دیکھتا ہے۔

بعض متقدمین سے مروی ہے کہ **کاتبوھم** کا امر وجوب کے لئے ہے۔ یہ قول عطاء اور عمرو بن دینار کا ہے۔ امام احمد سے بھی ایک قول وجوب کا مروی ہے۔ جبکہ غلام اپنے آقا سے اپنی قیمت کی مقدار پر یا اس سے زائد پر مکاتبت کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ ابن سیرین نے انس بن مالک سے مکاتب بنانے کا سوال کیا تو انہوں نے توقف کیا۔ ابن سیرین نے حضرت عمر سے شکایت کی تو انہوں نے انس بن مالک پر کوڑا بلند کرتے ہوئے حکم دیا کہ اسے مکاتب بناؤ۔ تو انس بن مالک نے اسے مکاتب بنا دیا۔ علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے (2)۔

کتابت عقد معاوضہ ہے جس پر مفاعلہ کا صیغہ دلالت کر رہا ہے' غلام اپنے آقا سے اپنے نفس کو اس چیز کے بدلے میں خریدتا ہے جو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (الفکر)   2۔ ایضاً، صفحہ 199

اپنی کمائی سے ادا کرے گا۔ یہ ابتیاء سے مشتق ہے جس کا معنی ایجاب ہے۔ پس مکاتبت میں ایجاب وقبول شرط ہے۔ یہ مال کی ادائیگی کے ساتھ معلق آزاد کرنا نہیں ہے۔ پس چھوٹے بچہ کو مکاتب بنانا بھی جائز ہے جبکہ وہ بیع وشراء کی عقل رکھتا ہو کیونکہ اس میں ایجاب وقبول متحقق ہے کیونکہ عاقل اہل قبول سے ہے اور اسکے حق میں تصرف نفع بخش بھی ہے۔ لیکن مجنون اور کم عقل بچے کو مکاتب بنانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان میں قبول کا تحقق نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا ان کی طرف سے زر کتابت ادا کر دے تو پھر بھی وہ مجنون اور کم عقل بچہ آزاد نہ ہوں گے اور جو کچھ اس کے مالک کو غیر کی طرف سے دیا گیا ہے وہ لوٹایا جائیگا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مکاتب بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ آقا اپنے غلام کو کہے میں نے تجھے اتنے مال پر مکاتب بنایا اور غلام کہے میں نے قبول کیا۔ پس غلام جب زر کتابت ادا کرے گا تو آزاد ہو جائے گا اگرچہ آقا نے یہ نہ بھی کہا ہو کہ جب تو ادا کرے گا تو تو آزاد ہے کیونکہ یہ موجب عقد ہے۔ پس آزادی بغیر تصریح کے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بیع میں ہوتا ہے۔ امام مالک اور احمد کا یہی قول ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں آقا کے لئے یہ کہنا شرط ہے کہ میں نے تجھے اس مال پر مکاتب بنالیا جو تو تھوڑا تھوڑا ادا کرے گا جب تو ادا کرے گا تو تو آزاد ہوگا۔ اگر تعلیق (آزاد کرنے) کا لفظ ترک کر دے اور اس کی نیت کرے تو بھی جائز ہے۔ بغیر نیت اور بغیر تعلیق کے کتابت کا لفظ کافی نہیں ہے۔ غلام کہے قبلت (میں نے قبول کیا)

مسئلہ: کتابت میں فوری مال کی ادائیگی کی شرط لگانا بھی جائز ہے اور دیر سے اور قسط وار ادائیگی کی شرط لگانا بھی جائز ہے۔ امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں فوری مال کی ادائیگی کی شرط لگانا جائز نہیں ہے' دو قسطوں میں ہونا ضروری ہے' کیونکہ غلام تھوڑے سے عرصہ میں رقم کی ادائیگی سے عاجز ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ غلام تھا اور کسی چیز کا مالک نہیں تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ آیت میں اقساط کی کوئی شرط نہیں ہے' اور ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہ عقد معاوضہ ہے اور بدل معقود بہ (ثمن) ہے' پس یہ بیع میں ثمن کے مشابہ ہو گیا۔ بیع میں جس طرح قیمت حوالے کرنے کی قدرت کی شرط نہیں ہوتی اسی طرح کتابت میں بھی شرط نہ ہوگی جتنی کہ مفلس کے لئے بڑے بڑے اموال خریدنا جائز ہوتا ہے' اور یہ ہو سکتا ہے کہ غلام کو ہبہ یا زکوۃ کے ذریعے بڑے بڑے اموال مل جائیں اور وہ فوراً زر کتابت ادا کر دے۔ اگر زر کتابت فوراً ادا کرنا ہو اور پھر مکاتب ادائیگی نہ کرے تو آقا کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے دوبارہ غلام بنالے۔

مسئلہ: جب کتابت کی عقد صحیح ہو جائے گی تو مکاتب آقا کے تصرف سے نکل جائے گا کیونکہ کتابت کا مقصود، یعنی بدل کی ادائیگی متحقق ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ مکاتب بیع وشراء اور سفر کرنے کا خود مالک ہو جائے گا اگرچہ مالک اس کو منع بھی کرے۔ لیکن اگر بدل (زر کتابت) مالک کی ملکیت میں نہیں آئے گا تو مکاتب مالک کی ملکیت سے خارج نہ ہوگا کیونکہ یہ (کتابت) عقد معاوضت ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ وہ ادائیگی سے پہلے اس کی ملکیت سے خارج نہ ہوگا۔

مسئلہ: کتابت آقا کی طرف سے عقد لازم ہے' آقا کے لئے جائز نہ ہوگا کہ اب اس کو فسخ کر دے لیکن غلام کی رضا سے فسخ کر سکتا ہے کیونکہ کتابت غلام کے لئے آزاد ہونے کا استحقاق ثابت کرتی ہے اور عتق (آزادی) فسخ کا احتمال نہیں رکھتا' اسی طرح اس کا استحقاق بھی فسخ کا احتمال نہیں رکھتا کیونکہ یہ (کتابت) بھی عتق کی طرح عبادت ہے اور اس کا فسخ کرنا عمل کو باطل کرنے کا موجب ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ۔ (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) لیکن غلام کی طرف سے یہ (کتابت) عقد لازم نہیں ہے۔ غلام کو اکتساب (کمانے) پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی رضا سے امام ابوحنیفہ' شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک کتابت فسخ ہو

جاتی ہے لیکن اگر غلام کے پاس اتنا مال ہو کہ جس سے زر کتابت مکمل ادا ہو سکتا ہو تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غلام کو اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جائیگا' ایسی صورت میں غلام (مکاتب) کے لئے کتابت کا فسخ کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ متعنت ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں غلام کو کمانے پر قدرت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو عاجز بنانا جائز نہیں ہے۔ اسے کمانے پر مجبور کیا جائے گا۔

مسئلہ: جب مکاتب آقا کی ملکیت سے نہیں نکلے گا تو آقا کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اسے آزاد کر دے، پس وہ مفت آزاد ہو جائے اور بدل کتابت اسکے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا کیونکہ یہ رقم آزادی کے مقابلہ میں لازم ہوئی تھی اور وہ آزادی بغیر رقم کے حاصل ہو چکی ہے اس لئے وہ رقم اس پر لازم نہ ہوگی۔ عقد کتابت اگرچہ آقا کی طرف سے لازم ہے لیکن غلام کی رضا سے اسے فسخ کر سکتا ہے اور ظاہراً اس کی رضا یہ ہے کہ وہ بغیر بدل کے اپنی آزادی کا وسیلہ ڈھونڈے۔

مسئلہ: جب مکاتب مالک کی ملکیت سے نہیں نکلے گا تو آقا کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنے مکاتب کو فروخت کر دے۔ یہ امام احمد کے نزدیک ہے۔ کتابت کی وجہ سے بیع فسخ نہ ہوگی بلکہ مشتری اس میں بائع کے قائم مقام ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی پہلا قول یہ ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں مکاتب کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ مگر اس کی رضا سے جائز ہے اور یہ کتابت کو فسخ کرنا ہوگا۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے اور امام شافعی کا جدید قول بھی یہی ہے۔ لیکن امام مالک کے نزدیک مکاتب کی بیع جائز ہے اور دین مؤجل (مؤخر) کی بیع فوری ثمن کے ساتھ جائز ہے۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے دوسرے مؤید علماء کے قول کی وجہ یہ ہے کہ مکاتب اپنی ذات پر تصرف کا مستحق ہو چکا ہے اور کتابت آقا کے حق میں عقد لازم ہے۔ اگر بیع میں مشتری کے لئے ملکیت ثابت ہو جائے تو یہ باطل ہو جائے گی حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ ملکیت کا مشتری کے لئے ثبوت امام احمد کے نزدیک کتابت کے فسخ کا مقتضی نہیں ہے اور مکاتب کو اپنی ذات پر تصرف کا استحقاق باطل نہیں ہوتا بلکہ مشتری اس میں بائع کے قائم مقام ہوتا ہے اور مشتری اس پر راضی ہو چکا ہے، اگر اسے مکاتب ہونے کا علم ہے' اگر مشتری کو پہلے غلام کے مکاتب ہونے کا علم نہیں ہے تو مشتری کو بیع کے فسخ کرنے کا حق ہے۔ امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس اپنی زر کتابت کی ادائیگی میں مدد طلب کرنے کیلئے حاضر ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسے کچھ نہ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فرمایا اسے خرید لو اور آزاد کر دو کیونکہ ولاء اس کو ملتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے(1) اور اس کی اصل صحیحین میں ہے کہ حضرت بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئی اور عرض کی میں نے 9 اوقیہ پر عقد مکاتبت کی ہے اور ہر سال اپنے مالک کو ایک اوقیہ دینا ہے' آپ میری اس سلسلہ میں مدد فرمائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اگر تیرے مالک یہ پسند کریں کہ میں انہیں تیری رقم یک مشت ادا کر دوں اور تجھے آزاد کر دوں' تو میں ایسا کر دوں گی اور ولاء میرے لئے ہوگی حضرت بریرہ اپنے مالکوں کے پاس گئی تو انہوں نے اس معاہدہ سے انکار کر دیا۔ حضرت بریرہ نے واپس آکر بتایا کہ میں نے اپنے مالکوں کے پاس آپ کی تجویز پیش کی ہے لیکن وہ اس بات پر مصر ہیں کہ ولاء ہماری ہوگی۔ اس واقعہ کے متعلق جب رسول اللہ ﷺ نے سنا تو آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا' میں نے تمام صورت حال عرض کی' آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تم اس لونڈی کو خرید لو

1۔ مسند احمد، جلد 6، صفحہ 81 (صادر)

اور پھر اسے آزاد کردو اور ان کیلئے ولاء کی شرط مان لو ولاء اس کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ الحدیث (1)۔
نسائی نے یہ واقعہ حضرت بریرہ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں امام احمد کے لئے کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ جھگڑا اور نزاع تو اس صورت میں ہے جب مکاتب کو اسکی رضا کے بغیر فروخت کیا جائے۔ لیکن اگر مکاتب کی رضا سے بیع ہو تو امام صاحب سے اظہر روایت یہ ہے کہ اس وقت بیع جائز ہے اور حضرت بریرہ کی بیع تو انکی رضا سے تھی۔ (اس میں تو نزاع ہی نہیں ہے) امام بخاری نے جس باب کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے اس کا عنوان ہی اس بات کا شاہد ہے' بَابُ بَيْعِ الْمُكَاتَبِ اِذَا رَضِيَ ۔ یعنی مکاتب کی بیع جب وہ راضی ہو۔
مسئلہ: مکاتب اس وقت آزاد ہوتا ہے جب پوری زر کتابت ادا کر دیتا ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے؟ فرمایا مکاتب اسوقت تک غلام ہے جب تک اس کی زر کتابت سے ایک درہم بھی باقی ہے (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد' نسائی اور حاکم نے کئی طرق سے روایت کیا ہے' نسائی اور ابن ماجہ نے ایک اور سند سے بھی روایت کی ہے جسکے راوی عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں' یہ ایک طویل حدیث ہے اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جو سو اوقیہ پر مکاتب ہو' وہ ایک اوقیہ کے علاوہ باقی سب بھی ادا کر دے تو بھی غلام ہے' نسائی فرماتے ہیں یہ حدیث منکر ہے' ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں راوی عطاء خراسانی ہے جس نے عبداللہ بن عمرو سے سماع نہیں کیا۔ اس حدیث کو ترمذی' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے غلام کو سو اوقیہ پر مکاتب بنایا پھر اس نے دس اوقیہ (یا فرمایا) دس دنانیر کے علاوہ سب ادا کر دیئے۔ پھر وہ مزید دس کی ادائیگی سے عاجز آ گیا تو وہ غلام ہے (3)' امام مالک نے موطا میں عن نافع عن ابن عمر سے موقوف روایت کی ہے کہ مکاتب غلام ہے جبکہ ایک درہم بھی زر کتابت سے باقی ہے (4)۔ ابن قانع نے ایک دوسری سند سے عن نافع عن عمر سے مرفوع روایت کی ہے لیکن اس کی علت بھی بیان کی ہے' صاحب ہدایہ لکھتے ہیں اس مسئلہ میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے کفایہ میں ہے کہ زید بن ثابت کا قول ہمارے قول کی مثل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جتنی مقدار زر کتابت ادا کر چکا ہے اتنا حصہ اس کا آزاد ہو جائے گا۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جب غلام اپنی قیمت کی مقدار ادا کر دے تو آزاد ہو جائے گا اور جو زائد زر کتابت باقی ہے اس میں مالک دوسرے قرض خواہوں کی طرح آقا بھی قرض خواہ ہوگا۔ ابن عباس فرماتے ہیں غلام مکاتب بنانے سے ہی آزاد ہو جائے گا۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مکاتب پر کسی حد کا فیصلہ ہو یا اسے کوئی میراث ملے تو جتنا اس کا حصہ آزاد ہے اسکے مطابق وارث ہوگا (5)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ
ام سلمہ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کے مکاتب کے پاس اتنا مال ہو جس سے زر کتابت ادا ہو سکتا ہے تو تم میں سے ہر ایک کو اس مکاتب سے پردہ کرنا چاہئے (6)' اس حدیث کو ترمذی ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔
مسئلہ: اگر مکاتب زر کتابت کی قسط ادا کرنے سے عاجز آ جائے تو حاکم اسکی کیفیت کا جائزہ لے گا اگر اس نے کوئی قرضہ لینا ہے یا کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 290 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی: 1260، جلد 4، صفحہ 387 (الفکر)
4۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 787 (التراث العربی)
5۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 4، صفحہ 385 (الفکر)
6۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 275 (الفکر)

اور ذریعہ سے اسے مال ملتا ہے تو حاکم فوری طور پر اس کے عاجز ہونے کا حکم نہ لگائے بلکہ تین دن تک مہلت دے' لیکن تین دن سے زائد مہلت نہ دے۔ اگر مکاتب کو کسی ذریعہ سے مال ملنے کی توقع نہ ہو اور اس کا آقا اس کے عاجز کرنے کا مطالبہ کرے تو اسے حاکم عاجز قرار دے دے۔ اور عقد کتابت کو فسخ کر دے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک ہے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں قاضی اسے عاجز قرار نہ دے حتیٰ کہ پے درپے دو اقساط ادا نہ کرے۔ آقا کے لئے خود مکاتب کو عاجز قرار دینا جائز نہیں بلکہ اس کا عجز قضاء قاضی یا غلام کی رضا سے ثابت ہوگا۔

مسئلہ: مکاتب نے اگر اپنے مولا کو ملنے والے صدقات دیئے پھر وہ اقساط کی ادائیگی سے عاجز آ گیا تو آقا کے لئے ان صدقات کا استعمال جائز اور حلال ہے، اگر چہ آقا غنی یا ہاشمی بھی ہو کیونکہ ملکیت بدلنے سے صدقات کا حکم بدل جاتا ہے۔ غلام صدقہ کا مالک بنتا ہے پھر آقا اس مال کو عتق کے عوض حاصل کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضور نبی رحمت ﷺ تشریف لائے تو ہنڈیا میں گوشت ابل رہا تھا آپ ﷺ کی بارگاہ میں روٹی اور گھر میں موجود سالن پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ہنڈیا میں گوشت نظر آ رہا ہے۔ گھر والوں نے عرض کی حضور ﷺ! گوشت تو واقعی ہے لیکن وہ ایسا گوشت ہے جو بریرہ پر صدقہ کیا گیا ہے اور آپ صدقہ کا گوشت تناول نہیں فرماتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ گوشت اس پر صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی شخص غنی یا ہاشمی کے لئے کوئی چیز مباح کرتا ہے تو اسکا حکم اس کے برعکس ہے کیونکہ جس کے لئے مباح کیا گیا ہے وہ مباح کرنے والے کی ملکیت سے لیتا ہے۔ اس صورت میں ملکیت تبدیل نہیں ہوتی اس لئے غنی آگے کسی کو وہ چیز نہیں دے سکتا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص بیع فاسد کے ذریعے کوئی چیز خریدتا ہے اگر وہ کسی دوسرے کے لئے وہ چیز مباح کرتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے لیکن اگر دوسرے کو مالک بنا دیتا ہے تو اس کے لئے اس کا استعمال جائز ہو جائے گا۔

مسئلہ: امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر غلام بدل کتابت ادا کرنے سے پہلے فوت ہو جاتا ہے تو وہ غلام کی حیثیت سے فوت ہوگا۔ اور عقد کتابت ختم ہو جائے گی خواہ وہ مکاتب مال چھوڑ کر مرا ہو یا بغیر مال کے مرا ہو۔ جیسا کہ قبضہ سے پہلے مبیع تلف ہو جائے تو بیع کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر' عبداللہ بن عمر' زید بن ثابت، عمر بن عبدالعزیز اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ' مالک' ثوری' عطاء' طاؤس' حسن بصری اور النخعی فرماتے ہیں اگر مال اتنی مقدار میں چھوڑ کر مرا ہے کہ اس کا بدل کتابت پورا ہو سکتا ہے تو وہ آزاد ہے اور بدل کتابت آقا کو ملے گا اور باقی مال آزاد ورثا کو ملے گا(1)۔

ے خیراً کا معنی ابن عمر نے کمانے پر قدرت کیا ہے۔ امام مالک اور ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ حسن' ضحاک اور مجاہد نے اس کا معنی مال کیا ہے اور بطور دلیل یہ ارشاد الٰہی پیش کیا ہے ان ترک خیراً۔ اس آیت میں خیراً کا معنی مال ہے۔ روایت ہے کہ سلمان کا ایک غلام تھا' غلام نے انہیں کہا کہ آپ مجھے مکاتب بنا دیں' سلمان نے پوچھا تیرے پاس مال ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ سلمان نے کہا تیرا ارادہ ہے کہ تو مجھے لوگوں کا میل کچیل کھلائے۔ (صدقہ و خیرات کے مال کو حضور ﷺ نے میل فرمایا ہے' سلمان نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے) یہ کہہ کر انہوں نے اسے مکاتب نہ بنایا(2)۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ غلام خود اور جو کچھ اس کے قبضہ میں ہوتا ہے وہ سب آقا کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 200 (الفکر)	2۔ ایضاً، صفحہ 199

ملک ہوتا ہے کیونکہ وہ مال کی ملکیت رکھنے کا اہل ہی نہیں ہوتا' مالکیت اور مملوکیت کے درمیان منافات ہے (یہ دونوں جمع نہیں ہوسکتیں) جب غلام مال کی ملکیت حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے تو بعد میں اس پر زر کتابت کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ زجاج کہتے ہیں اگر خیراً سے مال مراد ہوتا تو الفاظ اس طرح ہوتے اِنْ عَلِمْتُمْ لَهُمْ خَيْراً۔

ابراہیم بن زید اور عبید نے خیراً کا معنی صدق اور امانت بیان کیا ہے(1)۔ امام بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ خیراً کا معنی امانۃ اور وفاء ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غلام میں خیر کا اظہر معنی امانت کے ساتھ اکتساب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب غلام کمانے پر قادر ہو اور امین بھی ہو تو اس کو کتابت سے نہ روکا جائے(2)۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں خیراً سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اگر وہ مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ہو، مثلاً وہ کافر ہو اور کفار کی معاونت کرتا ہو تو ایسے شخص کو مکاتب بنانا مکروہ ہے لیکن اگر مالک اسے مکاتب بنا دے تو صحیح ہے۔ عبیدہ سے یہ معنی بھی حکایت ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غلام عاقل بالغ ہو۔ بچے اور مجنون کو مکاتب بنانا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان سے کوئی چیز طلب کرنا صحیح نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے کتابت کے امر کو الذین یبتغون الکتاب کے ارشاد پر مرتب فرمایا ہے۔ پس عقل کی شرط اسی سے سمجھ آ رہی ہے۔ پس اس تاویل پر یہ شرط لغو ہوگی اور بلوغ کی شرط لگانے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ بچہ جب عاقل ہو تو اس سے مطالبہ ہوسکتا ہے۔

مسئلہ: غلام جو کمائی نہ کرسکتا ہوں اس کو مکاتب بنانا امام ابوحنیفہ' مالک' شافعی اور ایک روایت میں احمد کے نزدیک مکروہ نہیں ہے' اور امام احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کو مکاتب بنانا مکروہ ہے' کیونکہ خیر سے مراد اکتساب پر قدرت ہے' میں کہتا ہوں اگر کتابت کے استحباب کے لئے اکتساب کی قدرت کا شرط ہونا تسلیم کر بھی لیا جائے تو استحباب کی شرط کا نہ پایا جانا اس کی کراہت کا مقتضی نہیں ہے۔ اس شرط کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ صدقات کی قبولیت کے ساتھ مال کا پہنچنا اس کے لئے ممکن ہے۔

مسئلہ: اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ ایسی لونڈی جو کمانے کی قدرت نہیں رکھتی اس کو مکاتبہ بنانا مکروہ ہے کیونکہ ہوسکتا ہے وہ بدکاری کا پیشہ اپنا کر مال کمانا شروع کر دے۔ واللہ اعلم۔

✿ اس جملہ میں مسلمانوں کو مکاتب کی اعانت پر برانگیختہ کیا جا رہا ہے ان کو صدقات دے کر ان کی معاونت کرو خواہ نفلی صدقات ہوں یا فرضی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت سے مراد ان کا وہ حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فرضی صدقات میں (وفی الرقاب) کے ارشاد کے ساتھ مقرر فرمایا ہے۔ حضرت حسن اور زید بن اسلم کا یہی قول ہے۔ آیت کا لفظ صدقات کو فرضی صدقات کے ساتھ خاص کرنے کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ امر استحباب کیلئے ہے؟ جیسا کہ کتابت (مکاتب بنانے) کا امر استحباب کے لئے ہے' بعض علماء فرماتے ہیں آقا کے لئے مستحب ہے کہ بدل کتابت میں سے کچھ حصہ معاف کر دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آقا پر بعض زر کتابت معاف کرنا واجب ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت عثمان' حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے پھر بدل کتابت میں سے ساقط کی جانے والی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زر کتابت کا چوتھا حصہ ساقط کر دے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ عبدالرزاق' سعید بن منصور، عبد بن حمید' ابن جریر' ابن المنذر' ابن مردویہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 199 2۔ ایضاً

اور بیہقی نے نے عبدالرحمن اسلمی کے طریق سے یہ قول روایت کیا ہے۔ بعض نے یہ قول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ تیسرا حصہ ساقط کرے۔ بعض کے نزدیک جتنا چاہے ساقط کر دے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ نافع فرماتے ہیں عبداللہ بن عمر نے اپنے ایک غلام کو پینتیس ہزار درہم پر مکاتب بنایا پھر آخری قسط میں پانچ سو درہم معاف کر دیئے تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر ابتداء میں مال معاف نہ کرتے تا کہ غلام کے ادائیگی سے عاجز آنے کی صورت میں صدقہ کیا ہوا مال واپس نہ آ جائے اور جتنا چاہتے آخر میں معاف فرما دیتے(1) میں کہتا ہوں ایتاء کی تفسیر ساقط کرنے اور کم کرنے سے کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ایتاء تملیک (مالک بنانے) پر دلالت کرتا ہے اور ساقط کرنے میں تملیک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آقا پر کوئی چیز ساقط کرنا واجب نہیں ہے وہ اسمیں بیع کا اعتبار کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی عقد معاوضت ہے اور تمام معاوضات میں ساقط کرنا واجب نہیں ہے۔ اسی طرح عقد کتابت میں بھی ساقط کرنا واجب نہیں ہوگا۔ کتابت غلام پر مال کتابت کے وجوب کا سبب ہے۔ پس یہ جائز نہیں ہے کہ جو چیز وجوب کا سبب ہے بعینہ وہی چیز ساقط کرنے کے استحقاق کا بھی سبب ہو جو وجوب کی ضد ہے، جس طرح کہ بیع ہے۔

میں کہتا ہوں بالا جماع بدل کتابت مقدر نہیں ہے۔ اگر بدل کتابت سے کچھ ساقط کرنا آقا پر واجب ہو تو پھر مولیٰ کے لئے جائز ہوگا کہ وہ ہزار درہم پر مکاتب بنا دے جبکہ اس کا ارادہ سات سو درہم پر مکاتب بنانے کا ہو۔ اور پھر تین سو درہم ساقط کر دے اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جائے ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۵۔ مسلم نے ابوسفیان عن جابر بن عبداللہ کے سلسلہ سے نقل فرمایا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈی کو کہتا کہ جاؤ اور ہمارے لئے اپنی بدکاری کے پیشہ سے کچھ کما کر لے آؤ۔ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی" کہ نہ مجبور کرو اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر(2)" اسکا عطف وانکحوا الایامیٰ پر ہے، نہی کا عطف امر پر ہے اور درمیان میں جملے معترضہ ہیں۔

مسلم نے اسی سند سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا، وہ ان سے بدکاری کا پیشہ کرواتا تھا ان دونوں لونڈیوں نے اپنی شکایت بارگاہ نبوت میں پیش کی تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حاکم نے ابوالزبیر عن جابر کے سلسلہ سے نقل کیا ہے کہ مسیکہ کسی انصاری کی لونڈی تھی اس نے بتایا کہ میرا مالک مجھے بدکاری پر مجبور کرتا ہے۔ اسوقت یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

بزار اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی ایک لونڈی تھی جو زمانہ جاہلیت میں بدکاری کرتی تھی جب زنا حرام قرار دیا گیا تو اس لونڈی نے کہا قسم بخدا میں اب زنا نہیں کروں گی۔ اسوقت یہ آیت نازل ہوئی۔

بزار نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس لونڈی کا نام معاذۃ روایت کیا ہے۔ سعید بن منصور نے سفیان عن عمرو بن دینار عن عکرمہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں مسیکہ اور معاذۃ تھیں وہ انہیں زنا پر مجبور کرتا تھا ان میں سے ایک نے کہا اگر یہ کوئی اچھا کام ہے تو میں اس سے زیادہ کمائی کروں گی اور اگر یہ اچھا کام نہیں ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 200 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 83 (العلمیہ) 3۔ مستدرک حاکم: 350 (العلمیہ)

تو مناسب ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں' اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ ایک دن ایک لونڈی چادر لے آئی اور دوسری دینار لے آئی عبداللہ بن ابی نے دونوں کو کہا کہ لوٹ جاؤ اور زنا کرو' دونوں نے کہا قسم بخدا ہم ایسا نہیں کریں گی اسلام آچکا ہے اور زنا حرام ہو چکا ہے۔ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور اپنی شکایت عرض کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی(1) ثعلبی نے مقاتل کی حدیث لکھی ہے کہ عبداللہ بن ابی کی چھ لونڈیاں تھیں اس کے متعلق لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ کا ارشاد نازل ہوا۔

ے امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ شرط مجبور کرنے کے لئے قید نہیں ہے کیونکہ اس کے بغیر اکراہ (مجبور کرنا) پایا ہی نہیں جاتا۔ اگر نہی کے لئے اس کو شرط بنایا جائے تو اسکے عدم سے اکراہ کا جواز لازم نہیں آتا اس لئے کہ منہی عنہ کے ارتفاع سے نہی کا ارتفاع جائز ہے(2)۔ یعنی پاکدامن رہنے کے ارادہ کے نہ پائے جانے کے وقت اکراہ ممتنع ہوگا بلکہ خوشی سے زنا متحقق ہوگا۔ میں کہتا ہوں اِن یہاں اذ کے معنی میں ہے اور یہ ظرف ہے شرط نہیں ہے۔ اور کلام اس طرح سبب نزول کی مطابقت کی وجہ سے خارج ہوگئی اور اذا کی جگہ اِن اس لئے ذکر کیا گیا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ لونڈیوں سے پاکدامن رہنے کا ارادہ شاذ و نادر ہے' اس قید میں مالکوں کو توبیخ کی گئی ہے اور انکو لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرنے پر عار دلائی گئی ہے اور اس بات پر انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ لونڈی اپنی کم عقلی، کوتاہ اندیشی اور غلبہ شہوت کے باوجود جب پاکدامن رہنے کا ارادہ کرتی ہیں تو اے سردارو! تم غیور مرد ہو تم اس بدکاری سے بچنے کے زیادہ حق دار ہو۔ حسین اور فضیل فرماتے ہیں اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا وَّلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ(3)۔

ے عرض الحياة الدنيا سے مراد لونڈیوں کی کمائی اور ان کی اولاد کی بیع ہے۔

۸ مالک اگر انہیں بدکاری پر مجبور کریں گے تو گناہ کا بوجھ مجبور کرنے والے پر ہوگا لونڈیوں پر اس گناہ کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ یہ معنی اس لئے کیا ہے کیونکہ حسن اس آیت کو پڑھتے تو کہتے لَهُنَّ وَاللّٰهِ لَهُنَّ وَاللّٰهِ۔ اور ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح ہے۔ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ لَهُنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (یہ قراتیں دلیل ہیں کہ اکراہ کی صورت میں لونڈیوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا) یہ قراۃ عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر عن ابن مسعود کے سلسلہ سے نقل کی ہے۔ اس تاویل کے مطابق من يكرههن کا قول مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی کیونکہ بعد والا جملہ خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اسمیں مبتدا کی طرف لوٹنے والی ضمیر نہیں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وَمَنْ يُّكْرِهْهُنَّ (فعليه وزرهن) فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ لَهُنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ اگر آیت کی تاویل اس طرح ہو فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ لَّهٗ۔ (اگر مجبور کرنے کے بعد جو شخص توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخشنے والا (اور) رحم فرمانے والا ہے) تو پھر یہ بعد والا جملہ من يكرههن کی خبر بن سکتا ہے۔ لیکن یہ بعید ہے کیونکہ جس شخص نے اکراہ کا فعل کیا اس کو توبیخ کرنے کے لئے یہ کلام ذکر کی گئی ہے اور ایسی جگہ میں مغفرت و رحمت کا وعدہ مناسب نہیں ہے۔ یہ تاویل درست ہی نہیں کیونکہ آیت کا نزول عبداللہ بن ابی منافق کے بارے ہوا جس کے متعلق ارشاد ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (یکساں ہے ان کے لئے آپ طلب مغفرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 50-49 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (الفکر)

کریں ان کے لئے یا طلب مغفرت نہ کریں ان کیلئے اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا انہیں بے شک اللہ تعالیٰ فاسقوں کی راہبری نہیں کرتا)۔
اگر یہ کہا جائے کہ مجبور لونڈی جب گناہ گار نہیں ہے تو مغفرۃ کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں اکراہ عقل اور ذمہ داری کے پائے جانے کیوجہ سے فعل کی ادائیگی کی اہلیت کے منافی نہیں ہے اور اکراہ کسی حال میں بھی خطاب کے سقوط کا موجب نہیں ہے، کیونکہ مجبور شخص مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور ابتلاء خطاب کو ثابت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجبور شخص پر کسی نفس کو قتل کرنا حرام ہے اور قتل کرنے کی صورت میں امام زفر کے نزدیک قاتل مجبور پر قصاص واجب ہوگا۔ لیکن امام ابوحنیفہ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ مجبوری کی صورت میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے رخصت بھی دی ہے اور گناہ بھی نہیں لکھا جاتا مثلاً دل جب ایمان سے مطمئن ہو تو مجبوری کی حالت میں زبان پر کلمہ کفر جاری کرنا جائز ہے۔ نماز کا فاسد کرنا۔ روزہ توڑنا' احرام کھول دینا کسی کا مال تلف کرنا وغیرہ بھی مجبوری کی حالت میں جائز ہے جبکہ اکراہ کامل ہو' گناہ کو اٹھا لینا اور رخصت دینا کئی مقامات پر رحمت و مغفرت کے آثار ہیں کیا آپ نے یہ ارشاد نہیں سنا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اسمیں بھی گناہ کی نفی کے ساتھ ہی مغفرت و رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ گناہ کے رفع سے مراد وہ گناہ ہو جو اکراہ میں تھا جس کی وجہ سے انسان مجبور ہوا۔ اور اکراہ یہ ہے کہ جس سے مجبور شخص ڈرتا ہے کہ نفس ضائع ہو جائے گا یا کوئی عضو ضائع ہو جائے گا جبکہ وہ ایسے شخص کی طرف سے ہو جو یہ اقدامات کرنے پر قادر بھی ہو۔ یہاں کلام عبداللہ بن ابی کے اپنی لونڈیوں کو مجبور کرنے میں ہے اور ظاہر ہے کہ وہ مجبور نہیں تھا اس لئے اس کا گناہ مرتفع نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور ہم نے اتاری ہیں تمہاری طرف روشن آیتیں نیز (ہم نے اتارے ہیں) بعض حالات ان لوگوں کے جو گزر چکے ہیں تم سے پہلے' نیز (اتاری ہے) نصیحت پرہیزگاروں کے لئے۔ ؎''

؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے، یعنی اے محمد ﷺ ہم نے اس سورت میں تمہاری طرف واضح آیتیں نازل کی ہیں۔ ابن عامر' حفص' حمزہ اور کسائی نے مبینت کو اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ایسی آیات جو احکام اور حدود کو بیان کرنے والی ہیں یا یہ بین سے مشتق ہے جو تبیین کے معنی میں ہے، یعنی واضح آیات جن کی پہلی کتب اور عقول سلیمہ تصدیق کرتی ہیں۔ باقی قراء نے اسم مفعول کے صیغہ کے ساتھ الفتح پڑھا ہے، یعنی ایسی آیات جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں اور ان میں احکام اور حدود واضح ہیں۔ اسمیں ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا گیا ہے جو پہلے لوگوں کے واقعات کی مثل ہے' یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ یوسف علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کے واقعہ کی طرح ہے یا یہ معنی اے میرے نبی کی زوجہ محترمہ عائشہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانے والو! تمہاری حالت پہلے لوگوں کی حالت کے مشابہ ہے اس لئے تمہیں بھی اسی انجام سے دوچار ہونا ہوگا جن سے پہلے کذاب و مفتری لوگ ہوئے۔ ان آیات میں متقین کو نصیحت کی گئی ہے۔ متقین کی تخصیص اس لئے فرمائی کیونکہ وہی خوش نصیب اور سعادت مند ہی آیات بینات سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا

شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾

''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا ۱؎ اسکے نور کی مثال ایسی ہے ۲؎ جیسے ایک طاق ہو ۳؎ اس میں چراغ ہو ۴؎ وہ چراغ شیشہ کے (ایک فانوس) میں ہو وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے جو موتی کی طرح چمک رہا ہے ۵؎ جو روشن کیا گیا ہے برکت والے زیتون کے درخت سے ۶؎ جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے ۷؎ قریب ہے اسکا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے ۸؎ (یہ) نور ہی نور ہے ۹؎ پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے ۱۰؎ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ طرح طرح کی مثالیں لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ۱۱؎ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ۱۲؎''

۱؎ نور اس کیفیت کو کہتے ہیں جسے پہلے آنکھ حاصل کرتی ہے پھر اس کیفیت کے واسطہ سے آنکھ تمام دیکھی جانے والی اشیاء کا ادراک کرتی ہے، جس طرح چاند اور سورج سے نکلنے والی شعاعیں اجسام کثیفہ پر پڑتی ہیں جو ان کے سامنے اور مقابل ہوتے ہیں۔ (چونکہ اجسام کا حدوث کیفیات اور اعراض جو اجسام کے ساتھ قائم ہوتی ہیں ان کے حدوث کو مستلزم ہے) اسلئے اس کیفیت کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کرنا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ ارشاد اپنے ظاہر پر نہیں ہے کہ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ مثل نورہ میں ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی طرف نور کی اضافت ہے جو اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کی ذات نور نہیں ہے بلکہ نور ذات سے مغایر ہے۔ پس علماء نے اللہ کی ذات پر نور کے اطلاق میں کئی وجوہ بیان فرمائی ہیں یا تو نور سے پہلے مضاف مقدر ہے (یعنی صاحب النور کے معنی میں ہے) یا مبالغہ پیدا کرنے کے لئے مصدر کے ساتھ صحت بیان کی گئی ہے، یعنی وہ ہر پوشیدہ چیز کو روشن و ظاہر کرنے والا ہے کیونکہ وہ سراپا نور ہے' جیسے کہا جاتا ہے زید کرم یعنی زید ذو کرم یا کریم۔ زید کرم کرنے والا ہے یا انتہائی کریم ہے گویا سراپا کرم ہے۔ یا مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یعنی آسمان کو سورج ، چاند' ستاروں سے منور کرنے والا ہے۔ ضحاک نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زمین کو نباتات اور اشجار سے منور کرنے والا ہے بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انوار اسی سے ہیں عرب کہتے ہیں فُلَانٌ رَحْمَةٌ اَیْ مِنْهُ رَحْمَةٌ ۔ کبھی کبھی یہ لفظ بطور مدح ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے سَارَ عَبْدُ اللّٰهِ مِنْ مَرْوٍ لَيْلَةً فَقَدْ سَارَ مِنْهَا نُوْرُهَا وَ جَمَالُهَا۔ ایک رات عبداللہ مرو سے چلا تو مرو سے اس کا نور و جمال بھی چلا گیا۔

بعض نے اس کا معنی مدبر کیا ہے' قوم کا رئیس جو قوم کے امور کے متعلق سوچ بچار کرتا ہے اسے نور القوم کہتے ہیں۔ کیونکہ قوم اس کی راہنمائی میں اپنے امور طے کرتی ہے۔ بعض نے نور کا معنی موجد (پیدا کرنے والا) کیا ہے کیونکہ نور وہ ہوتا ہے جو خود ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ خفاء کی اصل عدم ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے موجود ہے اور ہر چیز کو ایجاد فرمانے والا ہے۔ یا نور سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے یا آسمان اور زمین والوں کا نور ہے۔ (یعنی آنکھ کے ذریعے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کے ادراک کا سبب ہے' اور اس کے ذریعے آسمانوں اور زمین والے اشیاء کا ادراک کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قوت باصرہ پر بھی نور کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی ادراک کا سبب ہے اور ادراک کے قوت باصرہ پر موقوف ہونے کی وجہ سے قوت باصرہ نور کے ساتھ شریک ہے۔ پھر نور کا اطلاق بصیرت پر بھی ہوتا ہے کیونکہ بصیرت کا ادراک قوت باصرہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بصیرت اپنا ادراک کرتی ہے اور اسکے علاوہ موجود و معدوم کلیات و جزئیات کا ادراک بھی کرتی ہے اور موجودات و معدومات کے بواطن میں غور و خوض بھی کرتی ہے۔

نیز ترکیب وتحلیل کے ذریعے ان میں تصرف بھی کرتی ہے۔(یعنی بصیرت جنس کو فصل کے ساتھ ملاتی ہے' پس ان کے ملاپ سے طبیعت نوعیہ مرکبہ پیدا کرتی ہے۔پھر اس طبیعت واحدہ مقومہ کے مقومات کو جنس کی طرف اور عوارض لازمہ اور مفارقہ کی طرف تحلیل کرتی ہے پھر ان مقومات کو جنس کی طرف' جنس الجنس کی طرف' فصل کی طرف اور فصل الفصل وغیرہ کی طرف تحلیل کرتی ہے)اور پھر یہ ادراکات بذاتہا حاصل نہیں ہوتے ہیں ورنہ کبھی اس قوت سے جدا نہ ہوتے بلکہ یہ اس سبب سے ہوتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ ابتداءً ان ادراکات پر فیضان فرماتا ہے۔یا ملائکہ اور انبیاء کے ذریعے فیضان فرماتا ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء و ملائکہ کو بھی نور کہا جاتا ہے۔اسی قول کے قریب قریب ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے، جسے علامہ بغوی نے ذکر فرمایا ہے کہ اسکا معنی هَادِیْ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے،یعنی آسمانوں اور زمین والوں کا وہ ہادی ہے۔پس اسی کے نور ہدایت سے حق کی طرف راہنمائی پاتے ہیں اور گمراہی کی حیرانی سے نجات پاتے ہیں(1)۔نور کی اضافت آسمانوں اور زمین کی طرف اس لئے فرمائی ہے تاکہ اس کے نور کے اشراق کی وسعت پر دلالت ہو جائے۔یا اسلئے کہ آسمان اور زمین چونکہ انوار حسیہ اور عقلیہ پر مشتمل ہیں اور ادراک بشری آسمان اور زمین پر مقصور ہے اور انہی دو کے ساتھ متعلق ہے اس لئے ان کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے۔

۲۔ یعنی اس بندہ مومن کے دل میں اللہ کے نور کی عجیب وغریب صفت ہے جو اس نور کے ذریعے ذات الٰہی اور صفات الٰہیہ کا ادراک کرتا ہے اور ان چیزوں کی تصدیق تک پہنچتا ہے جن کے ادراک تک بغیر کسی واسطہ کے دانشوروں کی عقلیں بھی نہیں پہنچ سکتیں اور وہ بندہ مومن جو حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔(وہ اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے)علامہ بغوی فرماتے ہیں، ابن مسعود اس آیت کو مَثَلُ نُوْرِهٖ فِیْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ پڑھتے تھے۔سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کا مفہوم اسطرح روایت فرماتے ہیں۔مَثَلُ نُوْرِهِ الَّذِیْ اَعْطَى الْمُؤْمِنَ (یعنی اللہ تعالیٰ کے نور کی صفت جو اس نے مومن کو عطا فرمائی)بعض علماء فرماتے ہیں نورہ کی ضمیر کا مرجع مومن ہے۔ابی بن کعب مَثَلُ نُوْرِ قَلْبِ مَنْ آمَنَ پڑھتے تھے۔یعنی وہ بندہ جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن سے مزین فرمادیا۔حسن اور زید بن اسلم فرماتے ہیں نور سے مراد قرآن ہے۔سعید بن جبیر اور الضحاک فرماتے ہیں هو محمد ﷺ کہ نور سے مراد محمد ﷺ کی ذات اطہر ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں نور سے مراد طاعت ہے۔اطاعت الٰہیہ کو نور کہا گیا ہے اور ان انوار کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

۳۔ مشکوٰۃ دیوار میں چراغ رکھنے کی جگہ کو کہتے ہیں جو ایک طرف سے کھلی اور باقی اطراف سے بند ہوتی ہے۔اگر دیوار کا وہ سوراخ آر پار ہو تو اسے کوۃ کہتے ہیں۔بعض علماء فرماتے ہیں یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد قندیل ہے(2) اور مضاف مقدر ہے' مطلب یہ ہے کہ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمَثَلِ نُوْرِ مِشْكٰوةٍ،یعنی اللہ کے نور کی صفت قندیل کے نور کی صفت کی طرح ہے۔

۴۔ مصباح' الصبح سے مشتق ہے اور اس سے مراد چراغ ہے۔الصبح کا معنی الضوء ہے۔الصبح بمعنی الفجر بھی استعمال ہوتا ہے۔زجاجہ کا معنی شیشے کا فانوس ہے۔زجاج فرماتے ہیں، یہاں زجاجہ کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ فانوس میں روشنی زیادہ ہو جاتی ہے(3)۔یہ جملہ (المصباح فی زجاجةٍ) مصباح کی صفت ہے اور ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے پھر زجاجۃ کی صفت الزجاجة كانها كوكب دری یوقد ہے۔اس جملہ (الزجاجة كانها الخ) میں بھی ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے۔

ابوعمرو اور کسائی نے دری کو دال کے کسرہ مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اسکا وزن فعیل ہے اور درء سے مشتق ہے۔ابوبکر اور حمزہ

1۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 202(الفکر) 2۔ایضاً،صفحہ 203 3۔ایضاً۔

نے دال کے ضمہ مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ وزن شاذ ہے۔ اکثر علماء نحو فرماتے ہیں کہ کلام عرب میں فعیل (بضم فاء اور کسرہ عین) کا وزن نہیں پایا جاتا۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں اسکی اصل فعول ہے اور یہ درات سے مشتق ہے جیسے سبوح ہے۔ پھر عربوں نے ضموں کی کثرت کو ثقیل سمجھا تو بعض ضموں کو کسرہ کی طرف لوٹا دیا جیسے عتیا جو اصل میں عتیا بضم عین تھا اور عتوؤ سے مشتق تھا اس کے ضمہ کو کسرہ سے بدل دیتے ہیں۔ ان دونوں قراءتوں کے مطابق اس کا اشتقاق درء سے ہوگا جس کا معنی دور کرنا ہے کیونکہ اسکی ضوء سے تاریکیاں دور ہوتی ہیں یا اس کی چمک کی وجہ سے روشنی ایکدوسرے سے ٹکراتی ہے اور ایک دوسرے کو دور کرتی ہے۔ یا آسمان سے اس کے ذریعے شیطانوں کو دور کیا جاتا ہے۔ ستارے کو شیاطین کے دور کرنے کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس وقت اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ درء الکوکب سے مشتق ہے جب وہ دور ہوتا ہے اور اس وقت اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ طلع سے مشتق ہے جس کا معنی طلع (طلوع ہونا) ہے۔ عرب کہتے ہیں درء النجم، ستارہ بلند ہوا۔ اسی طرح کہتے ہیں درء فلان علینا۔ (یعنی فلاں ہمارے پاس ظاہر ہوا) مطلب یہ ہوگا کہ گویا وہ طلوع ہونے والا ستارہ ہے۔ دوسرے قراء نے دال کے ضمہ راء مشددہ اور یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ در سے منسوب ہے یعنی اپنی صفائی اور اپنے حسن کی وجہ سے موتی کی طرف منسوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ستارے کی روشنی موتی کی چمک سے زیادہ ہوتی ہے، پھر اس کی موتی کی طرف نسبت کیوں کی گئی ہے؟ ہم کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ستارہ تمام سے زیادہ روشن اور خوبصورت ہے، جیسا کہ موتی تمام دوسرے موتیوں سے خوبصورت ہوتا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کوکب دری، پانچ بڑے ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے۔ وہ بڑے ستارے یہ ہیں۔ زحل، مریخ، مشتری، زہرہ اور عطارد۔

میں کہتا ہوں شاید یہ ستارہ زہرہ ہے کیونکہ یہ دوسروں سے زیادہ روشن ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ستارے سے تشبیہ دی ہے سورج اور چاند سے تشبیہ نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کو گرہن لگتا ہے جبکہ ستاروں کو گرہن نہیں لگتا۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ مصباح کو سورج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے ارشاد ہے جعلنا الشمس سراجاً۔ زجاجہ کو ستارے کے ساتھ تشبیہ دی تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ مصباح سے زجاجہ کا مرتبہ کم ہے۔ اگر کانها شمس فرمایا جاتا تو زجاجہ کی مصباح پر فضیلت لازم آتی اور یہ مقصود میں خلل کا باعث ہوتا۔

5 یوقد، مصباح کی دوسری خبر ہے یا وہ ''فی زجاجہ'' ظرف مستقر میں ضمیر عائد سے حال ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو، ابوجعفر اور یعقوب نے تاء فوقانیہ اور واؤ مفتوحہ اور قاف مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی باب تفعل سے ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ چراغ روشن ہوا۔ عرب کہتے ہیں تو قدت النار ای اتقدت۔ آگ روشن ہوئی۔ باقی قراء نے باب افعال سے مضارع مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے تاء فوقانیہ کے ساتھ اس لئے پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ضمیر کا مرجع مضاف کے حذف کے ساتھ الزجاجہ ہے۔ تقدیر اسطرح ہے توقد نار الزجاجة۔ کیونکہ زجاجہ خود تو جلایا نہیں جاتا۔ باقی قراء نے یاء تحتانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ ضمیر کا مرجع المصباح ہے۔ یعنی یوقد المصباح۔

6 من شجرة میں من ابتدائیہ ہے یا مضاف کے حذف کی بناء پر سببیت کیلئے ہے، یعنی من دهن شجرة۔ پہلے شجرۃ کو مبہم ذکر فرمایا پھر مبارکة کے ساتھ وصف بیان فرمایا پھر زیتونة کے ساتھ اس کا بدل ذکر فرمایا یہ تمام انداز و اسلوب اس کی عظمت شان کے

اظہار کے لئے ہیں۔ کیونکہ وہ درخت بڑا بابرکت ہے اس میں بہت زیادہ منفعت ہے۔ زیتون کا تیل چراغ میں جلایا جاتا ہے جو انتہائی صاف ہوتا ہے اور تمام تیلوں سے اس کی روشنی زیادہ چمکدار ہوتی ہے' زیتون کا تیل بطور سالن بھی استعمال ہوتا ہے۔ زیتون بطور پھل بھی کھایا جاتا ہے۔ اسکے تیل کو نکالنے کے لئے کسی نچوڑنے اور تیل نکالنے والے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ خود بخود نکلتا ہے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ یہ ناسور کو درست کرتا ہے۔ یہ وہ درخت ہے جو اوپر سے نیچے تک جلایا جاتا ہے(1)۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اسید بن ثابت یا اسید الانصاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیت کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ برکت والا درخت ہے(2)۔ امام ترمذی نے حضرت عمر سے یہ حدیث مرفوع روایت کی ہے۔ احمد' ترمذی اور حاکم نے ابو اسید سے مرفوع روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور حاکم نے اسے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع روایت کیا ہے کہ زیتون کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ پاکیزہ اور مبارک (درخت) ہے۔ ابونعیم نے الطب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیت کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ ستر بیماریوں کی شفاء ہے جن میں سے ایک جذام بھی ہے(3)۔

ے لا شرقیه ' زیتونة کی صفت ہے اور حرف نفی' نفی کا فائدہ دینے کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نہ تو وہ ایسی جگہ پر ہے کہ ہمیشہ اسے سورج کی دھوپ لگتی رہتی ہو جو کہ اسے جلا دیتی ہو اور نہ ایسی جگہ پر پوشیدہ ہے کہ ہمیشہ اس پر سورج کی دھوپ نہ پڑتی ہو کہ اس کا پھل کچا رہ جاتا ہو۔ یہ معنی سدی اور چند دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ نہ تو وہ آبادی کے مشرق میں ہے کہ صرف سورج کی دھوپ اس پر اس کے طلوع ہونے کے وقت پڑتی ہو۔ اور نہ آبادی کے مغرب میں ہے کہ صرف سورج کے غروب ہونے کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو۔ بلکہ یہ چوٹی پر یا صحراء میں اگا ہوا ہے جس پر ہمیشہ سورج کی کرنیں پڑتی رہتی ہیں۔ اسی لئے اس کا پھل پکا ہوتا ہے اور اس کا تیل صاف وشفاف ہوتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے فُلَانٌ لَابِاَبْيَضَ وَلَا بِاَسْوَدَ ' یعنی نہ بالکل سفید ہے نہ بالکل سیاہ ہے لیکن اسمیں دونوں رنگوں کی آمیزش ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں هٰذَا الرُّمَانُ لَيْسَ بِحَامِضٍ وَلَاحُلْوٍ یعنی یہ انار نہ کھٹا ہے نہ میٹھا ہے بلکہ اس میں کھٹا پن اور مٹھاس جمع ہیں۔ یہ ابن عباس کا قول ہے، جسے عکرمہ نے روایت کیا ہے۔

کلبی اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے' بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے، نہ تو یہ زمین کے مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے بلکہ زمین کے وسط یعنی شام میں ہے کیونکہ شام کا زیتون عمدہ ہوتا ہے۔ الحسن فرماتے ہیں یہ دنیا کے درختوں میں سے نہیں ہے اگر دنیا کے درختوں سے ہوتا تو شرقی یا غربی ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال دینے کیلئے بیان فرمایا ہے(4) اس آخری قول کی بناء پر میں کہتا ہوں شاید جنت کے درختوں میں سے کوئی درخت مراد ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال جنت کے زیتون کے نور کے ساتھ دی ہو۔

۸۔ یہ جملہ زیتونۃ کی دوسری صفت ہے۔ اس کلام میں زیتون کے تیل کی صفائی اور سفیدی میں مبالغہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اور یکاد کا کلمہ کلام کی تصحیح کا موجب ہے۔

۹۔ یعنی نور الٰہی کو جس نور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وہ نور ہی نور ہے کیونکہ چراغ کا نور کئی گنا بڑھ جاتا ہے جب تیل انتہائی نفیس ہو۔ نیز وہ چراغ بلوریں قندیل میں ہو۔ پھر وہ چراغ مخصوص چراغ دان میں رکھا ہوا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (الفکر) 2۔ ایضاً

3۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 48 (مؤسسۃ الرسالۃ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205

علامہ بغوی فرماتے ہیں اہل علم کا اس مثال کے معنی بیان کرنے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ تمثیل نور محمد ﷺ کے لئے بیان کی گئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کعب الاحبار سے مثل نورہ کمشکوٰۃ کے ارشاد کے متعلق پوچھا تو حضرت کعب نے فرمایا یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کے لئے بیان فرمائی ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد نبی کریم ﷺ کا سینہ مبارک ہے اور زجاجہ سے مراد آپ ﷺ کا قلب منور ہے اور مصباح سے مراد نبوت ہے(1)۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ کا نور اور حضور ﷺ کی شان بلند خود بخود لوگوں پر عیاں تھی اگرچہ آپ اعلان نبوت نہ بھی فرماتے جیسا کہ وہ تیل اتنا روشن تھا کہ اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تو وہ خود بخود روشن ہو جائے وہ نور ہی نور ہے۔ حضرت کعب نے کتنی پیاری بات کہی ہے۔ میں یہاں ایک فصل تحریر کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ حضور ﷺ کی شان رفیع اعلان نبوت سے پہلے بھی ظاہر تھی۔

اعلان نبوت سے پہلے ظاہر ہونے والے معجزات

خلاصۃ السیر میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ نے فرمایا جب میرے بطن میں محمد ﷺ تھے تو میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھ سے ایک نور خارج ہوا جس کی وجہ سے بصریٰ کے محلات روشن ہو گئے ہیں'' پھر جب محمد ﷺ میرے بطن سے باہر آئے تو آپ ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے تھے اور آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے تھے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو آپ کی والدہ ماجدہ نے جنم دیا تو والدہ نے ایسا نور دیکھا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ فرماتے ہیں اس حدیث کو ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ ابو نعیم کی دلائل میں ہے کہ جب آپ ﷺ کی ولادت پاک ہوئی تو آپ کی والدہ فرماتی ہیں ایک فرشتہ نے آپ کو تین مرتبہ پانی میں غسل دیا پھر فرشتے نے سفید ریشم کی ایک تھیلی نکالی جس میں ایک مہر تھی پھر اسے آپ ﷺ کے کندھے پر لگایا وہ چھپے ہوئے سفید انڈے کی طرح تھی زہرہ ستارہ کی طرح چمکتی تھی۔ بیہقی' ابن ابی الدنیا اور ابن السکن نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی میلاد کی رات ایوان کسریٰ پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس کے چودہ کنگرے گر گئے۔ کسریٰ گھبرا گیا اور فارس کا آتش کدہ بجھ گیا جبکہ اس سے پہلے اسے ہزار سال گزر چکا تھا کبھی اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تھی اور ساوہ جھیل خشک ہو گئی(2)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک یہودی مکہ میں رہتا تھا اور یہاں ہی تجارت کرتا تھا جس رات رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو اس یہودی نے کہا اے قریشیو! اس رات اس امت کا نبی پیدا ہوا ہے جس کے کندھوں کے درمیان علامت ہے اس علامت میں متواتر بال ہیں گویا وہ گھوڑے کی کلغی کی طرح ہیں۔ قریش یہودی کو لے کر گئے حتیٰ کہ آپ کی والدہ ماجدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے اور کہا اپنے صاحبزادے کو باہر لے آؤ۔ آپ باہر لائیں تو انہوں نے آپ کی پیٹھ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا' جونہی اس یہودی کی نظر اس مہر نبوت پر پڑی تو غش کھا کر گر گیا۔ لوگوں نے کہا کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ اس یہودی نے کہا ذَهَبَتْ وَاللّٰهِ النُّبُوَّةُ مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ۔ قسم بخدا نبوت کا سلسلہ بنی اسرائیل سے نکل گیا ہے۔ اس روایت کو حاکم نے روایت کیا ہے(3)۔

مواہب اللدنیہ میں عیصا الراہب کا واقعہ لکھا ہے جو اہل مکہ کو کہا کرتا تھا اے اہل مکہ قریب ہی تمہارے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے عرب جس کی اطاعت کریں گے اور وہ عجم کا مالک ہوگا۔ یہی زمانہ اسکی آمد کا ہے' جب آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (الفکر) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 1، صفحہ 4 3۔ مستدرک حاکم: 4177، جلد 2، صفحہ 657 (العلمیۃ)

اس راہب نے عبداللہ بن المطلب کو کہا وہ بچہ تمہارے خاندان میں پیدا ہو چکا ہے جس کے متعلق میں تم سے گفتگو کرتا رہتا تھا۔
عباس بن عبدالمطلب فرماتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! مجھے آپ کے دین میں داخل کرنے والی چیز آپ کی نبوت کی نشانی ہے۔ میں نے آپ کو بچپن میں پنگھوڑے کے اندر دیکھا کہ چاند آپ کا دل بہلاتا تھا۔ آپ اس کی طرف اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے' تو وہ اسی طرف جھک جاتا تھا جدھر آپ اشارہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں چاند سے باتیں کرتا تھا اور وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور مجھے رونے سے چپ کراتا تھا۔ اور میں چاند کی آواز سنتا تھا جب وہ عرش کے نیچے اپنے رب کے حضور سجدہ کرتا تھا۔ آپ ﷺ کے خصائص میں یہ بھی شمار کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا جھولا فرشتے جھولاتے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ پیدائش کے وقت بولے تھے۔ ابویعلی اور ابن حبان نے عبداللہ بن جعفر سے انہوں نے حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں جب میں نے آپ ﷺ کو دودھ پلانے کے لئے اپنی گود میں رکھا تو آپ ﷺ نے سیر ہو کر دودھ پیا اور آپ کے بھائی ضمرہ نے بھی آپ کے ساتھ دودھ پیا اور سو گئے (1)۔ جبکہ اس سے پہلے ضمرہ سوتا نہیں تھا کیونکہ میری چھاتی میں اتنا دودھ ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ سیر ہو کر پیتا اور نہ ہماری اونٹنی کا اتنا دودھ ہوتا کہ وہ ان کی مکمل غذا بنتا۔ لیکن اس روز جب میرے خاوند نے اسی اونٹنی کو دیکھا تو اسکی کھیری دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اسے دوہ کر اتنا دودھ لائے کہ انہوں نے خود بھی پیا اور میں نے بھی پیا حتیٰ کہ ہم سیر ہو گئے اور بڑے سکون سے ہم نے رات گزاری۔ جب ہم آپ ﷺ کو لے کر واپس چلے تو میں اپنی گدھی پر سوار ہوئی اور آپ ﷺ کو بھی سوار کیا قسم بخدا، اس نے اس طرح تیزی سے سفر طے کیا کہ سرخ اونٹ بھی اتنی تیزی سے چلنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے ساتھ آنے والی عورتوں نے مجھے کہا۔ اے ابی ذویب کی بیٹی، ہمیں ساتھ لے کر چلیے کیا یہ وہی گدھی نہیں ہے جس پر تو سوار ہو کر آئی تھی؟ میں کہتی، ہے تو بالکل وہی گدھی جو آتے ہوئے بڑی آہستہ چلتی تھی حتیٰ کہ اس کے لئے قافلہ کو رکنا پڑتا تھا۔ اور قافلہ والوں پر اس کی کمزوری اور لاغری پریشانی کا باعث تھی۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ جب اس نے آپ ﷺ کا دودھ چھڑایا تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے زبان سے یہ کلمہ بولا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْراً وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْراً وَ سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلاً۔ پھر جب آپ کچھ بڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے تو آپ گھر سے باہر نکلتے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتے لیکن آپ ﷺ ان سے الگ تھلگ بیٹھتے تھے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت حلیمہ سعدیہ آپ ﷺ کو کہیں دور نہ جانے دیتیں تھیں۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اپنے رضاعی بہن شیماء کے ساتھ گرمی کے وقت میں اونٹوں کی طرف باہر نکل گئے' حضرت حلیمہ نے کہا اس گرمی میں باہر پھر رہے ہو آپ کی رضاعی بہن شیماء نے کہا امی جان! میرے بھائی کو گرمی دھوپ بالکل نہیں لگی میں نے دیکھا کہ آپ پر ایک بادل سایہ کئے ہوئے ہے آپ ٹھہرتے تو وہ بادل بھی ٹھہر جاتا آپ چلتے تو وہ بھی چل پڑتا۔
شمائل محمدیہ میں ہے کہ حضرت حلیمہ سعدیہ فرماتی ہیں ہم جب کبھی کسی کمرے میں اندھیرا محسوس کرتے اور چراغ کی ضرورت سمجھتے تو ہم آپ کو وہاں لے جاتے کیونکہ آپ کے چہرہ انور کا نور اور روشنی چراغ کی روشنی سے زیادہ تھی' جس دن سے آپ ہمارے گھر تشریف لائے ہیں ہمیں چراغ کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ آپ جس جگہ تشریف لاتے وہ جگہ آپ کی برکت سے منور ہو جاتی۔
حضرت حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب آپ کو لے کر بت کدہ میں گئی تو ہبل (بت) نے اپنا سر جھکا دیا۔ اسی طرح تمام دوسرے بتوں نے

1۔ مسند ابویعلی، جلد 6، صفحہ 171　　　2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 1، صفحہ 40-139 (العلمیہ)

آپ کی تعظیم میں سر جھکا دیئے۔ حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کو حجر اسود کے پاس لے گئی تا کہ آپ اسے بوسہ دیں تو حجر اسود اپنی جگہ سے نکلا اور آپ ﷺ کے چہرہ اقدس کے قریب ہو گیا۔ (تا کہ آپ بآسانی بوسہ دے لیں)

روایت ہے کہ جب حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو اپنی چھاتی کا دودھ پلایا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی چھاتی میں اتنا دودھ زیادہ ہو گیا کہ آپ ﷺ کے ساتھ دس یا اس سے زائد بچوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت حلیمہ جب آپ ﷺ کو کسی خشک وادی میں لے جاتیں تو وہ وادی اس وقت سرسبز و شاداب ہو جاتی۔

حضرت حلیمہ ان درختوں کی آواز سنتی تھیں جو آپ ﷺ پر سلام پڑھتے تھے درخت اپنی ٹہنیوں سمیت آپ پر جھک جاتے تھے اور اظہار محبت کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چراتے تھے آپ کا بھائی کہتا کہ میرا حجازی بھائی جب کسی وادی میں قدم رکھتا ہے تو وہ وادی اس وقت سرسبز ہو جاتی ہے جب کسی کنویں پر قدم رنجہ فرماتے تا کہ بکریوں کو پانی پلائیں تو پانی خود بخود کنویں کے منہ پر آ جاتا۔ جب آپ ﷺ دھوپ میں کھڑے ہوتے تو بادل ان پر سایہ فگن ہو جاتا۔ آپ کھڑے ہوتے تو وحشی آپ کے پاس آتے اور آپ کے جسم اطہر کو چومتے تھے۔ خلاصۃ السیر میں ہے کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب ہمارے پاس اونٹوں میں تھے کہ آپ کا رضاعی بھائی دوڑتا ہوا آیا اور بتایا کہ میرے قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے پکڑا جنہوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور اسے زمین پر لٹا دیا اور ان کا پیٹ شق کر دیا ہے۔ حضرت حلیمہ فرماتی ہیں ہم فوراً وہاں پہنچے تو آپ ﷺ چہرہ ڈھانپ کر کھڑے ہوئے تھے ہم آپ کے ساتھ چمٹ گئے اور پوچھا بیٹا کیا ہوا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس دو آدمی میرے پاس آئے انہوں نے مجھے لٹایا پھر میرے پیٹ کو چاک کیا اور میرے اندر سے کوئی چیز تلاش کی مجھے معلوم نہیں ہوا کہ وہ کیا تھی؟ ابویعلیٰ' ابونعیم اور ابن عساکر نے شداد بن اوس کی روایت میں اس طرح نقل کیا ہے کہ تین آدمی تھے ان کے ساتھ ایک سونے کا تھال تھا جو برف سے بھرا ہوا تھا ان میں سے ایک نے مجھے زمین پر لٹا دیا پھر پیٹ سے ہر چیز کو باہر نکالا' پھر اسے اس برف سے دھویا اور خوب دھویا پھر میرے پیٹ کی ہر چیز کو باہر نکالا' پھر اسے اس برف سے دھویا اور خوب دھویا پھر میرے پیٹ کی ہر چیز کو اپنی جگہ رکھ دیا۔ پھر دوسرا شخص اٹھا اس نے میرا دل باہر نکالا یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا' پھر اس شخص نے میرے دل کو چیرا اور اس سے ایک سیاہ لوتھڑا نکال کر باہر پھینک دیا پھر اس نے دائیں اور بائیں طرف سے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز پکڑی تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں نور کی ایک مہر ہے۔ اسے دیکھ کر دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے پھر اس شخص نے میرے دل پر وہ مہر لگائی جس سے میرا دل نور سے بھر گیا یہ حقیقت میں نبوت اور حکمت کا نور تھا پھر اس نے میرے دل کو اپنی جگہ رکھ دیا میں اس مہر کی ٹھنڈک اپنے دل میں ہمیشہ محسوس کرتا ہوں' پھر تیسرے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا تم ہٹ جاؤ پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے سے ناف تک پھیرا' جتنا شق تھا سب مل گیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں میں آپ ﷺ کے سینہ اطہر میں سوئی کے نشان دیکھتا تھا۔

ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کا ابھی بچپن تھا کہ علاقہ میں قحط پڑ گیا حضرت ابو طالب آپ ﷺ کو ساتھ لے کر حرم میں تشریف لائے اور آپ ﷺ کو کعبہ کے ساتھ بٹھا دیا۔ آپ ﷺ کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا اور دعا مانگی اس وقت آسمان پر کوئی بادل نہیں تھا دعا مانگنے کی دیر تھی کہ بادل ادھر ادھر سے ہجوم کر آئے اور موسلا دھار بارش برسی یہاں تک کہ وادیاں بہنے لگیں۔ اسوقت ابو طالب نے یہ شعر کہا۔

وَاَبْيَضَ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ

وہ سفید من بھاتی رنگت والا جس کے روئے تاباں کے صدقے بادل کی آرزو کی جاتی ہے وہ یتیموں کا ماویٰ ہے اور بیواؤں کا ملجا ہے۔

خلاصہ السیر میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کی طرف تشریف لے گئے جب بصریٰ پہنچے تو بحیرا راہب نے آپ ﷺ کو دیکھا تھا تو آپ کو علامات کی وجہ سے پہچان گیا' وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر کہا ھٰذَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ يَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ۔ یہ رب العالمین کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گا۔ بحیرا سے کسی نے پوچھا تجھے اس کا کیسے علم ہوا؟ بحیرا نے کہا تم جب گھاٹی سے آرہے تھے تو ہر شجر و حجر جھک کر سلامی پیش کر رہا تھا اور شجر و حجر صرف نبی کی ذات کے سامنے جھکتے ہیں اور ہم نے اپنی کتب میں آپ کا تذکرہ پڑھا ہے۔ بحیرا نے حضرت ابوطالب کو کہا کہ اگر آپ انہیں شام لے گئے تو یہود انہیں قتل کر دیں گے' پس ابوطالب نے اسی خوف کی وجہ سے آپ ﷺ کو واپس بھیج دیا۔ پھر دوبارہ آپ ﷺ نے شام کا سفر فرمایا جبکہ آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال تھی اور اس وقت آپ کے رفیق سفر حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ تھا اور اس سفر کا مقصود تجارت تھا۔ یہ سفر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح سے پہلے فرمایا تھا جب آپ شام میں پہنچے تو راہب کے گرجا کے قریب ایک درخت کے نیچے نزول فرمایا' راہب نے میسرہ سے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ میسرہ نے کہا یہ حرم قریشی ہے۔ راہب نے کہا اس درخت کے نیچے صرف نبی نے ہی نزول فرمایا ہے' بعض روایات میں ہے کہ راہب' نبی کریم ﷺ کے قریب آیا اور کہا وَاَنَا اَشْهَدُ اَنَّكَ الَّذِىْ ذَكَرَهُ اللّٰهُ فِى التَّوْرَاةِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی شخصیت ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے' جب اس نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو دیکھا تو اسے بوسہ دیا۔ اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں نبی ہیں' امی ہیں' ہاشمی ہیں' عربی ہیں' مکی ہیں' حوض کے مالک ہیں۔ صاحب شفاعت ہیں اور لواء حمد والے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ میسرہ نے بتایا کہ جب سخت دھوپ ہوتی اور کڑاکے کی گرمی ہوتی تو فرشتے اترتے جو آپ پر سایہ کرتے اور آپ کو گرمی سے بچاتے جبکہ آپ اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے میسرہ سے آپ ﷺ کی صفات و خصائل کے متعلق سنا تو آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آپ ﷺ ان سے نکاح فرمالیں۔

فائدہ: راہب کے قول ''اس درخت کے نیچے نبی ہی اترا ہے'' کی توجیہہ کرتے ہوئے سہیل نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اس درخت کے نیچے صرف نبی نے ہی قیام فرمایا ہے۔ علامہ سہیلی نے یہ توجیہہ اس لئے فرمائی ہے کیونکہ انبیاء کرام کا زمانہ بہت پہلے کا ہے اور اتنی مدت ایک درخت کا باقی رہنا بہت بعید ہے اور اتنی مدت درخت کا راستہ پر موجود ہونا اور اسکے نیچے کسی دوسرے کا قیام نہ کرنا یہ بھی بہت مستبعد ہے' لیکن خبر میں قط کا لفظ اس توجیہہ کے منافی ہے۔ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ معجزات خرق عادت ہوتے ہیں۔ پس ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس درخت کو باقی رکھا ہو اور لوگوں کو خلاف عادت اس کے نیچے نزول کرنے سے روکے رکھا ہو۔

اب پھر ہم آیت کریمہ کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔ سالم نے ابن عمر سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ ابن عمر نے فرمایا مشکوٰۃ سے مراد محمد ﷺ کا جوف (بطن) ہے اور زجاجہ سے مراد آپ کا قلب منور ہے اور مصباح سے مراد وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ کا مطلب یہ ہے کہ نہ وہ نصرانی ہے اور نہ یہودی ہے۔ شجرہ مبارکہ سے مراد ابراہیم علیہ

السلام ہیں۔ نور علی نور یعنی ابراہیم علیہ السلام کے قلب اطہر کا نور محمد ﷺ کے دل کے نور پر ہے(1)۔

محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں مشکوٰۃ سے مراد ابراہیم علیہ السلام' زجاجہ سے مراد اسماعیل علیہ السلام اور المصباح سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصباح فرمایا جیسا کہ آپ کو سراج بھی فرمایا ہے وسراجاً منیراً۔ شجرۃ مبارکۃ سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ کو مبارک کی صفت سے اس لئے یاد فرمایا کیونکہ اکثر انبیاء کرام آپ کی پشت سے ہیں۔ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ یعنی ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی ہیں اور نہ نصرانی ہیں لیکن آپ ہر مذہب کو چھوڑ کر اسلام پر قائم رہنے والے ہیں کیونکہ یہود مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں۔ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ یعنی محمد ﷺ کے محاسن عالیہ آپ ﷺ پر وحی کے آغاز سے پہلے ہی لوگوں پر ظاہر تھے۔ نور علی نور، یعنی آپ ﷺ نبی ہیں اور نبی کی نسل سے ہیں۔ محمد ﷺ کا نور' ابراہیم علیہ السلام کے نور پر ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ علوم و معارف جن سے اللہ تعالیٰ بندہ مومن کے دل کو منور فرماتا ہے ان کو مشکوٰۃ کے نور سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے' اس مفہوم کی تائید حضرت ابی اور ابن مسعود کی قرأت کرتی ہے۔ ابوالعالیہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا یہ بندہ مومن کی مثال ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد اس کی ذات ہے زجاجہ سے مراد اس کا سینہ ہے اور مصباح سے مراد ایمان و قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بندہ مومن کے دل میں ثبت فرمایا ہے۔ شجرۃ مبارکۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص ہے' پھر اس کی مثال اس درخت کی مانند ہے جو درختوں میں گھرا ہوا ہے اور جو سرسبز و شاداب ہے۔ سورج کے طلوع ہونے کے وقت نہ تو اسے دھوپ لگتی ہے اور نہ غروب ہونے کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہے۔ اسی طرح مومن فتنوں سے محفوظ ہوتا ہے اور وہ چار خصلتوں کا حامل ہوتا ہے' جب اسے نعمتوں کا حصول ہو تو شکر ادا کرتا ہے۔ جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو صبر کرتا ہے' جب فیصلہ کرتا ہے تو عدل کرتا ہے اور جب بولتا ہے تو سچ بولتا ہے۔ یکاد زیتھا یضیئی، یعنی قریب ہے کہ بندہ مومن کا دل حق کے ظہور سے پہلے حق کو پہچان لے۔ کیونکہ وہ اس کے موافق ہوتا ہے نور علی نور' ابی فرماتے ہیں بندہ مومن پانچ نوروں کے درمیان ہوتا ہے' اس کی بات نور ہوتی ہے اس کا علم نور ہوتا ہے۔ وہ جہاں داخل ہوتا ہے وہ جگہ نور ہوتی ہے اور جہاں سے خارج ہوتا ہے وہ جگہ بھی نور ہوتی ہے اور قیامت کے روز اس کا لوٹنا بھی نور کی طرف ہوگا(3)۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ اللہ کے نور کی مثال ہے جو بندہ مومن کے دل میں ہوتا ہے قریب ہے کہ بندہ مومن کا دل ہدایت پر عمل پیرا ہو اور جب اس کے پاس علم آتا ہے تو اس کی ہدایت پر ہدایت کا اضافہ ہوتا ہے' نور پر نور ہوتا ہے(4) میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی کا دل سچے قول' سچے فعل اور سچے اعتقاد کے لئے کھل جاتا ہے اور وہ ہر اچھے قول' عمل اور عقیدہ کو قبول کرتا ہے اور باطل کو اس کا دل ناپسند کرتا ہے اور اسے قبول نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے نفس سے فتویٰ طلب کر، اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دے بھی چکے ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت وابصہ سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جب بندہ مومن کے پاس کتاب و سنت کا علم آتا ہے تو اس کی ہدایت اور یقین کے چراغ کی لو میں اضافہ ہوتا ہے۔ کلبی کہتے ہیں اس سے مراد مومن کا ایمان اور اس کا عمل ہے۔ سدی کہتے ہیں نور ایمان اور نور قرآن مراد ہے۔ حسن اور ابن زید کہتے ہیں یہ قرآن کی مثال ہے۔ مصباح سے مراد قرآن ہے جس طرح چراغ سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اسی طرح قرآن سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ زجاجہ سے مراد بندہ مومن کا دل ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد اس کا منہ اور اس کی زبان ہے' شجرہ مبارکہ سے مراد وحی ہے۔ یکاد زیتھا یُضِیْٓئُ کا مطلب یہ ہے کہ قریب ہے کہ قرآن کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (الفکر)   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً، صفحہ 6-205   4۔ ایضاً، صفحہ 206

حجت خود بخود واضح ہو جائے، اگر چہ اس کو پڑھا نہ بھی جائے، یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کے لئے نور ہے حالانکہ نزول قرآن سے پہلے بھی بندوں کے لئے اس نے اپنی توحید کی طرف راہنمائی اور علامات بیان فرما دی تھی۔ قرآن کے نزول سے انکے نور میں اضافہ ہوا(1)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اس ہدایت کی تمثیل ہے جس پر واضح آیات دلالت کرتی ہیں جن کا مدلول بالکل عیاں ہے اور ان کے اندر جو ہدایت ہے وہ ظاہر و باہر ہے اور ہدایت ان کو اس مشکوٰۃ کے ذریعے دی گئی جس کی صفات بیان کی گئیں ہیں۔ یا یہ کہ ہدایت کو تشبیہ دی گئی ہے مصباح کے ساتھ اس اعتبار سے کہ وہ ہدایت لوگوں کے توہمات اور خیالات کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ اور کاف' مشکوٰۃ پر داخل ہوا ہے کیونکہ اس کو تاریکیاں گھیرے ہوئے ہوتی ہیں یا یہ ان پانچ قوتوں کی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو عطا فرماتا ہے اور ان پر بندے کی معاش و معاد کا دارومدار ہوتا ہے۔ 1۔ قوت حساسہ جو حواس خمسہ کے ذریعے محسوسات کا ادراک کرتی ہے 2۔ قوت خیالیہ یہ وہ قوت ہے جو ان محسوسات کی صورتوں کو محفوظ رکھتی ہے تاکہ پھر ضرورت کے وقت قوت عقلیہ پر ان محسوسات کو پیش کرے۔ 3۔ قوت عاقلہ۔ یہ وہ قوت ہے جو معقولات کو جمع کرتی ہے تاکہ ان معقولات سے غیر معلوم کو حاصل کرے۔ 5۔ قوت قدسیہ۔ یہ وہ قوت ہے جس پر آثار غیبیہ' اسرار ملکوتیہ ظاہر ہوتے ہیں یہ قوت انبیاء کرام اور اولیاء کے ساتھ خاص ہے۔ ارشاد الٰہی وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا سے یہی قوت قدسیہ مراد ہے۔

یہ آیت کریمہ ان پانچ قوتوں کی مثال ہے۔ مشکوٰۃ' زجاجہ' مصباح' شجرہ اور زیت۔ قوت حساسہ مشکوٰۃ کی طرح ہے کیونکہ سر میں اس کا محل بالکل چراغ دان کی طرح ہوتا ہے اس کا منہ ظاہر کی طرف ہوتا ہے اس کے پیچھے جو کچھ ہے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا اور اس کی روشنی معقولات کے ذریعے ہے بالذات نہیں ہے۔ قوت خیالہ ہر جانب سے مدرکات کی صورتوں کو قبول کرنے میں زجاجہ کی مثل ہے' یہ انوار عقلیہ کو ضبط کرتی ہے اور اس کی چمک اور روشنی قوت عاقلہ سے ہے اور قوت عاقلہ چراغ کی مثل ہے کیونکہ وہ ادراکات کلیہ اور معارف الٰہیہ سے منور ہوتی ہے۔ قوت متفکرہ شجرہ مبارکہ کی طرح ہے جو اتنے نتائج مہیا کرتی ہے اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے اور یہ زیتون کا درخت ہے جس سے چراغ روشن ہوتا ہے اسی طرح قوت متفکرہ ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے کیونکہ وہ لواحق جسمیہ سے خالی ہے یا اس لئے کہ وہ صورتوں اور معانی کے درمیان واقعہ ہے دونوں قبیلوں میں متصرف ہے اور دونوں طرف سے قابل انتفاع ہے۔ اور قوت قدسیہ' تیل کی مانند ہے وہ اپنے صفا اور ذکا کی وجہ سے قریب ہے کہ بغیر غور و خوض اور جاننے کے معارف سے روشن ہو جائے۔ یا یہ تمثیل ہے قوت عقلیہ کی کیونکہ وہ ابتداء میں علوم سے خالی ہوتی ہے لیکن علوم کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے' اس وقت وہ مشکوٰۃ کی طرح ہوتی ہے پھر جزئیات کے احساس کے واسطہ سے علوم ضروریہ سے وہ عقل منقش ہوتی ہے۔ اس وقت وہ نظریات کے حصول پر قادر ہوتی ہے۔ پس اس صورت میں وہ اس زجاجہ کی مانند ہوتی ہے جو فی نفسہا جگمگا رہا ہو۔ پھر قوت عقلیہ کو علوم حاصل ہوتے ہیں' اگر اسے علوم اجتہاد اور فکر سے حاصل ہوتے ہوں تو شجرہ زیتونہ کی مانند ہوتی ہے۔ اگر حدس کے ذریعے علوم حاصل کرتی ہو تو زیتون کے تیل کے مانند ہوتی ہے۔ اگر قوت عقلیہ کو علوم کا حصول قوت قدسیہ کے ذریعے ہوتا ہو تو وہ اس تیل کی مانند ہوتی ہے جو خود بخود روشن ہونے کے قریب ہوا گرچہ اس کو آگ نے نہ بھی چھوا ہو' کیونکہ وہ قوت عقلیہ اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ خود بخود علوم حاصل کرے خواہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (الفکر)

وحی اور وہ الہام جو آگ کی مثل ہوتا ہے جس سے عقول روشن ہو جاتی ہیں اس قوت عقلیہ کے ساتھ متصل نہ بھی ہوا ہو۔ پھر جب قوت عقلیہ کو علوم حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ قادر ہوتی ہے کہ ان علوم کو جب چاہے حاضر کرے اس صورت میں وہ مصباح کی مانند ہوتی ہے جب وہ ان علوم کو ہر وقت حاضر رکھتی ہو تو نور علی نور ہو جاتی ہے۔

میرے نزدیک اس آیت کی دو اور تاویلیں ہیں جن کا مدار شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا کشف ہے۔ 1۔ **اللّٰہ نور السمٰوات والارض** کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا موجد ومظہر ہے عدم سے خارج ظلی میں لانے والا ہے۔ مثل نورہ سے مراد اس کا وجود جو ممکنات کی ماہیات پر اپنا پرتو ڈالتا ہے۔ یہاں نور کی اپنی ذات کی اضافت تشریفی ہے جیسا کہ بیت اللہ اور ناقۃ اللہ میں اضافت شرف وعظمت کے اظہار کے لئے ہے یا اپنی ذات کی طرف نور کی اضافت اس لئے فرمائی کیونکہ نور کا صدور ذات الٰہیہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ سورج اور چاند کا نور اس وقت زمین پر پڑتا ہے جب وہ ان کے سامنے ہوتی ہے۔ کمشکوٰۃ سے مراد مشکوٰۃ کی روشنی اور نور ہے مضاف محذوف ہے۔ **فیھا مصباح**۔ یعنی اس مشکوٰۃ میں چراغ ہے اور اس چراغ کی وجہ سے وہ مشکوٰۃ منور ہے۔ پس جس طرح مشکوٰۃ (طاقچہ) نور حاصل کرتا ہے اور اس چراغ کی وجہ سے منور ہوتا ہے بالکل اسی طرح ممکنات کی ماہیات وجود کے نور سے استفادہ کرتی ہیں اور اللہ کی صفات اور اس کے اسماء کے چراغ سے ممکنات روشن ہو جاتی ہیں۔

المصباح فی زجاجۃ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ مصباح کا زجاجہ میں ہونا تصویر کے کمال کے لئے ہے۔ حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں انبیاء کرام اور فرشتوں کے سوا باقی تمام ممکنات کا مبدء تعین اسماء الٰہیہ اور صفات الٰہی کے عکس اور پرتو ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی صفات کمالیہ کو جانتا ہے اسی طرح ان صفات کے نقائص کو بھی جانتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جیسے موت حیات کی نقیض ہے جہالت علم کی نقیض ہے۔ عجز قدرت کی نقیض ہے۔ بہرہ پن سننے کے نقیض ہے۔ اندھا پن دیکھنے کی نقیض ہے۔ گونگا پن کلام کی نقیض ہے۔ جبر ارادہ کی نقیض ہے۔ تعطل تکوین کی نقیض ہے۔ جب صفات الٰہیہ علم کے مرتبہ میں اپنے نقائص کے ساتھ جمع ہوتی ہیں تو ان نقائص کی صورتیں صفات کے عکس کی وجہ سے منقش ہو جاتی ہیں اور یہ مخلوطات اس طرح ہو جاتی ہیں کہ ان کے حقائق اعدام اور ان کے عوارض صفات کا پرتو ہوتے ہیں۔ ان مخلوطات کو صوفیاء کی اصطلاح میں ظلال الصفات والاعیان کہتے ہیں اور ممکنات کے تعینات کے مبادی ان کے حقائق اور ان کے مربیات بھی یہی مخلوطات ہوتی ہیں۔ یہ صفات اس زجاجہ کی مانند ہیں جو مصباح کے نور سے منور ہوتا ہے اور ظرفیت تجلی کی حیثیت سے ہے کیونکہ صفات ظلال میں روشن ہوتی ہیں۔ ظلال صفات سے منور ہوتے ہیں۔ اسی طرح زجاجہ اس چراغ کے نور سے روشن ہوتا ہے جو اس میں رکھا ہوتا ہے۔ عکس روشن ہوتے ہیں پھر وہ اپنا صفات سے حاصل شدہ نور ممکنات کی ماہیات کو عطا کرتے ہیں۔ پس وہ روشن ہو جاتی ہیں اور ماہیات ظلال کے نور سے ظاہر ہوتی ہیں جیسا کہ مشکوٰۃ زجاجہ کے اس نور سے روشن ہوتا ہے جو چراغ سے حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حجاب نور ہے اگر وہ نورانی نقاب اٹھا دے تو اس کے چہرہ کی شعاعیں مخلوق کو وہاں تک جلا دیں جہاں تک اسکی نظر پہنچے(1) اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے۔ شاید نور سے مراد اس حدیث میں ظلال کا مرتبہ اور سبحات الوجہ (چہرہ کی شعاعیں) سے مراد اللہ کی صفات ہوں ممکنات کی ماہیات رتبہ کی کمی اور استعداد کے ضعف کی وجہ سے ظلال

1۔ تذکرۃ الموضوعات، صفحہ 12 (التراث العربی)

کے توسط کے بغیر صفات سے نور کے اقتباس کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ اگر یہ ظلال نہ ہوں تو ممکنات کا نام ونشان تک نہ ہو۔ لیکن انبیاء کرام اور ملائکہ اپنی قوت استعداد کی وجہ سے صفات سے اقتباس نور کرتے ہیں جیسا کہ ظلال' صفات سے نور حاصل کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام اور ملائکہ معصوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اصول میں شرنہیں پایا جاتا۔

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ۔ یعنی وہ مصباح کے انوار سے چمک رہا ہے حتیٰ کہ وہ فانوس دیکھنے والوں پر مشتبہ ہو جاتا ہے' حتی کہ وہ فانوس اور چراغ کے درمیان تفریق بھی نہیں کر سکتے۔ شاعر کہتا ہے۔

رَقَّ الزُّجَاجُ وَ رَقَّتِ الْخَمْرُ فَتَشَابَهَا وَ تَشَا كَلَ الْاَمْرُ

جام بھی شفاف ہے اور شراب بھی شفاف ہے۔ اس لئے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بالکل ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔

فَكَاَنَّمَا خَمْرٌ وَلَا زُجَاجٌ وَكَاَنَّمَا زُجَاجٌ وَلَا خَمْرُ

یوں لگتا ہے شراب ہی شراب ہے جام ہے ہی نہیں۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے سارا جام ہے شراب نہیں ہے۔

ظلال اور صفات میں اسی اشتباہ کی وجہ سے بہت سے عرفاء (وحدت الوجود قائلین) نے یہ گمان کیا کہ ظلال' اللہ کی صفات ہیں اور وہ ان دو مرتبوں میں امتیاز نہ کر سکے اور کہا صفات عین الذات ہیں اور یہ گمان کرنے لگے کہ ممکنات کی ماہیات بالکل عین ہیں، ان مربیات کا جوان میں ضیاء پاشی کرتی ہیں۔ اور کائنات میں اور کچھ نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ اور ایک صوفی نے کہا لیس فی جُبَّتِي سِوَى اللّٰهِ۔ میرے جبہ میں اور کچھ نہیں ہے۔ وحدت الوجود کے قائلین میں سے ایک شاعر کہتا ہے۔'' اس کائنات رنگ وبو میں نہ سلیمان کی بادشاہی ہے' نہ بلقیس ہے' نہ آدم ہے اور نہ ابلیس ہے۔ یہ سب صورتیں ہیں صرف تو ہی مراد ہے۔ اے وہ ذات جو دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کا مقناطیس ہے۔''

سکر اور غلبہ عشق کی وجہ سے ایسی کلام کا صدور ہوا ہے اور وہ روشن اور روشنی کرنے والے کے درمیان فرق نہیں کر سکے۔

يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ۔ یعنی وہ چراغ مبارک زیتون کے درخت کے تیل سے روشن ہے۔ صفات کا خارج حقیقی میں منور ہونا اللہ تعالیٰ کی ذات کی بدولت ہے۔ یہ صفات فی نفسھا ممکن ہیں لیکن ذات الٰہی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے واجب ہیں۔ یہ اپنے امکان کی وجہ سے انبیاء اور ملائکہ کے تعینات کے لئے مربیات ہیں۔ یہ قدیم وجود کے موجود ہیں جو ذات سے مستفاد ہے۔ پس ذات کو زیتون کے مبارک درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اسی وجہ سے اس درخت کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی ہے کیونکہ ذات تمام جہات سے پاک ہے۔ جن صفات کو مصباح سے تشبیہ دی گئی ہے وہ ذات سے زائد ہیں۔ یہ نظریہ کتاب و سنت سے مستفاد ہے اور اس پر اہلسنت والجماعت کا اجماع ہے، لیکن ابوالحسن اشعری کا یہ ارشاد کہ نہ یہ صفات عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفات ذات پر زائد ہیں اس کا عین نہیں ہیں لیکن اس سے جدا بھی نہیں ہوتیں۔ غیر ذات نہ ہونے کا یہی معنی ہے۔ فلاسفہ اور معتزلہ صفات زائدہ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر صفات ذات سے زائدہ ہوں تو آثار کے مرتب ہونے میں ذات ان صفات کی محتاج ہو گی۔ متکلمین فرماتے ہیں کسی چیز کی طرف احتیاج جو ممتنع ہے وہ اجنبی چیز کی طرف احتیاج ہے لیکن صفات کی طرف احتیاج ممتنع نہیں ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات زائدہ خارج میں اسی طرح موجود ہیں جس طرح اس کی مخفی حکمت تقاضا کرتی ہے۔ اس بات پر نصوص اور اجماع دلالت کرتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات بحیثیت

ذات صفات سے مستغنی ہے، آثار کے ترتب میں ان کی محتاج نہیں ہے حتیٰ کہ اگر ہم صفات کا نہ پایا جانا فرض بھی کر لیں تو آثار کے ترتب میں ذات کافی ہوگی۔

ذات سننے کے لئے کافی ہے اگر ہم فرض کر لیں کہ سمع کا وصف زائد موجود نہیں ہے۔ اسی طرح دیکھنے میں ذات کافی ہے۔ پس اس اعتبار سے کہ استماع کے آثار کے ترتب کی ذات صلاحیت رکھتی ہے۔ اسکو شان سمع کہا جاتا ہے۔ اگر دیکھنے کے آثار بغیر صفت ابصار کے ظاہر ہوں تو اسے شان ابصار کہتے ہیں۔ یہی ذات کے شیئون اور صفات کے اصول ہیں، جیسا کہ صفات ظلال کے لئے اصول ہیں یہ اعتبارات اور شئون جو ذات میں موجود ہیں وہ اس تیل کے مشابہ ہیں جو زیتون کے مبارک درخت میں ہوتا ہے پس یکاد زیتھا یضیئی ولو لم تمسسہ نار کے ارشاد کی تشبیہ اس طرح مکمل ہوئی کہ ذات کے اعتبارات پر آثار کا مرتب ہونا جائز ہے، اگر چہ وہاں صفات نہ بھی ہوں جنہیں چراغ کی آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نور علی نور یعنی چراغ کا نور جو شیشہ اور مشکوٰۃ کو روشن کر رہا ہے یہ درخت کے تیل کے نور سے زائدہ ہے۔ جیسا کہ صفات کا نور آثار کے ترتب میں اور ماہیات کو روشن کرنے اور ممکنات کو ایجاد کرنے میں اس نور سے زائد ہے جو ذات کے اعتبارات میں ہے۔ یھدی اللّٰہ لنورہ من یشاء۔ یعنی اس مخصوص معارف کو صرف وہی خواص عرفاء جانتے ہیں جن کو جتانے کا اللہ ارادہ فرماتا ہے۔

اس تاویل وتوجیہہ کی بنا پر اس آیت میں اشارہ ہے کہ ایجاد اور ولادت اولیٰ کا مطلب عدم سے وجود خارجی ظلی کی طرف لانا ہے جو تمام موجودات کے ذات کے قریب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جس کی طرف اس ارشاد نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ میں اشارہ فرمایا ہے۔ ہم نے سورہ قاف میں اس آیت کی تفسیر میں اقربیت کی تحقیق لکھی ہے دوسری تاویل جو سلف صالحین سے مروی ہے وہ یہ ہے اللّٰہ نور السمٰوات والارض، یعنی وہ آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والوں کی راہنمائی فرمانے والا ہے۔ پس تمام اس کے نور سے ذات الٰہ اور صفات الٰہیہ کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور مدارج قرب تک ترقی کرتے ہیں جس قرب کی طرف اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ۔ اسی طرح ارشاد ہے اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ (اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف) اسی طرح حدیث قدسی میں اسی قرب کو بیان فرمایا ہے۔ لَا یَزَالُ عَبۡدِیۡ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحۡبَبۡتُهٗ کُنۡتُ سَمۡعَهُ الَّذِیۡ یَسۡمَعُ بِهٖ (الحدیث)(1) یہی قرب ہے جسے ولایت خاصہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مَثَلُ نُوۡرِهٖ كَمِشۡكٰوةٍ فِيۡهَا مِصۡبَاحٌ، یعنی مومن بندہ کے دل کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے مشکوٰۃ ہو جس میں چراغ رکھا ہو۔ پس اس صورت میں مشکوٰۃ بندہ مومن کے دل کی مثال ہوگا اور وہ چراغ جو شجرۂ مبارکہ کے تیل سے منور ہے اس کو ان صفات سے تشبیہ ہوگی جو بندۂ مومن کے دل میں روشن ہیں اور اس ذات اقدس سے نکلی ہیں جس میں شعون اور اعتبارات ذاتیہ ہیں جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

المصباح فی زجاجۃ۔ الزجاجۃ کانھا کوکب دری۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ عام اولیاء کرام صفات کی تجلیات سے محظوظ ہوتے ہیں لیکن ظلال کے پردوں کے پیچھے سے۔ کیونکہ انبیاء کرام کے علاوہ لوگوں کا مبدء تعین یہ صفات کے ظلال ہیں۔ عام اولیاء کی ترقی کی حد اپنے اصول، یعنی ظلال تک ہوتی ہے۔ پھر ان ظلال کے واسطہ سے صفات کے انوار کو حاصل کرتے ہیں۔ پس عام

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم)

اولیاء کرام کو ان ظلال میں فنا اور بقا ملتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا جو قرب حاصل کرتے ہیں اس کو ولایت الاولیاء کہتے ہیں۔ یہی ولایت صغریٰ ہے۔ لیکن بعض اولیاء کاملین وہ اتباع رسالت مآب ﷺ کی وجہ سے اس مقام سے مقام صفات کی طرف ترقی کرتے ہیں، بلکہ شیون اور اعتبارات تک ترقی کرتے ہیں۔ پھر انہیں ان صفات میں فنا اور بقا ملتی ہے۔ پس مقام صفات کو ظہور کی حیثیت سے (یعنی صفات کے ذات کے ساتھ قیام کی حیثیت سے) ولایت بسری اور ولایۃ الانبیاء کہا جاتا ہے اور مقام صفات کو بطون کی حیثیت سے ولایۃ علیا اور ولایت ملائکہ کہا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے صدیقین جن کے متعلق ارشاد ہے ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ؟ یعنی اصحاب رسول اللہ ﷺ اور دوسرے صدیقین کے بارے فرمایا وقلیل من الاخرین۔ صدیقین مقام صفات و شیون سے مرتبہ ذات تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو شیون اور اعتبارات سے بلند ذات ہے حتیٰ کہ ان کے سامنے ذات صفات و اعتبارات کے پردوں کے بغیر عیاں ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں آخری دو گروہوں کی طرف اشارہ نہیں ہے لیکن نور علی نور کا ارشاد ہو سکتا ہے کہ اولیاء کرام کے درجات کے تفاوت کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی وہاں نور ہے جو بعض، بعض سے فوق ہے۔

۱۰؎ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر ان پر اپنا نور ڈالا۔ جس کو یہ نور ملا اس نے ہدایت پائی اور جس کو یہ نور نہیں ملا وہ گمراہ ہوا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ۔ علم الٰہی پر قلم خشک ہو گیا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت فرمایا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جہالت اور گمراہی میں پیدا فرمایا، یعنی عدم ذاتی جو ان کے مبادی تعینات میں تھا اس سے انہیں پیدا فرمایا پھر ان پر وہ نور ڈالا جو ظلال نے صفات سے حاصل کیا تھا۔ پس جس کو یہ نور میسر آیا وہ ہدایت پا گیا اور جسے یہ نور نہ ملا وہ گمراہ ہو گیا۔ اس نور کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اس نور کو اس ذات کریمہ سے حاصل کرے جسے اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنایا۔ جس کے سینہ اقدس کو منشرح فرمایا۔ اور جس کے دل کو نور، حکمت اور ایمان سے لبریز فرمایا انسان اپنے دل کو قلب مصطفیٰ کریم کے سامنے آئینہ بنائے۔ پس اس طرح انسان کا دل بقدر حصول فیض روشن ہو جائے گا۔ پس جس نے قلب مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایمان کی صورت اکتساب فیض کیا تو وہ دنیا میں کفر اور آخرت میں آگ کے عذاب سے نجات پا گیا اور جس نے فیضان قلب مصطفیٰ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کچھ حاصل نہ کیا پس وہ نور سے محروم رہا اور گمراہ ہو گیا۔ حضرت ابی عنبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے لئے اہل زمین سے کچھ برتن ہیں اور تمہارے رب کے برتن اللہ کے نیک بندوں کے دل ہیں اور اس کے نزدیک سب سے محبوب دل وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ نرم ہو' اس حدیث کو طبرانی نے بیان کیا ہے(2)۔

۱۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ ان امور کے لئے محسوس مثالیں بیان فرماتا ہے جن کا ادراک حواس سے ممکن نہیں ہے تاکہ ان محسوس مثالوں سے لوگ علم حاصل کریں اور ان کے عرفان میں اضافہ ہو۔ اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم امثال میں اپنے اولیاء کرام کو ایسی مثالیں دکھا دیتا ہے جن کی عالم شہادت میں مثالیں نہیں ہوتیں' یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ حقیقت کا رخ زیبا ان کے سامنے عیاں ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا قرب تو قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ فرمایا لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ۔ لیکن یہ قرب ایسا امر ہے جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی' اس کا ادراک حواس خمسہ اور عقل

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 26422، جلد 10، صفحہ 79 (العلمیہ) 2۔ کنز العمال: 1207، جلد 1، صفحہ 241 (مؤسسۃ الرسالۃ)

کے ذریعے ممکن نہیں ہے اور نہ اس سے علم حصولی اور نہ علم حضوری کا تعلق ہے۔ لیکن یہ قرب اس علم سے معلوم ہوتا ہے جو علوم مذکورہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ۔ (میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے) اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے اس ادراک کا ایک اور ذریعہ بھی بنایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ امور جن کی کوئی مثال نہیں ہے عالم مثال میں اللہ تعالیٰ اجسام کی صورت میں متشکل فرماتا ہے۔ پھر صوفی عالم مثال میں ظلال کا دائرہ اور صفات کا دائرہ دیکھتا ہے' جوں جوں صوفی نوافل کے ذریعے ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ وہ ظلال کے دائرہ کی طرف گامزن ہے یہاں تک کہ وہ اس ظلال کے دائرہ میں پہنچ جاتا ہے' پھر اس دائرہ میں گم ہو جاتا ہے اور اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے پھر اس کے بعد وہ اپنے آپ کو صفات کے دائرہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے' حتیٰ کہ اس کے اندر پہنچ اور پھر اسمیں گم ہو جاتا ہے اور دائرہ صفات کے رنگ میں رنگا جاتا ہے' یہاں رنگ میں رنگنے کا ذکر فقط سمجھانے کے لئے ہے ورنہ وہاں کوئی رنگ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں تا کہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔

۲؎ یہ جملہ یضرب کے فاعل سے حال ہے۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝

"ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے کہ بلند کئے جائیں اور لیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کا نام ۱؎ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان گھروں میں صبح اور شام ۲؎"

۱؎ اَذِنَ اللّٰهُ الخ بیوت کی صفت ہے اور ان بتقدیر حرف جر باء اذن کے متعلق ہے اور بیوت سے مراد مساجد ہیں۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ مساجد زمین میں اللہ کے گھر ہیں اور آسمان والوں کو یہ اس طرح روشن دکھائی دیتی ہیں جس طرح زمین والوں کو ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں(1)۔ ان ترفع کا معنی مجاہد نے ان تبنی (یعنی تعمیر کرنا) فرمایا ہے۔ اس معنی کی مثال یہ ارشاد بھی ہے اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ (یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل)(2)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کی رضا کے لئے مسجد بنائی اللہ اس کے لئے جنت میں محل بنائے گا(3)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت عثمان سے روایت کیا ہے۔ حضرت حسن نے ان ترفع کا معنی ان تعظم (عزت احترام کرنا) فرمایا ہے یعنی مساجد میں کوئی بری بات نہ کی جائے(4)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ (کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں' اعتکاف بیٹھنے والوں' اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت صالح بن حبان نے حضرت بریدہ سے اس آیت کے متعلق روایت فرمایا ہے کہ چار مساجد ایسی ہیں جنہیں انبیاء کرام نے تعمیر فرمایا ہے' کعبہ کو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر فرمایا۔ بیت المقدس کی تعمیر حضرت داؤد اور سلیمان علیہما

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 207 3۔ مشکوٰۃ المصابیح: 697، جلد 1، صفحہ 225 (الفکر)

السلام نے فرمائی۔ مسجد نبوی اور مسجد قبا کی تعمیر رسول اللہ ﷺ نے فرمائی(1)۔

میں کہتا ہوں بیوت سے صرف یہی چار مساجد مراد لینے کی کوئی دلیل نہیں ہے اگر چہ یہ چاروں مساجد باقی تمام مساجد سے افضل ہیں۔ فی بیوت' ماقبل سے متعلق ہے یعنی مشکوٰۃ کی صفت ہے یا محذوف سے متعلق ہے، یعنی جس طرح بعض مساجد میں مشکوٰۃ کی روشنی یا یہ توقد کے متعلق ہے اور مفہوم یہ ہوگا کہ اسی طرح بیوت (گھروں) میں روشن کیا گیا ہے۔ پس یہ مثل بہ کے لئے تقیید ہوگا۔ یہ تاویل میرے نزدیک ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو مشکوٰۃ کے نور سے تشبیہ دی ہے اور اس کو ایسی قیود سے مقید کیا ہے جو نور کی قوت اور اس کی چمک کی شدت پر دلالت کرتی ہیں اور اس قید کا ان مساجد میں روشن ہونے والے مشکوٰۃ اور مصباح مذکور میں روشنی کی زیادتی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ کہنا کہ مساجد کی قندیلیں بڑی بڑی ہوتی ہیں یہ درست نہیں ہے بلکہ غنی لوگوں کی مجالس کی قندیلوں کی روشنی مساجد کی قندیلوں کی روشنی سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ کے متعلق کیا جائے کیونکہ عام طور پر ہدایت ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو مساجد میں اعتکاف کرتے ہیں اور نمازیں ادا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کی معراج نماز ہے اور فرمایا بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے پس سجدہ میں دعا کی کثرت کیا کرو(2)۔ اس حدیث کو مسلم' ابوداؤد اور نسائی نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فی بیوت محذوف فعل سبحوا کے متعلق ہو۔ اللہ کی ہدایت کو حاصل کرنے کے لئے تسبیح کا حکم فرمایا۔

یعنی نماز کے اندر اور نماز سے باہر اس کا ذکر کیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں یذکر کا معنی یتلیٰ ہے، یعنی اس کی کتاب کی تلاوت کی جائے(3)۔ یسبح' بیوت کی دوسری صفت ہے یا جملہ مستانفہ ہے یا اسم جلالت کی دوسری خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ یُسَبِّحُ لَهٗ۔ ابوبکر اور ابن عامر نے یسبح کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور اسکے بعد تینوں ظروف میں سے ایک ظرف منسوب ہے۔ اس قرأت پر الاصال پر وقف ہوگا۔ باقی قراء نے معروف کا صیغہ بفتحہ باء پڑھا ہے۔ اہل تفسیر فرماتے ہیں ذکر سے مراد فرض نمازیں ہیں کیونکہ مساجد کی تعمیر نماز کے لئے ہوتی ہے۔ پس فجر کی نماز صبح ادا کی جاتی ہے اور باقی چار نمازیں دوسرے وقت میں ادا کی جاتی ہیں۔ غدو اصل میں مصدر ہے اور یہاں وقت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اسلئے اصال کے ساتھ اس کا اتصال بہتر ہے۔

آصال جمع ہے اصل کی۔ اس سے مراد عصر کے بعد کا وقت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الغدو والاصال سے مراد صبح اور عصر کی نمازیں ہیں کیونکہ ان کا اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے صبح کے وقت انسان نیند میں ہوتا ہے اور عصر کا وقت کام کاج میں مشغولیت کا ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے صبح اور عصر کی نماز پڑھی وہ جنت میں داخل ہوگا(4)۔ اس حدیث کو مسلم نے ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں' ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ صبح کی تسبیح سے مراد چاشت کی نماز ہے(5)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو پاکیزگی کی حالت میں فرض نماز پڑھنے کے لئے گیا اس کا اجر اس محرم حاجی کے اجر کی طرح ہے۔ اور جو چاشت کی نماز کے لئے جائے اور وہ صرف نماز کی خاطر کھڑا ہو تو اس کا اجر عمرہ کرنے والے کے اجر کی طرح ہے۔ ایک نماز کے پیچھے دوسری نماز علیین میں لکھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (الفکر) 2۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 226 (الریان) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (الفکر) 5۔ ایضاً

جاتی ہے۔ یہ حدیث علامہ بغوی نے ابوامامہ سے روایت کی ہے (1)۔طبرانی نے اس طرح روایت کی ہے جوفرض نماز جماعت سے پڑھنے کے لئے جائے اس کا یہ عمل حج کے عمل کی طرح ہے اور جونفلی نماز کی طرف جاتا ہے اسکا یہ عمل نفلی عمرہ کی طرح ہے (2)۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ۙ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿٣٧﴾

''وہ (جواں) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید وفروخت یاد الٰہی سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے گھبرا جائیں گے جس میں دل اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ ل''

ل رجال جمہور کی قرأت کے مطابق یسبح کا فاعل ہے یا ایسے فعل محذوف کا فاعل ہے جس پر یسبح دلالت کررہا ہے۔ یہ ابن عامر اور ابوبکر کی قرأت کے مطابق ہوگا۔ گویا یہ مقدر سوال کا جواب ہے۔ پوچھا گیا اس کی کون تسبیح کرتا ہے؟ فرمایا جوان اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ یہاں صرف مردوں کا ذکر فرمایا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ عورتوں پر مسجد میں جمع اور جماعت لازم نہیں ہیں یا اس لئے کہ اکثر عورتوں میں جہالت اور غفلت ہوتی ہے۔ آیت کریمہ میں بیع کو علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ تجارت کے ضمن میں اس کا ذکر ہو چکا تھا' اسکی وجہ یہ ہے کہ بیع تجارت کی قسموں میں سے اہم ترین قسم ہے کیونکہ اشتراء (خریدنے) سے نفع متوقع ہوتا ہے اور پھر فروخت کرنے سے نفع متحقق ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تجارت سے مراد اشتراء (خریدنا) ہے (اگرچہ تجارت کے اسم کا اطلاق بیع وشراء دونوں پر ہوتا ہے) ہمارے اس قول کی دلیل بیع کا تجارۃ پر عطف ہے۔ اشتراء کی جگہ تجارۃ کا لفظ ذکر فرمایا کیونکہ اشتراء تجارت کا مبدء اور بنیاد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تجارت سے مراد نفع بخش معاملہ ہے پھر تخصیص کے بعد تعمیم، مبالغہ پیدا کرنے کے لئے بیع کا ذکر فرمایا۔

فراء کہتا ہے اہل جلب کے لئے تجارت کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اہل حلب سے مراد باہر سے مال لانے والے ہیں) اور بیع وہ ہوتی ہے جس کو آدمی اپنے سامنے طے کرتا ہے۔ یعنی نماز کے قیام کے لئے مساجد میں حاضری سے تجارت اور کاروبار انہیں غافل نہیں کرتے (3)۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت سالم' حضرت ابن عمر سے روایت فرماتے ہیں کہ ابن عمر بازار میں تھے کہ نماز کی تکبیر ہو گئی' سب لوگ کھڑے ہوئے اور اپنی دکانیں بند کر کے مسجد میں داخل ہو گئے عبداللہ بن عمر نے فرمایا یہ ارشاد لا تلھیھم الخ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوا ہے۔ یالَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد دوام حضور ہے (4) یہ ایسا معنی ہے کہ یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جو معاملات زندگی ترک کردیتے ہیں اور اپنا سارا وقت اطاعت الٰہی میں گزارتے ہیں اور لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور یہ ان کو بھی شامل ہے جو معاملات زندگی ترک نہیں کرتے تجارت میں مشغول ہوتے ہوئے بھی وہ یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے' وہ ظاہراً لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور باطناً کائنات سے غافل ہوکر اپنا سلسلہ خدا سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اقام اصل میں اقوام تھا۔ واؤ کو الف سے بدلا تو دو الف جمع ہوئے ایک کو حذف کیا کیونکہ دو ساکن جمع ہو گئے پھر آخر میں الف محذوفہ کے عوض ۃ لگائی گی اور پھر اضافت کی حالت میں ۃ حذف ہوگئی۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اقام الصلوٰۃ سے مراد نماز کی اپنے وقت پر ادائیگی ہے (5) کیونکہ جو نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کرتا ہے وہ نماز کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (الفکر) 2۔ معجم کبیر، جلد 8، صفحہ 184 (التراث الاسلامی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 208 (الفکر)

5۔ ایضاً

قائم کرنے والا نہیں ہوتا۔ زکوۃ سے مراد فرضی زکوۃ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جب زکوۃ کا وقت ہو جائے تو اس کو مت روکو۔ بعض علماء فرماتے ہیں زکوۃ سے مراد تمام نیک اعمال ہیں۔(1) یخافون' یسبح کے فاعل سے یا لا تلهيهم کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی وہ ذکر الٰہی اور اطاعت کے باوجود خوفزدہ رہتے ہیں۔ تتقلب فيه۔ یوماً کی صفت ہے اور ضمیر عائد فیہ کی ضمیر ہے۔ یعنی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل گھبرائے ہوئے ہوں گے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی ہونگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کفار کے دل دنیا میں کفر و شک میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے کانپ رہے ہوں گے اور اس دن ان کی آنکھوں سے کفر کی پٹی اتر جائے گی اور وہ سب کچھ دیکھیں گے جو انہوں نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا بلکہ ایسا تصور بھی نہ کیا ہوگا اور مؤمنوں کے دل اور آنکھیں پلٹا کھائیں گی جبکہ پہلے وہ مشاہدہ مثال پر قانع تھے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کو چودھویں کے چاند کی طرح دیکھیں گے اور چوتھی ساعت کے وقت کے سورج کی طرح اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز خوف و امید سے دل الٹ پلٹ ہو رہے ہوں گے۔ کبھی ہلاکت کا خوف طاری ہوگا اور کبھی نجات کی امید بر آتی نظر آئے گی اور آنکھیں ادھر ادھر گم رہی ہوں گی کہ دائیں ہاتھ نامہ اعمال ملتا ہے یا بائیں ہاتھ میں ملتا ہے۔ دائیں جانب سے پکڑا جاتا ہے یا بائیں جانب سے۔

بعض علماء فرماتے ہیں دل خوف سے گلے میں اٹک جائیں گے نہ نیچے جائیں گے اور نہ باہر نکلیں گے' اور ہولناک منظر کو دیکھ کر آنکھیں تاڑے لگ جائیں گی۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۸

'' تاکہ جزاء دے انہیں اللہ تعالیٰ ان کے بہترین اعمال کی ل اور اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے انہیں اپنے فضل سے اور اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب ۲ ''

ل لام يسبح یا تلهيهم کے متعلق ہے اور یخافون کے متعلق بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں لام عاقبت کے لئے ہوگا کیونکہ خوف افعال اختیاریہ میں سے نہیں ہے اور علت غائیہ افعال اختیاریہ کے ساتھ مختص ہے۔ احسن بطور مفعول مطلق منصوب ہے۔

۲ اللہ تعالیٰ یا تو موعود جزاء پر زیادتی فرمائے گا یا ان کے اعمال پر ایسی چیز کی زیادتی فرمائے گا جس کا تصور ان کے دلوں میں بھی نہ آیا ہوگا۔ واللّٰه يرزق من يشاء بغير حساب۔ زیادتی کا ثبوت ہے اور اللہ کے کمال قدرت پر مشیت کے نفاذ پر اور احسان کی وسعت پر تنبیہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بے حد و بے حساب دیتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فُلَانٌ يُنْفِقُ بِغَيْرِ حِسَابٍ یعنی وہ اتنی وسعت رکھتا ہے کہ جو خرچ کرتا ہے اس کا حساب نہیں رکھتا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۳۹

'' اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہو کسی چٹیل میدان میں خیال کرتا ہے اسے پیاسا کہ وہ پانی ہے حتیٰ کہ جب (پینے کے لئے) اس کے قریب آتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا اور پاتا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 208 (الفکر)

تو پورا چکا دیا اس نے اس کا حساب ۱؎ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۲؎۔''

۱؎ سراب اس چمک کو کہتے ہیں جو ریت کے صحراء میں دور سے سورج کی کرنوں کی وجہ سے پانی دکھائی دیتی ہے' پیاسا اسے جاری پانی گمان کرتا ہے' یہ جملہ سابق کلام' کے مضمون پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی اَلْمُهْتَدُوْنَ بِنُوْرِ اللّٰهِ يَجْزِيْهِمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدُهُمْ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يَنْفَعُهُمْ اَعْمَالُهُمْ فَاِنَّهَا كَسَرَابٍ۔

قیعة کشادہ اور ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع قیعان اور تصغیر قویع ہے' بعض علماء فرماتے ہیں یہ قاع کی جمع ہے جیسے جیرۃ جمع ہے جار کی۔ کافر جسے اعمال کی سخت ضرورت ہو گی لیکن نامراد ہو گا اسے پیاسے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' جس طرح پیاسا سراب کو پانی سمجھ کر ناکام و نامراد ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ وجداللہ معطوف ہے لم یجدہ پر اور پھر جاءہ پر اور ضمیر مرفوع تمام افعال میں ظمان (پیاسے) کی طرف راجع ہے تو پھر سراب کے پاس پہنچ کر پیاسے کا عذاب الٰہی کے پانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک اس کلام کی دو تاویلیں ہیں ایک یہ کہ جب کافر قیامت کے روز آئے گا تو اس کو سخت پیاس لگی ہو گی اسے دوزخ کی آگ سراب دکھائی دے گی وہ اسے پانی گمان کرتے ہوئے دوڑ کر اس کے پاس جائے گا جب قریب پہنچے گا تو جو کچھ اس نے گمان کیا ہو گا اس میں سے کچھ نہ پائے گا اور اللہ کا عذاب' یعنی آگ کو پائے گا۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ عذاب اللہ سے مراد وہ سختی اور مایوسی ہے جو پیاسے کو دنیا میں لاحق ہوتی ہے۔ اس کا مبنیٰ اور بنیاد اس کے اپنے کرتوت ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے اور وہ (کریم) درگزر فرما دیتا ہے (تمہارے) بہت سے کرتوتوں سے۔

یہ کہنا بہتر ہے کہ حتی ابتدائیہ ہے اور اعمالهم کسراب کے ساتھ متصل ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ جب آخرت میں کافر اپنے عمل کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہیں پائے گا اور وہاں اللہ کا عذاب پائے گا اس معنی کی صورت میں جاءہ میں ضمیر مرفوع کا مرجع کافر ہو گا ظمان نہیں ہو گا اور منصوب ضمیر کا مرجع اس کا عمل ہو گا سراب نہیں ہو گا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے اور ایک کا حساب دوسرے کے حساب سے اسے غافل نہیں کرتا وہ اپنے بندوں کا حساب دنیا کے دنوں میں سے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝

''یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں ۱؎ جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں' چھا رہی ہوتی ہے اس پر موج اس کے اوپر اک اور موج (اور) اس کے اوپر بادل (تہہ در تہہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر ۲؎ جب وہ نکالتا ہے اپنا ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے ۳؎ اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لئے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے تو اس کے لئے کہیں نور نہیں ۴؎۔''

۱؎ کظلمت کا عطف کسراب پر ہے اَوْ تخییر کے لئے ہے' گویا مخاطب کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان کی بد اعمالیوں کو سراب یا

تاریکیوں میں سے جس کے ساتھ چاہے تشبیہ دے۔ کیونکہ ان کے اعمال نفع بخش نہ ہونے' مایوسی کا باعث ہونے اور حسرت کا موجب ہونے میں سراب کی مانند ہیں اور نور حق سے خالی ہونے میں سمندر' موجوں اور بادل کی تہہ در تہہ تاریکیوں کی مثل ہیں۔ یا او تنویع کے لئے ہے، یعنی ان کے اعمال اگر نیک ہیں مثلاً صدقہ' صلہ رحمی وغیرہ تو یہ سراب کی مانند ہیں اور اگر برے اعمال ہیں تو وہ تاریکیوں کی مثل ہیں۔ یا او تقسیم کے لئے ہے' یعنی ایک وقت میں ان کی تشبیہ سراب کے ساتھ ہے اور دوسرے وقت میں ان کی تشبیہ ظلمت کے ساتھ ہے۔ دنیا میں ان کے اعمال ظلمت کی طرح ہیں اور آخرت میں سراب کی مانند۔

۲۔ لجی۔ جہاں پانی کثیر ہو اور یہ لج اسم منسوب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جہاں پانی گہرا ہو(۱)۔ نہایہ اور قاموس میں اس طرح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں موجزن دریا۔ یغشاہ موج۔ یہ بحر کی صفت ہے اور موج وہ لہر ہے جو ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے پانی پر ظاہر ہوتی ہے۔ سحاب کو بزی نے ظلمت کی طرف مضاف کرنے کی وجہ سے بغیر تنوین کے پڑھا ہے اور قواس کی روایت میں سحاب مرفوع اور منون ہے اور ظلمات' کظلمات سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ باقی قراء نے سحاب اور ظلمات دونوں کو مرفوع اور منون پڑھا ہے۔ مرفوع منون ہونے کی صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوں گے۔

۳۔ اخرج' یدہ اور یریٰ میں ضمائر کا مرجع وہ شخص ہے جو سمندر میں واقع ہے اگرچہ ماقبل میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن دلالت کلام کی وجہ سے گویا موجود ہے۔ اس طرح کافر کے اعمال تاریکیاں ہیں جو اس کے دل پر تہہ در تہہ چڑھی ہوئی ہیں' ہدایت کا نور دیکھنے اور حق کے رخ زیبا کے ادراک سے مانع ہیں۔ پس کفر جو دل کا عمل ہے وہ گہرے سمندر کی مانند ہے پھر اس پر گناہوں کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں جو موجوں کی طرح تہہ در تہہ ہیں اور کافر کے دل پر مہر' موجوں پر بادل کی طرح ہے۔ جب کافر دین کے امور میں غور و فکر کرنے اور دین کی بدیہیات کو پانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے بدیہیات بھی نظر نہیں آتیں' آپ دیکھتے ہیں کہ کافر انبیاء علیہم السلام کا انکار کرتا ہے حالانکہ ان کے معجزات ظاہر اور اظہر من الشمس ہوتے ہیں اور بدبخت پتھروں کو معبود بناتا ہے جو ساری مخلوق سے کم مرتبہ ہیں۔

۴۔ یعنی ہدایت کسبی نہیں وہبی امر ہے، بلکہ مقدمات کو ترتیب دیکر نتیجہ کا حصول بھی عادی اور عطائی امر ہے اہل حق کے نزدیک مقدمات کو ترتیب دینے کے بعد نتیجہ کا حاصل کر لینا واجب نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جو دنیوی امور میں بڑے بھولے بھالے ہوتے ہیں لیکن آخرت کے امور کے سلسلہ میں بہت چست و چوبند ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ جو دنیا کے معاملات میں بڑے چالاک اور شاطر ہوتے ہیں لیکن امور آخرت سے غافل ہوتے ہیں وہ دین کے معاملہ میں ڈنگروں کی طرح ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر ان پر اپنا نور ڈالا' پس جس نے وہ نور پا لیا وہ ہدایت پا گیا اور جو محروم رہا وہ گمراہ ہو گیا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم پر قلم خشک ہو گیا ہے(2)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ آیت عتبہ بن ربیعہ کے متعلق نازل ہوئی وہ زمانہ جاہلیت میں دین کو تلاش کرتا تھا ٹاٹ کا لباس پہنتا تھا لیکن جب اسلام آیا تو اس نے انکار کر دیا(3)۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 236 (العلمیۃ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10، صفحہ 790 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (الفکر)

عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

'' کیا تم غور نہیں کرتے کہ بلاشبہ اللہ ہی ہے جس کی تسبیح بیان کرتے ہیں سارے آسمانوں والے اور زمین والے اور پرندے پر پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک جانتا ہے اپنی (مخصوص) دعا اور اپنی تسبیح کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے رہتے ہیں۔[1] ''

[1] کیا کشف صریح، استدلال اور وحی سے حاصل ہونے والا علم یقین اور وثوق میں مشاہدہ کی طرح نہیں ہے؟ (یعنی وحی اور استدلال کے ذریعے آپ کو علم حاصل ہو چکا ہے) کہ ملائکہ اور وہ لشکر جنہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور جن وانس وغیرہما جو زمین میں رہتے ہیں، یعنی تمام مخلوق اللہ کی ہر نقص اور عیب سے تقدیس بیان کر رہی ہے۔ ذوی العقول کو غلبہ دینے کی وجہ سے مَنْ کا کلمہ ذکر فرمایا۔ تمام مخلوق مراد ہونے کی دلیل و الطیر صافات کا ارشاد ہے الطیر کو صافات کے ساتھ مقید فرمایا تاکہ تکرار لازم نہ آئے کیونکہ زمین میں رہنے والی مخلوق کے ضمن میں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ صلاۃ سے مراد دعا ہے۔ ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے تسبیح کرنے والی چیز اپنی دعا اور تسبیح جانتی ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾

'' اور اللہ تعالیٰ کے لئے بادشاہی ہے سارے آسمانوں کی اور ساری زمین کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی (سب نے) لوٹنا ہے۔[1] ''

[1] یعنی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے ذوات، صفات اور افعال موجود ہیں سب کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ سب نے اسی کی بارگاہ میں لوٹنا ہے اور سب کو اپنے اپنے عمل کے مطابق جزا عطا فرمائے گا، حتیٰ کہ بغیر سینگوں والی بکری کا سینگوں والی بکری سے قصاص (بدلہ) لے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾

'' کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ لے جاتا ہے بادل کو پھر جوڑتا ہے اس کے (بکھرے ہوئے ٹکڑوں) کو پھر اسے تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ نکلتی ہے اس کے درمیان سے اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے پس نقصان پہنچاتا ہے اس سے جسے چاہتا ہے اور پھیر دیتا ہے اس کو جس سے چاہتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک لے جائے آنکھوں کی بینائی کو۔[1] ''

[1] یزجی تزجیۃ سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو دھکیلنا ہے ردی چیزوں کو بضاعۃ مزجاۃ کہتے ہیں کیونکہ ہر شخص انہیں پرے دھکیل دیتا ہے۔ یولف کا معنی جمع کرنا ہے، تہہ در تہہ چیز کو رکام کہتے ہیں۔ الودق کا معنی بارش ہے۔ من السماء سے من جبال بدل اشتمال ہے او مِن دونوں مقامات پر ابتدائیہ ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا من تبعیضیہ ہو اور مفعول واقع ہو رہا ہو۔ من برد میں

مِنْ بیانیہ ہے۔ اور یہ جبال کا بیان ہے۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ پہاڑ اتارتا ہے جو آسمان میں ہیں اور وہ پہاڑ اولوں کے ہیں اسی بناء پر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ آسمان میں برف کے پہاڑ ہیں (1)۔ دوسری تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ وہ آسمان سے بعض بڑے بڑے برف کے تودے برساتا ہے جو جمود اور لڑائی میں پہاڑوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا من تبعیضیہ ہو اور مفعول کی جگہ واقع ہو رہا ہو۔ فیصیب بہ میں بہ کی ضمیر کا مرجع برد ہے۔ یعنی اس برف کے ساتھ جس کے لئے چاہتا ہے اس کی کھیتی اور مال مویشی تباہ کردیتا ہے۔ سنا کا معنی روشنی ہے۔ یذہب کو ابوجعفر نے یاء کے ضمہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ اس قرأت پر باء زائدہ ہوگی۔

یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾

”بدلی کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ رات اور دن کی [1] بیشک اس میں عبرت ہے آنکھوں والوں کے لئے [2]“

[1] یعنی اللہ تعالیٰ دن کے بعد رات کو اور رات کے بعد دن کو لاتا ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ ایک وقت میں اضافہ کرتا ہے اور دوسرے کے وقت میں کمی کرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ گرمی، سردی، اندھیرا اور روشنی کے ذریعے دن رات کے حالات بدلتا رہتا ہے۔ یا اس سے بھی عام مفہوم ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ابن آدم زمانے کو برا بھلا کہہ کر مجھے اذیت دیتا ہے میں زمانہ (کو بدلتا) ہوں اور گردش لیل ونہار کا سلسلہ میرے قبضہ قدرت میں ہے (2)۔

[2] جسے اللہ تعالیٰ نے قلبی بصیرت اور عقل سلیم عطا فرمایا ہے اس کے لئے ان مذکورہ چیزوں میں صانع کے وجود اس کے کمال قدرت، کمال علم، نفاذ مشیت اور اس کے غیر کی احتیاج سے منزہ ہونے کی ہدایت اور دلالت موجود ہے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰۤی اَرْبَعٍ ؕ یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۵﴾

”اور اللہ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے تو ان میں کچھ رینگتے ہیں پیٹ کے بل۔ اور ان میں سے بعض چلتے ہیں دو ٹانگوں پر اور ان میں سے بعض چلتے ہیں چار ٹانگوں پر [1] پیدا فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ [2]“

[1] حمزہ اور کسائی نے خلق کو خالق کل دابة، یعنی اسم فاعل کا صیغہ مفعول کی طرف مضاف کرکے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے خلق ماضی کا صیغہ پڑھا اور کُلَّ کو مفعولیت کی بنا پر نصب دی ہے، یعنی حیوانات میں سے جو بھی زمین پر چلتا ہے ہر ایک کو پانی سے پیدا فرمایا ہے۔ یعنی پانی اس کے مادہ کا جز ہے یا مخصوص پانی مراد ہے یعنی نطفہ اگر مخصوص پانی (نطفہ) مراد ہوگا تو غالبیت کا اعتبار ہوگا کیونکہ بعض حیوانات نطفہ سے پیدا نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من ماءٍ، دابة کی صفت ہے۔ یہ خلق کے متعلق نہیں ہے اور دابہ میں ملائکہ اور جن داخل نہیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں پانی تمام مخلوق کی اصل ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری: 4549، جلد 4، صفحہ 1826 (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی کو پیدا فرمایا پھر اس کے بعض کو ہوا بنا دیا۔ پھر اس ہوا سے فرشتے پیدا فرمائے (1)۔ بعض پانی کو آگ بنا دیا پھر اس سے جنّ پیدا فرمائے' بعض پانی کو مٹی بنا دیا پھر اس سے آدم اور باقی تمام مخلوق پیدا فرمائی۔ بعض حیوانات پیٹ کے بل رینگتے ہیں، جیسے سانپ اور دوسرے کیڑے۔ بعض دو ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے انسان اور پرندے اور بعض چار ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے چوپائے' اللہ تعالیٰ نے ان حیوانات کا ذکر نہیں کیا جو چار سے زیادہ ٹانگوں پر چلتے ہیں مثلاً بھنگا اور دوسرے کیڑے جن کے پاؤں زیادہ ہوتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی صورت پر ہیں جو چار ٹانگوں پر چلتے ہیں۔ اور ضمیر کا مذکر ذکر کرنا عقلاء کو غلبہ دینے کی وجہ سے ہے' اور مختلف اصناف سے تعبیر فرمایا تا کہ تفصیل اجمال کے موافق ہو جائے۔

ع یعنی اللہ تعالیٰ بسائط' مرکبات وغیرہ اور وہ چیزیں جن کا ذکر ہو چکا ہے مادہ کے اتحاد کے باوجود صورتوں' ہیئتوں حرکات طبائع اور افعال کے اختلاف پر جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور جیسا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے ویسا کرتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

"ہم نے اتاری ہیں ایسی آیتیں جو (حق کو) صاف صاف بیان کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ تک 1۔"

1۔ یعنی قرآن کریم میں یا عالم وجود ظلی میں ایسے دلائل نازل کئے ہیں جو صانع کے وجود اور اس کے علیم' حکیم اور قدیر ہونے پر شاہد ہیں اور وہ دلائل حق کو ظاہر کرتے ہیں۔ صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے جو مراتب قرب تک پہنچاتا ہے نیز جنت تک پہنچنے اور دوزخ سے نجات کا باعث ہے۔

خلاصہ یہ کہ دولت ایمان عطائی اور وہبی چیز ہے۔ توفیق الٰہی اور ہدایت الٰہی کے بغیر دلائل میں غور وفکر سے حاصل نہیں ہوتی۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ بشر نامی ایک منافق شخص تھا جس کا زمین کے متعلق ایک یہودی سے تنازعہ تھا یہودی نے بشر کو کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتے ہیں اور فیصلہ کراتے ہیں۔ بشر منافق کہنے لگا کعب بن اشرف سے فیصلہ کراتے ہیں کیونکہ محمد (ﷺ) تو ہم پر ظلم کرتے ہیں (2) اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝

"اور وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور (اس کے) رسول پر اور ہم فرمانبردار ہیں پھر منہ پھیر لیتا ہے ایک فریق ان سے (ایمان واطاعت کے) اس دعویٰ کے بعد اور یہ لوگ ایماندار نہیں ہیں۔ 1"

1۔ یقولون کا فاعل، بشر اور اس جیسے دوسرے منافق ہیں۔ یعنی پہلے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں لیکن جب ان کا کوئی فیصلہ ان کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں' جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی سرتابی کرے وہ ایماندار نہیں۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ منافق اگرچہ اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے دل اس نعمت سے محروم ہیں۔ اولئک کا مشار الیہ یا تو وہ لوگ ہیں جو حق پر نہیں تھے یا وہ فریق ہے جنہوں نے منہ پھیر لیا تھا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 212 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 213

المومنین پر الف لام اس بات پر دلالت کرنے کے لئے لگایا ہے کہ جن کو تم مؤمن جانتے ہو یہ بدبخت ان میں سے نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ان مؤمنین کے اخلاص اور صدق کو جانتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت حسن سے ایک مرسل حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص تھا جس کا کسی دوسرے کے ساتھ جھگڑا ہوتا اور یہ حق پر ہوتا اور پھر نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں فیصلہ کرانے کے لئے بلایا جاتا تو وہ اطاعت کرتا اور یقین رکھتا کہ حضور ﷺ صحیح فیصلہ فرمائیں گے اور اگر اس شخص کا ارادہ کسی پر ظلم کرنا ہوتا تو اس وقت بارگاہ نبوت میں اسے دعوت دی جاتی تو وہ اعراض کرتا اور کہتا فلاں کے پاس جائیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تا کہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں سے روگردانی کرنے لگتی ہے۔ [1]''

[1] یعنی جب انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی طرف بلایا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بلایا جاتا ہے۔ رسولہ کا ارشاد تفسیر کے قائم مقام ہے جیسے کہ اس جملہ میں ہے اَعْجَبَنِیْ زَیْدٌ وَکَرَمُہٗ۔ اذا دعوا کا جملہ ما اولئک بالمومنین پر یا یقولون پر معطوف ہے۔ یعنی انہیں بلایا جاتا ہے کہ رسول مکرم ﷺ کی بارگاہ میں آؤ تا کہ رسول مکرم ﷺ حکم الٰہی کے مطابق فیصلہ فرمائیں تو وہ اس حکم سے یا ایمان سے اعراض کرتے ہیں۔ (یعنی جب انہیں علم ہوتا ہے کہ ہمارے جھگڑے کی بنیاد جھوٹ اور باطل پر ہے)

وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

''اور اگر فیصلہ ان کے حق میں ہونا ہو تو (بھاگے) چلے آتے ہیں اس کی طرف تسلیم کرتے ہوئے۔ [1]''

[1] الیہ کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ ہیں۔

اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

''کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے یا وہ (اسلام کے متعلق) شک میں مبتلا ہیں یا انہیں یہ اندیشہ ہے کہ ظلم کرے گا اللہ تعالیٰ ان پر اور اس کا رسول بلکہ (درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں۔ [1]''

[1] یعنی کیا ان کے دلوں میں کفر ہے اور ظلم کی طرف میلان ہے یا انہوں نے آپ کی ذات میں کوئی چیز دیکھی ہے جس نے ان کے اس یقین اور وثوق کو ٹھیس پہنچائی ہے جو یہ آپ ﷺ کے متعلق رکھتے تھے یا انہیں اندیشہ ہے کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول ﷺ فیصلہ کرنے میں ظلم کریں گے، (ہرگز نہیں) بلکہ یہ کفر اختیار کر کے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں یا لوگوں پر ظلم کرتے ہیں کہ یہ ان کے مال باطل ذرائع سے کھانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ یہ آخری دو قسموں سے اضراب ہے، کیونکہ پہلی قسم متحقق ہے کہ ان کا بارگاہ رسالت ﷺ میں فیصلہ کے لئے حاضر نہ ہونا یا تو اس لئے ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ اور مرض ہے۔ یا حاکم میں کوئی کمی ہے۔ دوسری صورت میں کہ حاکم میں ان کے نزدیک کمی متحقق تھی یا متوقع تھا۔ یہ دونوں

صورتیں باطل ہیں، کیونکہ منصب نبوت اور آپ ﷺ کا فرط امانت ان چیزوں سے مانع ہے۔ (یعنی نبی کی ذات میں فیصلہ کرنے کی صورت میں کوئی ظلم وتعدی کا اندیشہ نہیں ہوتا اس کا منصب عالی ایسے فعل سے بلند ہوتا ہے) پس یہ صورت ہی متحقق ہوتی ہے کہ بارگاہ نبوت میں حاضر نہ ہونے کا سبب ان کے دل کا کھوٹ ہے اور اس کی تائید پہلا ارشاد بھی کرتا ہے کہ اگر انہیں اپنے حق میں فیصلہ ہونے کا یقین ہو تو دوڑتے چلے آتے ہیں۔ اولئک کے بعد ضمیر فصل ہے دوسرے لوگوں سے اس حکم کی نفی پر دلالت کرنے کے لئے لگائی گئی ہے خصوصاً عوالیہ، یعنی رسول کریم ﷺ کی ذات سے ظلم کی نسبت ختم کرنے کے لئے ضمیر فصل لگائی ہے۔

منافقین کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے مخلص مومنین کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے لئے جو مناسب فوز وفلاح کا راستہ ہے اس کا ذکر فرمایا۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾

"ایمانداروں کی بات تو صرف اتنی ہے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ فرمادے ان کے درمیان تو وہ کہتے ہیں ہم نے فیصلہ سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں بامراد ہیں [1]"

[1] قول کان کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا اسم ان یقولوا ہے۔

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٢﴾

"اور جو شخص اطاعت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ڈرتا رہتا ہے اللہ سے اور بچتا رہتا ہے اس (کی نافرمانی) سے تو یہی لوگ کامیاب ہیں [1]"

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے خواہ اس کو اس اطاعت میں تکلیف ہو یا خوشی ہو۔ اور اپنے گناہوں کے متعلق ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اور احکام الٰہی کی مخالفت کا اندیشہ اسے ہر لحہ دامن گیر رہتا ہے۔ اور وہ احکام کی پیروی اور نواہی سے اجتناب اور حدود وفرامین کی فرمانبرداری کا مظاہرہ کر کے اس کے عذاب سے بچتا رہتا ہے تو ایسا خوش نصیب دائمی نعمتوں کے ساتھ کامیاب وکامران ہوگا۔

حفص نے یتقہ کو قاف کے سکون اور ماقبل سکون کی وجہ سے ہاء کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس صورت میں پڑھا جاتا ہے جب جزم کی وجہ سے یاء ساقط ہو۔ ماقبل کو ساکن کرتے ہیں عرب کہتے ہیں لَمْ اَشْتَرِ طَعَامًا راء کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ابوبکر، ابوعمرو اور خلاد، حمزہ سے روایت کر کے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ باقی قراء ہاء کو کسرہ دیتے ہیں۔ ابوجعفر، قالون اور یعقوب اختلاس کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ باقی قراء ماقبل متحرک ہونے کی وجہ سے اشباع کرتے ہیں۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۖ قُلْ لَا تُقْسِمُوا ۖ طَاعَةٌ مَعْرُوفَةٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٣﴾

"اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی بڑے زور وشور سے کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ (گھروں سے بھی) نکل جائیں گے [1] فرمائیے قسمیں نہ کھاؤ۔ تمہاری فرمانبرداری خوب معلوم ہے یقیناً اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے جو کچھ تم کرتے رہتے

ہو۔ لے''

لے اس آیت میں منافقین کے طریقہ کار کو بیان کیا جا رہا ہے جہاد کا لفظ یا تو مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یا اقسموا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی بڑی بلیغ قسمیں اٹھاتے ہیں۔ جهد الیمین کا لفظ جهد نفسه سے مستعار ہے، جس کا معنی انتہائی کوشش کرنا ہے' یا جهد مفعول فیہ ہے' یعنی و جهدهم ایمانهم۔ یعنی پرزور قسمیں اٹھانے کے وقت۔ یعنی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ اے محمد، صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ گھر بار اور مال و متاع چھوڑنے کا حکم دیں گے اور جہاد کا اشارہ فرمائیں گے تو ہم نکل پڑیں گے۔ لیخرجن، اقسموا کا حکایۃً جواب ہے۔ اور معنی شرط کی جزا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بڑے چوڑے دعوے کرتے کہ جہاں جناب ہوں گے ہم بھی آپ کے ساتھ ہوں گے' آپ اگر کسی مہم پر نکلیں گے تو ہم بھی آپ کی معیت میں نکلیں گے اگر آپ کہیں رک جائیں گے تو ہم بھی رک جائیں گے' اگر آپ ہمیں جہاد کا حکم دیں گے تو ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیارے حبیب! انہیں فرمائیے کہ جھوٹی قسمیں نہ اٹھاؤ۔

۲۔ مجاہد فرماتے ہیں طاعة معروفة سے مراد زبانی دعوے ہیں جن کے پیچھے اعتقاد کی قوت نہ ہو۔ یعنی تمہارا ہر کسی کو پتہ ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور تمہارے قول و فعل میں ہمیشہ تضاد ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ خالص نیکی' جھوٹے وعدہ سے افضل ہے۔ مقاتل بن سلیمان کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف سے طاعت معروفہ ہونی چاہئے (2)۔ بعض فرماتے ہیں تمہاری طرف سے فقط طاعت معروفہ مطلوب ہے۔ نفاق آمیز قسموں کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ پر تمہارے دلوں کے بھید بھی مخفی نہیں ہیں۔

قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۵۴﴾

'' آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان لو) رسول کے ذمہ اتنا ہے جو ان پر لازم کیا گیا۔ اور تمہارے ذمہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا۔ اگر تم اطاعت کرو گے اس کی تو ہدایت پا جاؤ گے اور نہیں ہے (ہمارے) رسول کے ذمہ بجز اس کے کہ وہ صاف صاف پیغام پہنچا دے۔ لے''

لے (قل) تاکید کے لئے امر کو مکرر ذکر فرمایا۔ فان تولوا اصل میں تتولوا تھا۔ یہ مضارع کا صیغہ ہے' ایک تا کو حذف کیا گیا ہے۔ فَاِنۡ کی جزاء محذوف ہے۔ فانما علیه۔ اس جزاء کی علت ہے جو جزاء کے قائم مقام رکھی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اعراض کرو گے تو اس کا خسارہ تمہیں ہوگا۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ اس کی جو ذمہ داری تھی اس نے بحسن و خوبی ادا فرما دی ہے اور تم پر جو لازم تھا تم نے اسے پس پشت ڈال دیا' اس لئے اس کا نقصان بھی تم پر ہوگا۔ و ان تطیعوا کا عطف ان تولوا پر ہے۔ یعنی اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت کرو گے تو نور حق کو پا لو گے اور جنت کے راستہ پر گامزن ہو جاؤ گے۔ میرے محبوب کے ذمہ تو فقط اتنا ہے کہ جن احکام کے تم مکلف بنائے گئے ہو اس کو صاف صاف بیان کرنا ہے۔

حاکم اور طبرانی نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ طیبہ ہجرت کر کے پہنچے تو انصار نے ان کو اپنے گھروں میں جگہ عطا کی' اس مہمان نوازی اور تعاون پر عرب انصار کے دشمن بن گئے۔ اس دشمنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (الفکر)　　2۔ ایضاً

کی وجہ سے انصار صبح وشام ہتھیار اٹھائے رہتے تھے۔ تو ان کے دل میں یہ حسرت اٹھتی کہ کبھی ہم بھی ایسی زندگی گزاریں گے کہ رات آرام وسکون سے بسر ہوگی اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے ۱؎ کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں ۲؎ جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان کو جو ان سے پہلے تھے ۳؎ اور مستحکم کر دے گا ان کے لئے ان کے دین کو جسے اس نے پسند فرمایا ہے ان کے لئے اور وہ ضرور بدل دے گا انہیں ان کی حالت خوف کو امن سے ۴؎ وہ میری عبادت کرتے ہیں کسی کو میرا شریک نہیں بناتے ۵؎ اور جس نے ناشکری کی اس کے بعد تو وہی لوگ نافرمان ہیں ۶؎''

۱؎ الذین آمنوا سے مراد وہ خوش نصیب ہیں جو آیت کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود تھے۔ تمام مؤمنین مراد نہیں ہیں کیونکہ اس وقت استدراک لازم آئے گا کیونکہ الذین آمنوا کا کلمہ اس کے لئے مفید نہیں ہے۔

۲؎ لیستخلفنھم محذوف قسم کا جواب ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی وعداللّٰہ واقسم، یعنی اللہ نے وعدہ فرمایا اور قسم اٹھائی ہے کہ وہ ضروری خلیفہ بنائے گا انہیں۔ یا وعدہ اپنے تحقق میں قسم کے قائم مقام ہے۔ یعنی ہم عرب وعجم کے کفار کی زمین کا انہیں وارث بنائیں گے اور ہم انہیں خلفاء، بادشاہ بنائیں گے جن کی اطاعت واجب ہوگی یا یہ معنی کہ ہم زمین میں انہیں ایسا تصرف عطا کریں گے جیسا غلاموں میں مالکوں کا تصرف ہوتا ہے۔

۳؎ کما میں کاف مثل کے معنی میں ہو کر مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی ہم انہیں اس طرح خلافت عطا فرمائیں گے جیسے ان سے پہلے انبیاء کرام مثلاً داؤد اور سلیمان وغیرہما (علیہم السلام) کو عطا فرمائی تھی۔ قتادہ نے یہی مفہوم بیان کیا ہے (2)۔ یا یہ معنی کہ جس طرح بنی اسرائیل کو خلافت عطا فرمائی کہ مصر اور شام کے جابر حکمرانوں کو تباہ کیا اور ان کی جائیدادوں، گھروں اور اموال کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تورات میں موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا کہ شام کے شہروں کی فتح عطا کی جائے گی۔ لیکن یہ وعدہ موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں پورا نہ ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ (یہ سرزمین حرام کر دی گئی ہے ان پر چالیس سال تک سرگرداں پھریں گے زمین میں) پھر ان کے بعد یوشع بن نون کو خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھوں یہ وعدہ پورا ہوا حتیٰ کہ انہوں نے شام کو فتح کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی وصیت کے مطابق شام کے شہروں کو بنی اسرائیل میں تقسیم فرما دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم محمد ﷺ سے وعدہ فرمایا کہ اس کے دین کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا اور وعدہ فرمایا کہ رومیوں کو ایرانیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ تو یہ سارے وعدے نبی کریم ﷺ کی حیات ظاہرہ میں پورے نہ ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ ﷺ کا جانشین بنایا اور ان کے ہاتھوں

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 100 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (الفکر)

اس وعدہ کو پورا فرمایا' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنی حنیفہ اور عرب کے دوسرے مرتدین سے جنگ کر کے وہاں غلبہ پایا اور شام سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں فتح ہوا۔ سنہ ۹ ہجری میں۔

یہ وعدہ خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں پورا ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصحاب نبی ﷺ سے عراق کی طرف لشکر کشی کا مشورہ طلب کیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی آیت کو دلیل بناتے ہوئے جہاد کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہماری اہل سنت کی کتب میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ لیکن نہج البلاغہ جو اہل تشیع کی معتبر کتب میں سے ہے اس میں بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اسی طرح مروی ہے۔

اس کام کی فتح کثرت تعداد کی وجہ سے اور اس کی ناکامی قلت کی وجہ سے نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کو اس نے غلبہ عطا فرمایا ہے یہ اللہ کا لشکر ہے جس کو اس نے خود تیار کیا ہے اور جس کی مدد اس نے خود فرمائی ہے، حتیٰ کہ وہ ترقی کی اس منزل تک پہنچا جہاں تک پہنچا۔ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے آپ نے اسی آیت وعد اللّٰہ الذین آمنوا کی طرف اشارہ فرمایا' اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو ضرور پورا فرمائے گا اور اپنے لشکر کی ضرور تائید فرمائے گا۔

ابوبکر نے استخلف کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے معروف پڑھا ہے۔

۴۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ولیمکنن الخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شہروں میں وسعت عطا فرمائے گا حتی کہ وہ انہیں ملکیت عطا فرمائے گا اور ان کے دین اسلام کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ ابن کثیر' ابوبکر اور یعقوب نے ولیبدلنھم کو تخفیف کے ساتھ اور باء کے سکون کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے باقی قراء نے تشدید کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔

۵۔ یعبدوننی کا جملہ الذین امنوا منکم سے حال ہے، کیونکہ وعدہ' توحید پر ثابت قدم رہنے کے ساتھ مقید ہے' یا یہ جملہ خلافت عطا فرمانے کے مقتضیٰ کے بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہے اور لا یشرکون' یعبدوننی کے فاعل سے حال ہے یا اسم موصول سے یعبدوننی کے لئے حال مرادف ہے۔

ابوالعالیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو جزیرہ عرب پر غلبہ عطا فرمایا تو وہ دولت ایمان سے مشرف ہوئے اور ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی روح کو قبض فرمایا۔ پھر سیدنا ابوبکر صدیق' سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک امن و آشتی کی فضا میں رہے۔ حتیٰ کہ پھر فتنوں میں مبتلا ہو گئے اور نعمتوں کی ناشکری شروع کر دی(1)۔

ابوالعالیہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ سلسلہ وحی کے شروع ہونے کے بعد دس سال صحابہ کرام کی معیت میں مکہ کے اندر ٹھہرے رہے اور اس دور میں صحابہ کرام کو کفار کی اذیتوں اور ظلم و ستم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم تھا۔ پھر صحابہ کرام کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا اور جنگ کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ صحابہ کرام ہر وقت خوفزدہ رہتے اور ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ ایک صحابی نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا ایسا دن بھی آئے گا کہ ہم امن و سکون کے ساتھ ہوں گے اور ہتھیار اٹھانے کی تکلیف سے چھٹکارا مل جائیگا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 16-215 (الفکر)

2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 100 (العلمیۃ)

ابن ابی حاتم نے براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے ہم ہر وقت سہمے سہمے رہتے تھے (1) کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور خوف کو امن سے تبدیل فرمادیا اور زمین کو ہمارے لئے کشادہ فرمادیا۔ یہ آیت نبوت کی صحت پر بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ اس میں ایک غیب کی خبر ہے اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا ارشاد فرمایا تھا۔ دوسرا اس آیت میں خلفاء راشدین کی خلافت کی صحت کی بھی دلیل ہے کیونکہ اگر خلفاء راشدین کی خلافت مراد نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں خلف لازم آتا کیونکہ وعدہ اور جن سے وعدہ کیا گیا تھا دونوں چیزیں خلافت راشدہ کے دور میں ہی موجود تھیں' تیسرا اس آیت میں اہل سنت والجماعت کے مذہب کے حق ہونے کی بھی دلیل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے اور اس میں رافضیوں کے مذہب کے بطلان کی بہت بڑی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ آج تک ائمہ خوفزدہ ہیں اور خوفزدہ رہیں گے حتیٰ کہ مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا اور مہدی علیہ السلام اب دشمنوں کے خوف سے چھپے ہوئے ہیں۔ رافضیوں کا یہ کہنا کہ '' اللہ تعالیٰ اس وعدہ کو اس وقت پورا فرمائے گا جب مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا'' ان کا یہ قول باطل ہے اور ان کے اس قول کی تردید آیت میں موجود منکم کا کلمہ کرتا ہے۔ دین کا وہ کونسا غلبہ ہوگا؟ اگر گیارہ سو سال بعد چند سال غلبہ ہو بھی جائے۔ یہ لوگ کتنے جاہل ہیں!

حضرت سفینہ جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے وہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ میرے بعد خلافت تیس سال ہوگی پھر بادشاہی ہوگی۔ پھر حضرت سفینہ نے فرمایا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت دو سال' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت دس سال اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بارہ سال اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت چھ سال رہی۔

عدی بن حاتم فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ ایک شخص حاضر ہوا اور اپنی تنگدستی اور فقر کی شکایت کی۔ پھر دوسرا شخص آیا اور ڈاکوؤں کا شکوہ کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے عدی، کیا تو نے حیرہ کا شہر دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا' حضور ایسا اتفاق نہیں ہوا لیکن مجھے اس کے متعلق کچھ بتایا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تیری زندگی لمبی ہوئی تو تو دیکھے گا کہ ایک عورت اونٹنی پر سوار ہو کر حیرہ سے روانہ ہوگی اور کعبہ کا طواف کرے گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ بنی طے قبیلہ کے ڈاکو کہاں چلے جائیں گے؟ پھر فرمایا اگر تیری زندگی دراز ہوئی تو تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے میں نے کہا حضور ﷺ! کسریٰ سے مراد کسریٰ بن ہرمز ہے؟ فرمایا ہاں کسریٰ بن ہرمز۔ پھر فرمایا اگر تیری زندگی لمبی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک شخص ہاتھوں میں سونا اور چاندی اٹھائے ایسے شخص کی تلاش میں ہوگا جو اس کا صدقہ قبول کرے۔ اور تم میں سے کوئی اپنے رب سے ملے گا جس دن وہ اس سے ملاقات کرے گا اور اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی ایسا ترجمان نہیں ہوگا جو ترجمانی کرے گا اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کیا میں نے تیری طرف رسول نہیں بھیجا تھا تاکہ وہ تجھے تبلیغ کرے؟ بندہ عرض کرے گا کیوں نہیں۔ وہ تیرا رسول مکرم ﷺ تشریف لایا تھا پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تجھے مال نہیں عطا کیا تھا اور تجھ پر فضل نہیں کیا تھا؟ بندہ عرض کرے گا واقعی مال بھی عطا فرمایا تھا اور فضل و احسان بھی بے شمار فرمایا تھا۔ پس وہ اپنے دائیں بائیں جہنم دیکھے گا (2)۔ عدی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے نصف حصہ کو صدقہ کر کے بھی بچ سکو۔ اگر کھجور کا نصف حصہ بھی جس کے پاس نہ ہو تو اچھی گفتگو کے ذریعے بچو۔ عدی فرماتے ہیں' میں نے حیرہ سے اونٹنی پر سوار ہو کر آنے والی عورت کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 100 (العلمیہ)

کسی کا خوف نہ تھا۔ اور میں ان لوگوں میں تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کئے تھے۔ اگر زندگی دراز ہوئی تو وہ سب کچھ ظاہر ہوگا جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک شخص ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھائے ہوئے ہوگا(1) لیکن کوئی غریب مسکین نہیں ملے گا۔

۲ اور جس نے مومنین کی تمکین اور استخلاف اور ان کے دین حنیف کی تائید کا آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ناشکری کی یا مرتد ہوگیا تو ایسے لوگ دائرہ ایمان سے نکلنے والے ہیں یا حد اطاعت سے خروج کرنے والے ہیں۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ علماء تفسیر فرماتے ہیں سب سے پہلے جن لوگوں نے اس نعمت کا انکار کیا وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کیا۔ جب انہوں نے آپ کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حالات بدل دیئے اور ان پر خوف طاری کر دیا۔ حتیٰ کہ بھائی بھائی بن جانے کے بعد آپس میں جنگ وجدل اور قتل وغارت پر اتر آئے(2)۔ علامہ بغوی نے اپنی سند سے حمید بن ہلال سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بتایا کہ جب سے رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہیں فرشتے اس شہر کے ارد گرد رہتے ہیں اور آج تک معاملہ اسی طرح ہے۔ قسم بخدا! اگر تم نے عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو قتل کر دیا تو فرشتے چلے جائیں گے اور پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ قسم بخدا! جو شخص انہیں قتل کرے گا وہ اللہ کی بارگاہ میں مجذوم ہو کر جائے گا اور اس کا ہاتھ نہ ہوگا اور اللہ کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہتی ہے۔ واللہ اگر وہ اسے سونت لے گا تو وہ اسے نیام میں نہیں ڈالے گا۔ (ابداً کا لفظ فرمایا یا الی یوم القیامۃ کا فرمایا) کوئی نبی قتل نہیں کیا گیا لیکن اس کے بدلہ میں پینتیس ہزار افراد قتل ہوئے اور کوئی خلیفہ قتل نہیں ہوا مگر اس کے بدلہ میں پینتیس ہزار افراد قتل ہوئے(3)۔ میں کہتا ہوں خلفائے راشدین کے خلیفہ بنانے کا انکار رافضیوں اور خارجیوں کے گروہوں نے کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ و من کفر بعد ذالک کے ارشاد کا اشارہ یزید بن معاویہ کی طرف ہو کیونکہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ساتھ دوسرے اہل نبوت کو شہید کیا اور آپ ﷺ کی اولاد کی اہانت کی اور پھر اس فعل قبیح پر اس نے فخر کا اظہار کیا۔ کہنے لگا یہ دن بدر کے دن کا بدلہ ہے۔ اس بدبخت نے مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکر بھیجا اور واقعہ حرہ میں مدینہ طیبہ میں جو اس نے طوفان بدتمیزی برپا کیا (الامان والحفیظ)۔ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ جس کی بنیاد پہلے دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی تھی (اس میں اس نے گھوڑے باندھے)۔ بیت اللہ شریف پر مجانیق نصب کیں۔ ابن زبیر کو قتل کیا۔ کونسا جرم تھا جو اس بدبخت نے نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اس نے اللہ کے دین کا بھی انکار کیا۔ اور شراب کو مباح قرار دیا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور صحیح صحیح ادا کیا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسول (پاک ﷺ) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۔ا ''

ا اقیموا کا جملہ اپنے معطوفات سے ملکر و اطیعوا اللہ پر معطوف ہے کیونکہ درمیان والی کلام مامور بہ پر وعدہ ہے اور اطاعت رسول ﷺ کے امر کا تکرار تاکید کے لئے ہے اور اطاعت رسول کے ساتھ رحمت کو معلق کرنے کیلئے ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 338 (العلمیہ)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (الفکر)   3۔ ایضاً

”یہ خیال ہرگز نہ کیجئے کہ کفار عاجز کرنے والے ہیں (ہمیں) زمین میں اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور یہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۱؎“

۱؎ ابن عامر اور حمزہ نے لا یحسبن غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اسم موصول اس کا فاعل ہے۔ اور باقی قراء نے خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور اسم موصول مفعول ہے۔ وما واھم النار اسم موصول سے حال ہے یا معنی کے اعتبار سے لا تحسبن پر معطوف ہے۔ بئس کا مخصوص بالذم النار ہے۔ لا تحسبن کا جملہ وعید ہے اور ومن کفر بعد ذالک کے ساتھ متصل ہے۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان سے روایت کیا ہے کہ اسماء بنت مرثد کا ایک غلام تھا جو اکثر ان کے پاس ایسے وقت میں آتا جس میں آپ انکا آنا ناپسند کرتی تھیں۔ حضرت اسماء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ ہمارے غلام ایسے اوقات میں ہمارے پاس آتے ہیں جن میں ان کا آنا ہمیں پسند نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾

”اے ایمان والو! اذن طلب کیا کریں تم سے (گھروں میں داخل ہوتے وقت) تمہارے غلام ۱؎ اور وہ (لڑکے) جو ابھی جوانی کو نہیں پہنچے ۲؎ تم میں سے تین مرتبہ نماز فجر سے پہلے اور جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو دوپہر کو اور نماز عشاء کے بعد۔ یہ تین پردے کے وقت ہیں تمہارے لئے ۳؎ نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی حرج ہے ان اوقات کے علاوہ۔ کثرت سے آنا جانا رہتا ہے تمہارا ایک دوسرے کے پاس یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنے) احکام اور اللہ تعالیٰ علیم حکیم ہے۔ ۴؎“

۱؎ یہ گزشتہ احکام کی اطاعت کے وجوب اور ان پر وعدہ اور ان سے اعراض پر وعید ذکر کرنے کے بعد سابقہ احکام کے تتمہ کے طور پر اس آیت کو ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں خطاب مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے لیکن مردوں کو غلبہ دیتے ہوئے صرف ان کا ذکر فرمایا۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدلج بن عمرو غلام کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف دوپہر کے وقت بھیجا تا کہ وہ انہیں بلا لائے۔ وہ غلام داخل ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس نے ایسی حالت میں دیکھا جس کا اسے دیکھنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ناپسند تھا(2)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲؎ یعنی وہ دَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۔ اس آیت میں بھی فبلغن اجلھن سے مراد قرب اختتام عدت ہے۔ اس دخول کے حکم کی نہی میں مراہق بھی داخل ہے کیونکہ وہ بھی بالغ کے حکم میں ہوتا ہے۔ یعنی خدام اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (الفکر) 2۔ ایضاً

بچے بھی اگر تین اوقات میں آئیں تو اجازت طلب کریں۔ ان اوقات میں سے پہلا وقت فجر کی نماز سے پہلے کا وقت ہے کیونکہ اس وقت میں انسان نماز کے لئے اٹھتا ہے اور سونے والے کپڑے اتار کر پاک کپڑے اور معمول کے کپڑے پہنتا ہے۔ دوسرا وقت وہ ہے جس میں انسان دوپہر کے وقت قیلولہ کرتا ہے اور تیسرا وقت عشاء کے بعد کا ہے کیونکہ انسان اس وقت سونے کے لئے لباس تبدیل کرتا ہے اور اپنے آپ کو ڈھانپتا ہے۔

ے حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے ثلث کو ثلاث مرات سے بدل کی حیثیت سے نصب دیا ہے۔ باقی قراء نے مبتدا محذوف کی خبر کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی تقدیر اس طرح ہے۔

ثَلَاثُ سَاعَاتِ اِنْكِشَافُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ۔ یعنی دو مضاف محذوف ہیں۔ اس تقدیر پر عورت بمعنی شرمگاہ ہوگی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کی تقدیر اس طرح ہے هِيَ ثَلَاثُ اَوْقَاتٍ تُخْتَلُّ فِيْهَا تَسَتُّرُكُمْ(1) یعنی یہ وہ تین اوقات ہیں جن میں تمہارا پوشیدہ ہونا تصور کیا جاتا ہے، عورۃ کا اصل معنی خلل ہے، بعض علماء فرماتے ہیں عورۃ، عار سے مشتق ہے، انسان کی شرمگاہ کو عورۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ظہور سے انسان کو عار اور شرمندگی لاحق ہوتی ہے اور مذمت کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے عورتوں کو عورت کہا جاتا ہے۔ بری کلام کو بھی عورت کہا جاتا ہے، کپڑے میں جو پھٹن ہو اسے بھی عورۃ کہا جاتا ہے، کمرے میں کوئی دراڑ بھی ہو اسے بھی عورت کہتے ہیں کیونکہ اس سے عار لاحق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ۔ (ہمارے مکان ٹوٹے ہوئے ہیں) ان اوقات کو عورت اس لئے کہا ہے کہ کیونکہ اس وقت انسان بغیر پردے کے دیکھے جانے سے عار محسوس کرتا ہے، قاموس میں عورت کے بہت سے معانی درج ہیں ہونٹوں وغیرہ میں خرابی۔ ہر وہ چیز جو پوشیدگی کے قابل ہو، شرمگاہ، وہ وقت جس میں انسان اپنے اعضا کو کھولتا ہے یہ تین اوقات ہیں۔ 1۔ نماز فجر سے پہلے 2۔ دوپہر اور 3۔ عشاء کی نماز کے بعد۔ اسی طرح یہ بھی لکھا ہے ہر وہ کام جس سے انسان کو حیا آجائے۔ اسی طرح اس کا معنی پہاڑوں کے درے بھی ہے(2)۔

مسئلہ: اس آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان اوقات میں غلام کے لئے اپنے آقا کے پاس جانا جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ چھوٹا بچہ ہو لیکن باشعور ہو۔ اسی طرح لونڈی کے لئے اپنی مالکن کے پاس ان اوقات میں جانا جائز نہیں ہے۔ بالغ اور مراہق غلام کا اپنی مالکن کے پاس جانا ہر وقت ممنوع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا الآية جن غلاموں کے دخول کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اس سے مراد لونڈیاں ہیں۔ لونڈی کے لئے اپنے مالک کے پاس جانا جائز ہے کیونکہ وہ بیوی کی طرح ہوتی ہے۔ سمجھدار چھوٹے بچے کے لئے ان مذکورہ تین اوقات میں بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اور ان اوقات کے علاوہ کسی وقت بھی بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے، جیسا کہ آگے ارشاد ہے ليس عليكم ولا عليهم جناح بعدهن۔ یعنی ان اوقات کے علاوہ بغیر اجازت ان کا گھروں میں داخل ہونا نہ تمہارے لئے گناہ کا موجب ہے اور نہ ان کے لئے۔

ے ان کا تمہارے پاس آنا جانا کثرت سے ہوتا ہے۔ بعضكم على بعض کا جملہ سابقہ جملہ سے بدل ہے اور اس کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غلاموں اور بچوں کو ان کی جنس میں شمار کیا ہے کیونکہ ان کا کثرت سے اختلاط ہوتا ہے۔ پس ان کو بھی مخاطبین کا بعض بنایا۔ کذالک میں کاف بمعنی مثل ہے اور یہ مصدر محذوف تبیاناً کی صفت ہے۔ آیات سے مراد احکام کی آیات ہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 252 (العلمیۃ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 624 (التراث العربی)

علامہ بغوی لکھتے ہیں اس آیت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا حکم منسوخ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کچھ ایسے لوگ تھے جن کے گھروں میں پردوں کا انتظام نہیں تھا۔ بچے اور خدام ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ بعض اوقات ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے جس کو وہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ پس اجازت طلب کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں رزق میں کشادگی عطا فرمائی۔ اور انہوں نے پردے بنوا لئے۔ اس کے بعد اجازت طلب کرنے کا حکم ختم ہو گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ منسوخ نہیں ہے(1)۔ حضرت سفیان، موسیٰ بن عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے شعبی سے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا قسم بخدا! یہ منسوخ نہیں ہے۔ میں نے کہا لوگ تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ شعبی نے فرمایا اللہ المستعان (اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جاتی ہے) سعید بن جبیر اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں لوگ کہتے ہیں یہ آیت منسوخ ہے۔ قسم بخدا یہ منسوخ نہیں ہے لیکن لوگ اس پر عمل کرنے میں سستی کرتے ہیں(2)۔ میں کہتا ہوں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے لیکن اجازت طلب کرنے کا حکم ان تین اوقات میں پردہ پوشی میں خلل کی علت کی بنا پر ہے، جیسا کہ فرمایا ثلٰث عورات لکم۔ یہ تین اوقات تمہارے لئے پردے کے اوقات ہیں یہ حکم ان تین اوقات اور دوسرے اوقات کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہے۔ علت کے نہ پائے جانے کے وقت حکم کا نہ پایا جانا نسخ کی دلیل نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جو اس کے منسوخ ہونے کا قول کیا ہے وہ مجازاً ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اب جبکہ لوگ پردے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں اور ان اوقات میں بھی کسی کے آنے سے خلل کا اندیشہ نہیں ہوتا تو آنے والوں پر اجازت طلب کرنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

''اور جب پہنچ جائیں تمہارے بچے حد بلوغ کو تو وہ بھی اذن طلب کیا کریں۔ جس طرح اذن طلب کیا کرتے ہیں وہ لوگ (جن کا ذکر) پہلے ہوا۔ یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام کو۔ اور اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے۔ لے''

لے اس آیت کریمہ کا حکم ہر اس فرد کو شامل ہے جو مردوں یا عورتوں کے پاس جانے کا ارادہ کرتا ہے خواہ وہ عورتیں محرمات ہوں یا اجنبیات ہوں۔ اس کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے جو ابو سعید الخدری سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں ابو موسیٰ ہمارے پاس آئے تو انہوں نے بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے بلا بھیجا میں ان کے دروازہ پر پہنچا تین مرتبہ سلام کیا لیکن کوئی جواب نہ آیا میں واپس لوٹ پڑا۔ کیونکہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا جبکہ تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے۔ اور پھر اجازت نہ ملے تو اسے واپس آ جانا چاہئے۔ مجھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس روایت پر دلیل پیش کرو۔ ابو سعید فرماتے ہیں میں آپ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور گواہی دی (کہ واقعی آپ ﷺ نے فرمایا تھا) یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے(3)۔

عطاء بن یسار سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کروں؟ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا حضور ﷺ میں اس کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اجازت طلب کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (الفکر)　2۔ ایضاً، صفحہ 218　3۔ صحیح مسلم: 2153، جلد 14، صفحہ 110 (العلمیۃ)

کرو۔اس شخص نے کہا حضور میں تو اس کا خدمت گزار ہوں فرمایا پھر بھی اجازت طلب کیا کرو کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اسے برہنہ دیکھے اس نے کہا نہیں۔فرمایا پھر ماں کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کیا کرو۔اس حدیث کو امام مالک نے مرسل روایت کیا ہے(1)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں، سعید بن المسیب فرماتے ہیں انسان اپنی ماں کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کرے۔یہ آیت کریمہ اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔حضرت حذیفہ سے پوچھا گیا کیا انسان اپنی والدہ کے پاس جانے سے پہلے اجازت طلب کرے؟ فرمایا ہاں کیونکہ اگر اجازت طلب نہیں کرے گا تو ایسی حالت دیکھے گا جس کا دیکھنا اسے ناپسند ہوگا(2)۔

میں کہتا ہوں اس آیت میں اجازت طلب کرنے کا حکم شاید استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں ہے۔جو شخص اپنے گھر میں داخل ہونے کا ارادہ کرے اور اس میں اسکی محرمات عورتیں ہوں تو بغیر اجازت اس کا گھر جانا مکروہ تنزیہی ہے، کیونکہ احتمال ہے کہ کوئی محرمہ عورت اسے برہنہ دکھائی دے۔یہ احتمال ضعیف ہے اور اس کا مقتضیٰ مکروہ تنزیہی ہے لیکن دوسرں کے گھروں میں بغیر اجازت جانا حرام ہے کیونکہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا۔(اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو(دوسروں کے) گھروں میں اپنے گھروں کے سوا جب تک تم اجازت نہ لے لو) اسی طرح ایسے گھر میں بھی بغیر اجازت داخل نہ ہو جس میں اجنبی عورتیں ہوں۔مرد کے لئے ایسے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ ارشاد ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (آپ حکم دیجئے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی نگاہیں)

امام بیضاوی فرماتے ہیں جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ بالغ غلام کا اپنی مالکن کے پاس جانے کے لئے اجازت طلب کرنا واجب ہے۔وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ افراد ہیں جو غلاموں کے مقابلہ میں ذکر کئے گئے ہیں، وہ ان میں داخل نہیں ہیں۔(3) امام بیضاوی کی کلام یہ شعور دلاتی ہے کہ علماء کا اختلاف ہے کہ غلام کا مالکن کے پاس جانے سے پہلے اجازت طلب کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ غلام اپنی مالکن کے لئے محرم ہے یا نہیں؟ امام مالک اور امام شافعی کا قول یہ ہے کہ غلام اپنی مالکن کے لئے محرم ہے۔جبکہ امام شافعی کا پہلا قول اور امام حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ وہ اپنی مالکن کے لئے غیر محرم ہے۔پس جو اسے محرم بناتے ہیں ان کے نزدیک اجازت طلب کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔اور جو علماء غلام کو مالکن کا محرم نہیں بناتے ان کے نزدیک اس کا اجازت طلب کرنا واجب ہے۔

وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۶۰

''اور بوڑھی خانہ نشین عورتیں جنہیں آرزو نہ ہو نکاح کی لے تو ان پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ رکھ دیں اپنے بالائی کپڑے بشرطیکہ وہ نہ ظاہر کرنے والی ہوں (اپنی) آرائش ۲ے اور ان کا اس سے بھی اجتناب کرنا ان کے لئے بہت بہتر ہے ۳ے اور اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔۴ے''

لے قواعد جمع ہے قاعد کی اور اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو حیض اور حمل سے مایوس ہوں۔چونکہ یہ لفظ عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔جس طرح

1۔موطا امام مالک، جلد 4، صفحہ 963 (التراث العربی) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (الفکر)

3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 253 (العلمیہ)

حائض اور حامل عورتوں کے ساتھ خاص ہیں۔ اس لئے بغیرۃ کے استعمال ہوا ہے۔ القواعد ترکیب نحوی کے اعتبار سے مبتدا ہے اور اس میں ضمیر فاعل ذوالحال ہے اور من النساء حال ہے۔ التی اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر قواعد کی صفت ہے، یعنی جو بڑھاپے کی وجہ سے نکاح میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ ربیعہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ بوڑھی عورتیں ہیں جن کو مرد دیکھیں تو ان سے انکی پیرانہ سالی کی وجہ سے نفرت کریں۔ لیکن وہ عورتیں جن میں ابھی حسن و جمال کی جھلک باقی ہو اور محل شہوت ہوں تو وہ اس آیت کے حکم میں داخل نہیں ہیں (1)۔

۲؎ فلیس الخ۔ القواعد مبتدا کی خبر ہے اور اس پر فاء کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مبتدا کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ یعنی اپنے بعض کپڑے (اوپر والی چادر) اتار لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس مفہوم کی تائید عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کی قرأت بھی کرتی ہے ان کی قرأت اس طرح ہے اَنْ یَّضَعْنَ مِنْ ثِیَابِھِنَّ۔ پس بوڑھی عورت کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا پیٹ، پیٹھ اور ناف کے نیچے کا بدن ظاہر کرے لیکن سر، چہرہ اور ہاتھوں کا کہنیوں تک کھولنا اس کے لئے جائز ہے۔ البرج کا اصل معنی الظہور، یعنی ظاہر ہونا ہے۔ مینار اور قلعہ کو اسی وجہ سے برج کہا جاتا ہے۔ آسمان کے ستاروں کو بھی برج کہا جاتا ہے۔ التبرج کا معنی تکلف سے مخفی چیز کا ظاہر کرنا ہے۔ اسی سے سفینۃ بارجۃ ہے ایسی کشتی جو اوپر سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ البرج آنکھ کی کشادگی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اس طرح آنکھ وسیع ہو کہ اس کی سفیدی اس کی سیاہی کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے ہو۔ لیکن اب اس لفظ کا استعمال صرف اس معنی میں ہوتا ہے کہ عورت کا مردوں کے سامنے اپنی آرائش اور اپنے حسن و جمال کو ظاہر کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے ایک ان میں سے غیر موزوں جگہ پر ہر زینت کا ظاہر کرنا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں التبرج کا معنی اجنبی لوگوں کے سامنے زیب و زینت کا ظاہر کرنا ہے۔ اور یہ مذموم ہے۔ لیکن خاوند کے سامنے اپنی زیب و زینت کا ظاہر کرنا مذموم نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد اَلتَّبَرُّجُ بِالزِّیْنَۃِ لِغَیْرِ مُحَلِّھَا۔ کا یہی معنی ہے۔ اور غیر متبرجات یضعن کے فاعل سے حال ہے اور یہ لفظ بوڑھی عورتوں کے اوپر والی چادروں کے اتارنے میں گناہ نہ ہونے کی تقیید کا فائدہ دے رہا ہے کہ ان کا ارادہ مردوں کے سامنے اظہار زینت نہ ہو تو وہ ایسا کر سکتی ہیں لیکن جن عورتوں کا ارادہ اپنی آرائش اور زینت کا اظہار ہو تو ان کے لئے چادریں اتارنا بھی حرام ہے۔

۳؎ یعنی ان عورتوں کا مردوں کے سامنے اپنی چادریں نہ اتارنا، چادریں اتارنے سے بہتر ہے۔ یستعففن۔ عفۃ سے مشتق ہے جس کا معنی نفس کو ایسے اعمال سے بھی روکنا ہے جو حلال ہیں۔ قاموس میں عفت کا یہی معنی لکھا ہے۔ بوڑھی عورتوں کا چادریں نہ اتارنا اس لئے بہتر ہے کیونکہ چادریں اتارنا فتنہ کا باعث ہے اور پردہ تہمت سے بہت دور ہے۔

۴؎ اللہ تعالیٰ عورتوں کی ان باتوں کو خوب سننے والا ہے جو وہ مردوں کے متعلق کرتی ہیں اور چادریں اتارنے میں عورتوں کا جو مقصود ہے اس کو بھی وہ بہتر جاننے والا ہے۔

لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآىٕكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (الفکر)

اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۗ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۗ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٦١﴾

''نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے اور نہ تم پر ۱؎ اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے ۲؎ یا جن گھروں کی کنجیوں کے تم مالک ہو ۳؎ یا اپنے دوست کے گھر سے ۴؎ نہیں ہے تم پر کوئی حرج اگر تم کھاؤ سب مل کر یا الگ الگ ۵؎ پھر جب تم داخل ہو گھروں میں تو سلامتی کی دعا دو اپنوں کو وہ دعا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے جو بڑی بابرکت (اور) پاکیزہ ہے ۶؎ یونہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنے) احکام کو تاکہ تم سمجھ لو ۔''

۱؎ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، ضحاک وغیرہما فرماتے ہیں نابینے، لنگڑے اور مریض لوگ، صحت مند لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب کرتے تھے، کیونکہ لوگ ان کے ساتھ کھانا کھانے کو ناپسند کرتے تھے۔ نابینا کہتا ہو سکتا ہے میں زیادہ کھاتا ہوں گا، لنگڑا کہتا، شاید میں دو آدمیوں کی جگہ لیتا ہوں گا، اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1)۔ یعنی ایسے افراد کے صحت مند لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی طرح ابن جریر نے بھی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آیت کریمہ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ نازل ہوئی تو مسلمان، مریضوں، نابینوں اور لنگڑوں کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب کرنے لگے اور کہا کہ کھانا اموال میں سے بہتر مال ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق مال باطل طریقہ سے کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اندھا اچھا اور عمدہ کھانا دیکھ نہیں سکتا لنگڑا سیدھا بیٹھ نہیں سکتا اور کھانے پر مزاحمت نہیں کر سکتا اور مریض کھانا کم کھاتا ہے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ الی مفاتحتک نازل ہوئی۔ اس تاویل کی صورت میں علیٰ بمعنیٰ فی ہوگا، یعنی اندھے کے ساتھ کھانے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے(2)۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں۔ مسلمان جب جہاد پر جاتے تو معذور لوگوں کو پیچھے چھوڑ جاتے اور ان کو اپنے گھروں کی چابیاں دے جاتے اور انہیں کہتے کہ ہم نے تمہارے لئے ان گھروں میں کھانے کی چیزیں حلال کی ہیں، یہ معذور لوگ ان کے گھروں میں داخل ہونے سے ہچکچاتے اور کہتے کہ ان کی عدم موجودگی میں ہم ان کے گھروں میں داخل نہ ہوں گے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور انہیں ان گھروں میں داخل ہونے اور کھانے کی رخصت دی۔

حضرت حسن فرماتے ہیں یہ آیت انہیں جہاد سے پیچھے رہنے کی رخصت دینے کے لئے نازل ہوئی(3)۔ اس آیت کا ایک حصہ یہاں ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد والی کلام و لا انفسهم سے علیحدہ کلام شروع ہو رہی ہے۔

۲؎ یعنی ان گھروں میں سے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے جن میں تمہارے اہل وعیال رہتے ہیں۔ ان گھروں میں اپنے بچوں کے گھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 220 3۔ ایضاً، صفحہ 221

بھی داخل ہیں کیونکہ بیٹے کا گھر اپنے گھر کی طرح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ (1) تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے اس حدیث کو صحاح ستہ کے محدثین نے اور ابن حبان اور حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو انسان اپنے کسب اور محنت سے کھاتا ہے اور انسان کا بیٹا بھی اس کے کسب سے ہوتا ہے (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے۔ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے اموال سے کھانے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ ابن قتیبہ نے اسی طرح لکھا ہے۔

؎ ابن عباس فرماتے ہیں **ما ملکت مفاتحہ** ۔ سے مراد انسان کا وکیل ہے اور زمین اور مویشیوں کا جسے مختار بنایا جائے۔ یعنی وکیل اور زمین اور مویشیوں کے نگہبان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ زمین کا پھل اور اناج کھائے اور چوپایوں کا دودھ پیئے۔ لیکن جانوروں پر بوجھ لادنا اور مال کو ذخیرہ کرنا اس کے لئے جائز نہ ہوگا۔ ضحاک فرماتے ہیں **ما ملکت مفاتحہ** ۔ سے مراد تمہارے غلاموں کے گھر ہیں۔ اس مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ مالک اپنے غلام کے گھر کا مالک ہوتا ہے، مفاتح سے مراد خزانے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا) اور یہ بھی جائز ہے کہ مفاتح سے مراد چابیاں ہوں۔ عکرمہ فرماتے ہیں جب آدمی چابی کا مالک ہوتا ہے تو وہ خازن ہوتا ہے اس کے لئے اس میں سے تھوڑی سی چیز لے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سدی کہتے ہیں جو شخص کسی کھانے کی حفاظت کے لئے نگران بنایا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کھانے سے کچھ کھا لینا جائز ہے (3)۔ بزار نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرمایا ہے کہ مسلمان نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد پر جانے کی بہت رغبت رکھتے تھے۔ اور وہ لوگ اپنی چابیاں اپنے معذوروں کو دے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان گھروں سے جو چیز تم کھانا پسند کرو ہماری طرف سے وہ تم پر حلال ہے، معذور لوگ کہتے کہ ہمارے لئے یہ کھانا حلال نہیں ہے (کیونکہ ہو سکتا ہے کہ) انہوں نے خوشی سے ہمیں اجازت نہ دی ہو۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (4)۔ ابن جریر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ ان سے **لیس علی الاعمٰی حرج** کے ارشاد متعلق پوچھا گیا یہاں اندھے، لنگڑے اور مریض کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ زہری نے فرمایا مجھے عبید اللہ بن عبد اللہ نے بتایا ہے کہ مسلمان جب جہاد پر جاتے اور پیچھے معذور افراد چھوڑ جاتے تھے، اور انہیں اپنے دروازوں کی چابیاں دے جاتے تھے اور کہتے کہ ہمارے ان گھروں میں جو کچھ موجود ہے اس سے تمہارے لئے کھانا مباح ہے۔ وہ معذور لوگ اجتناب کرتے اور یہ کہتے کہ ہم ان کی عدم موجودگی میں ان گھروں میں داخل نہ ہوں گے۔ پس یہ آیت کریمہ انہیں رخصت دینے کے لئے نازل ہوئی (5)۔ بعض علماء نے **او ما ملکتم مفاتحہ** ۔ سے مراد خزانہ لیا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جو تم نے خزانہ کیا ہوا ہے اور جس کے تم مالک ہو اس میں سے اپنے گھروں میں کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے (6)۔

؎ یعنی اس مخلص دوست کے گھر سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں جن سے بے تکلفی ہو (7) اور وہ اس کو پسند بھی کرتے ہوں۔ صدیق کے لفظ کا اطلاق واحد اور جمع پر ہوتا ہے، جس طرح خلیط کا اطلاق واحد اور جمع پر ہوتا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 142 (وزارت تعلیم)　2۔ ایضاً، صفحہ 141　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 106 (العلمیہ)　5۔ ایضاً، صفحہ 107　6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر)　7۔ ایضاً

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ آیت حارث بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد پر نکلے اور مالک بن زید کو اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا' پھر جب وہ جہاد سے واپس پلٹے تو مالک بن زید کو انتہائی مشقت میں پایا۔ حضرت حارث نے ان سے اس پریشان کن حالت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے طعام کو کھانے سے اجتناب کرتا رہا اس لئے میری یہ حالت ہوگئی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1)۔ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے اور مالک بن زید کی جگہ خالد بن زید لکھا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں یہ حسن اور قتادہ اسی آیت کریمہ کی بنا پر دوست کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہونے اور اس کے کھانے سے متمتع ہونے کو جائز خیال کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مذکورہ افراد کے گھروں میں جب تم داخل ہوا اور وہ اپنے گھروں میں موجود نہ ہوں تو تمہیں اجازت ہے کہ تم ان کے گھروں سے کھانا کھالو۔ لیکن ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہوگیا لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے لیکن یہ اس بات پر محمول ہے کہ یہ حکم اس صورت کے ساتھ مختص ہے کہ گھر والا تمہارے کھانے پر راضی ہو۔ اور اس کی رضا یا تو صراحۃً معلوم ہو یا قرینہ سے معروف ہو۔ اسی وجہ سے ان افراد کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان افراد کے ساتھ بے تکلفی ہوتی ہے۔ ان افراد کے ساتھ تخصیص عادت کے طور پر ہے ورنہ جو شخص کسی اجنبی کے گھر میں داخل ہوا اور اسے گھر کے مالک کی رضا معلوم ہوا اور وہ اس کے اذن صریح یا قرینہ اجازت سے اس کا کھانا کھالے تو یہ اس کے لئے جائز ہوگا۔

مسئلہ: یہ آیت کریمہ محارم کے درمیان عادۃً بے تکلفی پر دلالت کرتی ہے۔ احناف نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ ذی رحم محرم کے گھر سے چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا خواہ چوری ہونے والا مال اس ذی رحم محرم کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو۔ اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا جو کسی اجنبی کے گھر سے اپنے ذی رحم محرم کا مال چوری کرلے۔ اس کی وجہ یہ ہے پہلی صورت میں حرز نہیں ہے اور دوسری صورت میں حرز (حفاظت) ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اس آیت سے تو پھر یہ بھی ثابت ہوگا کہ اس کا ہاتھ بھی نہ کاٹا جائے تو اپنے دوست کے گھر سے چوری کرلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوستی ایک عارضی امر ہے کبھی دوستی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ چوری کرنے کی وجہ سے تو وہ دوستی دشمنی سے بدل جائے گی اور دوستی ختم ہوجائے گی۔ لیکن قرابت اور رشتہ داری کبھی زائل نہیں ہوتی۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اندھے' لنگڑے اور مریض لوگ کسی شخص کے پاس کھانا طلب کرنے کے لئے جاتے اور اس کے پاس ان کو کھلانے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو وہ انہیں لے کر اپنے والدین یا ان افراد کے پاس جاتا جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔ معذور لوگ اس کھانے سے اجتناب کرتے اور کہتے کہ وہ ہمیں دوسروں کے گھر لے گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ایسا کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (3) اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ اندھے اور دوسرے معذوروں پر کوئی حرج نہیں ہے اور تم پر بھی کوئی حرج نہیں کہ تم اندھے اور اس جیسے دوسرے معذوروں کے ساتھ اپنی گھروں سے اور اپنی اولاد' ازواج' آباء الخ کے گھروں سے کھانا کھاؤ۔ علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عطاء خراسانی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 221

فرمایا کوئی مالدار شخص کسی اپنے فقیر رشتہ دار یا دوست کے پاس جاتا اور وہ فقیر اسے کھانے کی دعوت دیتا تو وہ مالدار کہتا میں تیرے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا ہوں کیونکہ میں غنی ہوں اور تو فقیر ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی(1)۔

۵ اشتاتاً کا معنی الگ الگ ہے' علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بنی لیث بن بکر کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ کنانہ کا ایک قبیلہ تھا۔ان کا کوئی آدمی اکیلے کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ ہمیشہ کسی مہمان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔بعض اوقات کوئی فرد کھانا، کھانے کے لئے بیٹھتا تو صبح سے شام تک کھانا سامنے پڑا رہتا۔(جب تک کوئی مہمان نہ آتا کھانا نہ کھاتا تھا) بعض اوقات ان کے پاس دودھ دینے والی اونٹنیاں ہوتیں لیکن اس وقت تک وہ دودھ نہ پیتے جب تک کوئی دوسرا شریک نہ ہوتا۔جب شام ہو جاتی اور کوئی مہمان نہ آتا تو کھانا کھا لیتے۔یہ قتادہ' ضحاک اور ابن جریج کا قول ہے(2)۔ابن جریر نے عکرمہ اور ابی صالح سے یہ قول روایت کیا ہے۔بغوی نے ان دونوں حضرات سے روایت کیا ہے کہ انصار کے پاس جب کوئی مہمان آتا تو وہ اس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک کہ مہمان اس کے ساتھ کھانا نہ کھاتا۔اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا کہ رخصت ہے چاہے اکیلے کھاؤ یا ملکر کھاؤ(3)۔

۶ جب تم مذکورہ گھروں یا کسی دوسرے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو اپنوں کو، یعنی ایک دوسرے پر سلام کرو۔انفس کے لفظ کا اطلاق اس جماعت پر ہوتا ہے(1) وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (2) تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔(3) ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ۔

(1) اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے۔(2) اور نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر۔(3) گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنوں کے بارے نیک گمان۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جب تم اپنے گھروں میں جاؤ اور وہاں کوئی موجود نہ ہو تو اپنے اوپر سلام کرو، یعنی اس طرح کہو۔اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔کیونکہ فرشتے سلام کا جواب دیتے ہیں۔تحیۃ، تسلموا کا مترادف مصدر ہے کیونکہ تحیۃ کا معنی بھی تسلیم ہی ہے۔امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا انکا قد ستر ہاتھ لمبا تھا' جب تخلیق فرمایا تو فرمایا جاؤ اور بیٹھے ہوئے فرشتوں کے گروہ پر سلام کرو اور سنو کہ وہ کیا تجھے دعا دیتے ہیں۔وہی دعا تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔حضرت آدم علیہ السلام نے کہا السلام علیکم تو فرشتوں نے کہا السلام علیک ورحمۃ اللہ(4)۔من عنداللہ کا مطلب یہ ہے کہ جو دعا اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے مشروع فرمائی ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تحیۃ کا صلہ ہو۔کیونکہ تحیۃ کا معنی حیات کا طلب کرنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔مبارکۃ ،یعنی جو برکت کے ذکر کے ساتھ متصل ہے اور برکت نیکیوں میں زیادتی ہے' پس وہ کہے السلام علیکم والبرکتہ۔بعض علماء فرماتے ہیں تحیہ السلام کو برکت سے صفت بیان کی گئی ہے کیونکہ اس کے ساتھ خیر اور ثواب کی زیادتی کی امید کی جاتی ہے۔طیبۃ ،یعنی اس میں ریا اور نفاق نہ ہو۔اور نفس کی پاکیزگی سے اسکا اظہار ہو۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دعا ایسی ہو کہ سننے والے کا نفس خوش ہو جائے۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں مبارکۃ طیبۃ کا معنی حسنۃ جمیلۃ ہے(5)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو میرے امتی سے ملاقات کرے اور اس پر سلام کرے تو تیری عمر میں اضافہ ہوگا اور جب تو اپنے گھر میں داخل ہو اور اپنے گھر والوں پر سلام کرے تو تیرے گھر میں خیر و برکت زیادہ ہوگی اور چاشت کی نماز پڑھو کیونکہ یہ اوابین کی نماز ہے(6) (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کی نماز ہے) اس حدیث کو

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر) 2۔ایضاً 3۔ایضاً

4۔مشکوٰۃ المصابیح: 4628، جلد 3، صفحہ 3 (الفکر) 5۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر) 6۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 108 (العلمیۃ)

بیہقی نے شعب الایمان میں اور ثعلبی نے اور حمزہ بن یوسف جرجانی نے تاریخ جرجان میں روایت کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ انسان جب اپنے گھر میں داخل ہو تو اپنے اہل پر اور جو کوئی دوسرا گھر میں ہو اس پر سلام کرے۔ یہ جابر' طاؤس' زہری' ضحاک' قتادہ اور عمرو بن دینار کا قول ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں جب تو گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں پر سلام کرو کیونکہ تمہارے سلام کے سب سے زیادہ حقدار تمہارے گھر والے ہیں۔ اور جب تو کسی ایسے مکان میں داخل ہو جس میں کوئی شخص موجود نہ ہو تو یوں کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ ...... ملائکہ سلام کا جواب دیتے ہیں(1)۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت قتادہ سے مرسلاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم گھر میں داخل ہو تو اس گھر والوں پر سلام کرو اور جب تم باہر نکلو تو سلام کے ساتھ ان کو الوداع کہو(2)۔ امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے بیٹے! جب تو اپنے اہل کے پاس جائے تو انہیں سلام کر تو یہ فعل تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کے لئے باعث برکت ہوگا(3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اگر گھر میں کوئی شخص نہ ہو تو اس طرح کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا مِنْ رَّبِّنَا۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ۔ اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ(4)۔

عمرو بن دینار نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا جب تو مسجد میں داخل ہو تو یوں کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ(5) عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا اسلام بہتر ہے' فرمایا کھانا کھلانا' اور سلام کرنا ہر شخص کو خواہ تو اسے پہچانتا ہے یا نہیں پہچانتا ہے (بخاری' مسلم)(6)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مومن مرد پر دوسرے مومن کے لئے چھ چیزیں حق ہیں۔

1۔ جب مریض ہو تو اس کی بیمار پرسی کرے۔ 2۔ جب مر جائے تو اس کے جنازہ میں شریک ہو۔ 3۔ جب دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرے۔ 4۔ جب ملاقات ہو تو سلام کرے۔ 5۔ جب اسے چھینک آئے تو یرحمک اللہ کہے۔ 6۔ غائب ہو یا موجود ہو ہر حال میں اس کی خیر خواہی کرے۔(7) اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور بزار نے بھی اس طرح روایت کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' تم جنت میں داخل نہ ہو گے حتیٰ کہ ایمان لاؤ۔ اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ (فرمایا) میں تمہاری ایسے عمل کی طرف رہنمائی نہ کروں جو تم کرو تو آپس میں محبت کرنے لگو؟ (فرمایا وہ عمل یہ ہے) کہ تم آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(8)۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ سوار پیدل چلنے والے پر سلام کرے' پیدل چلنے والے بیٹھنے والے پر' اور تھوڑے زیادہ پر سلام کریں (بخاری' مسلم)(9) بخاری نے یہ الفاظ بھی لکھے ہیں کہ چھوٹا بڑے پر سلام کرے۔

عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم آپ ﷺ نے سلام کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر)
2۔ شعب الایمان: 8845، جلد 6، صفحہ 448 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2698، جلد 10، صفحہ 125 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر)
5۔ ایضاً
6۔ مشکوٰۃ المصابیح: 4629، جلد 3، صفحہ 3 (الفکر)
7۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2737، جلد 10، صفحہ 145 (العلمیہ)
8۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 31 (العلمیہ)
9۔ صحیح مسلم: 6160، جلد 14، صفحہ 119 (العلمیہ)

جواب عطا فرمایا اور فرمایا دس (نیکیاں)۔ پھر ایک دوسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب مرحمت فرمایا اور فرمایا بیس۔ (نیکیاں) پھر ایک تیسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب عطا فرمایا اور کہا تیس۔ (نیکیاں)(1) اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت معاذ بن انس سے یہی حدیث مرفوع روایت کی ہے اور اس میں یہ الفاظ زائد ہیں پھر چوتھا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس۔ (نیکیاں) (ہر لفظ کے اضافہ کے ساتھ) اسی طرح نیکیاں بڑھتی جاتی ہیں(2)۔

حضرت ابوامامہ سے مروی ہے فرماتے ہیں سب سے زیادہ قرب الٰہی اسے نصیب ہوگا جو سلام میں ابتداء کرے گا(3)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی مجلس میں پہنچے تو سلام کرے اگر بیٹھنے کا پروگرام بنے تو بیٹھ جائے۔ پھر جب مجلس سے کھڑا ہو تو پھر سلام کرے۔ پہلا سلام دوسرے سے ثواب میں برتر نہیں ہے(4)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب کوئی جماعت گزر رہی ہو اور اس میں سے کوئی ایک سلام کردے تو تمام کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور مجلس میں سے بھی کوئی ایک جواب دے دے تو ان تمام کی طرف سے ادا ہو جائیگا(5)۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے المصابیح میں موقوف ذکر کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں مرفوع ذکر کیا ہے۔

؎ یہ جملہ مزید تاکید اور آخری احکام کی عظمت کے اظہار کے لئے تیسری مرتبہ ذکر فرمایا۔ پہلی دو آیتوں میں علم الٰہی اور حکمت الٰہی کا ذکر فرمایا جو احکام کا مقتضی ہے اور اس آیت کے اختتام پر لعلکم تعقلون۔ (تاکہ تم احکام کو سمجھ لو) فرمایا، یعنی آیات واحکام کے نزول کا مقصود ذکر فرمایا۔ ابن اسحٰق اور بیہقی نے دلائل میں عروہ اور محمد بن کعب القرظی وغیرہما سے روایت کیا ہے کہ جب جنگ خندق کے موقع پر قریش حملہ آور ہوئے تو انہوں نے مدینہ طیبہ کے ایک کنواں رومہ کے قریب مجمع الاسیال میں پڑاؤ ڈالا' قریش کے لشکر کی قیادت ابوسفیان کر رہا تھا' عطفان آئے تو انہوں نے احد کے قریب نقمین میں ڈیرا لگایا۔ جب ان لشکروں کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے مدینہ کے ارد گرد خندق کھودنے کا حکم فرمایا۔ حضور ﷺ نے خود بھی اس کام میں حصہ لیا اور تمام مسلمانوں نے بھی خوب محنت کی لیکن منافق سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور برائے نام کام کر رہے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو بتائے بغیر اور آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر اپنے گھروں کو کھسک جاتے۔ لیکن مسلمانوں میں سے کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کرتا پھر اپنی حاجت کو پورا کرنے کے لئے آپ ﷺ سے اجازت طلب کرتا' پھر جب اپنا کام کر لیتا تو واپس آجاتا(6)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2679، جلد 10، صفحہ 117 (العلمیہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 350 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2706، جلد 10، صفحہ 128 (العلمیہ)
5۔ مصابیح السنۃ: 1540، جلد 2، صفحہ 248 (العلمیہ)
6۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 409 (العلمیہ)

اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۶۲﴾

''بس سچے مومن تو وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور جب ہوتے ہیں آپ ﷺ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے لئے تو (وہاں سے) چلے نہیں جاتے جب تک کہ آپ سے اجازت نہ لے لیں [1] بلاشبہ وہ لوگ جو اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ پس جب وہ اجازت مانگیں آپ سے اپنے کسی کام کے لئے تو اجازت دیجئے ان میں سے جسے آپ چاہیں [2] اور مغفرت طلب کیجئے ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ [3]''

[1] الذین آمنوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو صمیم قلب سے ایمان لائے تھے وہ لوگ مراد نہیں جو زبانی دعوے کرتے تھے لیکن دل نور ایمان سے خالی تھے۔ امر کی صفت مجازاً مبالغہ ظاہر کرنے کیلئے لگائی گئی ہے۔ اس سے مراد ایسا کام ہے جس کے لئے بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے خندق کھودنا' مشورہ کرنا' جہاد اور اسی طرح کے دوسرے امور مثلاً جمعہ' عیدین وغیرہ۔ یعنی ایسے خوش نصیب اپنے اس اجتماعی کام کو چھوڑ کر چلے نہیں جاتے۔ بلکہ اجازت طلب کرتے ہیں جب بارگاہ رسالت ﷺ سے اذن ملتا ہے تو تب گھروں کو جاتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا غیر مفید ہے کہ الذین آمنوا سے مراد کامل مومنین ہیں کیونکہ یہ ان مومنین کی حالت کا بیان ہے جو اس وقت موجود تھے اور جو اسوقت موجود تھے وہ کافروں سے ممتاز تھے اور وہ تمام کامل ایمان کے حامل تھے۔ مصیبت اور شدت کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی معیت کو ان کا نہ چھوڑنا ان کے صدق ایمان کی واضح دلیل تھا۔ تو مؤکد اسلوب کے ذریعے آئندہ کلام میں دوبارہ ان کی اسی صفت کو ذکر فرمایا۔ یعنی جو آپ ﷺ سے اجازت لے کر کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو یہی لوگ کامل ایمان والے ہیں۔

[2] جب کسی ضروری کام کے لئے اجازت طلب کریں تو آپ کی مرضی ہو تو اجازت مرحمت فرمادیں اس آیت میں اشارہ ہے کہ مومنین کی یہ شان نہیں کہ وہ ہر پیش آنے والے کام کے لئے اجازت طلب کریں بلکہ جو انتہائی اہم اور ضروری ہو اس کے لئے اجازت طلب کریں۔ اجازت کے امر کو مشیت سے مقید فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہ حکم اباحت کے لئے ہے۔ وجوب کے لئے نہیں ہے اگر اجازت طلب کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ پر اجازت دینا واجب ہوتا تو اجازت طلب کرنے کا مفاد ہی نہ رہتا کیونکہ اجازت طلب کرنا تو کسی کے لئے مشکل ہی نہ تھا۔ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ بعض احکام نبی کریم ﷺ کی مرضی اور رائے کو تفویض کئے گئے تھے۔ اسی طرح بعض احکام امام وقت کی رائے کے سپرد ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس اختیار کو تسلیم نہیں کیا وہ کہتے ہیں مشیت اس بات سے مقید ہے کہ آپ اگر دیکھیں کہ اجازت طلب کرنے والا سچا ہے تو آپ اجازت دے دیں۔ یا وہ اجتماعی امر ایسا ہو کہ زیادہ لوگوں کی ضرورت نہ ہو۔ یا اجازت طلب کرنے والے کی ضرورت نہ ہو۔ تو ان صورتوں میں آپ جس کو چاہیں اجازت مرحمت فرما سکتے ہیں۔

[3] چونکہ کسی دنیوی کام کے لئے اجازت طلب کرنا جائز تو تھا لیکن پھر بھی اس میں کسی قدر کمزوری کا پہلو تھا کیونکہ دنیوی امر کو گویا دینی امر پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا اے پیارے حبیب ﷺ اپنے ان اجازت طلب کرنے والوں کے لئے اپنے رب کے حضور مغفرت طلب فرمائیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی لغزشوں کو معاف فرمانے والا ہے اور ان پر آسانیاں پیدا فرمانے والا ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اس آیت کے شان نزول میں مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے روز منبر پر تشریف فرما ہوتے اور کوئی شخص کسی حاجت کے لئے مسجد سے نکلنا چاہتا تو وہ بغیر اجازت نکل نہ جاتا بلکہ پہلے وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ پس آپ ﷺ پہچان جاتے کہ یہ اجازت طلب کرنے کے لئے کھڑا ہے' آپ ﷺ جسے چاہتے اجازت عطا فرما دیتے۔ مجاہد فرماتے ہیں جمعہ کے دن امام کا اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دینا ہی اذن ہے۔ اہل علم فرماتے ہیں اسی طرح ہر وہ کام جس میں مسلمان کی معیت میں سب شریک ہوں' تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کی مخالفت نہ کریں اور اس کی اجازت کے بغیر اس کام کو چھوڑ کر چلے نہ جائیں۔ پھر جب اجازت طلب کریں تو امام کی مرضی ہے اگر چاہے تو اجازت دے اگر چاہے تو اجازت نہ دے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ کوئی ایسا سبب لاحق نہ ہو جائے جو اس جگہ ٹھہرنے سے مانع ہو۔ اگر کوئی ایسا سبب لاحق ہو جائے جو وہاں ٹھہرنے سے مانع ہو تو پھر اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے خود بخود ہی چلا جائے۔ جیسے عورت مسجد میں ہو اور اسے وہاں حیض شروع ہو جائے یا مرد جنبی ہو جائے یا کوئی مرض لاحق ہو جائے جس کی وجہ سے مسجد میں ٹھہرنا مانع ہو(1)۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

"نہ بنالو رسول کے پکارنے کو آپس میں جیسے تم پکارتے ہو ایک دوسرے کو ۔[1] اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے انہیں جو کھسک جاتے ہیں تم میں سے [2] ایک دوسرے کی آڑ لے کر پس ڈرنا چاہئے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول کریم ﷺ کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے یا دردناک عذاب نہ آئے۔[3]"

1۔ یعنی رسول مکرم ﷺ تمہیں کسی اجتماعی کام کی طرف بلائیں تو بسر وچشم ان کی دعوت کو قبول کرو اور ان کے حکم کی اطاعت کرو۔ اس کی دعوت اور اس کے بلانے کو ایک دوسرے کے بلانے کی طرح نہ سمجھو جس میں اعراض کی بھی گنجائش ہوتی ہے' مرضی کا بھی دخل ہوتا ہے اور بغیر اجازت اس کام کو چھوڑ کر واپس جانا بھی ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کرنا واجب ہے اور آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر واپس جانا حرام ہے جبکہ کسی دوسرے کی دعوت کا یہ حکم نہیں ہے۔ اس تاویل پر اس کی مثال یہ ارشاد ہوگا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ۔ دعاء الرسول میں مصدر کی فاعل کی طرف اضافت ہے اور مفعول محذوف ہے مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو نام کے ساتھ مت پکارو جیسے تم ایک دوسرے کو نام سے پکارتے ہو بلکہ عزت وشرف سے مزین کلمات کے ساتھ پکارو(2)۔

ابو نعیم نے دلائل میں ضحاک عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ لوگ آپ ﷺ کو یا محمد اور یا ابا القاسم کہہ کر بلاتے تھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ پھر لوگ یا نبی اللہ! یا رسول اللہ ﷺ! کہہ کر پکارنے لگے(3)۔ لیکن یہ تاویل کلام کے سیاق وسباق کے مناسب نہیں ہے کیونکہ کلام اجازت کے ساتھ اور بغیر اجازت کے نکلنے کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس طرح یہ کلام خود

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 110 (العلمیۃ)

بھی اس تاویل کے مناسب نہیں ہے کیونکہ مشبہ بہ دعا ہے جو فاعل کی طرف مضاف ہے اور اس کا مفعول بعد میں منصوب ہے پس ضروری ہے کہ مشبہ میں بھی رسول دعا کا فاعل ہو نہ کہ مفعول ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کا یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ جب تم پیارے رسول ﷺ کو ناراض کر بیٹھو تو آپ ﷺ کی بددعا سے بچو، کیونکہ آپ کی گزارش قبول ہو جاتی ہے۔ آپ کی بددعا دوسرے لوگوں کی بددعا کی طرح نہیں ہے(1)۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا السام علیکم آپ ﷺ نے جواباً فرمایا وعلیکم۔ حضرت عائشہ نے کہا اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ وَ لَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ۔ (تم پر موت ہو اور تم پر اللہ کی لعنت ہو اور تم پر اللہ کا غضب ہو) رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا اے عائشہ نرمی اختیار کرو۔ سخت گوئی اور فحش کلامی سے اجتناب کرو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی حضور ﷺ! آپ نے نہیں سنا کہ یہ کیا کہہ رہے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا آپ نے وہ نہیں سنا جو میں نے کہا ہے، میں نے بھی ان پر وہی کلمہ لوٹایا ہے جو انہوں نے کہا تھا۔ میری ان کے حق میں بددعا قبول ہوگی لیکن انہوں نے جو میرے متعلق کہا ہے وہ قبول نہ ہوگا(2)۔

میں کہتا ہوں اس تاویل پر کلام اسطرح ہوگی لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ (عَلَيْكُمْ) كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ (عَلٰى) بَعْضٍ۔ لیکن اس تاویل پر یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ تم میرے رسول کی رب کی بارگاہ میں التجاء کو اس طرح نہ سمجھو جس طرح چھوٹا بڑے کو پکارتا ہے اور بڑا کبھی تو اس کی دعا کو قبول کرتا ہے اور کبھی رد کر دیتا ہے، لیکن آپ ﷺ کی ہر التجاء قبول ہوتی ہے رد نہیں کی جاتی۔

۲۔ السل کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز سے آہستہ سے نکال لینا۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق خفیہ چوری پر بھی ہوتا ہے عرب کہتے ہیں سُلَّ الْبَعِيْرُ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ، یعنی اونٹ چپکے سے باہر نکل گیا۔ قاموس میں اس طرح ہے لواذاً۔ لَا وَذَيْلَاوِذُ مُلَاوَذَةً وَ لِوَاذًا کا مصدر ہے۔ یہ لاذ یلوذ سے مشتق نہیں ہے کیونکہ اس کا مصدر لیاذ آتا ہے۔ جس کا معنی دوسرے سے چمٹ جانا اور پناہ لینا ہے۔ دعاء منقول میں بھی یہ لفظ آیا ہے اَللّٰهُمَّ اَلُوْذُبِكَ۔ اے اللہ! میری پناہ لیتا ہوں۔ اللواذ۔ ہر ایک کا دوسرے کی پناہ لینا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ کر نکلتے ہیں یا یہ معنی کہ جن کو اجازت ملتی ہے ان کی آڑ میں یہ بھی نکل جاتے ہیں۔ قاموس میں اللوذ بالشئ کا معنی چھپ جانا لکھا ہے۔ منافقین کی خندق کی کھدائی کے دوران یہی کیفیت تھی چھپ کر نکل جاتے تھے جیسا کہ ابن اسحٰق اور بیہقی نے عروہ اور محمد بن کعب قرظی سے نقل فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جمعہ کے دن منافقین پر مسجد میں ٹھہرنا اور نبی کریم ﷺ کا خطبہ سننا بڑا مشکل اور بھاری ہوتا تھا، پس وہ بعض صحابہ کے پیچھے سے چھپ کر مسجد سے نکل جاتے تھے(3)۔ لواذاً حال کی بنا پر منصوب ہے۔ قد یعلم کا معنی یجازیھم ہے، یعنی اللہ انکو جزاء دے گا کیونکہ جزا علم کی فرع ہے۔

۳۔ عن امرہ میں عن زائدہ ہے، یعنی آپ ﷺ کی سمت کے مخالفت سمت اختیار کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں خالف کا صلہ عن ذکر فرمایا کیونکہ یخالف میں اعراض کا معنی متضمن ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ اللہ کے حکم سے رکتے ہیں اس صورت میں یہ خالفة عن الامر سے مشتق ہوگا۔ اور مفعول محذوف ہوگا کیونکہ مقصود مخالف اور مخالف عنہ کا بیان ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عن امرہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہو اور مفعول محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی يُخَالِفُوْنَ الرَّسُوْلَ وَيُخَالِفُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَنْ اَمْرِهٖ۔ اور امرہ کی ضمیر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری: 5683، جلد 5، صفحہ 2243 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر)

کا مرجع اللہ تعالیٰ یا رسول کریم علیہ ہے۔ فتنہ ... دنیا کی آزمائش ہے۔ ... ان دونوں حرفی اپنے صلہ سے ملکر محل نصب میں ہے۔ کیونکہ لیحذروا کا مفعول ہے، یعنی فتنہ کے لاحق ہونے یا عذاب الیم کے پہنچنے سے انہیں بچنا چاہئے۔ اور یہ حکم الٰہی کی مخالفت کے سبب ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مفعول محذوف ہو۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہو۔ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ عَنِ الْمُخَالِفَةِ يُصِيْبُهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اس آیت کریمہ میں ان علماء کی دلیل ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قرینہ نہ ہوتو امر وجوب کے لئے آتا ہے۔ یہ وجوب اور ندب کے درمیان مشترک نہیں ہے، جیسا کہ امام شافعی سے منقول ہے یا یہ وجوب او راستحباب اور اباحت کے درمیان مشترک ہے یا تینوں معانی میں مشترک ہے جیسا کہ شیعہ علماء کا مذہب ہے ابن شریح سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔ وجوب پر محمول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فتنہ اور عذاب صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب واجب کو چھوڑا جائے یا حرام کا ارتکاب کیا جائے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

"سن لو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ وہ خوب جانتا ہے جس حالت پر تم ہو[1] اور اس دن جب وہ لوٹائے جائیں گے اس (کی بارگاہ) کی طرف تو وہ انہیں آگاہ کرے گا جو انہوں نے کیا تھا[2] اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے[3]"

[1] یعنی آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور ملک ہے۔ اور جو کچھ تمہارے نہاں خانہ دل میں ایمان نفاق' موافقت اور مخالفت ہے وہ سب سے آگاہ ہے' یہ خطاب تمام مکلفین کو ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خاص طور پر خطاب منافقین کو ہو اور اس کلام میں غائب سے مخاطب کی طرف التفات ہو۔ قد یعلم کا جملہ سابق کلام کا ثبوت ہے کیونکہ جو ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اس کیلئے اپنی مخلوق اور مملوک کو جاننا بھی ضروری ہے۔

[2] تمام لوگ جزاء کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹیں گے۔ اس ارشاد میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے۔ یعنی جو کچھ دنیا میں انہوں نے کیا وہ اسکی انہیں جزاء دے گا۔ یوم یرجعون، ینبئهم کے متعلق ہے اور فاء زائدہ ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں فا زائدہ ہے۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ فَلْيَعْبُدُوْا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ظرف' محذوف ظرف پر معطوف ہو جو قدیعلم کے متعلق ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا۔

[3] اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ علامہ بغوی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کو بالا خانوں میں نہ ٹھہراؤ اور انہیں کتابت نہ سکھاؤ اور انہیں چرخہ کاتنا اور سورۃ نور سکھاؤ(1)۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور سچ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے اور سچ فرمایا رسول اللہ ﷺ کے اصحاب (رضی اللہ تعالیٰ

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔ سورۂ نور کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 13-11-2000 بعد نماز عشاء 11:10 پر بمطابق پندرہ شعبان 1421ھ مکمل ہوا۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔

اے میرے کریم وغفور رب آج کی رات، تیرے محبوب کے فرمان کے مطابق، تو بنی بکر کی بکریوں کے بالوں کے برابر اپنے گنہگار بندوں کی بخشش فرماتا ہے۔ اس عاجز کی التجا ہے کہ اپنے اس روسیاہ اور سیاہ کار بندے کی غلطیوں اور خطاؤں کو بھی معاف فرمادے۔ اللّٰھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی یا غفور یا غفور۔ والصلوٰۃ والسلام علی شفیع المذنبین۔

عبدک المسکین محمد اقبال شاہ

مشہور و معروف محدث و مفسر حضرت امام حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

کا عظیم شاہکار

جس کا جدید اور مکمل اردو ترجمہ ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف نے اپنے نامور فضلاء

مولانا محمد اکرم الازہری، مولانا محمد سعید الازہری

اور مولانا محمد الطاف حسین الازہری سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے۔

ان شاء اللہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

جلد اس علمی کارنامے کو منصۂ شہود پر لانے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔